فنون

جولائی، اگست ۶۶



رجسٹرڈ نمبر ایل : ۷۵۷۹   ٹیلی فون : ۶۹۵۸۰

معیاری علم و فن کے تخلیقی کارفتار پیما

فنون

اشاعتِ خاص

(۵ ـــ ۶)

جولائی ، اگست ۱۹۶۶ء

ادارہ
احمد ندیم قاسمی
حبیب اشعر دہلوی
تزئین : موجد،

جلد : ۳   شمارہ : ۳ ، ۴

[illegible]

مقامِ اشاعت : ۴۷ ـ انارکلی ـ لاہور

مندرجات

ادارہ

حرفِ اوّل

جب کوئی ادبی رسالہ کسی نئے شاعر یا افسانہ نگار یا نقاد کو منظرِ عام پر لاتا ہے تو وہ اس پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ ان فرائض میں سے ایک فرض پورا کرتا ہے جو اس نے اپنے اوپر عاید کر رکھے ہوتے ہیں۔ جب کوئی رسالہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی بنیادی نوعیت ادبی ہے تو اس طرح وہ اپنے قاری سے وعدہ کر رہا ہوتا ہے کہ وہ چند گنے چنے ناموں پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ جائے گا بلکہ نئے سے نئے جوہرِ قابل کی کھوج میں رہے گا اور جہاں بھی اسے حسنِ تخلیق کی چمک دکھائی دے گی، وہ اپنے صفحات اس کے سامنے پھیلا دے گا۔ تخلیقِ فن کا تسلسل صرف اسی طرح جاری رہ سکتا ہے اور اسے جاری رہنا چاہیئے کیونکہ کون کہہ سکتا ہے کہ ان نئے اہلِ قلم میں مستقبل کے کتنے بڑے شاعر اور ادیب شامل ہیں۔ شعر و ادب میں عظمت کی کوئی آخری حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ میر کے دور میں کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابھی ایک غالب کو آنا ہے اور غالب کی عظمت کے پرستاروں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اقبال بھی آئے گا۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے نئے شاعروں اور ادیبوں میں کوئی ایسی شخصیت موجود نہیں ہوگی جسے میر، غالب اور اقبال کا ہم مرتبہ کہا جاسکے۔ شعر و ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان عظیم شاعروں سے بھی کوئی عظیم تر شاعر پیدا ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں ادبی رسالوں کا فرض ہوجاتا ہے کہ وہ جہاں نامور اہلِ قلم کی نگارشات سے اپنے صفحات کو زینت بخشیں، وہاں اسی التزام کے ساتھ نو واردوں کی تخلیقات کا بھی مطالعہ کریں اور یہ مطالعہ اس احساس کے ساتھ کریں کہ اگر انھوں نے ذرا سی بھی کوتاہی کی تو بہت ممکن ہے کہ ایک جوہرِ قابل بددل اور مایوس ہو کر شعر و ادب کو ترک ہی کردے اور ہماری تہذیب ایک نئی آواز کی کھنک سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوجائے۔

نئے اہلِ قلم البتہ نئے اہلِ قلم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ محض نیا یا نو وارد فن کار ہونا اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ اچھا فن کار بھی ہوگا، یا اگر وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے تو اس کی ابتدائی تحریروں میں بھی (پختگی نہ سہی) پختگی کی ایک جھلک سی ہوگی۔ شعر و ادب کا فن یقیناً کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے سے نہیں آجاتا۔ ایسا ہوتا تو اردو شاعری کے بڑے بڑے اساتذہ کے سب شاگرد اپنے اساتذہ کے ہم پلہ ہوتے۔ سو تخلیق کا جوہر تو قطعی طور پر خدا داد چیز ہے البتہ اس جوہر کو نکھارنے اور سنوارنے کے لئے، بڑی محنت، بڑے مطالعے، بڑے ریاض اور بڑے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اپنے اندر خود تنقیدی کا حوصلہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو نئے لکھنے والے کی پہلی ہی چیز خود اس کی نظر میں شاہکار ٹھہرتی ہے اور یہ آغاز ہی میں تکمیل کا یقین (جو دراصل وہم ہوتا ہے) اتنی بڑی قیامت ہے کہ اس نے اردو

شعر و ادب سے ایسا ایسا جوہر قابل چھین لیا ہے جس کی اٹھان بے پناہ تھی مگر جو تکمیل کے دھوکے میں جامد ہو کر رہ گیا، پھر اپنے آپ کو دہرانے لگا، پھر اپنے آپ سے گھبرانے اور شرمانے لگا، پھر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ "فنون" نے بار بار اعلان کیا ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں سے ہمیشہ ہر ممکن تعاون کرے گا اور اس کی گذشتہ ایک درجن خاص اشاعتوں کے مندرجات گواہ ہیں کہ اس نے اپنا یہ فرض ایمانداری سے پورا کیا ہے۔ نئے لکھنے والوں سے ہماری صرف یہ گزارش ہے کہ وہ عجلت سے کام نہ لیا کریں۔ "فنون" انھیں کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ البتہ ان سے یہ مطالبہ ضرور کرے گا کہ وہ اپنے اندر خود تنقیدی کا حوصلہ بیدار کریں اور یہ کبھی نہ بھولیں کہ نو واردانِ ادب کا بھی ایک معیار ہوتا ہے۔ شاعری میں یہ معیار محض موزونیِ طبع تک محدود نہیں ہے۔ موزوں طبع تو غیر شاعر لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس معیار کی بنیاد یہ ہے کہ نو وارد نے بحیثیت شاعر یا ادیب اپنے موضوع کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے اور وہ حسن کاری کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہاں تک کامیاب رہا۔ اس حسن کاری میں ابلاغ بھی شامل ہے۔ اگر کوئی نو وارد ابلاغ کا منتا ہی نہیں پالتا اور اپنے خیالات کو قاری تک پہنچانا اس کا مسئلہ ہی نہیں ہے تو اس کی تحریروں کا اشاعت پذیر ہونا بھی اس کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیئے۔ "فنون" فن میں تجربوں کی قدر کرتا ہے۔ اگر تجربہ کرنے کی جرأت ختم ہو جائے تو فن جمود او ریک رنگی کا شکار ہو جاتا ہے مگر ادبی تجربے کا تعلق بھی ادبی روایت سے ہوتا ہے۔ فن کے قلعے بھی ہوا میں تعمیر نہیں ہو سکتے۔ انھیں چاہے کتنی بلندی پر پہنچا دیا جائے مگر ان کی بنیادیں زمین پر ہی رہتی ہیں۔ اپنی ادبی روایت سے کٹ کر ادب تخلیق کرنا صرف مداری پنا ہے۔ یقیناً روایت پتھر پر لکیر نہیں ہوتی۔ روایت ہمیشہ اصلاح پذیر رہتی ہے اور اسی لئے ادب میں تجربے کا جواز ہمیشہ موجود رہتا ہے لیکن جب کوئی تجربہ قاری کے ذہن تک منتقل نہ ہو سکے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تجربے کرنے والے کو خود ہی معلوم نہیں ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور اسے کیا کہنا چاہیئے اور کس طرح کہنا چاہیئے۔ ایسا کہہ کر ہم جدید ادب میں علامت اور تجرید کی نفی نہیں کر رہے ہیں۔ علامت بھی فن کو حسن بخش سکتی ہے اور تجرید بھی بعض صورتوں میں فن کا سنگار ثابت ہو سکتی ہے مگر ان کے لئے بھی ایک سلیقہ درکار ہوتا ہے۔ یہ سلیقہ ناپید ہو تو ادب کی بجائے بینترا تخلیق ہوتا ہے اور بینترا چونکاتا ضرور ہے (جس طرح کسی کا سر کے بل چلنا ہر دیکھنے والے کو چونکائے گا) مگر ادب کا منصب صرف چونکانا نہیں ہے۔ وہ تو قاری کے ذہن میں رچ جانے اور اس کے جذبے میں حلول کر جانے اور اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن جانے والی چیز ہے اور ؂

گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

علامہ نیاز فتحپوری

۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو اردو ادب اور علم اور زبان سے وہ ہمہ گیر اور ہمہ اوصاف شخصیت ہمیشہ کے لئے چھن گئی جس نے گذشتہ نصف صدی میں اُردو کو اتنا کچھ دیا کہ کوئی ادارہ بھی نہ دے سکتا تھا۔ علامہ نیاز فتحپوری ۸۲ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ یہ خاصی طویل عمر ہے مگر نیاز صاحب نے آخری دم تک جس بے مثال قوتِ ارادی کا مظاہرہ کیا، اس کے پیشِ نظر اس عمر کو ابھی اور طویل ہونا چاہیئے تھا۔ مگر کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے موت کب رک سکتی ہے۔

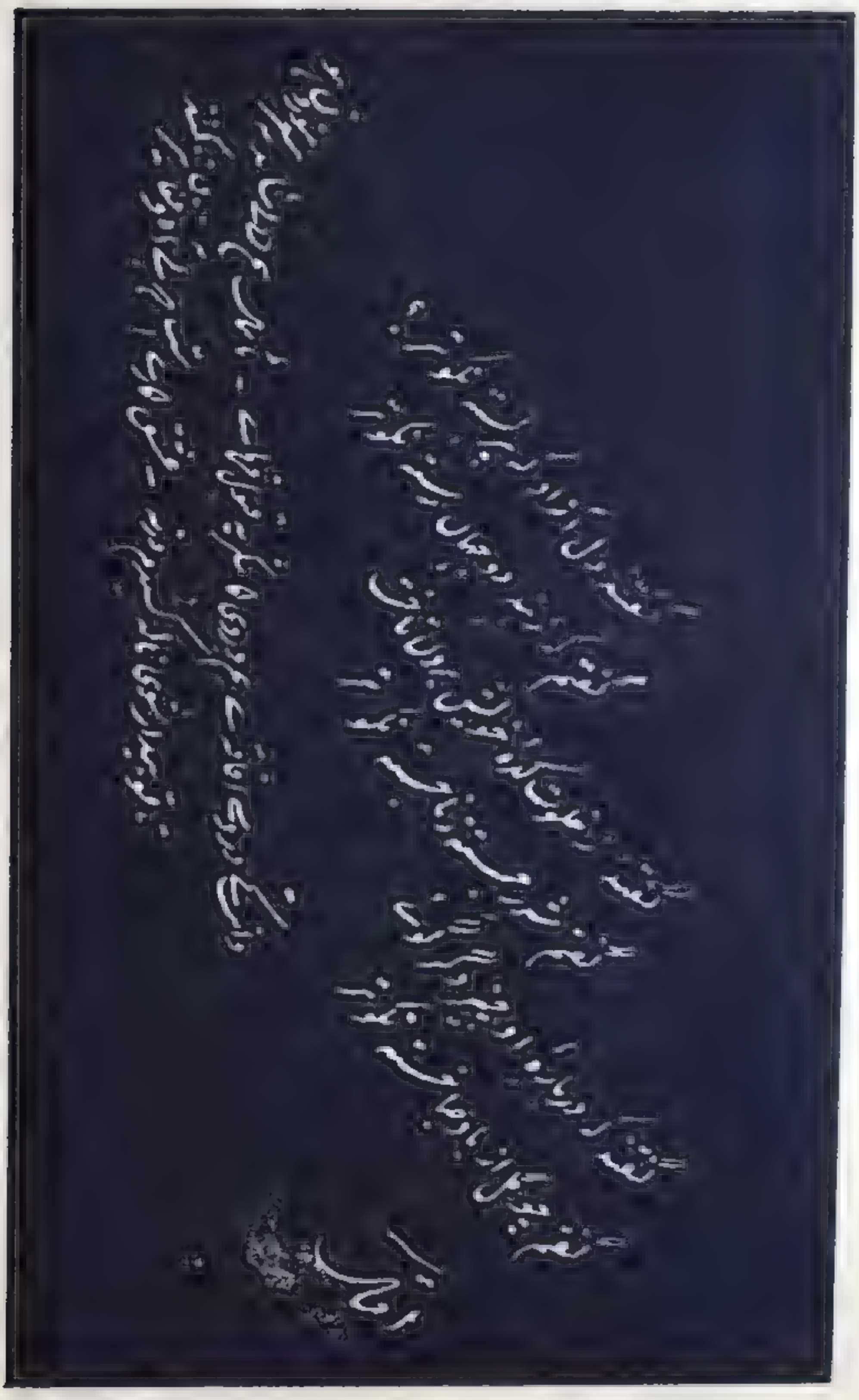
علامہ نیاز فتحپوری علم و ادب کے بے شمار شعبوں پر حاوی تھے۔ شعر، افسانہ، تنقیدِ ادب، انشاء، جمالیات، مذہبیات، تاریخ، تحقیق، فلسفہ، نفسیات، صحافت، معلوماتِ عامہ، مکتوب نگاری، سب پر ان کے انفرادی فکر و اسلوب کی چھاپ

موجود ہے مگر اپنے معاصرین میں نیاز کو جس خصوصیت نے قابلِ رشک امتیاز بخشا وہ ان کی آزادیٔ فکر اور جرأتِ اظہار تھی۔ ادب کے علاوہ مذہب تک کے مسائل پر بھی اُنھوں نے وہی کچھ لکھا جو اُنھوں نے سوچا۔ اُنھوں نے اپنے ضمیر پر کبھی کوئی پہرہ نہ بٹھایا۔ اُنھوں نے نتائج سے قطعی طور پر بے پروا ہو کر ان باتوں کا اعلان کیا جن کے بارے میں اُنھیں یقین تھا کہ وہ حق پر مبنی ہیں۔ اس ضمن میں اُنھیں برا بھلا بھی کہا گیا اور ان کے خلاف فتوے بھی جاری ہوئے اور ایک ایسا وقت بھی آیا جب "نگار" کو چھپ چھپ کر پڑھا جاتا تھا، مگر ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ یہ توانائی، یہ صلابت، یہ دیانت، کردار کی عظمت کا ثبوت ہے اور ہم اپنی تاریخ میں کردار کی ایسی بے داغ عظمتوں سے کچھ زیادہ متعارف نہیں ہیں اس لئے نیاز کی شخصیت ہمیں گذشتہ نصف صدی کی ادبی تاریخ میں منفرد نظر آتی ہے۔

علامہ نیاز فتحپوری کا ایک اور کمال یہ تھا کہ انھوں نے جس بھی موضوع پر قلم اُٹھایا، اس حقیقت کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہ کیا کہ وہ اول و آخر ادیب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں فکر و فن کے نہایت خوبصورت امتزاج کی غیر فانی مثالیں ہیں۔ وہ کبھی علم کی خشکی اور یبوست کا شکار نہ ہوئے، شگفتگی اور رنگینی نے ان کے علمی تبحر کا ساتھ کبھی نہ چھوڑا اور وہ نہایت "پتھریلے" موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی سحر نگار ہی رہے۔

ہم نیاز کی موت پر یہ رسمی فقرہ دہرانے کے گنہگار نہیں ہوں گے کہ اُنھوں نے ایک ایسا خلا چھوڑا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ علم و ادب اور تہذیب و تاریخ کی دنیا میں ہر خلا آخر کار پُر ہو کر رہتا ہے کہ یہی انسانی ارتقا کی شان ہے، البتہ ہم یہاں ایک اور رسمی فقرہ ضرور دہرائیں گے جو بہت کم موقعوں پر صحیح استعمال ہوتا ہے مگر جو نیاز صاحب کے سلسلے میں صد فی صد صحیح ہے ——— نیاز اپنی ذات میں، ایک تحریک، ایک ادارہ، ایک مکتبۂ فکر تھے۔ ان کی تحریروں نے آج کے متعدد بڑے بڑے اہلِ قلم کی تربیت کی اور ادب کی کسی نئی تحریک کی محض اس بنا پر مذمت نہ کی کہ وہ نئی ہے۔ وہ اردو ادب کی واحد شخصیت تھے جن کے نظریات سے کئی ایک کو اختلاف تھا (اور وہ اظہارِ اختلاف کی دعوت بھی دیتے تھے) مگر وہ سب کے محترم تھے۔ اردو زبان، ادب اور تنقید میں ان کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہے گا اور وہ ہمیشہ دیانتِ اظہار اور جرأتِ اظہار کی ایک علامت بنے رہیں گے۔ "نقوش" کی دعا ہے کہ "نگار" کی صورت میں اُنھوں نے علم و فن میں اجتہاد کی جو تحریک گذشتہ چالیس برس تک بڑے وقار سے چلائی وہ ان کے بعد بھی جاری رہے۔ ادارۂ "نقوش" علامہ نیاز مرحوم کے پس ماندگان کی محرومی میں اپنے آپ کو شامل سمجھتا ہے۔





عکس تحریر - علامہ اقبال



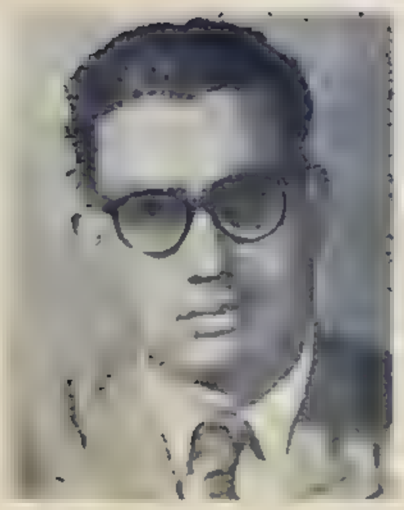
جسٹس ایس۔ اے۔ رحمن



ڈاکٹر محمد احمد خاں



رضا ہمدانی



ابن اسعد



صلاح الدین احمد



خمس رامپوری



مشہور مرحوم احمد سعدی

ڈاکٹر سید عبداللہ

کیا اقبالؔ وجودی تھے؟

کیا اقبالؔ وجودی تھے؟ اس کا سرسری جواب تو نفی میں ہے لیکن محض نفی سے کام نہیں بنتا کیونکہ اقبالؔ کے چند خیالات وجودیوں سے ملتے ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا مشکل ہوگا کہ وہ وجودی تھے یا انھوں نے وجودیوں سے کسبِ فیض کیا۔

وجودی فلسفہ[۱] کیا ہے؟ یہ ایک طویل قصہ ہے۔ اس کی مختصر تشریح یوں ہو سکتی ہے کہ یہ ایک طرح کا داخلی طرزِ فکر ہے جس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ حقیقت کا ادراک فرد کے اندرونی تجربے پر منحصر ہے۔ فرد کا وجدان سب سے بڑا علم ہے جو یقینی اور ناقابلِ تردید ہے۔ فرد کی آزادی کامل وجودیوں کا اہم عقیدہ ہے ــــ وہ فرد کو خود اپنا رہنما اور خود اپنا محافظ قرار دیتے ہیں۔ دین، مجلسی ادارے، اجتماعی منصوبے، سائنس، ٹکنالوجی یہ سب فرد کی آزادی چھیننے والی اور اس کی خود مختاری پر ڈاکا ڈالنے والی چیزیں ہیں۔

وجودی فلسفہ دراصل مغرب کی عقلیت اور مادی اجتماعیت کے خلاف، قلبِ انسانی کا احتجاج ہے۔ سائنس کی ترقی نے صنعت اور مشین کی اور استبدادی نظامِ اقتدار کی بے حد و حساب افزائی کی۔ ایسی فضا میں ذی احساس انسان کو یہ محسوس ہوا کہ اب اس کا وجود بیکار ہے اور اس کی زندگی بے مقصد ہو کر رہ گئی ہے! اس کے شب و روز میں یکرنگی اور اکتا دینے والی یکسانی ہے ــــ انسان کے لیے مرنا اور جینا گویا برابر ہے۔ بقول فانیؔ کے

موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیے تھا

ان حالات میں ایک ذہنی تحریک پیدا ہوئی جس کے بعض علمبرداروں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ژاں پال سارتر اس وقت وجودی فلسفے کا بڑا داعی اور مبلغ ہے۔

مغرب کے ماحول میں وجودی فلسفہ شاید وقت کی آواز ہے۔ اس لئے کہ دو تین صدیوں کی ٹکنیک، اور بے خدا تفکر کے علاوہ، زندگی سے بیزار کر دینے والی جنگوں نے خصوصاً دو عالمی جنگوں نے، شدید ذہانی جھنجلاہٹ اور اندرونی کشمکش پیدا کر دی ہے اور حالت یہ ہو رہی ہے کہ مرض کا جو علاج بھی کیا جاتا ہے وہ مرض میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ تسکین ذہنی اور روحانی سکون کی صورتیں کم سے کم ہوتی جاتی ہیں۔ اقبالؔ نے فرنگ سے خطاب کرتے ہوئے اسی موقعے کے لیے کہا تھا

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری عجب آن است کہ بیمارِ تو بیمارتر است

یہ تو رہا مغرب میں وجودیت کا معاملہ ہمارے سامنے۔ اس وقت سوال یہ ہے کہ اقبالؔ نے وجودیت سے کہاں تک اثر قبول کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ فکرِ اقبالؔ کے بعض حصے وجودی فلسفے سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں لیکن غور کیا جائے تو وہ مماثلت یا تو سرسری ہے یا اتفاقی۔ اقبالؔ کے بارے میں یہ کہنا تو ممکن ہے (اور صحیح ہے) کہ انھوں نے مغربی افکار کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان افکار سے استفادہ بھی کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا اپنا ایک مستقل نظامِ فکر ہے جس کے بعض پہلو مشرقی اور مغربی فلسفیانہ نظاموں کے بعض حصوں سے مماثلت رکھتے ہیں، البتہ ہم اس مماثلت کو اس لئے کسی دوسرے نظامِ فکر

۱۔ Existentialism مغربی فلسفے کے چند نئے دبستانوں میں سے ایک اہم دبستان ہے۔ اس کے نامور داعیوں میں کرک گارڈ، مارسل، ہیسپر، ژاں پال سارتر وغیرہ ہیں۔

سے متعلق نہیں کہہ سکتے کہ اپنی پوری شکل میں اقبالؔ کا فلسفہ ان نظام ہائے فکر کی روح کا قاطع اور مخالف ہے۔

مغرب کی بات چھوڑ دیجیے، ہم اگر اپنے مسلمانوں کے صوفیانہ فکر کے حوالے سے بات کریں تو تعصب کے الزام سے شاید بچ جائیں گے۔ یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ اقبالؔ نے مسلمان صوفیوں سے کتنا استفادہ کیا ہے۔ پھر بھی اقبالؔ کو ہم نہ صوفی کہتے ہیں اور نہ اُن کے مسلک کو تصوف کا مسلک قرار دیتے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ اقبال کا پورا نظامِ تصورات بالکل مستقل حیثیت رکھتا ہے، خواہ اس کے بعض حصے دوسروں کے تصورات سے ملتے بھی ہوں۔ یہی صورت مغربی فلسفیانہ تصورات کے تعلق میں ہے۔

وجودی فلسفے میں "خودی" پر ۔۔۔ یا انسان کی وجودیت پر بے حد زور دیا گیا ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اقبالؔ نے خودی پر اور انسان کی خودی پر بے حد اصرار کیا ہے ۔ مماثلت موجود ہے۔ مگر انسان کی "وجودیت" کا قصہ اہلِ مشرق کے لئے کوئی نیا نہیں۔ عربی میں ابنِ عربی کی فصوص الحکم اور ابن الفارض کی عربی شاعری اور فارسی اُردو کا بیشتر صوفیانہ ادب، انسانی وجودیت کے متعلق ہمیں بہت سی سمتوں میں لے جاتا ہے۔ اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ صوفیانہ فکر خود ایک اندرونی تضاد کا شکار ہے (وہ اس طرح کہ وجود کو نہ مانتے ہوئے بھی انسان کے شرف کا اثبات کرتا ہے) پھر بھی مغربی وجودیوں کی طرح (کہ وہ بھی ایسے ہی ایک اور تضاد کا شکار ہیں)، ہمارے صوفی اور متصوف شعراء، و اہلِ فکر انسان کے شرف اور اس کی وجودیت (= برتر وجودیت) کو مانتے ہیں۔ میں میر تقی میرؔ سے مانوس ہوں اس لئے میں اس موقعے پر میرؔ ہی کی ایک غزل بطور شہادت پیش کرتا ہوں۔ ؎

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا — اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں
صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی — اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں
عشق ان کی عقل کو ہے جو ماسوا ہمارے — ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

غالبؔ کا یہ شعر بھی (منجملہ دوسرے اشعار کے) اسی خیال کی تائید کرتا ہے: ؎

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

یہ ظاہر ہے کہ وجود کی طرف یہ اشارے خالص صوفیانہ تفکر کا حصہ ہیں۔ صوفیوں کے خیال میں وجود ہے مگر یہ وہ وجود ہے جسے برتر وجود (واجب الوجود) کہنا چاہیئے ان کا خیال ہے کہ لفظ وجود کا اطلاق صرف اسی پر ہو سکتا ہے، باقی جو کچھ ہے اسے اضافات و تعینات کا درجہ حاصل ہے۔ صوفی جب وجود کا اثبات کرتا ہے تو اسی وجود کا اثبات کرتا ہے۔ باقی کو تو وہ موجود مانتا ہی نہیں۔

جب معاملہ یہ ہے تو یہ بھی عجب تماشا ہے کہ "صوفی" (یا صوفیوں کا ایک گروہ) اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اعلان کرنے لگتا ہے کہ "میں ہی ہوں ۔۔۔ اور کچھ بھی نہیں" اور اس "میں ہی ہوں" کی رمز یہ ہے کہ "وجود" ناقابل تقسیم حقیقت ہے اور یہ جو کچھ نظر آتا ہے جسے ممکن الوجود کہا جاتا ہے یعنی یہ شاہد و مشہود و شہود، شاہد صرف نقلی ہیر پھیر ہے" اور در اصل بقول میرؔ ؎

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

اقبالؔ کا یہ موقف نہیں ۔۔۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وجودیوں کے خیالات بھی اس سے الگ ہیں۔ اقبالؔ تھوڑے عرصے کے لیے وحدت الوجود کے قائل رہے مگر بعد میں ان کا خیال یہ رہا کہ خدا خدا ہے اور انسان انسان ۔۔۔ وہ خدا، انسان اور کائنات تینوں کی مستقل حیثیت مانتے ہیں اور زندگی اور فکر کے سارے نظام کو

ان تین عناصر سے مرکب مان کر تینوں کی اصولی اہمیت کا اثبات کرتے ہیں۔

وجودی فلسفیوں کا ایک گروہ خدا کو مانتا ہے ـــــ یا کم از کم اس حقیقت الحقائق کو جو کبھی کبھی وجدان میں اپنی تجلی سے کسی وجود اعلیٰ کی جھلک دکھا دیتی ہے مگر وجودیوں کا ایک بڑا حصہ صرف "خودی" میں اعتقاد رکھتا ہے۔ یہ لوگ یہ احساس رکھتے ہیں کہ وہ (انسان) نامعلوم وجوہ سے اس کائنات میں پھینک دیئے گئے ہیں۔ ان کا کوئی سہارا نہیں۔ انھیں صرف اپنے اوپر اعتماد کرنا ہے۔ کوئی خارجی قوت ان کی دستگیری کے لئے آگے نہیں بڑھے گی۔ وہ تنہا ہیں۔ طرح طرح کی آفات اور بلائیں چاروں طرف سے انھیں گھیرے ہوئے ہیں، وہ نہ صرف بے یار و مددگار ہیں بلکہ اس عالم میں اجنبی ہیں۔ اس فضا میں انسان اپنا آپ محافظ اور اپنا آپ دوست ہے ـــــ یہاں تک کہ اجتماع بھی اس کا محافظ اور غم گسار نہیں۔ اسے (فرد) کو اپنی حفاظت خود کرنی ہے۔ مذہب اور کلیسا اور مسجد و کنشت سب دھوکے ہیں۔ ان سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

قدرتی طور پر یہ خیالات اقبال کے نہیں ہو سکتے۔ اقبال جہاں انسان کو مانتے ہیں وہاں خدا کو بھی واجب تعالیٰ مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال کا انسان اتنا ضعیف اور پژمردہ انسان نہیں۔ اقبال، دین، مذہب اور دعا (یعنی خدا تعالیٰ کے حامی و ناصر ہونے) پر گہرا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ دل سے مانتے ہیں کہ خدا بندے کی دعا سنتا ہے اور اس کو مصائب میں دل و ایمان کی طاقت سے استقامت عطا کرتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ بعض ظاہری مماثلتوں کے باوجود اقبال اور وجودیوں کا مسلک ایک نہیں

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اقبال کے کلام کے ایک حصے میں (خصوصاً پہلے دو ادوار میں) کسی قدر تنہائی، غربت اور اجنبی ہونے کا احساس ملتا ہے اس کے لیے انھوں نے اپنی خاص علامتوں کو بار بار استعمال کیا ہے مثلاً ستارہ اور لالۂ صحرا اور کبھی کبھی چراغ، شمع اور جگنو کو بھی اپنے احساسات کا نمائندہ بنایا ہے مگر درحقیقت یہ احساسِ تنہائی، ان کی رومانیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ وہ انگلستان (اور امریکہ) کے رومانی شعرا سے اپنی شاعری کے پہلے ادوار میں خاصے متاثر رہے ہیں ـــــ اور عظیم رومانی شاعر گوئٹے تو ان کے خاص ذہنی رفیق ہیں۔ لہٰذا یہ تنہائی، وجودیوں کی خوف انگیز تنہائی نہیں بلکہ یہ وہ تنہائی ہے جس میں لطفِ افسردگی اور لذتِ الم بھی حصہ لے رہی ہے۔

وجودیوں میں سے اکثر خوف اور خصوصاً خوفِ مرگ میں مبتلا ہیں ـــــ اور شاید یہی وہ ذہنی اور داخلی کیفیت یا احساس ہے جس کے اندر سے ایک وجودی زندگی کا وجدان حاصل کرتا ہے[1]۔ یہ صحیح ہے کہ خوف زندگی کی ایک اہم کیفیت ہے۔ اسی سے انسان اور ہر ذی حیات کی خود حفاظتی حِس بیدار ہوتی ہے اور مقابلے کی آمادگی پیدا کرتی ہے لیکن احساس تنہائی اور خوف دونوں وہ بنیادی جبلتیں ہیں جن کی تسخیر کے لیے عقل اور ایمان جیسے عطیے خدا نے انسان کو دیئے ہیں۔ قرآن مجید میں مومن کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے کہ (نہ وہ خوف زدہ ہوتے ہیں، نہ وہ غم سے مغلوب ہوتے ہیں)۔ اقبال کے فکر میں بھی قرآن مجید کے بتائے ہوئے اسی رویے کا پرتو ہر جگہ نظر آتا ہے، چنانچہ جاوید نامہ میں لکھا ہے:

از بلا ترسی حدیثِ مصطفیٰ است   مرد را روزِ بلا روزِ صفاست

از بلا پختہ تر گردد خودی   تا خدا را پردہ در گردد خودی

مومن بالائے ہر بالا ترے   غیرتِ او برنتابد ہم سرے
خرقۂ لاتحزنوا اندر برش   انتم الاعلون تاجے بر سرش

---

1. Existentialist Philosophies by Emmanuel Monier

وجودیوں کے متعلق یہ کہنا کہ بے انصافی ہوگی کہ وہ غم اور خوف کے سامنے سپر ڈال دینے والا اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے والا ایک گروہ ہے۔ یہ بات صحیح نہیں۔ وجودی زندگی سے گریز کا فلسفہ نہیں بلکہ مقابلے کا فلسفہ ہے۔ لیکن اقبال اور وجودیوں میں یہ فرق ہے کہ وجودی اس مقابلے میں صرف اپنی سعی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں سعی کے بعد بھی توفیق، خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایمانی مقاصد جو اقبال کی نظر میں ہیں وہ اکثر وجودیوں کی نظر میں نہیں۔

وجودی فلسفی، انسان کی ذہنی اور مادی زندگی پر بہت زور دیتے ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ تقریباً تمام وجودی سائنس اور ٹکنالوجی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح عقلیت بھی ان کے نزدیک ایک ناقص بلکہ ضرر رساں رویہ ہے۔ خارجی حقیقتوں سے سب وجودیوں نے انکار تو نہیں کیا مگر داخلیت پر بے حد زور دے کر ان میں سے بیشتر یہ تاثر دیتے ہیں کہ خارج، دراصل باطن کے انکشافات کی ایک مجسّم صورت ہے۔ اس کی وہ اہمیت نہیں جو وجدان کی ہے۔

ان خیالات کے سلسلے میں بھی اقبال کا راستہ جُدا ہے۔ اقبال سائنس کو شبہے کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اسی طرح عقل کو (اگرچہ وہ اس کی نارسائی کو مانتے ہیں) نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ خارجی اور داخلی دونوں قسم کے حقائق کو یکساں اہمیت دیتے ہیں اور ان کا رویہ عقل محض والوں سے مختلف سہی مگر وہ وجدان پسند، سائنسی ذہنیت کے مفکّر ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود، اقبال کے فکر اور وجودیوں کے خیالات میں کہیں کہیں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ وجودیوں کی طرح اقبال بھی فرد کی آزادی کے معتقد ہیں۔ بھیڑی رویہ حیات کا مخالف ہونا بھی ان کے بارے میں یہی ظاہر کرتا ہے۔ اقبال مشین اور ایجادات کے اتنے مخالف تو نہیں جتنے وجودی ہیں۔ پھر بھی وہ انسان کشی کے اس تجربے کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہیں جو مشینی دور کا ایک خاصہ بن چکا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس معاملے میں یورپ کے انسان دوست فلسفیوں اور شیلے اور ورڈزورتھ جیسے رومانیوں ــــ یا نطشے اور شپنگلر جیسے مفکّرین کے خیالات سے متاثر ہوں مگر اس معاملے میں وجودیوں سے فکر اقبال کی مماثلت اس لیئے واضح تر ہے کہ اقبال بھی ان کی طرح معروضی طریقہ (objective method) کو نارسا اور نا تمام خیال کرتے ہیں۔

جبر و اختیار کے مسئلوں میں بھی اقبال کے خیالات اس حد تک وجودیوں سے مماثلت رکھتے ہیں کہ اقبال فرد کو صاحبِ ارادہ اور فعال شخصیت تصور کرتے ہیں جس کی رہنمائی مقاصد کی تحریک کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہاں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ اقبال ایک باخدا فلسفی ہیں اور وجودیوں کے نظامِ فکر میں انسان ہی سب کچھ ہے۔

ان مختصر گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ بہت سی مماثلتوں کے باوجود اقبال کو وجودیوں سے فیض یاب مفکر نہیں کہا جا سکتا، البتہ وجودیوں کے خیالات کا کہیں کہیں پرتو ہے اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ وہ وجودیوں کے راستے سے آیا ہو، اس کے دوسرے راستے بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کتاب میں کرک گارڈ کے خیالات ملاحظہ ہوں a) Six Existentialist Thinkers by H.J. Blackham

ڈاکٹر طاہر فاروقی

اقبال کا تصورِ مردِ مومن

(یونیورسٹی اورینٹل کالج کی دعوت پر ۱۲ مارچ ۱۹۶۶ء کو سینیٹ ہال میں پڑھا گیا)

اسلام کا اصل الاصول توحید کا عقیدہ ہے۔ اسلامی توحید تمام مذاہب و ملل قدیمہ کے وحدانیت کے تصور سے مختلف ہے۔ مجملاً یوں کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی تعلیمات نے توحید کی عمارت کے دو ستون قرار دیئے ہیں۔ (۱) خدائے قدوس کی حقیقی عظمت و جلال کی پہچان اور (۲) کائنات میں انسان کی اصل حقیقت اور اس کے مرتبہ کی تعیین۔

خدائے عز و جل ہر قسم کے صفاتِ عالیہ، اوصاف اور محامدِ جمیلہ سے متصف ہے: "اس کے مانند کوئی نہیں"۔ "عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر اسی کی حکمرانی ہے"۔ "کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں"۔ "اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں"۔ "سب فانی ہیں، اسی ایک کو بقا ہے"۔ "سب اس کے آگے سربسجود ہیں"۔ "وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے"۔ "وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناتے سے پاک ہے"۔ وقس علیٰ ذلک۔

خدا کی "عظمت و جلالت و کبریائی" کے ساتھ ہی وحیِ محمدی نے یہ نکتہ سمجھایا کہ انسان اس عالمِ خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" (میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) کا منشور اس کی خلافت کا گواہ ہے۔ "وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ" (اور ہم نے بنی آدم کو عزت و اکرام عطا کیا) سے انسان کے جلال و عظمت اور "عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا" (اس نے آدم کو تمام و کمال اسما کا علم بخشا) سے اس کے علم و وسعت اور قوتِ تسخیر کی شہادت بہم پہنچتی ہے۔

غرض محمد رسول اللہ صلعم نے جس توحید کی تلقین کی وہ انہی دو اصولوں پر قائم ہے۔ ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیئے۔ دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی آستانے پر جھکنا چاہیئے۔

اقبال نے جس مردِ مومن کا تصور پیش کیا ہے وہ نائبِ خدا اور خلیفۃ اللہ ہے۔ وہی تخلیقِ کائنات کا مقصودِ حقیقی اور انسانِ کامل ہے۔ وہ ان تمام اوصاف و کمالات سے متصف ہے جو مشیتِ الٰہی میں اسی کے لئے امانت رکھے گئے۔ اور جن کی بدولت اسے احسن التقویم کے معزز لقب سے نوازا گیا۔ اقبال کے کلام میں مردِ مومن اور اس کے صفات و کمالات کا ذکر جا بجا آیا ہے لیکن ایک قطعے میں انھوں نے مردِ مسلمان کی بڑی واضح تفسیر کی ہے۔ بلکہ اس قطعے میں بھی صرف یہ ایک شعر جامع تعریف کا حق ادا کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

بلند مرہیاں شاعرانہ بلند خیالی اور مضمون آفرینی کی ایک عمدہ مثال نظر آتی ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے محض نکتہ نوازی اور سخن سرائی کے لئے یہ اوصاف جمع نہیں کئے بلکہ واقعی یہی چار عناصر ہیں جن سے مومن ترکیب پاتا ہے۔

آغازِ آفرینش سے وجود نے جتنے ارتقائی مدارج طے کئے۔ بلاشبہ ان میں انسان ارتقائی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر اس کو خیر و شر اور پست و بلند کا وہ مجموعہ بنایا گیا ہے کہ اگر ایک طرف وہ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ کے خطاب کا سزاوار ہے تو دوسری جانب اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ کا رتبہ بھی اسی کی طرف منسوب ہے۔ خیر و شر اور پست و بلند کا یہ تصادم و پیکار ہی انسان کو عظمت و شرف کی راہ پر لے جاتا ہے اس لئے کہ اسے وہ فطرتِ صالح، عقلِ سلیم اور قوتِ تمیز بخشی گئی ہے جو اسے غلط سے صحیح کی طرف، پست سے بلند کی جانب اور شر سے خیر کی سمت، صراطِ مستقیم پر گامزن کرتی ہے۔ خدا نے انسان کو فطری طور پر جو صلاحیت عطا کی ہے وہ اسے خیر و سلامتی کی راہ پر قائم رکھتی ہے۔

موجوداتِ عالم کے ذرّے ذرّے میں حق تعالیٰ کا ظہور ہے۔ اگر یہ ظہور نہ ہوتا تو موجوداتِ صوری کا وجود ہی نہ ہوتا۔ لیکن حق تعالیٰ کا ان ذرّوں میں ظہور ہر ذرّے کی استعداد کے مطابق ہے۔ ظہورِ اتم سوائے انسان کے کسی اور چیز میں نہیں۔ اسی لئے ساری کائنات اس کے لئے مسخر کی گئی ہے اور اسی لئے اس کو خدا نے اپنی نیابت و خلافت کے منصب و لقب سے سرفراز کیا ہے۔

حضرت آدمؑ (جو ابو البشر اور انسانیت کے اوّلین پیکر تھے) اپنے ظاہر کے لحاظ سے خَلق کی صورت تھے تو اپنے باطن کے لحاظ سے حق کی صورت۔ خداوند عز و جل کا ارشاد ہے فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ یہاں تسویہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب جسمِ آدم میں ہر قسم کی صلاحیت پیدا ہو گئی تب اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی۔ روح پھونکنے کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ جسدِ آدمی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، بلکہ یہ بھی کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات اور صفات کا پرتو آدمؑ پر ڈالا۔ چونکہ آدمؑ کا تسویہ پورا ہو چکا تھا، انھوں نے اس پرتو کو قبول کیا اور امانتِ الٰہی کے متحمل ہو گئے۔

اسی لئے انسان میں جملہ صفاتِ الٰہی کا پرتو پایا جاتا ہے۔ وجوبِ ذاتی اور صفاتِ تنزیہی کے ماسوا کہ وہ اسی پاک و برتر ذات کے لئے مخصوص ہیں، فرق یہ ہے کہ انسان ان صفات کے لئے اللہ کا محتاج ہے، اور اللہ کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ انسان ظلی، عکسی اور اضافی طور پر صفاتِ الٰہی کا حامل بنا تبھی تو اس کو مسجودِ ملائک کا اہم اور مقتدر رتبہ حاصل ہوا۔ مسجودِ ملائک ہونا گویا اعلامیہ تھا کہ وجود کے ارتقا نے مکمل ترین شکل اختیار کر لی۔

تمہید لمبی ہوتی جا رہی ہے لیکن ابھی اسماء و صفاتِ خداوندی پر بھی ایک نظر ڈالنی ہے۔ اسماء و صفاتِ الٰہی کی عام تقسیم صفاتِ جلالی اور صفاتِ جمالی میں کی گئی ہے۔ یوں تو جس طرح ذاتِ باری حد و احاطہ و استقصا سے ماورا ہے، اسی طرح اس کے صفات کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ لیکن جن صفات کا کم و بیش ادراک یا جن کا انسان کی عملی زندگی سے زیادہ تعلق سمجھا گیا، ان کو ننانوے اسمائے الٰہی کہہ کر ننانوے کے عدد میں جمع کر دیا گیا ہے ورنہ تجسس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہ اسماء و صفات جن کا ذکر قرآن پاک میں اور حدیث شریف میں آیا ہے وہ بھی ننانوے سے زیادہ ہیں۔

صفاتِ جلالی اور صفاتِ جمالی کی تقسیم بھی ہماری سوجھ بوجھ کے مطابق اور اعتباری قسم کی ہے ورنہ ہر اسم جلالی بھی ہے اور جمالی بھی۔ یعنی ایک لحاظ سے جلالی ہے تو دوسرے اعتبار سے جمالی۔ ہر جلال کے لئے جمال اور ہر جمال کے لئے جلال لازم ہے۔ مثلاً سورج کی روشنی میں نسبتاً جلال ہے لیکن جب سورج دور ہو جائے اور یہی روشنی زیادہ فاصلے سے گزر کر چاند کی روشنی بن جائے تو اس میں ایک جمال پیدا ہو جاتا ہے۔ انگارہ دور سے خوشنما نظر آتا ہے اور اس کی جمالی شان بڑی بھلی لگتی ہے۔ لیکن یہی انگارہ قریب ہو اور اسے ہاتھ لگایا جائے تو اس میں جلالی شان بھڑک اٹھتی ہے اور ہم تڑپ اٹھتے ہیں۔

خدا کے اسماء و صفات کا عقیدہ اسلام میں صرف نظری چیز نہیں ہے بلکہ اسلامی اعتقاد میں اس کو عملی حیثیت بھی حاصل ہے۔ یعنی خدا کی

یہ صفات اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں۔ انسان کے حصول شرف و عظمت کی کسوٹی ہیی صفات و اسماء ہیں۔ انسان کی عملی زندگی انھی صفاتِ خداوندی کے عکس اور پرتو کے مطابق ڈھلنی چاہئے۔ اگر انسان خدا سے نسبت پیدا کرنی چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ خدا کے ان اسماء و صفات سے نسبت پیدا کرے اور ان کو انتہائی معیار جان کر ان کی نقل اور ان کی پیروی کی کوشش کرے تاکہ نیابتِ خداوندی کے منصبِ جلیلہ تک اس کو رسائی میسر آسکے۔

حدیث شریف میں آیا ہے اِنَّ اللہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔) ذات باری ہر قسم کی تجسیم و تشبیہ سے پاک ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہاں صورت سے مراد جسمانی شکل نہیں ہوسکتی بلکہ معنوی شکل و صورت مقصود ہے۔ یعنی خدا کی صفاتِ کاملہ کا عکس موجودات میں سب سے زیادہ انسان ہی میں جلوہ گر ہوتا ہے اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے حُسْنُ الْخُلُقِ خُلُقُ اللہِ الْاَعْظَم (حسنِ اخلاق خدائے تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے) اربابِ معرفت نے اسی لئے یہ تعلیم دی ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہِ (خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو) جو کوئی جس درجہ تک اخلاقِ خداوندی سے نسبتِ کاملہ پیدا کرے گا، وہ اسی قدر شرفِ انسانیت سے آراستہ ہو جائے گا۔

وہ انسان جو صفاتِ الٰہیہ اور اخلاقِ خداوندی سے بدرجۂ کابل آراستہ ہو۔ اقبال کی اصطلاح میں مردِ مومن کہلاتا ہے اور یہی مردِ مومن اقبال کے تصور کے مطابق انسانِ کامل ہوتا ہے۔" وجود کے تمام مراتب میں (جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا) انسان اکمل ہے اور جملہ افرادِ انسانی میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ صلعم سب سے اکمل و ارفع ہیں۔ اور مظہرِ اتم ہیں حق تعالیٰ کے بس آپ ہی انسانِ کامل ہیں۔ دوسروں کو یہ مرتبہ آپ ہی کی برکت اور آپ ہی کی پیروی و متابعت اور آپ ہی کی محبت سے ظلّی طور پر حاصل ہوتا ہے۔"

اس تفصیل کے بعد اقبال کے شعر پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ انھوں نے مومن کے لئے جو چار عناصر قرار دیے ہیں، ان کے ذریعے اسی حقیقت کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ مکرر شعر پڑھنے کے لئے عذر خواہ ہوں:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

یہاں ایک جملۂ معترضہ اور شامل کر لینے دیجئے۔ وہ یہ کہ اقبال کی اصطلاح کے مطابق مردِ مومن، مردِ مسلمان، مردِ فقیر، مردِ قلندر، مردِ حق، مردِ آزاد سب اسی مومن کے مختلف نام ہیں۔ حسبِ ضرورت اقبال نے یہ مختلف الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ورنہ مفہوم کے لحاظ سے یہ سب ایک ہی ہیں

بعض علماء نے اسماء و صفاتِ الٰہی کو تین اقسام میں درج کیا ہے یعنی صفاتِ جلالی، صفاتِ جمالی اور صفاتِ کمالی۔ یعنی ان اسماء و صفات سے اگر خدا کی رحیمی اور کریمی ظاہر ہوتی ہے تو وہ صفاتِ جمالی ہیں۔ اگر ان سے خدا کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے تو وہ صفاتِ جلالی ہیں اور اگر ان سے اس کی بلندی، تنزیہ اور کمالات کی جامعیت ثابت ہوتی ہے تو وہ صفاتِ کمالی کہلاتی ہیں۔

علامہ اقبال نے مردِ مومن کے لئے جو چار عناصر تجویز کئے ہیں وہ ان تینوں صفاتِ الٰہی کے حامل ہونے کے ساتھ حقیقتِ محمدیؐ کے بھی جامع ہیں۔ قہاری صفتِ جلالی ہے، غفاری صفتِ جمالی، قدوسی صفتِ کمالی اور جبروت اصطلاحِ تصوف میں "حقیقتِ محمدیؐ" کو کہتے ہیں۔

میری ناقص رائے میں اقبال نے ان چار الفاظ کی یہ ترتیب محض اتفاقیہ اور صرف مصرع موزوں کرنے کے لئے قائم نہیں کی ہے بلکہ ان الفاظ کا انتخاب اور ان کی یہ ترتیب بے شمار حقائق کی عقدہ کشائی کرتی ہے۔ انسان کی قوت و عظمت، اس کی محبت و شرافت، اس کی برتری و پاکیزگی اور اس کے باطنی و روحانی ارتقائے اعلیٰ کی طرف بھی اس ترتیب میں بڑی بلاغت کے ساتھ اشارہ مطلوب و مقصود ہے۔

اقبال نے ان چار عناصر میں پہلا عنصر قہاری کو قرار دیا ہے۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ قہاری صفاتِ جلالی میں سے ہے۔ صفاتِ جلالی کی تعریف یہ ہے کہ "وہ صفات جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کے اسمائے جلالی قاہر

۱۱۔ قہّار کے مختصر معنی یہ ہیں کہ جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔ یہ تشریح مختصر یہ ہے۔ لیکن اس سے بھی صفت قہّاری کی جو بنیادی حیثیت ہے وہ بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید میں واضح طور پر انسان کو تسخیر کائنات کا حکم دیا گیا ہے۔ جا بجا ارشاد ہے کہ یہ ساری کائنات ہوا، پانی، زمین، آسمان اور ان میں جو کچھ ہے ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر انسان کا یہ فریضہ بن جاتا ہے کہ وہ سب کچھ تسخیر کرے۔ جب تک نوامیس فطرت اور مظاہر قدرت کی کامل تسخیر اور ان پر تصرف حاصل نہ ہو، اسے مردِ مومن کے لقب سے سرفراز نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ فرماتے ہیں:

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث   مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی   مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

فقرِ مومن چیست تسخیرِ جہات   بندہ از تاثیرِ او مولا صفات

خدا کی صفت قہاری کا عکس مردِ مومن میں جلوہ نما ہوتا ہے تو اسے تسخیرِ جہات اور غلبۂ کائنات میسر ہو جاتا ہے۔ اس کی قوت و سطوت اور اس کے شوکت و جلال کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ وہ آسمان و زمین کو تہہ و بالا کر سکتا ہے۔ کوئی چیز اور کوئی عمل اس کے تصرف و اختیار سے باہر نہیں ہوتا۔

ولایت، بادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری   یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

یہاں ایک جملۂ معترضہ کے لئے پھر عذر خواہ ہوں۔ اقبالیات پر گفتگو کرتے وقت ان کی اصطلاحِ خودی سے گریز ممکن نہیں۔ تسخیرِ کائنات، عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی سب کچھ تصورِ خودی میں شامل ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں:

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است   ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی   خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش   خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

اگر خواہی خدا را فاش بینی   خودی را فاش تر دیدن بیاموز

جب انسان کو معرفتِ خودی حاصل ہو جاتی ہے تو وہ انفس و آفاق کو مسخر کر لیتا ہے۔ ضمیرِ کائنات کے اسرار و رموز اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ آسمان و زمین سب اس کے اشاروں پر رقص کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ ابن الوقت نہیں رہتا۔ بلکہ ابوالوقت اور ابوالحال کے بلند مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:۔

آں مسلمانے کہ بیند خویش را   از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست   تیغِ لا موجود الا اللہ اوست
در مکان و لامکاں غوغائے او   نہ سپہر آوارہ در پہنائے او

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید   زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

خودی صیاد و نخچیرش مہ و مہر   اسیرِ بندِ تدبیرش مہ و مہر

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے   مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

خودی کا استحکام عشق سے ہوتا ہے۔ عشق نام ہے اس قوت کا جو مقصد آفریں ہے جو ہمہ وقت تلاش، جستجو، پیش قدمی، آرزو، سوز و ساز سے ہمکنار رکھتی ہے۔ عشق تکمیلِ ذات کے لئے تسخیری عمل پر مستعد رہتا ہے۔ اور اسی لئے تمام فطری اور عمرانی رکاوٹوں پر غالب آتا ہے۔ فرماتے ہیں:

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی ست   زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست

از محبت می شود پائندہ تر   زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

از محبت چوں خودی محکم شود   قوتش فرماں دہِ عالم شود

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات   عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

از نگاہِ عشق خارا شق شود   عشقِ حق آخر سراپا حق شود

عشق کا یہ جذبہ مردِ مومن کو حبِّ خدا اور حبِّ رسولؐ سے میسر ہوتا ہے۔ فرمانِ خدا ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (جو مومن ہیں وہ خدا کی ذات سے زیادہ سے زیادہ عشق رکھتے ہیں) محبتِ خدا عشقِ رسولؐ کے بغیر میسر نہیں ہوتی۔ قرآن شریف میں واضح طور پر فرمایا ہے: قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے: فرما دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو اول میرا اتباع کرو۔ اس طرح تم کو میری محبت حاصل ہو گی۔ اور محبتِ رسولؐ سے تم حبِّ الٰہی تک پہنچو گے جس کے صلے میں یہ انعام الٰہی نصیب ہوگا کہ خود خدا تم سے محبت فرمائے گا۔) علامہ فرماتے ہیں:

ہر کہ عشقِ مصطفےٰؐ سامانِ اوست   بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

سوزِ صدیقؓ و علیؓ از حق طلب   ذرۂ عشقِ نبیؐ از حق طلب

زانکہ ملت را حیات از عشقِ اوست   برگ و سازِ کائنات از عشقِ اوست

اور عشق کی یہ قوت ہی مردِ مومن کو قہاری کی صفت بخشتی ہے۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است   مسلم ار عاشق نباشد کافر است

مردِ مومن کے عناصرِ اربعہ میں سے دوسرا عنصر ہے غفاری۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں غفار صفاتِ جمالی میں سے ہے۔ صفاتِ جمالی وہ ہیں جن سے خدا کے رحم و کرم، عفو و درگزر اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ غفور اور غفار کے معنی مختصراً یہ ہیں:

"معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا"

مردِ مومن باوجود غلبہ و سلطانی، قوت و شوکت اور جاہ و جلال کے معمولاتِ زندگی ادا کرنے اور یگانہ و بیگانہ سے معاملہ کرنے میں سراپا رحمت و شفقت ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں مومنین کی صفت یوں بیان فرمائی گئی ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (کفار کے حق میں بہت سخت لیکن آپس کے تعلقات میں بے حد رحم دل اور شفیق ہیں) مومن کو یہ صفت اتباعِ رسولؐ کے صدقے میں اور خدا کی صفتِ غفاری کے پرتو سے میسر آتی ہے۔ دراصل مومن کے سامنے ایک ہی مثالی پیکر ہوتا ہے۔ اور وہ ہے جنابِ رسولِ مقبول صلعم کی ذاتِ متجمع الصفات جن کا پاکیزہ کردار اور اسوۂ حسنہ مکارمِ اخلاق کا واحد نمونہ ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (فرمانِ الٰہی ہے تمہارے لئے رسول پاک صلعم کی سیرت میں بہترین نمونہ موجود ہے)

مردِ مومن صفاتِ قہاری و غفاری کا جامع ہوتا ہے۔ عملی دنیا میں دونوں یکساں مفید اور ضروری ہیں۔ اس میں شدت اور نرمی دونوں پائی جاتی ہیں۔ بقول سعدیؒ ؎ درشتی و نرمی بہم در بہ است

لیکن دونوں کا مصرف و محل جداگانہ ہوتا ہے۔ دراصل تو خدمتِ خلق اس کا وظیفہ و معمول ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ؎

خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق — قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

اس کی محبت و کدورت سب خدا کے لئے ہوتی ہے، اس کا ہر اقدام دوسروں کے مفاد، رفاہِ عام اور خدمتِ خلق کے لئے ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل بے غرض بے لوث، پاک اور نفسانیت سے خالی ہوتا ہے۔ اسی لئے ابنائے زمانہ کے حق میں اس کا وجود خدا کی رحمت ثابت ہوتا ہے۔

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

پُر سوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

وہ رزم گاہِ حیات میں شمشیرِ بے نیام ہوتا ہے تو شبستانِ محبت میں کوئی دوسرا اس سے زیادہ نرم نہیں ہو سکتا۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اسلام بنیادی طور پر محبت اور سلامتی کا پیام دیتا ہے۔ بقول اقبالؒ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

لیکن کارزارِ زندگی میں محبت و اخوت کے ساتھ قوت و شدت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی لئے حضرتِ علامہ رزم گاہِ حیات میں کامیاب ہونے کے لئے قہاری و غفاری کے اوصاف کو حسبِ ضرورت کام میں لانے کا پیام دیتے ہیں:

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مردِ مومن کے لئے تیسرا عنصر قدوسی ہے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قدوس اسمائے الٰہی میں سے ہے یعنی وہ اسمار و صفات جو خدا کی یکتائی بے مثالی، خوبی، بڑائی، قدرت، کبریائی اور نیکی وغیرہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ قدوس کے معنی ہیں پاک، مقدس۔

مردِ مومن خدا پر ایمان لاتا ہے تو اس کے جملہ احکام کے سامنے سر خم کر دیتا ہے۔ وہ عشقِ رسولؐ میں سرشار ہو کر اسوۂ نبویؐ کے اتباع کی بدولت مکارمِ اخلاق سے آراستہ ہو جاتا ہے غیرُ اللّٰہ کی نفی اس کو پاکیِ باطن اور صفائے قلب عطا کرتی ہے۔ اس کے اعمال و اقوال احکامِ الٰہی کے نور سے منور ہو جاتے ہیں اور اس کا قلب بیدار مہبطِ تجلیاتِ الٰہی بن جاتا ہے:

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کراری مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

مومن کا دل ہوا و ہوس، آلودگی و نفسانیت سے پاک ہوتا ہے عشقِ حقیقی کی بدولت اسے دلِ زندہ اور قلبِ سلیم حاصل ہو جاتا ہے جو معرفتِ الٰہی کے نور سے روشن ہوتا ہے۔ اس کی پاکیِ باطن، صفائے قلب اور تنویرِ روحانی اس کو وہ ملکوتی شان اور لاہوتی آن عطا کرتی ہے جس کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں علامہ فرماتے ہیں:

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی

مردِ مومن اتباعِ نبویؐ اور عشقِ رسولؐ کی بدولت وہ پاکی و پاکیزگی حاصل کرتا ہے جو کمالِ انسانیت کے لئے لازم ہے جس کے صدقے میں اس کو بے اندازہ قدرت و قوت میسر آتی ہے فرماتے ہیں:

می ندانی عشق و مستی از کجاست این شعاعِ آفتابِ مصطفیٰؐ ست

زندہ تا سوزِ او در جانِ تست این نگہ دارندۂ ایمانِ تست

باخبر شو از رموزِ آب و گِل پس بزن بر آب و گل اکسیرِ دل

دل ز دین سرچشمۂ قوت است دین ہمہ از معجزاتِ صحبت است

اس گفتگو سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ صفات قہاری و غفاری و قدوسی میں رنگ کر مردِ مومن میں ان صفاتِ الٰہی کا انعکاس ہوتا ہے اور وہ ان کی برکت سے آراستہ ہو جاتا ہے جو اس کی ظاہری و باطنی زندگی کو اسوۂ حسنہ بنا دیتی ہیں۔ انسان کو اخلاق و صفات میں ملاءِ اعلیٰ سے تشبّہ و ہم شکلی کا جوہر عطا کیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کو سوز و گداز اور شوق و آرزو کا جذبہ عطا ہوا ہے۔ بقول علامہ:

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

انہی اوصاف و کمالات کا مجموعہ ہونے کے باعث مردِ مومن نیابتِ خداوندی کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔ خلافتِ الٰہی اور نیابتِ خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و کمالات کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا، اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصبِ خلافت و نیابت کا استحقاق زیادہ ثابت

کرے گا، اور اسی وقت وہ نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا۔ اصل کے اوصاف و کمالات کا یہ عکس کسی فرد میں اس کی اپنی صلاحیت اور پاکیزگی کے لحاظ سے کم و بیش پایا جائے گا۔ مدارجِ روحانی اور کمالاتِ باطنی میں اس درجہ ترقی ممکن ہے کہ پھر بندۂ مومن سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ جائے جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (اللہ کا رنگ!! اور اس کے رنگ سے زیادہ اچھا اور خوشنما رنگ اور کونسا ہو سکتا ہے!!) حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

آدم اصطرلابِ اوصافِ علو است — وصفِ آدم مظہرِ آیاتِ اوست
ہر چہ در وے می نماید عکس اوست — ہم چو عکسِ ماہ اندر آب جوست
خلق را چوں آب داں صاف و زلال — اندرو تاباں صفاتِ ذوالجلال

جب مردِ مومن اپنی پاکباطنی، روشن ضمیری، تنویرِ روحانی اور صفاتِ مستوردہ کی بدولت صفاتِ خداوندی کا مظہر بن جاتا ہے تو اسے وہ کمالِ ارتقائے انسانیت حاصل ہوتا ہے جو اسے مقامِ محمدی تک پہنچا تا ہے۔ حقیقتِ محمدیہ کو الفاظ میں بیان کرنا بے حد دشوار ہے۔ حقیقتِ انسانی کی اصل حقیقتِ محمدی ہے۔ حق تعالیٰ نے سب سے پہلا تنزل حقیقتِ محمدی میں فرمایا۔ رسولِ مقبول صلعم نے فرمایا کہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ یعنی پہلی چیز جو اللہ نے پیدا کی وہ میرا نور ہے۔ نیز فرمایا کہ کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ یعنی میں نبی تھا جب کہ آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔ آپؐ کل موجودات سے اسبق اور کل مخلوقات سے اکمل ہیں۔ آپ اصل ہیں جملہ کائنات کی۔ حدیثِ قدسی ہے لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ یعنی اگر آپ کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں کائنات کو ہی پیدا نہ کرتا۔ آپؐ خلاصۃ الموجودات ہیں۔ جس طرح آدم پر تخلیقِ کائنات ختم ہوئی، آپؐ پر تکمیلِ انسانیت ختم ہوئی۔ دراصل وہ قطب جس پر احکامِ عالم کا دارومدار ہے، اور جو ازل سے ابد تک دائرۂ وجود کا مرکز ہے حقیقتاً ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

مردِ مومن کے وجود کا چوتھا عنصر جبروت ہے۔ اور جبروت کے معنی اصطلاحِ صوفیہ کے مطابق حقیقتِ محمدیؐ کے ہیں۔ اسی لئے اقبال کہتے ہیں:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آپؐ کی ذاتِ والا صفات تک رسائی عشق کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔ عشق کی تکمیل بغیر اسوۂ طیبہ کے کامل اتباع کے ممکن نہیں۔ جس نے آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا مکمل اتباع کیا اُسے آپؐ کی محبت حاصل ہوئی۔ اور جسے یہ سعادت نصیب ہو گئی اسے سب کچھ مل گیا۔

بقولِ علامہ: در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ ست — آبروئے ما زنامِ مصطفیٰؐ ست

ہر کہ از سرِ نبیؐ گیرد نصیب — ہم بہ جبریلِ امیںؑ گردد قریب

مردِ مومن کے لئے واحد مثالی پیکر ذاتِ رسول صلعم ہے۔ جب اسے آپ تک رسائی ہو جاتی ہے تو وہ اس مقامِ بلند تک پہنچ جاتا ہے جس کی تفسیر علامہ اقبال نے اپنے ایک خط میں یوں کی ہے:

"مسلم وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوتِ نورانیہ ہے جو جامع ہے جواہرِ موسویت اور براہیمیت کی۔ آگ اسے چھو جائے تو برد و سلام بن جائے۔ پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔ پانی آگ جذب کر لیتا ہے۔ عدم وجود کو کھا جاتا ہے۔ پستی بلندی میں سما جاتی ہے۔ مگر جو قوت جامع اضداد ہو، اور محلِ تمام تناقضات کی ہو،

اسے کون جذب کرے۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت حیات و موت کو جذب کر کے حیات و موت کا تناقض مٹا چکی ہے۔

..............مسلم مثبت جذبات متناقض یعنی قہر و محبت اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے اور اس کا دائرہ اثر اخلاقی تناقضات تک ہی محدود نہیں، بلکہ تمام طبعی تناقضات پر بھی حاوی ہے۔ جو مسلم جو حامل ہے محمدیت کا اور وارث ہے موسویت اور ابراہیمیت کا، کیونکہ کسی شے میں جذب ہو سکتا ہے۔ البتہ اس زمان و مکان کی مقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے اور اس کی قوت جاذبہ ذوقی اور فطری نہیں، بلکہ مستعار ہے ایک کف پا سے، جس نے اس ریگستان کے چمکتے ذروں کو کبھی پامال کیا تھا۔"

اسی لئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است — اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است — آب و تابش از یمِ پیغمبر است

مردِ مومن یا انسانِ کامل کا جو تصور اقبال نے پیش کیا ہے۔ اس کا مختصر خاکہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ علامہ فرماتے ہیں کہ "انسانِ کامل کی پیدائش سے قبل انسانیت کے لئے جسمانی اور روحانی حیثیتوں سے مدارج ارتقاء کا طے کرنا شرط ہے۔ وہ ابھی ہمارے لئے نصب العین ہے۔ اس زمانے میں خارج میں اس کا وجود نہیں۔"

اقبال کی اصطلاح کے مطابق خودی کی کامل صورت یہی مردِ مومن یا انسانِ کامل ہے یہی شرفِ انسانیت کی معراجِ کمال ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ اس میں "زندگی کی متضاد قوتیں ہم آہنگ ہو جائیں گی۔ اور اس میں قوت اور علم اپنے انتہائی مدارج کے ساتھ موجود ہوگا۔" یہی وہ مقام ہے جسے علامہ نے اپنے اس قطعے میں یوں بیان کیا ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

اسی مرتبے پر مردِ مومن کی تفسیر یوں بھی فرمائی ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

یہی بات مولانائے رومؒ اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

آدمی چوں نور گیرد از خدا — ہست مسجودِ ملائک ز اجتبا

اور اسی مقام پر رضائے بندہ اور مرضیِ حق میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ بقول مولانائے رومؒ:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

علامہ اقبال بھی یہی کہتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

در رضایش مرضیِ حق گم شود — ایں سخن کے باور مردم شود

یہ لطیف نکتہ انسان اس لیے باور نہیں کر پاتا کہ اس کا ادراک حجابات کے پردوں میں ڈھکا رہتا ہے۔ ورنہ خود خدا نے قرآن شریف میں رسول مقبول صلعم کے عمل کو اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ فرمایا ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (جب تم نے مٹھی میں بھر کر پھینکا تھا تو وہ تم نے نہیں پھینکا تھا — تو اللہ نے پھینکا تھا)

الغرض وہ بندۂ مومن جو توحید کا رازدار اور متاعِ مصطفویؐ کا امین ہوتا ہے۔ جو احکامِ الٰہی اور فرمانِ مصطفویؐ کے اتباع کی بدولت جذبۂ عشق کا حامل بنتا ہے۔ عشقِ رسولؐ جس کا زادِ راہ اور قرآنِ عظیم جس کا ساز و برگ ہوتا ہے، اسے وہ شوکت و سطوت نصیب ہوتی ہے جو اسے ساری کائنات پر تصرف و غلبہ بخشتی ہے اور وہ بطنِ گیتی اور سینۂ افلاک کو چیر کر ان کے اسرارِ سربستہ کو حل کرتا اور سلطانِ موجودات بن جاتا ہے۔ بقول اقبال: ع

خودی ہے زندہ تو سلطانِ موجودات

وہ قوتِ عشق کی بدولت انسانیت کے شرفِ کمال تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اب اس کا ایک قدم زمین پر ہوتا ہے تو دوسرا ماورائے افلاک۔ تدبیر و تقدیر اس کے اشاروں پر عمل کرتی ہے۔ وہ عَبْدِہٗ کے درجۂ کمال پر فائز ہو کر بیک وقت نیابتِ خداوندی اور صفاتِ ملکوتی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی کی شان میں علامہ یوں بھی کہتے ہیں:

مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بو   مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر   ہر زماں او را چو حق شانے دگر

نیز فرماتے ہیں:

ہم چناں از خاک خیزد جانِ پاک   سوئے بے سوئی گریزد جانِ پاک
در رہِ او مرگ و حشر و حشر و مرگ   جز تب و تابے ندارد ساز و برگ
در فضائے صد سپہرِ نیلگوں   غوطہ پیہم خورد و باز آید بروں
می کند پرواز در پہنائے نور   مجلسش گیرندۂ جبریل و حور
تا زِ مَا زَاغَ الْبَصَرْ گیرد نصیب
بر مقامِ عَبْدُہٗ گردد رقیب

سید وقار عظیم

عشرتِ پرویز اور غمِ فرہاد

شیریں فرہاد کا قصہ بھی اسی طرح مدتوں سے شاعری کا موضوع ہے جیسے یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، وامق و عذرا، اور ہیر رانجھا کا، کہ جمالِ عشق کی طلبِ صادق کو زمانے کے قید و بند نے اس کے حق سے محروم رکھا، اور دونوں ناموں میں سے ایک حسن اور دوسرا عشق کی علامت بن گیا شاعری میں عموماً بات یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اقبال نے حسن و عشق کے ان افسانوں میں سے ایک میں خصوصیت کے ساتھ اس لئے کشش محسوس کی ہے کہ اس کے مختلف اجزا میں بعض ایسے رنگ جھلکتے ہیں جو اقبال کے فلسفۂ حیات کے رنگوں سے ہم آہنگ ہیں۔ —— شیریں فرہاد کے قصے کے چار اجزا ہیں شیریں اور فرہاد کی شخصیتوں کی حیثیت تو وہی ہے جو محبت کے دوسرے افسانوں میں چاہنے والے اور چاہے جانے والے کی ہوتی ہے۔ اس قصے میں شیریں اپنی شانِ محبوبی کے باوجود ایک خاموش اور غیر فعّال بت یا مجسمہ ہے اور اس سے اقبال کے فکر انگیز تخیل کو کوئی تحریک نہیں ہوتی۔ فرہاد کا کردار البتہ دوسرے مثالی عاشقوں کے کرداروں سے مختلف نظر آتا ہے، اس لئے کہ اس کا بے لوث عشق محض بادیہ پیمائی اور چاک دامانی کو اپنے مقصود کی معراج نہیں سمجھتا۔ وہ وصالِ محبوب کی دولتِ بیدار کے حصول کے لئے محض تقدیر کے معجزات کا منتظر ہو کر نہیں بیٹھ جاتا۔ اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے اور محبوب کے درمیان ایک کوہِ گراں حائل ہے تو کسی اور کے سہارے کا محتاج ہونے کے بجائے اپنے دست و بازو کی قوت کو آزماتا اور کوہ کنی کے صبر آزما عمل میں تیشے کو اپنا رفیق و دمساز بناتا ہے۔ اقبال کا نکتہ بیں اور دقیقہ رس فکر اس کی اسی ادائے دلنواز پہ فریفتہ ہو جاتا ہے اور پھر اقبال کی شاعری کے ہر دور میں دنیائے عاشقی کا یہ بطلِ عظیم وہی کارنامے انجام دیتا ہے جو اقبال نے اپنے مثالی انسان کے لئے خاص کئے ہیں۔ فرہاد کا ذکر اقبال کی اردو شاعری میں سب سے پہلے اس وقت آتا ہے جب کوہکن کے حوالے سے زندگی کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے وہ "جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں" کو اس کے اجزا قرار دیتے ہیں:[۵۰]

بانگِ درا کے اس شعر میں جس طرح زندگی کا مفہوم حقیقت کی بے رنگ سادگی کے ساتھ بیان ہوا ہے اسی طرح کوہکن سے نسبت بھی کوئی معنوی گہرائی اور گیرائی نہیں۔ اس شعر میں کوہکن اس شخص کی علامت ہے جسے اپنا گوہرِ مقصود حاصل کرنے کی لگن ہے۔ "جوئے شیر" اس کا وہ گوہرِ مقصود ہے کہ وہ مل جائے تو گویا محبوب مل گیا۔ "سنگِ گراں" وہ رکاوٹیں ہیں جو گوہرِ مقصود یا گوہرِ مراد کے حصول کے راستے میں حائل ہیں اور "تیشہ" وہ دستِ جفاکش ہے جو اپنی محنت و مشقت سے اس سنگِ گراں کو کاٹ کر طالب کے لئے مطلوب تک پہنچنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔

اقبال کے پورے فلسفۂ حیات میں انسانی زندگی کی حیثیت ایک مثلث کی سی ہے جس کی تکمیل تین اجزا سے ہوتی ہے۔ اس مثلث کا ایک ضلع یا اس فلسفے کا ایک جزو وہ منزلِ مقصود ہے جس پر پہنچے بغیر زندگی حسن اور معنویت سے خالی رہتی ہے۔ دوسرا جزو وہ سختیاں اور صعوبتیں ہیں جو منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ کا کانٹا بنتی ہیں اور تیسرا جزو وہ لگن جس کا نام کبھی شوق ہے، کبھی آرزو اور کبھی عشق جو منزل تک پہنچنے کی تڑپ کو

---

۵۰ زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی (خضرِ راہ)

زندہ و بیدار رکھتی اور وہ قوت عطا کرتی ہے کہ انسان پہاڑوں کے سینے چیرتا اور خارزاروں کو کچلتا روندتا آگے بڑھتا اور منزلِ مقصود سے قریب ہوتا رہتا ہے۔ اقبال جن کا ذہن حکیمانہ اور قلب شاعرانہ ہے اپنے فلسفیانہ مثلث کی تکمیل میں ان بہت سی علامتوں سے کام لیتے ہیں، جو شاعری کی روایت نے انہیں دی ہیں۔ ان علامتوں کو حکمت کے اظہار کا وسیلہ بناتے ہوئے اقبال نے انہیں نیا مفہوم بھی دیا ہے اور ان کے امکانات کا سراغ بھی لگایا ہے جو دوسروں کی نظر سے پوشیدہ رہے۔

ان علامتوں میں سے بعض ایسی ہیں جنہیں ہم تلمیحات کہتے ہیں۔ اقبال نے ان تلمیحات میں سے بعض میں معانی کا ایک ایسا سلسلہ دریافت کیا ہے کہ وہ ان کی محبوب بن گئی ہیں اسی طرح کی تلمیح شیریں فرہاد کا واقعہ ہے جس کے مختلف اجزا فلسفۂ اقبال کے گوناگوں پہلوؤں کے اظہار کا موثر اور دلنشیں ذریعہ بن گئے ہیں۔ ان اجزا میں سے ایک یعنی شیریں سے اقبال نے بہت کم کام لیا ہے، لیکن دوسرے اجزا یعنی فرہاد و پرویز بھیس بدل بدل کر سامنے آتے ہیں اور ہر دفعہ ایک نئے جہانِ معنی کی طرف اشارہ کرکے چلے جاتے ہیں۔ اقبال کی شاعری نے فرہاد کو اور اس سے کمتر درجے پر پرویز کو بعض ایسے اوصاف کا مظہر بنا کر پیش کیا ہے کہ جب تک ان کے شعر ایک مخصوص فلسفۂ حیات کی تفسیر و تعبیر کی خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ فرہاد و پرویز کی شخصیتوں کا نقش ماند نہیں پڑے گا۔ "غمِ فرہاد" و "عشرتِ پرویز" کی حکایت نئے نئے اسالیب میں بیان ہوتی رہتی ہے۔[1]

"غمِ فرہاد" و "عشرتِ پرویز" کی حکایت میں فرہاد اور پرویز تو اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہی ہیں، تیشے نے بھی کہ ایک بے جان چیز ہے ایک اہم حصہ لیا ہے۔ ترقی کے مختلف مدارج و مراحل طے کرنے اور عروج کی منتہا تک پہنچنے کے لئے انسانی خودی کو کارگہِ حیات میں مسلسل کشمکش اور جد و جہد میں مصروف رہنا ہوتا ہے۔ ماحول کی تسخیر کا جو فریضہ انسان کو اپنے اعلیٰ منصبِ حیات کی مناسبت کی بنا پر انجام دینا ہے اس کا تقاضا ہے کہ انسان سخت کوشی کو اپنا شعار اور سخت جانی کو اپنی فطرتِ ثانیہ بنالے کہ اسی کی بدولت علم کے سربستہ خزانوں کی کلید اس کے ہاتھ آتی ہے اور اسی کے طفیل وہ اس لعلِ بے بہا کا مالک بنتا ہے جو دلِ سنگ میں پوشیدہ و پنہاں ہے۔ کشمکش، جد و جہد، محنتِ پیہم و سخت کوشی کے اس عمل میں انسان کو جس آلۂ کار کی ضرورت ہے اس کا سب سے موثر مظہر تیشہ ہے۔ عشق گرہ کشا اپنا فیض عام کرنے کے لئے جس وسیلے کی مسلسل رفاقت کا طالب ہے، وہ وسیلہ بھی اقبال کے شعروں میں تیشے کا نام پاتا ہے۔ "تیشہ" کس کس طرح ان گوناگوں تصورات کی وضاحت کا آئینہ بنتا ہے اس کا عکس اقبال کے شعروں میں اس طرح نظر آتا ہے:

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا　　روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

(ضربِ کلیم صفحہ ۱۳۱)

ندارد عشق سامانے و لیکن تیشۂ دارد　　خراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویز است

(زبورِ عجم صفحہ ۱۶)

تیشہ اگر بسنگ زد این چہ مقامِ گفتگوست　　عشق بدوش می کشد سینۂ کہسار را

(زبورِ عجم صفحہ ۷۳)

اقبال نے اپنے نظامِ فکر میں خودی کے لئے اوامر و نواہی کا ایک سلسلہ مرتب کیا ہے۔ سلسلۂ نواہی میں سرِ فہرست یہ بات ہے کہ انسان کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرے تو اس کی خودی کو ضعف پہنچتا ہے۔ فرد اور جماعت یا فرد اور قوم دونوں پر اس پابندی کا اطلاق ہوتا ہے۔

---

[1] بہر زمانہ بہ اسلوبِ تازہ می گویند　　حکایتِ غمِ فرہاد و عشرتِ پرویز　　(پیامِ مشرق صفحہ ۲۰۲)

اقبال جس طرح محتاجی یا گداگری کو فرد اور جماعت دونوں کے لئے خودی کا دشمن کہتے اور دونوں کو جس سے بچنے اور محفوظ رہنے کی تاکید و تلقین کرتے ہیں۔ وہ محض حصولِ معاش تک محدود نہیں جسمانی اور مادی ضروریات سے بڑھ کر تمدنی اور تہذیبی لوازم کے حصول اور اختیار کے لئے بھی افراد اور اقوام کو دوسروں کا دستِ نگر، محتاج اور مقلد نہیں ہونا چاہئے۔ انسان کے لئے سیدھا، سچا اور ترقی کا راستہ وہ ہے جس کا سرچشمہ خود اپنے وسائل اور روایات ہیں، خود اپنی تاریخ اور تہذیب ہے، خود اپنا ماضی، اور اس ماضی میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والی قدریں ہیں۔ جو راہ دوسروں کی بتائی اور دکھائی ہوئی ہے وہ انسان کو ترقی کے اوج اور کمال تک نہیں لے جاتی، اسے منزلِ مقصود سے دور البتہ کرتی چلی جاتی ہے۔ اقبال نے فرہاد کے تیشے سے اپنے اس تصورِ حیات کی وضاحت میں مدد لی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش ‌ ‌ ‌ براہِ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دستِ تو کارِ نادر آید ‌ ‌ ‌ گناہے ہم اگر باشد ثواب است ‌ ‌ ‌ (پیامِ مشرق، ۹۲)

جس طرح اقبال نے دوسروں کی راہ پر چلنے کو عذاب بتاتے ہوئے تیشے کی مدد سے اپنی راہ آپ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے کہ زندگی کی یہی شان ہے، اسی طرح نئی زندگی کی طبقاتی کشمکش کے پیدا کئے ہوئے مسائل کی تفسیر و تعبیر کرتے ہوئے بھی بار بار تیشے کو فکر کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ نئے دور کی اس کشمکش میں ناتواں نے اپنی ناتوانی کے احساس سے نجات حاصل کر کے قوی سے اپنا صدیوں کا چھنا ہوا حق چھیننے کا تہیہ کیا تو قوت کو اس کی جرأت و ہمت کے آگے سر جھکانا پڑا لیکن اس جھکے ہوئے سر میں غرور کا سودا اب بھی پرورش پا رہا ہے۔ غریب و ناتواں تیشہ زنی و کوہ کنی کرنے کے باوجود امیر اور قوی کا زیر دست ہے۔ ان سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حقائق کے اظہار میں بھی اقبال نے جس قدیم فرسودہ اور روایتی شاعرانہ علامت سے بڑے حسین اور پرمعنی انداز میں کام لیا ہے، وہ تیشہ ہے۔ پیامِ مشرق میں کوہکن کی زبان سے اس ناقابلِ تردید لیکن تلخ حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں ہوا ہے ؎

اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد ‌ ‌ ‌ ہنوز گردشِ گردوں بکامِ پرویز است

ز خاک تا بفلک ہر چہ ہست رہ پیماست ‌ ‌ ‌ قدم کشادہ کہ رفتارِ کارواں تیز است ‌ ‌ ‌ (پیامِ مشرق، ۲۴۰)

کوہکن کو اپنے تیشے کی کوہ کنی پر بڑا ناز ہے لیکن اسے اس کا غم ہے کہ اس کی کوہ کنی و خارا شگافی کے باوجود زندگی پرویز کے دستِ تصرف میں ہے۔ خود اقبال کی نظر بھی اس دلخراش حقیقت پر ہے، اس لئے بڑی افسردگی اور دردمندی کے ساتھ وہ تیشے کی بدنصیبی کا ذکر ایک جگہ اس طرح کرتے ہیں ؎

تیشے کی کوئی گردشِ تقدیر تو دیکھے ‌ ‌ ‌ سیراب ہے پرویز، جگر تشنہ ہے فرہاد ‌ ‌ ‌ (ارمغانِ حجاز، ۲۴۱)

اسی جذبے اور احساس کے تحت وہ تیشے کی اس ضرب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جس سے کوہ کا سنگِ خارا پاش پاش نہ ہو جائے۔ ان کے نزدیک تو ضربِ کاری صرف وہ ضرب ہے جو پرویز کی حاکمیت اور اقتدار کی بنیادوں کو ہلا کر اس کی موت کا سبب بن سکے۔ تیشہ جو سعیِ پیہم اور کشاکشِ مسلسل کی ٹھوس عملی علامت ہے، اگر اپنا کام بر کر نہ سکے تو زندگی کے خزینے میں جو ہزار ہا لعل و گوہر مستور ہیں، انسان ان کے نور و تابانی سے محروم رہے، اور حق کے راستے میں جو بے شمار سنگِ گراں حائل ہیں، ان سے نیکی کا سفر رک جائے۔ علم کا نور جہل کی ظلمتوں میں چھپ کر رہ جائے اور قیصری و چنگیزی کے عفریت نئے نئے بھیسوں میں اور نئے نئے ناموں سے انسان کو ظلم، جبر اور استبداد کے شکنجوں میں کستے اور روح کو موت کی مرگِ ناگہاں کی منزلِ آخر کا راستہ دکھاتے رہیں۔

اقبال کو فرہاد ہر عاشق سے زیادہ اسی لئے عزیز ہے کہ اس کے ہاتھ میں تیشہ ہے اور اس تیشے سے وہ ہر زمانے میں باطل پر ضرب لگاتا رہا ہے۔ ابھی دنیا میں تیشے کا کام ختم نہیں ہوا اور یوں گویا فرہاد کا کام ختم نہیں ہوا۔ زندگی کے ہر گوشے میں کوہکنی کو بھی جاری رہنا ہے اور خارا شگافی کو

بھی، اور یہ منصب فرہاد کو ادا کرنا ہے جس کا رفیق دائمی اس کا تیشہ ہے۔

فرہاد کا ذکر اقبال کے فارسی اور اردو کلام میں بار بار آیا ہے لیکن اس ذکر میں عموماً پرویز اس کے ساتھ شامل ہے۔ اس لئے کہ اقبال نے فرہاد و پرویز کے کرداروں کے ساتھ اچھے اور برے جو صفات اور اقدار وابستہ کئے ہیں انھیں ابھارنے کے لئے دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل لانا ضروری سا ہے۔ ایسے موقعوں پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال پرویز کے نہیں فرہاد کے وکیل ہیں اور اُسے زندگی میں جو مقام دینا چاہتے ہیں وہ اتنا اعلیٰ وارفع ہے کہ پرویز کی پستی اس بلندی تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وکالت کا یہ منصب ادا کرتے ہوئے اقبال کے بیان میں ابہام کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بات مکمل کر کہی جاتی ہے اور پورے ایقان کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ اس طرح کا ایک شعر ہے ؎

در عشق و ہوسناکی دانی کہ تفاوت چیست   آں تیشۂ فرہادے، ایں حیلۂ پرویزے   (پیام مشرق ۱۹۱)

کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ اقبال نے فرہاد کا نام نہیں لیا بلکہ اس کی شخصیت کے کسی ایسے پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جو فرہاد اور پرویز کے تلمیحی واقعے میں اساسی طور پر موجود ہے اور شاعری کا موضوع بنتا رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر فرہاد کی شخصیت سنگ خارا کو آب کر دینے اور سینۂ کہسار کو چاک کر دینے والے محنت کش اور صاحبِ عزم عاشق کی شخصیت ہونے کے بجائے "حیلۂ پرویزی" میں مبتلا ہونے والے مجبور و مظلوم انسان کی ہوتی ہے اور اقبال ایک حیات بخش پیغام کی نویدِ جاں فزا سنا کر اس کے دلِ خاموش کو عزم کی ایک نئی چنگاری سے گرمانا چاہتے ہیں کہ یوں وہ پرویز سے اپنی دولتِ گم گشتہ چھین سکے۔ "پیامِ مشرق" کی نظم "صحبتِ رفتگاں" میں جہاں اقبال کے تخیل کارل مارکس کی زبان سے بعض نکتے کی باتیں کہلوائی ہیں وہ مزدک کو فرہاد سے مخاطب دکھاتے ہیں اور یہاں مزدک فرہاد کو مزدک یا کوہکن نہیں کہتا۔ شعر یہ ہیں ؎

دانۂ ایراں ز کشتِ زار و قیصر بر دمید   مرگ نو می رقصد اندر قصرِ سلطان و امیر
مدتے در آتشِ نمرود می سوزد خلیل   تا تہی گردد حریمش از خداوندانِ پیر
دورِ پرویزی گزشت اے کشتۂ پرویز خیز   نعمتِ گم گشتۂ خود را ز خسرو باز گیر

یہاں کشتۂ پرویز، فرہاد کوہکن کا نمائندہ ہی سہی کہ یہ ایک مسلّمہ شاعرانہ اور تخیلی حقیقت ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ وہ اس طبقہ کی علامت ہے جس نے زندگی کے ہر دور میں باطل کی قوتوں کا مقابلہ کیا اور انھیں شکست دے کر حق کے پرچم کو بلند رکھا ہے۔

کشتۂ پرویز میں فرہاد ایک بالواسطہ علامت کی حیثیت سے ہمارے ذہن میں اُبھرتا ہے لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ اقبال نے فرہاد کی کوئی ایسی تصویر بنائی ہے جس میں اس کی شخصیت کے سارے نقوش اُبھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں یا اس کی شخصیت کا ایک نقش اتنا گہرا ہو کر ابھرتا ہے کہ ہم فرہاد کو اس کے پورے قد و قامت کے ساتھ نظرِ قلب اور ذہن کی گہرائیوں میں جذب ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ ایک تصویر تو وہ ہے جو پیام مشرق والی نظم "صحبتِ رفتگاں" میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل اور مزدک کے بعد ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہاں فرہاد عاشقِ صادق بھی ہے اور اولوالعزم اور بلند حوصلہ کارکن بھی جو بڑے جذبے کے ساتھ اپنے شوقِ فراواں کا ذکر کرتا ہے۔ بڑے فخر و ناز سے اپنی تیشہ زنی کے کارنامے کی داستان دہراتا ہے اور اس تلخ حقیقت کے احساس کے ساتھ کہ شوقِ فراواں کے باوجود اس کی آغوش محبوب کی ہم کناری سے محروم ہے اور اس کی تیشہ زنی کے باوجود زندگی پر پرویزی کا غلبہ ہے۔ وہ ایک تازہ عزم کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود کی طرف گامزن دکھائی دیتا ہے ؎

قدم کشائے کہ رفتارِ کارواں تیز است

نیز: نظم میں آمدہ وہ باتیں حکیم فرانسوی اگسٹس کومٹ اور مرد مزدور — پیامِ مشرق — صفحہ ۲۴۴، اقبال نے مردِ مزدور کی زبان سے وہ باتیں

کہلاتی ہیں جنہیں "مسلک فرہادی" کی اساس کہنا چاہیے۔ "مرد مزدور" حکیم کے اندازِ فکر پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ زندگی کے مستقبل کا انحصار صرف تیشہ زنی اور کوہ کنی پر ہے۔ مردِ مزدور کے کلمات میں سے چند بڑی وضاحت سے اس مسلک کی وکالت کرتے ہیں جنہیں ہم نے مسلک فرہادی کہا ہے ؎

فریبی بہ حکمت مرا اے حکیم   کہ خورجیم شکست ایں طلسمِ قدیم
مس خام را از زر اندودۂ   مرا خوئے تسلیم فرمودۂ
کند بحر را آبنایم اسیر   ز خارا برد تیشہ ام جوئے شیر
حق کوہکن دادی اے نکتہ سنج   بہ پرویز پرکار نابردہ رنج
....
... .
جہاں راست بہ رزق از دست مرد   ندانی کہ ایں ہیچ کار است دزد   (مرد مزدور)

اقبال کی شاعری میں مسلک فرہادی کو کوہکنی بھی کہا گیا ہے اور خارا شگنی بھی، اس لئے کہ محنت کشی و سخت کوشی ہی فرہاد یا کوہکن کی سیرت اور کردار کا سب سے بڑا وصف ہے۔ اسی وصف نے اسے حیاتِ جاوداں بخشی ہے اور اقبال کے فلسفۂ خودی اور خودی کے ارتقاء کے سفر میں شوق اور آرزو کے مختلف مرحلوں میں یہی وصف انسان کے لئے مشکل کشائی کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ لیکن شعر اقبال میں بہ حیثیت مسلک "پرویزی" کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس لئے کہ اس کی تشکیل جن گوناگوں عناصر سے ہوتی ہے وہ نتائج و اثرات کے اعتبار سے زماں گیر بھی ہیں اور مکاں گیر بھی۔ ان میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ پرویزی کے عناصر اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالعموم تخریبی ہیں لیکن اقبال کی حق بین نظر نے اس میں عظمت، شکوہ اور عالی مرتبتی کی ایک شان بھی دیکھی ہے اور اس شان کا ذکر عشق و فقر کے سیاق میں بھی کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی   کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز   (بال جبریل ۲۵)

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ   ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنتِ پرویز   (بال جبریل ۴۲)

"زبورِ عجم" میں ایک چھوٹی سی نظم ہے "یا چناں کن یا چنیں"۔ اقبال اس نظم میں باری تعالیٰ سے مخاطب ہیں اور شوخی کے اسی انداز خاص میں مخاطب ہیں جس پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ ہم سے پوچھئے تو وہ خدا سے اس طرح کی باتیں کہنے کی جسارت کرتے ہیں ؎

یا مسلماں را مدہ فرماں کہ جاں بر کف بنہ
یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں
یا چناں کن یا چنیں!

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک
یا دگر ابلیس بہر امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کن یا چنیں!

ان چند "متضاد باتوں" سے جو اس نظم میں کئے گئے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ ع

نقر بخشی ؟ با شکوہِ خسروِ پرویز بخش!

اقبال کی شاعری میں "پرویزی" انداز ملوکانہ، سلطنتِ پرویز اور شکوہِ خسروی کی علامت ہے۔ لیکن "پرویزی" کو اس کی عظمت کا حق دینے کے باوجود اقبال نے اس کے مزاج کی ان خستہ صفتوں کو جی کھول کر ہدفِ ملامت بنایا ہے جن سے معاشرتی زندگی میں تن آسانی اور عشرت پسندی کے علاوہ حقدار کا حق چھیننے کی رسم کا آغاز ہوتا ہے۔ عشرتِ پرویز کے ثمرات محدود ہیں کہ عموماً ان سے ایک ذات متاثر ہوتی ہے۔ جبکہ پرویزی کا دستِ تطاول عشق کی دنیا تک پہنچتا اور عشق کو ہوس کی بنا تا ہے۔ طریق کوہکن میں اپنا زہر ہلاہل شامل کر کے اس کا زور بازو چھینتا ہے اور افرنگ کو ان حربوں سے "تریاکِ فرنگ کی رنگین ضربوں سے فضا" فرہادوں سے کو بخشی گئی ہے ؂

زیاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ

زیاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ (از بورِ عجم ۱۰۹)

اقبال کی حقیقت بینی نے تیشے کو باطل پر ضرب کاری لگاتے اور اس ضرب کے اثر سے کوہ وجبل کو پارہ پارہ ہوتے دیکھا۔ ان کی حق پسندی نے فرہاد کوہکن اور خارا شگافی کی داد دی اور پرویز کی خسروی و ملوکیت کے شکوہ و جلال کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی حیلہ گری کا پردہ فاش کیا اور زندگی کے مثلث میں جس ضلع کی جو حیثیت ہے، اُسے واضح کر کے دکھایا۔ لیکن ان کا حکیمانہ نظامِ فکر ہمارے سامنے جس اعلیٰ مثالی اور یقینی زندگی کا تصور و تخیل پیش کرتا ہے اس میں "پرویزی" فنا ہو جانے والی اور کوہکنی ہمیشہ زندہ رہنے والی حقیقت ہے ؂

فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک باقی نہیں دنیا میں ملوکیتِ پرویز

عشرتِ پرویز اور غمِ فرہاد کے مراتب کے تعین میں بھی اقبال نے غمِ فرہاد کا پلڑا بھاری رکھا ہے ؂

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

اندریں گویا محبت کے مقابلے اور ملوکیت سے شکست کھا جانے والا فرہاد زندگی کی کشمکش کے مقابلوں میں فاتح ہے اور پرویز مفتوح کہ ایک نام نے اپنا رشتہ عاشقی کے ساتھ جوڑا ہے اور دوسرے کا نام بوالہوسی کی علامت ہے۔ ایک کے حصے میں زندگی کی عشرتیں آئی ہیں کہ وہ فانی ہیں اور دوسرے کو غم کی دولت ملی ہے کہ وہ جاودانی ہے۔

جمیلہ شاہین

عورت — اِقبال کی کمزوری؟

گذشتہ نصف صدی کی اردو تنقید میں اس غلط فکری کو ایک مسلمہ حقیقت کا درجہ دیا جا چکا ہے کہ مفکر اور شاعر کی حیثیت سے اقبال کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ عورت اس کی کمزوری نہیں ہے۔ میں اقبال کو کمزوریوں سے بالاتر نہیں سمجھتی مگر میرے خیال میں اقبال کی یہ نام نہاد کمزوری ہی ان کی فکری عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے جس زمانے میں اقبال قومی مصائب پر تنہائی دلسوزی سے تخلیقی غور و فکر میں مصروف تھے، چند مصلحین مظلومیٔ نسواں جیسے ضمنی مسائل کو اہم ترین مسائل مان کر گرمیٔ گفتار کے جوہر دکھا رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی نذیر احمد کی تعلیمِ نسواں کی تحریک، آزادیٔ نسواں کی تحریک کا روپ دھار چکی تھی اور نئے زمانے کے ڈپٹی نذیر احمد اپنی ہیروئن کو بغاوت کا درس دے رہے تھے:

ارضِ مشرق کی سدا رنج میں گھلتی عورت
کب ترا سوگ مٹا، درد ترے دل کا گیا
تیری بیکار سے چولہا، تو فراغت سے بچے
کوئی مصرف ہی نہیں جسم کے مصرف کے سوا
چار دیواری میں کھیلا ہوا جوبن تیرا
یہیں پروان چڑھا اور یہیں جلتا رہا

اور اس بات کا جشن منا رہے تھے کہ اب:

اک نئے دور کی بنیاد اٹھانے کا پیام
میرے ہی نام نہیں، تیرے بھی نام آیا ہے
میں ترے ساتھ رہوں گا، وہ گھڑی آئی ہے
تو میرے ساتھ چلے گی وہ مقام آیا ہے
اک ترے ہاتھ کی ضو اک تیری تمشیہ کی تاب
ہاتھ میں تیغ ترے تیغ دو دم بنتی ہوئی
ان روایات کو جو تو نے ضیا تاب کیا
نظر آئے گی زمیں رشکِ ارم بنتی ہوئی

(پورب دیس کی ناری۔ مخمور جالندھری)

عورت کو آنچل سے پرچم بنانے کی ترغیب دینا روشن خیالی اور ترقی پسندی کی ایسی زوردار دلیل ہے کہ مظلومیٔ نسواں سے اذیت پرستانہ خوشی حاصل کرنے والے بھی مہر بہ لب ہیں۔ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ رجعت پسندی اور تنگ نظری کے طعنوں سے ڈرے بغیر عورت کو اس تحریک کے مضمرات سے آگاہ کرتے ہیں اور اس تحریک کے ظاہری رومانوی دلکشی کے بجائے اس کے منطقی انجام کی جانب متوجہ کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں:

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟ مرد بے کار و زن تہی آغوش!

اقبال کے نزدیک یہ تحریک صرف انسانی معاشرے ہی کے لیے ہلاکت آفریں نہیں بلکہ فطرتِ انسانی کے بنیادی تقاضوں سے بھی ناآشنا ہے۔ اقبال خوب جانتے ہیں کہ عورت نے جس راہ کو آزادی کی راہ سمجھ کر انتہائی جوش و خروش کے ساتھ اختیار کیا ہے اس پر ان گنت غلامیوں کے جال بچھے ہوئے ہیں چنانچہ وہ غلامیٔ نسواں پر لرزہ براندام ہونے کے علاوہ یہ سوچنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں:

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

جب سے لے کر اب تک برصغیر کی عورت کی بصیرت اس راز کو فاش کرنے میں ہمہ تن محو ہے۔ اس راز کو فاش کرنے کی جد و جہد کے دوران کی عورت کن نتائج سے دوچار ہوئی اس کا تذکرہ میں آخر میں کروں گا۔ فی الحال دیکھنا یہ ہے کہ یہ سوالات اٹھانے پر اقبال کی جو ملامت اور مذمت ہوئی اس کی نوعیت کیا ہے۔

ملامت باری اس بارے میں تین تنقیدی رویے ملتے ہیں۔ پہلا رویہ ان اقبال پرستوں کا ہے جو روشن خیالی اور ترقی پسندی کے زعم میں فکرِ اقبال کے اس حصے سے اختلاف رکھتے ہیں اور جب اس اختلاف کو چھپانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو معذرت کا لہجہ اختیار کرتے ہیں کہ صاحب جانے دیجیے اقبال بھی آخر انسان تھے غلطی ہو ہی گئی۔ مجھے ان نقادوں سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسرا رویہ اشتراکی مادیت کے اسیر نقادوں کا ہے جو عورت کے ساتھ وابستہ تقدس اور معصومیت کی اقدار کو جاگیردارانہ ریاکاری قرار دیتے ہیں اور عورت کو بھی ایک "چیز" گردان کر سماج کی مادی ترقی کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں ان کی بات بھی نہ چھیڑوں گا کیونکہ خود اقبال نے مثبت اور منفی ہر دو اعتبار سے ان تنقیدوں کا انتہائی موثر جواب لکھ رکھا ہے اور قرآن کا ہر قاری اقبال کے جواب کی روشنی میں ان اعتراضات کی فرسودگی سے آگاہ ہو سکتا ہے تیسرے رویے کی نمائندگی وہ نقاد کرتے ہیں جو نفسیات کے مطالعے کے دوران اپنی ہی نفسیات خراب کر بیٹھے اور اب اقبال کی شاعری اور فکر کو Case History جان کر اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اگر یہ اصحاب اپنی تحقیقات کو ادبی تنقید کے زمرے میں شامل نہ کرتے تو مجھے ان سے بھی کوئی کلام نہ ہوتا مگر اس کا کیا علاج کہ اقبال پر ڈاکٹر محمد اجمل کے مختصر مضمون کے بعض مندرجات کو اردو تنقید میں سند کا درجہ مل چکا ہے۔

یہ حقیقت کہ اقبال کے ہاں عورت مرد کی شیطنت کے روپ میں کبھی نظر نہیں آتی، ڈاکٹر اجمل کے نزدیک اقبال کے ایک نفسیاتی مرض کی پیداوار ہے اور وہ نفسیاتی بیماری یہ ہے کہ اقبال برسے بھرے جذبات سے لبریز عورت سے گھبراتا ہے جس کی وجہ سے

"وہ رومانی تباہی کی دفع مدار شدت جو روحی سے کملاتی ہے

یک دست جام بادہ و یک دست زلفِ یار رقصے چنیں میانۂ میدانم آرزوست

> اقبال کے ہاں نظر نہیں آتی۔ اقبال کے ہاں محبت کا ذکر تو بہت ملتا ہے لیکن اس کی محبت آفاقی قسم کی ہے۔ یہ گوشت پوست کے انسانوں کی محبت نہیں۔ اقبال کی شاعری میں عورت نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری میں ایک ایسا خلا ہے جسے کوئی نسوانی یا جنسی جذبہ پُر نہیں کر سکتی۔ اقبال کی نظر میں عورت ایک حقیر ہستی ہے۔ انسانی خودی کا منفی عورت کو محض ثانوی حیثیت دیتا ہے۔ انسانی خودی کی حکمت سے پر اعتماد رکھنے والا شاعر جو خدا کی تقدیر کو خودی [illegible] کے تابع کر سکتا ہے، عورت کو خاطر میں نہیں لاتا ...... لیکن عورت کے لئے جذبۂ حقارت کا منطقی نتیجہ کیا ہے؟ یہی کہ خودی کے اندر جو ابلیس مضمر ہے، اقبال کو اس کا شعور نہیں ہے۔ اس ابلیس میں جنس کا خروش، سرکشی، طوفان اور شورش موجود نہیں۔ یہ ایک نہایت پارسا قسم کا ابلیس ہے۔ اقبال کو ابلیس جنسی آلائشوں سے منزہ معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعری کی عمر اس دور کی طرح ہے جو لڑکپن یعنی تین برس سے دس بارہ برس تک آتا ہے۔ یہ دور جنسی آرزوؤں سے کسی قدر محروم ہوتا ہے۔"
> (اقبال۔ ایک ماہر نفسیات کی نظر میں ــ مطبوعہ قومی زبان)

اگر اقبال، از عطیہ فیضی اور حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور، از پروفیسر محمد عثمان جیسی دستاویزات موجود نہ ہوتیں۔ تو شاید اس طرح کے انکشافات اردو تنقید کے عجائبات میں ہی شمار ہوتے۔ اس لئے کہ اقبال کے ہاں عورت کا مرد کی شیطنت کے روپ میں نظر نہ آنا اس بات کا غماز نہیں کہ اقبال عورت سے ڈرتے تھے اور مارے خوف کے عورت کو حقیر گردانتے تھے بلکہ اس انداز نظر کا کرشمہ ہے کہ عورت کا سب سے اہم اور بنیادی کردار ماں کا ہے اور ماں کبھی گناہ اور آلائش کی علامت نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے نظامِ فکر میں عورت کا مقام کیا ہے؟ یہ جاننے کے لئے اقبال کی نسبتاً کم معروف کتاب Stray Reflections کا ایک اقتباس دیکھنا ہوگا:

> "ایک معاشرے کی حیثیت سے ہمارا اخلاقی و مذہبی عقیدوں پر مبنی ہے۔ مذہبی اصولوں پر جونہی زد پڑتی ہے ذہنی پستی ہے ہمارا معاشرتی تشخص معدوم ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہمارا انجام بھی یہودیوں جیسا ہوگا۔ ہم اس گراوٹ کو [illegible] روکنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ ایک معاشرے میں مذہب [illegible] کا معدن کون ہے؟ عورت! [illegible] عورتوں کو گہری مذہبی تعلیم دلانی چاہیے کیونکہ معاشرے کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ یہ تعلیم جو کسی قطعی نظام میں یقین نہیں رکھتی، ہمارے معاشرتی نظام کی روشنی میں [illegible] تمام مذہبی تعلیمات [illegible] ایک مسلمان لڑکی کو درجۂ نسوانیت سے گرا دیا اسلام سے دور پہنچا دیا۔ اس کے نصاب سے خارج ہونے چاہئیں [illegible] ہمارے ماہرین تعلیم ابھی تک تاریکی میں بھٹک رہے ہیں۔ [illegible] تصورات [illegible] مذہبیت اور وطنیت کے مابین فرق کو [illegible] حاصل نہیں ہوتا۔ اسلام ایک نسبتاً تجریدی تصور یعنی مذہبیت قومیت کا تانا بانا بنتا ہے اور مغرب کے تصور قومیت کی اساس مادی چیز یعنی مملکت ہے۔"

[illegible] کا مسئلہ یہ ہے کہ مغرب کے بعض نقادوں نے بعض مغربی شعراء کے فن پر بحث کرتے ہوئے جو تنقیدی سانچے وضع کئے، ڈاکٹر اجمل اقبال کے فکر و فن کو بھی ان سانچوں کی حدود واسطے میں کرنا چاہتے ہیں۔ عیسائی دانشوروں کے ہاں انسان کے زوال کا تصور بنیادی اہمیت رکھتا ہے جبکہ اقبال نے قرآن کی زبانی میں عورت کو مجسم گناہ نہیں سمجھا۔ پیغام [illegible] میں اقبال نے واضح طور پر کہا ہے کہ حوا نے آدم کو جس پیڑ کا پھل کھانے کی دعوت دی تھی وہ علم کا پیڑ تھا۔ اس لئے یہ پھل چکھنے کے بعد آدم میں آزادی و اختیار کا جو شعور بیدار ہوا وہ انسان کے ازلی گناہ کی نہیں، انسان کی ذہنی عظمت کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے ہاں عورت کو گناہ اور اس سے پیدا ہونے والی تباہی و بربادی کے بجائے تخلیقِ حیات اور بقائے حیات کے مقدس جذبے کا استعارہ تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اقبال کا ابلیس عیسائی شعرائے ابلیس کی طرح جنس کے خروش، سرکشی، طوفان اور شورش سے آشنا نہیں۔ یہ وہ ابلیس ہے جس کی ساری سرکشی طوفان اور شورش انسانوں کو مادی اور سیاسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی ناکام کوششوں

سے پیدا ہوتی ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے اہلِ قلم تو اقبال کے تصورِ ابلیس کو دانتے اور گوئٹے کے تصورِ ابلیس کا چربہ پا کر برہم ہیں مگر یورپ کے دانشور بالکل اسی بنا پر اقبال کی عظمت کے ثنا خواں ہیں۔ مستشرقین یورپ، اقبال کے شیطان کی سیاسی شخصیت کو دنیائے ادب میں بے حد منفرد اور قابلِ قدر اضافہ تصور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مشہور اطالوی مستشرق پروفیسر الیگزنڈر بوسانی نے اقبال کے ابلیس پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں انھوں نے اقبال کے ابلیس کی سیاسی شخصیت پر مناسب توجہ دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اقبال کے نزدیک شیطان کے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کے پس پشت دو منفی جذبات کارفرما تھے ایک حسد اور دوسرا تکبر۔ حسد اور تکبر کی کیفیات شیطانی اس لئے ہیں کہ شیطان کا انکار عشق کے بجائے رنگ و نسب کی برتری کے احساس سے جنم لیتا ہے۔ اس استدلال کے ساتھ پروفیسر بوسانی اقبال کے شیطان کے سیاسی کردار کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اسے اقبال کا اہم ترین ادبی کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے ہمیں اتنی تنگ نظری اختیار کرنے کی ضرورت کب تک رہے گی، اس سوال پر غور کیا جانا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ ـــــ ڈاکٹر اجمل صاحب کے دوسرے اعتراض کی نوعیت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں وہ رومانی شادابی کا وفور اور وہ شدت کیوں نہیں جو رومی کے اس شعر میں موجود ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے بطور حوالہ نقل کیا ہے، تو عرض یہ ہے کہ رومی کا یہ شعر جس غزل سے لیا گیا ہے وہ غزل اقبال ہی کی وساطت سے اردو داں طبقہ تک پہنچی ہے۔ یہ غزل اقبال کو اتنی قدر پسند تھی کہ انھوں نے بہ صرف جاوید نامہ میں رومی سے ملاقات کے وقت یہی غزل سننے کی فرمائش کی بلکہ اسرار و رموز کا حرفِ آغاز بھی اسی غزل کے چند اشعار ہیں۔ مجھے بصد احترام اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر ڈاکٹر اجمل پوری غزل ایک نظر دیکھنے کی زحمت گوارہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس غزل کی رومانی شادابی، جام بادہ اور زلف یار ہی تک محدود نہیں بلکہ یہ اشعار بھی اسی غزل کے ہیں:

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت ۔۔۔ شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

جانم ملول گشت ز فرعون و ظلم او ۔۔۔ آں نورِ جیبِ موسیٰ عمرانم آرزوست

اور ان اشعار میں بھی ایک طرح کی رومانی شادابی کا وفور اور شدت موجود ہے۔ اقبال کو ڈاکٹر اجمل کے برعکس ان اشعار کی رومانی شادابی اور شدت مسحور کرتی ہے اس لئے کہ وہ شاعری کو اپنی جنسی شکستوں اور جسمانی خواہشوں کے بیان کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ شاعر سے ان کا مطالبہ ہے

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن ۔۔۔ نعرۂ لا پیشِ نمروداں بزن

اور جب وہ زمانہ آتا ہے جب شاعر فرعون اور اس کے ظلم، نمرود اور اس کی خدائی سے متصادم ہونے کے بجائے اپنے لئے جسمانی آسودگیوں کی تلاش میں کھوئے رہنا ہی کمالِ فن تصور کرتا ہے تو نقاد کبھی ڈاکٹر اجمل بنتا ہے تو کبھی محمد حسن عسکری اور کبھی سلیم احمد اور کہتا ہے:

"علامہ اقبال کے سلسلے میں کچھ شیطانی وسوسے میرے دل میں اٹھتے رہتے ہیں، یہ کیا بات ہے کہ ان کے پورے کلام میں بیتی یا گیتی گوشت پوست والی عورت کا سراغ دور دور تک نہیں ملتا۔ اب سے کئی سال ادھر کی بات ہے جب ڈاکٹر اجمل نے اقبال پر ایک نہایت وقیع مضمون لکھتے ہوئے اسی خیال کا اظہار کیا تھا کہ اقبال بڑے سے بڑے جذبات والی عورت سے خوف کھاتے تھے۔ ڈاکٹر اجمل نفسیات کے ماہر ہیں۔ میرے جیسے جاہل آدمی کے لئے تو ان کی بات سند کا درجہ رکھتی ہے لیکن جن لوگوں کو ذاتی تحقیق کا شوق ہے انھیں کبھی کبھی اس گتھی پر غور کرنا چاہیے کہ اقبال عورت کے نام پر اتنے بدکتے کیوں تھے۔ عالمِ سوز و ساز میں ذاتی کا مرتبہ اگر اضطراب اور حرکت کے سبب ہے تو ہے جسے اقبال حیات کہتے ہیں تو عورت اضطراب کے نقطۂ عروج اور حرکت کی مکمل ترین ہم آہنگی کا نام ہے

غالب نے اس حقیقت کے پیش نظر وصل کو شوق کا زوال ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس امر کی طرف نہایت بلیغ اشارہ کیا تھا کہ وصل لازمی طور پر جہد و طلب کی موت نہیں ہے :

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال　　موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

لیکن اقبال وصل کی کیفیت سے اتنے ڈرے ہوئے ہیں، کہ اپنی ہستی کو عورت تو عورت ہے۔ حقیقتِ ازلی میں بھی گم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے "

(غزل سلطرا اور ہندوستان ــــــ سلیم احمد)

جن لوگوں کو ذاتی تحقیق کا شوق ہے۔ ان کی اطلاع کے لئے میں عرض کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ اقبال کا یہ شعر :

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق　　وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

غزل کا نہیں نظم کا شعر ہے اور نظم بھی "ذوق و شوق" جیسی اور جس زندگی کے اسرار و رموز کا بیان اس نظم میں کیا گیا ہے وہ قلب و نظر کی زندگی ہے اور جس حسن کی ثنا خوانی مقصود ہے وہ حسنِ ازلی ہے، اور جس عشق کی مدح سرائی ہو رہی ہے وہ یہ ہے :

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق　　معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آج کا نقاد اس حقیقت کو کیوں نظر انداز کر دیتا ہے کہ اقبال کسی سلمیٰ یا میر آکین کے فراق کا ذکر نہیں کرتے بلکہ وہ اس لذتِ طلب میں سرشار ہیں

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں　　گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اور اس سوال کا جواب بھی اس نقاد کے استدلال میں پوشیدہ ہے محترم کا سب سے بڑا استدلال یہ ہے کہ مادام سیمون دا بوار نے یوں کہا ہے اس نے اقبال کو اپن کتا ہوگا ورنہ ہم انھیں طعنہ دیں گے کہ مادام بوآر کی نفسیات فہمی کے مطابق آپ تو عورت سے ڈرتے ہیں۔ کاش یہ ماہرینِ نفسیات و ادب مستعار نظریات کو ہماری زندگی اور افکار پر لاگو کرتے ہوئے یہ تو دیکھ لیتے کہ یہ نظریات خود مغرب میں کس حد تک قبول کئے جا رہے ہیں۔ آج کے مغرب میں یہ احساس عام ہے کہ صحیح معنوں میں آزاد عورت کا وجود محض ایک خیال ہے۔ نئی عورت پرانے زمانے کی عورت سے کہیں زیادہ مرد کی غلام ہے اسے اقتصادی اور سیاسی مسائل کا شعور نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے تمام ڈکٹیٹروں کی سب سے زیادہ پرجوش اور مذہبی حامی عورتیں ہی ہیں۔ مادام سیمون دا بوار کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور مفکر Clyde Cluckhon لکھتے ہیں :

"سیمون دا بوار مرد سے زیادہ دانشور ہیں۔ انھوں نے عورت کی آزادی اور تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فطری کمزوریاں کی خامیں اور فیکٹریاں کی نشاط، گھریلو ذمہ داریاں اور ماحول نے زیادہ غیر تخلیقی، بیزار کن اور غلامانہ ہیں۔ اگر ہم مصنفہ کے خیالات کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ تمام عورتیں فنکار اور دانشور ہیں۔ حیاتیات اور معاشرتی تقسیم کار کے مروجہ اصول شاہد ہیں کہ نہ تمام عورتیں اور نہ تمام مرد یکساں صلاحیتیں رکھتے ہیں اور نہ ایسا ہونا کسی عنوان ممکن ہے"

آپ کہیں گے یہ تو مغرب کی عورت کی باتیں ہیں سنیئے بیگم ستنام محمود ایشیا کی عورت کے خد و خال پیش کرتی ہیں :

"اب وقت آ گیا ہے کہ عورت جس صورت حال سے دوچار ہے ہم اس کا غیر جذباتی انداز سے جائزہ لیں۔ ایشیا کی عورت آزادی کے لئے سرگرداں ہے مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ وہ کس سے آزاد ہونا چاہتی ہے اور کیوں؟ کیا وہ اقتصادی آزادی کی خواہاں ہے یا وہ مرد کی بالادستی سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ مغرب میں بہت سی امیر عورتیں جن میں بہت سی ایسی بھی ہیں جو نہیں جانتیں اس دولت کا کیا کریں۔ جہاں تک مرد کی بالادستی سے آزاد ہونے کا تعلق ہے ہم پہلے سے زیادہ بدتر صورت حال کا شکار ہیں۔ عورت کے معاشرتی حقوق کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے لیکن مرد اب تک اس کا

: خداب ہے۔ اسے اب تک اعلیٰ نوکریوں کے لئے مردوں کی رضا درکار ہے اور اس سلسلے میں اسے اعصابی تناؤ اور بعض اوقات شرمندگی برداشت کرنا ہوتی ہے۔ محبت اور شادی کے میدان کے علاوہ پیشہ ورانہ دائرہ عمل میں بھی اسے مقابلہ کا سخت دباؤ سہنا پڑتا ہے۔ بڑھتی پھیلتی صنعت اس کے لئے ہر روز ایک نیا روپ پیش کرتی ہے۔ کبھی اسے صابن کی ایک ٹکیہ کے لئے مدہوشی طاری کرنا پڑتی ہے کبھی مٹھائی کے ایک ٹکڑے کے لئے سراپا اشتیاق بننا ہوتا ہے۔ ہر موقع کی مناسبت سے اسے موزوں نفسیاتی مسکراہٹیں پیش کرنا پڑتی ہیں۔ یہ انقلابی تبدیلیاں جس تیزی سے جاری ہیں اسے دیکھتے ہوئے ہمیں سوچنا ہے کہ مستقبل کی عورت کے خدوخال کیا ہوں گے ——— مستقبل کی یہ عورت شاید کنواری عورت ہوگی، تنہا عورت ہوگی، پیشہ ور عورت ہوگی اور غضبناک عورت ہوگی ... بہرحال جدید عورت کی یہ فتوحات بے حد المناک ہیں۔

(The Shape of Woman to Come — Pakistan Times.)

اقبال نے بھی آزادیٔ نسواں کی تحریک کو فرنگی معاشرت کے فساد سے تعبیر کیا تھا۔ اقبال نے اپنے کلام میں اگر ایک طرف معاشرت کے اس فساد پر تنقید کرتے ہوئے اس سے نفرت دلائی تو دوسری طرف معاشرت کی صحت کی راہیں بھی دکھائیں۔ "جاوید نامہ" میں دوشیزۂ مریخ کی یہ تقریر:

اے زناں اے مادراں اے خواہراں　　زیستن تا کے مثالِ دلبراں
دلبری اندر جہاں مظلومی است　　دلبری محکومی و محرومی است
از امومت زرد روئے مادراں　　اے خنک آزادیٔ بے شوہراں

پیش کرنے کے بعد اقبال نے رومی سے اسے "حاصلِ تہذیبِ لادینی" کہلوایا ہے۔ اس طرح مثنوی "پس چہ باید کرد" میں حکمتِ فرعونی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اقبال اس عورت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

دختراں او بزلفِ خود اسیر　　شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر
ساختہ پرداختہ دل باختہ　　ابروآں مثلِ دو تیغِ آختہ
ساعدِ سیمینِ شاں عیشِ نظر　　سینۂ ماہی بموج اندر نگر

اقبال کو نئی عورت پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ نازک اندام اور شوخ چشم بننے ہی کو اپنا منتہا سمجھتی ہے اور ماں بننے سے گریزاں ہے جبکہ:

از امومت گرم رفتارِ حیات　　از امومت کشفِ اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوئے ما　　موج و گرداب و حبابِ جوئے ما

اس لئے اقبال کے نزدیک وہ دہقان زادی زیادہ محترم ہے جو:

نا تراشے پرورش نا دادۂ　　کم نگاہے کم زبانے سادۂ
دل ز آلامِ امومت کردہ خوں　　گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست　　یک مسلمانِ غیور و حق پرست
ہستیٔ ما محکم از آلامِ اوست　　صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست

اقبال ملت کے تقاضوں کو ذات کے تقاضوں سے علیحدہ نہیں سمجھتے ہیں اس لئے ان کے ہاں مثالی عورت حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ وہ نئی عورت کو سیدۃ النساءؓ کے اسوۂ کاملہ پر غور کرنے کا درس دیتے ہیں:

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ — مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

بہرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت — با یہودے چادرِ خود را فروخت

آں ادب پروردۂ صبر و رضا — آسیا گرداں و لب قرآں سرا

یہ جاننے کے لئے کہ اقبالؔ عورت کو ماں ہی کے روپ میں کیوں دیکھتے ہیں، اقبالؔ کی جنسی زندگی پر تحقیق کرنے سے پیشتر اگر اقبال کے بچے کے مفہوم کو جان لیا جائے تو افہام و تفہیم میں بہت آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں:

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

جب مائیں جناب فاطمۃ الزہراؓ کے حسنِ کردار سے آشنا ہوں گی تب قافلۂ حجاز میں حسینؑ جیسے نوجوان نمودار ہوں گے اور تب ہی اقبالؔ کا ہجر، وصال بنے گا کہ:

درنوائے زندگی سوز از حسینؑ — اہلِ حق حریت آموز از حسینؑ

سیرتِ فرزندہا از امہات — جوہرِ صدق و صفا از امہات

اور جب تک یہ نہ ہوگا نئی عورت خود بھی ترقی کرتی رہے گی اور باپ، بھائی اور شوہر کے لئے ترقی کا زینہ بھی بنتی رہے گی مگر ساتھ یہ بھی ہوتا رہے گا کہ خالدہ اصغر افسانہ لکھنے کے بجائے اس غم میں گھلتی رہیں گی کہ ہمارے شہروں میں بچپن اور لڑکپن کی معصومیت اور بے فکری کہاں ناپید ہو گئی اور یہ ماں کیسی ماں ہے جس نے قرآن کے لاکٹ بنا کر پہنے، وہ لڑکیوں کو بھی پہنائے اور سب کو بتایا کہ اس قرآن کا استعمال محض یہی تزئین ہے۔ اور یہ بھی کہ جب یہ ماں کسی سے ملتی ہے تو یہ توقع کیوں کرتی ہے کہ اس سے کہا جائے کہ وہ شادی شدہ اتنے بچوں اور خصوصیت سے اتنے بڑے بچوں کی ماں نہیں لگتی ——— اور اخبارِ خواتین کے صفحۂ اول پر نئی عورت کی "قدرِ عورت" تصویر فریاد کرتی رہے گی "سلطانہ بیگم تنہا ہیں؟"

سید علی عباس جلالپوری

روحِ عصر

۴

صنعتی انقلاب اور تجارتی ملوکیت

عروجِ مغرب

کولمبس، واسکوڈاگاما اور میگیلان کے بحری سفروں نے اہلِ مغرب کی آنکھوں کے سامنے نئی دنیا اور مشرق بعید کے دروازے کھول دیئے۔ اہلِ ہسپانیہ نے جنوبی امریکہ میں، انگریزوں نے شمالی امریکہ اور ہند کے ساحلوں پر، ولندیزیوں نے جزائر شرق الہند میں، فرانسیسیوں نے شمالی امریکہ اور ہند میں اپنی تجارتی کوٹھیاں اور نوآبادیاں قائم کیں۔ سلاطینِ مشرق کے باہمی نفاق اور معاصرانہ چشمک سے فائدہ اٹھا کر تجارت اور صنعت و حرفت کے علاوہ [illegible] حاصل علاقوں پر تصرف کیا گیا اور اطرافِ عالم سے زر و جواہر سے لدے ہوئے جہاز مغربی ممالک کو جانے لگے۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مغرب میں صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ اس انقلاب کا آغاز کم و بیش ۱۷۶۰ء میں انگلستان میں ہوا جب آرک رائٹ نے سوت کاتنے کی کل ایجاد کی جو آبی قوت سے چلتی تھی۔ ۱۷۸۲ء میں جیمز واٹ نے دخانی انجن ایجاد کیا۔ ۱۸۲۹ء میں لورپول اور مانچسٹر کے درمیان ریل کی پٹری بچھائی گئی۔ ۱۸۳۸ء میں پہلے دخانی جہاز "گریٹ ویسٹرن" نے بحر اوقیانوس کو عبور کیا۔ ۱۸۳۲ء میں مورس نے تار برقی ایجاد کی۔ ان ایجادات نے صنعت، اشیا اور رسل و رسائل میں آسانیاں پیدا کر دیں۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیانی عرصے میں صنعتی انقلاب یورپ اور امریکہ میں پھیلتا ہوا جاپان تک پہنچ گیا اور انگلستان کا صنعتی اجارہ ختم ہو گیا۔

صنعتی انقلاب کے ساتھ وسیع پیمانے پر مصنوعات کی ساخت ہونے لگی جن کی کھپت کے لئے منڈیوں اور کچے مال کی فراہمی کے لئے نوآبادیوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ یورپی اقوام میں ایشیا اور افریقہ کی منڈیوں اور نوآبادیوں کے حصول کے لئے بے پناہ تگ و تاز کا آغاز ہوا۔ مشرق وسطیٰ سے لے کر ہندوستان تک، جزائر شرق الہند سے لے کر چین و جاپان تک کے اکثر ممالک پر اہلِ مغرب کا سیاسی و اقتصادی تسلط قائم ہو گیا۔ اس تجارتی رقابت نے یورپ کی کشمکش کو ہوا دی اور تجارتی اور ملکی مفاد کے تحفظ کے لئے متعدد خونریز جنگیں لڑی گئیں ---- ان صدیوں میں مشرقی اقوام کی حالت زار و زبوں تھی۔ معاشرتی تنزل، اقتصادی بے چارگی، عسکری کمزوری اور باہمی نفاق کے باعث ---- اہلِ مشرق مغرب کی طرف سے اُمڈتے ہوئے اس سیلاب کا مقابلہ نہ کر سکے اور خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ مٹھی بھر انگریزوں نے ایک صدی میں ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور ولندیزی جزائر شرق الہند پر قابض ہو گئے۔ ۱۸۵۳ء میں امریکہ کا بحری بیڑہ کموڈور پیری کی قیادت میں یوکوہاما کی بندرگاہ میں زبردستی جا داخل ہوا اور پیری نے جاپانیوں کو ڈرا دھمکا کر تجارتی مراعات حاصل کیں۔ انگریزوں نے "جنگِ افیون" (۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء) میں اہلِ چین کو بزورِ شمشیر افیون خریدنے اور کھانے پر مجبور کیا[a]۔ ۱۹۰۰ء میں چین کے محبانِ وطن نے غیر ملکیوں کو ملک سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن ایک بین الاقوامی فوج نے انہیں شکست دے کر بغاوت کو فرو کر دیا اور چین سے ایک رقمِ کثیر بطور تاوانِ جنگ وصول کی۔

مشرق صدیوں سے بے حسی اور بے عملی کے خوابِ غفلت میں لیٹا پڑا تھا کہ اہلِ مغرب کی جارحانہ ترکتازی اور تاخت و تاراج نے اسے آنکھیں کھولنے پر

---

a! Civilization On Trial ... Toynbee

مجبور کر دیا۔ جاپان اس بیداری کا نقیبِ اوّل ہے۔ جاپانیوں نے حیرت انگیز مستعدی سے جدید علوم و فنون کی تحصیل کی، کلیں بنائیں، کارخانے کھولے اور فوج کو جدید آلاتِ حرب و ضرب سے مسلح کیا۔ جنگِ روس و جاپان میں جاپان کو فتح حاصل ہوئی تو سب مشرقی ممالک میں آزادی کی تحریکیں برپا ہو گئیں جیسے جنگل کی آگ دیکھتے دیکھتے چاروں طرف بھڑک اٹھتی ہے اور مشرقیوں نے مغرب کے پیرانِ تسمہ پا سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے۔ اہلِ مغرب نے اپنا قبضہ اور تسلط برقرار رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن ان کی روز بروز آہنی گرفت کمزور پڑتی گئی۔ جاپان نے کوزے کا ڈھکنا اٹھا کر عفریت کو آزاد کر دیا تھا۔

نظام کلیسا، قانون، فوج داری اور سلطنت کے نظم و نسق کے ساتھ ملوکیت بھی اہلِ مغرب کو رومہ سے ورثے میں ملی تھی۔ رومی غیر اقوام کے ممالک کو اپنی نوآبادیاں سمجھتے تھے۔ چونکہ جنگیں ملوکانہ مقاصد کے لئے لڑی گئی تھیں۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ جب روم کے سینیٹرز نے کارتھیج کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے میں پس و پیش کی تو مارکس کیٹو نے اپنی آستین سے تین بڑی بڑی اور خوش رنگ ناشپاتیاں نکالیں اور انہیں سب کے سامنے زمین پر لڑھکا دیا۔ تمام سینیٹروں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "یہ ناشپاتیاں کس ملک میں پیدا ہوتی ہیں؟" کیٹو نے کہا "کارتھیج میں جو یہاں سے صرف تین دن کے راستے پر واقع ہے۔ کیا ایسے ملک پر قبضہ نہیں کرنا چاہیے؟" یہ دلیل کارگر ثابت ہوئی اور جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن رومیوں کے معاصر وارثانِ اہلِ مغرب ایسے سیدھے سادے نہیں ہیں۔ یہ لوگ اپنے تجارتی اغراض و عزائم کو "مذہبی اور اخلاقی اقدار کے تحفظ" اور "اشاعتِ تہذیب و تمدن" جیسی خوش آئند ترکیبوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ملوکیت پسندوں اور تاجروں نے سترھویں صدی سے مذہبی تبلیغ کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا چنانچہ سیکڑوں مشنری ادارے قائم کئے گئے اور مشنری عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جوق در جوق مشرقی ممالک کو جانے لگے۔ یہ سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ عیسائیت کی اشاعت سے اہلِ مغرب کا مقصد یہ تھا کہ دیسیوں نے عیسائیت قبول کر لی تو وہ اپنے مغربی آقاؤں کو اپنا ہم مذہب سمجھ کر اُن کی معاشی لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج نہیں کریں گے۔ اس طرح اہلِ مغرب نے مذہب کے نام پر اپنا سیاسی تسلط برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ جنوبی افریقہ کے ایک قبائلی سردار نے کہا تھا "جب سفید آدمی آیا تو اُس کے پاس بائبل تھی اور ہمارے پاس اراضی۔ اب اراضی سفید آدمی کے پاس ہے اور ہمارے پاس بائبل" بمبئی کی بندرگاہ پورٹ پرلس میں ملکیوں نے مسیح اور شیطان کے سنگین مجسمے نصب کر رکھے ہیں۔ مسیح کا مجسمہ سیاہ رنگ کا ہے اور شیطان کا مجسمہ سفید رنگ کا۔[۵۱]

اخلاقی قدروں کے ان محافظوں اور مسیحی انسان دوستی کے ان مبلغوں نے بڑی بے رحمی سے ملکی باشندوں کا استیصال کیا۔ امریکیوں نے لال ہندیوں کا قتلِ عام کر کے سیکڑوں قبیلوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا۔ کانگو میں شاہ لیوپولڈ دوم کے زمانے میں حبشیوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے۔ صرف پندرہ برسوں میں اس دانش مند بادشاہ نے، جو کلیسا کا ایک مخلص فرزند تھا اور جو بزعمِ خود بڑا مخیر اور انسان دوست تھا، کانگو کی آبادی کو دو کروڑ سے گھٹا کر نوے لاکھ کر دیا تھا۔[۵۲] جب پزارو نے امریکہ کے ایک ملکی بادشاہ اتاہوالپا پر فتح پائی تو اس کے لئے موت کی یہ صورت تجویز کی گئی کہ اُسے دھیمی آنچ پر آہستہ آہستہ جلا کر مارا جائے۔ بادشاہ نے درخواست کی کہ اس کا سر تلوار سے قلم کیا جائے۔ پزارو نے کہا "تم عیسائیت قبول کر لو تو اس رعایت کے مستحق ہو سکتے ہو" چنانچہ بادشاہ نے بپتسمہ لیا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

اہلِ مغرب زبان سے انسانی برادری اور انسانیتِ عالیہ کا دم بھرتے ہیں لیکن فی الحقیقت مشرق کی "رنگ دار" اقوام کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ امریکہ کے حبشی غلاموں نے خون پسینہ ایک کر کے جنوبی ریاستوں کو آباد کیا اور زرعی پیداوار کے لحاظ سے امریکہ کو خود مکتفی کر دیا لیکن آج تک امریکی انہیں جانور سمجھتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تاحبشی اور نیوبرٹ میں حبشی عورتوں سے دودھ پلا کر "ذروں" کی پرورش کرائی جاتی تھی۔ "سفید آدمی کا بوجھ" اسی بدخود غلط ذہنیت کی تخلیق ہے۔ اس نظم میں رڈیارڈ کپلنگ نے اہلِ مشرق کو "نیم ابلیس اور نیم طفل" کے القاب ارزانی فرمائے ہیں۔ نظم درج ذیل ہے۔ اُردو ترجمے میں اس کی زہریلی طنز کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

---

۵۱ Human Society. Bertrand Russell. ۵۲ New Hopes for a Ch.nging World.
۵۳ Mansions of Philosophy. Will Durant.

Take up the white man's burdon
Send forth the best you breed
Go bind your sons to exile
To serve your captives' needs;
To wait in heavy harness
On fluthered fold and wild
Your new-caught sullen peoples
Half-devil and half-child

لطف یہ ہے کہ ان ملوکیت پسندوں اور طالع آزماؤں کی حرص و آز سے خود اُن کے ہم وطن بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ مشرق کی دولت سے کارخانہ داروں کے خزینے معمور ہو گئے لیکن عوام کی حالت بدستور رہی۔ صنعتی انقلاب کے بعد جس اقتصادی استبداد کو اُن پر مسلط کیا گیا تھا وہ جاگیرداروں کے اس استبداد سے اک گونہ بدتر تھا جس سے خود تجارتی طبقے نے صدیوں کی کشمکش کے بعد رہائی پائی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب غلام کا نام مزدور پڑ گیا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں پادری بالعموم جاگیرداروں کا ساتھ دیتے تھے بلکہ ان میں سے بعض خود بڑے بڑے جاگیردار تھے۔ نظامِ جاگیرداری کی تنسیخ کے بعد یہ لوگ تاجروں کے ساتھ مل گئے جیسے ہندوستان میں کھشتریوں کا زور ٹوٹ جانے پر برہمنوں نے بنیوں سے ایکا کر لیا ہے اور اُن کی مدد سے ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے فرانس کے عوام نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کے خلاف متحد ہو کر احتجاج کیا۔ میرابو عوام کا رہنما بن گیا۔ اس کی خطابت اور کوشش سے نیشنل اسمبلی وجود میں آئی۔ باسٹیل کی تسخیر کے بعد عوام نے لافیت کو اپنا عسکری قائد منتخب کیا۔ دانتون، مرا اور روبس پیر کمیٹی آف پبلک سیفٹی کے ممبر منتخب کر لیے گئے۔ انھوں نے سرکاری طور پر عیسائیت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

صنعتی انقلاب کے بعد کم و بیش ایک صدی تک انگلستان یورپ کا سب سے بڑا صنعتی مرکز بنا رہا۔ یہاں کے کپڑے کے کارخانوں اور کوئلے کی کانوں میں لاکھوں مزدور کام کرتے تھے۔ زمینداروں نے اپنے کھیتوں کو بھیڑ بکریوں کے باڑوں میں تبدیل کر دیا تھا اس لیے کسان گروہ در گروہ تلاشِ معاش میں شہروں کی طرف نکل کھڑے ہوئے جہاں کارخانوں میں مردوں کے علاوہ عورتوں اور بچوں سے بھی دن رات میں بیس بیس گھنٹے کام لیا جاتا تھا۔ اہلِ سرمایہ کی خود غرضی اور سنگ دلی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس زمانے کے انگریز مصلحین اور "انسان دوست" ولبر فورس وغیرہ جو غلامی کے انسداد کے لیے واویلا کر رہے تھے انھیں مزدور بچوں اور عورتوں کی حالتِ زبوں کا مطلق احساس نہ تھا۔ وہ ہر اس آواز کو سختی سے دبا دیتے تھے جو ان بچوں کی بہتری کے لیے بلند کی جاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے اُن کی اپنی آمدنی میں کمی واقع ہونے کا اندیشہ تھا۔ برٹرنڈ رسل[1] اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غلاموں کی تجارت کے متعلق انگریزوں کا رویہ ایک نفسیاتی اعجوبے سے کم نہیں کیونکہ جو لوگ غلامی کے انسداد کے درپے تھے وہی صنعتی ظلم و استبداد کو برقرار رکھنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ حبشی غلاموں سے تو ہمدردی کا اظہار کرتے تھے لیکن خود اپنے بچوں کی طرف اُن کا رویہ سنگدلانہ تھا۔"

کارخانے میں کام کرنے سے مزدور کو اپنی قوتِ بازو کے صرف کا جو صلہ ملتا تھا اُس سے کہیں زیادہ نفع وہ کارخانہ دار کو پہنچاتا تھا۔ جرمن فلسفی کارل مارکس نے سب سے پہلے مزدور کی اجرت اور کارخانہ دار کے نفع کے درمیان روز بروز بڑھتے ہوئے اس فرق کی طرف توجہ دلائی اور دنیا بھر کے مزدوروں کو اس ناانصافی کے

---

(۱) Freedom and Organisation.

خوف متحد ہو کر کشمکش کرنے کی دعوت دی۔ اس طرح تحریک اشتمالیت کی بنیاد پڑی جو پہلی جنگ عالمگیر کے اواخر میں لینن کی کوششوں سے روس میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کی مقبولیت پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل نے لکھا ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی نظریے یا ادارے کو ایسی حیرت ناک ترقی نصیب نہیں ہوئی جتنی کہ اشتمالیت کو ہوئی ہے۔

لینن اور اس کے ساتھیوں نے روس میں اشتمالی معاشرہ قائم کرنے کی جو کوشش کی، اس کے متعلق انگریز فلسفی سی۔ای۔ایم جوڈ[۱] لکھتے ہیں:

"پہلے پہل روس میں مساوات قائم کی جا چکی تھی۔ فیصلہ کن مرحلہ آیا۔ امیر تھے اور نہ غریب۔ تمام شہری ایک سو سے ایک سو ساٹھ پونڈ سالانہ آمدنی پر گزر بسر کرتے تھے۔ بالشویکوں نے ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیا تھا جہاں روپے کو معاشی قدر کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا تھا۔ اس میں مزدور طبقوں کا جھگڑا لیکن اقوام کی خصوصیت سے تمام و نشان تک نہ تھا۔"

زرعی انقلاب کے بعد صنعتی انقلاب تاریخ عالم میں سب سے اہم سنگ میل سمجھا جا سکتا ہے جس طرح زرعی انقلاب نے شکار کے عہد کی قدروں کو بدل لیا تھا۔ اسی طرح صنعتی انقلاب کے ہمہ گیر شیوع سے زرعی معاشرے کی دس ہزار برس کی پرانی قدریں اور روایات نامحسوس طریق پر بدلتی جا رہی ہیں۔ ول ڈیورنٹ[۲] لکھتے ہیں:

"زرعی معیشت کے خاتمے اور صنعتی انقلاب کے برپا ہونے سے معاشرے میں آہستہ آہستہ نامعلوم طور پر تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں۔ عوام بیدار ہو گئے ہیں بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اشتراکیت کا ہر طرف نفوذ ہو رہا ہے۔ عورت آزاد ہو چکی ہے۔ قدیم اخلاقی بندشیں ختم ہو رہی ہیں۔ ضبط نفس کی بجائے اظہار نفس کا رواج ہو رہا ہے۔ جنگ و جدال نے زیادہ خوفناک صورت اختیار کر لی ہے۔ ہمارے عزیز ترین عقیدے شکست و ریخت ہو رہے ہیں۔"

خرد افروزی

کوپرنیکس، گلیلیو اور نیوٹن نے جدید سائنس کی بنیاد رکھی تھی اور دے کارت اور ہابس نے اس کے انکشافات کی روشنی میں فلسفے کو از سر نو مرتب کیا تھا۔ جو ہر زمانے سے عقلی استدلال کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ سپینوزا، بارکلے اور برگساں جیسے اہل فکر بھی جن کے افکار پر تصوف و باطنیت کا رنگ غالب تھا، اس سے استمداد کرنے پر مجبور ہو گئے۔

سائنس کی روز افزوں ترقی و ترویج کے باعث ۱۸ ویں صدی عیسوی میں یورپ میں تحریک خرد افروزی بار آور ہوئی۔ تاریخ فلسفہ میں اس کو Enlightenment کہا گیا ہے۔ جرمن فلاسفر اسے Aufklarung کا نام دیتے ہیں۔ یہ تحریک ہالینڈ اور انگلستان سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ سارے یورپ میں پھیل گئی اور فرانس میں نقطۂ عروج تک جا پہنچی۔ انگلستان میں لاک اور ہیوم نے اس کی آبیاری کی تھی۔ لاک نے مثالیت پسندوں کے برعکس تجربات اور مشاہدات کی بنا پر فلسفہ و نفسیات کے اصول مرتب کرنے کی کوشش کی جس سے انگلستان میں تجربیت (Empiricism) کے مکتب فکر کی بنیاد پڑی۔ ہیوم اپنے عہد کے اہل تشکک کا سرخیل تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ انسان کی انا یا اس کی روح کو اس کے ذہنی واردات اور حسیات سے علیحدہ اور ماورا کسی قسم کا مستقل بالذات مقام حاصل نہیں ہے۔ فرانس میں والٹیر، دیدرو اور ان کے قاموسی رفقا نے اس تحریک کی اشاعت پر کمر باندھی۔ قاموسیوں نے پینتیس جلدوں میں ایک قاموس علوم مرتب کی۔ اس کی پہلی سترہ جلدیں اکیلے دیدرو نے لکھی تھیں باقی ماندہ جلدیں کندورسے، دالمبر، ہیلویشس، ترگو، کوندیاک، ہیل، دیشیس، دولباک، کینے اور روسو کی علمی کاوشوں کا ثمرہ تھیں۔

اٹھارہویں صدی کے فرانس کو قاموسیوں کا عہد زریں سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مشہور "لغت" سے ہیوم اور ایڈم سمتھ نے بھی استفادہ کیا تھا۔ ہیل کا نظریہ تھا کہ مذہب سائنٹفک تحقیق کے راستے میں حائل ہے اس لئے مذہب کو صرف الہامی امور تک محدود کر دینا ضروری ہے۔ اس نے علمی مسائل

---

۱ New Hopes for a Changing World ., The Book of Joad.

۲ Mansions of Philosophy . Will Durant

کی تحقیق سے مذہبی اور الہامی عقائد کو یکسر خارج کر دینے کی تجویز پیش کی اور کہا کہ مذہب کو بھی عقل کے معیار پر جانچنا چاہیئے۔ ۱۷۷۰ء میں فریڈرک اعظم شاہِ پرشیا نے والٹیر کو ایک خط میں لکھا۔

"بیل نے جنگ کا آغاز کیا تھا چند انگریزوں نے اُس کی تقلید کی۔ تم اس جنگ کو ختم کر دینے کے لئے پیدا ہوئے ہو"

بیل الحاد اور بے دینی کی بہ نسبت مذہبی جنون کو زیادہ خطرناک سمجھتا تھا۔

دنیائے ادب میں والٹیر کا طنز و مزاح مشہور ہے۔ وہ زہد فروشوں کی ریاکاری اور مذہبی جنون کا سخت دشمن تھا۔ ایک دن والٹیر نے ایک رئیس شیولیر دی روہان سے مذاق کیا۔ رئیس مذکور نے غضبناک ہو کر والٹیر کو اپنے کوچوانوں سے خوب پٹوایا۔ اس پر والٹیر نے اُسے دعوتِ مبازرت (ڈوئل) دی۔ رئیس نے کہلا بھیجا کہ وہ ایک عامی سے لڑنا اپنی توہین سمجھتا ہے اور الٹا والٹیر کو قید کرا دیا۔ قید سے رہا ہو کر والٹیر انگلستان بھاگ گیا جہاں بیٹھ کر اُس نے فرانس کے جاگیرداروں کے خلاف قلمی جہاد کا آغاز کیا۔

والٹیر پہلا مورخ ہے جس نے تاریخِ عالم پر قلم اٹھایا اور یورپ کے علاوہ ہندوستان، چین، جاپان وغیرہ کے تاریخی حالات قلم بند کئے۔ اس سے اٹھارھویں صدی کی وسعتِ نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

قاموسیوں میں دالمبر ایک بلند پایہ ریاضی دان تھا۔ کیبدلک ماہرِ نفسیات تھا۔ ہالباخ نے طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کو اپنا موضوع بنایا۔ بوفنے نے طبیعی تاریخ پر قلم اٹھایا اور سائنس پر متعدد مقالات لکھے۔ دیدرو نے پادریوں کی خرد دشمنی اور دکان آرائی کا پردہ چاک کیا۔ ہیل وتیسیس نے اپنی ہنگامہ پرور تالیف De l, Esprite میں علانیہ مادیت کی حمایت کی۔ کندورسے نے انسان دوستی کے تصور کو تقویت بخشی۔

قاموسیوں میں کندورسے کی شخصیت خاص طور پر پُرکشش ہے۔ "ایامِ وحشت" میں جب روبس پیر، دوسار اور جاگیرداروں کو چُن چُن کر گلوٹین کی نذر کر رہا تھا کندورسے کو بھی عالی نژاد ہونے کے باعث قید کر دیا گیا۔ کندورسے کو اپنی موت کا یقین تھا کیونکہ اُس زمانے میں تمام رئیس زادوں کو بے دریغ قتل کیا جاتا تھا۔ ایامِ اسیری میں جب کہ اُس کے سر پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا، اُس نے اپنی معرکہ آرا کتاب "ذہنِ انسانی کی ترقی کا خاکہ" تصنیف کی۔ اس کتاب کے آخری باب میں اُس نے عقل و فکر کی تلقی اور آخری فتحمندی کی پیش گوئی کی ہے اور کہا ہے کہ انسان دوستی کا تصور ایک نہ ایک دن بالضرور تصوراتی جنون، عصبیت اور منافرت و تنگ نظری اور خرد دشمنی پر فتح پانے میں کامیاب ہوگا۔ اُس نے لکھا کہ انسان فطرتاً نیک ہے صرف وہم پرستی اور تعصب نے اسے برائی پر آمادہ کر رکھا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کو چند دن ہی گذرے تھے کہ کندورسے گلوٹین کا شکار ہو گیا۔ کندورسے کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کونسا مل سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی جب کہ گلوٹین کا خون آلود پھل اس کی گردن پر جھک رہا تھا اُس نے انسان دوستی اور دانش و خرد پر نہ صرف اپنا اعتماد بحال رکھا بلکہ ان کی آخری فتحمندی کی پیش گوئی بھی کی۔

مغربی ممالک میں نئی روح کو بیدار کرنے اور جدید نظریات کی اشاعت کرنے والوں میں والٹیر اور منتسکو پیش پیش تھے۔ ان کی تحریروں کے باعث عقل و دانش کا احترام اور انسانی حقوق کی پاسداری کا احساس، جو جدید دور کی تعقلیانہ تحریکوں کی خصوصیات میں اٹھارھویں صدی میں ہر کہیں مقبول ہوئے اور انسان دوستی، مروّت، فطری حقوق اور مساوات و اخوت جیسی تراکیب زبان زدِ خاص و عام ہو گئیں۔

قاموسِ علوم کے مرتب کرنے سے دیدرو کا مقصدِ اولیں یہ تھا کہ اوسط درجے کے پڑھے لکھے طبقے کو مروجہ اوہام و خرافات سے نجات دلائی جائے۔ قاموسیوں نے عقلی بنیادوں پر نیا معاشرہ تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ انہیں دانش و خرد پر مکمل اعتماد تھا اور وہ انسان کو فطرتاً صالح سمجھتے تھے۔ ان کے افکار کو مختصر طور پر بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو تین الفاظ کافی ہوں گے — حقیقت پسندی، انسان دوستی، مادیت — وہ سلاطین اور برہمنوں کو بنی نوعِ انسان کے سب سے بڑے دشمن سمجھتے تھے۔ دیدرو کا مشہور مقولہ ہے:

"نوعِ انسان کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوگا جب تک آخری بادشاہ کو آخری پروہت کی انتڑیوں سے پھانسی نہ دے دی جائے گی۔"

سفت شروع ہو کر تحریک خرد افروزی علم و دانش زندگی کے ہر شعبے میں نفوذ کر گئی۔ مذہب، ادبیات، فنونِ لطیفہ، تاریخ نگاری اور سیاسیات پر اس نے گہرے اثرات ثبت کئے۔

ادبیات میں اس کی نمائندگی اس ادبی رجحان نے کی جسے نقادِ ادب کی اصطلاح میں کلاسیکیت کہتے ہیں۔ کلاسیکیوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی مشہور نقادِ ادب بائیلو نے ان الفاظ میں کی ہے: "ادب عقل ہے جس کی ترجمانی یک گونہ ذہنی کی ہو۔" فرانس میں کورنیل، ریسین اور مولیئر کی تمثیلوں اور انگلستان میں پوپ کی شاعری اور جین آسٹن کے ناولوں میں یہ رجحان نمایاں طور پر موجود ہے۔

کلاسیکیت کے بنیادی اصول تین تھے۔ اسلوبِ نگارش کی اہمیت، بیان کی شستگی، انضباط۔ یہ خصوصیات ورسائی کے محلوں سے لے کر ولندیزی مصوّر ریوبنز، فرانسیسی مصوّر واتیو، انگریز مصوروں گینز بارو اور ٹرنر کے نقوش میں مطالعہ کی جا سکتی ہیں۔ موسیقی میں اس کی ترجمانی باخ اور اس کے متبعین نے کی تھی۔

تاریخ نگاری میں انگریز مورخ گبن اس تحریک کا مشہور علمبردار ہے۔ "زوال و سقوطِ روما" میں اس نے قدمائے یونان و روما کی پرجوش مدح سرائی کی ہے وہ کہتا ہے کہ یونان و روما کے دورِ عروج میں فرد کو جماعت کا جزوِ ترکیبی سمجھا جاتا تھا اس لئے اخلاق و سیاسیات کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ہر فرد سے یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ اپنی صلاحیتیں معاشرے کی تقویت و فلاح کے لئے وقف کر دے گا۔ گبن کے خیال میں عیسائیت نے شخصی اخلاق و کردار اور معاشرے کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی کیونکہ عیسائیت نے اجتماعی مفاد کو پسِ پشت ڈال کر شخصی نجات کے حصول کو فرد کی زندگی کا واحد نصب العین قرار دیا۔ اس سے فردیت (Individualism) کے تخریبی رجحان کو پنپنے کا موقع مل گیا۔ فردیت کا لازمی نتیجہ رہبانیت، مردم بیزاری، مریضانہ زہد و تقشف اور خود غرضی کی صورت میں رونما ہوا جس سے فرد کا رشتہ جماعت سے منقطع ہو گیا اور جماعت کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا۔ اسی بنا پر گبن زوالِ روما اور عیسائیت کی فتح کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "عیسائیت اور بربریت کو فتح حاصل ہوئی اور مغرب پر ازمنۂ تاریک کا گھٹا ٹوپ اندھیرا محیط ہو گیا۔"

رومانیت

رومیوں کے دورِ تسلط میں فرانس میں جو ملکی زبان ظہور پذیر ہوئی اسے "رومانا لنگوا" کا نام دیا گیا۔ یہ عوام کی بولی تھی۔ اس میں جو قصے لکھے گئے وہ رومان کہلائے۔ بعد میں رومان کا اطلاق شجاعانہ قصوں پر ہونے لگا۔ انگلستان میں لفظ رومان کی ترویج سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں ہوئی۔ اس زمانے میں انگلستان میں یہ لفظ تحقیر و تنقیص کے اظہار کے لئے بولا جاتا تھا۔ گوئٹے اور شیلر نے مروجہ مفہوم میں رومانی شاعری اور ناول کی بنیاد رکھی۔ گوئٹے کی "ورتھر" رومانیت کے اولین صحائف میں شمار ہوتی ہے لیکن اواخرِ عمر میں گوئٹے نے کلاسیکیت سے رجوع کر لیا تھا اور کہا کرتا تھا "کلاسیکیت صحت ہے اور رومانیت مرض"۔ جرمنی کی اس تحریک کو "سٹرم ونڈ ڈرینگ"[۱] کا نام دیا گیا ہے۔ ہرڈر، لسنگ اور ونکل مان بھی اسی تحریک سے وابستہ تھے۔ رومانیت اپنے وسیع مفہوم میں اس ردِ عمل کی نمائندگی کرتی ہے جو اٹھارھویں صدی کے اواخر میں خرد افروزی کے خلاف ہوا تھا۔

عام طور سے روسو کو "رومانیت کا باپ" کہا جاتا ہے۔ وہ والٹیر اور منٹسکو کا معاصر تھا۔ اس نے سب سے پہلے قاموسیوں کی عقلیت کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ ایک دلچسپ واقعہ سے قاموسیوں اور روسو کے نقطۂ نظر کے اختلاف کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ایک دفعہ روسو نے اپنے مقالات کا ایک چھپا ہوا مجموعہ والٹیر کے پاس تبصرے کے لئے بھیجا۔ والٹیر نے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد روسو کو خط لکھا:

"نوعِ انسان کے خلاف جو نئی کتاب تم نے لکھی ہے مجھے مل گئی۔ شکریہ۔ ہم سب کو احمق بنانے کے لئے آج تک کسی شخص نے ایسی ذہانت سے کام نہیں لیا ہوگا۔ تمہاری کتاب پڑھنے کے بعد بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چاروں ٹانگوں کے بل چلنا شروع کر دوں لیکن ساٹھ برس سے مجھے اس کی عادت نہیں رہی۔ افسوس کہ میں یہ عادت دوبارہ اختیار نہیں کر سکتا۔"

---

(۱) Sturm and Drang.

قاموسیوں کو انسان کی عمرانی ترقی اور اس کے درخشاں مستقبل پر کامل اعتماد تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مشکلات اور حوادث کے باوجود انسان روز بروز ہمہ گیر فلاح و بہبود کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ روسو نے اس خیال کی پُرزور تردید کی اور کہا کہ عقلی استدلال اور فلسفیانہ تدبر و تفکر غیر فطری ہے جس چیز کو تہذیب و شائستگی کا نام دیا جاتا ہے وہ محض تنزل کا دوسرا نام ہے۔ تہذیب انسان کو فطرت سے دور لے جاتی ہے۔ بنی نوع انسان کی بہتری اسی میں ہے کہ فطرت کی طرف واپس لوٹ جائے۔ بعد کے رومانی شعراء نے روسو کے اس عقیدے سے پر مسلکِ فطرت پرستی کی بنیاد رکھی۔ ورڈز ورتھ نے تو معرفتِ فطرت کا ایک اچھا خاصا متصوفانہ نظریہ بھی مرتب کر دیا۔ کارلائل اور کولرج جرمن رومانیت سے متاثر ہوئے تھے۔ کولرج کی وساطت سے یہ تحریک انگلستان میں شیوع پذیر ہوئی۔ انگریزی رومانیت کا آغاز ۱۷۹۸ء میں ورڈز ورتھ اور کولرج کی غنائی نظموں کی اشاعت سے ہوا۔ انقلابِ فرانس کے ہنگامے اور نپولین کی فتوحات سے بددل ہو کر جب کولرج اور ورڈز ورتھ رجعت پسندی کی طرف مائل ہو گئے تو شیلی اور کیٹس نے اس کا احیا کیا۔ فرانس میں یہ تحریک ۱۸۲۰ء میں لیمارتن کے "مراقبات" کی اشاعت سے مقبول ہوئی۔ وکٹر ہیوگو، دی مسے اور الگزنڈر ڈوما اس کے مشہور ترجمان تھے۔ امریکہ میں تھورو نے اسے سندِ قبولیت بخشی۔

ادبی لحاظ سے رومانیت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں پرجوش جذبات کے بے ساختہ اظہار کو اولین اہمیت دی جاتی ہے۔ رومانی شاعر یا ادیب اظہارِ نفس کے راستے میں کسی قسم کی مزاحمت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے ہاں موضوع ہیئت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ وہ تخیلات اور محسوسات کو اسالیب کی پابندیوں سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ رومانی ناول نگار ایسا ماحول پیش کرتے ہیں جس میں کسی نہ کسی قسم کی غرابت اور اجنبیت پائی جائے۔ ان لوگوں نے عجیب و غریب مہمات، بھوت پریت کے قصوں، شکستہ محلات، ناکام عشاق، خانماں برباد زمیں زادوں کے حالات اور سحر و سیمیا کے واقعات پیش کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رقیق جذباتیت کے باعث یہ ناول صرف طفلانہ طبائع ہی کو محظوظ کر سکتے ہیں۔ جیرالڈ اپنی تالیف "مقدمہ ادبیاتِ عالم"[1] میں لکھتے ہیں:

> "رومانیت کا مطلب مریضانہ انانیت، جنون اور کجروی ہے۔ رومانی تمام دنیا سے برسرِ پیکار رہتا ہے اور تمام خارجی بندشوں کو خیرباد کہہ کر اپنی ہی عظمت اور الوہیت کا اعلان کرتا ہے۔ وہ روحانی اور ذہنی عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کی شاعری یا نثر بچوں اور ناپختہ ذوق لوگوں کے لئے ہی کشش کا باعث ہو سکتی ہے۔"

انگلستان کے مشہور ناقدِ ادب ایف۔ آر۔ لوکس اپنی تصنیف "رومانی نصب العین کا زوال و ہبوط"[2] میں رقم طراز ہیں:

> "رومانیوں کی انا پرستی اور دیوانگی اور ... حواس کو رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ان کا مذاق بھی عجیب و غریب تھا وہ سبز بالوں، نیلے گلاب کے پھولوں اور سیاہ فام عورتوں کو پسند کرتے تھے۔ اس تحریک نے مکروہ خواہشات کو ہوا دی، ایذا دہی اور ایذا پسندی کے جذبات کو اکسایا۔ اسی لئے گوئٹے نے اسے مرض سے تعبیر کیا تھا۔ ایڈگر ایلن پو کے دہشت ناک افسانے اور بادلیئر کی شاعری اس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس عہد کے فرانسیسی رومانی اپنی داشتاؤں کو تارک الدنیا کے راہبوں کا لباس پہناتے تھے اور اتوار کے دن اکٹھے ہو کر شیطان کی پرستش کرتے تھے۔ علاوہ ازیں محرمات کے معاشقے بھی ان کا دل پسند موضوع تھا۔ والپول کی پُراسرار ماں، ڈرائن اور شیلی: فرہاد اور پریسینا۔ بائرن کی ذہنی زندگی، اور بعد میں جیرار دی نروال کی "چامورا" میں اس رجحان کا کھوج ملتا ہے۔ مرگ پسندی کی انتہا یہ تھی کہ دی مسے کے ساتھ معاشقے کے خاتمے پر جارج ساں نے ایک کھوپڑی خریدی اور اس میں اپنے عاشق کا آخری خط محفوظ کر لیا۔ وکٹر ہیوگو اپنے کمرے کے آتش دان پر کلاک کے بجائے کھوپڑی رکھتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ وقت کا بہترین پیمانہ ہے۔ اس طرح موت، فنا، بربادی اور

---

[1] Preface to World Literature [2] Decline and Fall of Romantic Ideal.

تنزل کے ساتھ رومانیوں کا مریضانہ شغف واضح ہوتا ہے   آج کل ڈی۔ ایچ۔ لارنس میں یہ ایذا دہی بھر ابھر رہی ہے۔ اس کے شتر ن خوان آمدہ آنکھوں سے یہی حسین محبوباؤں کو اپنی آغوش میں لیتے ہیں۔ مثلاً لارنس بجائے دماغ کے ہڈی کے گودے سے سوچتا ہے۔ کہتا ہے:

خدا مجھے ان خیالات سے محفوظ رکھے جو
صرف ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔
وہ شخص جو دوامی گیت گاتا ہے
ہڈی کے گودے سے سوچتا ہے۔

ڈی کوئنسی کا قول ہے "اگر ابلیس کے غرور و تجبر کے ذکر کی ضرورت پیش آئے تو اس کی تصویر ورڈزورتھ کے مشابہ ہوگی" بائرن کی انانیت زیادہ جارحانہ ہے۔ وکٹر ہیوگو اپنی داشتہ کو خط میں لکھتا ہے "میرا مقابلہ یسوع مسیح سے کیا جائے۔ ایک زمانہ آئے گا جب یسوع مسیح کی بجائے لوگ وکٹر ہیوگو سے ایک نئے سنہ کا آغاز کریں گے۔"

یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ مشاہیر رومان غیر متوازن طبائع رکھتے تھے اور بقول جیرالڈ "ذہنی عذاب" میں مبتلا تھے۔ روسو کا اپنا ذہن ناہموار تھا۔ وہ ساری عمر اس وہم کا شکار رہا کہ دنیا بھر کے لوگوں نے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ ہیوم کے بقول اپنے ذہنی خلفشار اور عجیب المزاجی کے باعث وہ ایسے شخص کی مانند تھا جیسے جاڑے کی برفبار رات کو مادرزاد برہنہ کر کے باہر گلی میں دھکیل دیا گیا ہو۔ اس نے شائستگی اور تمیز کے تمام لوازم اور معاشرے کے جملہ آداب کو یک قلم ترک کر دیا تھا اور اوباش پن اور وارستہ مزاجی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ وہ مذہب کا حامی تھا لیکن اخلاق سے بیگانہ تھا۔ اس کا قول ہے کہ فرانس بھر میں صرف میں ہی ایک ایسا شخص ہوں جو خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ اس کی حالت یہ تھی کہ ہوٹل کی ایک ملازمہ تریسیں کو بطور داشتہ گھر میں ڈال رکھی تھی۔ اس کے بطن سے جو پانچ بچے پیدا ہوئے ان کی کفالت یا پرورش کرنے کی بجائے سب کو یکے بعد دیگرے "حرامی بچوں کے گھر" پھینک آیا۔ اسی طرح بلیک، واگنر، بائرن وغیرہ کی رومانیت نے کلاسیکی روایات و اسالیب کے ساتھ آداب اخلاق کو بھی دھتا بتا دی تھی۔ واگنر عورتوں کا لباس پہن کر سرِ بازار پھرتا تھا۔ بائرن اپنے فسق و فجور کی داستانیں برسرِ عام فخریہ بیان کرتا تھا اور اپنے فطرتاً خبیث ہونے پر نازاں تھا۔ وہ اکثر اپنے آپ کو ابلیس اور قابیل کہا کرتا تھا۔ ایک جگہ کہتا ہے:

He who threw
Enchantment over passion and from woe wrung
Overwhelming eloquence oft he knew
How to make madness beautiful and cast
O'er erring deeds and thoughts a heavenly hue.

بائرن سچ کہتا ہے۔ دیوانگی اور کجروی کو حسین پیرائے میں بیان کرنا ہی رومانیت ہے۔ رومانیوں کی سطح بینی اور تہی مغزی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے سی۔ ای۔ ایم جوڈ[1] لکھتے ہیں:

"مجھے رومانیت اور رومانیوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ رومانی اپنے زعم میں زندگی کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتے ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ اس قسم کی گہرائیوں کا وجود ہے لیکن بسا اوقات ایک رومانی سمجھتا ہے کہ وہ زندگی کے سرچشمے تک جا پہنچا ہے جب کہ وہ صرف سطحِ آب پر کا پانی اچھال رہا ہوتا ہے۔"

فرانس کے ایک نقاد لوئی ری نیو[2] نے رومانیت پر محاکمہ کرتے ہوئے کہا ہے:

---

۱ The Book of Joad.   ۲ French Romanticism.

"رومانیت میں عقلیت کی بجائے جبلت، قانون کی بجائے رواج، معاشرے کی بجائے فرد، اخلاقی و فنی ضوابط کی بجائے انفرادیت، جذباتی ہیجان اور تخیل کی بے راہ روی کو اختیار کیا گیا ہے"

عمرانی پہلو سے رومانیت، معاشرے کی پابندیوں کے خلاف فرد کے شدید ردِ عمل اور بغاوت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس پہلو سے فردیت اس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے (فردیت کو انفرادیت سے مخلوط نہ کیا جائے۔ اس کا مطلب ہے فرد کا اجتماعی مقتضیات و عوامل سے قطع نظر کر کے اپنے ہی من میں حقائق کو تلاش کرنے کی کوشش کرنا اور اپنی ہی ذات کو صداقت کا معیار سمجھنے لگنا) عقلیت اور کلاسیکیت نے اجتماع کی اہمیت، ضبطِ نفس، اسالیبِ آداب کی پابندی پر زور دیا ہے۔ رومانی شخص، احساسات کے پرجوش اظہار کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں عقل و فکر، اخلاقی قیود اور اسالیبِ آداب کی پابندی سے انسان کے جذبات کی فطری تازگی سلب ہو جاتی ہے جس سے انسان کی شخصیت دب کر فنا ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض حالات میں معاشرے کی رسوم و قیود فرد کی تخلیقات میں مانع ہوتی ہیں اور اس کی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں لیکن بغاوت کے جوش میں رومانی شدت پابندی اور بے راہ روی کے شکار ہو گئے۔ روسو نے کہا تھا "انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ پابہ زنجیر ہے" اور یہ آزادی فطرت کی طرف لوٹ آنے سے ہی میسر آ سکتی ہے۔ یہاں اس نے آزادی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ آزادی سے مراد جبلت کی آزادی یا شہوانوں کی آزادی نہیں ہے۔ انسان معاشرتی فرائض و حقوق کی ادائگی سے ہی سچی آزادی حاصل کر سکتا ہے

ہمارے زمانے میں رومانی بے راہ روی کی مثال ڈی۔ ایچ۔ لارنس نے پیش کی ہے۔ اس کا ایک افسانہ ہے "ایک شخص جو جزیروں سے محبت کرتا تھا" اس افسانے کا ہیرو ترکِ علائق کر کے جنگل کی راہ لیتا ہے اور وہاں بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ فردیت کا یہ مریضانہ تصور جو رومانیت کا لازمہ ہے بنیادی طور پر سطحی اور تخریبی ہے۔ جیسا کہ جے۔ ایس۔ ہالڈین نے ثابت کیا ہے شخصیتِ انسانی زمان و مکان اور گرد و پیش کے عوامل سے الگ کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی۔ ارسطو نے بھی اس حقیقت کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلائی تھی کہ "کوئی آدمی جو شہری نہ ہو انسان کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ فرد جماعت سے وابستہ رہ کر ہی تکمیلِ ذات کر سکتا ہے۔ اخلاقیات کا بنیادی تعلق معاشرتی زندگی سے ہے کیونکہ معاشرے سے بے تعلق ہو کر خیر و شر میں تمیز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ رومانی مثالی فرد سے مثالی جماعت کی جستجو کا آغاز کرتے ہیں حالانکہ مثالی فرد کی جستجو کا آغاز مثالی جماعت سے ہونا چاہئے۔ جب وہ انسان کو "فطرت کے قریب آنے" کی تلقین کرتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فرد معاشرے کے عائد کردہ فرائض اور حقوق کو خیر باد کہہ دے۔ وہ اس بات سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں کہ اس مفہوم میں فطرت کے قریب آنے کی بجائے وہ الٹا اس سے دور ہو جائے گا۔ کیونکہ مل جل کر رہنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ دنیائے فلسفہ میں روسو نے جرمن مثالیت کو متاثر کیا۔ کانٹ روسو کا بڑا مداح تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نطشے اسے طنزیہ moral fanatic à la Rousseau کہا کرتا تھا۔ روسو کی تقلید میں کانٹ نے بھی فلسفیوں کے خلاف قلم اٹھایا۔ اس کے بعد فشٹے، شوپنہار، شیلنگ اور نطشے نے اس جہاد کو جاری رکھا۔

رومانیت فی الحقیقت خرد دشمنی کی روایت کی ہی ایک فرع ہے۔ فلسفہ میں رومانیت اور خرد دشمنی مترادفات سمجھے جاتے ہیں۔ جرمن مثالیت پسندوں کی طرح ان کی تقلید میں بعد کے مفکرین برگساں، ولیم جیمز، ایوکن وغیرہ بھی وجدان اور ارادے کو عقل سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ہمارے ہاں شیخ محمد اقبال نے خرد دشمنی کی اس روایت کی ترجمانی کی ہے۔ شیخ صاحب کا نظریۂ حیات بنیادی طور پر رومانی ہی تھا۔

جرمن مثالیت کا مرکزی تصور یہ ہے کہ حقیقتِ کل ایک زندہ، روحانی، ذی شعور و ارادہ ہستی ہے جو اپنی جملہ خصوصیات اور کیفیات سمیت انسانی ذہن میں جلوہ گر ہے۔ دوسرے الفاظ میں تمام کائنات میں ایک ہمہ گیر شعور کارفرما ہے جو نوعی لحاظ سے انسانی ذہن کے مماثل ہے۔ یاد رہے کہ وجودیوں نے بھی مختلف

پیرایۂ بیان میں اسی خیال کا اظہار کیا تھا۔ یہ نقطۂ نظر بدیہی طور پر تشبیہی[۵۱] ہے۔ اس میں فرد کے نفس یا نشٹے کی اصطلاح میں "انا" کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔

جرمن مثالیت کی وساطت سے رومانیت سیاسیات پر بھی اثر انداز ہوئی۔ لارڈ برٹرنڈ رسل کے بقول "رومانی روایت فکر بائرن، شوپنہار اور نطشے سے ہوتی ہوئی مسولینی اور ہٹلر پر منتہی ہوئی۔"[۵۲]

نپولین نے جرمنوں کو جنگ جینا میں سخت شکست دی تھی جس سے ان کی قومی انا مجروح ہوگئی۔ اپنی شکستہ دل قوم کے اعتمادِ نفس کو بحال کرنے کے لیے فشٹے نے اپنے مشہور خطبات لکھے جن میں اس نے اپنے ہم وطنوں کو یقین دلایا کہ وہ دنیا کی برگزیدہ ملت ہیں جنھیں مقدرِ انسانی نے اقوامِ عالم کی قیادت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ بعد میں ہیگل نے بھی اسی سے ملتے جلتے دلائل سے پرشیا کے استبداد کا جواز پیش کیا تھا۔ بسمارک، قیصر، ہٹلر اور دوسرے فاشسٹی اسی اندازِ نظر کی تخلیق سمجھے جا سکتے ہیں۔ رومانیت کے سیاسی پہلو پر بحث کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں:

> "انا کی بے راہ روی کا سامان بہم پہنچا کر رومانیت نے معاشرتی توازن و اشتراک کو ناممکن العمل بنا دیا اور اس کے پیروؤں کے سامنے دو راستے کھول دیئے، قزاق کا راستہ اور مستبد کا راستہ۔"

کلیسا نے بڑے جوش و خروش سے رومانیت کا خیر مقدم کیا تھا۔ بنظرِ غور دیکھا جائے تو تشبیہ پسندی، قنوطیت اور خرد دشمنی کی خصوصیات کلیسا اور رومانیت میں مشترک ہیں۔ کلیسا نے روسو، کانٹ اور شوپنہار کے نظریات سے اپنے عقائد کی توثیق میں بڑی مدد لی ہے اور ان کے دلائل کلیسا کے جدید علم کلام کے لازمی اجزا بن گئے ہیں۔ ول ڈیورنٹ کا خیال ہے کہ سائنس کے انکشافات سے انسان کی انا کو جو ٹھیس سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں پہنچی تھی، رومانیت میں اسی کا مداوا تلاش کیا گیا ہے۔ اُن کے الفاظ ہیں:

> "جرمنی میں رومانیت کا نشو و نما موضوعیوں کی تشبیہ کے خلاف ردِ عمل سے ہوا تھا۔ سائنس کے انکشافات، بالخصوص کوپرنیکس کے اس نظریے نے کہ کرۂ ارض کائنات کا مرکز نہیں بلکہ دوسرے سیاروں کی طرح ایک معمولی سیارہ ہے جو کائنات کی بے پایاں وسعتوں میں سورج کے گرد گردش کر رہا ہے، انسان کے امتیازی مقام اور اس کی [illegible] کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی [illegible] نے اس کی تسلی کے لیے فلسفہ گھڑ لیا کہ کائنات انسانی ذہن کی مخلوق ہے۔ [illegible] رومانیت کا مرکزی خیال یہی ہے۔ اس طرح گویا انسان کو دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام واپس مل گیا اور اس خیال سے اس کی [illegible] تسکین ہوگئی کہ کائنات وسیع و بسیط ہونے کے باوجود انسانی ذہن کی ہی تخلیق ہے۔ اس لحاظ سے رومانیت مذہبیت کی ہی بدلی ہوئی صورت ہے۔"

حقیقت پسندی

انیسویں صدی کے نصف ثانی میں حقیقت پسندی کے خد و خال نمایاں ہونے لگے تھے۔ فلسفے میں کانٹ، ہیگل اور اُن کے پیرووں کے نظریات پر کڑی تنقید کی گئی جس سے جرمنی میں تحریک مادیت[۵۳] کا آغاز ہوا۔ فوگٹ، مولشاٹ اور بخنر نے مثالیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ایجابیت[۵۴]، افادیت[۵۵]، نتائجیت[۵۶] اور جدلی مادیت[۵۷] حقیقت پسندی کے رجحان کی ہی مختلف صورتیں سمجھی جا سکتی ہیں۔ حقیقت پسندوں اور تجربیوں نے جرمن مثالیت کی ابدی اور تجریدی صداقتوں سے انکار کیا اور انسانی مشاہدے کو ادراکِ حقیقت کا ذریعہ قرار دیا۔ اس لحاظ سے حقیقت پسندی میں لاک، ہیوم اور فرانسیسی قاموسیوں کے نقطۂ نظر کی ہی نئے سرے سے توثیق کی گئی ہے۔

---

۵۱ Anthropomorphic (انسان کو اپنی ذات پر قیاس کرنا)
۵۲ Mansions of Philosophy
۵۳ Materialmusstreit
۵۴ Positivism
۵۵ Utilitarianism.
۵۶ Pragmatism.
۵۷ Dialectical Materialism.

ایجابیت کا بانی اگسٹس کومٹ کہتا ہے کہ سائنس کے اصول و قوانین صرف تجربے اور مشاہدے سے ہی دریافت کئے جا سکتے ہیں اور اسی طریقے سے حاصل کیا ہوا علم زندگی کے مختلف شعبوں میں بکارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے خیال میں اس نوع کا ایجابی علم لازماً ارتقائی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے عملِ ارتقا کے تین مراحل مقرر کئے۔ ۱۔ مذہبی۔ ۲۔ مابعد الطبیعی اور ۳۔ ایجابی۔ وہ کہتا ہے کہ سائنس کی ترقی و ترویج کے باعث انسان پہلے دو مرحلوں کو طے کر کے اب ایجابی دور میں داخل ہو چکا ہے اس لئے مذہبی معتقدات اور مابعد الطبیعی افکار اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ کومٹ رب کے وجود کا منکر تھا اور کہتا تھا کہ حقائقِ علمی کا حصول صرف معروضی طریقے سے ہی ممکن ہے۔ اُسے اس بات کا یقین تھا کہ ہمدردیٔ انسان کا جذبہ (altruism یہ ترکیب بھی اسی کی وضع کی ہوئی ہے) بالآخر اس کی خود غرضی پر غالب آ جائے گا۔ اس نے انسان دوستی کے نصب العین پر بطورِ خاص زور دیا اور کہا کہ تاریخی عمل اس نصب العین کے حصول پر منتہی ہوگا۔ اس کے خیال میں اس دنیا میں اگر کوئی چیز لائقِ پرستش ہے تو وہ یہی نصب العین ہے۔ اسی بنا پر ٹی ایچ ہکسلے نے کومٹ کے انسان دوستی کے نظریے کو Catholicism without Christianity کا نام دیا تھا۔ ولیم جیمز انگریزوں کی تجربیت[1] سے متاثر تھا۔ اس نے امریکہ میں نتائجیت کی اشاعت کی۔ نتائجیت کو لاادریت[2] کی ایک شاخ سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی رو سے بھی کانٹ کے مسلک کی طرح بنیادی عقیدوں کی عقلی توجیہ ناممکن ہے۔ ولیم جیمز اور اس کے پیرووں کا خیال ہے کہ انسان کے ارادے اور اس کے فعل سے الگ کسی صداقت کا وجود نہیں ہے۔ صداقت وہی ہے جس پر اعتقاد رکھنے سے انسان کو عملی فائدہ پہنچے۔ ولیم جیمز تجریدی مثالیت[3] کے تصورات پر چڑھ دوڑتا ہے اور اس کے وجودِ مطلق کو مابعد الطبیعی مفروضہ کا نام دیتا ہے۔ اس کے خیال میں اگر خدا کی ہستی پر ایمان رکھنے سے انسان کو کوئی عملی فائدہ پہنچتا ہے تو ... یہ دونوں باتیں چنداں متناقض نہیں۔ گویا خدا پر ایمان لانا اس لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ فی الواقع موجود ہے بلکہ اس لئے لازم ہے کہ اس عقیدے سے انسان کو عملی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہماری تاریخ میں اس نقطۂ نظر کی ایک دلچسپ مثال موجود ہے۔ جب چھٹی صدی عیسوی میں بدھ مت جاپان میں پہنچا تو حکومت کو اس مذہب کی صداقت میں شک ہوا چنانچہ شہنشاہ نے اپنے ایک درباری کو حکم دیا کہ وہ تجربۃً بدھ مت اختیار کرے۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اگر بدھ مت قبول کرنے کے بعد اس درباری کی دنیوی حالت بہتر ہو گئی تو سب لوگ بدھ مت اختیار کر لیں گے۔

"برٹرینڈ رسل[4] نے نتائجیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس نظریے میں قوت کو ہی صداقت کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ متحارب جماعتوں میں سے کونسا فریق حق بجانب ہے ہمیں نتائج کا انتظار کرنا پڑے گا جو فریق اپنے مخالف پر غالب آ گیا وہی حق بجانب سمجھا جائے گا۔ اس طرح یہ فلسفہ بالآخر قوت کے استعمال پر منتہی ہوگا کیونکہ اس کی رو سے عسکری طاقت ہی حق و باطل کا تعین کر سکتی ہے۔ جو قوم فوجی لحاظ سے طاقتور ہوگی وہی حق بجانب ٹھہرے گی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ لگام ہیں جمہوریت اور باہمی مروت۔ اہلِ مغرب بالعموم اس نظریے پر کاربند ہیں۔ وہ مذہب کی ازلی اور ابدی صداقتوں اور مسیحی انسان دوستی کا دم اس لئے بھرتے ہیں کہ اس سے انہیں عملی فائدے پہنچ رہے ہیں۔"

جن فلاسفہ نے ہیگل کے خلاف جرمنی میں احتجاج کیا تھا ان میں شوپنہاور، فختے، ہربارٹ اور فائر باخ قابلِ ذکر ہیں۔ فائر باخ کو ہیگل اور کارل مارکس کے درمیان ایک ضروری واسطے کا مقام حاصل ہے۔ اس نے ہیگل کے جدلی نظریے کی تردید کی اور کہا کہ مثبت اور منفی تصورات کے پیہم تصادم سے ہیگل نے جو نقشہ تعمیر کیا تھا وہ خالص خیال سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ فائر باخ کی تنقید نے ایک شارح کے الفاظ میں "ہیگل کے فلسفے کو جو سر کے بل کھڑا تھا دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔"

کارل مارکس بھی اوائل میں ہیگل کا معتقد تھا۔ فائر باخ کی تنقید سے متاثر ہو کر وہ ہیگل کے نظریات کا مخالف ہو گیا اور بعد میں اپنے مستقل مکتبِ فکر

ف[1] Empiricism
ف[2] Agnosticism
ف[3] Absolute Idealism.
ف[4] New Hopes for a Changing World.

جدلی مادیت کو مرتب کیا مارکس نے عمل تاریخ کی ترجمانی اقتصادی نقطۂ نظر سے کی۔ برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں :

"بحیثیت ایک مفکر کے کارل مارکس راسخ پر ہے۔ اُس کا اصل اصول یہ ہے کہ تاریخ میں سیاسی، مذہبی اور ذوقی تبدیلیاں اقتصادی تبدیلیوں کے نتائج ہیں، اُن کے اسباب نہیں ہیں۔ یہ عظیم اور نتیجہ خیز نظریہ کارل مارکس کی اختراع نہیں۔ اُس سے پہلے بھی کئی علما نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن مارکس کے لئے یہ بات مایۂ فخر ہے کہ اُس نے اس خیال کو اپنے تمام اقتصادی نظام کی بنیاد بنا دیا ہے۔"

مارکس نے ہیگل کی پیکارِ تصورات کو طبقاتِ معاشرہ کی آویزش میں منتقل کر دیا۔ اُس کا نظریہ مادی ہے کیونکہ اُس کے خیال میں کائنات اور معاشرہ چند اٹل فطری قوانین کے تحت منازل ارتقا طے کر رہے ہیں۔ اپنی تالیف "سرمایہ" میں لکھتا ہے :

"ہیگل کے نزدیک عملِ تفکر جسے وہ تصور (idea) کا نام دیتا ہے حقیقی دنیا کا خالق ہے۔ اس کے برعکس میرے نزدیک محض مادی شے ہے جس کا عکس ذہنِ انسانی پر پڑتا ہے اور خیالات کا پیکر اختیار کر لیتا ہے۔"

مارکس نظریے اور عمل میں کسی قسم کی تفریق کا قائل نہیں ہے۔ اُس کا قول ہے "فلسفہ کا کام دنیا کی ترجمانی کرنا نہیں ہے بلکہ اُسے بدل دینا ہے۔" اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لارڈ برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں :

"ہمارے خیال میں مارکس کا مفہوم یہ ہے کہ معروض (object) اور موضوع (subject) یعنی عالم اور معلوم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اُس نے اس عمل کو جدلیاتی کہا ہے کیونکہ یہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتا۔ مارکس کے خیال میں عمل تاریخ کا محرک وہ تعلق ہے جو انسان مادے سے پیدا کرتا ہے اور جس کا سب سے اہم ظہور طریق پیداوار میں ہوتا ہے۔ اس طرح مارکس کی مادیت مجبوراً اقتصادی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔"

راقم کے خیال میں مارکس کے نظریے میں تین تحریکوں کا امتزاج عمل میں آیا ہے۔ ۱۔ کلاسیکی جرمن فلسفہ۔ ۲۔ انگریزوں کے سیاسی اور اقتصادی نظریات اور ۳۔ فرانسیسی قاموسیوں کی اشتراکیت اور انقلابیت۔

ادبیات اور فنون میں حقیقت نگاری کا آغاز رومانیوں کی رقیق جذباتیت اور ذوقِ غرابت کے خلاف بغاوت سے ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں عوام کی ہمہ گیر بیداری کے آثار محسوس و نمایاں ہونے لگے تھے۔ اس عہد کے اکثر اہل قلم زیریں متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو دوسرے طبقے کے معاشرتی تفوق اور اقتصادی تسلط سے نالاں تھا اس لئے قدرتی طور پر ان ادبا کو عوامی زندگی سے دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہو گئی چنانچہ جرمنی، فرانس، انگلستان اور روس کے شعرا اور ناول نگار روزمرہ کی شہری اور دیہاتی زندگی پیش کرنے لگے۔ اس طرح ادبیات میں حقیقت نگاری کی داغ بیل پڑی۔ رفتہ رفتہ یہ رجحان دنیائے ادب میں ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کر گیا اور آج بھی جب کہ اس کے متوازی رمزیت، فوق واقعیت، ماورار واقعیت اور داداازم وغیرہ کی تحریکیں بن بن کر بگڑ رہی ہیں اس کی اہمیت اور مقبولیت روزافزوں ہے۔

انگلستان میں میری اجورتھ نے غالباً سب سے پہلے دیہاتی زندگی کے جیتے جاگتے نقشے پیش کئے۔ جان کاؤپر پاؤس اور میس نیمفنڈ نے اس رجحان کو تقویت دی۔ ڈکنز کے ناولوں میں اس زمانے کے زیردست طبقے کے مصائب و آلام کی سچی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ ہڈورڈ کا ریبٹر کو کسانوں سے دلی ہمدردی تھی۔ اُس نے اپنے قصوں میں دیہاتی کردار پیش کئے۔ اواخر عمر میں وہ خود کسان بن کر دیہات میں مقیم ہو گیا۔ ٹھیکرے نے امرا کے کردار کو بےنقاب کیا اور کھوکھلے تکلفات کا پردہ چاک کیا۔ فرانس میں بالزاک، فلابیر اور ستاں دال کے ناولوں میں یہ تحریک پروان چڑھی۔ ایک ناقد کے بقول "ڈکنز اور بالزاک کے ناول زندگی سے گریز نہیں سکھاتے بلکہ زندگی سے تعارف کراتے ہیں۔" ستاں دال نے ناول کی تعریف میں کہا ہے "ناول ایک ایسا آئینہ ہے جو شاہراہ پر چلا جا رہا ہو" سولو غب نے کہانی

منفعا شیطان کی عذر خواہی کرتے ہوئے کہتا ہے "میں نے اپنے پاس سے کچھ نہیں لکھا بلکہ محض ایک آئینہ صیقل کر کے رکھ دیا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ آئینہ صاف اور مجلّی ہے۔" گونکور برادران، زولا اور موپاساں میں حقیقت نگاری کا رجحان فطرت نگاری[۱۵] کی صورت اختیار کر گیا اور اطالوی ادیب پیرآن دیلو نے اس کا رخ اظہاریت[۱۶] کی طرف موڑ دیا۔ حقیقت نگاری کی ایک شاخ نے بیسویں صدی کے اوائل میں ترقی پسندی کا نام پایا۔ امریکہ میں برٹ ہارٹ اور مارک ٹوین نے قدامت پسندی اور رومانیت کی مخالفت کا آغاز کیا تھا۔ تمثیل نگاری میں ابسن نے حقیقت نگاری کی نمائندگی کی اور اپنی تالیفات میں معاصر معاشرے کی اجتماعی الجھنوں کو بنا خاص موضوع بنایا۔ جرمنی میں ہاپٹ مان نے اپنی مشہور تمثیل "بافندے" میں ان دستکاروں کی زبوں حالی کا دلدوز نقشہ کھینچا جنھیں کلوں کے رواج نے بیکار کر دیا تھا۔ انگلستان میں جارج برنارڈ شا نے نئے معاشرے پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور اس کے داخلی تضاد کو واضح کیا۔ مصوری میں حقیقت نگاری کا آغاز کوربے سے ہوا اس کے نقوش میں اس عہد کی روزمرہ کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ ماقبل رفائیلی بھی حقیقت نگار تھے اور نقش گری میں تفصیل نگاری کو اہم سمجھتے تھے جو اس مکتب کی نمایاں خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

روسی ادب کو اس لحاظ سے مستثنیٰ مقام حاصل ہے کہ وہاں ادب کا آغاز ہی حقیقت نگاری سے ہوا تھا۔ روسی ادبا و شعرا رومانیت سے بہت کم متاثر ہوئے۔ پشکن کی پہلی نظم ۱۸۲۰ء میں شائع ہوئی تھی جس میں بائرن کی رومانیت کے اثرات جھلکتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ اس کی سلامتیٔ طبع اس غیر ملکی رجحان پر غالب آ گئی۔ اس دور کی نظموں میں بھی اس کی طبعی رجائیت رومانی قنوطیت پر غالب تھی۔ ایک نظم کا ترجمہ درج ذیل ہے:

شراب پرانی ہو کر تیز تر ہو جاتی ہے
میں اواخر عمر میں ماضی کے بوجھ کے نیچے دب گیا ہوں
راستہ دھندلا ہو گیا ہے اور طوفانی سمندروں کی طرح
مصائب و آلام میرا انتظار کر رہے ہیں
لیکن دوستو! میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے مزید زندگی کی آرزو ہے
مجھے مزید خوابوں اور مزید ذہنی اذیت کی ضرورت ہے۔
انتشار طبع، داخلی خلفشار اور پریشانیوں کے ہجوم کے باوجود
مجھے یقین ہے
کہ میں مسرت سے ہمکنار ہو کر رہوں گا

اس کی مشہور داستان "اسنے جن" روزمرہ زندگی کی ایک دلکش کہانی ہے۔ پشکن، کوستوف اور لرمنتوف نے اپنے اکثر کردار عوام کی زندگی سے لیے ہیں اور اپنے قصوں میں لوک کہانیاں پیش کی ہیں۔ ان کہانیوں میں زیردست طبقے کے افراد کی مسرتوں، حسرتوں، خوابوں اور ناکامیوں کو استادانہ چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک نقاد کے بقول پشکن نے "اسنے جن" میں وہی کیا جس کی تحریک شیلے نے بائرن کو کی تھی:

"کوئی ایسی چیز تخلیق کرو جو روحِ عصر کے مطابق بھی ہو اور حسین بھی ہو۔"

گوگول کی "ارواحِ مردہ" میں غالباً پہلی مرتبہ اشتراکی خیالات واضح صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ جب گوگول نے پشکن کو اپنے اس ناول کا ایک باب پڑھ کر سنایا تو وہ بے اختیار چلا اٹھا "خدایا! روسی کیسے غم زدہ لوگ ہیں۔"

---

۱۵ Naturalism ۱۶ Expressionism

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی کو بعض ناقدینِ ادب دنیائے ادب کا عظیم ترین ناول نگار تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ساری عمر کے غور و تدبر کے بعد اواخرِ عمر میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ذاتی ملکیت ہی معاشرے کی سب سے بڑی لعنت ہے اور تمام برائیوں کی جڑ بھی یہی ہے۔ اس نے اپنا ایک مخصوص نظریۂ فن بھی پیش کیا تھا جس پر تبصرہ کرتے ہوئے سی۔ ای۔ ایم جوڈ کہتے ہیں:

> ٹالسٹائی نے اپنی کتاب "فن کیا ہے" میں جمالیاتی قدر کا معیار یہ قرار دیا ہے کہ بلند پایہ فنی کارنامہ اسے قرار دیا جائے گا جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرے گا۔ کسی تصویر، نغمے یا نظم کی فنی قدر و قیمت کا تعین اس بات سے کیا جائے گا کہ اس نے زیادہ سے زیادہ کتنے آدمیوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ اس طرح حسن معروضی نہیں سمجھا جائے گا جو کسی فن پارے میں مستقل طور پہ موجود ہو بلکہ موضوعی ہوگا یعنی سامعین یا ناظرین اپنی پسند سے اس میں جمالیاتی قدر کی تخلیق کریں گے۔

ٹالسٹائی کے اس نظریۂ فن کے اثرات بہت دور رس ثابت ہوئے ہیں۔ اسی کے زیرِ اثر روس کے ناقدِ فن بیلنسکی نے "فن برائے فن" کے خلاف قلم اٹھایا تھا۔ بیلنسکی بھی ٹالسٹائی کی طرح زندگی کو فن سے زیادہ اہم سمجھتا تھا۔

رمزیت

نشاۃ الثانیہ کے ساتھ سائنس کو ترقی نصیب ہوئی تو ازمنۂ تاریک کے اوہام کا طلسم ٹوٹ گیا لیکن باطنیت کے علمبردار اپنے عقائد کی نت نئی توجیہیں کر کے انہیں روشن خیالی کا جامہ پہنانے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ سائنس اور کیمیا یا سائنس اور باطنیت کی یہ کشمکش ہمیں دنیائے ادب میں حقیقت نگاری اور رومانیت یا حقیقت نگاری اور رمزیت کی متوازی کشمکش میں دکھائی دیتی ہے۔

حقیقت پسندی کے زاویۂ نگاہ نے سائنٹفک اندازِ تحقیق کے دامن میں پرورش پائی تھی اور زندگی و معاشرے کے مسائل پر سے رومانی جذباتیت اور رمزیاتی ابہام کے دبیز پردے ہٹا دیئے تھے۔ جس طرح سائنس کے طرزِ تحقیق کو سترھویں صدی سے لے کر آج تک باطنیت اور تصوف کی مخالفت کے باوجود وجدانِ غالب کی حیثیت میسر رہی ہے اور اس کے مقابلے میں کرسچین سائنس، اور تھیاسوفی جیسی تحریکیں ناکام ثابت ہو چکی ہیں۔ اسی طرح حقیقت نگاری کے مقابلے میں رومانیت، رمزیت، مسلکِ لاشعور، وجودیت، داداازم وغیرہ جیسی تحریکیں ناکام رہی ہیں۔ سائنس اور باطنیت یا حقیقت نگاری اور رومانیت کی کشمکش ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کے انجام کے متعلق کسی قسم کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی لیکن اتنا یقینی ہے کہ سائنس نے جن توہمات کے پردے چاک کر دیئے ہیں انہیں باطنیت کے احوال و مقامات سے رفو نہیں کیا جا سکتا اور حقیقت نگاری نے مسائلِ حیات پر تعمیری تنقید کے جو اسالیب وضع کئے ہیں ان پر لفاظی و جذباتیت کی گرفت کبھی مضبوط نہ ہو سکے گی۔

انیسویں صدی کے نصف ثانی میں فرانس کے بعض شعراء نے حقیقت نگاری سے انحراف کر کے رمزیت کی تحریک کو رواج دیا۔ مغرب کی شاعری میں یہ عہد "فن برائے فن" کا ہے۔ انگلستان میں ٹینی سن، میتھیو آرنلڈ اور ماقبل رفائیلی، فرانس میں گاتیئر، بودلیئر اور روس میں الکسی ٹالسٹائی خوابوں کے زرتار جال بن رہے تھے۔ ورلین، میلارمے اور رمبو جو ایڈگر ایلن پو کی کتب کے ترجموں سے متاثر ہوئے تھے اسی تحریک سے وابستہ تھے۔ رمزیت پسند بظاہر رومانیوں اور حقیقت نگاروں کے مخالف تھے لیکن درحقیقت ان کا رشتہ رومانیوں سے اتنا ہی گہرا ہے جتنا حقیقت نگاروں کا کلاسیکیوں سے۔ وہ رومانیوں کی طرح خارج یا معروض سے چنداں اعتنا نہیں کرتے بلکہ اپنے ہی من میں ڈوب کر حقائق کے موتی تلاش کرتے ہیں۔

رمزیت کو وکٹر کزن کے نعرے "فن برائے فن" سے تقویت حاصل ہوئی۔ اس نعرے میں جرمن فلسفی کانٹ کے اس اصول کو پیش کیا گیا تھا کہ آرٹ کو ہر قسم کے خارجی علائق و اغراض سے پاک ہونا چاہیئے۔ "فن برائے فن" کی ترکیب سب سے پہلے گاتیئر نے اپنے رومان میڈموزل دی ماپن ۱۸۳۵ء کے دیباچے میں استعمال کی تھی۔

---

۱ Commonsense Philosophy.

ادب برائے ادب کا مفہوم یہ ہے کہ حسن خود اپنا معیار ہے، مقصود بالذات ہے۔ اسے کسی خارجی معیار پر نہیں جانچا جا سکتا ... اپنے ہی معیار کو مقصود بالذات سمجھتا ہے اور ماہرین حسن ذوق کو واحد معیار مانتے ہیں۔ جمالیین کے خیال میں فن کو استقلال بالکل اسی طرح ... کا معیار ... ہے ... کے صرف تصرف سے باہر ہوں۔ فن کو مذہب، اخلاق، سیاست یا معاشی حدود میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی ... نقادوں ... اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتا ہے خواہ اس کا شعر یا افسانہ مذہب و تصور اخلاق کے منافی ... اپنی ذات کو برقرار رکھنے کے لئے اگر ... نے حضرت سے انحراف کیا تھا تو ... یہ فعل اہل مذہب کے نزدیک قابل مذمت ... قرار دیں گے ... اگر ... کو جلا کر خاک کر دیا تو ... اخلاق اس کی مذمت کرتے رہیں ... شعر ... ذوق کے شعروں کی صورت میں جو ... تھا ایک ... منظر پیش کرتا تھا۔ البرٹ ... لکھتے ہیں:

> "سب سے بڑا ... یہ ہے کہ ... صورت میں ... ہے ... قسم کے نقطہ نظر کو ... کیا ہے۔ اس کا سبب ... انحراف کیا۔ بیکسٹ ... نے خدا اور ... کا ذکر ... محسوس کرنے لگا ... یہ ہے کہ وہ ایک سچا شاعر تھا اور بغیر ... مجرموں اور فاسقوں کے حالات میں دلچسپی لیتے ہیں۔"

انتہا پسندی کے باعث فرانس میں فن برائے فن کا نعرہ ... ایک آدمار dogma کی ... تنقید ... فن بے شک ... میں ... ہے کہ کسی خارجی مقصد کے حصول کا وسیلہ نہیں بنایا جا سکتا لیکن فرانسیسی جمالیین نے اس کی ... بنا یا ... کا ... کا تصور پیش کیا یعنی ... کی طرح خارجی عناصر اور ... سے الگ اور مستقل ... موجود ہے ... کہ اسکندریہ کا صوفی مفکر فلاطینوس بھی حسن ازل کو مادی کائنات سے ماورا سمجھتا تھا اور فطرت کے حسن کو ... ایک عکس خیال کرتا تھا۔ فن برائے فن کا تصور بھی ... شدید اور انتہائی صورت ... کی تخمین ہے۔ الفاظ ... بنیادی ... وہی ہے۔ راقم کے خیال میں جمالیاتی قدریں خارج سے ... میں داخل نہیں ہوتیں ... کا تخلیقی بہرصورت ... پر منحصر ہے۔ یہ کہنا غلط اندیشی ہے کہ فن آپ اپنا معیار ہے جس طرح صداقت اور خیر کا ... معاشرہ اور ماحول ہی متعین کرے گا ... خارجی ... معیار ...

فرانس کے "پرناسی شعرا" ... نعرے سے ... تھے ... انتخاب ... کی ... ان کا ... نظر ... تھا ... کہ وہ اسلوب بیان میں کلاسیکی شستگی اور انضباط کا اہتمام روا رکھتے ... بادلیئر کو ... ورلین نے ... پسند ... اسالیب موسیقی سے بھی متاثر ہوئے تھے ... کلاسیکی ... کے اسالیب کے خلاف ... کی پیروی ... نے ... کلاسیکی اسالیب کو خیرباد کہہ دی۔

... پسند ... کے شید ... اور ... کی طرح اپنے ہی نفس کی گہرائیوں کو کھنگالنے کی دعوت دیتے تھے۔ رمزیت، رومانیت اور باطنیت میں قدر مشترک یہ ہے کہ خارجی ماحول اور عمرانی گرد و پیش سے رشتہ منقطع کر کے ایک شخص اپنے نفس میں صداقت، خیر یا حسن کی جستجو کرتا ہے۔ اور ... کوشش غیر فطری ہے اس لئے ... فردیت کا شکار ہو جاتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی تنزل کی ... بڑی ... ہے جیسا کہ ... ہیں ...

---

a) Preface to World Literature

جیرارڈ دی نروال، آسکر وائلڈ اور بادلیئر کی تنزل پذیری کی تہہ میں یہی انفرادیت کارفرما ہے اور اسی کے باعث رمزیت کو تحریکِ تنزل کا نام دیا جاتا ہے۔ اس تحریک کے سب سے بڑے ترجمان ایڈگر ایلن پو اور بادلیئر ہیں۔ ان کے سوانحِ حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داخلیت اور خود مرکزیت کے باعث وہ خارج کے تقاضوں سے بے پروا ہو چکے تھے۔ پو کی شخصیت منقسم (Split-personality) اپنی عمر کا بیشتر حصہ وہ روح فرسا ذہنی کشمکش اور ہذیان کا شکار رہا جو بعد میں جنون میں منتج ہوا چنانچہ اُس کی موت بھی حالتِ جنون میں ہی واقع ہوئی تھی۔ اُسے خارج سے مطلق دلچسپی نہ تھی اور وہ دن رات اس اندیشے میں مبتلا رہتا تھا کہ کوئی نامعلوم شخص اُسے قتل کرنے کے درپے ہے۔ موت اور فنا کے تصورات اُس کے ذہن و دماغ پر اس قدر متصرف ہو چکے تھے کہ وہ حسن کا تصور بھی موت کے بغیر نہیں کر سکتا تھا چنانچہ کسی حسین دوشیزہ کو عالمِ جانکنی میں دکھانا اُس کا سب سے محبوب موضوع تھا۔

پو کی نظموں کے ترجموں سے ہی فرانس میں تحریکِ تنزل کا آغاز ہوا تھا۔ بادلیئر اور میلارمے نے اُس کی نظموں کے ترجمے کئے تھے۔ میلارمے میں پو کی رمزیت ابہام کی صورت میں ظاہر ہوئی جسے وہ خالص شاعری کا نام دیتا تھا۔ بادلیئر کا تنزل پذیر رجحان جنسی بے راہ روی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ وہ بھی پو کی طرح عصبی المزاج تھا۔ اس کی تالیف بدی کے پھول کے موضوعات اس قدر سوقیانہ اور اُس کا اندازِ اظہار ایسا عریاں تھا کہ اس کتاب کو مخربِ اخلاق سمجھ کر ضبط کر لیا گیا۔ بادلیئر کی نظموں میں اُس جارحانہ فسق و فجور کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو رومانیوں میں بائرن سے مخصوص تھی۔ اسی بنا پر ناقدینِ ادب اُس کے اندازِ نظر کو "ابلیسی" کہتے ہیں۔ وہ خود بھی کہا کرتا تھا "ابلیس مردانگی کا بہترین نمونہ ہے۔"

بادلیئر ایک مدت تک ایک اخلاق باختہ حبشی نژاد عورت کی محبت میں گرفتار رہا۔ وہ اُسے کھلم کھلا دغا دیتی رہی لیکن وہ بے غیرت بے پروا تھا۔ اس کے لئے اس حبشی عورت کے حسنِ سیاہ میں بلا کی کشش تھی کیونکہ وہ غرابت اور اجنبیت کو حسن کا جزوِ لازم سمجھتا تھا۔ اس عورت کی صحبت نے اس کا نہ صرف مالی دیوالیہ نکالا بلکہ اُسے اخلاقی بے حسی میں بھی مبتلا کر دیا۔ بادلیئر کے ذہنی اختلال کا ثبوت اُس کے ایک اور معاشقے سے بھی بہم پہنچتا ہے۔ وہ پانچ برس تک پیرس کی ایک عورت مادام سباتیئر کے عشق کا دم بھرتا رہا اور اُسے دل و جان سے چاہتا رہا۔ لیکن جب مادام سباتیئر نے اُس کی والہانہ پرستش سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو اُس کے سپرد کیا تو وہ سخت برگشتہ خاطر ہو کر بھاگ گیا۔ یہ خیال حد درجہ اندیشہ ناک ہے کہ بادلیئر کو جدید دور کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے اور دنیا کے اکثر شعرا اُس کی تقلید و تاسی کر رہے ہیں۔ آلڈوس ہکسلے اُس کی تنزل پذیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بادلیئر صرف ابلیسی ہی نہیں تھا۔ وہ اُکتایا ہوا ابلیسی تھا۔ وہ بیزاری کا شاعر تھا۔ اُس بے پناہ اُکتاہٹ کا جو غیر فانی صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اس اکتاہٹ کے ذاتی اسباب آسانی سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ اوائلِ شباب سے ہی بادلیئر کی صحت بگڑ گئی۔ آتشک اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ کثرت سے شراب پیتا تھا اور کسی نہ کسی شکل میں کثیر مقدار میں افیون بھی کھاتا تھا اور بھنگ بھی پیتا تھا۔ بے لطف فسق و فجور نے اُسے ہمیشہ کے لئے خستہ و رنجور کر دیا۔ ان حالات میں اُس کے لئے خوش باش رہ سکنا محال تھا۔ اُس کا جسم مریض تھا اور جیب خالی۔ قرض خواہ اُسے ہر وقت پریشان کرتے تھے اور وہ مسلسل پریشانی کا شکار رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عصبی امراض کا شکار ہو گیا جو حزن و ملال پر منتج ہوئے۔ وہ خود کہتا ہے کہ خزاں کے طویل و بے کیف شب و روز میں یہ اندوہ ناقابلِ برداشت ثابت ہوتا تھا ... آج کل بادلیئر کو نہ صرف فرانس بلکہ یورپ کا بھی سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اُس کی شاعری جو داخلیت، سلبیت، تخریبی ابلیسیت اور شدید اکتاہٹ کی شاعری ہے۔ جدید شاعری کہلاتی ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے کہ جدید دور کا سب سے بڑا شاعر ابلیسی تھا۔" (مقالات)

(مسلسل)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

صوتی تغیّرات

زبانوں کے لسانی مطالعہ میں صوتی تغیرات اور تصرفات کا مطالعہ اور مشاہدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اکثر زبانوں کے صوتی مطالعے سے پتہ چلا ہے کہ صوتی مماثلات (Phonetic Correspondences) کا عمل بلا استثنا زبانوں میں پایا جاتا ہے سوائے اس کے کہ ہم حسب ذیل صورتوں سے بحث کر رہے ہوں[1]:

(الف) مختلف قسم کے الفاظ جن کو مستعار یا دخیل الفاظ کہتے ہیں۔

(ب) مماثلات کی بعض دیگر صورتیں جن کا پورا علم نہ ہو یا جو محض مخصوص حالات میں عمل کرتی ہوں۔

(ج) الفاظ جن کو تمثیل analogy کے اصول پر بنایا گیا ہو۔

(د) زیر نظر زبان یا زبانیں بولیوں کا مرکب ہو۔

(ہ) الفاظ جو آوازوں کی نقل سے بنائے گئے ہوں۔ مثلاً سن سن۔ بھن بھن وغیرہ (Onamatopoeia)

(و) ضرورت شعری سے قافیہ کے لئے الفاظ میں تصرف کیا گیا ہو۔

مذکورہ بالا صورتوں میں اکثر صوتی تغیرات اور تصرفات کی ایسی مثالیں بھی سامنے آجاتی ہیں جن کو صوتی مماثلات کے اصول کے مطابق ثابت کرنا دشوار نظر آتا ہے۔ ان صورتوں کو غیر معمولی یا مستثنیات شمار کرنا چاہیئے۔ ورنہ صوتی مماثلات کا قاعدہ بنیادی اور اہم لسانی اصول ہے جس کے پیش نظر دو زبانوں یا بولیوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی رشتہ یا تعلق پایا جاتا ہے یا نہیں اور ان ہی صوتی تغیرات و تصرفات کو سامنے رکھ کر زبانوں کی اصل اور ابتدا ان کی ارتقاء وغیرہ کے مسائل کا تصفیہ ہو سکتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ لسانی مطالعہ میں صوتیات کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔

یہ تو مسلم ہے کہ اصوات میں تبدیلی اصولوں اور ضابطوں کے تحت ہوتی ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہم کسی تبدیلی کی وضاحت پوری طرح نہ کر سکیں یا کسی ایسے اصول یا قاعدے کو دریافت نہ کر سکیں جو اس قسم کی تبدیلیوں کا ذمہ دار ہو لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صوتی تبدیلیاں کیوں واقع ہوتی ہیں۔ اس سوال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں بعض حضرات کو خیال ہے کہ صوتی تبدیلیوں کا تعلق جغرافیائی ماحول سے ہوتا ہے۔ یہ بات عام طور پر ہمارے مشاہدے میں آتی ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے جو ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہوتے ہیں اپنے علاقوں کے جغرافیائی حالات کے زیر اثر نہ صرف اپنے روزمرہ رہنے سہنے کے طریقوں میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں بلکہ ان کا لہجہ اور زبان عموماً ان کے علاقوں کا پتہ دیتے ہیں۔ اردو بولنے والے مثلاً مغربی پاکستان میں سابق صوبہ پنجاب سابق صوبہ سرحد اور کراچی میں آباد ہیں لیکن اگر ان تینوں علاقوں کے اردو بولنے والے کسی ایک محفل میں

---

(1) Gray – Louis. H. Foundations of Language P: 83, New York Second printing 1958.

جمع ہوں اور اردو میں گفتگو کریں تو آسانی سے محض ان کی بات چیت سن کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ وہ کس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ علاقائی خصوصیات بول چال اور لہجے میں نمایاں ہوتی ہیں۔ بڑی حد تک جغرافیائی عوامل کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ ہم لوگوں کو ان کے ہنسنے اور رونے سے بھی پہچان لیتے ہیں۔ ایک سرد پہاڑی علاقے کے رہنے والے کی زبان ایک گرم میدانی علاقے کے باشندے کی زبان سے مختلف ہو گی۔ جن لوگوں نے انگلستان میں سفر کیا ہے۔ انھوں نے محسوس کیا ہو گا کہ شمالی علاقوں میں جو اکثر نسبتاً سرد ہے بَس (bas) کا تلفظ بُس (bʌs) ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ شمالی علاقے کے سرد موسم کا تقاضا ہوتا ہے کہ منہ کم سے کم کھولا جائے تاکہ تکلیف دہ ٹھنڈی ہوا منہ کے ذریعے سے پھیپھڑوں تک کم سے کم داخل ہو سکے۔ یہ صحیح ہے کہ جغرافیائی عنصر صوتی تغیر کا ایک ممکن سبب ہے لیکن اگر اسی کو صوتی تغیرات کی بنا قرار دے دیا جائے تو بہت سی تبدیلیوں کی تشریح اور توضیح نہیں ہو سکتی۔ ایک اور توجیہہ صوتی تغیرات کی یہ بھی کی گئی ہے کہ ان کا دار و مدار آلات صوت کے فرق پر ہے لیکن یہ فرق اسی حد تک موثر ہے کہ آلات صوت کے فرق کی وجہ سے ہم مختلف لوگوں کی آوازوں میں تمیز کر سکتے ہیں۔ زنانی اور مردانہ آواز کو الگ الگ پہچان لیتے ہیں حالانکہ ایسی بھی صورتیں ہوتی ہیں کہ بعض مردوں کی آواز میں زنانہ پن ہوتا ہے اور بعض عورتوں کی آواز میں خاصی مردانہ ہوتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ بنیادی طور پر آلات صوت کی ساخت میں ساری دنیا کے انسانوں میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے جسے مختلف لوگوں کی صوتی خصوصیات کی بنیاد قرار دیا جا سکے۔ ایک جاپانی نسل کا بچہ جو جاپان میں پیدا ہوا ہو اگر پیدائش کے بعد کسی انگریزی بولنے والے علاقے میں منتقل کر دیا جائے تو وہ اپنے گلے اور دیگر آلات صوت سے انگریزی بولنے والوں کے صوتی نظام کو قبول و اختیار کرے گا۔ اور اگر آئندہ کسی زمانے میں اسے جاپانی سیکھنا پڑے تو اُسے وہی دقتیں پیش آئیں گی جو ایک برطانوی نژاد کو پیش آ سکتی ہیں۔ اس طرح یہ بات عام مشاہدہ میں آ سکتی ہے کہ محنت اور مشق سے انسان ہر آواز کی ہو بہو نقل اتار سکتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض حالات میں جو خالص جسمانی ہوں بعض افراد میں اور بعض صورتوں میں بعض جماعتوں میں صوتی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔ زبان یا منہ کے کسی حصہ پر فالج کے اثر سے کسی شخص کا تکلم متاثر ہو سکتا ہے۔ دانت ٹوٹ جائے تو بعض آوازوں کی ادائگی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ افریقہ کے بعض قبائل میں زینت کے لئے ہونٹوں میں سوراخ کر کے ان میں آویزے پہنے جاتے ہیں ظاہر ہے اس سے بعض آوازوں کے ادا میں تکلف پیدا ہو جاتا ہے لیکن ان حالات کو مستثنیات میں شمار کرنا چاہیئے ان کو صوتی تغیر و تصرف کی بنا پر قرار دینا مشکل ہے۔

ایک اور توجیہہ صوتی تغیر و تصرف کی یہ کی گئی ہے کہ انسان فطرتاً سہل پسند واقع ہوا ہے۔ جن آوازوں کے ادا کرنے میں آلات صوت پر زیادہ زور پڑتا ہے یا زیادہ وقت صرف ہوتا ہے انسان ایسی آوازوں کو سہل تر آوازوں سے بدل لیتا ہے۔ اس کی ایک صورت ادغام Assimilation ہے۔ اس صورت میں دو متصل اصوات رفتہ رفتہ ایک صوت بن کر رہ جاتی ہیں مثلاً سنسکرت کے بعض الفاظ میں کَ شْ (ks) کی جگہ صرف کَ (k) یا صرف شْ (ŝ) کا رہ جانا۔ یا کبھی ان میں سے ایک اور کبھی دوسری آواز باقی رہ جاتی ہے۔ مثلاً کھتری یا چھتری جو قدیم تر شکل میں کشتری (kŝattri) یا شیر /ŝir/ جو قدیم تر شکل میں کشیرِ (kŝir) ہے[1]۔ عام طور پر الفاظ کے شروع میں مصمتوں کے عقدے اس طرح کی تبدیلیوں سے بہت متاثر ہوتے ہیں جس کی مثالیں ان زبانوں سے بکثرت مل سکتی ہیں جن میں ابتدائی مصمتوں کے عقدے عام ملتے ہیں۔ اردو میں ابتدائی مصمتوں کے عقدے نہیں آتے اور اسی لئے انگریزی کے School / Skul / کو اردو میں اسکول / iskul / اور پنجابی میں سکول / sikul / کر لیتے ہیں۔ انگریزی میں ابتدائی عقدے بہت عام ہیں۔ وہ بلکہ تین مصمتوں کے عقدے عام طور پر ملتے ہیں۔ مثلاً 'sŝ' 'st' 'str' 'sp' 'spr' جن کی مثال

---

[1] یعنی دودھ۔ اردو کھیر کی بھی اصل یہی ہے۔

[2] اردو برکھا، قدیم تر برکھا = فارسی برشگال ــــ اردو کھیت، قدیم تر کرشنا = فارسی کاشت۔

'spri' 'spring' 'spik' 'speak' 'strit' 'strut' - 'stand' - 'slip' - 'sleep' وغیرہ

لیکن قدیم انگریزی میں hr, hl, hn اور kn, gn, wr کے عقدے پائے جاتے تھے

/hring/	'hring'	قدیم	/riŋ/	'ring'	مثلاً موجودہ
/klipan/	'hleapan'	"	/lip/	'leap'	
/hneka/	'hnecca'	"	/nek/	'neck'	
/knio/	'cneow'	"	/ni/	'knee'	
/gnagan/	'gnagan'	"	/n/	'gnaw'	
/wriŋab/	'wringan'	"	/riŋ/	'wring'	

ان الفاظ میں صوتیہ (h) غالباً قرونِ وسطیٰ (Middle Ages) میں زائل ہوا۔ g, w غالباً عہد جدید کے آغاز میں زائل ہوئے اور شاید یہی سبب ہے کہ اگرچہ تلفظ میں ایسے صوتیے زائل ہو چکے ہیں لیکن املا میں اب تک باقی ہیں۔ اسی طرح کی بعض اور مثالیں جن میں غالباً دورِ جدید کے آغاز میں یہ عمل شروع ہوا حسب ذیل ہیں۔

wraith, wrangle, wrap, wrapt, wrath, wreak, wreath, wreck, wrest, wretch, wriggle, wright, wrinkle, wren, wrench, writ, wrong, wry.

ان تمام مثالوں میں بیسویں صدی کے معیاری تلفظ میں (w) کی آواز زائل ہو چکی ہے۔ ایک اور عقدہ (ps) ہے اس میں ابتدائی (p) کے زائل ہونے کی بھی مثالیں بکثرت ہیں:

psalm, psalter, pseudo, psyche, psychology, psychosis. وغیرہ

یہی صورت (pt) کے عقدوں کی ہے۔ ptisan, ptolemy, ptomaine, ptosis, ptyalism.

صوتی تغیرات و تصرفات کی تفصیلی بحث آگے آتی ہے۔ اس لئے یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے۔ سہل پسندی، گو کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر ضرور ان تغیرات و تصرفات کا باعث ہوتی ہے۔

ان تغیرات و تصرفات کی توجیہ کے لئے ایک اور نظریہ پیش کیا گیا ہے جسے زیریں طبقہ Sub-Stratum کہتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق صوتی تغیر و تصرف کا سبب نقص لسانی ہے۔ جب بولنے والوں کی کوئی جماعت کوئی نئی زبان اختیار کرتی ہے تو اس کا تلفظ ناقص ہوتا ہے اور یہ نقص اس سبب سے پیدا ہوتا ہے کہ نئی زبان کے بولنے والے اپنی پرانی اور مادری زبان کی صوتیات سے اتنا گہرا رشتہ او تعلق رکھتے ہیں کہ نئی زبان کو بھی اسی کے مطابق صوتی قالب پر ڈھالنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں لکھا ہے:

مثال باشندۂ دہلی

مجھ میں اس بات کی کیا خبر یہاں کون کون رہتا ہے اور جانے میری بلا کہ کس اپنی تیلی کا دوپٹہ اور دو روپئے

بات دستے اور کون کا ذمبہ پیر لے گیا۔ جس پر چوری ثبوت ہو اس شوق سے لیو اتار دیا اور شکان باندھ کر

۱؎ Bloomfield. L. Language p: 370, published George Allen & Unwin Ltd, London 1958.

پاکر رکھ دو۔

دوسرے مجرد ساختہ بجائے مجھے و ثبوت بجائے ثابت و مضمون بجائے مطلب، بجائے خیال، بعد وقت و بجائے بجائے کرکے پنجابی است۔ چوں لہجہ متکلم درست است پنجابی نمی توان گفت۔ ازیں پیچ می شود کہ در ترکیب آشنا بیں انداز فشرد۔ دراں ندارد۔ پنجابی کسے است کہ مفتوح، در اردو در لہجہ خود پنجابی ساخت نیز مجبور است کہ خبر را بسکون یا گویند چنانچہ ... تمام این قدر مفتوح سازد کہ باعث مسموع شود۔ وتار رہتا ہے نیز از زبان او مشدد برآید یا مخفف مشدد صورت بلکہ میان مشدد و مخفف۔ دیگر چیز حاترحم را بہ زیر ... و گاف ... را مکسور گویند۔ ... ست ہووے گویند۔ ... دوم صحت دارد لیکن پنجابی بجائے ہو ہمیشہ ہووے می گویند۔ مثال پنجابی اردو دان۔

مجھے اس بات کی کیا خبر کہ یہاں کون کون رہتا ہے جانے میری بلا کس کی تیمی کا دوپٹہ اور ڈوپٹے جانے رہے ہیں اور کون کا فریب ہے لے گیا ہے۔ خیر، چوری ثابت ہووے جس کی شوق سے لیوتا، لواور مشکیں باندھ کر کرٹے لگاؤ۔

دیگر لہجہ مخصوص باہل پنجاب است کہ ہر فتحہ از زبان ایشان ضمہ برآید و فتحہ بضمہ تا گویند۔ لہجہ ایں صاحبان و ایں عبارت باید کہ یک لفظش مخالف اردو نیست لیکن سبب لہجہ تمامش پنجابی شدہ است۔

آپ کا کرم از بس کہ میرے حال او پر ہے جی چاہتا ہے کہ ہر کوچہ و بازار کے اندر حضرت آپ کی صفت اور ثنا بیان کروں اپنے مقبول کی خدمت اپنی نجات کا سبب ہے۔

دیگر سے حرف متحرک را در تلفظ مجرد ساکن نیز گویند مانند ایں عبارت۔

حسن اور حسین کی ایسی ذات ہے کہ جن کے پیغمبر خدا نشتر بنے تھے، اور باغ ارم ان کے غلاموں کا گھر ہے، قضا و قدر جو جو چاہے سو ہووے۔ نانا انھوں کا محمد اور پدر علی مرتضیٰ اور مادر فاطمہ کس کے پسر کا منہ ہے جو ان سے برابر ہووے[1]

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جو لوگ کسی زبان کو ثانوی زبان کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں، ان کا تلفظ ان کی مادری زبان کے تلفظ سے متاثر ہوتا ہے[2] لیکن ماہرینِ لسانیات اس سے اختلاف کرتے ہیں کہ یہ صورتِ حال صوتی تغیر و تصرف کی بنا ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض ذخیرہ مستعار الفاظ ثانوی زبان میں ایسے داخل ہو جاتے ہیں جن میں صوتی تصرف اور املا کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ خاص کر ایسی صورتوں میں جب مستعار الفاظ کی بعض اصوات اس ثانوی زبان میں موجود نہ ہوں۔ اس کی بکثرت مثالیں اردو میں بھی مل جاتی ہیں مثلاً اردو کا لفظ (گوشت) کہ اصلاً عربی عضلہ ہے۔ اردو ... کہ حرف حنجرہ ہے... مسالا کہ اصلاً مصالحہ ہے۔ اردو سینگی کہ اصلاً سنجینی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اردو میں جہاں صرف /س/ کی صوت ہے وہاں عربی میں تین حلقی اصوات (ث، س، ص) ہیں، اسی طرح اردو کے صوتیے (ز) کے مقابلے میں عربی (ذ، ز، ض، ظ) ہیں۔ ... (ت) کے مقابلہ میں (ت) اور (ط) ہیں۔ ان میں سے بعض اصوات صوتی، دونوں صورتوں میں بدل گئی ہیں بعض صورتوں میں املا باقی ہے لیکن صوتی فرق باقی نہیں رہا۔ سوائے ان لوگوں کی گفتگو میں جو بطور خاص اہتمام اور تکلف کر کے اردو میں استعمال ہونے والے جملہ عربی الاصل الفاظ کو معرب لہجہ میں ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی تبدیلیوں سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ تبدیلیاں

---

[1] انشاء اللہ خاں، دریائے لطافت ص

[2] ہم آسانی سے پنجابی، بنگالی اور اردو بطور مادری زبان استعمال کرنے والوں کے انگریزی کے تلفظ میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ یہ صوتی تبدیلیاں اس لیے ہوتی ہیں کہ ان میں سے ہر بولنے والا ثانوی زبان (انگریزی) کو اپنی مادری زبان کے زیر اثر استعمال کرتا ہے۔

صوتی مماثلت کی شکلیں ہیں۔ مثلاً کہا یہ جاتا ہے کہ ان زبانوں میں جن کو ہند آریائی کی ایک ذیلی شاخ طیوطانی کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی واضح اور متعین صوتی تبدیلیاں ہوتی ہیں کہ ان کو ایک اصول اور ضابطے کی شکل دے دی گئی ہے Verner's Law ورنر کا قانون کہتے ہیں۔ ورنر کا قانون اور Grim's Law گرم کا قانون جن کو طیوطانی شاخ میں نمودار ہونے والے صوتی تصرفات اور تغیرات کی پوری توجیہہ کر دیتے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تاریخ کے ایک قدیم دور میں ایک ایسی زبان بولی جاتی تھی جس کے بولنے والے فاتحین نے ان لوگوں کی زبان پر اثر ڈالا جن کو طیوطانی حلقہ میں شامل کیا جاتا ہے اور اس اثر کے نتیجہ کے طور پر زیر طبقی Sub-stratum نظریہ کے مطابق طیوطانی حلقہ کی بولیوں اور زبانوں میں تغیر و تصرف رونما ہوا تو پھر ان تبدیلیوں اور تصرفات کی کس طرح توجیہہ کی جائے گی جو طیوطانی زبانوں میں طیوطانی فتح کے بعد رونما ہوئی ہیں یا وہ تبدیلیاں جو بعد میں فرانسیسی یا پرتگالی زبانوں میں رونما ہوئی ہیں۔ یہی صورت حال زبانوں کے دوسرے خاندانوں کے متعلق ہے۔ اگر جدید فارسی اور قدیم فارسی (ژند اوستا) کے فرق کو عربی کے اثرات کا مرہون منت بتایا جائے تو پھر دورِ جدید سے پہلے اور عربی فتح سے کافی بعد شروع ہونے والی صوتی تبدیلیوں کا کوئی سبب نظر نہ آئے گا۔ اس لئے زیر طبقی نظریہ بھی پوری طرح صوتی تغیر و تصرف کے اسباب کی توجیہہ و تشریح سے قاصر ہے۔

بولیوں کے ملاپ dialect mixture کو بھی بعض حضرات نے صوتی تغیرات و تصرفات کی بنا قرار دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ دو لسانی سرحدوں پر جیسے یورپ میں جرمن یا فرانسیسی ہیں ایک بولی کے اصوات دوسری بولی پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ پاکستان میں اس کی ایک اچھی مثال بلوچستان میں بولی جانے والی براہوی میں ملتی ہے۔ براہوی ایک دراوڑی زبان ہے جس کا صوتی نظام ہند آریائی سے کسی قدر مختلف ہے لیکن بلوچستان کے پڑوس میں ایران میں بولی جانے والی فارسی نے جس طرح بلوچی کو متاثر کیا ہے جو خود ہند آریائی ہے اسی طرح براہوی کو بھی متاثر کیا ہے لیکن اس توجیہہ پر بھی وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو زیر طبقی نظریہ پر کیا جاتا ہے۔

ایک اور دلچسپ توجیہہ حیاتیات کے مشہور مینڈل کے قانون وراثت Mendal's Law of Heridity کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس قانون کو یوں مختصراً بیان کیا جا سکتا ہے۔ والدین کی اولاد میں سے نصف میں دونوں (ماں باپ) کی صفات پائی جائیں گی۔ ایک چوتھائی میں صرف ایک (باپ یا ماں) کی خصوصیات ملیں گی اور بقیہ چوتھائی میں دوسرے (باپ یا ماں) کی۔ "عموماً" وراثت میں یہی تقسیم ملتی ہے لیکن ان کے علاوہ غیر معمولی صفتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں مثلاً عجوبے sudden mutations جن کو خودرنگ (sports) کہتے ہیں یا رجعت (atavism) کی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں ایک یا متعدد اولادیں کسی بعید مورث کی خصوصیات کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ حیاتیات کے اس اصول کی روشنی میں لسانی تغیر و تصرف کے مسئلہ کو ابھی پوری طرح تحقیق و تجزیہ کا موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔ اس لئے قطعیت کے ساتھ اس باب میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بہر حال صوتی تغیرات و تصرفات کا سب سے اہم سبب ناقص یا ناتمام سماعت ہے یا سنی ہوئی آواز کی ناقص یا ناممکن نقل۔ بچہ جب زبان سیکھنے لگتا ہے تو وہ ان لوگوں کے صوتیوں کی نقل اتارتا ہے جو اس کے گرد و پیش موجود ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کی سماعت کا حلقہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ اکتساب عمر کے خاصے حصے تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصے میں تلفظ کی تبدیلی کا احساس بالکل غیر شعوری ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب بولنے والا کسی ایسے علاقے میں منتقل ہوتا ہے جہاں بولنے والوں کا تلفظ اس کے اصلی وطن سے مختلف ہوتا ہے لیکن بعض صورتوں میں شعوری طور پر بھی تلفظ بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خاص طور پر عوام ان لوگوں کے تلفظ اور لب و لہجہ کی تقلید کی کوشش کرتے ہیں جو سماج میں اپنی تعلیم، تہذیبی مرتبہ، سیاسی اور امتیازی کی بنا پر قابلِ احترام سمجھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی بعض انفرادی خصوصیات

بولنے والے کے تلفظ کو متاثر کرتی ہیں۔ مثلاً انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں میر غفر نبنی کی جو گفتگو نقل کی ہے وہ اسی کی مثال ہے۔

زبان آموزی بلا شبہ نقل کا عمل یا نقالی ہے لیکن انسانی کان ایسا آلہ نہیں جس سے سماعت میں غلطی کا امکان یا احتمال ہو۔ اسی طرح اس کی نقل میں زبان کے وقت نقل کا پورا مطابق اصل ہونا بھی یقینی نہیں جس نقل کو وہ مکمل سمجھتا ہے وہ کم و بیش نامکمل ہوتی ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ صوتی ہم شبیہہ کہہ سکتے ہیں۔ اصل و نقل کے فرق کو نہ سننے والا محسوس کرتا ہے اور نہ بولنے والا کیونکہ اس معمولی فرق سے تکلم کا مقصد تو حاصل ہو ہی جاتا ہے اور سننے والے اسی سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک لب و لہجہ اور تلفظ معمول کے مطابق ہو کیونکہ سننے والوں کے نزدیک تلفظ اور لب و لہجہ اصل چیز نہیں۔ اصل اہمیت کلام کا نفس مضمون ہے اور جب ابلاغ پوری طرح ہو جاتا ہے تو متکلم اور سامع دونوں کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ کئی نسلوں میں تلفظ کی تبدیلی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک نسل کے لوگوں کو کئی نسل پہلے کے لوگوں کے تلفظ کی تفہیم میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ جن حضرات نے دکھنی اردو کا مطالعہ کیا ہے وہ اس دقت سے بخوبی واقف ہیں۔ اس طرح زمانہ گزرنے پر صوتی تصرفات (اور صرفی و نحوی تغیرات) بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی زبان کے قدیم ترین اور رائج زبان کے بولنے والوں میں یہ فرق اتنا بڑھ جاتا ہے کہ تفہیم دشوار ہو جاتی ہے حالانکہ اپنے دور میں ہر نسل پچھلی نسل کی زبان میں اس قسم کی دقت یا دشواری محسوس نہیں کرتی۔ اگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی زبان کے بولنے والے اگر جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور دونوں کے درمیان روابط مسلسل و مضبوط نہ رہ سکیں تو یہ تصرفات اس حد تک بڑھ جاتے ہیں کہ ایک کے لئے دوسرے کی زبان کا سمجھنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ برہوی بولنے والے آج تامل، تیلگو، کنڑی اور ملیالم نہیں سمجھ سکتے اور نہ ان زبانوں کے بولنے والے برہوی سمجھ سکتے ہیں حالانکہ آج سے غالباً پانچ ہزار سال پہلے ان میں افہام و تفہیم کی صورت محدود ہوگی۔

جغرافیائی اعتبار سے کسی وسیع خطۂ ارض میں ایک علاقے کے بولنے والے ملحقہ علاقے کی زبان آسانی سے سمجھ لیتے ہیں لیکن کسی ایک علاقے کو مرکز تصور کرکے اس سے جس قدر فاصلہ بڑھتا جاتا ہے زبان کا یہ فرق بھی بڑھتا ہے۔ خیبر سے مغربی پاکستان سے بھارت میں سے گزرتے ہوئے مشرقی پاکستان تک بری سفر کرنے والا ہر مسافر آج بھی اس کیفیت کا اندازہ کر سکتا ہے اور اسے حیرت ہوتی ہے کہ ایک لفظ پشاور سے ڈھاکہ اور سلہٹ تک پہنچتے پہنچتے کس قدر بدل جاتا ہے۔ نوآبادیوں کے قیام سے بھی اس طرح کے تغیرات اور تصرفات رونما ہوتے ہیں۔ افریقہ کی جن نوآبادیوں میں انگریزی پہنچی اس میں تغیرات و تصرفات سے انگریزی کی ایک بدلی ہوئی صورت پیدا ہوئی یہی حال بربر کے علاقے میں عربی کا ہوا۔[1]

غرض صوتی تغیر اور تصرف ایک مسلمہ امر ہے۔ اس کے بعض اسباب و نتائج مرتب ہو چکے ہیں لیکن لسانیات کے بعض اور بنیادی مسائل کی طرح اس مسئلہ کے بھی بہت سے پہلو اب بھی تحقیق طلب ہیں۔ (زیر اشاعت کتاب مبادیات لسانیات کا ایک باب)

اصطلاحات

ادغام	Assimilation	تمثیل	Analogy
آواز	Sound	ثانوی	Secondary
بولی	Dialect	خود رنگ	Sport
تغیر	Change	رجعت	Atavism

---

[1] Siddiqi, Abullais — Arabic Loan Words in Berber with special reference to the dialects of Rif :— University Studies No: 2, University of Karachi 1965.

زبان	Language
زیر طبقی	Sub-stratum
سامعہ	Audition
صحیحہ	Consonant
صوت	Phone
صوتی	Phonetic
صوتیات	Phonetics
صوتیہ	Phoneme
طیوطانی	Tentonic
اُجوبہ	Sudden Mutation
عقدہ	Cluster
علاقائی	Regional
گرم کا ضابطہ یا قانون	Grim's Law .
لسانی	Linguistic
ماحول	Environment
مرکب	Mixture
مستعار اور دخیل الفاظ	Loan Words .
مماثلت	Correspondence
مینڈل کا قانون توارث	Mendal's Law of Inheritance
نظریہ	Theory
نقل مکانی	Migration
نقل نقالی	Imitation
ورنر کا ضابطہ یا قانون	Verner's Law
قدرتی آوازوں کی نقل میں الفاظ سازی	Amatopoeia

(متن میں آڑی لکیروں کے درمیان صوتی املا بین الاقوامی صوتی علامات کے مطابق لکھا گیا ہے۔ رائج املا واوین میں درج ہے)

ڈاکٹر محمد اجمل

جذبات

مشاہدہ ہو یا ادراک، فکر ہو یا عمل، سائنس ان کی طرف توجہ کرنے سے نہیں گھبراتی لیکن جونہی سائنس، احساسات و جذبات کی طرف رجوع کرتی ہے، فوراً ہی بوکھلا جاتی ہے اور کبھی تو انھیں شخصیت کی جان اور اصل الاصول سمجھنے لگتی ہے، اور کبھی محض ایک محرک کہہ کر ٹال دیتی ہے۔ وہ ماہرینِ نفسیات جو روح اور مادہ کی کش مکش سے اس طرح نجات حاصل کرتے ہیں کہ مادیت کو اپنے نظامِ فکر کی بنیاد بنا دیتے ہیں۔ جذبات کی اساس جسمانی تغیر کو سمجھنے لگتے ہیں۔ مثلاً ولیم جیمز نے کہا تھا کہ کسی جذبے کی جسمانی علامتیں پہلے ظہور میں آتی ہیں اور ذہنی علامتیں بعد میں۔ یہ نظریہ ہمارے روزمرہ کے نظریے کے بالکل برعکس ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں تو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم غصے میں آتے ہیں تو کسی نہ کسی کو چپت رسید کر دیتے ہیں۔ لیکن ولیم جیمز نے کہا کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ہم بھاگتے ہیں اس لئے ڈرتے ہیں، چونکہ ہم چپت لگاتے ہیں اس لئے غصے میں آتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ بات صریحاً غلط معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ دراصل ایک ردِ عمل تھا اُن نظریات کے خلاف جو ہمیشہ ذہن کو اولین مقام دینے پر مصر تھے اور دیکھا جائے تو اس میں ایک گونہ صداقت بھی ہے۔ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیجیے کہ آپ اچھے بھلے مطمئن بیٹھے ہیں، مٹھیاں بھینچ لیجیے، بھویں بھینچ دیکھیے، آنکھوں کو خونخوار بنائیے تو تھوڑی ہی دیر میں آپ کو غصہ آنے لگے گا۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ اگر آپ کے غدود کام نہیں کرتے تو جذبہ کہاں پیدا ہونے لگا ہے اگر ہوگا بھی تو کم کم۔ پھر حیاتیات کے ماہروں نے تجربات کیے ہیں کہ اگر بلیوں اور کتوں کے غدود سے متعلق اعصاب کاٹ دیئے جائیں تو ان میں پھر بھی جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ حقیقت غالباً یہ ہے کہ جذبے کے لئے ذہن اور بدن دونوں کی ضرورت ہے۔ جب تک ذہن اور بدن اور خاص حالات نہ ہوں جذبہ نہیں ابھرتا۔ اگر آپ کو Adiemin کا ٹیکہ لگا دیا جائے تو یہ نہیں کہ آپ کو غصہ بہت آئے گا، بلکہ ایک بے چینی کی سی کیفیت رہے گی اور جونہی کوئی برانگیختہ کرنے والی بات ہوگی آپ آتش زیرِ پا ہو جائیں گے۔ سٹیج اور سینما کی اداکاری دیکھیے۔ اچھا اداکار جن جذبات کا اظہار کرتا ہے وہ اسے محسوس ہوتے ہیں لیکن وہ اُسے تبھی محسوس ہوتے ہیں، جب وہ اُن حالات کو جو اُس کے کردار سے متعلق ہیں پوری طرح تخیل میں لے آتا ہے۔ جب تک وہ اُن حالات کو تخیل کا اوڑھنا بچھونا نہیں بنا لیتا، اچھی اداکاری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ اداکاری کے وقت ناظرین کی طرف متوجہ ہو جائیں تو وہ جذبات ختم ہو جائیں گے اور ایک میکانکی اور بے جان سی اداکاری رہ جائے گی۔ یونانی اسٹیج پر جب اداکار آتے تھے تو اکثر و بیشتر مصنوعی چہرے اوڑھ لیتے تھے۔ اس سے وہ اداکاری کے وقت شرم یا خفت کے جذبات سے محفوظ ہو جاتے تھے جو ناظرین کی موجودگی میں آسانی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس سے ایک اور حقیقت کا انکشاف بھی ہوتا ہے کہ جذبات اور چہرے کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ امریکہ میں ایک تہوار ہوتا ہے جسے Hallowaen کہتے ہیں۔ اس تہوار پر چھوٹے چھوٹے بچے

masks پہن کے گھروں میں جاتے ہیں اور تحفے مانگتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت شرمیلے بچے بھی masks پہن کر بیباک ہو جاتے ہیں اور بغیر کسی جھجک کے تحفے مانگ لیتے ہیں۔ چند مہینوں کی بات ہے کہ گورنمنٹ کالج (لاہور) کلینک میں ایک بچہ آیا، جو لکنت کا مریض تھا۔ ہم نے اُسے ایک mask پہنا دیا، لکنت یکایک غائب ہو گئی۔ اُس لڑکے نے پندرہ منٹ تک لکنت کے بغیر باتیں کیں۔ کسی بچے سے کہیے کہ کوئی کہانی سنائے۔ پھر اُسے mask پہنا دیجئے اور پھر کہیے کہ وہی کہانی دوبارہ سنائے۔ آپ دیکھیں گے کہ دوسری مرتبہ کہانی میں جذبات کا وفور اور شدت زیادہ ہوگی، تخیل زیادہ آزاد ہوگا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں روس اور امریکہ نے فضا میں راکٹ چھوڑے تھے، ان میں انسان بھی گئے تھے۔ اُن انسانوں کے جذبات کا اندازہ کرنے کے لئے ایک آلہ تیار کیا گیا تھا۔ وہ آلہ تو اُس شخص سے لگا رہتا تھا جو فضا کی سیر کرتا تھا مگر یہاں ایک پیمائشی آلے میں اُس کے جذبات کا زیر و بم نظر آجاتا تھا۔ بعض امریکی ماہرینِ نفسیات نے اس سے جذبات کے مطالعے کی ایک اور سبیل نکالی ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی پریشانی میں مبتلا مریض اُن کے پاس آتا ہے تو اُسے ایک آلہ دے دیتے ہیں کہ اسے چوبیس گھنٹے پاس رکھنا۔ ماہر نفسیات کے پاس اُس کا پیمائشی آلہ رہتا ہے جو اُس کے جذبات کے نشیب و فراز رقم کرتا رہتا ہے۔ دوسرے دن مریض آکر اپنی کیفیات بیان کرتا ہے اور وہ یہ دیکھتے ہیں کہ مریض کو اکثر اپنے جذبات کا شعور نہیں ہوتا اور پھر کھوج کرنے سے ہی وہ شعور میں آتے ہیں۔

جذبات کا مطالعہ خاصی مدت تک ماہرین نفسیات کا محبوب موضوع رہا ہے لیکن آہستہ آہستہ اب اُس کا ذکر کم ہو رہا ہے۔ وہ محض اس لئے کہ اب پوری شخصیت کا مطالعہ زیادہ اہم سمجھا جانے لگا ہے، یعنی اب جذبات کو مشاہدہ و ادراک، سوجھ بوجھ اور تفکر و تعلیم کے ساتھ وابستہ کر کے، ان کا مطالعہ ہوتا ہے۔

مثلاً ایک مدرسۂ فکر نے جذبات و تفکر کے باہمی تعلق کو نہایت اہم سمجھ رکھا ہے۔ یہ مدرسہ کہتا ہے کہ آپ کے زندگی کے متعلق مفروضوں کا جذبات پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر آپ کا مفروضہ یہ ہے کہ جب کوئی آپ کو گالی دے (اور اگر آپ ہیرو ہیں تو آپ اس کا سر توڑ دیں گے) تو آپ کو ایسی حالت میں بہت غصہ آئے گا۔ سو یہ مردانگی کے متعلق آپ کا مفروضہ ہے۔ آپ اس مفروضے کو یوں بھی بدل سکتے ہیں کہ اگر آپ ہیرو ہیں، تو گالی دینے والے کو مجبور مجنوں سمجھ کر معاف کر دیں گے۔ اگر یہ مفروضہ ہے تو غصہ نہیں آئے گا۔ اگر آپ کا یہ مفروضہ ہے کہ جب کوئی جذبہ پیدا ہو، اُس کا اظہار کر دینا چاہیئے ورنہ اختلاجِ قلب میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے، تو آپ کسی جذبے پر قابو پانے کی ہمت ہی نہیں کریں گے۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھیں کہ جذبات پر قابو پایا جا سکتا ہے تو جذبات قابو میں رہ سکیں گے۔ جذبہ تو ایک شرارے کی طرح اُبھرتا ہے، اور پھر راکھ ہو جاتا ہے۔ یہ محض خیال ہے یا مفروضہ جو اُسے کسی حد تک مستقل بنا دیتا ہے۔

اسی قسم کے اور تجربات، جذبات اور شخصیت کے باہمی تعلق کو اجاگر کر رہے ہیں۔ اس وسیلے سے جذبے کی نفسیات کو دوبارہ اہمیت حاصل ہو سکتی ہے۔

سید وقار عظیم

ستمبر ۱۹۶۵ء کی شاعری

پاکستان کی زندگی کے نئے دور کے متعلق جب کوئی بات شروع کی جاتی ہے تو آدمی کی زبان سے اضطراری طور پر نکلتا ہے "۶ ستمبر!" یہ بات کو اب بے کہ اس دن کو مشکل سے پونے تین مہینے ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مہینے تو کیا، گزرتے ہوئے سال قرن اور صدیاں بھی اس دن کو نہیں بھلا سکیں گی کہ اس وقت ہر پاکستانی کے لئے انفرادی طور پر اور پوری پاکستانی قوم کے لئے اجتماعی طور پر خودنگری اور خودشناسی اور خوداعتمادی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور زندگی کے اس نئے دور میں جنگ کے محاذ کے ساتھ ساتھ زندگی کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے بے شمار محاذوں پر ہر شخص نے ایک جنگ لڑی اور جنگ لڑ کر اس میں فتح حاصل کی۔

زندگی کے اس نئے دور میں کہ پوری قوم کے لئے سیاسی، معاشرتی، دینی، اخلاقی اور نسبی یعنی جنگ کا دور ہے، مختلف گروہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ ناپ تول کے مختلف پیمانوں سے اس کی قدر و قیمت متعین کی جا رہی ہے اور جو کچھ جس نے کیا ہے حسب توفیق اس کی داد دی جا رہی ہے۔ جائزہ لینے اور کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کے اس عمل کو نہ انوکھا سمجھا جاتا ہے نہ قبل از وقت، اس لیے کہ کارناموں کی نوعیت ہی اتنی غیر معمولی ہے کہ انھوں نے ہر دیکھنے، سوچنے، اور محسوس کرنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر کے ان کی اہمیت اور عظمت تسلیم کرنے پر مجبور کیا ہے، لیکن کوئی شخص ان کارناموں کی قدر و قیمت متعین کرنے کی جسارت کرے جو ہمارے شاعروں نے انجام دیئے ہیں تو یہ بات انوکھی بھی سمجھی جائے گی اور یقیناً قبل از وقت بھی۔ لیکن ہمارے شاعروں نے اپنا یہ فرض منصب قومی احساس کی جس دل سوزی کے تحت انجام دیا ہے اس کی داد دینے میں تاخیر سے کام لینا میرے نزدیک بخل بھی ہے اور تنگ نظری بھی۔

زندگی کے اس مختصر لیکن بے حد اہم دور میں ہمارے شاعروں نے جو سینکڑوں گیت اور ترانے لکھے، ان گنت غزلیں اور نظمیں کہیں، وہ ہمارے شاعروں کی طرف سے محبت اور احسان مندی کا نذرانہ ہے۔ اس سرزمین کی خدمت میں جس کی بقا کے ساتھ ان کی بقا وابستہ ہے، ان شہیدوں اور غازیوں کی خدمت میں جو اس مقدس سرزمین کی عزت و حرمت کے نگران و پاسبان ہیں اور ان اہل وطن کی خدمت میں جنھوں نے آزمائش کی ایک سخت اور سنگین گھڑی میں اپنی ذات کو قوم کی ذات میں جذب کر کے صرف وہ کیا جس کی وطن کو ضرورت تھی۔

شاعروں نے محبت اور احسان مندی کا یہ نذرانہ پیش کرتے ہوئے اپنے مخاطب کو بتایا کہ انھوں نے جو جنگ لڑی ہے وہ بے شمار عزیز قدروں کی جنگ تھی — بقا کی اس جنگ کا احساس دلانے والے اس شاعر کو جو آزادی کے حصول کے بعد سے اب تک ۱۸ سال کی مدت میں بھی پورے یقین اور اعتماد سے زندگی کے ساتھ اپنا رشتہ استوار نہیں کر سکا تھا، عزیز قدروں کی بقا کی جنگ کے اس دور میں کئی مستحکم اور پائدار رشتے دریافت اور استوار کرنے کا موقع ملا ہے۔ وطن اور اس کی مقدس سرزمین کے ساتھ اس کا رشتہ، صحیح کی تہذیبی اور اخلاقی روایت کے ساتھ اس کا رشتہ، اقتدار اور اس کے احکام کے ساتھ اس کا رشتہ، اپنے مخاطب کے ساتھ اس کا رشتہ، اپنے فنی منصب کے ساتھ اس کا رشتہ اور منصب کو ادا کرنے کے وسائل کے ساتھ اس کا رشتہ اور ان سب رشتوں کے ساتھ دوسرے لطیف فنون کے ساتھ اس کا رشتہ، مغنی کی نے اور ساز کی جھنکار کے ساتھ اس کا رشتہ۔ یہ سب رشتے اس پر اس سے پہلے کبھی اتنے واضح نہیں ہوئے تھے جتنے آج ہیں۔ اور اس انکشاف کا واضح نتیجہ ہے کہ اس کی شاعری، اب وطن کی محبت اور وطن شناسی کی شاعری، ورثے اور حق کی

بے شمار قدروں کی حمایت اور پاسداری کی شاعری بن گئی ہے۔ پاکستان کے اس مختصر سے دور میں شاعر نے اپنے وطن کو وہ دیا جس کی اسے ضرورت تھی۔ حق کے احساس کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اس اساسی وحدت کو جو ہر پاکستانی کے وجود کا حصہ تھی، ابھار کر سامنے لایا۔ اس نے وطن کی آزادی اور اس آزادی کی بقا کی صحیح قدر و قیمت متعین کی۔ فرد کے احساس کو جماعت کا احساس بنایا۔ اپنا حوصلہ بلند کر کے دوسروں کے حوصلے اور عزم کو پختگی اور استقامت بخشی۔ اس کے کلام سے ذہن کو روشنی اور دل کو گرمی ملی۔ اس کا شعر متعدد آرزوؤں اور امنگوں کا جیتا جاگتا روپ بنا اور یوں حق سب کی نظر میں عزیز و محبوب اور باطل ذلیل و معتوب ٹھہرا۔

قومی زندگی میں شعر کہنے اور شعر سننے والوں کے دلوں کی دھڑکنیں کبھی اس طرح یک نہیں بنتیں اور فکر و خیال کے سلسلے یوں پیوستہ نہیں ہوتے جیسے اب نظر آ رہے ہیں شاعر نے اس سے پہلے اس خلوص اور وفاداری کے ساتھ نہ اپنے مخاطب کے احساس کا ترجمان بننے کی کوشش کی تھی اور نہ اس کی سطح پر آ کر اس سے یہ بات کہنے کا تجربہ کیا تھا۔ اس نئے تجربے سے ایک نئی طرح کا فن دیا ہے اور ایک نئی طرح کا لہجہ۔ فن اور لہجے کے اس اشتراک نے اس پر یہ حقیقت منکشف کی ہے کہ اعلیٰ مقصد شعر کی روح ہے۔ شعر مقصد ہو کر ہی دل میں اترتا ہے ــــ بلکہ کبھی کبھی یہ کہ وہ مقصد نہ ہو تو دل میں اترتا ہی نہیں۔

شعر و فن کے سفر میں ایک مرحلہ وہ آتا ہے جب شاعر اور فن کار کے لئے بے تعلقی، علیحدگی یا detachment جو اچھی ادبی تخلیق کی ایک اہم شرط ہے جرم بن جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر کی پوری داخلی شخصیت ابھر کر لفظوں کا روپ دھار لیتی ہے اور وہ اپنے کہے ہوئے ایک ایک حرف کے ساتھ سفر کرتا ہے اور خود اپنا سفیر اور پیغامبر بنتا ہے۔ پھر یہ کہ مقصد اعلیٰ اور ارفع ہو اور یہ مقصد ایک شخص کا نہیں پوری قوم کا ہو تو تجربے اور روایت کی بحثیں بے معنی بن جاتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے میں جذب ہوتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اپنا منصب ادا کرتے ہیں۔ اظہار مطالب کا کوئی وسیلہ فرسودہ نہیں رہتا، کسی پیرایہ بیان کی مذمت نہیں سمجھا جاتا ــــ بشرطیکہ ان وسائل سے ملی، اخلاقی اور روحانی اقدار پر انسان کا ایمان پختہ کرنے اور انفرادی جذبے اور احساس کی روح سے ہم آہنگ بنانے اور ہر دل کی دھڑکن کو ایک لڑی میں پرونے کا کام لیا جائے۔

ہمارے شاعر نے پچھلے دنوں یہی زندہ رہنے اور زندہ رکھنے والا کام کیا ہے ــــ لیکن بعض لوگ دبی زبان سے یہ کہتے ہوئے بھی سنائی دیتے ہیں کہ ان صداؤں میں سے صرف چند ایسی ہیں جو مستقبل کے ادب میں جگہ حاصل کر سکیں گی۔ ان کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت مشتبہ ہے۔ تنقید کا محتاط رویہ ان کی عادت میں داخل ہے اور اس عادت کا احترام کرنے میں نقصان کم اور فائدے زیادہ ہیں لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اظہار کے اسلوب میں جا بجا احتیاط کی محض اس لئے ہے کہ شاعر کو جو بات کہنی تھی وہ اپنے آپ کو منوانے کے لئے اکثر و بیشتر کسی ظاہری تزئین و آرائش کی محتاج ہی نہیں تھی۔ بات میں کشش ہو تو جس طرح بھی کہی جائے دلنشیں ہوتی ہے۔ بہن اس دور میں بھی ہوا ــــ اسلوب تو وقت کے ساتھ خود بخود نکھرے گا۔ خوش اور مطمئن ہونے کی بات یہ ہے کہ شاعر جو کسی راہ کسی مسلک کسی مقصد کی تلاش میں تھا وہ اسے مل گیا۔ اس نے حال کے احساس کی تفسیر و تعمیر کرنے کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی بشارت کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ اس نے ہمیں امید، یقین اور حوصلے کا رجائی ادب دیا ہے اور یہ سب کرتے ہوئے بھی اپنی فطری خوش طبعی اور خوش مزاجی کو فنا نہیں ہونے دیا ــــ اور یہ بات اس نئے دور کی شاعری کی بہت بڑی فتح ہے۔

لیکن شاعر کے لئے اور اس سے بھی زیادہ اس افسانہ نگار اور ناول نگار کے لئے جو اپنے ردعمل کے اظہار کے لئے ٹھہری ہوئی فضا چاہتا ہے، فتح کا یہ لمحہ حقیقت میں اس کے نئے سفر کا آغاز ہے۔ شاعر نے بڑے ولولہ انگیز انداز میں ماضی اور حال کے روابط، دنیا اور دین کے روابط، اللہ اور بندے کے روابط، انسان اور نیکی کے روابط، وطن اور اہل وطن کے روابط کے مفہوم کو نئے سرے سے ابھار کر اپنے مخاطب کو فکر و عمل کا صحیح راستہ دکھانے کے لئے اس کے دل میں حق کے احساس کی جو شمع روشن کی ہے، اسے اسی طرح روشن رکھنا اس کا فنی منصب ہے۔

لکھنوی مکتب کے کسی شاعر کا شعر ہے ؎

مال سے جان سوا، جان سے ایمان سوا ‏ ‏ ‏ ‏ مال سے جان سے ایماں سے سوا تم مجھ کو

پاکستانی زندگی کے نئے دور میں ہمارے شاعر کو لکھنوی شاعر کی زبان میں یہ بتانا ہے کہ ہمیں اپنا وطن اور اس وطن کے ساتھ جو نصب العین وابستہ ہے، وہ مال، جان اور ایمان سے زیادہ عزیز ہے۔

جمیلہ شاہین

میراجی کا سفرِ شوق

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی شاعر کی شخصیت تک رسائی حاصل کرنے میں اس شاعر کی شاعری کے بجائے اس کی غیر متعلق اور سرسری تحریریں زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے ثبوت کے طور پر میراجی کی وہ نثری تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں جو کسی خاص تخلیقی منصوبے کے بغیر بس یونہی تفننِ طبع کے طور پر سرزد ہو گئیں مگر مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میراجی اپنی ذات کو عمر بھر پردۂ سخن میں چھپاتے چھپاتے بالآخر ان نثری تحریروں میں بے نقاب ہو گئے ہیں۔ فروری ۱۹۴۹ء کے خیال میں کتابِ پریشاں کے عنوان سے میراجی نے جو نثر پارہ پیش کیا ہے اس کا ابتدائی حصہ میراجی کی شاعرانہ شخصیت کی کلید ہے۔ بات سنگ تراش کے استعارے سے شروع کی گئی ہے جو غالب کے اس شعر سے مستعار معلوم ہوتا ہے:

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ　　سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

میراجی نے لکھا ہے:

"لیکن اس عمل کے دوران سنگ تراش کو یاد نہیں رہتا کہ مورتی اندر سے اب بھی وہی پتھر کی ہے جس میں نہ جذبہ ہے نہ گداز جو اپنی سفاکانہ یکسانیت میں ہر داخلیت پر ایک طنزیہ نشتر کا حکم رکھتی ہے اور یہ اس کی ٹریجڈی ہے۔

عورت کی محبت میں مجھے ہمیشہ کچھ ان کے تجربوں کا موقع میسا ہو سکا ہے۔ داخلیت کا حد سے بڑھا ہوا انہماک خود پرستی کے تہہ در تہہ بہروپ میں ہمیشہ مجھے یہی دھوکا دیتا رہا ہے گویا میں ہر شے کو بھول کر کسی خارجی شے کی پرستش کر رہا ہوں لیکن انجام کار یہی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں بھولا، یا تو وہ صرف میری اپنی ذات ہے، اپنی شخصیت، اپنی انفرادیت اس صورت میں خارجی ذرائع سے تسکین طلبی نہ صرف غیر منطقی بلکہ بے صرف معلوم ہوتی ہے۔

خود پرست عاشق کا یہی تجربہ ہے کہ وہ بڑھتے بڑھتے اس کے بت سے دھوکوں میں ایک گہرے انہماک کرے اور ہر بار اپنے جی کی ہوس کو نظر انداز کرتے ہوئے احساس کو اور عمل کے تبادلے سے اپنے بدلنے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا، یہ کیسے کہوں، میں تو ہمیشہ یہ کرتا آیا ہوں اور نفس کی رحمت کو کی محبت اور اپنی چاہت کو دوسروں کی محبت کا نام دیتا ہوں۔"

ان اقتباس اور میراجی کی آخری پانچ سات سال کی شاعری سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیت شاعر میراجی کا سب سے بڑا المیہ تو میرا اور بدبختی وہ ہاں بلکہ میراجی کے دوست اور نقاد ہیں۔ دوستوں نے جو میراجی کے دل کے قریب تھے میراجی کی غیر مطبوعہ اور منتشر تخلیقات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے بجائے ان کی آوارگی اور اوباشی کے مبالغہ آمیز قصے چسکے لے لے کر سنائے اور نقادوں نے جو پہلے ان کے شاگرد تھے، بعد ازاں

دوست مصلح، رہبر اور نقاد بن بیٹھے، ان ہیبت ناک نظموں کو بنیاد بنا کر میراجی کی شاعری میں ابہام دریافت فرمایا۔ اس بے بنیاد ابہام کے لیے ایک جھوٹا "حوالہ" گھڑا، اس پر بہیزگی انہماء اور ابہام چیزیں اور رات ہمیشہ کے لیے تین گولوں کے زیر تلے دبا دیا۔ ان تنقیدوں اور تاویلوں کی بدولت یہ طے سا ہو گیا کہ میراجی صرف پھسلتے ملبوس کے عشرت انگیز اور بعض اوقات غلاظت آمیز اور کراہیت خیز تلازمات کے مبہم ترجمان ہیں اور انہی نقادوں نے چند بدنام نظموں کے حوالے سے میراجی کو سراہنے یا نشانہ بنانے کے بعد یہ بھی انکشاف کر دیا کہ میراجی کے ذہنی اور فنی ارتقاء کی ساری کی ساری داستان "میراجی کی نظمیں" نامی کتاب تک محدود ہے۔ اور دو نقادوں کا یہ فیصلہ جدید شاعری کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

میراجی کی شخصیت اور شاعری پر قلم اٹھانے والوں کی سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ وہ میراجی کی زندگی اور فکر کے ظاہر میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ باطن پرست میراجی پر اس سے بڑا ظلم جو بھی کیا سکتا ہے؟ یہ درست ہے کہ میراجی نے خارجی ماحول کے ہنگاموں کو مرکز فکر بنانے کے بجائے اپنی ذات کے اندرونی ہنگاموں پر توجہ مرکوز کی مگر یہ غلط ہے کہ ہم میراجی کی شاعری اور شخصیت پر بات کرتے ہوئے میراجی کی ذات کو شنار! لنڈ ڈار کی تباہیوں تک اور ان کی ذاتیات کو مبینہ جنسی کجرویوں تک محدود کر دیں۔ میراجی کے ہاں اپنے آپ کو ڈھونڈنے کا عمل صرف ایک فرد کی تفتیش ذات ہی نہیں بلکہ ایک فرد کا قومی، تہذیبی شخصیت کی بازیافت کا عمل بھی ہے۔

میراجی کی شاعری کی ابتداء ذرا پہلے سن ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ حضرت علامہ اقبال اس حقیقت پر پیچ و تاب کھا چکے تھے کہ فلسفہ زدہ سید زادے دل و دماغ سے بدگمان ہو چکے ہیں اور لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کے زیر اثر ادب تو ادب سید ہاشمی کی اولاد تک اپنی خودی کھو چکی ہے۔ اس زمانے کا نوجوان ڈاکٹر محمد حسن کے لفظوں میں:

"پرانے دھرے سے زندگی گذارنے پر تیار نہ تھا۔ اس کے آدرش بدل گئے تھے۔ اب اس کے لیے پرانی اخلاقی قدروں اور سماجی بندشوں کا صدیوں کا احترام دشوار تھا۔۔۔۔۔ قدامت پرستی کے بہت سے خول شکست ہو گئے۔ بہت سی پرانی قدریں جو صدیوں سے ہماری تہذیب اور ہمارے ادب کے سینے سے لگی رہی تھیں ٹوٹ گئیں۔ اسے کام کا نہ وہ انتخاب پسند تھا جو اس کے لیے بزرگوں نے طے کیا تھا اور نہ اسے دنیا کی زندگی کا وہ نقشہ دل آویز لگتا تھا جو اس کے لیے طے کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ اس تہذیبی بحران کو سیاسی حالات اور عالمگیر فضا نے اور بھی تقویت پہنچائی۔۔۔۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک نئی منزلیں طے کر رہی تھی۔ گول میز کانفرنس کے ملتے ہندوستان کے عام نوجوانوں کو یاد ہو چکے تھے عام ہندوستانی نوجوان آزادی کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن ایک طرف چند نسلی فسادات کا سلسلہ اور دوسری طرف کانگریسی رہنماؤں کا آئینی حربوں تک محدود رہنے کا فیصلہ، دونوں ہی باتیں انہیں پریشان کر رہی تھیں"۔ (جدید اردو ادب)

ستم یہ ہوا کہ اسی عہد میں سائنسی فلسفے اور نظریات ڈارون، ہیگل، مارکس، اور فرائیڈ کے انکشافات نے مابعد الطبیعیاتی اقدار کو دریا برد کر کے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا بھرم بھی توڑ دیا۔ پرانی تہذیبی قدروں کے نیست و نابود ہونے سے:

"عالمگیر طور پر ایک ایسے ذہن کا جنم ہوا جو اپنے سے ضرورت سے زیادہ آگاہی رکھتا تھا اور اس کے پاس آگاہی کی سادہ تسکین کا مرکز نہ تھا کیونکہ ساری کڑواہٹ تھی خیالات کے وہ سارے سلسلے تھے جو کہیں ختم نہیں ہوتے تھے۔ ہاں اس کے پاس زندہ رہنے کا وہ جذبہ بھی نہ تھا جو اس کے بزرگ رکھتے تھے۔ اس لیے یورپ میں ایک خاص قسم کی ذہنی شاعری کا رواج عام ہو گیا۔ ہمارے نئے شاعر جذباتی آہنگ اور داخلی خلوص سے کم آشنا تھے اور فکری کلبیت اور خیالات کی آوارگی کا شکار تھے"۔ (جدید اردو ادب)

اس شکست و ریخت کے عہد میں میراجی کے سفر شوق کا آغاز ہوا۔

"میں تو بچپن ہی سے اس جنگ میں شامل ہو گیا تھا جو دنیا کی تمام جنگوں سے کہیں مختلف ہوتی ہے۔ دنیا کی عام جنگیں لالچ اور نفع کے لئے ہوتی ہیں مجھے لالچ اور نفع سے کبھی نہ سروکار رہا ہے اور نہ رہے گا۔ میری جنگ خدمت کی جنگ ہے۔" (بہن کے نام ایک خط)

اردو نقاد اس سفرِ شوق اور جنگ کی روداد کو صرف اس حد تک پیش کرتے ہیں جس حد تک وہ میراجی کو مریضانہ داخلیت پرستی اور جنسی تلذذ پرستی کے رجحانات کا نمائندہ ثابت کر سکے۔ حالانکہ میراجی نے جہاں لارنس، بودیلیئر اور فرائڈ سے متاثر ہونے کا اقبال کیا ہے۔ وہاں انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ:

"موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش (سیاسی سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کیا ہے وہ بالخصوص میرا مرکزِ نظر رہا ہے۔" (میراجی از میراجی)

موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش جنگ عظیم اور نازی تحریک کی صورت میں انسانیت کے بھیانک مستقبل کی پیش گوئی کر چکی تھی اور برصغیر کی سیاسی اور تہذیبی فضا میں خلافت تحریک کے دم توڑنے اور کانگریس کی ہندو نوازی کے آغاز کے بعد مسلمانوں کی ابدی غلامی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ برصغیر اگرچہ آزاد ہونے والا تھا لیکن آزاد ہند میں مسلمانوں کا بحیثیت مسلمان مستقبل صفر نظر آ رہا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں نوجوان میراجی نے کہا:

رہائی کی امیدیں مجھ کو معلوم تسلی کرنا اے صیاد میری (ابتدائی کلام)

یہی وہ وقت تھا جب میراجی کو اپنے آریہ ہونے کا شدید احساس ہوا۔ محمد ثناء اللہ ڈار کے اس احساس پر ہمیں حیران نہ ہونا چاہیئے کہ آریہ ہونے کا احساس تو خود اقبال کو بھی ہوا تھا۔ میراجی کی طرح اقبال بھی "اصل کے خاص سومناتی" تھے۔ ان کے "آبا لاتی و مناتی" تھے۔ ان کی "کفِ خاک برہمن زاد" تھی۔ مگر جب اقبال نے تہذیبی شخصیت کی بازیافت کے لئے عجمی آریائی روایات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو "سِرِ محمدؐ و براہیمؑ" سے آگاہ ہوئے اور یہ کہ ان کی نظر میں "سگل کا صدف گہر سے خالی ہے" تو "انجامِ خرد بے حضوری" ہے مگر "مغرب کے نغمہ ہائے بے صوت" میراجی اور ان کی نسل کے نوجوانوں کے "ذوقِ عمل کے لئے موت" بن چکے تھے۔ اقبال کی بیتاب، غمناک اور کرب انگیز شعری شخصیت نے مسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی شخصیت کی بازیافت کے لئے ایک عظیم جد و جہد کی تھی:

"وہ اپنے آپ سے نکل لوگوں قوموں نسلوں علاقوں منطقوں، ساحلوں اور صحراؤں، ان دنیاؤں میں جنہیں جغرافیہ ملک ملک سے جدا کرتا ہے پھیل جاتا ہے ان کے دکھ اور غمناکیوں کو اپنے اوپر وارد کر لیتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے ان مختلف اکائیوں سے جو ترکوں، عربوں، ایرانیوں، افغانوں، مصریوں اور مغرب اقصیٰ کے رہنے والوں سے پیدا ہوتی ہیں ایک فاعدا اکائی کو نمذ کرتا ہے۔ اس اکائی کو ہم مسلمانوں کے ایک ہونے کے احساس کی شکل میں جانتے ہیں اور تصورِ ملت اسلامیہ بھی کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اقبال کے تصورِ ملت کا اصل مفہوم مسلمانوں کی تہذیبی وحدت ہے کہ وہ اپنی تہذیب ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے ماضی اپنے طرزِ فکر اور اپنے مذہب کے باعث اپنی الگ دنیا رکھتے ہیں۔ جو نہ تو مشرقِ بعید سے کوئی علاقہ رکھتی ہے اور نہ یورپی دنیا سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اقبال مسلمانوں کی تہذیبی شخصیت کا عکس پیش کرتا ہے۔" جیلانی کامران: اقبال کی شہرت کا باعث۔

"مشرق و مغرب کے نغمے کی لَے" اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ میراجی نے بھی تہذیبی شخصیت کی بازیافت کے لئے تہذیبی منطقوں کا سفر اختیار کیا اور جس خطے میں بھی اپنی ہی طرح واماندۂ شوق نظر آئے ان سے تہذیبی رشتے استوار کئے مگر میراجی "نفس تازی" رکھنے کے باوجود "نگاہ آلودۂ اندازِ افرنگ" کی بدولت اقبال کے پیش کردہ تہذیبی شخصیت کے عکس سے دوچار نہ ہو سکے اور تفتیشِ ذات کی اس مہم کی پہلی منزل پر ان کا سامنا میر تقی میر سے ہو گیا:

میر ملے تھے میراجی سے باتوں سے ہم جان گئے فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا بھی دیوان کریں

میراجی نے اس سرچشمۂ فیض تک رسائی حاصل کی تو معلوم ہوا کہ میر نے تو:

قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

میراجی بعد ازاں میراجی کو سنت بھائی اور ایک ایمان دار آدمی کی طرح انھوں نے ترکِ اسلام کی روایت سے رشتہ جوڑ لیا اور اس دوران کا ذہن چھتنا ہو گیا ہندوانی بننے لگا۔ جب میراجی نے اپنے آپ کو ایران کے آریائی مٹی سے جڑا ہونے پر محسوس کیا اور ہند آریائی روایات کے تہذیبی اثرات سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کی کوشش کی تو ان کی ذات اور شاعری خود ان کے لیے معمہ بن گئی کیونکہ عجمی آریائی اور ہند آریائی روایات کے ذہنی اختلافات کا نتیجہ ایک غیر مربوط منتشر نظامات فکر ہی کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ فلسفہ عجم کے دیباچے میں علامہ اقبال لکھتے ہیں :

> "ایرانی کا تخیل ساقیانہ کیف آور ایک نیم مستی کے عالم میں ایک پھول سے دوسرے پھول کی طرف اڑتا پھرتا ہے اور وسعت چمن پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالنے کے ناقابل نظر آتا ہے اس وجہ سے اس کے گہرے سے گہرے افکار و جذبات غیر مربوط اشعار (غزل) میں ظاہر ہوتے ہیں جو اس کی فنی لطافت کا آئینہ ہے۔ لیکن ہندی بھی ایک ایرانی کی طرح عالم کے ایک اصلی وحدت کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ ایک تجربے سے دوسرے تجربے کی طرف خاموشی کے ساتھ آگے بڑھتا اور بے رحمی سے ان تجارب کا تجزیہ کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ کلیت ان تجارب سے منکشف ہو جاتی ہے جو ان کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایرانی کو مابعد الطبیعیات کی بہ حیثیت ایک انتظام فکر کے شعور مخفی ہوتا ہے اس کے برعکس ایک برہمن اس بات کو پوری طرح محسوس کرتا ہے کہ اس کے نظریہ کو ایک مدلل نظام کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔"

میراجی کی شاعری اور شخصیت کا یہ وہ دور ہے جب ان کی شاعری میں ان کی ذات کا اظہار ہندی دیومالا، ہندی شاعری کے لہجہ اور آہنگ اور ہندی تراکیب کی وساطت سے ہوا۔ "میراجی کے گیت"، "گیت ہی گیت" اور میراجی کی نظمیں کی بیشتر فضا ہند آریائی فضا ہے۔ اس مرحلے پر وہ ذات اور شاعری کے معمے کی پیچیدگی میں کھوئے رہے، الجھنوں سے مزے لیتے رہے اور ذات اور شاعری کے الوکھے پن سے مشہور ہوتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ میراجی کی خودنگری، ان کے لیے سدِ راہ بن کر رہ گئی۔ جب انھوں نے اس معمے کو سمجھ لیا اور سمجھ کر حل کرنے پر مائل ہوئے تو ان کی شاعری میں ایک واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ "خیال" کے صفحات "پابند نظمیں" اور "سہ آتشہ" کی نظمیں اور غزلیں ہند آریائی فضا سے قدرے مختلف ہیں۔ ان رسالوں اور کتابوں میں میراجی کا اب و لہجہ بالکل عجمی اسلامی ہے۔ خدا، طالب علم، جزو کل، آبگینہ کے اس پار کی ایک شام، انجام، روحِ انسانی کے اندیشے، صدا بصحرا، لمحے اور غزلیات میں فارسی عربی تراکیب بکثرت ہیں۔ عجمی آریائی فضا ہے۔ ہندی لفظ اول تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو آ گیا ہے لایا نہیں گیا اور وہ بھی اس قید سے کہ عربی اور فارسی کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ مزید یہ کہ اس دور کی نظمیں پابند نظموں کی شان لیے اور ابہام سے یکسر خالی ہیں۔ میراجی کے نقادوں نے میراجی کی شاعری کی اس واضح تبدیلی کو اب تک نظر انداز کر رکھا ہے۔

عجمی آریائی روایات سے وابستہ ہونے سے پہلے میراجی کے ہاں جو فضا ہے، جو شعور ہے، جو روحانی کرب اور ویران تنہائی ہے اس کا تجزیہ خود میراجی نے اپنے ایک مضمون جرمنی کا یہودی شاعر "ہائینے" میں کر رکھا ہے۔ فی الواقع ہائینے اور میراجی میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ جس طرح ہائینے کو اپنے یہودی النسل ہونے کا شدید احساس تھا۔ اسی طرح میراجی کو اپنے آریہ ہونے کا شدید احساس تھا۔ ہائینے کی طرح میراجی بھی بہ یک وقت جدت اور قدامت کے جویا تھے۔ پھر ہائینے ہی کی طرح میراجی کی نظر میں "شادی بیاہ کے معنی مذہبی یا قانونی بندھن نہیں ہیں" اور "جذبۂ محبت اور جذبۂ جنس دو الگ چیزیں نہیں"۔ اس سلسلہ میں میراجی کا یہ اعتراف بھی قابل غور ہے: "اس کے کلام میں وہ صحت اور لذتِ نفس آ سکی جو عرب کے ایامِ جاہلیت کی شاعری میں تھی یا یونان میں تھی .... شعر و ادب میں یہ رنگ صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ فن کار کی نظر میں جنسیت اور محبت ایک ہی بات کے دو نام ہوں۔"

میراجی نے جنسی خواہشات کو قلبی رفاقت سے علاحدہ کر کے جنسی زندگی کی ساری سماجی اہمیت کو نظر انداز کر دیا اور اس حد تک انتہا پسند

ہو گئے کہ جنسی بے راہ روی اور مزاج کو بھی برا نہیں سمجھا۔ سب سے بڑھ کر اونچا مکان، حرامی، طوائف اور اغوا جیسی نظمیں اس نظریہ کی تائید میں میراجی قدیم متصوفانہ زندگی کے پرستار ہوتے ہوئے بھی اپنے فنی اور فکری سفر کے اس مرحلے پر عورت کو محض عشرت پرستی کی نظر سے دیکھتے رہے اور جوابی طور پر ان ہی عورتوں نے بھی انھیں میراجی ہی بنا دیا۔ یہی خیر مبارک کتاب جنت کے نام کے مکمل دیباچہ میں ایک غزل اور دو نظمیں کہانت، عشرت پرستی کو عزیز جانا۔ یہ عورتیں اس سے زیادہ کچھ کیا سمجھ سکتی تھیں؟ کتابوں نے بھی یہی بتایا ہے کہ جب بھی عورت کو عورت کے جمالی اوصاف کی بنا پر پایا گیا ہے تو وہ بھی طور پر جمالی خوبیوں کی حفاظت کی خاطر آرام اور آسائش کی زندگی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ میراجی کا یہ تضاد کہ قدیم متصوفانہ زندگی کو بتاتے ہیں مگر اس زندگی کے روپ، رواں تصور عشق سے دور ہو گئے ہیں، وہ مشینی دور کی جنس پرستی کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں اس لئے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ انھوں نے اپنے کئی مضامین میں بارہا کہا ہے کہ یہ خیرگی آدمی پر اخلاقیات کی ہمت نہ رکھتا ہوا اپنے لئے ایک تصوراتی جہان ڈھونڈ لیتا ہے اور [illegible] یہ تمام نظریہ کو یاد دن سارا کر دیتا ہے جو اس کے [illegible] کے نظریات کی ضد ہوتے ہیں۔ میراجی کے آریائی ماضی نے روح کی بہشت کی تلاش کی تھی اور میراجی نے انتقاماً بیسویں صدی کے گمراہ کن اور خالص جنسی معروضوں کے آسیب میں محصور ہو کر اپنے جسم ہی کو سب کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ تفتیش ذات کا یہ وہ مرحلہ تھا جب وہ جسم کی اندھی تاریکیوں میں اترے۔ نادان کی یہ جد روشنی کے حصول کے لئے تھی۔ میراجی نے جسم کی تاریکیوں میں انسانی وحشت و غضب اور بے بسی لاچارگی کے اندھیروں میں گھرے رہنے کے باوجود سوچ کا سہارا کبھی نہ چھوڑا۔ ان کی ایسی نظمیں جن کو محض جنسی بے راہ روی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے ان میں سوچ کا یہ پہلو جھلک رہا ہے۔ ایسی ہی ایک نظم کے آخری مصرعے ہیں:

آ مری ننھی پجارن
آ مری من موہنی
چاہتا ہوں تو بھی میرے پاس ہو
اور سوئیں ساتھ ساتھ

یہ جنسی معاملہ بندی نہیں روحانی پیاس کی منظر نگاری ہے

ایک اور نظم میں ایک نئی صورت دیکھئے:

جی چاہتا ہے تم ایک ننھی سی لڑکی ہوتیں اور تمہیں گود میں لے کر اپنی بٹھا لیں
یونہی جھڑ چلاؤ، بھنویں دو یونہی، ادھر ادھر [illegible] ملا کر گرا دو
کبھی ایسے جیسے کوئی بات کہنے لگی ہو
کبھی ایسے جیسے نہ بولیں گے تم سے
کبھی مسکراتے ہوئے شور کرتے ہوئے ہر جگہ سے ابھر کر وہ ایسی باتیں

ان نظموں کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ میراجی جسم کی تاریکیوں میں محض جنسی بھوک ہی کی خاطر نہیں اترے بلکہ انھیں محبت اور عورت میں رفاقت اور یگانگت کی کرنوں کی تلاش تھی۔ مگر میراجی کا ماحول اتنا دم گھونٹ دینے والا تھا کہ انھیں کہنا پڑا:

مجھے کچھ پتا نہیں آج یہ دنیا مٹ جائے
اپنی پابندی سے [illegible] بچ کے نکل جائے

میراجی نے "سنگدل خون سکھاتی ہوئی بے کار سماج سے فرار کے لئے ایک "روزنِ بے زنداں" بہت پہلے ڈھونڈ لیا تھا۔ انگلستان کی تین شاعرہ بہنوں سے اردو دنیا کو متعارف کراتے ہوئے میراجی نے لکھا تھا: "ماحول کے ناپسندیدہ ہونے کی صورت میں اگر اس کی فطرت باغیانہ ہو تو شاعر صوفی یا بیراگی بن جاتا ہے۔۔۔۔ لیکن اگر اس قسم کا کوئی اور انسان جو فن کارانہ رجحانات رکھتا ہو اور گہرے احساس کا اہل ہو، اپنی ہستی کو اپنے آپ میں سمیٹ کر دنیا سے علیحدہ کرے تو وہ اپنی وابستگی اور اس کے احساس کی حاجت روائی کے لئے اس جہان سے الگ ہو کر اپنا ایک الگ جہان آباد کرے گا جہاں اس کے نازک تصورات کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہ ہو گی" اس لئے اپنے سفرِ شوق کے اس مرحلے پر میراجی کے ذہن کی نئی کروٹ نے "عشق کے طائرِ آوارہ" کا بہروپ بھرا اور اس دشت کی راہ پکڑی جس سفر کرنا جوکھم کا کام تھا۔ زادِ راہ کے لئے ایک "گھنگھور سکون اور کڑی تنہائی" کا اندوختہ تو پہلے ہی موجود تھا ماضی سے حال تک کا یہ سفر جو میراجی نے ابھی طے کیا تھا ان کے لئے سایہ کا سفر تھا:

بیتی لذت بھی میرے واسطے اک سایہ ہے
کسی سورج تلے آئے ہوئے بادل کا
سرسراتے ہوئے جھونکے کی طرح آتا ہوا جاتا ہوا
باتیں کرتے ہوئے وہ ایک پل بھی نہیں رکتا

اور حال کا سایہ کتنا ہیجان لیوا ہے:

راستہ آج بھی سایہ ہے مگر اک نیا سایہ
راہ میں ایک مکاں
وہ بھی سایہ ہے، اداسی کا گھنیرا استھان
راہ میں آتی ہوئی ہر مورت
ایک سایہ ہے ——— چڑیل
حور کا اس میں کوئی عکس نظر آتا نہیں

اس طرح تفتیشِ ذات اور قومی تہذیبی شخصیت کو ڈھونڈنے کا یہ انفرادی عمل ایک بھیانک تنہائی پر تمام ہوا۔ ایک ایسی تنہائی جس میں ذہنی خلفشار بھی تھا اور جنسی انتشار بھی۔ مگر حق کے جویا میراجی اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس تنہائی، خلفشار اور انتشار سے نبرد آزما ہونے کے لئے اور روح کی بہجت کی تلاش میں میراجی ایک نئے سفر پر نکلے اور یہ سفر بھی آریائی روایات کی طرف واپسی کا سفر تھا:

گوشے میں عافیت کے نہ بیٹھے کبھی کوئی — مسلک میرا یہی ہے مراد کو بڑھاؤں گا
سو تجربے ہیں راہِ سفر میں چھپے ہوئے — میں ان کو اپنی عمر کا حاصل بناؤں گا
طاری ہے اک جمود سا رخِ حیات پر — ہر نقشِ جمود کو یکسر مٹاؤں گا
لیکن عطا ہوں سحر کی خاصیتیں مجھے
مل جائیں لفظ لفظ میں کیفیتیں مجھے

(سندباد کی واپسی)

اردو شاعری کے سندباد کی واپسی کا یہ سفر اس لحاظ سے بڑا معنی خیز ہے کہ یہ سفر ایک روایت سے دوسری روایت کی طرف واپسی کا سفر ہی نہیں بلکہ وہ

سفر بھی ہے جو میراجی نے جسم سے روح کی طرف، بیراگ سے تصوف کی طرف، طبیعیات سے مابعد الطبیعیات کی طرف اور خیال سے نقطہ کی طرف اختیار کیا۔

وفات سے پہلے میراجی جو مجموعۂ کلام مرتب کر رہے تھے اس کا نام انھوں نے "تین رنگ" تجویز کیا تھا۔ اس کتاب کا جو اشتہار "خیال" میں برابر شائع ہوتا رہا اس میں میراجی کی ذہنی نشو و نما کا تذکرہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نشو و نما کا اندازہ صرف اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ اب میراجی گیت اور نظم کی لذت زا پہنائیوں تک محدود نہیں بلکہ غزل کی ماورائی فضا میں بھی پرواز کھولنے میں بھی کوشاں ہیں۔ یہ تیسرا رنگ میراجی کی شاعری اور شخصیت کی تیسری سمت سے میراجی نے یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ بودلیئر، میلارمے، فرائڈ، لارنس، امیر خسرو، انشاء، غالب اور ٹیگور سے بہت متاثر ہیں۔ شعراء کی اس طویل فہرست میں اقبال کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ "مشرق و مغرب کے نغمے" کے کئی مضامین میں انھوں نے اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

> "اردو کے موجودہ انقلابی شاعر بھی حالات سے بدظن ہو کر اپنی ایک علیحدہ دنیا بسائے بیٹھے ہیں۔ یہ دنیا بھی ویسی ہی ناکارہ ہے جیسی کہ پرانے شاعر کی خیالی دنیا کیونکہ اس میں بھی عمل کا فقدان ہے اور باتوں کی کثرت۔ اس لحاظ سے صرف اقبال اردو کا ایک شاعر ہے جو صحیح راہ پر چلتے ہوئے ایک نئی دنیا بسانا چاہتا ہے کیونکہ وہ ہر وقت عمل پر مصر رہتا ہے۔"

یہ اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ میراجی اقبال کے نظریات کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرنے کی جد و جہد میں مصروف تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کسی شاعر یا صنفِ شعر کو رہنما نہیں اپنایا۔ انھوں نے غزل اور اقبال کو بھی رہنما نہیں اپنایا بلکہ غزل اور اقبال سے رشتہ استوار کرنے کی وجہ دونوں کا مابعد الطبیعیاتی اندازِ فکر ہے جو میراجی کی چند آخری نظموں، دو چند منصوبوں میں پوری تابانیوں سے جلوہ گر ہے۔ اپنی ایک نظم "تنہائی" میں میراجی نے تنہائی کو بالکل انوکھے انداز سے پیش کیا ہے۔ اب یہ ایک ایسے شخص کی تنہائی نہیں جو ذہنی خلفشار اور جنسی انتشار میں گھرا ہوا ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی تنہائی ہے جس نے خود کو کائنات اور اس کے مظاہر سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ یہ تنہائی گہرے سکون سے عبارت ہے۔ شاعر کے اندر کا سکون خارجی دنیا کے سکون سے ہم رشتہ ہے:

فضا میں سکون ہے
المناک گہرا، گھنا، ایک اک شے کو گھیرے ہوئے ایک اک شے کو افسردگی سے مسل کر مٹاتا ہوا، بے اماں، بے محل
نور سے دور پھیلی فضا میں سکوں ہے
اُجالے کی ہر کرن جیسے ٹھٹکی ہوئی — اندھیرے سے بڑھ کر اندھیرا

....

فسردہ سی کچھ ہڈیاں ہیں، فسردہ سی خاکستر بے زباں ہے،
فسردہ سے کنکر، فسردہ فضا میں سکوں ہے
یہاں کوئی غولِ بیاباں نہیں ہے
چھلکتی ہوئی ٹہنیوں کی گھنی پتیوں میں گھنا اور گہرا سکوں ہے

یہاں میراجی نے اپنے آپ کو "فسردہ سی ہڈیاں" اور "فسردہ سی خاکستر بے زباں" کہا ہے اور پھر "فسردہ کنکر اور فسردہ فضا" کا ذکر کر کے عالمِ آب، و باد و خاک، اور میراجی دونوں کو ایک کر دیا۔ اس میراجی (تنہا رات)، اور کون و مکاں ہر دو کا سب سے بڑا دکھ سکوں ہے۔ وہ چاہتے ہیں:

سکوں دور ہو جائے
یہ کیسا فسوں ہے؟
سکوں ہے، سکوں ہے؟

سکوں دور ہو جائے ہنگامہ پیدا ہو، ہنگامہ شورِ مجسم بنے، سامنے آئے پل میں سکوں دور ہو جائے

لیکن

مرے دل کے گہرے سکوں میں ہوا سرسرانے لگی ہے

اب میراجی اندھیروں کو مسخر کر کے اس منزل کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں سے عرفانِ نفس و آفاق کی روشنی دیکھی جا سکتی تھی اور اس لمحہ انھوں نے سکون کا ادراک بھی کر لیا تھا۔ ذات و کائنات پر سکون مسلط ہو جائے تو کائنات اور ذات کے تغیر، ارتقاء اور نشو و نما کی تمام راہیں بند ہو جائیں گی یہی میراجی کا دکھ ہے۔ ذاتی سطح پر یہ دکھ ان کی نظم "یگانگت" میں ابھرا ہے۔

زمانے میں کوئی برائی نہیں ہے

فقط اک تسلسل کا جھولا رواں ہے

یہ میں کہہ رہا ہوں

میں کوئی برائی نہیں ہوں، زمانہ نہیں ہوں، تسلسل کا جھولا نہیں ہوں

مجھے کیا خبر کیا برائی میں ہے، کیا زمانے میں ہے، اور پھر میں تو یہ بھی کہوں گا

کہ جو شے اکیلی رہے اس کی منزل فنا ہی فنا ہے

برائی، بھلائی، زمانہ، تسلسل ــــــ یہ باتیں بقا کے گھرانے سے آئی ہوئی ہیں

مجھے تو کسی بھی گھرانے سے کوئی تعلق نہیں ہے

میں ہوں، ایک، اور میں اکیلا ہوں، اک اجنبی ہوں

کہیں یگانگت کا موضوع یہ فرمانِ مقدس تو نہیں کہ زمانہ کو برا نہ کہو کہ میں خود زمانہ ہوں"؛ اس سلسلۂ خیال کی ایک اور نظم عدم کا خلا ہے:

ہر ایک شے سے مرا نشانِ عدم عیاں ہے

عدم بھی دریوزہ گر ہے میرا، مرے ہی بل پر رواں دواں ہے

فسانۂ زیست کا جھلستا ہوا اجالا بھی مٹ چکا ہے

مگر وہ مٹ کر کوئی اندھیرا نہیں بنا ہے

کہ اس جگہ تو کوئی اندھیرا نہیں، اجالا نہیں، یہاں کوئی شے نہیں ہے

میراجی کے ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ اگر کوئی شے نہیں ہے (ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے) تو وہ دنیا تو نہیں ہے؛ اگر کوئی شے نہیں ہے تو وہ خدا تو نہیں ہے؟ خدا میراجی کی طرح ہے مگر نہ میراجی شے ہیں اور نہ خدا شے ہے اور بالآخر مادیت کے مرعوب ذہن نے پیغمبروں کی طرح صبح شام کو نظارہ کرنے اپنے "ان گنت گہرے خیالوں کو سمیٹا۔

میں نے کب دیکھا تجھے روحِ ابد

ان گنت گہرے خیالوں میں ہے تیرا مرقد

صبح کا شام کا نظارہ ہے

ذوقِ نظارہ نہیں چشمِ گدا گر کو مگر

میں نے کب جانا تجھے روحِ ابد
راگ ہے تو پہ مجھے ذوقِ سماعت کب ہے
مادیت کا ہے مرہونِ مرا ذہن ..... مجھے
چھو کے معلوم ہو سکتا ہے شیریں ہے ثمر
اور جب پھول کھلے ان کی مہک اُڑتی ہے
اپنی ہی آنکھ ہے اور اپنی سمجھ کس کو کہیں ..... تو مجرم

اور اس طور رو سے "روح" تک کا عرفان کیا:

میں تجھے جان گیا روحِ ابد
تو تصور کی تمازت کے سوا کچھ بھی نہیں
چشمِ ظاہر کے لیے خوف کا سنگیں مرقد
اور مرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں (خدا)

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ اس مرحلے پہ میراجی ان مسائل سے دوچار ہوئے جن سے نوعمر اقبال دوچار ہوئے تھے بسبب رہنے میراجی کے ہاں "حقیقتِ منتظر" کو "لباسِ مجاز" میں دیکھنے کی تڑپ جاگتی ہے۔ لباسِ مجاز وہ پہلا شعلہ "جب نوجوانی کا عالم تھا اور بہار کا موسم جس کا اندوختہ بچی کھچی آورشی ذہنیت سے دو دیباچہ اجنتا کے غار، میرا سین یاد آتی ہے، اس کا جسم یاد آتا ہے۔ کیونکہ میراجی کے خیال میں ہر عورت ہر مرد کو ہر عورت کا روپ دکھانے میں مصروف ہے یا ایک ہی عورت ایک ہی مرد کو ہر عورت بن کر لپیٹ رہی ہے۔" آبگینہ کے اس پار کی ایک شام میں میراجی ایک عورت کے تصور کے پاس سرک جاتے ہیں۔ یہ عورت میرا سین نہیں مگر وہ اس میں میرا کا روپ دیکھنا چاہتے ہیں:

یونہی لیٹی رہو، ذرا میں سوچ لوں، ایک گھونٹ تیرے گرم بازو سے
مرے دل کو سبک سار کر سکے گا، یا پھر میں گہرے اندھیرے کے خلا میں جھولتے ہی جھولتے نمناک آنکھیں بند کر دوں

میراجی کا دل سبک سار نہ بن سکا کہ اب وہ زندگی کے اس مقام پہ تھے جب عناصر میں اعتدال نہ ہونے سے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور مجاز و حقیقت دونوں ان کے بس کی بات نہ رہے۔ وہ اتنی دور جا چکے تھے کہ چاہنے کے باوجود، گھر پہنچنا ناممکن تھا!

حیاتِ مختصر سب کی بہی جاتی ہے اور میں بھی
ہر اک کو دیکھتا ہوں، مسکراتا ہے کہ ہنستا ہے
کوئی ہنستا نظر آئے کوئی روتا نظر آئے
میں سب کو دیکھتا ہوں دیکھ کر خاموش رہتا ہوں
مجھے ساحل نہیں ملتا

جیمس جوائز کی کتاب میں قرآن پاک کے حوالے تلاش کرنے والے میراجی کا جرمنی جا کر انتال کی ماہیت اور وجہ تسمیہ کو جستجو کر قرآن پاک پر تحقیق کرنے

اور یوں جنوبی ہند سے جرمنی تک کا سفر کرنے کا منصوبہ ادھورا رہ گیا ورنہ اس طرح اطالوی نقاد ماریو پراز کی کتاب Romantic Agony پڑھ کر میراجی کے نقطۂ نظر میں جو تبدیلی اور وہ اس تبدیلی کے زیر اثر اردو ادب میں جو کارنامے انجام دینے کے خواب دیکھ رہے تھے اس کی تعبیر بھی سامنے آ سکی (میراجی کے مشن ―― مظہر ممتاز) اقبالؔ بھی ایک بار اس بے پناہ مایوسی کا شکار ہوئے تھے اور ملت کی پریشانیوں اور مایوسیوں پر ذاتی رنگ دے کر انھوں نے بھی ایک آرزو کی تھی۔

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب ۔۔۔ کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

میراجی بھی دنیا کی محفلوں سے ترکِ تعلق کی آرزو کرتے ہیں:

غیر آباد جزیروں میں چلا جاؤں گا ۔۔۔ عمر بھر لوٹ کے میں پھر نہ کبھی آؤں گا
شہر میں سانس بھی لینا ہے مجھے اب دوبھر ۔۔۔ شہر کی تلخ فضاؤں سے نکل جاؤں گا
دور جا بیٹھوں گا ہنگامۂ شور و شر سے ۔۔۔ قلب مجروح کو میں تنہائی سے بہلاؤں گا

نغرو دنیا کی حدیں راہ میں حائل ہوں گی
حسرتیں ساکنِ ظلمت کدۂ دل ہوں گی

رسم دنیا ہے محبت میں ہوں تشنہ کامی ۔۔۔ حسن کے خواب غم دورد کے ہیں پیغامی
اس جہاں میں مجھے رسوائی ملی ناکامی ۔۔۔ اس جہاں میں میں رہا خستہ و خوار و عامی
اس جہاں میں نہ کبھی رنج کی ہیبت دیکھی ۔۔۔ اس جہاں میں نہ کبھی راہِ مسرت دیکھی

اس جہاں میں نہ کبھی لوٹ کے پھر آؤں گا
غیر آباد جزیروں میں چلا جاؤں گا

(ترکِ تعلق)

اردو ادب کی زبردست بدقسمتی ہے کہ میراجی کی یہ آرزو بہت جلد پوری ہو گئی اور وہ بمبئی کے ایک ہسپتال میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور ان کے ادبی منصوبے باقی رہے جو ابھی تک ان کے کسی شاگرد کی راہ دیکھ رہے ہیں مگر ان کے شاگرد بھی تو ہم جیسے افادہ پرست لوگ ہیں جو ان کی موت کے بعد ان کی زندگی پر مضمون لکھ سکتے ہیں جلسہ گاہوں میں یوم میراجی منا کر اپنی فن دوستی کی نمائش کر سکتے ہیں لیکن میراجی کا غیر مطبوعہ کلام شائع نہیں کرا سکتے۔

مجھے یقین ہے کہ میراجی کے شاگرد جب بھی ان کا غیر مطبوعہ کلام یکجا کریں گے یا جب بھی نقاد اس کلام سے اعتنا کریں گے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گی کہ میراجی کا نعرہ بھی انا الحق ہے مگر بقول احمد ندیم قاسمی:

ہم وہی بات بہ اندازِ دگر کہتے ہیں

میراجی بھی یہ بات بہ اندازِ دگر کہتے ہیں، اقبالؔ و ندیمؔ سے بھی مختلف انداز میں، اور اسی اندازِ دگر میں میراجی کی انفرادیت اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

خاطر غزنوی

اُردو میں آپرا

اُردو میں آپرا کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں ماضی کی ان سبھی سبھاؤں اور جلسوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جن کا تعلق موسیقی سے ہے لیکن ان سے بھی پیشتر یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ آپرا کیا ہے اور اس کی فنی خصوصیات کیا ہیں۔

آپرا درحقیقت اطالیہ کی چیز ہے اور ازمنہ وسطیٰ کے مذہبی ناٹکوں سے ماخوذ۔ ابتدائی آپرا امراء کے طبقے کے چند انٹلکچوئل قسم کے لوگوں کی اختراع تھی اور اس نے یورپ کے سب سے زیادہ انٹلکچوئل شہر فلورنس میں جنم لیا۔ کوئی سو سال سے زیادہ عرصہ تک شمالی اٹلی تعمیر، سنگ تراشی، مصوری، شاعری اور موسیقی جیسے فنون لطیفہ کی فنکارانہ تہذیب اور تہذیب و تمدن کا مرکز رہا اور امراء و روساء نے ان فنون کی سرپرستی کی۔ سب سے پہلا آپرا "ڈیفنی" ۱۵۹۷ء میں فلورنس میں کھیلا گیا۔ یہ رینوشینی نے لکھا اور پیری نے اس کی موسیقی ترتیب دی۔

اولین آپراؤں میں سے جن کی مکمل موسیقی محفوظ ہے۔ ان میں پیری اور رینوشینی کا "یوری ڈائس" ہے۔ یہ ۱۶۰۰ء میں فلورنس میں کھیلا گیا۔ اس کے مصنف کا مقصد قدیم یونان کی ٹریجڈی میں موسیقی کی روایت کا احیاء تھا لیکن جس شخص کی ذہانت نے آپرا کے روشن مستقبل کا اندازہ لگایا وہ کلاڈیو مانتی وردی تھا جس نے ۱۶۰۷ء میں "آرفیو" نام کا آپرا پیش کیا۔ وہ مذہبی اور غیر مذہبی موسیقی کی ترتیب کی بہترین صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اسے عوامی عشقیہ ناٹکوں کا بھی تجربہ تھا جن میں جذبات کی انتہائی شدت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ آپرا میں مزاحیہ عناصر شامل کر کے اس کو عوامی سطح پر لایا گیا۔ پہلا پبلک آپرا ہاؤس کیولی نے وینس میں کھولا۔ پھر کارڈینل مازارین نے اطالوی آپرا کو فرانس میں متعارف کرانے کی غرض سے اسی کیولی کو پیرس میں مدعو کیا۔ اگرچہ یہ ناکامیاب رہا لیکن یہیں سے فرانس میں آپرا کی طرف توجہ ہوئی اور ۱۶۷۲ء میں لوئی چہاردہم کی سرپرستی میں لُلی نے باقاعدہ فرانسیسی آپرا کا آغاز کیا۔ انگلستان میں آپرا براہ راست اٹلی سے پہنچا۔ انگلستان میں ابتدائی آپرا نگاروں میں ڈی دیونینٹ قابل ذکر ہے جس کا پہلا آپرا "دی سیج آف رہوڈز" تھا۔

سترھویں صدی میں جب اخلاق پرستوں کی تعداد یورپ میں بڑھ گئی تو آپرا کو ایک خطرناک ترغیبی چیز سمجھا گیا لیکن دورِ جدید میں آپرا کے موسیقاروں کو بہترین تاثر کے افراد قرار دیا گیا۔ بیتھوون اور ویگنر سے پہلے موسیقی کو ڈرامے کی دوسری اصناف کی طرح (سوائے چرچ کی موسیقی کے) صرف تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ ویگنر کا کارنامہ تھا کہ اس نے آپرا میں مذہبی روح پھونکی اور اسے کسی حد تک مقدس بنا دیا۔

آپرا کے ساتھ بعض ایسی خصوصیات وابستہ ہیں جو عام ڈرامے میں نہیں ملتیں۔ یہ خصوصیات زیادہ تر موسیقی پر مبنی ہیں۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپرا کھیلے جانے کے بجائے تمام تر گا کر کھیلا جاتا ہے۔ اسی خصوصیت کو اور واضح الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ آپرا کی ترتیب، تعمیر یا تصنیف یا تخلیق موسیقی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپرا میں شعری اور غنائی فنون پر یکساں طور پر عبور رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر ایسے مقامات پر جہاں کوئی عمل رک جاتا ہے وہاں کوئی نغمہ گایا جاتا ہے۔

بعض پرانے آپرا ایسے بھی ہیں جن میں بعض مکالمے یا الفاظ دہرائے جاتے ہیں خصوصی طور پر آپرا کی ایک مضحکہ خیز روایت یہ بھی ہے کہ اگر کسی کردار کو سٹیج سے جانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ سٹیج فٹ لائٹس کے پاس آ کر اپنے لہجے کی نغمگی کے ساتھ اپنے جانے کا اعلان کرتا ہے۔

آپرا کی ضرورت اور اہمیت جتاتے ہوئے میٹروپولٹن آپرا گلڈ کے ایک تعارفی مجموعے میں کیرول این لتھن اور سماجے لتھن نے لکھا ہے کہ کسی آپرا کو سنتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ آپرا ایک قسم کا ناٹک ہے۔ جس طرح کوئی ڈرامہ دیکھتے ہوئے، بولے جانے والے الفاظ کو سمجھنا ایک ضروری امر ہے اسی طرح آپرا کے الفاظ کی تفہیم سے بھی آپ فائدہ اُٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً یہ تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی شخص کا شکسپیئر کی کسی ٹریجڈی کو دیکھنا محض سٹیج کا نظارہ کرنے اور اداکاروں کی صرف آوازوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہے اور یہ کہ ڈرامے کے الفاظ کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا یا سنی اَن سُنی کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ بھی عجیب بات ہوگی اگر ایک شخص آپرا کے الفاظ سے لاعلم رہ کر آپرا دیکھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپرا ناٹک ہے اور اس کے الفاظ اہمیت رکھتے ہیں تو پھر اس میں موسیقی کا کیا مقام ہے۔ دراصل آپرا میں موسیقی ہی الفاظ کو نئی وسعت بخشتی ہے۔ آپرا میں موسیقی کا کام وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں الفاظ کی قوتِ اظہار جواب دے جاتی ہے۔

موسیقی وجدان و بے خودی کا زینہ ہے اور اس اصول کے تحت اس آپرا کو زیادہ کامیاب سمجھا جاتا ہے جو ذہنی طور پر دیکھنے اور سننے والوں کو اس دنیا سے اُڑا کر ایک نئی رومانی دنیا میں پہنچا دے۔ کوئی آپرا جتنا حقیقی ہوگا، عوام میں اتنا ہی کم مقبول ہوگا اور ہوتا رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ زیادہ تر آپرا کی کہانیوں کا موضوع وہ قصے بنے جو کلاسیکی اور رومانی تھے۔ قدیم یونانی اور دور دراز ممالک مثلاً مصر اور جاپان اور پرانے ادوار کی کہانیاں جو آپرا لکھے جانے والی سرزمین یا زمانے سے تعلق نہیں رکھتی تھیں آپرا کے لئے موزوں جان کر منتخب کی گئیں۔

آپرا کی اس تعریف کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں آپرا کے طرح میں ڈھلی ہوئی ایک محفل کا جائزہ لینا ہوگا۔ اودھ کے بادشاہ نصیرالدین حیدر کے شغل کے بارے میں رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عبرت کی یہ عبارت اس تاریخی محفل سے روشناس کرتی ہے:

"کسی نے راگ مالے کی کتاب نذر دی۔ فرمایا اس کا جلسہ ہو۔ جو راگنی جس صورت پوشاک سے دیکھی وہی صحبت ٹھہری۔ ایک بھیرویں کے جلسے میں پانسو عورتیں دلہن کا لباس پہنے، ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگی، چوڑی شہانی، سر سے پاؤں تک جواہر کا زیور، ایک راگنی کی صحبت تیس دن ہوئی تھی، اندر کا سبھا کی آنکھ دکھوائی تھی۔"

ہماری موسیقی کے بارے میں کسی سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ راگ ودیا میں ہر راگ اور راگنی کی ایک خاص عمر، شکل وصورت، وضع قطع اور لباس ہے۔ یہی ساری چیزیں اس راگ یا راگنی کے تاثر کی مظہر ہوتی ہیں۔ ایک اور خصوصی چیز جو ہر راگ سے وابستہ ہے، اس کے گائے جانے کا وقت ہے۔ سارے راگوں میں صرف راگنی بھیرویں کو سدا سہاگن راگنی کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ وقت کے ہر پل میں دلہن کی طرح جوان، حسین اور سجیلی تسلیم کی گئی ہے۔ اس تصور سے نصیرالدین حیدر کے یہاں بھیرویں کے تیس دن پانچ سو دلہنوں کے مہندی رنگے ہاتھوں کی خوشبوؤں اور چوڑیوں کے نغموں سے معمور ہے۔ ایک راگنی کے مزاج کا عملی پہلو ایک نئی چیز تھا اور بظاہر آپرا ہی کا ایک مبہم نقش۔ آپرا کا مبہم نقش اس لئے کہ اس میں ایک راگنی کی خصوصیات مجسم ہو گئی تھیں پھر تیس دن رات بھیرویں کا جلسہ نغموں کا سیلاب لایا ہوگا۔ ٹھمریاں، غزلیں اور گیت وغیرہ سبھی نغموں کا سرچشمہ ایک ہی موضوع تھا۔ اس سارے تماشے میں سب کچھ تھا لیکن کہانی نہیں تھی۔ اس لئے اسے آپرا کہنے میں تامل ہوتا ہے۔

آپرا کی اس سے ذرا بہتر صورت سلطان واجد علی شاہ اختر کا پہلا رہس یعنی کرشن کنہیا کا قصہ تھا جس میں کہانی موجود ہے یعنی اس کی بنیاد سری کرشن کی لیلاؤں میں سے ایک لیلا یعنی راس ہے۔ اسی راس سے لفظ رہس نکلا۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق کے مطابق اس کی اصل یوں ہے کہ ایک دفعہ کرشن نے گوپیوں سے وعدہ کیا کہ آئندہ جاڑوں کی راتیں وہ ان کے ساتھ گزارے گا۔ جب جاڑے کی راتیں آئیں تو کرشن بندرابن میں بانسری بجانے اور دل لبھانے والے گیت گانے لگا جنھیں سن کر گوپیاں جذبات کی شدت سے بے قابو ہو گئیں اور اپنے اپنے کاموں کو ادھورا چھوڑ کر برج سے چل کھڑی ہوئیں۔ کرشن نے ان سے برج واپس جانے کو کہا تو وہ بہت رنجیدہ ہوئیں۔ آخر ان کی خوشی پوری کرنے کے لئے کرشن جمنا کے کنارے ان کے ساتھ کھیلنے اور تفریح کرنے لگے۔ ان کی شفقت پا کر گوپیوں کے دل میں یہ غرور پیدا ہو گیا کہ ہم سے زیادہ خوبصورت، نیک صفات اور خوش قسمت کوئی عورت دنیا میں نہیں۔ ان کا یہ غرور ڈھانے کے لئے کرشن یکایک غائب ہو گئے۔ جب کرشن نظر نہ آئے تو گوپیاں پریشان ہو کر ان کی تلاش میں ادھر ادھر پھرنے لگیں جنگل کے درختوں سے اور ان سے لپٹی ہوئی بیلوں سے کرشن کا پتہ پوچھتی پھریں، پھر کرشن کی یاد میں محو ہو کر ان کے کارناموں کی نقلیں کرنے لگیں۔ کاتک کی پورنماشی کی رات تھی۔ جب تک چاند کی روشنی باقی رہی۔ وہ اسی طرح کرشن کی لیلاؤں کی نقلیں کرتی ہوئی ان کو ڈھونڈتی پھریں۔ پھر سب پلٹ آئیں اور جمنا کے کنارے بیٹھ کر کرشن کے گن گانے اور ان کی نقلیں کرنے لگیں۔ وہ اسی طرح غمگین بیٹھی تھیں کہ یکایک کرشن ان کے سامنے نمودار ہوئے۔ گوپیاں ان کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے بے اختیار ہو گئیں۔

کرشن ان کو لے کر جمنا کے کنارے گھومنے لگے اور ان کے ساتھ کھیل تماشے کرتے رہے۔ گوپیاں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اور گھیرا بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ کرشن بھی اسی حلقہ میں اس طرح شامل ہو گئے کہ ہر دو گوپیوں کے بیچ ایک کرشن نظر آتے تھے۔ ہر گوپی سمجھ رہی تھی کہ کرشن اس کے پاس ہیں۔ گوپیوں اور کرشنوں کا یہ حلقہ بڑے دلکش انداز سے ناچنے گانے لگا۔ بے شمار دیوتا اپنی دیویوں کے ساتھ آسمان سے اس راس لیلا کا نظارہ کرنے لگے اور نقارے بجا بجا کر پھول برسانے لگے۔ راس منڈل میں ناچتی گاتی گوپیوں کی تانوں سے ساری دنیا گونج اٹھی۔ دشنو پران میں جزئی اختلاف کے باوجود راس کا بیان تقریباً اس طرح کیا گیا ہے کہ ہر گوپی کرشن کے پہلو میں کھڑی ہونا چاہتی تھی اور ناچ کا حلقہ نہیں بننے پاتا تھا۔ اس لئے کرشن نے ہر گوپی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اس کی جگہ پر کھڑا کر دیا۔ ہاتھ سے ہاتھ مس ہونے کا یہ اثر ہوا کہ گوپیوں کے حواس جاتے رہے اور ہر گوپی نے اپنے پاس والی گوپی کا ہاتھ کرشن کا ہاتھ سمجھ کر پکڑ لیا۔ بعض روایات کے مطابق ہر گوپی ان کو پہلو میں بھی دیکھتی تھی اور ناچ کے حلقہ کے بیچ اور سامنے بھی۔

ڈاکٹر کمر جی راس لیلا پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کرشن سے گوپیوں کی خود فراموشانہ محبت انسان اور خدا کے درمیان انتہائی گہرے رشتۂ اتحاد کو ظاہر کرتی ہے۔ گوپیوں سے انسان کی محدود دل بستگی مراد ہے اور کرشن شعورِ محض، حسن وجود اور راحتِ روحانی کی علامت ہیں۔ یہ راس لیلا بے نفس محبت کی بلندی سے اترتے اترتے خواہش پرستی کی پستی تک پہنچ گئی۔ واجد علی شاہ اختر کا "رادھا کنہیا کا قصہ" اس راس لیلا کا ایک روپ ہے اس کی کہانی اور رقص و نغمہ ایسے عناصر ہیں جن کے سبب یہ کھیل ڈرامہ کہلا سکتا ہے لیکن اس میں مکالمے تمام تر نثر میں ہیں اور یہی نثری مکالمے "کنہیا رادھا کے قصے" کو ڈرامے کی صف میں لے آتے ہیں اور اسے اردو ڈرامے کی تاریخ میں اولیت کا شرف بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ یوں تو کئی ادبا نے فرخ سیر کے عہد میں "شکنتلا ناٹک" کے ترجمے کو نوازؔ سے منسوب کیا ہے لیکن جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نوازؔ نے کالی داس کے اس ڈرامے کو قصے کے انداز میں ترجمہ کیا تھا، ڈرامے کی صورت میں نہیں۔

واجد علی شاہ نے کرشن کنہیا اور رادھا کے رہس کے بعد اپنی تین مثنویوں "دریائے تعشق"، "افسانۂ عشق" اور "بحر الفت" کو ڈرامائی صورت دی۔ ان مثنویوں کا ڈرامائی روپ دستیاب نہیں ہو سکا لیکن ان ناٹکوں کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان سے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے یہ قیاس کیا ہے:

"مثنویوں کو ناٹک کا روپ دینے اور ان کو سٹیج پر پیش کرنے کے لئے ان میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کرنا پڑتی ہوگی اور مکالموں میں زیادہ تر نثر سے کام لیا جاتا ہوگا۔"

چنانچہ اپنے اس قیاس کی تصدیق کے طور پر انھوں نے واجد علی شاہ کے قصے ماہ پیکر و سیمتن یعنی مثنوی "افسانۂ عشق" کے دیباچے کا حوالہ دیا ہے۔ حکیم اصغر علی خاں اس دیباچے میں لکھتے ہیں:

"یک روز رہس مبارک میں جو مشتری بنتے ہیں وہ اس حقیر کے پاس آئے اور کہا کہ . . . . . آپ بطرز داستان کے گفتگو مشتری کی درست کر دیجئے تو بڑا احسان ہوگا۔"

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان مثنویوں کی ڈرامائی تشکیل میں مکالمے نثر میں ہوتے تھے۔ ان شہادتوں کی بنا پر انھیں ڈراموں کی ذیل میں تو شمار کر لیا جائے لیکن مسودے کہاں سے لائے جائیں۔ اب رہ گیا امانت لکھنوی مرحوم کا تماشا یا جلسہ "اندر سبھا"۔

اوپرا کی جو خصوصیات بیان کی جا چکی ہیں، ان کی روشنی میں اندر سبھا کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے الفاظ کو موسیقی کے مطابق ڈھالنے، جوڑنے یا تخمین کرنے کا مقام آتا ہے۔ ابتدا میں امانت نے غزلوں میں اپنے آپ کو اُستاد کے تخلص سے نوازا اور اس کے جواز کے طور پر اس کام کو معیوب کہا گویا لوگوں کے استہزا کا نشانہ بننے سے بچنے کی غرض سے اُستاد کا لبادہ اوڑھا۔

یہ بات بڑی واضح ہے کہ اس دور میں شاعری عیب نہ تھی البتہ صرف موسیقی ہی کو ڈوم ڈھاریوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ شرح اندر سبھا میں امانت نے اس لئے اسے معیوب نہیں کہا کہ اندر سبھا موسیقی کا جلسہ ہے بلکہ اس لئے کہا کہ اسے لوگوں کی طرف سے انگلیاں اُٹھنے کا ڈر تھا۔ ورنہ اندر سبھا میں موسیقی کا اظہار ہر ہر سطر میں ہے چنانچہ اُستاد کے پردہ دار تخلص میں نہ صرف شاعرانہ اُستادی بلکہ موسیقی میں اُستادی کے افتخار کا جذبہ بھی موجود ہے۔

اندر سبھا کی غزلیں، گیت، ٹھمریاں سب کسی نہ کسی راگ یا راگنی یعنی بہاگ، بھیرویں، دیس، برج، سندھی کافی، کھماج یا بہار وغیرہ کی دھنوں میں ہیں اور ساتھ ہی پیش کش کا ماہرانہ فرض بھی ادا کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اندر سبھا کے اکثر گانے مختلف راگوں میں ترتیب دیئے گئے ہیں بلکہ اس کے بعض الفاظ بھی ان راگوں کے رنگوں اور کیفیات کے مظہر ہیں۔ رعایت لفظی جو لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے، امانت کی اندر سبھا میں موسیقی کو شاعری سے منسلک کرتی ہے۔ مثلاً بہار کے موسم میں زرد رنگ کی بہار کی ایسی تصویر ہے اور موسیقی اور شاعری کا ایسا امتزاج ہے جس کا لطف موسیقی اور شاعری دونوں کے شیدائی اپنی اپنی جگہ حاصل کرتے ہیں۔ کھماج پری کی زبانی بسنتی غزل بھی موسیقی اور شاعرانہ منظر نگاری کو شیر و شکر کر دیتی ہے۔

اندر سبھا کا تماشا آگے چلتا ہے۔ مصنف کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق شروع کیا گیا ہو تو جوگن کے جوگ لینے کا منظر رات کے پچھلے پہر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس وقت جوگن کی گائی ہوئی بھیرویں کی ٹھمریاں اور غزلیں عین رات کے پچھلے پہر کی فضا کو پرفضا بنا دیتی ہیں اور موسیقی حقیقی جادو جگاتی ہے۔ جوگن کا جوگ اس کی جوگن کے بھیس میں نکھری ہوئی صورت اور اس کی صورت کے مطابق الفاظ کی شعری ترتیب اور پھر وقت کی راگنی اس منظر کو جنت نگاہ اور فردوس گوش بنا کر تماشائیوں کو بے خودی کا درجہ بخشتی ہے جو اوپرا کا اصل اصول ہے۔

ان نغموں کے نئے طرز کے التزام کے ساتھ پیش کش کے لئے شرح اندر سبھا دستگیری کرتی ہے گویا اندر سبھا اور اس کی شرح اوپرا کے "لبریٹو" اور "رائٹن میوزک" کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اندر سبھا بول کر نہیں بلکہ گا کر کھیلے جانے والی چیز ہے۔ اس پورے کھیل میں صرف چار نثری سطریں ہیں۔ اور اتنی کم نثری سطروں کی رعایت اوپرا میں دی گئی ہے۔ کئی مغربی اوپرا ایسے موجود ہیں جن میں کہانی کو آگے چلانے کے لئے کہیں کہیں خفیف نثری ٹکڑے استعمال کئے گئے ہیں۔ اندر سبھا میں اوپرا کی یہ روایت بھی بہت سے مقامات پر ستاروں کی طرح چمکتی نظر آتی ہے کہ جہاں نغمہ شروع ہوتا ہے، کھیل کی عملی روانی رک جاتی ہے اور سبھی کردار تماشائیوں سمیت محض اور محض نغمے کا رس پیتے ہوئے نشے میں رہتے ہیں۔

اوپرا کی وہ مضحکہ خیز روایت بھی اندر سبھا میں موجود ہے کہ کردار سٹیج سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے جانے کا اعلان کرتا ہے۔ اندر سبھا میں پہلا

منظر راجہ اندر کا دربار ہے۔ سبھی پریاں ایک ایک کرکے گا چکتی ہیں تو راجہ اندر انھیں انعام سے نواز کر اپنے پہلو میں بٹھا لیتا ہے لیکن سبز پری کے مجرے کے وقت سو جاتا ہے۔ یہاں منظر بدلنے سے پہلے یہ دکھانا ضروری ہے کہ اس مقام سے راجہ کو سوتا چھوڑ کر سبز پری جا رہی ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہتی ہے:

راجاجی تو سو گئے دیا نہ کچھ انعام
جاتی ہوں میں باغ میں یہاں میرا کیا کام

حقیقت یہ ہے کہ اس روایت کو برتنے کے ساتھ ہی امانت نے اسے مضحکہ خیزی کے درجے سے نکال کر ایک حسن بخش دیا ہے۔ چنانچہ جہاں کسی منظر سے کسی کو نکالنا مقصود ہوتا ہے۔ وہ خوبصورت طریقے سے اس کا اعلان کرتے ہیں۔ مثلاً راجہ اندر سبز پری کو سزا کے طور پر اس کے پر نوچ کر اسے اکھاڑے سے نکالنے کا حکم اس طرح دیتے ہیں:

سو تو نوچ کر اس کے پر اور بال اکھاڑے سے میرے ابھی دے نکال
اُڑاتی پھرے خاک یہ کو بہ کو نہ آئے ہمارے کبھی رو بہ رو

گروِل این لٹن کے قول کے مطابق اگر اوپرا کے الفاظ اور گانے سننے اور سمجھنے ضروری ہیں کہ اس کے بغیر کہانی کی ابتدا اور ارتقا کا شعور حاصل نہیں ہوتا تو یہی بات اندر سبھا پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کی اکثر غزلیں، گیت، چھند، ٹھمریاں اور بیانیہ نظم محض گانے ہی نہیں، کہانی کو آگے چلانے کا وسیلہ بھی ہیں۔ اندر سبھا میں بھی موسیقی الفاظ کی اہمیت کو بڑھاتی ہے اور وہ کام کرتی ہے جو الفاظ کی قدرت سے باہر ہے

جہاں تک اوپرا میں اساطیری اور دیومالائی کہانیوں کو موضوع بنانے کی روایت کا تعلق ہے، اندر سبھا اس کی بڑی واضح مثال ہے۔ اندر سبھا کے راجہ اندر میں ہندوؤں کے دیوتا اندر کی جھلک ہے۔ سبز پری کے سبھا سے نکال دئے جانے میں اندر کی اپسرا اُروسی کا عکس ہے۔ اندر سبھا میں بعض مشہور اُردو مثنویوں کی جھلکیاں بھی ہیں۔ ناٹک ساگر کے مصنف محمد عمر نورالٰہی اس کہانی میں اساطیری عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"انھوں (امانت) نے کوشش کی ہے کہ ہندو مسلم تخیل کا ایسا سنگم بنائیں کہ دونوں کو اس ڈراما میں یکساں لطف حاصل ہو۔"

بعض دوسرے نقاد بھی اندر سبھا کے دیومالائی عنصر کو ہند ایرانی دیومالائی امتزاج کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ آخر میں اندر سبھا کی اس خصوصیت کا ذکر بھی ضروری ہے جس کے تحت اس میں اوپرا کی تخیلی اور رومان پرور فضا پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ رومانی فضا تو راجہ اندر کی آمد کے نغمے کے ساتھ ہی ساری فضا میں ہی جال بننے لگتی ہے اور یہ طلسم رفتہ رفتہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی اندر سبھا اور فرانسیسی اوپرا پر تقابلی نظر ڈالتے ہوئے فرانسیسی اوپرا کے متعلق فرماتے ہیں:

"سنہ ۱۸۱۳ء اوپرا کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال جرمنی میں وگنر اور اٹلی میں وردی پیدا ہوا۔ ان دونوں کی ذہنی کاوشوں اور قلمی کوششوں نے اوپرا کو فکری تہذیب اور ادبی شان عطا کی۔ ان کے راگ ناٹکوں میں لفظوں کی اہمیت نغموں سے کم نہ تھی اور وگنر کا نظریہ یہ تھا کہ اوپرا کی تکمیل اس کی متقضی ہے کہ جس دماغ سے اس کے الفاظ نکلیں، اسی سے اس کی دُھنیں بھی نکلیں۔"

پروفیسر موصوف امانت کی اندر سبھا کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اوپرا کے تدریجی ارتقا پر نظر کرنے سے امانت کی قدر ہوتی ہے کہ یورپ میں ڈھائی سو برس کے بعد اوپرا ترقی کی جس منزل پر پہنچا تھا، اس کی جھلک ان کی پہلی ہی کوشش میں صاف نظر آتی ہے۔ اندر سبھا میں ناچ بھی ہے اور گانے بھی۔ فکری تہذیب بھی ہے اور ادبی شان بھی۔ اس کا قصہ دلچسپ اور گیت برمحل ہیں۔ اس میں لفظوں کی اہمیت نغموں سے کم نہیں ہے۔ اس کے گیت بھی امانت نے بنائے ہیں اور ان کی دُھنیں بھی انھیں نے رکھی ہیں۔"

پروفیسر رضوی اندر سبھا کی متذکرہ خوبیوں کی بنا پر اسے ترقی یافتہ آپرا سے مشابہ ضرور سمجھتے ہیں لیکن اس کے کھیل کو آپرا کے کھیل سے کوئی مناسبت دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس کا جواز ان کے نزدیک یہ ہے کہ آپرا بڑی شاندار اور بہت قیمتی تفریح تھی۔ اس میں بیش بہا پردے، نظر فریب سینری اور بہت بھاری اور پیچیدہ مشینیں کام میں لائی جاتی تھیں۔

اس کے برعکس آپرا کے ماہر اور کیمبرج یونیورسٹی کے موسیقی کے پروفیسر ای۔ جے ڈنٹ جنھوں نے موزارٹ کے آپرا "دی میجک فلوٹ" کو انگریزی میں ڈھالا اور پیش کیا، کہتے ہیں کہ ابتدائی آپرا میں مصور پردے اور مناظر وغیرہ کی چنداں ضرورت پیش نہیں آتی۔ نظر فریب سینریاں اور قیمتی آرائش ہمیں بعد کے آپروں میں ملتی ہیں لیکن فرض کر لیجئے کہ آپرا اول میں ان ساری چیزوں کی ضرورت ناگزیر ہے تب بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسودے اور پیش کش کی حد تک اندر سبھا میں آپرا کی تمام تر خصوصیات موجود ہیں تو سٹیج اور اس کے لوازمات یا عمدہ منظر دے کی غیر موجودگی جیسی خارجی چیزیں اندر سبھا کو کیوں کر آپرا کی صف سے علیحدہ کر دیتی ہیں۔ آج اندر سبھا کو مغرب کے کسی آپرا ہاؤس میں کھیلا جائے تو فنی لحاظ سے اس میں کوئی کمی نہیں پائی جائے گی۔ اسی لئے شعر اور موسیقی کے شعوری امتزاج کے اس نمونے کو اردو کا پہلا مکمل اور اول درجے کا آپرا کہنے میں کسی قسم کا پس و پیش نفیِ کفر کے مترادف ہے۔

اندر سبھا کی مقبولیت سے متاثر ہو کر کئی آپرا لکھے گئے۔ یہ اندر سبھا کی مقبولیت ہی تھی کہ اس کے تتبع میں لکھے اور کھیلے جانے والے سبھی کھیلوں کو "سبھا" ہی کا نام ملا۔ ان میں گیارہ سبھائیں قابلِ ذکر ہیں لیکن تقریباً سب کسی نہ کسی لحاظ سے اندر سبھا کی نقل تھیں۔ کہانیوں میں عرب و عجم کا پرتو زیادہ تھا لیکن گانوں میں وہی ڈھنگ اختیار کیا گیا۔ ان سبھاؤں میں مداری لال کی اندر سبھا کو شہرت حاصل ہوئی لیکن وہ قبولِ عام اسے مل سکا جو امانت کی اندر سبھا کے حصے میں آیا۔ اسی طرح جب بمبئی میں پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے ڈرامے سٹیج کرنے شروع کئے تو قدیم مثنویوں اور قصوں سے فائدہ اٹھایا اور سبھاؤں میں ترمیم و اضافہ کیا۔ گویا اندر سبھا کے بعد تخلیقی قوتوں سے کم کام لیا گیا۔ اسی طرح سٹیج ڈرامے کا رجحان آپرا کی تکمیل کے بجائے نثر کی طرف ہو گیا اور اندر سبھا کی صرف اتنی روایت باقی رہ گئی کہ ہر ڈرامے میں گانا ایک جزوِ لاینفک کی حیثیت اختیار کر گیا۔

ریڈیو میں آپرا کو تقویت پہنچنے کے بڑے امکانات تھے لیکن ریڈیو کے لکھنے والوں میں آغا امانت کی طرح نے سُر میں سوچ کر شعر کہنے والا کوئی قابلِ ذکر مصنف پیدا نہ ہوا۔ بعض ایسے شعرا نے جنھیں موسیقی سے مس تھا چند ایسی کوششیں ضرور کیں لیکن ان کی کوششوں کو ہم آپرا کی ذیل میں نہیں غنائیہ کی ذیل میں لا سکتے ہیں۔ آپرا اور غنائیہ میں فرق یہ ہے کہ آپرا کے لئے موسیقی پہلے سوچی جاتی ہے اور الفاظ بعد میں۔ اور آپرا کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ موسیقار شاعر بھی ہو۔ لیکن غنائیہ کے لئے اصول بالکل اُلٹ ہیں۔ غنائیہ نگار کے لئے صرف شاعر ہونا ضروری ہے۔ وہ غنائیہ لکھ کر ریڈیو والوں کے حوالے کر دے۔ اس کی دھنیں موزوں کرنا ریڈیو کے میوزک ڈائرکٹر کا کام ہے۔

جعفر طاہر نے کیوپڈ اور سائیکی کے عنوان سے ایک منظوم ڈرامہ لکھا جس میں مکالمے بھی ہیں، گیت اور نغمے بھی۔ جعفر طاہر نے اپنے کینٹوز کی مہم سر کرنے کے لئے موسیقی میں دسترس پیدا کرنے کی کوشش کی اور سُر تال کے علم سے فائدہ اٹھا کر بعض نظموں میں گت توڑوں کا انداز پیدا کرنے کی کوشش بھی کی لیکن کیوپڈ اور سائیکی میں "رٹن میوزک" یا موسیقی کے لئے اشارے عنقا ہیں اور یہ آپرا کی ڈگر سے ہٹ کر صرف ایک منظوم ڈراما ہو کر رہ جاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے گلبرٹ فرینکاڈ کے اوپرا کا اردو ترجمہ شاید ۱۹۴۱ء/۴۲ء میں "قاضی جی کا فیصلہ" کے عنوان سے کیا۔ یہ اوپرا آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے نشر ہوا اور اس کے لئے رفیق غزنوی نے موسیقی ترتیب دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شاعر کی تخلیقی قوتوں اور وجدانی کیفیت نے اس اوپرا میں ترنم اور غنا کا جادو پھونکا اور اس کی دھنیں ترتیب دینے والے نے شعروں کو موسیقی میں شکر کی طرح گھل جانے کا اعتراف بھی کیا۔ لیکن اصولی طور پر اسے غنائیہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اشعار کی تخلیق موسیقی کی بنیاد پر نہیں ہوئی۔

احمد ندیم قاسمی ہی کی دوسری شعری تحریر "نیا سال" کے عنوان سے دلّی ریڈیو سے نشر ہوئی، اس میں موسم سردی، گرمی، بسنت، بہار، خزاں، سال مہینے، دن، لمحے، پل، کردار ہیں لیکن اس کی صورت بھی وہی ہے۔ ان دونوں تحریروں کو غنائیے کی ذیل میں لایا جا سکتا ہے۔ ندیم نے اس سے پہلے "سیوست" "ضیغم ہندوستان" اور "ماحول کے مارے" کے عنوان سے منظوم ڈرامے بھی لکھے تھے مگر وہ بھی اوپیرا کی ذیل میں نہیں آسکتے۔

قیوم نظر موسیقی میں دسترس رکھتے ہیں اور کلاسیکی موسیقی کے شاعرانہ پہلو پر انھوں نے کام بھی کیا ہے۔ انھوں نے مغربی اوپیرا کا مطالعہ بھی کیا ہے اور مشہور اوپیرا نگار ورڈی کے ایک اوپیرا کو انگریزی کے توسط سے اردو میں بھی ڈھالا ہے۔ لیکن یہ ترجمہ ——— ترجمہ در ترجمہ ہے اس لئے اس میں اصل کی روح کو برقرار رکھا بھی جائے تو جب بھی اس کا موسیقی کا پہلو یقیناً تشنہ رہ جاتا ہے۔ جعفر طاہر کی طرح انھوں نے بھی موسیقی کے اشاروں سے اسے کھیلے جانے کی ہدایات سے محروم رکھا ہے اور اس کا سبب واضح ہے کہ شاعر قیوم نظر کی توجہ انگریزی اوپیرا کی شاعرانہ خوبیوں اور ادبی شان کو اردو میں منتقل کرنے کی طرف لگی ہوئی ہے۔ موسیقی کے رسیا قیوم نظر اس موقعے پر غائب ہیں اور اسی لئے یہ اوپیرا محض کاغذی اوپیرا بن کر رہ گیا ہے۔

اس سارے دور میں ایک مختصر سا ریڈیائی پروگرام ایسا نشر ہو چکا ہے جسے اوپیرا کی ذیل میں لایا جا سکتا ہے یہ پروگرام شاد امرتسری کا "سازوں کی کہانی ان کی اپنی زبانی" ہے۔ شاد امرتسری نے سازوں کی زندگی "تاریخ" اور خصوصیات کو شعر میں ڈھالا ——— رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں ریڈیو کی مجلس ختم ہو چکی ہے۔ سٹڈیو کی برقی روشنیاں بجھا دی گئی ہیں۔ اندھیرا اور خموشی سٹڈیو پر حکمراں ہیں۔ اس اثنا میں سارنگی کا ایک تار جھنجھناتا اٹھتا ہے۔ تھکے ماندے ساز کروٹیں لینے لگتے ہیں اور تنہائی اور خاموشی کو ختم کرنے کے لئے محو گفتگو ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر ساز اپنی آپ بیتی سناتا ہے۔ یہ آپ بیتی موسیقی کی آپ بیتی ہے اس لئے اس پر جو اشعار تخلیق ہوئے ہیں ان میں موسیقی بنیاد ہے۔ جب طبلہ کہتا ہے :

ماتا مری پکھاوج ہے

تو اس میں لے، تال اور کہانی تینوں شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ یہی اوپیرا کی اصل روح ہے۔ لیکن اتفاق سے یہ اوپیرا صرف ریڈیو پر ہی نشر ہو سکتا ہے سٹیج یا ٹیلی وژن (اس میں فلم بھی شامل ہے) پر اس میں "ان فینٹاسی" کا عنصر نمایاں ہو جائے گا۔

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اردو میں اوپیرا کی تاریخ لکھی جائے تو ہمیں اول و آخر آغا امانت لکھنوی کا اوپیرا اندر سبھا ہی نظر آتا ہے اور اس گلستان کے چاروں طرف دور دور تک لق و دق صحرا پھیلا ہوا ہے۔

ممتاز احمد

وجودیت — منظر و پس منظر

ہم چاروں طرف سے ایک ایسے سلسلۂ اشیاء میں گھرے ہوئے ہیں جسے سمجھنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔ خواہ ہمارا روزمرہ کا کوئی تجربہ ہو، سائنس ہو، فلسفہ یا مذہب ہو، ہمیں پاسکل کے اس نتیجے کی طرف آخر کار رجوع کرنا ہی پڑے گا کہ "کائنات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو ہماری عقل سے بالاتر ہیں" پھر یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر کیرکے گور کہہ اٹھتا ہے:

> جب ایک شخص زمین پر اپنی انگلی رکھتا ہے تو وہ اس کی بو سے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ وہ کس قسم کی زمین پر کھڑا ہے۔ میں اپنی انگلی اپنے وجود پر رکھتا ہوں مگر اس سے کسی قسم کی بھی بو نہیں آتی۔ میں کہاں ہوں؟ میں کون ہوں؟ میں یہاں کیسے آیا؟ یہ چیز کیا ہے جسے دنیا کہا جاتا ہے؟ مجھے یہاں کون لایا تھا اور اب وہ میری نظروں سے اوجھل کیوں ہے؟ میں اس دنیا میں کیونکر آیا؟ آخر مجھ سے مشورہ کیوں نہیں لیا گیا؟"

اور پھر کامیو کے الفاظ میں آخری سوال۔

"Why are we here, all of us condemned to death?"

یہ سارے سوالات ایسے ہیں جن کا تعلق انسان کے اپنے وجود سے ہے اور جب تک وہ ان سوالات کے بارے میں کوئی توجیہہ تلاش نہیں کر لیتا، اس کا کائنات کی دیگر اشیاء کی طرف راغب ہونا بے معنی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان سوالات کا تسلی بخش جواب فراہم نہ کر سکیں مگر ہمیں کم از کم ان کی طرف راغب تو ہونا چاہئے۔ ان کا جواب معلوم کرنے کی کوشش تو کرنی چاہیئے لیکن وجودیت سے قبل یورپ کی ساری فکر فرد کے وجود سے کم اور اس کے جوہر سے زیادہ بحث کرتی تھی۔ گذشتہ کئی صدیوں کے یورپی فلسفے کا غالب حصہ مجرد تصورات اور نظاموں ہی سے بحث کرتا رہا اور فرد مسلسل نظرانداز ہوتا رہا۔ پھر یوں ہوا کہ انسان معروضی حقائق، سائنسی ترقیوں اور عقلیت پرستی کسی سے بھی مطمئن نہ ہو سکا اور خود کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کولن ولسن کے الفاظ میں سائنسی ترقی اور عقلیت پرستی کے دور سے قبل کے انسان کی مثال اس بچے کی سی تھی جسے یہ بتایا گیا تھا کہ جب تک وہ بڑا نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ بہت سی چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ پھر انیسویں صدی کی عقلیت پرستی نے انسان کو کئی ایسے سوالات کا جواب دے دیا جن کے بارے میں وہ عہد طفولیت میں پریشان ہوا کرتا تھا۔ اور اب جبکہ وہ مطمئن ہو چکا تھا کہ سائنس اور عقل نے اس کے سارے مسائل حل کر دیئے ہیں، اچانک ایک تاریک رات کو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتا تھا —— سوالات تو سارے کے سارے کے یونہی پڑے ہیں[1]! ڈیکارٹ نے اپنے عہد کے لوگوں کو تو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ "میں سوچتا ہوں، اس لئے موجود ہوں" مگر آج جب ٹالسٹائی کے ایک افسانے کا ایک پاگل کردار یہ سوال اٹھاتا ہے کہ "میں کون ہوں؟" تو نہ ڈیکارٹ جواب دیتا ہے اور نہ ہی آج تک کی سائنسی اور عقلی ترقی!

1: Colin Wilson : "Beyond the Outsider" (London 1965), page: 110

اس سوال نے اور کچھ کیا ہو یا نہ، البتہ ایک کام ضرور کیا ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف تو اس نے عقل کی برتری اور مطلقیت کا سحر توڑ کے رکھ دیا ہے اور دوسری طرف انسانی علوم کے کھوکھلے پن کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے ـــــ اسی سوال نے وجودیت کو جنم دیا، وجودیت جو ہر طرح کی مجرد فکر، خالص منطقی یا سائنسی فلسفے اور عقل کی مطلقیت کی رو سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ وجودیت کا مطالبہ یہ ہے کہ فلسفہ کو انسانی زندگی، اس کے تجربات اور اس تاریخی ماحول سے گہرے طور پر مربوط ہونا چاہیئے جس میں انسان لا ڈالا گیا ہے۔ فلسفہ ظن و تخمین کا ایک دلچسپ کھیل نہیں بلکہ ایک طرزِ زندگی ہونا چاہیئے اور اس طرزِ زندگی کے تعین میں جس چیز کو اولین اہمیت حاصل ہو وہ اس کا اپنا تجربہ ہو۔

فلسفۂ وجودیت یورپی فکر کا جدید ترین سرمایۂ اظہار ہے جسے فرانس میں بالخصوص اور اب دیگر ممالک میں بالعموم فیشن کی سی مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر اس شخص کو جو انیسویں صدی کی عقلیت پرستی کے خلاف کسی طرح کے بھی ردِ عمل کا اظہار کرے، فوراً وجودی قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ نوبت اس حد تک جا پہنچی ہے کہ دورِ جدید میں اس فلسفہ کے ایک اہم مفکر ژاں پال سارتر کو کہنا پڑا کہ "اب لفظِ وجودیت کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے"

پھر اگر ہم ان مفکرین کے افکار کا مرتب اور منظم شکل میں جائزہ لینے کی کوشش کریں جو اپنے آپ کو وجودی فلسفے سے متعلق سمجھتے ہیں یا نہیں ایسا سمجھا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنا راستہ الگ نکالا ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک دو قدم ساتھ چل کر سب کی منزلیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ فرانس میں سارتر اور اس کے پیروکار دہریے ہیں، جبرئیل مارسل رومن کیتھولک ہے، البرٹ کامیو اپنے آپ کو انسانیت کہتا ہے، جرمنی میں مارٹن ہیڈیگر دہریہ ہے، کارل جیسپر مذہب پرست ہے، انگلینڈ میں اس کے ماننے والے سب کے سب عیسائی ہیں۔ مارٹن بیوبر یہودی ہے۔ کیرکے گارڈ اور نکولائی بردیوف عیسائی ہیں۔

بہرحال اگر ان باہم مختلف بلکہ اکثر اوقات متضاد خیالات رکھنے والے مفکرین کے افکار میں مشترک چیزیں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش رائگاں نہیں جاتی۔ فرد کی اہمیت، اس کا مختار اور ذمہ دار ہونا، یہ تین چیزیں ایسی ہیں جو ان سب کی فکر کا نقطۂ آغاز قرار پاتی ہیں۔

سردست وجودیت کی جو شکل پیش کی جا رہی ہے وہ سارتر کی پیش کردہ ہے اور جسے "مطلق وجودیت" بھی کہا جاتا ہے۔

وجودیت وجود کا فلسفہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ وہ فلسفہ ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ فرد کا وجود اس کے جوہر (Essence) پر مقدم ہے اس دعویٰ کے اثباتی پہلو پر غور کیا جائے تو اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ ایک فرد کائنات کو دیکھنے، اس پر غور کرنے یا بطور ایک فرد کے اس میں کسی سرگرمی کا آغاز کرنے سے بیشتر اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ کائنات میں اس کا استغراق اور اس کی جملہ سرگرمیاں منحصر ہی اس حقیقت پر ہیں کہ وہ موجود ہے اس طرح وجود وہ بنیادی حقیقت ہے جس سے باقی تمام چیزوں کے چشمے پھوٹتے ہیں! ایک شخص کا زندگی بسر کرنا، سوچنا عمل کرنا، اور ان سے اپنی فطرت کا تعین کرنا جسے جوہر کہا جاتا ہے بہت بعد کی بات ہے۔

منفی پہلو سے غور کرنے پر یہ دعویٰ اس خیال کا حامل معلوم ہوتا ہے کہ "انسانی فطرت" نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسی "عالمگیر حقیقت" ہے جو تمام ہی نوعِ انسان کا جوہر قرار دی جا سکے۔ ہر فرد ایک مستقل حقیقت ہے۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے لئے پہلے ہی سے آب کچھ حقائق مقرر کر لیں یا زندگی بسر کرنے کا کوئی راستہ طے کر لیں یہ سب کچھ اسے خود اپنی زندگی اور اس کے تجربات کے حوالے سے ہی کرنا ہو گا۔

سارتر Existentialism in Humanism میں لکھتا ہے:

> جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وجود جوہر پر مقدم ہے تو اس سے ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی موجود پہلے ہوتا ہے اور دنیا میں ابھر کر اپنے زندگی کی راہ بعد میں تجویز کرتا ہے۔ اگر آدمی وجودیوں کی نظر میں ناقابلِ فہم ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ابتدا میں کچھ بھی نہیں ہے

بس وہ ہے[1]

بالفاظِ دیگر میں یہ سوال تو کر سکتا ہوں کہ "میں کیا ہوں؟" مگر یہ سوال نہیں کر سکتا کہ "کیا میں ہوں؟" کیونکہ اگر میں نہیں ہوں تو پھر یہ سوال کون کر رہا ہے؟ گویا میں نے اپنی فطرت اور حقیقت کے بارے میں یہ سوال اٹھانے سے قبل اپنے وجود کو فرض کر لیا ہے! یہاں وجود اولیں اور جوہر ثانوی ہے۔ اسی بنا پر وجودیت میں آکر ڈیکارٹ کا مشہور ماٹو "میں سوچتا ہوں اس لئے میں موجود ہوں" یوں ہو گیا ہے "میں موجود ہوں اس لئے سوچتا ہوں"۔

چنانچہ فرد کی داخلیت ہی سے وجودیت کے سفر کا آغاز ہوتا ہے اور اس کی نگاہ میں یہ داخلیت ہی وہ واحد معروضی حقیقت ہے جو انسانی تجربے میں آسکتی ہے۔

وجودیت کو ان مسائل سے دلچسپی نہیں ہے کہ انسانی وجود یا اس کے شعور کی ابتدا کیسے ہوئی۔ یہ وہیں سے اپنی بحث کا آغاز کرتی ہے، جہاں سے یہ کسی شے کو اپنے سامنے موجود پاتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جو کچھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہم کسی پر بحث کر ہی نہیں سکتے۔ انسانی ذہن کا مخرج کیا ہے — مادہ یا روح؟ یہ سوال وجودیت کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کی نگاہ میں اگر اس سوال کا جواب فراہم بھی کر دیا جائے، جب بھی وجودیت کا یہ اہم ترین مقام اپنی جگہ باقی رہے گا کہ ایک فرد صرف ایک ہی چیز پر یقین کر سکتا ہے اور وہ ہے اس کا اپنا وجود۔

دوسری طرف جب ہم انسانی شعور کا مطالعہ کرتے ہیں، جو فی الحقیقت لاشئی ہوتے ہوئے بھی اپنے وجود پر یقین رکھتا ہے، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شعور انا تک سے محروم ہے۔ اس کے اندر کچھ بھی نہیں ہے اور سارتر کے الفاظ میں یہ ایک عظیم "خلا ہے" ایک رَو ہے جو اشیاء کی جانب بہہ رہی ہے۔ چونکہ اس کے اندر کچھ نہیں ہے اس لئے یہ اپنی انا دوسری اشیاء کے ساتھ خارجی دنیا میں دیکھتا ہے —— وہ اشیا جو شعور کے لئے باہر کی دنیا میں تو موجود ہیں مگر یہ خود ان پر مشتمل نہیں ہے۔ وجودیت تصوریت کی طرح کائنات اور اس کی جملہ اشیاء کو شعور کی پیداوار قرار نہیں دیتی۔ اس کے مطابق دنیا ایک مادی وجود رکھتی ہے اور یہ وجود انسان اور اس کے شعور سے الگ ایک مستقل وجود ہے۔ بالفاظ دیگر انسان اور اس کے شعور کے معدوم ہو جانے پر کائنات اور اس کی دیگر اشیا موجود رہیں گی۔ چنانچہ شعور اور دیگر دنیا کی تقسیم بین الاثنین سے فلسفۂ وجودیت کے ایک اور بنیادی اصول کا آغاز ہوتا ہے۔ شعور کو وہ کائنات کا تصوری عنصر قرار دیتے ہیں اور شعور کے علاوہ دیگر تمام اشیاء کو مادی عنصر، تاہم کائنات کا تصوری عنصر اپنے وجود کے لئے مادی عنصر کا محتاج ہے۔ تصوری عنصر یعنی شعور لاشئی محض ہے، ایک خلا ہے اور سارتر کے الفاظ میں فقدان محض ہے۔ اس لئے کائنات کی دیگر اشیا کے تعلق سے ہی اپنے آپ کو موجود سمجھتا ہے اور موجود رہ سکتا ہے۔ یہ خارجی اشیاء کی دنیا ہی ہے جو شعور کو اپنے وجود کا احساس دلانے کا باعث بنتی ہے۔ وجود کا یہ احساس، ابتدا میں بطور شعور کے ہوتا ہے، پھر وجود کی حیثیت سے اور آخر میں ایک مخصوص فرد کی حیثیت سے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شعور خارجی دنیا میں عمل، ردِ عمل اور باہمی عمل کی بنا پر وجود رکھتا ہے۔ چنانچہ سارتر اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ——

"سوائے عمل کے اور کسی میں حقیقت نہیں ہے۔ آدمی اپنے اعمال کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اپنے اعمال کی مجموعی میزان کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے اور وہی کچھ ہے جیسی اس کی زندگی ہے"[2]

پس شعور کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن پر انسان کی مطلق خود مختاری اور پھر اس کے نتیجے میں مطلق ذمہ داری کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ شعور چونکہ ایک خلا

---

[1] Jeane Paul Sartre : "Existentialism is a Humanism" —
"Existentialism from Dostoevsky to Sartre" ed: Walter Kaufmann (N.Y. 1956)
pp: 290-91.

[2] ایضاً صفحہ ۳۰۰

ہے اس لئے خارجی دنیا سے اس کے تعلق کی نوعیت ہر لمحہ بدل سکتی ہے پس انسان ہر وقت کائنات کی خارجی اشیاء سے اپنے روابط کی نوعیت کو بدل سکتا ہے۔ ہر لمحہ وہ اپنے ماضی، حال اور مستقبل کا فیصلہ کر سکتا ہے اس کی منزل کبھی متعین نہیں ہوتی کسی بھی لمحے کوئی بھی نئی منزل سامنے آسکتی ہے۔ جبریت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انسان خود مختار ہے۔ البتہ صرف ایک چیز ایسی ہے جس میں وہ آزاد نہیں ہے اور وہ چیز خود اس کی آزادی ہے، یعنی یہ آزادی اُس کے اپنے آزادانہ انتخاب کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ پیدا ہی آزاد ہوا ہے۔ اور بقول سارتر

"He is condemned to be free."

اس خود مختاری اور آزادی کا لازمی نتیجہ اُس کا ذمہ دار اور جواب دہ ہونا ہے۔ ہر وہ واقعہ جو اس کے ساتھ پیش آتا ہے، اُس کا اپنا پیدا کردہ ہے، ہر کام جو وہ انجام دیتا ہے، اس کا اپنا کام ہے۔ اس میں کسی حادثے اور کسی اتفاق کو دخل نہیں ہے۔ خود مختار اور آزاد ہونے کی حیثیت سے وہ ہر چیز کو رد کر سکتا ہے حتیٰ کہ خودکشی کر کے اپنی آزادی کو ختم کر دینے میں بھی آزاد ہے!

آزادی اور خود مختاری کا یہ تصور فرانسیسی وجودیت کے ایک اور بنیادی اصول کے پیش نظر ایک اور اہمیت بھی رکھتا ہے۔ چونکہ خدا کا وجود نہیں ہے اس لئے اپنی زندگی اور اس دنیا کو جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے، بامعنی بنانے کا کام بھی انسان کو خود ہی انجام دینا ہوگا۔ اب انسان آپ اپنا خدا ہے! —— اس لئے کہ وہ اپنا جوہر اور اپنی فطرت خود مقرر کرتا ہے اور اپنے اور دوسروں کے لئے اقدار کا تعین خود کرتا ہے۔ اب چونکہ اس اہم ترین فریضے کو اُسے اکیلے ہی انجام دینا ہے اور کسی مافوق البشر ذات یا کسی مطلق قدر کی رہنمائی میں اسے یہ کام نہیں کرنا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے، اس لئے اس مقام پر اُسے اس کیفیت کا تجربہ ہوتا ہے جسے "کرب" کہتے ہیں۔ وہ خدا تو ہے مگر پابہ زنجیر! وہ یہ کام کرنے پر مجبور ہے۔ خدائی کا یہ فریضہ انجام دینا اُس کے اپنے آزادانہ انتخاب کا نتیجہ نہیں ہے۔ پھر بھی اُسے یہ کام کرنا ہے، بہر صورت کرنا ہے۔ چنانچہ انہی کربناک حالات کے نتیجے میں وہ اس کس مپرسی، بے چارگی اور یاس کا شکار ہوتا ہے جو اسے یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ——

"میں اپنے آپ کو اس بھری دنیا میں بغیر کسی مدد کے پاتا ہوں۔ اس دنیا کی پوری پوری ذمہ داری مجھ پر ہے۔ میں کسی طرح بھی اس ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا کیونکہ ذمہ داری سے بچنے کی خواہش کی ذمہ داری بھی مجھ ہی پر عائد ہوتی ہے۔"

چنانچہ وجودی مفکرین کے ہاں ڈر، خوف، دہشت، یاس اور بے چارگی کے جو احساسات ملتے ہیں ان کا ماخذ انسان کی آزادی اور ذمہ داری ہی ہے۔ سارتر لکھتا ہے:-

"اگر آدمی وہی کچھ ہے جیسا کچھ کہ وہ اپنے آپ کو بناتا ہے اور اپنے آپ کو بناتے وقت وہ پوری بنی نوعِ انسان کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے، اگر کوئی مستقل قدر اور کوئی اخلاقی ضابطہ موجود نہیں ہے اور ہمیں ہر بات میں اکیلے ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ بغیر کسی بنیاد کے، بغیر کسی رہنمائی کے، تو آخر ہم فیصلہ کرنے سے پہلے پریشانی سے کیسے بچ سکتے ہیں جب ہمارا ہر فعل کائنات کے مفہوم اور کائنات میں انسان کے مقام کا تعین کرتا ہو اور ہمارے ہاتھ میں عالمگیر اقدار کا ترازو ہو تو پھر یہ کیسے فرض کر لیا جائے کہ ہم اس ذمہ داری کے سامنے اپنے آپ کو سہما سہما اور خوفزدہ نہ پائیں گے۔"

وجودیت کی مذکورہ شکل جو سارتر اور دوسرے فرانسیسی وجودیوں نے پیش کی ہے علمی حلقوں میں خاصی سخت تنقید کا نشانہ بنی رہی ہے جو امور سب سے زیادہ زیر بحث آئے وہ یہ تھے —— وجود کا جوہر پر مقدم ہونا، "صرف وجود ہی ایک حقیقت ہے" —— فرد کی مطلق اور لامحدود آزادی کا تصور"۔
وجودیت کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اہمیت صرف فرد ہی کو دی جانی چاہیئے کیونکہ سارتر کے الفاظ

ہیں ——" وجود ہی صرف واحد حقیقت ہے اور میں سوائے اپنے وجود کے کسی بھی اور چیز کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔

سارتر کے اس مفروضے پر تنقید کرتے ہوئے پال روبے شک کہتا ہے کہ اگر سارتر کا یہ دعویٰ درست مان لیا جائے تو ذاتی تجربہ تک ناممکن ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ ہمیں اپنے وجود یا بالفاظ دیگر "میں" کا شعور دوسروں کے تقابل یا دوسرے الفاظ میں "تم" سے اتصال کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہماری خود آگہی، دیگر افراد اور اشیا کے وجود کے باعث بیدار ہوتی ہے اور اس طرح یہ سب کچھ —— یعنی "میں"، "تم" اور دیگر کائنات کی اشیا، بیک وقت ہمارے شعور میں حقیقت کا روپ دھارتی ہیں[۵۱]۔

اب جہاں تک وجود کے جوہر پر مقدم ہونے کا تعلق ہے تو دراصل یہ ایک مفروضہ ہے جو سارتر اور دیگر مطلق وجودیوں نے تصورِ آزادی کی بنیاد فراہم کرنے کے لئے قائم کر رکھا ہے۔ پھر یہ بات اگر مان بھی لی جائے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے یعنی یہ کہ انسان اپنے وجود اور اپنے "ایک فرد" ہونے کا شعور حاصل کرنے سے قبل بھی موجود ہوتا ہے تو اس سے یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ انسان اپنا جوہر بھی خود ہی متعین کرتا ہے؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جوہر پہلے ہی سے طے ہو اور جس طرح انسان اپنے وجود کو دریافت کرتا ہے اسی طرح اپنے جوہر کو بھی دریافت کرتا ہو[۵۲]۔

حقیقت یہ ہے کہ وجودیت کا یہ مفروضہ وجودیت کو ایسے نتائج کی طرف لے جاتا ہے جہاں پہنچ کر ایک وجودی کو سوائے خودکشی کر لینے کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ جوہر کو وجود سے خارج کر دیا جائے تو وجود میں ایک ایسا عظیم خلا رونما ہو جاتا ہے جسے صرف خودکشی ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے (الا یہ کہ کوئی شخص پاگل ہو جائے!) سارتر جوہر کو غائب کر کے انسان کو فی الواقع اس چیز سے بھی محروم کر دیتا ہے جو اسے اپنے وجود کے شعور اور اس کی معنویت و مقصدیت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ سارتر خود اس نتیجے پر پہنچا ہے۔

"All existing beings are born for no reason, continue through weakness and die by accident.... Man is a useless passion. It is meaningless that we are born; it is meaningless that we die.

اور یہ صورتِ حال اُسے خود اپنے وجود سے ہی انکار کی طرف لے جاتی ہے جو وجودیت کا نقطۂ آغاز ہے۔

"I look at myself in vain in a mirror, tell myself my own story, I can never grasp myself as an entire object, I experience in myself the emptiness that is myself, I feel that I am not."

شاید سارتر کو اسی صورتِ حال میں دیکھ کر پال روبے شک نے لکھا تھا کہ اس کے بیانات اُس شخص کی دل ہلا دینے والی چیخوں کی طرح ہیں جو کسی ماورائے ادراک ذات اخلاقیات و اقدار پر اپنے عدمِ ایمان کے خطرناک نتائج اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہو اور آزادی کے تجربے کو جھوٹ موٹ کے مجرد دعووں کی شکل میں پیش کر رہا ہو۔ روبے شک کہتا ہے۔

—"There is either responsibility and the transcendental or there is no responsibility at all." [۵۳]

---

۵۱ Paul Roubiczek: "Towards Existentialism." (Cambridge 1964) pp: 119-120.

۵۲ Walter Odajnyk: "Marxism and Existentialism". (New York: 1965) p. 177

۵۳ Paul Roubiczek". page 128.

مطلق وجودیت، انسان کی جس لامحدود آزادی و خودمختاری کی علمبردار ہے اُس پر بھی خاصی تنقید کی گئی ہے اور اس کے ہر پہلو کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس سے قبل میں لکھ چکا ہوں کہ وجود کے جوہر پر مقدم ہونے اور انسانی فطرت کے انکار کرنے سے سارتر کا مقصد صرف انسانی آزادی کے لئے بنیادیں فراہم کرنا ہے۔ اس لئے آزادی اور خودمختاری پر گفتگو سے قبل اس کی بنیاد —— انسانی فطرت سے انکار —— کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

سارتر کا خیال ہے کہ انسانی فطرت یا انسانی جوہر کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دلیل یوں دی جاتی ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے وقت یا مکمل شعور کی حالت کو پہنچنے تک بالکل خالی الذہن (Tabula Rasa) ہوتا ہے۔ اس لئے آگے جاکر وہ جو چاہے بن سکتا ہے۔ یہ کہتے وقت سارتر اس امر کو بھول جاتا ہے کہ انسان اپنی حیاتیاتی اور نفسیاتی ہیئت اور وظائف میں صرف انسان ہی ہے —— بندر، کتا یا سارتر ہی کے الفاظ میں سٹرابری نہیں ہے۔ پھر جب تمام انسانوں میں ایک ہی طرح کی حیاتی اور نفسیاتی ہیئت موجود ہے جو انھیں دیکھنے، محسوس کرنے، عمل کرنے، مخصوص انداز میں سوچ بچار کرنے —— (ایک ایسے انداز میں جو صرف انسان ہی کے لئے مختص ہے) —— پر اُبھارتی ہے، تو کیا یہ انسانی فطرت کے مترادف نہیں؟ یہ چیز بجائے خود انسانی فطرت کے لئے ایک معیار اور بنیاد بن جاتی ہے کیونکہ ہر وہ حیاتی شے جو اس معیار پر پوری اُترتی ہے وہ انسان ہے۔ اگر وجودیت اس حیاتیاتی اور نفسیاتی فطرتِ مشترکہ کو تسلیم کرے —— اور نہ تسلیم کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل ہی نہیں ہے —— تو پھر اس کا یہ دعویٰ ختم ہو کر رہ جاتا ہے کہ کوئی ہمہ گیر انسانی فطرت یا جوہر موجود نہیں ہے! پھر اس سلسلے میں خود سارتر کے ہاں بھی ایک دلچسپ تضاد موجود ہے۔ سارتر جب یہ کہتا ہے کہ ہر شخص کا شعور "فقدانِ محض" ہوتا ہے تو کیا وہ بنی نوعِ انسان کی ایک مشترکہ فطرت کی نشان دہی نہیں کرتا؟ زیادہ واضح طور پر یوں کہنا چاہئے کہ سارتر کا یہ دعویٰ کہ "کوئی انسانی فطرت نہیں" خود انسانی فطرت بن جاتا ہے!

اب آزادی و مختاری کو لیجئے۔ سارتر نے حقیقی آزادی کی تعریف یوں کی ہے —— "آزادانہ انتخاب اُن منصوبوں اور فیصلوں کے اظہار کا عمل ہے جو عمل کرنے سے قبل مکمل طور پر شعور نے طے کئے ہوں۔ سارتر کا ایک مبصر کہتا ہے کہ اگر یہ تعریف صحیح مان لی جائے تو سارتر کی آزادی و مختاری موقع پرستی کے سوا کچھ نہیں رہتی اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔" آدمی جو کچھ کرتا ہے وہی چاہتا ہے اور وہی کچھ چاہتا ہے جو وہ کرتا ہے —— یہ ایک بے معنی دائرے کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔[۵۱]

آزادی و مختاری کا ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ ہے اس کا لامحدود ہونا۔ سارتر انسانی آزادی و مختاری پر چند برائے نام سماجی پابندیاں عائد کرنے کا قائل ہے اور ان خارجی حالات کے ساتھ خود انسانی وجود کا جوہر آزادی پر جو پابندیاں عائد کرتا ہے اُسے سارتر نظر انداز کر جاتا ہے۔ انسان کے آزاد اور خودمختار ہونے سے یہ مراد لینا کہ اُسے ہر طرح کی آزادی حاصل ہو گئی ہے صحیح نہیں۔ آزادی کو لازماً ذمہ داری، اخلاق، محبت اور اعتماد کی بنیادی اقدار اور معیارات کے ساتھ مربوط ہونا چاہئے۔ ہم صرف اسی صورت میں آزاد اور خودمختار رہ سکتے ہیں۔ جب ہم اس آزادی کو ایسے امور میں استعمال کریں جو اس آزادی کو بامعنی بنائیں اور اس میں اضافے کا موجب ہوں۔ اگر ہم اپنی پسند اور ناپسند پر بے سوچے سمجھے عمل کرنا شروع کر دیں تو ہو سکتا ہے کہ ہم غیر شعوری طور پر داخلی یا خارجی جبریت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں اور خود اپنی آزادی کو اپنے ہاتھوں ختم کر کے رکھ دیں۔ پس خود آزادی کی بقا کے لئے آزادی کی پابندیوں کا وجود اور شعور لازمی ہو جاتا ہے!

مارکسسٹ فلاسفر سارتر کے تصورِ آزادی پر اس کے نتائج کے اعتبار سے تنقید کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں آزادی و مختاری کا جو تصور وجودیت میں ہے وہ غیر سماجی ہے اور جبریت سے بزار گنا بدتر ہے۔ فلسفۂ وجودیت کی خودمختاری سے ہم کنار ہو کر ایک فرد جن کیفیات کا شکار ہوتا ہے وہ خود وجودیوں

---

[۵۱] James Collins "The Existentialists : A Critical Study" (Chicago: 1952) p: 75

کے نزدیک غصہ، جھنجھلاہٹ، دست برداری، یاس اور کرب کی کیفیات ہیں۔

بحران کے نزدیک آزادی کا ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ ہے اس کا مخرج و منبع! مارکسسٹ جب وجودیوں کی Ontology اور بالخصوص اُن کے تصورِ کائنات اور کائنات میں انسان کے مقام کا جائزہ لیتے ہیں تو اُن کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ کلی آزادی سارتر کہاں سے نکال لاتا ہے اور عملی دنیا میں اس کا مفہوم کیا ہے۔ ایڈم شاف نے خیال میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک فرد اپنے فیصلوں میں خود مختار بھی ہو اور کائنات کے سامنے بے بس بھی ہو؛ سارتر کائنات کی جو تصویر ہمارے سامنے کھینچتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر آزادی کا تصور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔[a]

مارکسسٹوں کی طرف سے وجودیت پر جو عام تنقید کی جاتی ہے وہ کم و بیش اسی نوعیت کی ہے جو سارتر نے مارکسزم پر کی ہے ـــــ یعنی یہ کہ وجودیت بورژوا سوسائٹی کی پیداوار ہے اور اس میں مذہب کا عنصر غالب ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ وجودیت اُس وقت پروان چڑھی جب بورژوا معاشرے میں فرد معاشرے سے بالکل کٹ چکا تھا ـــــ اس کے معاشرتی روابط درہم برہم ہو چکے تھے اور وہ خود اپنے لئے بھی اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔ سارتر پر سب سے خوبصورت اور پُر مزاح تنقید ایک امریکی مارکسسٹ بی۔ ڈن ہیم کی طرف سے سامنے آئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وجودی مفکرین ہمیشہ ناقابلِ فہم اور مبہم اصطلاحات میں باتیں کرتے ہیں۔ سارتر پر وہ الزام لگاتا ہے کہ اُس نے انگریزی فعل "ہونا" (To be) کا غلط استعمال کیا ہے اور غصے، موت، ڈر، جرم، یاس، ذمہ داری، کومٹ منٹ اور وجود جیسے مجرد اسما استعمال کر کے اپنے قارئین کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے ـــــ وجودیت فرانسیسیوں کی ذہنی انارکی کی پیداوار ہے۔ اس ضمن میں ڈن ہیم بڑے دلچسپ انداز سے وجودیت پر طنز کرتا ہے۔

"اچھا تو تم یہ کہتے ہو کہ ہمارا نظریہ ناقابلِ فہم ہے؟ ـــــ خوب! تم نے اسے قابلِ فہم بنانے کی خواہش کب کی تھی؟ ہماری باتیں تمہیں غیر عقلی لگتی ہیں؟ ـــــ یہ تو اور بھی اچھا ہے ـــــ لغویت ہی میں تو معنویت پوشیدہ ہے! تم کہتے ہو کہ مختلف وجودیوں میں ہر مسئلے پر اختلاف ہے؟ ـــــ یہی تو ہم بھی چاہتے تھے! ہمارے خیالات تمہیں غیر صحت مند اور معمول کے خلاف نظر آتے ہیں؟ ـــــ بہت خوب! صحت اور معمول تو پرانے دور کی چیزیں ہیں۔"

اب اس طرح کی جو باتیں کرے اُس کے ساتھ کیا کیا جا سکتا ہے؟ ڈن ہیم یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وجودیت کوئی فلسفہ نہیں بلکہ بیماری ہے ـــ اور جس طرح کسی فلسفے پر تنقید کی جاتی ہے اس طرح اس بیماری کی تشخیص کرنی چاہیئے۔ وہ تشخیص یوں کرتا ہے کہ وجودی درد سے لذت حاصل کرتے ہیں۔ اور اپنے ذاتی مسائل میں اُلجھے رہتے ہیں۔ اگر یہ علامات کسی بالغ آدمی میں پائی جاتی ہیں تو وہ اُن کے علاج کی فکر کرتا ہے مگر وجودی یہ بھی نہیں کرتے۔ یہ لوگ تو بس Spoiled Children ہیں۔ وہ ماں کے پیٹ سے نکل تو آتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ یہ دنیا بھی جس میں وہ آئے ہیں، ماں کے پیٹ کی طرح ہو جائے اور چونکہ یہ دنیا ماں کے پیٹ کی طرح نہیں ہے پس وہ اُن نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتے ہیں جسے وہ فلسفہ سمجھنے لگے ہیں۔

اب ہم عقلیت پرستی کی اُن انتہا پسندیوں کا ایک مختصر سا جائزہ لیں گے جن کے خلاف ردِ عمل کے طور پر وجودیت کا فلسفہ اپنی موجودہ شکل میں وجود میں آیا۔

عقلیت پرستی کے دور میں عقل کو مطلق اور اُس کی بنیادوں پر پروان چڑھنے والے علوم کو اپنے اپنے موضوع پر حرفِ آخر سمجھ لیا گیا تھا؛ حالانکہ عقل کی مطلقیت کا دعویٰ بذاتِ خود ایک خلافِ عقل دعویٰ ہے۔ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ عقل کی کچھ

a! Adam Schaff : "Stock Taking in Philosophy". page: 12.

محدود ہیں، اور خالص منطقی، عقلی اور سائنسی طریقِ فکر حقیقت کے ایک محدود سے حصے پر روشنی ڈالنے سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس سلسلے میں اگر ہم عقلیت پرستی کے دور کے چند علوم کا جائزہ لیں تو ان کا منطقی تناقض کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ علمِ حیاتیات میں نظریۂ ارتقا، کا سارا دار و مدار اتفاقی حادثوں پر مبنی تغیرات پر ہے۔ یہ مفروضہ سراسر غیر عقلی ہے کیونکہ یہ بات کسی عقلی دلیل سے ثابت نہیں کی جاسکتی کہ کس طرح اندھی، بہری اور غیر ذی شعور طاقتوں اور حادثات نے جو تبدیلیِ نوع کا باعث بتلائے جاتے ہیں، نامیاتی اجسام، پودوں، جانوروں اور انسانوں کی ایک منظم صورت کو پیدا کردیا! یہ دعویٰ کہ انتشارِ محض، ابتری اور بے ترتیبی نے ایک تنظیم اور ترتیب کی شکل اختیار کرلی، عقل کی حدود سے باہر تو کہا جاسکتا ہے اس کے اندر نہیں:۔

"کیا ہم سوچ سکتے ہیں کہ اگر ہزاروں سال تک بھی حروفِ تہجی کو ایک ڈبے میں بند کرکے ہلاتے رہیں تو ہم شیکسپیئر کا ڈرامہ "ہیملٹ" پیدا کرسکتے ہیں؟ پھر اگر ایسا ہو کر بھی لیں تو بھی اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ فی الحقیقت "ہیملٹ" لکھا ہی اس طرح گیا تھا!"۱؎

اس کے بعد نفسیات کو لیجیے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی اعمال اس کے ارادوں اور شعور ہی پر منحصر نہیں بلکہ اکثر ان جبلتوں اور حیاتیاتی عوامل پر مبنی ہوتے ہیں جو ہمارے لاشعور میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ دعویٰ خود عقل کے محدود ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے کیونکہ عقل کا دار و مدار شعور پر ہے اور شعور کے بغیر عقل ممکن ہی نہیں۔ پس جب ہم لاشعور کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی گویا ہم یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ عقل محدود ہے کیونکہ جب لاشعور ہی سب کچھ ہے اور وہی طاقت کا حقیقی منبع ہے تو پھر شعور یعنی عقل مطلق نہیں ہوسکتی!

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کے تمام علوم میں جبریت کی روح کارفرما ہے اور علت و معلول ہی ان کی بنیاد ہے، حالانکہ ہمارے ذاتی تجربات جبریت کی طرف نہیں بلکہ قدریت کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ کیا ہم اپنے آپ کو آزاد محسوس نہیں کرتے؟ کیا ہم اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں پاتے؟ اپنے آپ کو ذمہ دار محسوس کرنا انسانی زندگی کا بنیادی تجربہ ہے اور وجودیت کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ یہ ذاتی تجربات بھی حقیقت کی تلاش میں ایک اہم شہادت کی حیثیت سے لئے جائیں۔ کیونکہ صرف معروضی طریقِ کار ہی کافی نہیں۔ معروضی طریقِ کار خارجی اشیاء سے تو بحث کرسکتا ہے مگر انسانی جذبات کا احاطہ کیسے کرے گا؟ اب اگر مثلاً ہمارے سامنے نفسیاتی اور طبیعیاتی دونوں نقطہ ہائے نظر سے صحیح سائنسی طریق پر درد کی وضاحت کی جائے، ان سارے مراحل کی تشریح کی جائے جو اس درد کی بنا پر ہمارے جسم اور اعصاب میں طے ہوئے، پھر بھی ہم اس وقت تک درد کی صحیح نوعیت کو سمجھ نہیں سکتے جب تک ہم خود اس میں مبتلا نہ ہوں۔۲؎

یہ وہ موضوعی حقیقت تھی جو اس دور کے انسان کی نظر سے پوشیدہ رہی نتیجۃً بعد میں اس کے خلاف اس قدر شدید ردِعمل رونما ہوا کہ عقل کی بجائے لغویت اور مہمل پن ہی بنیاد بن کر رہ گیا اور کیرکے گور نے کہا:۔

"عیسائیت ایک لغو اور مہمل ترین مذہب ہے کیونکہ کوئی شخص جو محض عقل پر یقین رکھتا ہو اس کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ خدا آدمی کے روپ میں زمین پر آیا اور اسے ایک آدمی کی طرح صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ اور عیسائیت کی یہ لغویت اسے دنیا کا بہترین مذہب ثابت کرتی ہے۔"

نطشے عقلیت پرستوں کے گروہ سے وہ پہلا شخص تھا جس نے منطقیت و عقلیت کی آگ کی جلن کو شدت سے محسوس کیا۔ نطشے کے دور کا غالب تصور ترقی کا تصور تھا یعنی یہ کہ فطرت اور انسان ایک مسلسل اور بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے یہاں تک آپہنچے ہیں۔ یہ ارتقا یہ ترقی خود بخود ہو رہی ہے اور ناگزیر ہے۔ اس تصور کو عملی دنیا کے حقائق نے اور بھی پختہ کردیا۔ انیسویں صدی کے آخری وسط میں یورپ میں قدرتی علوم کی ترقی اور سائنسی نکتہ نظر نے انسان کو یقین دلا دیا کہ ترقی کا یہ نظریہ محض نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک قدرتی قانون ہے! یورپ کی ساری فکر نظریۂ ارتقا کے رنگ میں رنگ گئی۔ ہربرٹ اسپنسر

۱؎ Paul Roubiczek , page: 3 ۲؎ Ibid : page 5

نطشے حتیٰ کہ برگساں جیسا عینیت پسند بھی اس کے اثرات سے نہ بچ سکا۔

ڈارون نظریۂ ارتقاء میں صرف ایک ہی مفروضہ لیتا ہے اور وہ ہے مادّے کا وجود، اس کے بعد وہ بغیر کسی اور مفروضے کا سہارا لئے سارے عمل تخلیق کی توجیہہ کرتا ہے۔ اس سارے عمل تخلیق میں کسی مافوق الفطرت ذات کی مداخلت نہیں ہوتی بلکہ کسی ماورائے ادراک ذات کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ حادثات اور فطرت کی اندھی قوتیں تبدیلی انواع کا کام انجام دیتی ہیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ حیاتی انواع زیادہ ہیں اور خوراک کم، اس لئے بقا کے لئے ایک کشمکش کا آغاز ہوتا ہے اور اس کشمکش میں جو کامیاب ہوتا ہے وہی زندہ رہتا ہے۔ اس طرح انتخاب طبعی سے اصلح ترین باقی رہتا ہے اور کمزور انواع مٹ جاتی ہیں۔ اسی ارتقائی سفر میں انسانی ذہن بھی پیدا ہوتا ہے جو بعد میں اس کشمکش میں ممد و معاون بنتا ہے اور جو خود بھی ارتقاء پذیر ہے۔ اس طرح نظریۂ ارتقاء نے مادّے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسانی عقل کے وجود کی بھی توجیہہ کر دی۔

یہ نظریہ اپنی متعدد خامیوں کے باوجود یورپی فکر کے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ زندگی اور موت کی بے رحم کشمکش نے پرانی اخلاقی قدروں کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں شدید مسابقت، اشتراکی نظام میں طبقاتی جنگ، اور قوم پرستی کی تحریکیں اسی کے زیر اثر تھیں۔

نطشے بعض اختلافات کے باوجود نظریۂ ارتقاء سے گہرا متاثر ہوا جس کا واضح ترین ثبوت اس کا "مافوق البشر" (Superman) ہے۔ نطشے ہی نے پہلی مرتبہ نظریۂ ارتقاء کے عملی مضمرات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اگر انسان محض حیاتی ارتقاء کا نتیجہ ہے تو اس کے تمام اعمال کو اس طبعی ہیئت کے پس منظر میں سمجھا جانا چاہیے جس میں یہ اعمال اس سے سرزد ہوتے ہیں، نہ کہ اخلاقی معیارات و اقدار کی روشنی میں جو محض اضافی ہیں۔ اسی بنا پر نطشے مسیحی اخلاقیات پر سخت تنقید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسے کمزور لوگوں نے محض اپنی تسلی کے لئے ایجاد کیا ہے۔ خدا کو تو وہ پہلے ہی ختم کر چکا تھا۔ اب اخلاق کی مطلقیت سے بھی انکار کر کے نطشے نے حادثات اور فطرت کی اندھی قوتوں کے لئے راستہ مکمل طور پر صاف کر دیا۔ نطشے جب یہ کہتا ہے کہ "کوئی چیز بھی حقیقی نہیں" تو اس سے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ "ہر چیز جائز ہے۔ کوئی چیز بھی حقیقی اس لئے نہیں ہے کہ ہر چیز کا انحصار Species پر ہے، کوئی مطلق حقیقت، کوئی غایت اولیٰ وجود نہیں رکھتی، کوئی مطلق قانون نہیں ہے ہر طاقت ہر لمحے اپنے لئے ایک الگ راستہ تجویز کرتی ہے۔"[۵]

نطشے نے قوت و جبروت کا جو مجسمہ "فوق البشر" کے نام سے تراشا ہے، پال روبیزک کا خیال ہے کہ یہ دراصل اس خوف اور دہشت کا اثر ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں یورپ کے ممکنہ زوال کا نتیجہ تھی۔ اس وقت یہ خوف ہر بڑے دماغ میں موجود تھا کہ ذہنی ترقیوں کی وجہ سے یورپی انسان کی صحت اور حیاتی طاقتیں اس حد تک مضمحل ہو چکی ہیں کہ اب اس کا باقی رہنا مشکل ہو گیا ہے چنانچہ اسی خوف کے نفسیاتی ردعمل کے طور پر نطشے نے ایک "فوق البشر" تخلیق کیا اور اسے بتایا کہ وہ آپ اپنا خدا ہے۔

لیکن ایک وقت آیا کہ خود نطشے کو خود اپنے فلسفہ کے خطرناک نتائج کا احساس ہونے لگا اور وہ ... کی طرف مائل ہوا۔ نطشے میں دراصل یہ دونوں رجحانات شروع ہی سے موجود تھے۔ پال روبیزک نے خدا کے وجود کے بارے میں نطشے اور عام دہریوں کے نقطۂ نظر میں ایک بڑے نازک سے فرق کا ذکر کیا ہے۔ نطشے نے یہ کہا ہے کہ:

"خدا مر چکا ہے، ہم نے خدا کو قتل کر دیا ہے۔"

یہ نہیں کہا کہ خدا موجود ہی نہیں۔ "خدا مر چکا ہے" کا اعلان دراصل ایمان کے کھوئے جانے کا اعلان تھا۔ نطشے کو اس امر کا بھی احساس ہے کہ ایمان کے

۵۔ نطشے کا یہ کہنا کہ کوئی مطلق قانون نہیں ہے، پال روبیزک کے نزدیک بذاتِ خود ایک قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ بحوالہ کتاب مذکورہ Paul Roubiczek، صفحہ ۲۳

فقدان نے مغربی تہذیب کو ایک خلا میں لا کھڑا کیا ہے اور یہ خلا انتہائی تخریبی انداز میں مسلسل وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ تصورات، اقدار، عقائد اور نظریات جو اس سے قبل ہماری زندگی کے لئے سنگ ہائے میل تھے، آج بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور آخر کار آج یہی نامعنویت meaninglessness ہماری زندگی کے لئے مقدر ہو چکی ہے نطشے کا یہی احساس وجودیت کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ اسی صورتِ حال کو نطشے نے نہایت خوبصورت تمثیلی انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

"کیا تم نے اس پاگل آدمی کے بارے میں نہیں سنا جس نے ایک چمکیلی روشن صبح کو لالٹین جلائی اور بھرے بازار میں آ کر چلانے لگا۔

" I am searching for God ."

اس کے قریب ہی چند ایسے لوگ کھڑے تھے جو خدا کے وجود پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ یہ سن کر وہ ہنسنے لگے تب پاگل آدمی بین ان کے وسط میں آ کر کھڑا ہو گیا اور چلایا۔

" Where is God , well , I will tell you . We have killed him — you and I . We , all of us , are his murderers . But how did we do this deed ? How did we manage to drink the ocean dry ? Who gave us the sponge to wipe away the whole horizon ? What were we about when we unchained this earth from its sun ? Whither is it moving now ? Are we not falling incessantly ? Backwards , sideways , forwards , in all directions ? Can we still talk about " above " and " below " ? — Are we not wandering ; lost , through an infinity of nothingness ? .... Is night not approaching , and more and more night ? .... God is dead . God remains dead ! And we have killed him ! What possible comfort is there for us ? .... Is not the greatness of the deed too heavy for us ? " ل

پھر آگے جا کر "بقول زرتشت" میں نطشے کہتا ہے کہ اسے مستقبل بہت خطرناک نظر آ رہا ہے کیونکہ ہر وہ چیز جو مستقل اور مطلق سمجھی جاتی تھی ختم ہو چکی ہے۔ شروع میں تو بے شک نطشے کا خیال یہ تھا کہ خدا کی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے وہ اپنے "فوق البشر" سے پُر کر سکے گا مگر بعد میں آہستہ آہستہ اسے احساس ہوتا گیا کہ اس کی تعلیمات نہ صرف یہ کہ اس خلا کو پُر نہیں کر سکتیں بلکہ اس میں مزید وسعت پیدا کرنے کا باعث بن جائیں گی۔ کئی اخلاقی مسیحی نقطۂ نظر رکھنے والے فلاسفر نطشے کو Rediscover کرتے نظر آتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ نطشے ایک ایسا معلمِ اخلاق تھا جس نے اپنے آپ سے بغاوت کی اور اس نے جو "غیر اخلاقی طرزِ زندگی" کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ اس لئے پیش نہیں کیا کہ ہم اس پر عمل کریں بلکہ اس لئے کہ ہم اس کے خطرناک نتائج سے متنبہ ہو جائیں۔ نطشے کے خیالات کی اس تعبیر کا ماخذ اس کی نامکمل کتاب The Will To Power ہے۔ اس میں ہمیں واضح

ل E.L. Allen , "Guide to Western Thought" (London 1957) pp: 132-33 .

طور پر ان خیالات کی تردید و اصلاح ملتی ہے جو نطشے نے ابتدا میں نہایت زور شور سے نظریۂ ارتقا کی روشنی میں پیش کئے تھے۔ ایک وقت پر، انسان کی مسلسل اور ناگزیر ترقی کا علمبردار نطشے آخر کار یہ کہنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔

"When I consider the short duration of my life, swallowed up in the eternity, before and after, the little space which I fill, and even can see, engulfed in the infinity of space of which I am ignorant, and which know me not, I am frightened .... The eternal silence of these infinite spaces frightens me."

چنانچہ خوف، لاشئیت کا احساس اور منطق سے بغاوت نطشے کے فلسفہ میں یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جو آج کی وجودیت کی بنیاد دکھتی نظر آتی ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ جس قسم کے فلسفے کی ضرورت کا اظہار کرتا ہے وہ فلسفہ آج ہمیں وجودیت ہی کی شکل میں نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"We must constantly give birth to our thoughts from our pains and, like mothers, give them all that we have within us of blood, heat, fire, lust, passion, torments, conscious, destiny, doom."

نطشے کے خیالات میں اس عظیم تبدیلی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی شے اور کوئی اصطلاح بھی ماورائے ادراک ذات کا بدل نہیں ہو سکتی۔ آدمی خدا تو بن گیا، مگر خدا بن جانے کے بعد بھی اپنی حقیقت نہ جان سکا، اپنی منزل متعین نہ کر سکا اور نہ ہی کائنات کو مسخر کر سکا۔ برعکس اس کے وہ یاس کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا اور نطشے ہی کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کیرکے گور نے کیونکر یاس ہی کو اپنی نسبت وجودی فکر کا نقطۂ آغاز بنایا ہے۔

کیرکے گور ہی تھا جس نے Existentialism (وجودیت) کی اصطلاح سب سے پہلے استعمال کی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں یورپی فلاسفروں کی تمام تر فکر کا محور مجرد مابعد الطبیعیاتی نظاموں کی تخلیق تھا۔ کیرکے گور نے ایسی تمام کوششوں کی شدت سے مخالفت کی اور ہیگل پر بالخصوص تنقید کی جس کا دعویٰ تھا کہ اس نے عقل کی وساطت سے کائنات اور انسان سے متعلقہ ہر چیز کی مکمل وضاحت کر دی ہے۔ کیرکے گور نے کہا کہ فلسفہ کوئی مجرد چیز نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کی بنیاد ذاتی تجربے اور اس تاریخی ماحول پر ہو جس میں انسان موجود ہوتا ہے۔ صرف ایسی صورت میں فلسفہ محض ظن و تخمین کا کھیل بن کر رہ جانے کے بجائے انسان کی زندگی بن سکتا ہے۔ کیرکے گور کے نزدیک اہم ترین مسئلہ ایمان کا مسئلہ تھا اور اسے اس مشکل کا پوری طرح احساس تھا جو ایک عقلیت پرست آدمی کو کسی مذہب اور بالخصوص عیسائیت کو قبول کرتے وقت پیش آ سکتی ہے۔ اس مسئلے کو کیرکے گور نے ذاتی تجربے کے حوالے سے حل کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں اس نے بائبل سے دو شخصیات لیں —— حضرت ایوبؑ اور حضرت ابراہیمؑ —— ان دونوں شخصیات کو جب اس نے سمجھنے کی کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ ایمان کسی آسان اور آرام دہ تجربہ کا نام نہیں ہے بلکہ خوف اور کرب سے معمور ہے۔ یہیں سے اس نے اپنی وجودیت کے تین بنیادی تصورات —— تناقض کلی (Absolute Paradox)، تصورِ خوف اور ایمان بالغیب —— اخذ کئے۔ اب دیکھئے کیرکے گور ان تصورات کو حضرت ایوبؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے حوالے سے کس طرح سامنے لاتا ہے۔

حضرت ایوبؑ کے دوست انھیں یہ بتاتے ہیں کہ ممکن ہے اُن کے دکھ اُن کے کسی گناہ کی پاداش میں ہوں۔ مگر حضرت ایوبؑ اس بات سے مطمئن نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ معصوم ہیں اور حق پر ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اُن کی بے گناہی اور معصومیت سے خدا بھی واقف ہے۔ اس کے باوجود اُن کی زندگی اس کی تنقیص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس تناقض کلی ہے ——— کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں اور خدا کے خلاف حق پر ہیں جبکہ وہ خدا کے خلاف حق پر ہو ہی نہیں سکتے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کی اپنی زندگی اس کے خلاف ثبوت بھی مہیا کر رہی ہے ——— وہ اس عالم یاس میں اپنے ایمان کے تقاضے کا شعور حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ——— خدا انسان سے اس قدر عظیم ہے کہ ہم کلی طور پر اُسے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے ہمیں اس کی طرف سے وہ چیز بھی قبول کرنے میں گریز نہیں کرنا چاہیئے جو بظاہر خلاف عقل نظر آ رہی ہو۔ حضرت ایوبؑ کو اپنے دکھوں کے باوجود خدا کی تعریف کرنی ہی پڑے گی. کیونکہ ایمان نام ہی مکمل سپردگی کا ہے۔

پھر کیر کے گور حضرت ابراہیمؑ کے وجودی ماحول کو لیتا ہے۔ عمر کے بالکل آخری آخری ایام میں اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے اور پھر انھیں کہا جاتا ہے کہ وہ اسے بھی قربان کر دیں۔ اس موقع پر جو تناقض سامنے آتا ہے اُسے کیر کے گور یوں بیان کرتا ہے:

" Who then is He that plucks away the old man's staff ... Who is He that would make a man's grey hairs comfortless, who is it that requires that he himself shall do it ? Is there no compassion for the venerable old man, none for the innocent child ? And yet Abraham was God's elect, and it was the Lord who imposed trial. "

حضرت ابراہیمؑ کو یہ دکھ برداشت کرنا تو ہے مگر وہ فوراً ہی اپنے بیٹے کو ذبح نہیں کر دیتے۔ پورے تین دن اور تین راتیں اسی کرب میں گزرتی ہیں اور پھر وہ اپنے بیٹے کو لے کر پہاڑ پر پہنچ جاتے ہیں۔ ڈر اور خوف اور دہشت کے ساتھ یہاں ایک اور تناقض اُبھرتا ہے اور وہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی امید اور ان کا اعتماد۔ اپنے بیٹے کو ذبح کر دینے کی تمام تر تیاریوں کے باوجود حضرت ابراہیمؑ کے دل میں یہ اطمینان ضرور موجود ہے کہ آخر کار سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ وہ بات جو اب ناقابل فہم لگتی ہے، واضح ہو کر رہے گی۔ اگر یہ اعتماد نہ ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ ہرگز خدا کے اس حکم پر عمل پیرا نہ ہوتے کیونکہ پھر تو یہ قربانی قتل کی صورت اختیار کر لیتی۔ لیکن یہ تناقض آخر تک قائم رہتا ہے۔ ابراہیمؑ اپنے اعتماد اور اپنی امید کو ظاہر نہیں کر سکتے ——— حتیٰ کہ اپنے سامنے بھی اسے بیان نہیں کر سکتے کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کی قربانی، قربانی نہیں رہتی، ایک نمائش بن کر رہ جاتی ہے۔ پس انھیں اس تضاد، اس تناقض کی آگ میں اس فعل کے آخری لمحوں تک جلنا ہوگا تاکہ وہ بیم و رجا، امید و خوف کا پورا پورا تجربہ حاصل کر سکیں۔ کیر کے گور کی نظر میں یہی تضاد اور یہی تناقض ہی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ ہے اور اس پر جس پہلو سے سب سے زیادہ اعتراض کیا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ تناقض پر بہت زیادہ انحصار کر کے اس نے عقل کی اہمیت غیر ضروری طور پر کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اعتراض اس لحاظ سے صحیح نہیں ہے کہ کیر کے گور انسانی وجود کے تجربات کو بیان کرتے وقت بہت دور تک عقل اور انسانی ذہن کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اس امر کی پوری پوری کوشش کرتا ہے کہ بالکل آغاز ہی میں وہ ان کی نفی نہ کر دے۔ البتہ ایک مرحلے پر جا کر اُسے عقل سے دست کش ہونا ہی پڑتا ہے کیر کے گور کا تناقض نہ عقل اور خارجی اختیار کے علوم کی حدود واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نئی طرز فکر کا بھی آغاز کرتا ہے ——— ایک ایسی طرز فکر جو خالص سائنسی اور منطقی طرز سے یکسر مختلف ہے اور جس کو کیر کے گور "داخلی یا معروضی طریقہ" کہتا ہے۔

کیر کے گور کے خیال میں ہم انسان اور خدا اور کائنات سے اُس کے تعلق کو اسی طریقے سے سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ انسانی تجربات، اخلاقیات، مذہب اور

ایمان ایسی چیزیں نہیں ہیں جنھیں سائنٹفک یا دیگر الفاظ میں معروضی طریقے سے سمجھا سکے۔

کیرکے گور کے خیال میں علم اور ایمان دو مختلف چیزیں ہیں۔ علم وہ ہے کہ جو سوچ بچار کی شعوری کوشش کے بعد حاصل ہو یہاں سے وہ یہ بات پیدا کرتا ہے کہ چیز جس کا علم حاصل کیا جا سکے ہم اس پر ایمان نہیں لا سکتے۔ اس سے کیرکے گور کی مراد یہ ہے کہ صرف اپنی کوششوں سے چونکہ ہم اتنا علم حاصل نہیں کر سکتے جتنے علم کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے عملاً کثر ہمیں دوسروں کو ماننا پڑتا ہے۔ مگر ہمیں اتنا اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ جب ہم چاہیں ان باتوں کی صداقت کو پرکھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف ایمان ہے جو ماورائے ادراک ہے، ہم مکمل طور پر اس کا علم حاصل نہیں کر سکتے۔ یہاں ہمیں بغیر کسی ثبوت کے غیب پر ایمان لانا پڑتا ہے اور ایمان کی صداقت کو پرکھنے کے لئے ہمارے پاس اپنا تجربہ ہے۔ اس طرح کیرکے گور کائنات میں دو مختلف حقائق کا پتہ لگاتا ہے ——— ایک وہ جن کا علم حاصل کیا جا سکے اور دوسرے وہ جو انسانی تجربے ہی میں آسکیں۔ یہ دوسری قسم کے حقائق ہی وجودیت کی بنیاد ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"عیسائیت کو بطور ایک معروضی حقیقت کے قبول کرنا محض غلط ہی نہیں کفر بھی ہے"

وہ کہتا ہے کہ عیسائیت ایک طرزِ زندگی کا نام ہے، اسے بطور ایک دلچسپ سلسلۂ خیال یا ایک مجرد تصورِ کائنات کے قبول کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا اسے بے معنی بنا دیتا ہے۔ داخلی یا معروضی طریقہ جو پہلا کام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایمان، زندگی اور عمل کے درمیان ایک ربط قائم کر دیتا ہے اور اگر یہ ربط قائم نہ ہو تو ایمان بے معنی ہو جاتا ہے۔ ہمیں اپنے ایمان کے بارے میں کومٹ منٹ کرنا ہی ہوگا تاکہ ہم ذاتی تجربے سے اس کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو سکیں۔

معروضی اور داخلی طریقے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ معروضی طریقے سے دریافت کردہ نتائج کو پرکھا جا سکتا ہے، ثابت کیا جا سکتا ہے اور پھر اس ثبوت کے ہمراہ انھیں دوسروں تک بھی پہنچایا جا سکتا ہے جبکہ داخلی یا موضوعی طریقہ ہر لمحہ تبدیل ہونے والے تجربات پر مبنی ہے۔ اس کے نتائج دوسروں تک پہنچائے تو جا سکتے ہیں مگر ان نتائج پر یقین کرنے کے لئے دوسروں کو بھی اپنا ذاتی تجربہ کام میں لانا ہوگا مگر جب ایک بار یقین ہو جائے تو یہ یقین مطلق ہوگا۔ اس طرح بقول کیرکے گور، جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ اوامر عشرہ یا پہاڑی کے وعظ کی طرح سچے اور مستحکم ہوتے ہیں ——— اور اس قسم کی سچائی اور استحکام معروضی طریقے سے دریافت کردہ نتائج میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ذاتی تجربے یا بالفاظ دیگر ایمان و عمل کے روابط کو کیرکے گور جو اہمیت دیتا ہے وہ اس کے اس اقتباس سے ظاہر ہے۔

"اگر ایک کافر اپنے بتوں پر پوری گرمجوشی سے ایمان رکھتا ہے اور برعکس اس کے ایک عیسائی کا ایمان نیم دلانہ ہے تو میری نظر میں اس کافر کا ایمان عیسائی کے ایمان سے زیادہ قابلِ تعریف ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے :-

"It is easier to become a christian when I am not a christian than to become a christian when I am one."

کیرکے گور اور جدید وجودیوں میں فرق یہ ہے کہ کیرکے گور جو وجودیت کے بعض مضر خطرناک نتائج سے بھی آگاہ تھا اسے صرف اخلاق اور عیسائیت میں زندگی کی لہر دوڑانے کے لئے بطور ایک ذریعہ کے استعمال میں لاتا ہے۔ جدید وجودیوں کی طرح خود وجودیت ہی کو مقصد نہیں بنا لیتا۔ وہ وجود و جوہر (یعنی انسانی تجربے اور انسانی فطرت) اور اس کے خدا اور کائنات کے تعلق کے درمیان ایک توازن پیدا کرتا ہے۔ اس کی وجودیت میں

خدا کا وجود بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر خدا کے وجود سے انکار کر دیا جائے، جیسا کہ مطلق وجودیت کے منکرین نے کیا ہے تو انسان کا بنیادی تجربہ لاشیئیت ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیرکے گور اپنے فلسفے میں "خلافِ عقل" یا "مہمل پن" کے عنصر پر جو زور دیتا ہے تو وہ محض اس لئے کہ وہ اس کی وساطت سے زندگی اور عیسائیت کے "مہمل پن" کو اپنے ذاتی تجربے کا حصہ بنانا چاہتا ہے، لیکن جب کسی ماورائے ادراک ذات کا انکار کر دیا جائے تو "مہمل پن" بذاتِ خود منتہائے مقصود بن کر رہ جائے گا جیسا کہ جدید فرانسیسی وجودیوں کے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ انھوں نے معروضیت کو بھی کلّی طور پر مسترد کر دیا ہے اور ہر وہ چیز جو معروضی طریقے پر معلوم کی جا سکتی ہے اُن کے نزدیک ناقابلِ التفات ہے۔ اس لئے انسان، کائنات غرضیکہ ہر چیز ان کے لئے معنویت کھو بیٹھتی ہے۔ صرف ایک ہی چیز اس منظر میں اُبھرتی ہے اور وہ ہے لاشیئیت اور یہ اُبھر کر ہر چیز کو ختم کر دیتی ہے ——— کچھ بھی باقی نہیں بچتا سوائے لاشیئیت کے! یہ وہ نتائج ہیں جہاں خدا یا کسی دیگر مطلق قدر سے انکار کرنے کے بعد ایک وجودی پہنچ سکتا ہے۔

کیرکے گور کے خیالات کو آگے بڑھانے میں یہودی فلاسفر مارٹن بیوبر نے جو کام کیا ہے اُس کا جائزہ مختصر طور پر پیش کیا جاتا ہے ——— مارٹن بیوبر دو بنیادی رشتے قائم کرتا ہے اور پھر ان کے درمیان فرق واضح کرتا ہے۔ ایک کو وہ "I - it" کہتا ہے اور دوسرے کو "I - thou"۔ یہ تفریق اُس کے اُس دعویٰ پر مبنی ہے کہ جب بھی ہم لفظ "میں" (I) استعمال کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو خلا میں الگ تھلگ زندہ نہیں کر رہے ہوتے بلکہ یا تو ہم اشیاء سے اپنا تعلق قائم کر رہے ہوتے ہیں یا افراد سے۔ I - it کے تعلقات محض تعلقات ہی ہیں مگر I - thou کے تعلقات نہایت ذاتی نوعیت کے تعلقات ہوتے ہیں۔

بیوبر کے خیال میں ہر وجود کی حقیقت اتصال میں ہے۔ بیوبر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُسے اس فرق سے سمجھا جا سکتا ہے جو کتاب کا مطالعہ کرنے، لیکچر سننے اور گفتگو کرنے میں ہے۔ جب ہم کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو کتاب کا مصنف ہمیں متاثر تو کرتا ہے مگر ہمارے خیالات اس دوران میں غیر مجتمع بھی رہ سکتے ہیں۔ مطالعۂ کتاب کے دوران میں ہم اور بھی کئی چیزوں کے بارے میں سوچ سکتے ہیں، چونکہ ہم مطالعہ میں کلّی طور پر Involved نہیں ہوتے اس لئے بیوبر اسے اتصال نہیں سمجھتا۔

پھر جب ہم کوئی لیکچر سنتے ہیں تو ہو سکتا ہے لیکچرر سے ذاتی تعلقات کی وجہ سے ہم کچھ زیادہ ہی متوجہ ہو جائیں مگر اس کے باوجود ہمارے خیالات اس دوران میں منتشر ہو سکتے ہیں بلکہ ہم اس دوران میں سو بھی سکتے ہیں۔

گفتگو میں، اگر وہ صحیح معنوں میں گفتگو ہو تو، ہمیں ہر وقت حاضر اور متوجہ رہنا پڑتا ہے کیونکہ اگر ہم توجہ اور غور سے دوسرے کی بات نہیں سنیں گے تو ہم نہ تو اس کا جواب دے سکیں گے اور نہ ہی شریکِ گفتگو کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں گے۔ چنانچہ ہمیں لازماً یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم اُس کی بات سمجھ سکیں اور اپنی سمجھا سکیں۔ اُسے ترغیب دے سکیں، اور خود راغب ہو سکیں۔ گفتگو اس وقت ہی صحیح معنوں میں گفتگو ہو گی جب ہم کوئی لگی لپٹی نہ رکھیں، نہ تو ہم اپنی صحیح رائے کو چھپائیں، اور نہ ہی دوسرے کی صحیح رائے کو جھٹلائیں۔ جب ایسا ممکن ہو گا تو ہم اُس حقیقی اتصال کا تجربہ کر سکیں گے جو بیوبر چاہتا ہے۔

اس طرح کا اتصال ہے تو فلسفۂ وجودیت ہی کا ایک جزو، تاہم مطلق وجودیوں اور بیوبر میں اس سلسلے میں ایک اہم اختلاف بھی ہے۔ اُن کے نزدیک پیدائش سے قبل اور موت کے بعد انسانی وجود معطل ہے مگر بیوبر پیدائش سے قبل اور موت کے بعد بھی اتصال کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ایک فرد تین طرح اتصال کا تجربہ کرتا ہے۔ پیدائش سے قبل کے اتصال کو وہ Life with Nature کہتا ہے جس کے تجربے کو ہم محسوس کر سکتے ہیں مگر بیان نہیں کر سکتے۔ تیسرا اتصال Life with Spiritual کا ہے جو موت کے بعد پیش آتا ہے۔ یہاں ہم سے ایک ایسی ذات مخاطب ہوتی ہے جو ماورائے ادراک ہے۔ دوسرا اتصال جو پہلے اور تیسرے اتصال کے درمیان پیش آتا ہے Life with Man کا ہے۔ یہی وہ واحد اتصال ہے جسے ہم اپنی زبان میں بیان کر سکتے

ہیں کیونکہ یہاں دوسرے شریکِ گفتگو کے ساتھ ہمیں زبان کا اشتراک حاصل ہوتا ہے[1]۔

بیوبر کا شریکِ گفتگو یا Thou کا تصور ہمیں مذہب کی حقیقت کو بھی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بدھ مت اپنے اصلی رنگ میں خدا کے وجود سے منکر تھا۔ بالفاظِ دیگر اس مذہب میں کوئی Thou نہیں تھا جسے مخاطب کیا جا سکے اور مصائب و مشکلات میں جس سے مدد طلب کی جا سکے، چونکہ یہ خلا مذہب ہی کی فطرت کے خلاف تھا اس لئے بعد میں خود گوتم بدھ ہی کو خدا مان کر ایک Thou شامل کر لیا گیا جسے مخاطب کیا جا سکے۔

• بیوبر نے آگے چل کر تصوف پر جو تنقید کی ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ تصوف وحدت الوجود کو منتہائے مقصود قرار دیتا ہے ــــ ایک ایسی وحدت جس میں خدا اور انسان ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں۔ بیوبر کہتا ہے کہ مذہبی تجربے میں بھی "میں" اور "تم" " I and Thou " کے درمیان تفریق ناگزیر ہے کیونکہ خدا کے مجھ سے مخاطب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ میرا وجود بھی لازمی ہے۔

" As God addresses me, my person remains essential —— I am saved, I am delivered, I matter."[2]

بیوبر ہمارے ہاں کی اصطلاح میں وحدت الشہود کے زیادہ قریب ہے وہ کہتا ہے:۔

" Truly though God surrounds us and dwells in us, we never have Him with us."[3]

مارٹن بیوبر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سائنسی اور عقلیت پرستی کے اس دور کے انسان کو ایسی اصطلاحات دے دی ہیں جن کی مدد سے وہ خدا، مذہبی تجربے اور دیگر ماورائے ادراک عناصر پر بامعنی طور پر گفتگو کر سکتا ہے۔ اب خدا ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ ہم سے ایک بار پھر مخاطب ہوگا!!۔

---

[1] مارٹن بیوبر نے اس دوسرے اتصال کو اپنی کتاب "I and Thou" (۱۹۲۳ء) کے بعد "Between Man and Man" (۱۹۴۷ء) میں خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں اس کتاب کے ابواب (1) Dialogue اور (2) The Question to the Single One. کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا (م۔و)

[2] Martin Buber " I and Thou " (Edinburgh : 1937) : p 104.

[3] Ibid, page 104.

ظہور احمد اظہر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ادبی ذوق

حضرت عمرؓ ایک مثالی حکمراں اور بیدار مغز سیاستداں ہونے کے علاوہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کے فقہی اجتہادات اور علمی کمالات سے دنیا بخوبی واقف ہے۔ اسی طرح ایک سچے اور خالص فرزندِ عرب کی حیثیت سے شعر و شاعری اور ادب و تنقید کا ذوق بھی ان میں بدرجۂ کمال موجود تھا۔ غالباً وہ پہلے عرب نقاد ہیں جنھوں نے عربی تنقید کی تاریخ میں سب سے پہلے عربی شاعری پر ایجابی انداز میں تنقید کی[۱] اور مختلف شعرائے جاہلیت کے کلام پر رائے زنی کی۔ مسلم خلفاء اور سلاطین کی ادب نوازی اور علوم کی سرپرستی ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن تاریخ اسلام میں بعض نام ایسے بھی ملتے ہیں جو امورِ سلطنت کی انجام دہی کے ساتھ ہی نہ صرف علماء، ادباء اور شعراء کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ خود بھی جید عالم اور بلند ذوق ادیب تھے۔ ادبی ذوق اور ادب نوازی میں عبدالملک بن مروان، فلسفیانہ ذوق اور علوم و سائنس کی سرپرستی میں مامون الرشید اور تبحرِ علمی اور کتابوں کی فراہمی اور حفاظت میں الحکم بن عبدالرحمٰن الناصر کا مقام بہت اونچا ہے، مگر ان میں حضرت عمرؓ کو اس لحاظ سے اولیت اور انفرادیت کا شرف حاصل ہے کہ ایک زاہد و متقی اور مصروف ترین خلیفہ ہوتے ہوئے بھی آپ نے شعر و ادب کے لئے وقت نکالا اور اس سلسلے میں ایسی تنقیدی آراء اپنی یادگار چھوڑی ہیں جو قیمتی ہونے کے ساتھ ہی بعد کے وضع کردہ اصولِ نقد و بلاغت پر بھی پوری اترتی ہیں۔ اس لئے جب بھی ہم صدرِ اسلام کے ادب و تنقید سے بحث کرنے لگیں تو ان کا تذکرہ کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

ادب، تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں بعض متفرق اشعار ملتے ہیں جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں جس طرح بعض قصائد حضرت ابوبکرؓ و حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہیں۔ حضرت عمرؓ کی طرف منسوب اشعار کی صحت یا عدمِ صحت کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے البتہ یہ بات ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ وہ شعر و ادب کا بہت بلند ذوق رکھتے تھے۔ انھیں عرب کے اکثر مشہور شعراء کے قصائد زبانی یاد تھے اور موقع کی مناسبت سے اشعار سے استشہاد کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ فحول شعرائے جاہلیت کے کلام پر انھوں نے تنقید کی اور اکثر کے متعلق اپنی منفرد اور خاص خاص آراء قائم کی ہیں۔ انہی آراء کی بنیاد پر عرب نقادوں نے ادبی ذوق اور نقدِ شعر کے میدان میں حضرت عمرؓ کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔

ابوعثمان عمر الجاحظ کو عربی ادب اور تنقید کی تاریخ میں ایک بنیادی ستون کی حیثیت حاصل ہے وہ حضرت عمرؓ کے ادبی ذوق کے متعلق ایک ادیب العائشی یا العتبی کا قول نقل کرتا ہے[۲] "وکان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اعلم الناس بالشعر" کہ حضرت عمرؓ کو

۱۔ اصول النقد الادبی : احمد الشائب

۲۔ البیان والتبیین للجاحظ ج ۱ ص ۱۳۵

۳۔ اسد الغابہ ج ۴ ص ۷۰، العمدہ ج ۱ ص ۲۳

شعر و شاعری کا سب سے زیادہ علم تھا۔ علامہ ابو علی الحسن بن رشیق القیروانی (۳۹۰ - ۴۵۶) حضرت عمرؓ کے ذوقِ ادب و نقد کے متعلق لکھتے ہیں: "وکان من انقد اهل زمانه للشعر وانفذهم فيه معرفة" شعر کی تنقید اور شعر و شاعری کے متعلق گہری معلومات رکھنے میں حضرت عمرؓ اپنے زمانے کے سب لوگوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ جاحظ نے کتاب البیان والتبیین میں تیسری صدی ہجری کے مشہور نقاد اور ادیب محمد بن سلام الجمحی (۲۳۲ھ) کا قول نقل کیا ہے: قال محمد سلام الجمحی عن بعض اشیاخه: "قال كان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لا يكاد يعرض له امر الا انشد فيه بيت الشعر" حضرت عمرؓ کے سامنے تقریباً جب بھی کوئی معاملہ پیش ہوتا تو موقع کی مناسبت سے شعر پڑھ دیا کرتے تھے۔ سب سے آخر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے اس ارشاد پر غور فرمائیے۔

"سینۂ فاروق اعظم را بمنزلہ خانہ تصور کن کہ درہائے مختلف دارد و در ہر درے صاحب کمالے نشستہ"[3]

کتب ادب میں حضرت عمرؓ کے جو اقوال و آرا ملتی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعرائے جاہلیت میں سے وہ تین فحول شعراء، امرؤ القیس، زہیر بن ابی سلمیٰ، نابغہ ذبیانی کو پسند کرتے تھے اور ان کے شاعرانہ اور فنی کمالات کے معترف تھے۔ ان میں زہیر سے تو انہیں خصوصی محبت تھی۔ وہ ان کا پسندیدہ شاعر تھا۔ اسی کے کلام کو انھوں نے سب سے زیادہ پسند کیا اور اس پر ایجابی تنقید کی ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں شام کا سفر اختیار کیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جب رات ہوئی تو ابن عباسؓ کو طلب کر کے فرمایا: شاعر الشعراء (شاعروں کے شاعر) کا کچھ کلام یاد ہے؟ ابن عباسؓ نے عرض کیا: شاعر الشعراء سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا: زہیر بن ابی سلمیٰ! ابن عباسؓ نے پوچھا آپ اسے سب سے بڑا شاعر کس بنا پر قرار دیتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا: اس لئے کہ وہ اپنے کلام میں وحشی اور نامانوس الفاظ استعمال کرنے سے اجتناب کرتا تھا۔ اس کے اشعار ابہام و تعقید اور لفظی پیچیدگیوں سے بھی پاک ہیں اور پھر وہ لوگوں کی بے جا تعریف بھی نہیں کرتا تھا بلکہ جو اوصاف واقعی کسی میں ہوتے، انہی کی تعریف کرتا تھا۔ کیا یہ زہیر ہی نہیں کہتا:

اذا ابتدرت قيس بن عيلان غاية	من المجد من يسبق اليها يسود
سبقت اليها كل طلق مبرز	سبوق الى الغايات غير مزند
كفعل جواد يسبق الخيل عفوه	السراع وان يجهد ويجهدن يبعد
ولو كان حمد يخلد الناس لم تمت	ولكن حمد الناس ليس بمخلد

ترجمہ: جب بنو قیس بن عیلان عزت و بزرگی کی منزل کی طرف بڑھیں اور جو بزرگی کی طرف بڑھتا ہے اسے حاصل کر ہی لیتا ہے

تو تو اس منزل شرف و عزت میں تمام سخیوں اور مقابلہ کرنے والوں پر یقیناً سبقت لے جائے گا۔

جس طرح ایک عمدہ نسل کا گھوڑا میدان مسابقت میں آسانی سے سب سے آگے نکل جاتا ہے۔

اگر مدح و ثنا کسی کو غیر فانی بنا سکتی تو تو کبھی نہ مرتا مگر حمد و ثنا سے کسی کو ہمیشہ کی زندگی نہیں مل سکتی۔

ابن عباس! مجھے اس کا کلام سنائیے۔۔ چنانچہ ابنِ عباس کہتے ہیں: میں عمرؓ کو کلامِ زہیر سناتا رہا اور قافلہ چلتا رہا اور جب

---

[1] کتاب العمدۃ ج ۱ ص ۳۳
[2] کتاب البیان والتبیین ج ۱ ص ۱۳۶
[3] ازالۃ الخفاء
[4] الاغانی ج ۱۰ ص ۲۸۸، الشعر والشعراء ج ۱ ص ۹۳، العمدۃ ج ۱ ص ۹۸، نقد الشعر ۶۵، الموشح ۳۵۲
[5] الاغانی ج ۱۰ ص ۲۸۹، دیوانِ زہیر ص ۳۴، ۳۵

سحر ہوئی تو فرمایا: ابنِ عباس اب بس کرو اب تلاوتِ قرآنِ کریم کا وقت ہو گیا ہے، میں نے پوچھا: کون سی سورت سناؤں؟ آپ نے فرمایا: سورۂ واقعہ سنایئے۔ اور میں نے سورۂ واقعہ کی تلاوت کی۔ اذان کہی گئی اور صبح کی نماز ادا کی گئی[۵۰]

حضرت عمرؓ کے نزدیک اچھے شعر کی خصوصیات یہ تھیں:۔

۱۔ شعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے بھدے، وحشی اور نامانوس الفاظ سے پاک ہو جو طبعِ سلیم پر ناگوار گذریں اور پاکیزہ ذوق ان سے انقباض محسوس کرے۔

۲۔ شعر میں ایسی دور از کار تراکیب، تعقیدِ لفظی، ابہام اور پیچیدگیاں بھی نہ ہوں جن سے وہ ایک معما بن کر رہ جائے اور سمجھنے کے لئے دور دراز کے سفر اختیار کرنے پڑ جائیں۔

۳۔ شعر میں جھوٹ کی آمیزش اور مبالغہ آرائی نہ ہو۔ وہ حقیقت پسندی کی صحیح تصویر ہو اور حقائقِ زندگی کی سچی تعبیر پیش کرے۔

قدیم نقد و بلاغت کے علاوہ جدید تنقید بھی شاعری کے ان خصائص کو تسلیم کرتی ہے اور یہ بات ہمیں حضرت عمرؓ کو بحیثیت نقاد بلند مقام دینے پر مجبور کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ ادب و فن کی بقائے دوام اور حیاتِ ابدی کے تصور سے بھی خوب آگاہ تھے۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ شاہوں کی سطوت اور دولت و ثروت کی فراوانی ادب و فن کے قیمتی اور عظیم شاہکاروں کے مقابلے میں بالکل بے معنی اور بے حقیقت ہے۔ شعرا و ادبا پر بادشاہوں اور امیروں کی طرف سے انعام و اکرام اور عطیات کی جو بارشیں ہوتی ہیں۔ ادب و فن کے ان غیر فانی جواہرات کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتیں جو وہ ان کی نذر کرتے ہیں۔ اگر ادیب و فنکار اس حقیقتِ ثابتہ سے آگاہ ہو جاتے تو وہ بادشاہوں اور دولتمندوں کو خاطر میں بھی نہ لاتے۔

ہرم بن سنان، زہیر بن ابی سلمیٰ کا ممدوح تھا۔ عبس و ذبیان کے قبائل کے درمیان صلح کرا کے اس نے جس اخلاقی برتری اور عربی مروت کا مظاہرہ کیا، اسے جاہلی عربوں کی تاریخ میں ایک قابلِ تقلید مثال کی حیثیت حاصل ہے۔ زہیر نے اسی شاندار کارنامے پر ہرم کی شان میں اپنا مشہور اور غیر فانی معلقہ نظم کیا تھا جو عربی ادب کے شہ پاروں میں شمار ہوتا ہے۔ ہرم کے ایسے ہی بلند اخلاق اور اوصافِ حمیدہ نے زہیر کو اس کا مداح اور گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ اس کی شان میں قصائد کہتا اور بدلے میں انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا[۵۱]۔ اتفاق سے ہرم اور زہیر دونوں کی اولاد نے حضرت عمرؓ کا زمانہ پایا تھا اور ان سے اس سلسلے میں جو مکالمات ہوئے وہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ کے فہم و فراست اور ذوقِ سلیم کی دلیل بھی ہیں۔

ایک دفعہ ہرم بن سنان کا ایک بیٹا حضرت عمرؓ کے پاس موجود تھا۔ آپ نے کہا: مجھے زہیر کے کچھ وہ مدحیہ قصائد سناؤ جو وہ تمہارے والد کی شان میں کہا کرتا تھا۔ وہ سنا چکا تو حضرت عمرؓ نے کہا: بھئی وہ تو تمہاری خوب تعریف کرتا تھا! ہرم کا بیٹا بولا: بخدا ہم بھی تو اسے عطیات و انعامات سے خوب نوازتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: جو کچھ تم نے اسے دیا وہ تو گیا، ختم ہو گیا، مگر اس نے جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے وہ تو ہمیشہ کے لئے باقی ہے[۵۲]۔

زہیر ابن ابی سلمیٰ کے ایک بیٹے[۵۳] سے آپ نے ایک مرتبہ پوچھا: بھئی وہ خلعتیں کیا ہوئیں جو ہرم تمہارے باپ کو پہنایا کرتا تھا؟ لڑکے نے کہا: جناب! گردشِ دوراں نے انھیں بوسیدہ کر کے مٹا دیا ہے۔ آپ نے کہا: مگر وہ خلعتیں تو غیر فانی اور زندہ جاوید ہیں جو تمہارے باپ

---

[۵۰] الاغانی ج ۱۰ ص ۲۸۹، کتاب الشعر والشعراء، ص ۹۳

[۵۱] الاغانی ج ۱۰ ص ۳۰۵ ۔ کتاب الشعر والشعراء، ص ۹۴

[۵۲] الاغانی ج ۱۰ ص ۳۰۵

[۵۳] بعض روایات میں زہیر کی بیٹی لکھا ہے۔ العمدۃ ج ۱ ص ۸۱

نے ہرم کو پہنائیں[۱]

فقہی اجتہاد کے لحاظ سے حضرت عمرؓ فقہائے صحابہ میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ اپنے دورِ خلافت میں انھوں نے جو خطوط اپنے عمال اور قاضیوں کے نام لکھے ہیں وہ اسلامی فقہ و قانون سازی میں ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ جب زہیر کا یہ شعر سنا تو بار بار دہرایا کئے:

فان الحق مقطعة ثلاث اداء او نفار او جلاء

(حقوق کا فیصلہ تین طرح سے ہوتا ہے، یا ادا کرنے سے یا عدالت میں مقدمہ لے جانے سے اور یا پھر بات بالکل واضح ہو جہاں عذر اور جھگڑے کی گنجائش ہی نہ ہو۔)

اسی شعر کی وجہ سے زہیر کو "قاضی الشعراء" کہا جاتا تھا[۲]

امراءالقیس وصف نگاری اور نادر تشبیہات لانے میں کمال رکھتا تھا مگر اس کے کلام میں فحش نگاری اور عریانی طبع سلیم پر ناگوار گذرتی ہے اس لئے حضرت عمرؓ نے اس کے کلام سے ایسی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ تاہم ایک صاحب بصیرت نقاد اور باذوق ادیب کی حیثیت سے امراءالقیس کی شاعری پر بھی رائے زنی کی ہے۔ ان کے نزدیک امراءالقیس کی فضیلت و اہمیت کا راز یہ ہے کہ اس نے عرب شعراء کے لئے شاعری کا میدان تیار کیا اور اصنافِ سخن کے لئے زمین ہموار کی ہے۔ نازک خیالات اور نادر تشبیہات لانے کے علاوہ ایسے اچھوتے معانی پیدا کئے ہیں جن کی پہلے کوئی نظیر ہی نہ تھی۔ چنانچہ ایک دن حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب آپ سے شعر و شاعری پر گفتگو کر رہے تھے۔ انھوں نے جاہلی شعراء کے متعلق سوالات کئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں امراءالقیس کے متعلق فرمایا: "اسے تمام شعرائے عرب پر تقدم اور سبقت حاصل ہے کیونکہ اسی نے عرب شعراء کے لئے شاعری کے سرچشمے جاری کئے اور اندھے مضامین کو بصیرت عطا کر دی"[۳]

جاہلی دور کا تیسرا بڑا شاعر نابغہ ذبیانی ہے، اسے حیرہ و غسان کے شاہی درباروں سے وابستہ ہونے اور سوق عکاظ میں شعراء کی ادبی مجلس کا صدر اور حج ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے۔ نابغہ کے علاوہ یہ اعزاز کسی دوسرے جاہلی شاعر کے حصے میں نہیں آیا کہ اسے شعرائے عرب نے اپنا حکم و امام تسلیم کر کے اس کی تنقیدی آراء اور فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کو زہیر اور امراءالقیس کی طرح نابغہ کی شاعری سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ایک مرتبہ نابغہ کے قبیلے کے لوگ حضرت عمرؓ کے پاس حاضر تھے۔ ادبی گفتگو اور شعراء کا تذکرہ چھڑ گیا۔ آپ نے وفد بنی غطفان کے لوگوں سے پوچھا: یہ شعر تمہارے کس شاعر کا ہے:-

اتیتك عاریا خلقا ثیابی علی خوف تظن بی الظنون

(میں تیرے پاس عجز و انکسار کے ساتھ معذرت و معافی کے لئے، اس حال میں آیا ہوں کہ برہنہ تن ہوں، لباس بوسیدہ ہو چکا ہے اور خوف کے مارے قسم قسم کے گمان دل میں پیدا ہو رہے ہیں)

وفد کے لوگوں نے جواب دیا: یہ تو نابغہ کا شعر ہے، پھر آپ نے فرمایا یہ شعر کس کا ہے:

حلفت فلم اترك لنفسك ریبة ولیس وراء اللہ للمرء مذهب

---

[۱] الاغانی ج ۱ ص ۳۰۵
[۲] الشعر والشعراء ص ۸۹ - دیوان زہیر ص ۱۸
[۳] العمدة ج ۱ ص ۵۵ - البیان والتبیین ج ۱ ص ۱۳۵
[۴] العمدة ج ۱ ص ۹۴

ترجمہ: (میں نے قسم کھا کر اپنی بے گناہی اور معذرت کا اظہار کر دیا ہے) اب تیرے دل میں کسی قسم کا شک باقی نہیں رہنا چاہئے اور خدا کی قسم کھانے کے بعد انسان کے پاس اور چارہ کار کیا رہ جاتا ہے)

وہ کہنے لگے یہ بھی نابغہ کا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: یہ کس نے کہا ہے؟

فانك كالليل الذى هو مدركى ‌ ‌ ‌ ‌ وان خلت أن المنتأى عنك واسع

ترجمہ: (اگر میں (بزعم خویش) یہ سمجھ بھی لوں کہ تجھ سے دور رہنے کے لئے میرے سامنے دنیا بہت وسیع ہے (تو تب بھی تیرے غضب سے نہیں بچ سکتا) کیونکہ تو اس رات کی مانند ہے جو مجھے ہر صورت میں آ ہی لے گی (جس طرح رات سے کوئی نہیں بھاگ سکتا اسی طرح تجھ سے بھی کسی کو مفر نہیں)

وفد کے لوگوں نے کہا یہ شعر بھی نابغہ کا ہے، آپ نے فرمایا: یہی تمہارا سب سے بڑا شاعر ہے[1]

الاغانی میں یہ روایت تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ مذکور ہے۔ وہاں وفد بنو غطفان کی جگہ بعض لوگوں کا ذکر ہے۔ پھر نابغہ کو تمام شعرائے عرب پر فضیلت دینے کا ذکر ہے۔ ہم نے ابن قتیبہ کی روایت کو بوجوہ پسند کیا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ادب و نقد کے میدان میں ابن قتیبہ کو ابو الفرج اصفہانی پر برتری حاصل ہے۔ دوسرے نابغہ کو تمام شعراء پر فضیلت و فوقیت دینا مبالغے سے خالی نہیں اور خصوصاً حضرت عمرؓ جیسا نقاد جو زہیر کو شاعر الشعراء تسلیم کرتا ہو، وہ نابغہ کو مطلقاً تمام شاعروں پر فضیلت نہیں دے سکتا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ نابغہ کا مقام بہت اونچا ہے اور اسے کئی شعراء پر تفوق حاصل ہے۔

مستند روایات حضرت عمرؓ کو ایک بذلہ سنج اور طبع سلیم کے مالک ادیب اور بلند ذوق سخن فہم اور صائب الرائے نقاد کے روپ میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ کثرت مشاغل، امور سلطنت کی عظیم ذمہ داریوں اور ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود میں انہماک کے باوجود آپ شعر و ادب سے لطف اندوز ہونے کے لئے بھی وقت نکال لیتے تھے۔ صحابہ کرام میں سے ادبی ذوق رکھنے والے حضرات آپ سے شعر و ادب کے موضوعات پر گفتگو فرماتے، شعراء کے بارے میں رائے طلب کرتے[2] جب کبھی آپ کے گرد و پیش ایسے باذوق لوگ جمع ہو جاتے اور یا شعراء خود اپنا کلام سناتے[3] یا صاحب ذوق اشخاص جاہلی اور اسلامی شعراء کے قصائد سناتے[4] حضرت عمرؓ شعراء کا کلام اور قصائد سنتے جاتے اور جہاں داد دینے کا موقع ہوتا، داد دیتے اور شعر کے فنی محاسن اور خوبیوں کی تعریف فرماتے۔ اچھوتے خیالات، نادر تشبیہات و استعارات اور فنی نکات پر پھڑک اٹھتے۔ بار بار شعر کو دہراتے اور جھومتے جاتے[5] اور بعض اوقات تنقید بھی فرماتے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعات ایک دلچسپ مطالعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ عبدہ بن الطبیب کا طویل لامیہ قصیدہ آپ کو سنایا گیا۔ قصیدہ سنانے والا جب اس شعر پر پہنچا:

والمرء ساع لامر ليس يدركه ‌ ‌ ‌ ‌ والعيش شح واشفاق وتأميل

ترجمہ: انسان کچھ ایسے کاموں کی کوشش کرتا ہے جن میں کامیاب نہیں ہو پاتا (بھلا ہو بھی کیونکر) جبکہ زندگی تو محض بخل، خوف اور امنگوں کا نام ہے (یعنی انسان خوف اور امنگ کے جذبات لئے آگے بڑھتا ہے مگر زندگی اتنی بخیل ہے کہ کچھ نہیں دیتی)

تو حضرت عمرؓ پھڑک اٹھے اور دوسرے مصرعے کو جھوم جھوم کر دوہراتے رہے[6]

---

[1] کتاب الشعر والشعراء ص ۱۰۹-۱۱۰، طبقات الشعراء ص ۲۷، تاریخ النقد والنقد فی الادب العربی۔

[2] الأغانی ج ۱۱ ص ۳۰۴

[3] العمدۃ ج ۱ ص ۹۳

[4] طبقات الشعراء ص ۱۷

[5] اغانی ج ۱۰ ص ۲۸۸، الشعر والشعراء ص ۹۳

[6] کتاب البیان والتبیین ج ۱ ص ۱۳۵، الفاروق ص ۲۱۸

[7] البیان والتبیین ج ۱ ص ۱۳۵

ایک دفعہ ابوقیس بن الاسلت کا قصیدہ عینیہ سنایا گیا جس میں یہ شعر بھی تھا:۔

الکیس والقوۃ خیر من الـ ۔۔۔ اشفاق والفھۃ والھاع

ترجمہ:۔ بھلا خوف، گونگے پن اور بزدلی کو عقل و شجاعت ایسے بہتر اوصاف سے کیا نسبت؟

حضرت عمرؓ نے جب یہ شعر سنا تو بہت پسند فرمایا اور مکرر پڑھنے کی فرمائش کی۔[1]

کسی شخص نے حضرت عمر کے سامنے طرفہ بن العبد کا یہ شعر پڑھا

فلولا ثلاث ھن من عیشۃ الفتی ۔۔۔ وجدک لم احفل متی قام عودی

ترجمہ:۔ اگر تین چیزیں (شراب، شہسواری اور وصال محبوبہ) نہ ہوتیں جو ایک نوجوان کے لئے سامان عیش ہیں تو تیری قسمت کی قسم مجھے موت کی کوئی پروا نہ ہوتی!

حضرت عمرؓ کو یہ خیال پسند نہ آیا اور فرمانے لگے "اگر راہِ خدا میں سفرِ جہاد کی ذمہ داری خدا کے حضور میں کھڑے ہو کر عجز و نیاز کی سعادت حاصل کرنے کی تمنا اور نیک لوگوں کی مجالس میں بیٹھنے کی آرزو نہ ہوتی تو مجھے موت کی کوئی پروا نہ تھی۔[2]

کوئی شخص الحطیئہ کا یہ شعر پڑھ رہا تھا

متی تاتہ تعشوا الی ضوء نارہ ۔۔۔ تجد خیر نار عندھا خیر موقد

ترجمہ:۔ جب اس کی آگ کی روشنی دیکھ کر اس کے پاس بغرض مہمانی آؤ گے تو دیکھ لو گے کہ ایک اچھا آگ جلانے والا ایک بہترین آگ جلائے بیٹھا ہے۔

جب حضرت عمرؓ نے یہ شعر سنا تو کہنے لگے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت و کرامت کی بھی یہی شان تھی۔[3] اور ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ الحطیئہ جھوٹ بکتا ہے، بہترین آگ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔[4]

سحیم عبد بنی الحسحاس صدرِ اسلام کا مشہور شاعر تھا۔ جاحظ نے اسے ان خطباء و شعراء میں شمار کیا ہے جن کی زبان میں لکنت تھی، وہ جب حضرت عمر کو اپنا قصیدہ سنانے لگا اور کہا کہ:

عمیرۃ ودع ان تجھزت غادیا ۔۔۔ کفی الشیب والاسلام للمرء ناھیا

ترجمہ:۔ عمیرہ! جب جانے کے لئے تو نے رختِ سفر باندھ ہی لیا ہے تو اب الوداع کہہ دے کیونکہ بڑھاپا اور اسلام، انسان کو باز رکھنے اور تنبیہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

تو شعر سن کر حضرت عمرؓ فرمانے لگے۔ اگر شعر میں تم اسلام کو بڑھاپے سے پہلے لاتے تو میں تمہیں انعام دیتا۔ سحیم کہنے لگا "ما سعرت" مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں آیا، (وہ شین نہیں کہہ سکتا تھا اس لئے ماشعرت کی جگہ ما سعرت کہہ دیا)[5]

پھر اس نے یہ شعر پڑھا

توسدنی کفا وتثنی بمعصم ۔۔۔ علی وتحوی رجلھا من ورائیا

ترجمہ:۔ محبوبہ نے اپنی ہتھیلی کو میرا تکیہ بنا دیا اور دوسرے ہاتھ کی کلائی سے میرے ہاتھ کو تھام لیا اور اس کے پاؤں میری پشت پر تھے!

---

[1] کتاب البیان والتبین ج ۱ ص ۱۳۶

[2] المعلقات السبع ص ۱۱۲

[3] کتاب البیان والتبین ج ۱ ص ۱۰۰

[4] الفتاح ج ۱ ص ۱۴

[5] الاغانی ج ۲ ص ۳۰۰

[6] کتاب البیان والتبین ج ۱ ص ۴۰

حضرت عمرؓ نے یہ شعر سنا تو کہا کہ "ارے کمبخت: تو تو مقتول معلوم ہوتا ہے![50] یعنی یہ کیفیت تو زخموں سے نڈھال شخص کی ہوتی ہے اور اسے بلبل سہارا دیا جاتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق بعد میں سحیم کو اس کی محبوبہ کے رشتہ داروں نے واقعی قتل کر دیا تھا![51]

عربی ادب میں متمم بن نویرہ کو بحیثیت مرثیہ نگار بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ اس کا بھائی مالک بن نویرہ بڑی خوبیوں کا مالک نوجوان تھا جو جنگ ارتداد میں خالدؓ بن ولید کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ متمم اس صدمے کا تیر برداشت نہ کر سکا اور بھائی کی موت کے بعد زندگی اس کے لئے اجیرن ہو گئی۔ تمام عمر مرثیے لکھتا رہا اور روتا رہا، لوگوں کو رلاتا رہا اور اسی حال میں تباہ ہو گیا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے متمم سے خواہش ظاہر کی کہ اپنے بھائی کا کوئی مرثیہ سناؤ۔ متمم نے اپنا مشہور مرثیہ سنانا شروع کیا جو اس طرح شروع ہوتا ہے!

"لعمری وما دهری بتابين مالك"

قصیدے کے آخر میں یہ شعر بھی تھے

كنا كندمانى جذيمة حقبة　　　من الدهر حتى قيل لن يتصدعا

ترجمہ:- ہم دونوں بھائی ایک مدت تک جذیمہ (بادشاہ) کے دو ہم نشینوں کی طرح ایک ساتھ رہے حتیٰ کہ کہا جانے لگا کہ وہ کبھی جدا نہ ہوں گے۔

فلما تفرقنا كأنى ومالكا　　　لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

ترجمہ:- اور اب جدا ہونے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے اتنا طویل عرصہ ایک ساتھ رہنے کے باوجود ہم نے ایک رات بھی اکٹھے نہ گزاری تھی!

حضرت عمرؓ جب مرثیہ سن چکے تو متمم سے کہا کہ اگر میں بھی شاعر ہوتا تو اپنے بھائی زید بن الخطاب کا مرثیہ کہتا جو جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔ متمم نے جواب دیا کہ اگر میرا بھائی بھی آپ کے بھائی کی طرح شہادت کی موت مرا ہوتا تو میں کبھی اس کا مرثیہ نہ کہتا! حضرت عمرؓ کو ایک شاعر کی شاعرانہ تعزیت پسند آئی اور فرمانے لگے متمم! تمہارے ان الفاظ سے جو مجھے اطمینان و سکون حاصل ہوا ہے۔ اتنا کسی تعزیت کرنے والے کے ہمدردی سے بھرے ہوئے الفاظ سے کبھی نہیں ہوا۔[52]

حضرت عمرؓ بے حد بیدار مغز، اور بڑے سخت گیر حکمران تھے مگر شعر و شاعری اور غنا و سماع کے سلسلے میں اتنی سختی نہیں کرتے تھے بلکہ بعض اوقات خود بھی ترنم سے شعر گا لیا کرتے اور خوش الحان چرواہوں سے گیت بھی سن لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گیت اور نغمات تو عربوں کی زندگی کی ایک شدید ترین ضرورت تھی۔ دور دراز سفروں کی روح فرسا مشقت و دشواری کا واحد علاج حدی خوانی تھا۔ تھکے ہارے قافلے حدی خوانوں کے مسرت انگیز سریلے نغمات سن کر اپنی تمام تکالیف بھول جاتے اور تھکے ماندے اونٹوں کی جان میں جان آ جاتی اور وہ مست ہو کر اپنی رفتار کو تیز تر کر دیتے اور جب رات کو کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے تو نغمہ و سرود کی محفلیں لگ جاتیں۔ نغمہ سرائی اور سماع جیسے تھکاوٹ اور واماندگی کا علاج ہو! دیر تک یہی سلسلے جاری رہتے۔ یہاں تک کہ تھکاوٹ اور نغمات کے نشے سے چور ہو کر فرزندان ریگستان نیند کے آغوش میں چلے جاتے۔

حضرت عمرؓ نے جب جابیۃ الجولان کا سفر کیا تو ایک شخص رباح الفہری بھی ان کے قافلے میں شامل تھا جو بڑا خوش الحان نغمہ گر اور حدی خوانی میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ ریگستان کا طویل سفر شب جب قافلے والوں پر گراں ہونے لگا تو اس کے ساتھیوں نے حدی خوانی کی فرمائش کی مگر رباح نے حضرت عمرؓ سے جھجک محسوس کی۔ ساتھیوں نے کہا: تم گانا شروع کرو اگر وہ منع کریں تو

---

[50] اغانی ج ۲۰ ص ۶　　[51] طبقات الشعراء الجمحی ص ۷۱　　[52] کتاب الشعر والشعراء ص ۲۹۷

چپ ہو جاتا چنانچہ رباح نے سرور انگیز لے میں حدی خوانی شروع کر دی۔ تمام قافلے پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور ریگستانی سفر کی صعوبتیں اور تھکاوٹیں حریر و پرنیاں کے بستر بن گئیں۔ حضرت عمرؓ خاموشی کے ساتھ سنتے رہے اور لطف اندوز ہوتے رہے اور سحر ہوئی تو منع کر دیا کہ اب عبادت کا وقت ہے یاد الٰہی میں مصروف ہو جاؤ۔ پھر دوسری رات کو لوگوں نے نصب خوانی کی فرمائش کر دی۔ حضرت عمرؓ سحر ہونے تک نصب بھی سنتے رہے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ تیسری رات قافلے والوں نے رامش گروں کے گانے کی فرمائش کی، لیکن رباح نے جونہی گانا شروع کیا تو حضرت عمرؓ نے گرجتی ہوئی آواز سے منع کر دیا کہ اس یاوہ گوئی کو بند کرو۔ اس سے دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے[5]۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں مسلمانوں کی زندگی کا ہر پہلو پیش نظر رکھا اور انھیں معاشرے کی تمام ضرورتوں کا خیال رہا۔ تعلیم کو ایک اہم ضرورت تسلیم کرتے ہوئے اس پر بھی پوری توجہ دی۔ جگہ جگہ مکاتب کا سلسلہ قائم کیا جہاں قرآن اور عربی زبان کی تعلیم کا بندوبست تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح آگاہ تھے کہ شعر ہی عربوں کی تاریخ ہے[6] اور یہ بھی انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ادب انسانی زندگی کی تشکیل میں نہایت ہی اہم کردار ادا کرتا ہے، اس لئے اپنی تمام قلمرو میں یہ فرمان جاری کر دیا کہ اما بعد فعلموا أولادکم السباحة والفروسیة ورووهم ماسار من المثل وحسن من الشعر[7] (اپنے بچوں کو تیراکی اور شہسواری سکھاؤ اور مشہور ضرب الامثال اور عمدہ اشعار کی تعلیم دو) اپنے ایک گورنر ابو موسیٰ الاشعری کو ایک دفعہ لکھا کہ مُر من قبلك بتعلم الشعر فانه يدل على معالى الاخلاق وصواب الرأى ومعرفة الانساب[8] (اپنی طرف کے لوگوں کو شعر و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کا حکم دو کیونکہ یہ بلند اخلاق، اصابت رائے اور معرفتِ نسب کی دلیل ہے)۔

حضرت عمرؓ کے خطوط اور خطبات کتب ادب عربی کا ایک اہم حصہ ہیں جو ان کی فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی پر دلالت کرتے ہیں اس کے علاوہ ان کے کچھ اقوال بھی ہیں جو ان کے حسنِ ذوق اور طبع سلیم کا عکس پیش کرنے میں۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا لوكنت تاجرا ما اخترت على العطر شيئا ان فاتنى ربحه لم يفتنى ريحه (اگر میں تجارت کرتا تو عطریات کے کاروبار کو پسند کرتا کیونکہ اس میں اگر نفع نہ بھی ملتا تو خوشبو تو کہیں نہیں گئی تھی)۔ ایک دفعہ کسی شخص سے مدد لینا چاہتے تھے۔ نام پوچھا تو اس نے کہا ظالم بن سراق۔ آپ نے کہا تو ظالم ہے اور تیرا باپ چور! اس شخص سے مدد نہ لی۔ ایک مرتبہ کہیں سے آ رہے تھے۔ راستے میں کچھ لوگ آگ جلائے بیٹھے تھے۔ آپ نے کہا السلام علیکم یا اهل الضوء یعنی یا أهل النار کہنے میں کراہیت محسوس کی[9]۔

بنی مجاشع بڑے طویل القامت اور مضبوط جسم کے لوگ تھے لیکن ایک دفعہ ان کے ایک شاعر النجاشی نے انصار کی ہجو کہہ دی۔ اس پر حضرت حسانؓ کو جو غصہ آیا تو چند ہجویہ اشعار لکھ کر بنو مجاشع کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔ ان میں یہ شعر بھی تھا:-

لا بأس بالقوم من طول ومن عظم   جسم البغال واحلام العصافير

ترجمہ:- اس قوم کے طویل القامت اور مضبوط جسم والے لوگوں کا کیا کہنا! جسم خچروں جیسے اور عقل چڑیوں جیسی[10]!!

بنو مجاشع اپنے شاعر پر بہت ناراض ہوئے اور مات گدتے پر جکڑ کر حسانؓ سے معافی مانگنے کے لئے آئے۔ سردار قبیلہ نے کہا: "حسانؓ! ہم لوگ اپنے دراز قدوں اور مضبوط جسموں پر فخر کرتے تھے مگر اس شعر سے یہی بات ہمارے لئے ایک گالی بن گئی ہے! اسی طرح بنو نمیر سے ناراض ہو کر

---

[5] الفاروق عمر
[6] طبقات الشعراء ص ۱۶
[7] کتاب البیان والتبیین للجاحظ ج ۱ ص ۹۲
[8] الادب العربی وتاریخہ ج ۱ ص ۸۸
[9] ایضاً ص ۸۹
[10] دیوان حسان بن ثابت ص ۲۱۴

جریر نے ان کی ہجو کہہ ڈالی جس میں یہ شعر بھی تھا:

فغض الطرف انك من نمير　　　فلا كعبا بلغت ولا كلابا

ترجمہ: تو سر اوپر اٹھا ہی نہیں سکتا! کیونکہ تو نمیری ہے نا، تو بھلا بنو کعب و بنو کلاب کی عزت کو کیا پہنچ سکتا ہے؟!!!

اس شعر سے بنو نمیر کی دشمنی پلید ہوئی اور وہ رسوائی ہوئی کہ بزم و رزم میں ان کے لیے کوئی گنجائش نہ رہی۔ جونہی یہ شعر پڑھا جاتا بنو نمیر کے لوگ شرم و ندامت سے سر جھکا لیتے۔ الغرض ہجو گوئی نہ صرف ذلت و بدنامی اور رسوائی کا باعث تھی۔ بلکہ خاندانی عداوت و انتقام، اور جنگ و جدال کا سبب بھی بنتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ہجو گوئی کو بڑی سختی سے روکا، ہجو گو شعراء کو سزائیں بھی دیں اور مال دے کر ان سے لوگوں کی عزت و ناموس کو محفوظ بھی کیا۔

عربوں کا ایک قبیلہ تھا جو بنو العجلان (جلدی کرنے والے کی اولاد) کہلاتا تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ان کا ایک بزرگ مہمان کی تواضع اور خاطر مدارات میں بڑی تیزی اور عجلت دکھاتا تھا، اور یہ بات بلاشبہ باعثِ فخر ہے۔ مگر مشہور شاعر النجاشی نے ان کی ہجو کہی، اور اس میں وجہ تسمیہ ایک بڑی قابلِ شرم بات کو قرار دیا۔ چنانچہ بنو العجلان اس نام سے تنگی محسوس کرنے لگے اور یہی نام ان کے لیے ایک گالی بن گیا۔ آخر وہ حضرت عمرؓ کے پاس شکایت لائے۔ آپ نے فرمایا مجھے وہ ہجو سناؤ۔ انھوں نے ہجو پڑھی:

اذا الله عادى اهل لوم ورقة　　　فعادى بني العجلان رهط ابن مقبل

ترجمہ: اگر اللہ تعالیٰ ذلیل اور کمینے لوگوں کو دشمن رکھتا ہے تو وہ قبیلہ عجلان کو بھی دشمن رکھے جو تمیم بن مقبل کی قوم ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا: یہ تو ہجو نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے بددعا کہا جا سکتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے خدا اس کی دعا قبول ہی نہ کرے۔

پھر انھوں نے یہ شعر سنایا:

قبيلة لا يغدرون بذمة،　　　ولا يظلمون الناس حبة خردل

ترجمہ: وہ تو ایک حقیر سا قبیلہ ہے نہ یہ لوگ کوئی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں اور نہ ہی لوگوں پر رتی بھر ظلم کر سکتے ہیں (عربوں میں یہ باتیں بھی معیوب سمجھی جاتی تھیں)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کاش میں بھی اسی قبیلے سے ہوتا۔

اب ایک اور شعر سنایا گیا:

ولا يردون الماء الا عشية　　　اذا صدر الوراد عن كل منهل

ترجمہ: یہ لوگ، پانی لینے کے لیے بھی رات کے وقت جاتے ہیں جب سب لوگ گھاٹ سے واپس آ چکے ہوتے ہیں (عربوں میں یہ بزدلی اور کمزوری کی علامت خیال کی جاتی ہے)

حضرت عمرؓ نے کہا: بھئی اس میں ہجو کی کیا بات ہے بھیڑ سے بچنا تو بڑی عقلمندی کی بات ہے!

تب انھوں نے یہ شعر سنایا:

تعاف الكلاب الضاريات لحومهم　　　وتاكل من كعب بن عوف ونهشل

ترجمہ: درندہ نما کتے ان لوگوں کا گوشت بھی نہیں کھاتے حالانکہ کعب بن عوف اور نہشل کو کھاتے ہیں یعنی وہ ایسے پلید ہیں کہ کتے بھی ان کے گوشت سے کراہیت محسوس کرتے ہیں۔

لہٰ حضرت عمرؓ اس وقت کسی خاص موڈ میں تھے، فرمانے لگے: جس کا گوشت کتوں سے محفوظ رہ جائے اسے اور کیا چاہیئے۔ سب سے بڑی ذلت تو اس کے لئے ہے جس کا گوشت کتے کھا جائیں!

وہ لوگ کہنے لگے کہ پھر اس کا یہ شعر سنیئے!

وما سمی العجلان الا لقولهم ۔۔۔ خذ القعب واحلب ایها العبد واعجل

ترجمہ: بنو عجلان کو عجلان کہلانے کی وجہ یہ کہ لوگ ان کے بڑے سے کہا کرتے تھے کہ "اے او غلام! پیالہ لے اور جلدی سے دودھ دوہ لا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: ہم سب غلام ہیں اور پھر "سید القوم خادمهم" یہ کوئی بری بات نہیں۔ وہ کہنے لگے یا امیر المومنین یہ تو ہماری ہجو ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: بھئی مجھے تو اس میں ہجو کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ وہ لوگ کہنے لگے تو آپ حضرت حسان بن ثابت سے پوچھ لیجیے۔ جب حسان سے پوچھا تو وہ کہنے لگے: یہ ہجو ہی نہیں، ان پر ایک مہلک وار کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے نجاشی کو قید کر دیا اور بعض روایات میں آتا ہے کہ اس پر حد بھی لگائی۔[لہٰ] ابن قتیبہ کی روایت ہے کہ یہ اشعار سن کر حضرت عمرؓ نے حسان اور ایک اور شاعر الحطیئہ (جو ہجو گوئی کی وجہ سے قید تھا، کو بلوایا اور اُن کی رائے معلوم کرنے کے بعد نجاشی کو دھمکی دی کہ اگر پھر ہجو کہی تو زبان کاٹ ڈالوں گا۔[لہٰ]

اس واقعہ سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ہجو گوئی میں تمیز نہ کر سکے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ خوب سمجھتے تھے لیکن دو چیزیں مانع تھیں۔

(۱) شریعت میں فیصلہ دینے کے لئے گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جب مقدمہ فنی نوعیت کا ہو تو کسی ماہرِ فن کا مشورہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے حسان اور الحطیئہ سے رائے طلب کی تاکہ وہ خود بحیثیت حاکم اور قاضی فیصلہ صادر کر سکیں۔ چنانچہ ابن رشیق نے اس موقع پر لکھا ہے کہ "وکان عمرؓ ابصر الناس بما قال النجاشی ولکن اراد ان یدرأ الحد بالشبهات"[لہٰ]

حضرت عمر نجاشی کے اشعار کو سب سے زیادہ سمجھتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ شک کا فائدہ دیتے ہوئے نجاشی حد سے بچ جائے ورنہ حسان یا حطیئہ باوجود صاحبِ فن ہونے کے حضرت عمرؓ سے بڑے عالم نہیں تھے۔

(۲) اس مقدمہ میں ایک طرف تمیم بن مقبل تھا اور دوسری طرف نجاشی اور دونوں شاعر تھے اور حضرت عمر دونوں کے شر سے محفوظ رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے یہ معاملہ حسانؓ کے سپرد کر دیا۔ ابن رشیق کہتا ہے کان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ عالماً بالشعر قلیل التعرض لاهله:[لہٰ] (حضرت عمرؓ شعر سے واقف تھے اور شعراء کے درپے کم ہوتے تھے) پھر ان اشعار کے مفہوم کی جو مزاحیہ توجیہات حضرت عمرؓ نے پیش کی ہیں وہ تو ان کی ظرافت طبع اور ادبی ذوق کی دلیل ہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ایک اور بھی ہجو گو شاعر تھا اور وہ ہے الحطیئہ یہ ایسا بدزبان اور خبیث اللسان تھا کہ اس کی ہجو سے کوئی بھی نہ بچا تھا حتیٰ کہ اس نے اپنے باپ، اپنی ماں اور خود اپنی بھی ہجو کہہ ڈالی تھی۔ حضرت عمرؓ نے حسان بن ثابت اور لبید بن ربیعہ کی رائے طلب کر کے ایک تہہ خانے میں بند کر دیا۔[لہٰ]

اس کے بعد الحطیئہ نے ایک قصیدہ لکھا جس میں حضرت عمرؓ سے نرمی برتنے اور رحم کھانے کی درخواست کی۔ اس قصیدے میں وہ حضرت سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

لہٰ کتاب العمدۃ ج ۱ ص ۵۲ ۔ لہٰ الشعر والشعراء ص ۷۹ ۔ لہٰ العمدۃ ج ۱ ص ۵۲

لہٰ العمدۃ ج ۱ ص ۔ لہٰ کتاب الشعر والشعراء ص ۲۸۶ تجرید الاغانی ج ۱ ص ۳۳۴، الموشح ص ۲۸۰

اعوذ بجدک انی امرء   سقتنی الاعادی سُمّا سجالا

ترجمہ:- میں تیرے دادا کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ میں ایک ایسا آدمی ہوں جسے دشمنوں نے پے در پے زہر کے پیالے پلائے ہیں۔

تحنن علیّ هداک الملیک   فان لکل مقام مقالا

ترجمہ:- خدا تجھے راہِ راست پر چلائے مجھ پر رحم کر کیونکہ ہر موقع کے لئے ایک بات ہوتی ہے (ہجو کا موقع تھا سو میں نے کر ڈالی۔ کیا میں اس موقع پر تعریف کرتا!!!

ظاہر ہے ان باتوں کا حضرت عمرؓ پر کیا اثر ہو سکتا تھا مگر شاعر بھی آخر شاعر ہوتا ہے، پتھر کو بھی موم کر دیتا ہے۔ الحطیئہ نے ایک اور قصیدہ لکھا جس میں وہ حضرت عمرؓ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے:

ماذا تقول لافراخ بذی مرخ   زغب الحواصل لا ماء ولا شجر

ترجمہ:- اے عمر! یہ بتا کہ ان معصوم بچوں کا کیا بنے گا جو بے آب و گیاہ وادی ذی مرخ میں یوں پڑے ہوئے ہیں جس طرح نازک پروں والے چھوٹے چھوٹے پرندے کے بچے!!؟

غادرت کاسبهم فی قعر مظلمة   فاغفر هداک ملیک الناس یا عمر

ترجمہ:- ان کی پرورش کرنے والے کو تو تو نے ایک تاریک گڑھے میں ڈال دیا ہے۔ اب ان کا کون ہے؟ اے عمر! تجھے خدا ہدایت بخشے مجھے معاف کر دے۔

حضرت عمرؓ پر ان الفاظ کا اتنا اثر ہوا کہ آپ رونے لگے اور پھر حکم دیا کہ الحطیئہ کو رہا کر کے میرے سامنے لایا جائے۔ صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی۔ حضرت عمرؓ نے کہا جاؤ استرا لے آؤ میں اس خبیث کی زبان کاٹتا ہوں تاکہ یہ پھر کسی بندۂ خدا کی ہجو کہہ کر اسے ایذا پہنچانے کے قابل ہی نہ رہے۔ لوگ جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ کا مقصد زبان کاٹنا نہیں بلکہ شاعر کو دھمکانا اور خاموش کرانا ہے چنانچہ سب لوگوں نے الحطیئہ سے کہا کہ امیرالمومنین سے معافی مانگو اور آئندہ خاموش رہنے کا وعدہ کرو۔ چنانچہ خاموش رہنے کا وعدہ کرنے پر حضرت عمرؓ نے شاعر کو رہا کر دیا اور تین ہزار درہم دے کر لوگوں کی عزت محفوظ کرا لی۔ اسی واقعہ کی طرف الحطیئہ اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

واخذت اطراف الکلام فلم تدع   شتما یضر ولا مدیحا ینفع

ترجمہ:- تو نے زبان بند کر دی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ہجو یا نفع بخش مدح کا موقع ہی نہیں چھوڑا۔

وحمیتنی عرض اللئیم فلم یخف   ذمی واصبح آمنا لا یفزع

ترجمہ:- یہاں تک کہ تو نے کمینے آدمی کی عزت بھی مجھ سے محفوظ کرا لی ہے۔ اب اسے میری مذمت کا کوئی ڈر نہیں رہا اور وہ بالکل مامون اور بے فکر ہو گیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے نہ صرف ادب و شعر میں گہری دلچسپی لی اور نقدِ شعر کا ایک خاص معیار قائم کیا بلکہ ادبا و شعرا کی سرپرستی بھی فرمائی۔ فقہ و اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والوں اور حفاظِ قرآن کی قدردانی کے علاوہ انھوں نے شعرا کو وظائف دیئے۔ ان کی ذاتی مشکلات کو حل کیا اور عطیات سے بھی نوازا۔ ایک دفعہ ایک شاعر سے اس قدر خوش ہوئے کہ انعام و اکرام سے نوازے بغیر نہ رہ سکے، مگر ایک درویش صفت خلیفہ کے پاس بھاری عطیات کے لئے دولت کہاں! اور پھر ایک بے مثال دیانتدار اور امین حکمران سرکاری خزانے کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت کیسے کر سکتا تھا چنانچہ شاعر کو اپنی قمیص اتار کر دے دی۔[2]

---

[1] تجرید الاغانی ج ۱ ص ۱۳۵

[2] الادب العربی وتاریخہ ص ۸۸

عربی شاعری میں جن خواتین نے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کی ان میں خنساؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔ خنساؔ کی تمام شاعری اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی مرثیہ گوئی پر مشتمل ہے اور علمائے ادب کا اس پر اتفاق ہے کہ مرثیہ کے فن میں خنساؔ کو تمام عرب شعراء پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے اسے کعبہ میں روتے اور چیختے دیکھا تو پاس جاکر تعزیت و تسلی کی۔ اس نامور خاتون کے چار بیٹے تھے اور چاروں اسلام لانے کے بعد جنگ قادسیہ میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے حضرت عمرؓ نے ان چاروں شہیدوں کی تنخواہ خنساؔ کے نام جاری کر دی۔[1]

لبیدؔ بن ربیعہ عامر دورِ جاہلی کے بڑے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اسلام لانے سے پہلے بھی بڑا متقی اور نیک خصلت انسان تھا اور اسلام کے بعد تو اس کے زہد و تدین پر خاص رنگ چڑھ گیا تھا۔ کوفہ و بصرہ کے آباد ہونے کے بعد لبیدؔ بھی کوفہ میں جا بسا تھا اور آخری دم تک وہیں رہا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے مغیرہؔ بن شعبہ کو حکم بھیجا کہ کوفہ میں موجود شعراء سے وہ کلام جمع کر کے بھیجیں جو انھوں نے زمانۂ اسلام میں کہا ہے۔ مغیرہؔ نے سب سے پہلے اغلبؔ عجلی کو امیر المومنین کے فرمان سے آگاہ کیا۔ اغلبؔ نے جواب میں یہ شعر پڑھا۔

لقد طلبت هنيئا موجودا　　　ارجزا تريد ام قصيدا

ترجمہ:۔ تم نے تو ایک بڑی خوشگوار فرمائش کی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ قصیدہ مطلوب ہے یا رجزیہ چاہتے ہو یعنی بہت کچھ کہا ہے!!

پھر جب لبیدؔ کو یہ حکم سنایا تو اس نے سورۂ بقر لکھ کر پیش کر دی اور کہا کہ شعر کے بدلے خدا نے مجھے یہ عنایت فرمادی ہے۔ مغیرہؔ نے تمام حالات حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجے۔ آپ کو لبیدؔ کی ادا بہت پسند آئی اور معلوم ہوتا ہے اغلب کی شاعرانہ تعلّی کو برا منایا چنانچہ مغیرہؔ کو لکھ بھیجا کہ اغلب کے روزینے میں سے گھٹا کر لبیدؔ کے وظیفے میں پانچسو کا اضافہ کردو۔ اغلب نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ حکم کی بجاآوری کا یہی صلہ ہے؟ اس پر حضرت عمرؓ نے لبیدؔ کے اضافے کے ساتھ اس کا وظیفہ بھی بحال کر دیا۔[2]

حضرت عمرؓ ایک عظیم خطیب اور ادیب تھے۔ ان کے خطبات اور مکاتیب کتب ادب و تاریخ میں محفوظ ہیں اور عرب ادباء نے حضرت عمرؓ کو بلند پایہ خطباء اور ادیبوں میں شمار کیا ہے۔ وہ شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور کبھی کبھی شعر کہہ بھی لیتے تھے۔ کتب ادب میں کچھ اشعار ملتے ہیں جو ان کی طرف منسوب ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

هون عليك فان الامور　　　بكف الاله مقاديرها

ترجمہ:۔ گھبرا نہیں کیونکہ تمام معاملات کا فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

فليس باتيك منهيها　　　ولا قاصر عنك مامورها

ترجمہ:۔ جو بات خدا نہیں چاہتا وہ تجھے کبھی پیش نہیں آئے گی اور جن معاملات کا وہ فیصلہ کر چکا ہے وہ رکنے والے نہیں۔

یہ اشعار بھی ان سے منسوب کئے جاتے ہیں:۔

لاشئ مما ترى تبقى بشاشته　　　يبقى الاله ويفنى المال والولد

ترجمہ:۔ دنیا میں نظر آنے والی اشیاء کی تازگی ہمیشہ نہیں رہے گی۔ البتہ خدا کی ذات باقی رہے گی، اور مال و اولاد فنا ہو جائیں گے۔

لم تغن عن هرمز يوما خزائنه　　　والخلد قد حاولت عاد فما خلدوا

---

[1] الاغانی، الفاروق ص ۲۳۳　　[2] الاغانی ج ۱۵ ص ۳۶۹

ترجمہ: ہرمزکو اس کے خزانے بے نیاز نہ کرسکے اور نہ قوم عاد کو بقا نصیب ہوئی۔

ولا سلیمان اذ تجری الریاح لہ　　والجن والانس فیما بینہا ترد

ترجمہ:۔ سلیمان بھی باقی نہ رہے۔ حالانکہ ہوا ان کے تابع تھی اور جن و انسان ان کی اطاعت کرتے تھے۔

حوض ہنالک مورود بلا کذب　　لابد من وردہ یوما کما وردوا

ترجمہ:۔ موت تو ایک حوض ہے جس میں سب کو اسی طرح وارد ہونا ہے جس طرح پہلے لوگ وارد ہو چکے ہیں۔

مرنے سے پہلے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

وما بی خوف الموت انی لمیت　　ولکن خوف الذنب یتبعہ الذنب

ترجمہ: مجھے موت کا کوئی ڈر نہیں کیونکہ وہ تو آنی ہی ہے، مگر خوف تو ان گناہوں کا ہے جو میں ساتھ لئے جاتا ہوں۔

حضرت عمرؓ کی شہادت "تاریخ اسلام کا عظیم المیہ ہے جس نے اسلامی دنیا پر تاریکی کی دبیز چادریں تان دیں۔ اور بقول ابن خلکان "اسلام کی عزت و اقبال مندی حضرت عمرؓ کے ساتھ دفن ہو گئی۔ اس حادثۂ فاجعہ پر شعراء نے آپ کے مرثیے لکھے ہیں جن میں حسان بن ثابت انصاری، شماخ بن ضرار اور عاتکہ کے نام قابل ذکر ہیں:

شماخ کہتا ہے:۔

فمن یسع او یرکب جناحی نعامۃ　　لیدرک ما قدمت بالامس تسبق

ترجمہ:۔ بعد میں آنے والے لوگ خواہ کتنی ہی کوشش کر گذریں، وہ تیرے کارناموں کو ہرگز نہیں پہنچ سکیں گے۔

حضرت عمرؓ کی بیوی عاتکہ بنت زید کہتی ہیں:۔

عین جودی بعبرۃ و نحیب　　لا تملی علی الامام النجیب

ترجمہ:۔ اے میری آنکھ اس شریف اور بزرگ امام وقت کی وفات حسرت آیات پر خوب آنسو بہا اور بین کر۔

عصمۃ الناس والمعین علی　　الدہر وغیث المنتاب والمحروب

ترجمہ:۔ وہ انسانوں کی پناہ مصائب میں ان کے مددگار تھے اور مصیبت زدوں اور ستائے ہوئے لوگوں کی فریاد رسی کرنے والے تھے۔

۱؎ العمدۃ ج ۱ ص ۳۲　　۲؎ اسد الغابہ ج ۴ ص ۷۴　　۳؎ ایضاً ص ۷۸

سمرسٹ ماہم
ترجمہ: فہمیدہ ریاض

زیبِ داستاں کے لیے

کہانی کا انحصار واقعات پر ہی ہوتا ہے لیکن افسانویت پیدا کرنے کے لیے واقعات کو خود مرتب کرنا پڑتا ہے۔

حقیقت ایک ناقص قصہ گو ہے۔ وہ بڑے منتشر انداز سے اور اکثر اصل آغاز سے بہت پہلے، کہانی کی ابتدا کر دیتی ہے اور لڑکھڑاتے ہوئے آخر اس طرح ختم کرتی ہے کہ انجام بہت ڈھیلا اور غیر متعین رہتا ہے اور کوئی خاص نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت کسی دلچسپ مقام تک پہنچ تو جاتی ہے مگر پھر اصل قصے کو معلق چھوڑ کر غیر متعلق باتوں میں الجھ جاتی ہے۔ حقیقت میں نہ تو کوئی نقطۂ عروج ہوتا ہے اور نہ وہ اپنے ڈرامائی تاثر کو قائم رکھ سکتی ہے۔

افسانہ نگاروں اور ادیبوں کا ایک اسکول اس خیال کا حامل ہے کہ حقیقت کی یہی روش افسانہ لکھنے کا صحیح طریقہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر حقیقت بے جوڑ ہوتی ہے تو افسانے کو بھی مربوط نہیں ہونا چاہئے کیونکہ افسانہ حقیقت کا ہی عکاس ہوتا ہے۔ زندگی میں واقعات بڑے اچانک اور غیر متعین ہوتے ہیں۔ لہذا ایک اچھی کہانی میں بھی واقعات غیر مسلسل اور بے جوڑ ہونے چاہئیں۔ کہانی کے واقعات میں اگر کوئی نقطۂ عروج ہو تو یہ بالکل غیر حقیقی ہوگا۔ زندگی کی طرح اصلیت کی طرح کہانی کو بہتے رہنا چاہئے اور خاموشی سے کسی دوسری کہانی میں گھل جانا چاہیئے۔ اگر کوئی افسانہ نگار اپنی کہانی میں کوئی موڑ پیدا کرے یا کسی غیر متوقع واقعے سے قاری کو متعجب کر دے تو اسے یہ لوگ قطعی غیر حقیقی اور مصنوعی گردانتے ہیں۔ ان کی اپنی کہانیوں میں اگر واقعات کسی ڈرامائی زاویے کی طرف جھکنے لگیں تو یہ اس سے بچنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ دراصل وہ پڑھنے والوں کو کوئی پوری کہانی نہیں سناتے بلکہ کہانی کے ضروری اجزا مہیا کر دیتے ہیں جس پر ہر منفرد قاری اپنی کہانی کھڑی کر سکتا ہے۔ اس قسم کے لکھنے والے عموماً اپنی کہانی کی ابتدا کسی بڑے معمولی اور غیر مخصوص واقعے سے کر دیتے ہیں۔ یہ افسانے ہر منفرد قاری کو اس واقعے کی اہمیت سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ کبھی تو وہ افسانے کو اس حد تک محدود کر دیتے ہیں کہ پوری کہانی میں صرف ایک کردار کا مبہم سا تذکرہ ہوتا ہے۔ ایک طرح سے وہ آپ کو پکانے کا سامان تو دے دیتے ہیں۔ اب آپ اسے کس طرح پکائیں اور یہ بھی کہ پکائیں کیا — یہ آپ پر منحصر ہے۔

افسانے کئی رنگوں میں لکھے جاتے ہیں، کئی طرح لکھے جاتے ہیں، اور مذکورہ بالا طرزِ تحریر ان میں سے ایک ہے۔ اس روش پر بعض بہت اچھے افسانے بھی تخلیق کئے گئے ہیں۔ چیخوف کو اس طریق کار پر پورا عبور حاصل تھا اور اس کی کہانیاں ایسے ہی لکھی گئی ہیں۔ طویل کہانیوں کی نسبت یہ طریقہ مختصر افسانوں کے لئے بہتر ہے۔ اگر پورے افسانے میں محض کسی کیفیت کا تجزیہ ہو، کسی مخصوص حالت یا ماحول کا بیان ہو تو ہماری توجہ محض پانچ چھ صفحات تک افسانے پر مرکوز رہ سکتی ہے۔ لیکن اگر کہانی طویل ہو تو پڑھنے والے کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے اسے ایک ڈھانچے کی ضرورت پڑے گی بہ الفاظ دیگر اس صورت میں کہانی کے لئے ایک پلاٹ رکھنا ناگزیر ہو جائے گا۔

اب جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے کسی بھی پلاٹ میں چند لازمی خاصیتیں ہوتی ہیں جو کہ تین عناصر پر مشتمل ہیں۔ ابتدا، وسط اور اختتام

[illegible] پنے نہیں مکمل ہوتا ہے۔ وہ کچھ ایسے حالات سے شروع ہوتا ہے جن کا کوئی نتیجہ بنا ہوتا ہے۔ ان حالات کی وجہ تو نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔ [illegible] نتائج نہیں۔ اور پھر یہ نتائج چند اور [illegible] ت کی وجہ بن جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ قائم رہتا ہے حتیٰ کہ ایسا مقام آ جائے جب قاری کی مکمل تسکین ہو جاتی ہے [illegible] کہانی [illegible] واقعے کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مطلب اس کا یہ ہوا کہ کہانی کو کسی خاص مقام پر شروع ہو جانا چاہئے اور مخصوص مقام پر ختم ہونا چاہیے۔ اس طرح کہانی ایک نامعلوم سی غیر متعین لکیر پر بھٹکنے کے بجائے ایک واضح قوس بناتی ہے۔ اگر خطوط کے ذریعے کہانی کا اُتار چڑھاؤ ظاہر کیا جائے تو یہ ایک نیم دائرے کی شکل میں ہوگا

یہ ثابت کرتا ہے کہ کہانی میں نقطۂ عروج کا موجود ہونا کوئی نقص نہیں بلکہ بلاشبہ ایک خوبی ہے۔ وہ افسانویت جو چیخوف کے پیروؤں کو کھٹکتی ہے اس وقت ہی قابل مذمت ہے جب کہ وہ مبالغے کی حدیں پھلانگ جائے لیکن اگر افسانویت خود کہانی کا ایک حصہ بن جائے اور منطق کے لحاظ سے درست ہو تو کسی بھی تخلیق کے شاہکار بننے میں مانع نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نقطۂ عروج میں ایسی کوئی غیر فطری بات نہیں بلکہ یہ تو ایک قاری کا فطری تقاضہ ہے۔ ہاں اگر گزشتہ واقعات کا موجودہ واقعات سے کوئی ربط نہ ہو اور کہانی کا ارتقا ناقابل یقین ہو تو اسے بےشک غلط کہا جا سکتا ہے لیکن صرف اس بنا پر نقطۂ عروج سے گریز کرنا کہ زندگی میں واقعات غیر متاثرانہ انداز میں اختتام پذیر ہوتے ہیں سراسر زیادتی ہے۔ یہ موقف کہ افسانے کو حقیقت کی نقل ہونا چاہیے۔ اول و آخر محض ایک موقف ہی تو ہے۔ یہ [illegible] فکر فن مصوری میں موجود ہے لیکن اگر پرانے ماسٹروں [illegible] مصوروں سے مقابلہ کیا جائے تو اس مدرسۂ فکر کی تصاویر بہت خالی خالی سی محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً کلاڈ کی تصویروں اور موپاساں کی طرز تحریر میں جو مماثلت پائی جاتی ہے اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ موپاساں کی کہانیاں دوسری کہانیوں سے زیادہ عرصے تک زندہ رہیں گی۔ بلکہ درحقیقت موجودہ زمانے میں ہی پچاس سال قبل کے روسی متوسط طبقے کی معاشرت میں ہماری دلچسپی گھٹنے لگی ہے اور چیخوف کے قصے عموماً ایسے جاذب توجہ نہیں ہوتے جتنے [illegible] یا [illegible] فرانس کی کہانیاں ہیں، کہ ہماری ذاتی دلچسپیوں کو چھوڑ کر محض کرداروں سے ہماری توجہ وابستہ رکھتی ہیں۔

افسانہ نگار کے جس طرز کا میں نے یہاں ذکر کیا ہے اس کے حامل زندگی کے ساحل سے صرف ان واقعات کے موتی چنتے ہیں جو موثر ہیں، ڈرامائی ہیں اور جن کا اتار چڑھاؤ ہماری توجہ کھینچ سکتا ہے۔ یہ افسانے حرف بحرف حقیقت کی نقل نہیں ہوتے مگر زندگی کے اتنے نزدیک ضرور رہتے ہیں کہ قاری کے ذہن کو بے یقینی کا جھکولا نہیں محسوس ہونے پاتا۔ یہ افسانہ نگار واردات میں ردوبدل اور کانٹ چھانٹ بھی کر سکتے ہیں اور ان حقائق کو جو ایک دلچسپ اور جاذب توجہ تمثیل پیش کر سکتے ہیں، یہ افسانے اور بھی نکھار دیتے ہیں۔ یہ صناعی ہے، تصنع نہیں۔

ملک احمد نواز

اخبار صبح صادق

مدراس کا ایک اخبار:

اخبار صبح صادق کا اجرا ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق[1]، بدر شکیب[2]، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید[3] اور سید محمد اشرف کی تحقیق کے مطابق اس اخبار کا اجرا ۱۸۵۹ء[4] میں ہوا۔ اردو کے مشہور محقق، نصیر الدین ہاشمی[5] اور امداد صابری[6] اس کا سنہ اجرا ۱۸۷۰ء بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اسے ۱۸۶۶ء کا اخبار قرار دیتے ہیں۔

میرے پیش نظر اس وقت اس اخبار کی جلد ۲، شمارہ ۱۲ تا ۲۹ (اکتوبر ۱۸۶۵ء/۱۹ جمادی الاول ۱۲۸۲ھ تا ۳۱ مارچ ۱۸۶۶ء/۱۳ ذوالقعد ۱۲۸۲ھ) موجود ہے۔ اگر عام قاعدے کے مطابق ہر سال کی ایک جلد قرار دی جائے تو تاریخ اجرا غالباً ۱۸۶۴ء ہوگی لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ شروع میں یہ اخبار ہفتہ وار[7] تھا۔ اس کے بعد دس روزہ[8] ہوگیا۔ وقفہ اشاعت کی تبدیلی کی وجہ سے اس اخبار کے اجرا کا صحیح تعین مشکل ہے۔ بہرکیف یہ اخبار ۱۸۵۹ء میں زندہ تھا۔ اس اخبار کے متعلق ایک اشتہار کوہ نور اخبار ۱۸۵۹ء میں ملتا ہے۔ اصل عبارت مندرجہ ذیل ہے:

اشتہار

اس ہفتہ میں ایک نیا اخبار نمبر ۱۔ مطبوعہ ۴ رمئی سنہ حال جس کا نام صبح صادق ہے، مدراس سے ہمارے پاس پہنچا۔ وہ ورقہ کاغذ مصری رام پوری، میانہ تختہ پر چھپتا ہے۔ خبریں بھی اس میں زیادہ اطراف نزدیک و دور کی چھپتی ہیں۔ عبارت اردو ہے۔ صفحہ اوس کا عرض و طول میں بڑا ہے۔ ایک صفحہ تین کالم میں تقسیم ہے۔ غرض کہ حقیقت میں بجائے خود صبح صادق ہے بلکہ اگر روز روشن کہیں تو بجا ہے۔

(کوہ نور۔ لاہور۔ ۲۷ رمئی ۱۸۵۹ء۔ ج ۱۰۔ نمبر ۲۲۔ صفحہ ۲۲۳، کالم ۱)

---

[1] انیسویں صدی میں مدراس کے اردو اخبار۔ رسالہ اردو۔ اپریل ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۱۷۱ — ۲۲۳ (متعلقہ صفحہ ۱۷۷)

[2] اردو صحافت۔ بدر شکیب۔ کاروان ادب۔ کراچی۔ ۱۹۵۲ء۔ ص ۱۵۵

[3] صحافت — پاکستان و ہند میں۔ عبدالسلام خورشید۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔ ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۰۵۔

[4] سوانح عمری اخبارات۔ ج ۱۔ (اختر شاہنشاہی) اختر پریس لکھنؤ۔ ص ۱۹۹۔

[5] مدراس میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی۔ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس۔ ۱۹۳۸ء۔ ص ۴۳۔

[6] تاریخ صحافت اردو۔ جلد دوم، حصہ اول۔ ۱۹۳۷ء۔ ص ۱۴۹۔

[7] اردو صحافت کی ابتداء اور ترقی۔ رسالہ مصنف۔ ج ۱۔ نمبر ۱۔ فروری ۱۹۴۲ء۔ ص ۱۱۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اخبار صبح صادق کا نام تک نہیں لکھا۔ ڈاکٹر موصوف کی اصل عبارت یہ ہے: "کچھ دنوں کے بعد مدراس سے ایک اور اردو اخبار جلد شمس شعاع (رفقوت غلط ہے اصل لفظ شعاعت ہے) کی ادارت میں نکلنے لگا۔۔۔۔"

[8] خطبات گارساں دتاسی خطبہ نمبر ۱۵۔ ۲ دسمبر ۱۸۶۵ء ص ۴۹۴ [9] خطبات گارساں دتاسی۔ خطبہ نمبر ۱۶۔ ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء۔ ص ۵۱۹۔ ۵۲۰

افسوس ہے کہ مندرجہ بالا اشتہار میں اخبار صبح صادق کا صرف نمبر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ جلد کا ذکر نہیں۔ علاوہ ازیں وقفۂ اشاعت کا ذکر بھی نہیں۔ ان دو چیزوں کی کمی کی وجہ سے اس کے اجرا کا صحیح تعین مشکل ہے۔ فی الحال ہمیں اسے ۱۸۵۶ء تک محدود رکھنا ہوگا۔

جائے اشاعت — افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق کے مطابق یہ اخبار شاہ محمد صادق شریف، مدراس کی زیر ادارت مطبع شرفیہ سے جاری ہوا۔ یہ مطبع کہاں اور کس جگہ واقع تھا، اس کے متعلق محمد اشرف (سوانح عمری اخبارات، ص ۱۵۹) حسب ذیل معلومات بہم پہنچاتے ہیں:

"...... مدراس: متصل مسجد والا جاہی، علاقہ ترپلکیری؛ مالک: شاہ محمد صادق حسینی تخلص شریف؛ مہتمم: محمد جعفر تخلص حریف؛ پرنٹر: غلام محی الدین تخلص حنیف؛ اجراء: جنوری ۱۸۵۹ء"

میرے پیش نظر جو شمارے ہیں (جلد ۱۲، شمارہ نمبر ۱۲ تا ۲۶، ۱۰ / اکتوبر ۱۸۶۵ء تا ۳۱ / مارچ ۱۸۶۶ء) وہ مطبع شرفیہ کی بجائے مطبع رحمانی سے شائع ہوئے ہیں۔ اور مہتمم و مالک مطبع و اخبار: سید محمد عبدالرحمٰن سقاف ہیں۔ ہر شمارہ کے آخری صفحہ کے اختتام پر، حاشیہ کے نیچے مندرجہ ذیل عبارت تحریر ہے۔

"مدراس ترپلکیری محلہ جم بازار نمبر مکان ۲، مطبع رحمانی میں اہتمام سے سید محمد عبدالرحمٰن سقاف کے ...... چھپا گیا۔"

سرِ ورق — موسیو گارساں دتاسی (۱۷۹۴ء – ۱۸۷۸ء) کی کتاب ہندوستانی ادب از ۱۸۵۰ء تا ۱۸۷۷ء کا اردو ترجمہ خطبات گارساں دتاسی کے نام سے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ انجمن ترقی اردو کے اس ترجمہ شدہ خطبات میں اخبار صبح صادق کے سرورق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی صحت محل نظر ہے۔

سرورق کے چاروں طرف سرخ رنگ کے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ ان بوٹوں کے گرد بیرونی دائرہ سولہ (۱۶) ٹکڑوں میں منقسم ہے جس میں چاروں طرف آٹھ اشعار درج ہیں لیکن اردو ترجمہ میں ان اشعار کی تعداد صرف چار بتائی گئی ہے۔ مترجم کو یہ غلط فہمی گارساں دتاسی کے اس فرانسیسی لفظ Huitvers سے ہوئی ہے۔ مترجم نے Vers کا مفہوم مصرع لیا ہے اور اس طرح Huitvers کا ترجمہ آٹھ مصرع یعنی چار اشعار کیا ہے۔ حالانکہ گارساں دتاسی نے ان آٹھ اشعار کا فرانسیسی زبان میں قوسین کے اندر مکمل ترجمہ دیا ہے۔

اسی طرح اخبار کے سرورق پر مہتمم اور مالک کا نام عبدالرحمٰن سقاف لکھا ہے۔ گارساں دتاسی کی اصل کتاب میں عبدالرحمٰن سقاف کو مندرجہ ذیل ہجوں میں لکھا گیا ہے "ABDUR RAHMAN SACCÂF" لیکن اردو ترجمہ میں سقاف کی بجائے شفاف ہے۔ قوی امکان ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے کیونکہ اس پر تین نقطے زائد ہیں۔

یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انجمن ترقی اردو کے اس ترجمے میں طباعت کی مندرجہ بالا غلطی کا اعادہ نصیر الدین ہاشمی[۴]، ڈاکٹر محمد عبدالحق[۵]، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید[۶]، بدر شکیب[۷]، امداد صابری[۸] اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی[۹] نے بھی کیا ہے۔

۱۔ گارساں دتاسی۔ ہندوستانی ادب از ۱۸۵۰ء – ۱۸۷۷ء۔ پیرس۔ چاپ دوم۔ ۱۸۷۴ء

۲۔ خطبات گارساں دتاسی میں ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۹ء کے خطبات شامل ہیں۔ ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۲ء اور ۱۸۷۴ء تا ۱۸۷۷ء تک کے خطبات مقالات گارساں دتاسی کے عنوان سے دو جلدوں میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے ۱۹۴۳ء میں شائع

۳۔ خطبات گارساں دتاسی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)۔ ۱۹۳۵ء۔ ص ۵۱۹ – ۵۲۰

۴۔ نصیر الدین ہاشمی۔ مدراس میں اردو۔ حیدرآباد دکن۔ ۱۹۳۸ء۔ ص ۲۴۴ – ۲۴۷ — ۵۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق۔ انیسویں صدی میں مدراس کے اردو اخبار۔ رسالہ اردو۔ اپریل ۱۹۴۱ء

۶۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ صحافت پاکستان و ہند میں۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۰۵ — ۷۔ بدر شکیب۔ اردو صحافت۔ کراچی۔ ۱۹۵۲ء۔ ص ۱۵۵

۸۔ امداد صابری۔ تاریخ صحافت اردو۔ ج ۲۔ ح ۔ ص ۱۴۹ — ۹۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ اردو کے انیسویں صدی کے اخبارات۔ رسالہ مصنف۔ جلد اول نمبر ا۔ فروری ۱۹۳۲ء۔ ص ۱۱۰

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ سرورق کی زمین پر خوبصورت بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں اور بیچوں بیچ دو بیضوی (محراب نما) دائرے خالی چھوڑے گئے ہیں۔ بیرونی دائرہ بہت چھوٹا ہے اور سولہ خانوں میں منقسم ہے۔ ان خانوں میں مندرجہ ذیل آٹھ اشعار درج ہیں ؎

"اعجاز بیاں سے ہے سروکار — عیسیٰ نفس اس کے ہیں خریدار
جو لوگ کہ قدرداں ہیں اس کے — لیتے ہیں وہ دے کے زر کے توڑے

اندھیر نہ ہو کبھی وہاں پر — صبح صادق، یہ ہو جہاں پر
جس بزم میں آ گئے یہ پرچے — ہونے لگے اس طرح کے چرچے
الماس کے ہیں ورق سراسر — ہیں سارے سطور سلک گوہر
ہے بہرِ فوائد خریدار — سبحان اللہ خوب اخبار
اللہ سے ہے مدام امید — فیض اس کے ہوں مثل نور خورشید
جب تک خورشید ہو فلک پر — بر روئے زمیں یہ ہو چمک پر"

اندرونی دائرہ بڑا ہے۔ پیشانی پر:-

"۱۲۷۰ھ ہجری"

درج ہے اور اس کے نیچے خطِ طغرا میں عنوانِ اخبار:-

"اخبار صبح صادق مدراس"

اس کے بعد جلد کا نمبر:-

"جلد ۱۲"

پھر بخطِ انگریزی عنوانِ اخبار جس کے نیچے قابلِ غور ہیں:

" The Soobhi Saudeck Madras "

بعد ازاں ضمنی عنوان:

"اطلاع اخبار صبح صادق"

اس کے نیچے مندرجہ ذیل فارسی کے دو اشعار ہیں ؎

"نقطۂ وحدت چو قد افراختہ — از پئے احمد الفی ساختہ
تا نہ نظر بر قدش افراختند — قائمۂ عرش نیفراختند"

اس کے بعد حسب ذیل عبارت ہے:-

"یہ اخبار مہینے میں تین بار، قیمت ہر نمبر ۴ر، منفعت مفید عام معنت، مفید خاص سطر پیچھے ۴ر مبلغ بسبیل ہنڈوی یا ٹکٹ ہائے ڈاک، بصیغۂ رجسٹری روانہ کریں۔ مکتوب بنام بندۂ ایزدی حافظ سید محمد عبدالرحمٰن سقاف مہتمم و مالک مطبع و اخبار۔ ز ہیچ دیں خریدار اخبار کو ضرور بعد تبدیل مکان سے بروقت خبر رساں ہو دیں۔ جمیع نوابان ذی شان و راجگان عالی مکان سے ماہوار فی پرچہ ۴ر روپیہ پیشگی سالانہ ۲۵ روپیہ

تا بعد ۸ روپیہ۔ حضرات خریداران اندرون شہر سے ماہوار ۱ روپیہ پیشگی ششماہی ۵ روپے تا بعد ششماہی ۶ روپیہ پیشگی سال تمام ۹ روپیہ۔ بعد سال ۱۲ روپیہ۔ حضرات خریداران بیرون شہر ماہوار ۱ روپیہ پیشگی ششماہی ۶ روپے تا بعد ششماہی ۷ روپیہ پیشگی سال تمام ۱۲ روپے۔ بعد سال ۱۵ روپیہ۔ شائقین کم استطاعت سے ۲ روپیہ۔ سالانہ محصول ڈاک ۱۲ روپیہ۔ بطور پیشگی ایک ماہ کے اندر پہنچا دیں۔ ورنہ ماہوار ایک روپیہ ۳ مع محصول ڈاک اور بعد سال تمام ۱۵ روپیہ لئے جاویں گے۔ (خط کشیدہ الفاظ سبز جلی رقم ہیں)

ضخامت و اشاعت

اخبار صبح صادق ۸½ × ۱۱½ کے سائز پر چھپتا تھا۔ اس کی ضخامت ۲ صفحات اور اس کے ضمیموں کی ۸ صفحات تھی۔ یہ بڑی تقطیع پر دو کالموں میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے بعض شماروں اور ضمیموں کے ابتدائی صفحات کے کالموں اور خبروں کے عنوانات کے اردگرد ۔ کے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ شروع میں یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور ہر سہ شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ (خطبات گارساں دتاسی، ص ۴۴)[1] لیکن بعد میں یہ اخبار مہینے میں تین بار شائع ہونا شروع ہوا۔ اور بارہ صفحات پر مشتمل تھا (خطبات گارساں دتاسی ص ۱۰۵-۲۰۹) مؤخرالذکر بیان کی تصدیق پیش نظر فائل سے ہوتی ہے۔

خبروں کی سرخی۔ شہروں، ملکوں، اور ریاستوں کے نام پر دی جاتی تھی۔ مثلاً "خبر ترک"، "خبر بمبئی" بعض اوقات عنوانات کے ساتھ لفظ "خبر" نہیں ہوتا۔ صرف ملک، شہر یا ریاست کا نام ہوتا ہے مثلاً بھوٹان، بھوپال، کلکتہ، مصر، کابل، روس، روم، اجمیر وغیرہ۔

خبریں عموماً ہمعصر اردو اور انگریزی اخبارات کے حوالہ سے دی جاتی تھیں۔ جس اخبار سے خبر نقل کی جاتی تھی اس کی مطبوعہ تاریخ کا خاص التزام رکھا جاتا۔ یہاں چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ مدراس ٹیمس (ٹائمز) مطبوعہ ۲۸ ستمبر بحوالہ انگلش مین مورخہ ۲۳ ستمبر کے مطالعہ سے ظاہر ہوا......

۲۔ اودھ گزٹ مورخہ ۳ ستمبر سے بحوالہ انگلش مین معلوم ہوا کہ......

بعض خبروں کے ابتدائی فقرے بڑے دلچسپ ہیں جن سے پوری خبر کے مفہوم کا پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ راقم اخبار ٹیمس (ٹائمز) کا بیان ہے "ناسفتا فزا داستان ہے......

۲۔ صاحب انگلش مین کا بیان ہے، فساد تازہ کا اعلان ہے....

۳۔ ٹیمس (ٹائمز) آف انڈیا کی تحریر ہے، حسرت افزا تقریر ہے......

اردو اخبارات میں تجارتی اشتہارات وغیرہ کا رواج بہت زیادہ نہیں تھا۔ صرف اخبار یا مطبع والے جو کتاب شائع کرتے اسی کا اشتہار شائع ہوتا۔ علاوہ ازیں بعض ہمعصر اخبارات کے اجرا کے اشتہار بھی ہوتے، جو تحقیق کے سلسلے میں نہایت اہم ہیں۔ ان میں سے بعض اخبارات اب بالکل ناپید ہو چکے اور ان کا کہیں وجود تک نہیں۔ ان اخباروں کے اشتہارات۔ دیگر ہمعصر اخباروں سے مل جاتے ہیں جن سے کم از کم ان کی کتابیاتی تفصیلات ---- یعنی قیمت، مقام، تاریخ اجرا، وقفہ اشاعت اور مہتمم وغیرہ کا پتہ چل جاتا ہے۔ — اسی طرح ان نایاب اخبارات کا زمانی تعین کرنے میں آسانی رہتی ہے۔

اخبار صبح صادق کے پیش نظر فائل میں صرف تین اشتہارات ہیں۔ ان میں سب سے اہم اشتہار "اخبار کرتان" کے متعلق ہے۔ اس اخبار کا ذکر گارساں دتاسی اور شمس العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق[2] نے بھی کیا ہے۔ لیکن اخبار کی قیمت، مہتمم اور مطبع کا ذکر مذکورہ بالا حضرات نے نہیں کیا۔ اصل

---

[1] گارساں دتاسی۔ خطبات گارساں دتاسی ص ۱۰۵

[2] افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق "انیسویں صدی میں مدراس کے اردو..." رسالہ اردو، اپریل ۱۹۴۹ء ص ۱۸۴ - ۱۸۵

اشتہار مندرجہ ذیل ہے:

"اشتہار اخبار کرنان۔ ایک اخبار موسوم باخبار کرنان مطبع انوری سے چھپ کر ہمارے پاس آیا۔ قابل دید لائق شنید ہے۔ مہینے میں تین بار بزبان اُردو خوش خط بارہ صفحہ پر چھپتا ہے۔ مہتمم اس کے محمد اکبر صاحب ہیں۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے تک ماہوار (ا) جوانہ مقرر ہے۔ جس صاحب کو لینا اس اخبار کا منظور ہے وہ درخواست مطبع انوری میں بھیج کر منگا لیں۔ کرنان کے دو معنی ہیں ۔۔۔ ایک محمد قاسم صاحب تاجر مقیم بنگلور کا لقب ہے۔ دوسرے معنی از روئے شمس اللغات صبح و شام ہے۔ اس اخبار کی تعریف زیادہ ہے پھر ہم کیا زیادہ تعریف کریں۔ ؎

حسن و جمال ذاتی، دشمن زیب عارضی　　سرمہ غبار خاطر است چشم مارا"

(اخبار صبح صادق مدراس۔ جلد ۱۲، شمارہ ۱۲۰۔ ۱۹ جمادی الاول ۱۲۸۲ھ / ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۵ء ص ۲، کالم ۱)

تحریکِ آزادی

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اخبار صبح صادق کے عام سیاسی و دینی نقطۂ نظر سے بھی متعارف کرایا جائے۔ اس زمانے کا اہم ترین واقعہ وہ تحریکِ آزادی ہے جو سید احمد شہید کی زیر سرکردگی مسلمانوں کے سیاسی و دینی احیا کے لئے منظرِ عام پر آئی۔ یہ اخبار تحریک آزادی کا سخت مخالف تھا۔ آزادی کے علمبرداروں کو "ذات شریف" اور جد وجہد آزادی کو "فتنہ" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ مجاہدین کی ذات اور مذہب میں اسے "فتنہ و فساد" نظر آتا ہے۔ نیز وہ سید احمد شہید اور حضرت اسمٰعیل شہید کے مذہبی خیالات کو "مکروہ" خیال کرتا ہے۔

• چنانچہ جلد ۱۲، شمارہ ۱۹ (۲۰ دسمبر ۱۸۶۵ء) شمارہ ۲۰ (۳۱ دسمبر ۱۸۶۵ء) اور شمارہ ۲۱ (۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء) میں مولانا محمد علی رام پوری کی مدراس میں آمد، مدراس کے لوگوں کی مخالفت، لفظ وہابی کی تشریح، ستھانہ، اکبر شاہ، مبارک شاہ، عمران شاہ اور سید عمر کے متعلق بالترتیب حالات ملتے ہیں۔

سید احمد شہید نے مولانا محمد علی رام پوری اور مولانا ولایت علی صادق پوری کو میدانِ جہاد سے مدراس اور دکن میں تبلیغ کے لئے بھیجا۔ ۱۲۴۴ھ / ۲ جولائی ۱۸۲۹ء کو مولانا محمد علی حیدر آباد سے مدراس پہنچے اور ملا بحر العلوم کے فرزند مولوی عبدالرب کے مدرسے میں رہائش اختیار کی۔ یہاں کے تنگ نظر علما نے آپ کے ساتھ مناظرے شروع کیے۔ جن میں مولانا جمال فرنگی محلی، مولوی اسلمی اور ارتضا علی پیش پیش تھے۔

(مسلسل)

آغا یمین

لاہور کا پہلا فارسی شاعر

تحقیقی مقالہ لکھنے والے کا ڈھنگ کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ مضمون کی ترتیب کے ساتھ ساتھ جو نکات ابھرتے ہیں، اس کا ذہن انھیں زیرِ قلم لانے کی اس وقت تک اجازت نہیں دیتا جب تک کہ وہ ٹھوس اور مستند دلائل پر مبنی نہ ہوں۔

یہی مسئلہ یہاں درپیش ہے جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لاہور کا پہلا فارسی شاعر فلاں ہے تو تحت الشعور قاری یا سامع کے ذہن میں یوں کھٹکا ہوتا ہے کہ صاحب، ویسے تو ہم آپ کی بات ماننے کو تیار نہیں، البتہ اس کے لئے کوئی ٹھوس اور مستند دلائل پیش کیجئے تو بات بنتی ہے۔

لہٰذا اس سے پہلے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ لاہور کا پہلا فارسی شاعر کون ہے؟ —— اور وہ کیا دلائل ہیں جن کی رو سے ہم اسے ہی لاہور کا پہلا فارسی شاعر قرار دیتے ہیں، اس امر کی تحقیق کرنا لازم ہوگا کہ اس سرزمین پاکستان و ہند میں فارسی شاعری کا وجود و ورود کب —— اور کس طرح ہوا؟ —— پھر یہ بھی جاننا ضروری ہوگا کہ خود فارسی زبان کی کیا عمر ہے؟ —— اور اس نے کہاں وجود پایا؟

اس ضمن میں ہم عصر حاضر کے ایرانی مصنف ڈاکٹر رضازادہ شفق (جو حال ہی میں اسلامی کلوکیم کے موقع پر پاکستان بھی تشریف لائے تھے) کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ آپ فارسی زبان کی عمر ان الفاظ میں بتاتے ہیں[1]:

"پیداست کہ زبان پہلوی در این مدت تغییراتی پیدا کردہ و بتدریج زبان فارسی کنونی منقلب شد تا اینکہ فارسی دری بعد از ورود اسلام رواج آمد۔"

جیسا کہ مندرجہ بالا حوالے سے عیاں ہے کہ جب فارسی زبان کا وجود ہی دورِ اسلام کے بعد ہوا تو بہرحال پاکستان و ہند کی سرزمین میں فارسی زبان کا وجود و ورود اسلام سے پہلے ناممکن تھا۔

سب سے پہلے اس سوال کا جواب کہ اس برصغیر میں فارسی زبان کا ورود کب؟ —— اور کس طرح ہوا؟ —— بعض مورخین کی ذاتی رائے کی روشنی میں یوں ملتا ہے کہ اس سرزمین میں فارسی زبان کا ورود محمد بن قاسم کے حملے سے ہی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایم عبدالغنی اپنی تصنیف Pre-Moghal Persian in Hindustan میں رقم طراز ہیں[2]:

"Mohammad Bin Qasim's forces were collected in Shiraz and they consisted largely of Persian soldiers — and on that account Persian must have been spoken in the newly conquered land."

ایم عبدالغنی نے محض اس بنا پر کہ محمد بن قاسم نے شیراز سے فوج کشی کی اور چونکہ زیادہ تعداد میں وہ فوجی ایرانی تھے اس لئے

---

[1] تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۲۰ تصنیف ڈاکٹر رضازادہ شفق۔ چاپ موسسہ انتشارات امیر کبیر ۱۳۴۲۔ تہران۔ ایران

[2] "Pre-Moghal Persian in Hindustan" by M. Abdul Ghani, p: 60.

یہ مفروضہ پیش کیا کہ سندھ میں فارسی زبان کا ورود بھی انہی ایرانی فوجیوں کی آمد کے ساتھ ہوا ہوگا۔

اس ضمن میں ہمیں صوبہ سندھ کے گزیٹیر (Gazettere) میں ایک اور مفروضہ بھی ملتا ہے۔ اس گزیٹیر کا ایڈیٹر ای۔ اے۔ ایٹکن ایک عربی جغرافیہ داں اصطخری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے:[۵۱]

" About 951 A.D. the geographer "Istakhri" described Mansura as more fertile and also more populous than Multan. He gives us a glimpse of common life in the note that — The people of Multan wear trousers, and most of them speak Persian and Sindhi as in Mansura."

ہوسکتا ہے کہ مندرجہ بالا بیانات کے مطابق محمد بن قاسم کی فوج کے ساتھ ایرانی فوجی سندھ میں آباد ہوئے ہوں لیکن اس بات کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی کہ اس زمانے میں سندھ یا پاکستان کے کسی اور خطے میں فارسی زبان کی ترویج بھی ہوسکی ہو جب اس ضمن میں کوئی تاریخی شواہد نہیں ملتے تو ظاہر ہوا کہ مندرجہ بالا بیانات محض مفروضات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ اس کے برعکس محمد بن قاسم کے حملے کے بعد سندھ میں عربی زبان کی ترویج کے شواہد ضرور ملتے ہیں۔ حقیقت بھی یوں ہے کہ ہر ملک میں حکمراں قوم کی زبان ہی رواج پایا کرتی ہے بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے کے کچھ عرصہ بعد وہ فارسی زبان جو وقتی طور پر شیراز سے نکل کر ایرانی فوجیوں کے ساتھ سندھ میں آئی تھی، ان کے ساتھ ہی واپس چلی گئی ہو۔ ہم اپنے اس بیان کی دلیل میں ڈاکٹر سدارنگانی کی جدید تحقیق پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سدارنگانی مذکورہ عربی جغرافیہ داں اصطخری کے بعد کے دو اور مشہور عربی جغرافیہ داں ابن حوقل اور مقدسی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:[۵۲]

"The evidence of Ibn-e-Hauqal and Maqdsi, two famous Arab geographers of the tenth century A.D. is sufficient to discredit such surmise. Both these reviewers have placed it on record that the languages current in Sind during their days were Arabic and Sindhi."

مذکورہ تاریخی شواہد سے ظاہر ہوا کہ اصطخری کے بعد کے دونوں عربی جغرافیہ داں اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے زمانے یعنی دسویں صدی عیسوی میں سندھ کی مروجہ زبانیں عربی اور سندھی تھیں۔ اگر فارسی زبان مروج ہوتی تو یقیناً اس کا بھی ذکر ضرور کیا جاتا۔ یہ اصطخری کے بعد کے جغرافیہ داں ہیں اس لئے ان تاریخی شواہد کے تحت ہمارا یہ بیان کہ فارسی زبان ایرانی فوجیوں کے ساتھ جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی، درست ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ مذکورہ شواہد کی روشنی میں وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ سرزمین سندھ میں دسویں صدی عیسوی تک فارسی زبان رائج نہ تھی۔

---

۵۱ "Gazettere of the Province of Sindhi", compiled by E.A. Aitkin Printed in Mercantile Steam Press – Karachi. page: 91.

۵۲ "Persian Poets of Sindh" by Dr H.I. Sadarangani. Published by "Sindhi Adabi Board" – Karachi 1959. Chapter I, p: 5

حقیقت بھی یوں ہے کہ اس برصغیر پاکستان و ہند میں صحیح معنوں میں فارسی زبان کا ورود دسویں صدی عیسوی کے بعد گیارہویں صدی عیسوی یعنی دورِ غزنوی میں ہوا اور جس جگہ ہوا وہ پنجاب کا خطۂ لاہور ہے۔

آلِ سبکتگین کا بانی ناصر الدین سبکتگین بقول[1] صاحبِ مفتاح التواریخ ۳۶۶ھ ہجری میں غزنہ میں تخت نشین ہوا۔ پھر بائیس سال بعد اس کا بیٹا محمود غزنوی ۳۸۸ھ ہجری میں کمال تزک و احتشام سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ دودمانِ غزنوی کا وہ چراغ ہے جس نے فارسی شعر و ادب کو جلا بخشی اور یہی وہ غزنوی دور ہے جب ایران میں فردوسی طوسی، عنصری اور منوچہری ایسے جلیل القدر شعرا نامور ہوئے۔ جب اس فاتح اعظم نے ایران اور افغانستان کی سرحدوں کو عبور کر کے برصغیر پاکستان و ہند کا رخ کیا تو سب سے پہلے پنجاب کو ہی فتح کیا اور پنجاب فتح ہونے کے بعد بقول[2] ڈاکٹر وحید مرزا ۴۱۲ھ مطابق ۱۰۲۱ء میں غزنہ کے علاوہ لاہور بھی غزنویوں کا سیاسی اور ثقافتی مرکز بن گیا، لہٰذا غزنوی حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ترکی، افغانی اور ایرانی ادیب اور شاعر بھی آتے رہے اور بعض تو یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ حکومت کی رسمی اور درباری زبان فارسی تھی اس لئے فارسی دانوں کی ایک کثیر تعداد سرحد، پنجاب، بلوچستان اور سندھ تک پھیل گئی یا یوں سمجھئے کہ ہمارا آج کا مغربی پاکستان فارسی بولنے والوں کا مسکن بن گیا

جب سلجوقیوں نے مسعود (اول) بن محمود غزنوی کے آخری زمانے یعنی ۴۲۱ ہجری میں غزنویوں کو شکست دی تو وہ زیادہ عرصے تک غزنہ میں نہ رہ سکے، اور انھوں نے غزنہ کے علاوہ پنجاب میں لاہور کو بھی اپنا دار الحکومت بنا لیا۔ آخر کار مسعود (سوم) بن ابراہیم غزنوی کے زمانے یعنی ۴۹۲ھ مطابق ۱۰۹۹ء سے ۵۰۸ھ مطابق ۱۱۱۴ء میں سلجوقیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی وجہ سے غزنہ کی بجائے لاہور کو مستقل طور پر پایہ تخت بنا لیا گیا جس کی شہادت ہمیں جج سید محمد لطیف کی تصنیف Lahore میں ان الفاظ میں ملتی ہے[3]

"During the reign of Masud-II (1098–1114 A.D.) Lahore became the real capital of the Ghaznavi dynasty and their possession in the Punjab became consolidated.

جج سید محمد لطیف کے مندرجہ بالا بیان میں ایک غلطی کا ازالہ کرنا بھی لازم ہوگا۔ تاریخی شواہد کے مطابق بقول[4] لین پول (Lane Poole) ۱۰۹۹ء سے ۱۱۱۴ء تک کا زمانہ مسعود (دوم) کا نہیں بلکہ مسعود (سوم) کا ہے۔ اور بقول[5] صاحب تاریخ فرشتہ مسعود (دوم) بن مودود غزنوی ابھی چار سال کا بچہ ہی تھا کہ سیاسی حالات کی بنا پر فقط پانچ چھ روز کی تخت نشینی کے بعد ارکینِ دولت نے اس کے چچا ابو الحسن علی بن مسعود (اول) بن محمود غزنوی کو اس کی جگہ سن ۴۴۰ھ مطابق ۱۰۴۸ء میں تخت نشین کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریس کی غلطی کی وجہ سے Masud III کی بجائے Masud II لکھا گیا ورنہ جج صاحب سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

---

۱ مفتاح التواریخ۔ صفحہ ۵۰ (واقعات ہجری) مصنفہ سر ٹامس ولیم بیل۔ آگرہ ۱۸۲۹ء

۲ "Life and Works of Amir Khusru" by Dr Wahid Mirza (Calcutta 1935) Introduction: page 1.

۳ "Lahore" – (Its History, Architectural remains and Antiquities) by Judge Syed Muhammad Latif, New Imperial Press, Lahore 1892, Chapter I, page 11

۴ "The Muhammedan Dynasties" by Stanley Lane Poole (Paris 1925) page: 285.

۵ تاریخ فرشتہ۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۸۰ Edited by Briggs—(Bombay 1832)

بہ حال پنجاب میں سلاطین غزنوی نے لاہور کو ہی اپنا دارالحکومت منتخب کیا اس لئے تمام برصغیر میں دورِ غزنوی میں جو اہمیت لاہور کو حاصل رہی وہ کسی اور مقام کو نہ ہو سکی یہی وجہ تھی کہ غزنوی دربار کے تمام امرا، وزرا، علما، فضلا، اور ادبا و شعرا کا مسکن بھی لاہور ہی بنا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام برصغیر پاکستان و ہند میں فارسی شعر و ادب کا سب سے پہلا گہوارہ لاہور ہی بنا۔ اس کی شہادت ہمیں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر اقبال حسین کے تحقیقی مقالے "Early Persian Poets of India" میں اس طرح ملتی ہے[۵۱]

" In a short time Lahore rivalled Ghazna itself as a centre of literary activity, and here was laid the first foundation of Indo-Persian poetry ."

اگر پروفیسر اقبال حسین کے مندرجہ بالا بیان کو تذکروں اور تواریخ کی روشنی میں پرکھا جائے تو وہ بالکل حق بجانب نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، اس برصغیر میں فارسی زبان کا وجود اس سے پہلے شاید سندھ میں ہو تو ہو لیکن صحیح معنوں میں اس کا دورِ غزنوی میں پنجاب میں ہی ہوا ہے۔

قرائن کے اعتبار سے اور بقول ڈاکٹر حمید مرزا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، سلطنتِ غزنویہ کا سب سے پہلا مرکز سنہ ۴۱۲ھ مطابق ۱۰۲۱ء کا ہے جبکہ ابھی مسلمانوں کے ورود کا ابتدائی زمانہ تھا اور ابھی فارسی گو امرا و وزرا اور شعرا و ادبا یہاں آباد ہونا شروع ہو رہے تھے۔ دوسرا زمانہ مسعود (اول) بن محمود غزنوی کا یعنی ۴۲۱ھ سے ۴۳۲ھ کا ہے۔ مذکورہ شواہد سے یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ غزنوی دور میں شعر و ادب کا مرکز بن گئے کافی عرصہ بعد یعنی مسعود (سوم) بن ابراہیم غزنوی کے زمانے میں (تقریباً پانچویں صدی ہجری اور بارہویں صدی عیسوی میں) معرضِ وجود میں آیا تھا ہے کہ اس سرزمین لاہور میں اگر کوئی پہلا فارسی شاعر ہو سکتا ہے تو وہ لاہور میں دودمانِ غزنوی کے سیاسی اور ثقافتی مرکز قائم ہونے کے وقت یا اس کے ذرا بعد ہی ہو سکتا ہے اور اس سے پہلے جبکہ اس خطۂ لاہور میں فارسی زبان کا وجود ہی نہ تھا کسی بھی فارسی شاعر کا وجود ناممکن ہے۔

فارسی ادبیات کے تذکرہ نویسوں نے متقدمین شعرا کے تذکروں میں لاہور کے فارسی شعرا کا بھی کہیں کہیں ذکر کیا ہے جن میں سب سے پہلے ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کا ہی نام آتا ہے۔ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ ابوالفرج رونی کی صحیح تاریخِ پیدائش کیا ہے۔ البتہ مسعود سعد سلمان لاہوری کی پیدائش اور وفات کی دونوں تاریخیں ملتی ہیں۔ یہ دونوں شعرا ایک ہی زمانے کے ہیں۔ اس لئے بعض تذکرہ نویس جن کا ذکر آگے آرہا ہے، اس شبہ کا شکار نظر آتے ہیں کہ مسعود، ابوالفرج رونی سے ذرا پہلے کا شاعر ہے۔ مثلاً ڈاکٹر رضا زادہ شفق نے تاریخ ادبیات ایران[۵۲] میں اور دخت امیر بٹ نے آثار پارسی[۵۳] میں مسعود سعد سلمان لاہوری کا پہلے اور ابوالفرج رونی کا بعد میں ذکر کیا ہے حالانکہ متقدمین تذکرہ نویسوں کے اس کے برعکس لکھا ہے مثلاً نظامی عروضی سمرقندی نے "چہار مقالہ"[۵۴] میں جو آلِ ناصرالدین سبکتگین کے زمانے کے معروف شعرا کی فہرست لکھی ہے، اس میں ابوالفرج رونی کا پہلے اور مسعود سعد سلمان کا بعد میں نام لکھا ہے۔ اور عوفی کے مستند تذکرے لباب الالباب[۵۵] میں اسی ترتیب سے ابوالفرج رونی کا پہلے اور

---

[۵۱] "Early Persian Poets of India" by Prof. Iqbal Husain (Patna University 1935) page: 2.

[۵۲] تاریخ ادبیات ایران، صفحہ ۱۴۶، ۱۹۸۔ مصنف: رضا زادہ شفق۔ چاپ مؤسسہ امیر کبیر، ایران، تہران

[۵۳] آثار پارسی، مصنفہ دخت امیر بٹ۔ تاج بک ڈپو، لاہور

[۵۴] چہار مقالہ، در ماہیت علم شعر و صلاحیت شاعر، حکایت اول صفحہ ۴۹۔ مصنف: نظامی عروضی سمرقندی۔ مطبع سلیمانی، دہلی۔

[۵۵] لباب الالباب۔ جلد اول۔ شعرای غزنہ و لاہور، صفحات رونی ۲۴۱، مسعود ۲۴۶۔ مصنف: محمد عوفی۔ تالیف پروفیسر براؤن۔ لندن۔ ۱۹۰۵ء

مسعود سعد سلمان کا بعد میں ذکر آیا ہے۔ اس کے علاوہ دورِ حاضر کے تذکرہ نویسوں میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے "تاریخ ادبیات ایران" اور ڈاکٹر اقبال حسین[۳۲] نے Early Persian Poets of India میں بھی ابوالفرج رونی کا پہلے اور مسعود سعد سلمان کا بعد میں ذکر کیا ہے۔

ہاں یہ الگ بات ہے کہ سخنوری کے میدان میں جو شہرت مسعود سعد سلمان کو نصیب ہوئی وہ خود مسعود کے اُستاد ابوالفرج رونی کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ سو اگر فارسی شاعری میں مدارج کے اعتبار سے ڈاکٹر شفق نے مسعود کا پہلے اور رونی کا بعد میں ذکر کیا تو کسی حد تک ٹھیک ہے مگر قرائن کے لحاظ سے یہ ترتیب درست معلوم نہیں ہوتی۔

البتہ یہاں اس سوال کی گنجائش ضرور محسوس ہوتی ہے کہ جب ابوالفرج رونی کی صحیح تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہیں چلتا تو وہ کیا دلائل ہیں جن کی رو سے ابوالفرج رونی کو مسعود سلمان سے پہلے کا شاعر تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اس ضمن میں ہم چند تاریخی قرائن اور ادبی شواہد پیش کرتے ہیں۔

خود ڈاکٹر شفق نے جو سنین پیش کئے ہیں، انھیں بھی اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یقیناً ابوالفرج رونی مسعود سے پہلے کا شاعر ہے۔ مثلاً ڈاکٹر شفق مسعود سعد کی تاریخ پیدائش اور وفات کو ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں[۳۳]۔

"ولادتش (مسعود سعد سلمان لاہوری) در لاہورِ ہندوستان در حدود سالِ چہار صد و چہل ہجری اتفاق افتاد"

اور پھر وفات کے متعلق لکھتے ہیں[۳۴]:

"وفات مسعود سعد سلمان ظاہراً در سالِ پانصد و پانزدہ اتفاق افتاد"

اور ابوالفرج رونی کے متعلق فرماتے ہیں کہ[۳۵]:

"از مداحانش (ابوالفرج رونی) در دربار غزنوی بود و ابراہیم بن مسعود (۴۵۱ تا ۴۹۲ ھ) و پسرش مسعود بن ابراہیم (۴۹۲ - ۵۰۸ ھ) پانزدہمین و شانزدہمین شاہانِ غزنوی را مدح گفتہ"

اور اس کی وفات کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ[۳۶]:

"وفات رونی در اواخر قرن ششم یا اوائل قرن ہفتم اتفاق افتاد"

ذاتی طور پر خود ڈاکٹر شفق کے مذکورہ بیانات میں اختلاف نظر آتا ہے کیونکہ تمام تذکرہ نویس جن میں خود ڈاکٹر شفق بھی شامل ہیں (مثلاً ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا[۳۷] و درخت امیر بٹ[۳۸]) باتفاق رائے ابوالفرج رونی کی "تاریخ وفات (۴۹۰ تا ۵۰۸ ھ) کے درمیان بتاتے ہیں اور عام طور پر یہ تاریخ (۴۹۰ - ۴۹۲ ھ) تسلیم کی جاتی ہے اور خود بھی انھوں نے "شانزدہمین شاہانِ غزنویان را مدح گفتہ" کہہ کر ثابت کیا ہے کہ ابوالفرج رونی ۵۰۸ ہجری تک تو ضرور بقیدِ حیات تھا۔ اس لئے اگر "در اواخر قرن پنجم یا در اوائلِ قرن ششم" لکھا جاتا تو درست تھا لیکن یہ بھی

---

[۳۱] تاریخ ادبیات ایران، صفحات (رونی ۴۷۰ سے ۴۷۲، مسعود ۴۸۳ سے ۴۹۰)، مصنف ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا۔ مطبوعہ ایران

[۳۲] "Early Persian Poets of India" by Iqbal Husain page (Rooni : 66) (Masud : 123).

[۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶] تاریخ ادبیات ایران، صفحات، ۳۳ ص ۱۵۱، ۳۴ ص ۱۵۲، ۳۵ ص ۱۴۹، ۳۶ ص ۱۵۰) مصنف رضا زادہ شفق۔ چاپ امیر کبیر پریس۔ تہران ایران

[۳۷] تاریخ ادبیات ایران۔ صفحہ ۴۷۰۔ مصنف ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا

[۳۸] آثار پارسی۔ صفحہ ۵۔ درخت امیر بٹ۔ تاج بک ڈپو۔ لاہور

کتابت ہی کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

دخت امیربٹ نے مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی کی تواریخ یوں بیان کی ہیں[5]۔

"مسعود سعد سلمان پیدائش ۱۰۴۸ء مطابق ۴۴۰ھ۔ وفات ۱۱۲۱ء مطابق ۵۱۵ھ"

اور ابوالفرج رونی کے متعلق لکھتی ہیں کہ:-

"ابوالفرج رونی۔ تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ وفات غالباً ۴۹۰ ہجری"

سنین مذکورہ سے واضح ہوا کہ مسعود سعد سلمان ۱۱۲۱ء مطابق ۵۱۵ھ ہیں۔ ابوالفرج رونی نے تقریباً ۴۹۰ھ میں وفات پائی لہٰذا ابوالفرج رونی کا انتقال مسعود سعد سلمان سے یقیناً پہلے ہوا۔

اب مسئلہ اُن کی پیدائش کا ہے۔ مسعود کی پیدائش ۴۴۰ھ میں ہوئی مگر ابوالفرج رونی کی پیدائش سے متعلق تمام تذکرہ نویسوں نے باتفاق رائے یہی لکھا ہے کہ رونی نے ابراہیم بن مسعود غزنوی کے زمانے میں شہرت حاصل کی خلاً ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا رقم طراز ہیں[5]:

"میتواں گفت کہ اصل او (ابوالفرج رونی) از رونہ و مولد و منشا مانند مسعود بجز از ہند بودہ است۔ و او شاعری از ہنگام ورود بعہد بار سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی (۴۵۰ - ۴۹۲) آغاز شدہ و او پسر ابراہیم یعنی سلطان مسعود غزنوی (۴۹۲ - ۵۰۸) را مدح از رجال عہد آں دو سلطان را نیز مدح کردہ است و وفاتش معلوم نیست ولی مسلماً بعد از ۴۹۲ھ یعنی از سال جلوس سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی درگذشتہ است"

ظاہر ہوا کہ ابراہیم غزنوی کے سال جلوس یعنی ۴۵۰ھ میں جب وہ سریر آرائے سلطنت ہوا تو ابوالفرج رونی اُس کے دربار سے منسلک ضرور تھا اور اُس کی شاعری کی شہرت بھی ہو چکی تھی۔ اس طرح لازماً وہ جوان تھا اور اس کی کم از کم عمر اکتیس[3] یا بتیس برس کے درمیان ہوگی۔ اگر ان سنین کی روشنی میں اُس کا سن ولادت نکالا جائے تو کم از کم ۴۵۰ - ۳۱ = ۴۱۹ ہجری کے قریب ہوگا۔

مذکورہ سنین و شواہد کے مطابق اور خود بقول ڈاکٹر شفیق مسعود لاہوری کا سن ولادت ۴۴۰ ہجری ہے تو ظاہر ہوا کہ ابوالفرج رونی مسعود سعد سلمان سے کم از کم (۴۴۰ - ۴۱۹ = ۲۱ یعنی) اکیس برس پہلے پیدا ہوا اور اُس کی وفات بھی مسعود سے (۵۱۵ - ۴۹۰ = ۲۵ یعنی) پچیس برس پہلے ہوئی۔ ثابت ہوا کہ ابوالفرج رونی اگرچہ مسعود سعد سلمان لاہوری کا ہمعصر تھا لیکن تاریخی سنین کے اعتبار سے ابوالفرج رونی کو ہی مسعود سعد سے پہلے کا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم ابوالفرج رونی کو ہی لاہور کا پہلا فارسی شاعر قرار دیں، ذہن میں ایک اور سوال اُبھرتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اسی لاہور کی سرزمین میں رونی سے پہلے بھی کوئی اور فارسی شاعر ہوا ہو۔

لہٰذا اس ضمن میں راقم الحروف کو متقدمین فارسی شعرا کے تذکرے، ادبیات فارسی کی تواریخ اور بہت سے دستاویزات اور ذہنی نوشتے دیکھنا پڑے جن میں خطۂ لاہور کی فارسی میراث کے گرانبہا موتی چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ آخر کار ان تمام تاریخی اور ادبی شواہد سے ہمارا یہ مسئلہ جو آج تک حل نہ ہو سکا تھا حل ہو ہی گیا۔

---

[5] ۱۹۴۳ء پارسی۔ صفحہ ۵۔۷۔ مصنفہ دخت امیربٹ۔ مطبوعہ تاج بک ڈپو۔ لاہور

[5] تاریخ ادبیات در ایران۔ صفحہ ۴۷۰۔ مصنفہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا۔ کتاب فروشی ابن سینا۔ تہران ۱۳۳۹۔ خورشیدی

فارسی ادبیات کی تواریخ اور تذکروں میں لاہور کے فارسی شعراء کا ذکر تو خال خال آتا ہے لیکن ابھی تک کسی نے لاہور کے فارسی شعرا پر علیحدہ کوئی کتاب نہیں لکھی، لہذا شہر لاہور جو شروع سے لے کر آج تک فارسی شعر و ادب کا گہوارہ چلا آرہا ہے، لازم تھا کہ اس پر بسیط پیرائے میں لکھا جاتا۔ بالخصوص اب جبکہ ہمارے تعلقات اپنے ہم وطن اور ہم مذہب ملک ایران سے (جہاں دنیا میں سب سے پہلے فارسی شاعری نے جنم لیا) استوار ہو چکے ہیں، ہمارا فرض ہے کہ اُس فارسی شعر و ادب سے جو سرزمین ایران سے نکل کر برصغیر پاکستان و ہند میں وارد ہوا، اپنے ایرانی بھائیوں کو روشناس کرائیں۔ دراصل راقم الحروف کو اس بات کا اُس وقت احساس ہوا جب پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد بہت سے پاکستانی اور ایرانی ثقافتی وفود کا آپس میں تبادلہ ہوا اور ہمارے ادبی تعلقات ایرانی بھائیوں سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ بالخصوص جب مارچ ۱۹۵۵ء میں راقم الحروف کی ملاقات ایران کے دانشمند مفکر اور عصر حاضر کے معروف ادیب آقای سعید نفیسی سے لاہور میں ہوئی تو آپ نے فرمایا:

"لاہور کہ ہمیشہ مرکز شعر فارسی بودہ چہ خوش وقتی است اگر راجع بہ این چیزی برائے ما بنویسید"

مختصر یہ کہ جناب سعید نفیسی کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے اور دل میں ایک شدید احساس پیدا ہوا جس نے ایک قومی فریضہ کی صورت اختیار کی لہذا اب ایک بسیط مقالہ ایرانی بھائیوں ہی کی زبان میں بعنوان "تاریخ تحول شعر فارسی در لاہور" زیر تحریر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک قومی فریضہ یہ بھی تھا کہ اس ضمن میں جو نئی معلومات فراہم ہوں انھیں اہل وطن کے لئے قومی زبان اردو میں بھی پیش کیا جائے۔ یہ مضمون اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ ابوالفرج رونی مسعود سعد سلمان سے پہلے کا شاعر ہے۔ اب یہ مسئلہ درپیش ہے کہ آیا ابوالفرج رونی سے پہلے بھی کوئی فارسی شاعر خطۂ لاہور میں معرضِ وجود میں آیا ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی ہے تو وہ کون ہے؟

اس ضمن میں سب سے پہلے محمد عوفی کے تذکرے "لباب الالباب" کو ہی لے لیجئے۔ یہ متقدمین فارسی شعراء کا قدیم اور مستند تذکرہ ہے۔ محمد عوفی نے جس ترتیب سے ان شعراء کی گروہ بندی کی ہے وہ بالکل مستند اور مدلل ہے چنانچہ جہاں اس نے غزنہ و لوہور (لاہور) کے فارسی شعراء کا ذکر کیا ہے وہاں ابوالفرج رونی سے پہلے لاہور کے ایک اور فارسی شاعر کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس شاعر کا پورا نام ابوعبداللہ روزبہ النکتی اللہوری ہے۔

بدقسمتی سے لباب الالباب میں اس شاعر کا سالِ پیدائش بلکہ سالِ وصال بھی درج نہیں ہے۔ البتہ تذکرے میں نکتی لاہوری کا ذکر ابوالفرج رونی کے تذکرے سے پہلے کیا ہے۔ شعراء کی ترتیب زمان و ادوار کے اعتبار سے دی گئی ہے اس لئے قیاس کہتا ہے کہ نکتی لاہوری ابوالفرج رونی سے بھی پہلے کا شاعر تھا، لیکن جب تک تاریخی دلائل اور شواہد سے ثابت نہ کیا جائے ہمارا یہ دعویٰ قیاس ہی کہلائے گا۔

اس سلسلے میں کہ نکتی ہی لاہور کا پہلا فارسی شاعر ہے ہمیں کوئی واضح بیان نہیں ملتا۔ البتہ ایک مبہم سا اشارہ سندھ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر سدارنگانی کے مقالے "Persian Poets of Sindh" میں ان الفاظ میں ملتا ہے[1]:

"It is not improbable that India possessed poets in Persian who predeceased him (Nukati of Lahore) but there is no elusive evidence to this effect."

ڈاکٹر سدارنگانی کے مذکورہ بیان کے مطابق یہ ناممکن نہیں ہے کہ برصغیر میں نکتی لاہوری سے پہلے بھی کوئی فارسی شاعر پیدا ہوا ہو کیونکہ اس کے لئے ان کے پاس کوئی فیصلہ کن دلیل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ بیان مشتبہ ہے اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ نکتی ہی لاہور کا پہلا فارسی شاعر ہے۔

---

[1] "Persian Poets of Sindh" by Dr H. I. Sadarangani. (Introduction p: X & XI) Printed by Sind Adabi Board, Karachi 1956

لیکن اگر تاریخی شواہد کی روشنی میں تحقیق کی جائے تو ہمیں اس حقیقت کا راستہ مل ہی جاتا ہے اور اس طرح ان شکوک کا ازالہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

یہ درست ہے کہ لباب الالباب میں عوفی نے نکتی لاہوری کا کوئی سال پیدائش یا سالِ وصال درج نہیں کیا لیکن اگر عوفی کے اسی تذکرے کا بنظرِ تحقیق مطالعہ کیا جائے تو اس کے زمانے کا تعین ہو سکتا ہے، بلکہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ نکتی لاہوری، سلطان مسعود شہید غزنوی کے زمانے کا شاعر ہے۔ عوفی نے نکتی لاہوری کا کلام پیش کرتے ہوئے جو قصیدہ درج کیا ہے اس کا عنوان یہ ہے[۵۳]۔

"دَر مدحِ مسعود شہید گوید"

اور یہ قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

روی آں ترک نہ رویست نہ براو نہ بماست ‏ ‏ ‏ ‏ کہ بریں نار بہارست و براں گُل ببراست"

سلاطینِ غزنویہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دودمانِ غزنویہ میں مسعود تین ہیں۔ پہلا سلطان مسعود (اوّل) بن محمود غزنوی، دوسرا سلطان مسعود (دوم) بن مودود غزنوی، اور تیسرا سلطان مسعود (سوم) بن ابراہیم بن مسعود (اوّل) بن محمود غزنوی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تینوں سلاطین غزنویہ میں سے مسعود شہید جس کی مدح میں نکتی لاہوری نے قصیدہ کہا، کونسا مسعود ہے؟ —— جب تک ہم نکتی لاہوری کے ممدوح سلطان مسعود شہید کی وضاحت نہیں کر پائیں گے نکتی لاہوری کے زمانے کا تعین نہیں کیا جا سکتا اور جب تک نکتی لاہوری کے زمانے کا تعین نہیں کیا جاتا نکتی کو ابوالفرج رونی سے پہلے کا شاعر بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دراصل زمانے کے متعین نہ ہونے کی وجہ سے ہی بعض تذکرہ نویس شبہات کے شکار نظر آتے ہیں، اس لئے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا لاہور کا پہلا فارسی شاعر کون ہے —— علاوہ ازیں بعض تذکروں میں ایک اشتباہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ ابوالفرج رونی، نکتی کا ہم عصر اس لئے تھا کہ اُس نے بھی مسعود غزنوی کی مدح میں قصیدے کہے۔ لہذا یہ اشتباہ اس وقت ہی دور ہو سکتا ہے جب یہ ثابت کیا جائے کہ مسعود شہید کون ہے؟ —— مسعود اول ہے یا دوم یا سوم؟

اگر ہم اس مسئلے کو تاریخی شواہد کی روشنی میں پرکھیں تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً مفتاح التواریخ کے حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان مسعود (سوم) بن ابراہیم غزنوی شہید نہیں ہوا تھا اُس کا انتقال ۵۰۸ ہجری میں ہوا، یہ الفاظ اس کے شاہد ہیں[۵۴]۔

"سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی رونق بخش اورنگ شاہی بود و بر ممالک غزنوی و لاہور سلطنت می نمود و خواہر سلطان سنجر ابن ملک شاہ سلجوقی بعقد نکاح خود داشت۔ در آخر پانصد و ہشت ہجری بعد ایالت شانزدہ سال فوت کرد۔ بعد از وی پسرش سلطان شیرزاد قابضِ تخت و تاج دگردید۔"

رہا سلطان مسعود (دوم) بن مودود غزنوی تو اس کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ وہ محض چار سال کا بچہ ہی تھا کہ ارکین دولت نے چند سیاسی وجوہ کی بنا پر اُسے فقط پانچ چھ روز کی تخت نشینی کے بعد ہٹا دیا اور اُس کی جگہ اُس کے چچا ابوالحسن علی بن مسعود (اول) کو بٹھا دیا۔ اس کا حوالہ تاریخ فرشتہ میں یوں ملتا ہے[۵۵]:

"باتفاق ارکان دولت مسعود (دوم) بن مودود غزنوی را بعد از پنج و شش روز پادشاہی کردہ، بود خلع نمودہ، عمش ابوالحسن علی

---

۵۳ لباب الالباب۔ جلد دوم صفحہ ۲۰۔ تصنیف محمد عوفی۔ تدوین پروفیسر براؤن لندن ۱۹۰۵ء

۵۴ مفتاح التواریخ۔ بات ششم صفحہ ۴۲۔ تصنیف۔ سر طامس ولیم بل مطبع اسد الاخبار۔ آگرہ بابت ۱۸۳۶ء

۵۵ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۸۰۔ تصنیف محمد قاسم بن ہندو شاہ استرآبادی المعروف فرشتہ۔ Edited by Briggs — (Bombay 1832)

بن مسعود (اول) را بایالت برداشت ؛

البتہ مسعود اول ابن محمود غزنوی کے شہید ہونے کی شہادت ہمیں مفتاح التواریخ میں اس طرح ملتی ہے۔[۵۱]

"چوں در سنہ چہار صد و سی و سہ ہجری[۴۳۳] شہزادہ احمد پسر سلطان محمد کحول سلطان مسعود (اول) را در محبس شہید کرد پسرش سلطان مودود بن سلطان مسعود (اول) جہت انتقام خون پدر با سلطان محمد کحول جنگ کردہ او را با دیگر قاتلانِ پدرِ خود از جان کشتہ بر تختِ سلطنت نشست و در سن چہار صد و چہل و یک ہجری[۴۴۱] درگذشت ؛

یعنی مسعود (اول) بن محمود غزنوی کو سلطان محمد کے لڑکے شہزادہ احمد غزنوی نے (جو کہ اس کا بھتیجا تھا) ۴۳۳ھ ہجری میں قید ہی میں شہید کر دیا تھا۔

مذکورہ تاریخی شواہد کے علاوہ عوفی کے مستند تذکرے لباب الالباب کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ مسعود شہید ابراہیم غزنوی کا بیٹا (مسعود سوم) نہیں بلکہ محمود غزنوی کا بیٹا (مسعود اول) ہی ہے۔ وہ لکھتا ہے:[۵۲]

"و بعد از وی (محمود) امیر شہید ظہیر الدولہ و مجیر الملۃ ابوسعید سعد مسعود رحمۃ اللہ علیہ کہ در عہد پدر والی عراق بود و ولی عہد بتخت نشست و دہ سال سلطان آں زماں بود ؛

اگر عوفی کے اس بیان کو کہ مسعود شہید کی حکومت کا زمانہ دس سال تھا، تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو لین پول، صاحب مفتاح التواریخ، اور تاریخ فرشتہ کے بیانات کے مطابق مسعود سوم ابن ابراہیم غزنوی کا زمانہ سن ۴۹۲ ہجری سے ۵۰۸ ہجری یعنی سولہ سال اور مسعود (اول) بن محمود غزنوی کا زمانہ ۴۲۱ھ سے ۴۳۲ ہجری یعنی دس سال کا نکلتا ہے۔

اس کی مزید تصدیق ہمیں ایران حاضر کے معروف محقق اور بہترین نقاد جناب ڈاکٹر آقای ذبیح اللہ صفا کی تاریخ ادبیات ایران میں ملتی ہے۔ وہ نکتی لاہوری کے بارے میں رقم طراز ہیں:[۵۳]

"ابو عبداللہ روزبہ نکتی لاہوری از قدیم ترین شاعران فارسی زبان منسوب بلاہور است۔ وی مداحانِ سلطان مسعود بن محمود غزنوی (۴۲۱ - ۴۳۲) بودہ و بنا بریں در نیمۂ اول قرن پنجم میزیستہ است ؛

مذکورہ حوالے میں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے مسعود بن محمود غزنوی یعنی اسی مسعود اول امیر شہید کو ہی نکتی لاہوری کا ممدوح قرار دیا ہے۔

لہذا مذکورہ تاریخی شواہد سے واضح ہوا کہ مسعود شہید یہی مسعود (اول) بن محمود غزنوی ہے اور نکتی لاہوری نے اسی مسعود شہید یعنی مسعود (اول) بن محمود غزنوی کی مدح میں قصیدہ کہا۔ ظاہر ہوا کہ نکتی لاہوری مسعود (اول) بن محمود غزنوی کے زمانے کا شاعر ہے اور اس کے برعکس ابوالفرج رونی کا زمانہ مسعود (سوم) بن ابراہیم غزنوی کا ہے لہذا نکتی لاہوری لازماً ابوالفرج رونی سے پہلے کا شاعر ہے۔

تاریخی شواہد کی روشنی میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ لاہور میں فارسی زبان کا وجود سلطان محمود غزنوی کے پنجاب پر حملوں یعنی سن ۱۰۰۱ء سے ۱۰۲۴ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور اس زمانے سے پہلے جبکہ لاہور میں فارسی زبان کا وجود ہی نہ تھا

---

۵۱ مفتاح التواریخ۔ ٹامس ولیم بیل۔ صفحہ ۵۵۔ تصنیف مسٹر ٹامس ولیم بیل۔ مطبع اسد الاخبار۔ آگرہ ۱۸۳۶ء

۵۲ لباب الالباب۔ جلد دوم صفحہ ۲۸ مصنف محمد عوفی۔ تدوین پروفیسر براؤن۔ لندن۔ ۱۹۰۳ء

۵۳ تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۵۳۰ تا ۹۰۰۔ تالیف: دکتر ذبیح اللہ صفا۔ استاد دانشگاہ تہران۔ چاپ خانہ دانشگاہ تہران۔ ۱۳۳۸

کسی فارسی شاعر کا وجود کیونکر ممکن ہے۔ البتہ محمود غزنوی کے پنجاب پر حملوں کے بعد یعنی گیارھویں صدی عیسوی مطابق پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں غزنویوں کا پایۂ تخت غزنہ کے مقابل پنجاب میں پہلی بار لاہور ہی میں تقریباً ۴۱۲ھ مطابق ۱۰۲۱ء میں قائم کیا گیا جس کی تصدیق ڈاکٹر وحید مرزا کے مقالے " Life and Works of Amir Khusru " میں ان الفاظ میں ملتی ہے[۵]:

"With Mahmud's conquest of the Punjab (1021 A.D.), Lahore came to be an important centre, politically as well as socially equal to Ghazna"

ڈاکٹر موصوف کے مذکورہ بیان سے ظاہر ہے کہ اس وقت تک لاہور کو غزنویوں کے صرف اور معاشرتی مرکز بننے کی حیثیت حاصل ہوئی تھی اور ابھی وہ ادبی مرکز نہ بنا تھا، بلکہ وہ ترکی، افغانی اور ایرانی ادبا، شعرا، اور امراء، وزرا جو سلاطین غزنوی کے ساتھ لاہور کی سرزمین میں آئے، آہستہ آہستہ یہاں اقامت پذیر ہو رہے تھے۔ یا بالفاظ دیگر محمود غزنوی کے بعد یعنی مسعود (اول) بن محمود غزنوی کے زمانے (۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء) میں حکمراں قوم کی فارسی زبان کے ورود کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد یعنی گیارھویں صدی عیسوی کے وسط آخر میں یعنی ابراہیم اور مسعود (سوم) بن ابراہیم غزنوی کے زمانے (۴۵۱ھ مطابق ۱۰۵۹ء تا ۵۰۸ھ مطابق ۱۱۱۴ء) میں لاہور مکمل طور پر فارسی شعر و ادب کا گہوارہ بنا۔ اس دور میں ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان ایسے جلیل القدر شعراء کی شہرت لاہور کی سرزمین سے نکل کر افغانستان اور ایران کے دور دراز گوشوں تک جا پہنچی۔

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ لاہور کی سرزمین میں سب سے پہلے جس زمانے میں کسی فارسی شاعر کا وجود ممکن ہے تو وہ مسعود (اول) بن محمود غزنوی کا زمانہ ہی ہو سکتا ہے اور یہ فارسی زبان کے ورود کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ جب ہم لاہور کے اس زمانے کی فارسی ادبیات کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں سوائے نکتی لاہوری کے کسی اور فارسی شاعر کے وجود کا ثبوت نہیں ملتا۔

لہٰذا مذکورہ تاریخی شواہد، حقائق اور دلائل کی روشنی میں ثابت ہوا کہ لاہور کا پہلا فارسی شاعر نکتی لاہوری ہی ہے۔

۵۔ " Life and Works of Amir Khusru " by Dr Muhammad Wahid Mirza Ph.D (London). Printed in Calcutta 1935. Introduction page: 1.

مشکور حسین یاد

تجربہ اور ناتجربہ کاری

تجربے کا پہلا کام یکجائی کو ختم کرنا ہے۔ وحدت قائم رہے تو انسان زندگی کو سمجھ نہیں سکتا۔ سمجھنے سمجھانے کے لئے تقسیم کا عمل ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ عقل کو ابھی تک ضرب دینا یا جمع کرنا نہیں آیا۔ اُسے تو بس تقسیم سے غرض ہے۔ جب دیکھو اُس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی تیشہ ہوتا ہے جس سے وہ موجودات کے ٹکڑے کرتی رہتی ہے۔ کیا تجربے کے علاوہ ادراک کا کوئی اور بھی طریقہ ہو سکتا ہے؟ انسان کو ابھی اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ اسی لئے وہ سمجھنے سمجھانے کے چکر میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔

دنیا میں کسی چیز کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ تجربہ ہر چیز کو ٹھکانے سے لگانا چاہتا ہے۔ اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا ہے لیکن چیزیں اپنی فطرت کیسے بدل سکتی ہیں۔ تجربہ انہیں ہزار باندھ کر بٹھائے، وہ کبھی نہ کبھی سارے بندھن توڑ کر اس کی گرفت سے نکل بھاگتی ہیں۔ حدود کا تمام تصور تجربے کی پیداوار ہے۔ جب حدیں ٹوٹتی ہیں تو تجربہ اپنی شرمندگی دور کرنے کے لئے کہتا ہے کہ حدیں نہیں ٹوٹیں، اُس کے قدم آگے بڑھے ہیں۔

تجربے کے ذریعے بات سمجھنا آسان ہے۔ اس لئے نہیں کہ تجربہ خود آسان چیز ہے بلکہ اس لئے کہ تجربے کے ذریعہ بات ہمیشہ ادھوری سمجھ میں آتی ہے ظاہر ہے کہ کچھ سمجھنا سب کچھ سمجھنے کی نسبت آسان ہوتا ہے) انسان کو اچھے بُرے کی تمیز بھی اسی ادھورے پن کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ جتنا کچھ سمجھ میں آگیا وہ اچھا، جو سمجھ میں نہیں آیا وہ بُرا۔ امتیازات کا یہ سلسلہ سمجھ اور ناسمجھی کی درمیانی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

آدمی میں کمال کو سمجھنے کی بے پناہ خواہش ہے لیکن اس کا مظاہرہ کے لئے اس نے جو ذریعہ اختیار کیا ہے وہ سخت خطرناک ہے یعنی نقص کی منزلوں کا سفر ہے۔ انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑنے والی بات بظاہر نہایت معقول معلوم ہوتی ہے لیکن عام طور پر حادثہ یہ پیش آتا ہے کہ آدمی انگلی کے لمس کی کیفیت میں اتنا کھو جاتا ہے کہ نہ صرف اُسے پہنچا پکڑنے کا خیال نہیں رہتا بلکہ وہ انگلی ہی کو پہنچا سمجھ لیتا ہے۔ یہی پہنچا پکڑنے کی خواہش یعنی حصول کمال کی خواہش ناتجربہ کاری ہے اور انگلی پکڑ کر پہنچا پکڑنے کی کوشش تجربہ

میں سعیٔ لاحاصل کا قائل نہیں ہوں کوشش خواہ کسی قسم کی ہو رائگاں نہیں جاتی۔ تجربہ ہزار خطراتِ نقص کے باوجود اپنے دامن میں منفعتیں بھی رکھتا ہے خصوصاً مادہ کو مسخر کرنے کے لئے نقص کی منزلوں سے تجربہ کا سفر بے حد سودمند ثابت ہوا ہے یعنی دنیا داری کا سامان مہیا کرنے میں تمام کا تمام تجربہ کا ہاتھ ہے۔ لیکن دنیا دار بنا کر تجربے نے انسان میں کون سے صفات پیدا کئے اس تلخ حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قبل انسان یگانگت کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ کائنات اُس کی مٹھی میں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے نہیں کہ کائنات کوئی مٹھی میں آنے والی شے ہے بلکہ اس اعتبار سے کہ وہ اپنی مٹھی اور کائنات کو دو الگ چیزیں تصور نہیں کرتا۔ نہ آگ اُسے جلاتی ہے، نہ پانی اُسے ڈبوتا ہے۔ سب تک پہنچنا اور سب کو اپنے تک لے آنا اُسے نہایت آسان اور سہل نظر آتا ہے۔ اُس کے راستے میں دیواریں نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی ہیں تو اسے

یقین ہوتا ہے کہ جب وہ سفر کا آغاز کرے گا تو یہ خود بخود اُس کے لیئے راستہ بنا دیں گی۔ دراصل ناتجربہ کاری کی فضا دوستی کی فضا ہے۔ اس میں انسان کو سب اپنے دکھائی دیتے ہیں، کوئی غیر نظر نہیں آتا۔ تجربہ سب سے پہلے اسی دوستی کی فضا کو مجروح کرتا ہے۔ نفع اور نقصان، اپنے اور پرائے کی تمیز اُس کا اولین عطیہ ہے۔ آفاقیت اور ہمہ گیری تجربے سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ہر ایک کو اچھا سمجھنا، ہر ایک سے محبت کرنا انسان کی ناتجربہ کاری کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح بغور دیکھا جائے تو انصاف پسندی، غیر جانبداری، خیر خواہی اور ہمدردی وغیرہ ہر قسم کی اخلاقی قدریں بھی انسان کو تجربے کی بناء پر حاصل نہیں ہوئیں۔ ان میں بھی اُس کی ناتجربہ کاری پکار پکار کر اپنا اعلان کر رہی ہے۔ یہاں بھی اُس نے تجربے کی گھٹن کو دور کرنے کے لیئے نئے انداز سے ناتجربہ کاری کی کھلی فضا میں آکر دم لیا ہے۔

میں نگاہ کی وسعت اور دل کی کشادگی کو خوب یا ناخوب نہیں کہتا۔ ہو سکتا ہے جسے ہم وسعت کہتے ہیں وہ خلاؤں میں بلا مقصد ہاتھ پاؤں مارنے کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو۔ یا ممکن ہے وسعت کے تصور میں انسان ٹھوس حقائق کے فشار سے تنگ آکر جائے فرار تلاش کرنا چاہتا ہو۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ وسعت ہی وہ مقصدِ عظیم ہو جس کے لئے انسان کی ہستی وجود میں آئی ہے۔ اسی طرح انصاف پسندی، غیر جانبداری، ہمدردی اور خیر اندیشی وغیرہ کے خوب و ناخوب ہونے کے بارے میں کوئی قطعی حکم لگانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ انصاف پسندی میں انسان اگر پوری طرح نہیں تو بجاس فی صد اپنے آپ سے قطع تعلق ضرور کر لیتا ہے۔ گویا نفس لفسی کو چھوڑ کر نصفا نصفی کی فضا میں معلق ہو جاتا ہے۔ نہ وہ خود سے پیار کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے سے، نہ اُسے خود سے نفرت ہوتی ہے، نہ کسی غیر سے، وہ تو بس انصاف کے پیچھے بھاگتا ہے جو اسے کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ (یہ اور بات ہے کہ انسان کہیں کا نہ رہ کر ہی زیادہ خوش رہتا ہو)۔ انصاف پسندی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کی ذات تک محدود نہیں رہنے دیتی بلکہ پورے عالمِ انسانیت تک اُس کی ہستی کو لے جانا چاہتی ہے۔ وہی وسعت کا پیغام۔ وسعت کی دعوت، وسعت کی طرف قدم بڑھانے کی ترغیب۔ غیر جانبداری کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح ہے۔ غیر جانبدار آدمی بھی کسی کا نہ ہوتے ہوئے سب کا ہوتا ہے۔ یہاں بھی وسعتیں اپنا دامن پھیلائے موجود ہوتی ہیں۔ اور تو بہ تو فضاؤں کی آغوش کشادہ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خلا بھی منہ پھاڑ کر چنگھاڑتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ ہمدردی اور خیر اندیشی وغیرہ کا یہ حال ہے کہ ہمدردی میں انسان کبھی درد سے بالکل رشتہ توڑ بیٹھتا ہے اور کبھی سراپا درد بن جاتا ہے۔ خیر اندیشی میں کبھی اپنے ساتھ دوسروں کو بھی پار لگا دیتا ہے اور کبھی نہ صرف اپنا بلکہ سب کا بیڑہ غرق کر بیٹھتا ہے۔ غرض جملہ اعلیٰ انسانی قدریں جن کے مثبت اور منفی ہر دو پہلوؤں پر بحث کی جا سکتی ہے اور جن پر انسانیت کو ہمیشہ ناز رہا ہے۔ انسان کے تجربے کی نہیں بلکہ ناتجربہ کاری کی پیداوار ہیں۔ ان اقدار کے فروغ میں، اگر تجربے کا کوئی ہاتھ ہے تو صرف اتنا کہ اُس نے ان کے مقابلے میں ایک بار نہیں سینکڑوں بار شکست کھائی ہے۔ (حالانکہ وہ اپنی ضد پر ہمیشہ قائم رہا اور ہے)

تجربہ انسان کو خود غرض، حریص، ڈرپوک، متعصب، تنگ دل اور تنگ نظر بنا دیتا ہے۔ میں ان صفات کو بھی کلی طور پر بُرا نہیں سمجھتا۔ نالائق اولاد اور کھوٹے پیسے کی طرح یہ صفات بھی کسی نہ کسی موقع پر انسان کے بُرے وقت میں کام آ ہی جاتے ہیں۔ یوں بھی خود غرضی اور لالچ ایک خاص حد سے تجاوز نہ کریں تو آدمی کو زندگی میں خاصی عافیت نصیب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعض حالات میں خوف اور تعصب کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ کبھی کبھی تنگ دلی اور تنگ نظری زندگی کی بدولت بھی انسان کو زندگی کا ایک شدید اور گہرا شعور حاصل ہو جاتا ہے لیکن عام طور پر جو بڑی دشواری پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ تجربہ اپنی قائم کی ہوئی حدوں کا اعلان جس قطعیت کے ساتھ کرتا ہے، اُس میں اُس کا یقین جہالت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ زندگی کو قطعیت ایک آنکھ نہیں بھاتی خصوصاً انسانی معاملات میں۔ اس سے بڑھ کر خطرناک شے اور کوئی نہیں ہے۔

ہم دیگر اشیا کے برتاؤ اور طرزِ عمل کے بارے میں قبل از وقت کوئی حکم لگا سکتے ہیں لیکن کسی انسان کے برتاؤ اور طرزِ عمل سے متعلق ایسا نہیں کر سکتے۔ اگرچہ شاذ و نادر اشیا بھی اس قید سے آزاد ہو جاتی ہیں اور انسان بھی عموماً توقع کے مطابق ہی عمل کرتا ہے لیکن پھر بھی انسانی طرزِ عمل سے متعلق کامل وثوق کے ساتھ پیش گوئی کرنا محال ہے۔ ایک جھوٹے آدمی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہمیشہ جھوٹ بولے گا، سراسر غلط ہے۔ اسی طرح ایک سچ بولنے والے سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہمیشہ سچ بولے گا درست نہیں۔ بھلا آدمی کب برائی کر بیٹھتا ہے اور بُرے آدمی سے کب بھلائی ہو جاتی ہے اس ضمن میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ امکانات سو فی صد موجود ہوتے ہیں۔ تجربے کی سب سے بڑی جہالت یہی ہے کہ وہ خود اعتمادی کے زعم میں ان امکانات کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔

دیگر موجوداتِ عالم اور انسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دوسری چیزوں کو تقسیم کیا جا سکتا ہے، انسان کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہزار ٹکڑے کرنے کے باوجود اس کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ دیگر اشیا کی ذات کا پتہ چل جاتا ہے، انسان کی ذات کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ یہ طرح طرح کے روپ دھار کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اختلاف اور تضاد اس کی اصلیت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ فی الحقیقت وہ کیا ہے؟ یہ ایک راز ہی رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کی اکثریت خلق تو ہو جاتی ہے لیکن ظاہر نہیں ہوتی۔ دوسرے موجودات کی طرح تجربہ انسان کو بھی محدود کر کے اس پر حرفِ آخر صادر کرنا چاہتا ہے۔ تجربے کی حدیں دیگر اشیاء عام کے ضمن میں تو یقیناً کارآمد ثابت ہوتی ہیں لیکن انسان کو ان کے حصار میں لینے کی کوشش کرنا فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ اشیا کو تعصب کی نظر سے دیکھنا، اُن سے خوف کھانا، اُن کے بارے میں تنگ نظری سے کام لینا، یہ سب باتیں نہ صرف اشیا کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں بلکہ کائنات پر انسان کی گرفت کو مضبوط بھی کرتی ہیں لیکن انسانی معاملات میں یہی باتیں جہل، بُعد اور ہلاکت کا سبب بن جاتی ہیں۔ انسان سے انسان کا تعصب اور انسان سے انسان کا خوف ہمیشہ ایک دوسرے کے درمیان بیگانگی کی خلیج قائم رکھتا ہے۔ دراصل انسان کو سمجھنے کے لئے عصبیت، خوف، اور تنگ نظری وغیرہ قسم کی قیود کو توڑے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں۔ یہ دیواریں تجربے نے عناصرِ اربعہ کو قابو میں کرنے کی خاطر اُن کے گرد کھڑی کی تھیں۔ بعد میں اُس نے انسان کو بھی آگ، پانی، مٹی اور ہوا سمجھ کر ان کے گھیرے میں لینے کی کوشش شروع کر دی اور یوں آدمی کائنات کو تسخیر کرتے کرتے اپنے آپ سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔ انسانی تہذیب و تمدن کے سینے پر تجربے کی یہ کوشش ایک ناسور بن کر رہ گئی ہے۔

عموماً تجربہ تکلیفیں پہنچاتا ہے، زخم لگاتا ہے، ناتجربہ کاری ان زخموں پر پھاہے رکھتی ہے۔ تجربے کی لذتوں اور مسرتوں کے پیچھے بھی ناتجربہ کاری ہی کا نرم و نازک ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی تجربہ کرنے کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ انسان جس جذبے کے تحت کائنات کو ٹکڑوں میں تقسیم کرتا چلا جاتا ہے، اُسی جذبے کے تحت اُسے کائنات کو ایک مکمل صورت میں دیکھنے کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔ اجزاء کا مشاہدہ اُس کے ذوقِ جستجو کی تسکین ہی کا باعث نہیں بنتا، اُسے بے حد دکھ بھی پہنچاتا ہے، اسی لئے وہ بار بار کُل کی طرف دوڑتا ہے۔ انسانی ارتقا کے سارے مراحل اسی مراجعت کی بدولت طے ہوئے ہیں۔ کُل ہاتھ سے نکلنے کے باوجود ہاتھ سے نہیں نکلتا۔

جزو کا تصوّر موت کی خبر دیتا ہے۔ کُل کا خیال یہ بتاتا ہے کہ موت کے بعد پھر زندگی ہے۔ موت اور زندگی کے اسی جھمیلے میں انسان جزو سے کُل اور کُل سے جزو کی طرف سفر کرتا رہتا ہے اور اس سفر میں قدم پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے زیادہ بڑھتے ہیں۔

تجربہ نہ ہوتا تو انسان کبھی نہ مرتا، یا کم از کم وہ موت کے تصور سے کبھی آگاہ نہ ہوتا۔ ابھی تک تجربے کی سب سے بڑی دریافت موت ہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موت کی دریافت نے کائنات کے بہت سے راز منکشف کئے لیکن انسان کو زندگی کے بھید معلوم کرنے سے بیگانہ کر دیا۔ وہ زندگی سے زیادہ موت کا سراغ لگانے میں مصروف ہو گیا—— ایسی چیز کا سراغ جس کی فی الواقع کوئی حقیقت نہیں ہے۔

ہمارے ہر خیال اور ہر کوشش کے پس منظر میں موت کا تصور کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتا ہے، خواہ اسے لاشعوری طور پر کہ لیجئے ہم زندگی کی نسبت موت پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے کے عادی ہیں۔ انسان حقائق سے منہ اُسی وقت موڑ سکتا ہے جب اُسے ان کے پیچھے کچھ نظر نہیں آتا، کچھ نظر نہ آنا ہی موت ہے۔ انسانی فطرت ہر حقیقت کے عقب ایک حقیقت دیکھنے کی متمنی ہے۔ تجربہ انسان کی اس تمنا کو گلا گھونٹ کر ختم کرنا چاہتا ہے تجربے کی کم مائگی اور کوتاہ نظری ظاہر ہے۔ اسی کوتاہ نظری کی وجہ سے ہم زندگی کو گذران اور موت کو اٹل خیال کرنے لگے۔

ناتجربہ کاری امیدوں اور آرزؤں کا مسکن ہے۔ اُس میں انسان کو زمان و مکان کے اثرات سے اونچا اُٹھا لینے کی بے پناہ قوت موجود ہے۔ وہ اُسے یعنی انسان کو ہمیشہ بچپن یا زیادہ سے زیادہ جوانی کی حدوں میں رکھتی ہے۔ تجربہ انسان کو بوڑھا کر دیتا ہے۔ اُس کے چہرے پر جھریاں ڈال دیتا ہے۔ اُس کی صورت بگاڑ دیتا ہے۔ دراصل انسان نے تجربے پر غلبہ حاصل نہیں کیا بلکہ تجربے نے انسان کو اپنے شکنجے میں لے لیا ہے۔ تجربہ کی اس مضبوط اور ہلاک کر دینے والی گرفت سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ناتجربہ کاری کی قوت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جائے۔ ناتجربہ کاری کی اس قوت کا دوسرا نام محبت ہے۔ محبت کرنے والے تجربہ کار ہو کر بھی ناتجربہ کار رہتے ہیں اور یوں اُن کے ہاتھ سے کل کا دامن کبھی نہیں چھوٹتا۔

پروفیسر حمید احمد خان

بڑا بھائی

۱۵ اپریل ۱۹۶۲ء کو لاہور کے اہلِ علم و قلم نے جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے یونیورسٹی سینٹ ہال میں ایک باوقار تقریب منعقد کی۔ یہ مضمون اسی یادگار محفل میں پڑھا گیا ——— ادارہ

میں اِس محفل کے مہتممین کا احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے مجھے ایک خوشگوار اور دل پسند فرض ادا کرنے کا موقع بہم پہنچایا۔

جسٹس شیخ عبدالرحمٰن ملک کے ان سپوتوں میں ہیں جنھوں نے ہماری روزمرہ زندگی کو ہماری تہذیبی روایت کی مضبوط بنیاد پر تعمیر کرنے میں نمایاں حصّہ لیا۔ بلاشبہ ان کی ہمت ان کے بلند منصب سے کچھ زیادہ بلند ہے۔ کیونکہ منصبی فرائض سے قطع نظر وہ ہمیشہ ان میدانوں میں بھی سرگرمِ کار رہے ہیں جن کی طرف ان کے اپنے ذوقِ سلیم اور قوم کی امیدوں اور تمناؤں نے ان کی رہنمائی کی۔ نظامِ عدالت ہو یا نظامِ تعلیم، علمِ دین ہو یا علمِ معاشرت، زبان و ادب ہو یا موسیقی و نقاشی۔ جسٹس رحمٰن کے دل و دماغ کی روشنی سے ہر شعبۂ حیات کا کوئی نہ کوئی گوشہ منور و منور ہوتا رہا۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوا کہ جسٹس رحمٰن کی اپنی ذات متنوع کمالات کی جامع ہے۔ علم کا نکھار، ذہن کی حرارت، فیصلے کا توازن، عقیدے کی پختگی کے ساتھ وسیع المشربی، یہ سب کچھ یہاں موجود ہے اور اس کو ترکیب دینے کے لئے وہ پُراسرار عمل شامل ہو جاتا ہے کہ جسے بجز جسٹس رحمٰن کی شخصیت کے طلسم کے، ہم اور کوئی نام نہیں دے سکتے۔

وہ لوگ جنھوں نے اس شخصیت کے خدوخال کو بتدریج روشن ہوتے دیکھا اربابِ کمال کی اس محفل میں موجود ہیں۔ اوائل عمر ہی میں شیخ عبدالرحمٰن کی پیشانی پر ذہانت کا ستارہ چمکتا تھا اور ان کی آنکھوں میں مروّت کی وہ جھلک تھی جسے بالآخر انسانی تعلقات کے ایک نئے عالم کو محیط ہونا تھا۔ اس ابتدائی زمانے میں اُن کے بھائی شیخ عبدالرحیم اُن کے ہم جماعت تھے۔ لیکن مساواتِ عمر کے باوجود رحمٰن صاحب "بڑا بھائی" کہلاتے تھے۔ شاید کچھ اس وجہ سے کہ پڑھائی میں ایک قدم آگے تھے مگر زیادہ تر اس لئے کہ ان کے انداز میں بڑے بھائیوں کی سی شفقت تھی۔ سالہا سال گزر گئے اور دنیا نے دیکھا کہ شیخ عبدالرحیم کا "بڑا بھائی" انسانوں کے ایک وسیع تر حلقے کا بڑا بھائی بن گیا۔ یہ حلقہ قرابت داری اور قومیت کے حدود سے ماورا، بنی آدم کی اخوت کا حلقہ ہے، جہاں بڑا بھائی ہر کسی کے لئے اپنا بڑا دل کھلا رکھتا ہے، ہر کسی کو اپنی بزرگانہ شفقت کا سہارا دیتا ہے، چھوٹے بھائیوں کی تعداد اب بے شمار ہے۔ کیا معصوم اور کیا خطاکار، کبھی اپنی اپنی فریاد لے کر بڑے بھائی کے حضور میں پہنچ جاتے ہیں، اور انھیں کم از کم شنوائی اور ہمدردانہ شنوائی، ضرور ملتی ہے۔ انسان دوستی کے اس عالم میں جسٹس رحمٰن خطاکار کی خطا اور غرضمند کی خودغرضی کو نظرانداز نہیں کرتے لیکن سائل کی خطا و عصیان کو غیر متناسب اور انتقام پسندانہ اہمیت بھی نہیں دیتے۔ وہ نکتہ بینی کرتے ہیں نکتہ چینی نہیں کرتے۔ اُن کا

مزاجِ سعدی کا مزاج ہے۔ وہ اپنی سلامتِ طبع کے ساتھ یہی انسانی ہمدردی کے جذبے کو اس طرح ملاتے ہیں کہ رحم و انصاف کی باہمی تفریق معدوم ہو جاتی ہے اور ہم خود بخود مان لیتے ہیں کہ انسان کے دکھ درد میں شریک ہونا سب سے بڑی عقل مندی اور دوسرے کی بد اخلاقی پر اپنے عمل کی بنیاد رکھنا انتہا درجے کی نافہمی ہے۔

گزشتہ آٹھ دس برس کے عرصے میں یونیورسٹی کے اندر اور باہر مختلف انتظامی اور علمی و ادبی کمیٹیوں میں مجھے جسٹس رحمٰن کے ساتھ شریک ہونے کے بے شمار موقعے ملے ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ جسٹس رحمٰن کبھی کسی جلسے میں کسی خاص طرزِ فکر کی وکالت کی قسم کھا کر نہیں آتے وہ اُن لوگوں میں ہیں جو دوسروں کی بات سننے کی استعداد رکھتے ہیں اور نئے معلومات کی روشنی میں نئی رائے قائم کرنے سے احتراز نہیں کرتے۔ اختلافِ رائے کا موقع آن پڑے تو جسٹس رحمٰن دوسرے کے نقطہ نظر پر حملہ آور نہیں ہوتے، بلکہ ہر مخالف دلیل کو تھوڑی دیر ذہن میں پرکھنے کے بعد اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو کی چمک دمک میں طنز، طعن، تشنیع کی چبھن کبھی شامل نہیں ہوتی۔ بحث کے دوران میں بھی وہ بدستور ایک حلیم مگر بذلہ سنج، تیز طرار مگر مرنجاں مرنج انسان رہتے ہیں۔ اُن کی ذاتی شائستگی محض ایک شستہ لہجے اور لفظوں کے رکھ رکھاؤ سے عبارت نہیں۔ بلکہ اندرونِ قلب کی وسیع النظری اور عالمگیر انسانی ہمدردی کا بیرونی عکس ہے۔

ذاتی طور پر میں خوش ہوں کہ جسٹس رحمٰن کو اس ارمغانِ علمی کی پیشکش ایسے وقت میں ہوئی جب یونیورسٹی کا انصرام مجھے تفویض تھا۔ رحمٰن صاحب کے ساتھ میرا تعلق بحیثیت ہم سن، ہم وطن، ہم سبق کے، نصف صدی کے کچھ اوپر تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ حسنِ اتفاق ہے کہ جس یونیورسٹی کا امتحانِ داخلہ ہم دونوں نے ۱۹۱۹ء میں دیا تھا، اسی کے سینٹ روم میں رحمٰن صاحب کے کارناموں پر خراجِ تحسین پیش کرنے کا اہتمام ہوا اور اس جشنِ مسرت میں یونیورسٹی کی نمائندگی میرے حصے میں آئی۔

پنجاب یونیورسٹی اپنے عظیم اور نامور فرزند جسٹس شیخ عبدالرحمٰن کو اہلِ علم کی طرف سے اُن کے فضل و کمال کے اس اعتراف پر مبارکباد دیتی ہے یونیورسٹی کی طرف سے اس قسم کی تہنیت کے وصول کرنے کا حق جسٹس رحمٰن سے زیادہ کسی کو نہیں پہنچتا، کیونکہ یونیورسٹی کے ساتھ اُن کے ربطِ خاص کے جلی و خفی پہلو کثرت اور تنوع کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ گزشتہ بیس برس کے عرصے میں یونیورسٹی کی زندگی کے ہر اہم موڑ پر جہاں علمی اور تنظیمی منصوبہ بندی یا تعمیری و تخلیقی کاوش کی کسی نئی منزل کا آغاز ہوا جسٹس رحمٰن ایک مخلص رفیق و رہنما کی طرح اپنے دل و دماغ کا بہترین سرمایہ لئے ہوئے موجود تھے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ رحمٰن صاحب طویل یا مختصر عرصے کے لئے، کئی بار یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے مگر سنڈیکیٹ اور سینیٹ کے رکن کی حیثیت سے اُن کی وہ بے شمار خدمات جو ہماری تعلیمی عمارت کی بنیاد کے سنگ و خشت میں شامل ہیں، اپنا حقیقی اور مستحکم وجود رکھتے ہوئے بھی دنیا کی نظر سے پنہاں ہیں۔ پھر یونیورسٹی کی متعدد دستوری، انتظامی اور مشاورتی مجلسوں میں بطور ایک معتمد کارکن کے، اُن کی باقاعدہ شرکت بے لوث کام کی ایک ایسی مثال ہے جس سے یونیورسٹی کے در و بام ہمیشہ فروزاں رہیں گے۔

ایس، اے، رحمٰن

شہیدِ ملّت و وطن!

شہیدِ ملّت و وطن، نبیؐ کے دیں کی آبرو
وہ سرزمیں مجھے حرم، گرا جہاں ترا لہو
وہ خاکِ پاک جس نے تیرے خوں سے کرلیا وضو
صداقتیں، شجاعتیں، اسی سے پائیں گی نمو
شہیدِ ملّت و وطن، عزیزِ دو جہاں ہے تو!

شہید! تیری ہمتوں سے موت مات کھا گئی
حیات تیرے فیض سے ابد کا راز پا گئی
بہارِ شوق کی فضا عجیب گل کھلا گئی
ادائے نازِ عاشقی نیاز کو سکھا گئی
چمن کو تیری آرزو، چمن ہے تیرا رنگ و بو!

ہوس کے بتکدے میں تو نے دی ہے پیار کی اذاں
ضمیرِ لا الٰہ تیرے عزم کا ہے رازداں
سدا رہے گی سطوتِ وطن تری فسانہ خواں
ترے قدم کی برکتیں مکاں مکاں، زماں زماں
نہ بندشوں میں رکھ سکا تجھے جہانِ چار سُو!

گواہی جاں سے کے تو نے دی ہے حق کی ذات پر
چلیں گے قافلے ترے نشانِ پا کو دیکھ کر
غبارِ رہ ترا ہے ہر جواں کو سرمۂ نظر
ترے چراغ سے سحر کی مل گئی ہمیں خبر
نہیں ہے قوم کو خطر، ہو لاکھ شورشِ عدو!

ایس، اے، رحمٰن

○

مقامِ شکر ہے اے دل، شبِ کرب و بلا گزری
شکایت کیا، گِلہ کیسا، اگر آہستہ پا گزری

جب آئی تھی، جفا کی بجلیاں بھی ساتھ لائی تھی
مگر سینے میں، روشن کر کے قندیلِ وفا گزری

خدا ہی جانتا ہے کس طرح ہم نے گزاری تھی
وہ لمبی اور کالی رات، جو تم سے جدا گزری

عدو کے جَور سے جو کچھ بھی بیتی تھی سو بیتی تھی
مگر جو دوست کے ہاتھوں سرِ اہلِ وفا گزری

صبا آئی ہو اُدھر سے، کہو کچھ خلد راضی کی
جنوں کی کیا سزا ٹھہری، گل و لالہ پہ کیا گزری؟

فیض احمد فیض

بلیک آؤٹ

جب سے بے نور ہوئی ہیں شمعیں
خاک میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں، نہ جانے کس جا
کھو گئی ہیں مری دونوں آنکھیں
تم جو واقف ہو، بتاؤ کوئی پہچان مری
اس طرح ہے کہ ہر اک رگ میں اُتر آیا ہے
موج در موج کسی زہر کا قاتل دریا
تیرا ارمان، تری یاد لیے، جان مری
جانے کس موج میں غلطاں ہے کہاں دل میرا
ایک پل ٹھہرو کہ اُس پار کسی دنیا سے
برق آئے مری جانب، یدِ بیضا لے کر
اور مری آنکھوں کے گم گشتہ گہر
جامِ ظلمت سے سیہ مست نئی آنکھوں کے شب تاب گہر لوٹا دے
ایک پل ٹھہرو کہ دریا کا کہیں پاٹ لگے
اور نیا دل میرا
زہر میں دھل کے، فنا ہو کے کسی گھاٹ لگے
پھر پئے نذر، نئے دیدہ و دل لے کے چلوں
حسن کی مدح کروں
عشق کا مضموں لکھوں

فیض احمد فیض

بَین

اٹھو اب ماٹی سے اٹھو
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال

تمری سیج سجاون کارن
دیکھو آئی رین اندھیارن
نیلے شال دوشالے لے کر
جن میں ان دُکھین اَکھین نے
ڈھیر کیے ہیں اتنے موتی
اتنے موتی
جن کی جیوتی سنگ تمھارا
جگ جگ لاگا نام چمکنے
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال

گھر گھر بکھرا بھور کا کندن
گھور اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکے ہیں
بالی دلہنیا، بانکے بیرن
سونا تمرا راج پڑا ہے
دیکھو کتنا کاج پڑا ہے
بیری براجے راج سنگھاسن
تم ماٹی میں لال
اٹھو اب ماٹی سے اٹھو
جاگو میرے لال

ہٹ نہ کرو، ماٹی سے اٹھو
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال

منظور حسین شور

جشنِ ماتم

آنکھوں میں سرورِ ساغر و چنگ
نظروں میں ہزاروں جلوے بے رنگ
تعبیر نہ پوچھ، خواب مت پوچھ، زہراب ہے یا شراب، مت پوچھ

ساقی نہیں، نغمہ گر نہیں ہے
قدموں پہ کسی کے سر نہیں ہے
محفل سے اٹھا ہوں داغ لے کر چلتا ہوں جلا چراغ لے کر

آزادِ نوازشِ خضر ہوں
اپنا ہی چراغِ رہگذر ہوں
اتنی بھی نہیں نگاہ مجبور سورج مری ذات سے نہیں دور

صرصر کی ہنسی بھی دیپ کا غم
خورشید کی لو بھی مرگِ شبنم
جیسے گذرے گذر گئے دن بیتے ہوئے ماہ و سال مت گن

کھا جائے زمیں کو سیلِ ظلمات
اتنی بھی سیہ نہیں کوئی رات
پھوٹا وہ افق سے پھر اُجالا سورج نے وہ دیکھ منہ نکالا

تاروں کا سکوت میرا ہمراز
سورج کا ضمیر میری آواز
تقدیر کی ناؤ دیکھے رہا ہوں طوفاں کو دعائیں دے رہا ہوں

مختار صدیقی

بیترس نے کہا

سالہا سال کے نیرنگِ تمنّا کا جو مجبور تماشائی ہو
اُسے ہوگا بھی، تو کس چیز کا ارماں ہوگا ؟

وہ شب و روز بھی تھے :
جن میں کہ تم ایک خیال
ایک تصوّر کی طرح
میری نگاہوں کے افق پر جھلکیں !
وہ شب و روز بھی تھے :
جن میں خیالوں کے افق کا تارا :
اک چھلاوے کی طرح میری زمیں پہ آیا !
اور یہ ایسا چھلاوہ تھا
جو اپنے ہی گریز
اور تامّل کی کڑی بھول بھلیّوں کا نگہباں ہوگا !

یہ چھلاوہ کبھی چپ کراتا بگولا تھا :
کبھی بھول سی آنکھوں کی نگاہیں تھیں !
کبھی بات کی دھیج، لہجے کی طلعت تھی
کبھی آمنا سامنا ایسا تھا
کہ خورشید بھی اس طرح نہ تاباں ہوگا !

ان شب و روز میں :
دید اور تمنّا کے کچھ ایسے بھی کرشمے تھے
کہ اک آن میں جس طرح سے
اک تان سہانی کسی پلٹے میں نہاں ہو جائے !
اور کچھ ایسے نمایاں ہو :
کہ دریا کبھی موجوں سے نہ پنہاں ہوگا !!

سالہا سال کے نیرنگِ تمنّا میں
وہ دن اور وہ راتیں بھی سسکتی رہیں
جب زندگی کرنے کے جتن مرجھاتے !
جبھی تھیں رنج کی آنچیں
تو مری شامیں تھیں
ویران خیالی کے سلگتے سائے

(۲)

اور وہ دن بھی تمھیں یاد ہیں ؟
جب باتوں کی پرچھائیاں
اک بات کے اظہار سے
اک بات کے اقرار سے
لَو دیتی تھیں ؟

تم یہ کہتے تھے — کہ ہر بات کو کہنا سیکھو
میں یہ کہتی تھی — کہ کہنے سے بھلا کیا ہوگا!
تم یہ کہتے تھے — تامّل سے تو اچھا ہوگا
میں یہ کہتی تھی — گمانوں سے نہیں
بلکہ یقیں اور بھروسے سے بھی رہنا سیکھو!"

ہاں یہ مجبورِ تماشائی کی مختاری تھی اتنی ہی
کہ خود اپنے یقیں
اپنے بھروسے پہ شب و روز کا نیرنگِ تمنا دیکھے!
ہو سکے، تو تری صورت، تری دنیا دیکھے!
ورنہ — خود اپنے خرابوں کا تماشا دیکھے!

(۳)

اور پھر — روح کی پہنائی میں
اک طور بنایا گیا!
اک برقِ تجلی کے ڈنک اُٹھے الوہی انوار!
اس میں تھیں حسنِ ازل
اور ترے حسن کی
اور حسنِ تمنا کی نرالی شانیں
اس کے جلووں سے ملیں، مجھ کو مری
اور شب و روز کے نیرنگِ تمنا کی نئی پہچانیں!
اس کے نیرنگ میں،
کیا سوز و سکوں کا تھا وفور
اور ہر اک آن نئی شان میں
وہ حسنِ غیاب، اور کبھی حسنِ حضور!
اور ہر لحظہ، نئی موت سے مرتی
تو نئی زیست سے جیتی جانیں!!

(۴)

"سنو — یہ موڑ جو آیا ہے
تو نیرنگِ تمنا کے شب و روز کا
وہ تارا ملا ہے کہ نہیں؟
وہ چھلاوا کہ جو باتوں کا حجاب
اور گریز اور تامّل کا سراب
اور لرزتی ہوئی تمانوں کا تھا سیماب
وہ نیرنگِ تمنا کا صلہ ہے کہ نہیں
میں حقیقت کی تجلی ہوں
کہ جو رو برو
اب جلوہ نما ہے کہ نہیں!!

عارف عبد المتین

مہک

مرے وطن، تری مٹی کی سوندھی سوندھی مہک
گُلِ ارم کی مہک سے عزیز تر ہے مجھے
یہ سوندھی سوندھی مہک ذہن میں ابھارتی ہے
مرے اب و جدِ عالی کے تابناک نقوش
مرے اب و جدِ عالی، کہ جن کی عظمت نے
یہاں جلائے تھے عرفان و آگہی کے چراغ
وفا و مہر و محبت کے، آشتی کے چراغ
وطن کی عزت و ناموس کے، خودی کے چراغ
چراغ — جن کو فروزاں کیا بہ فیضِ جنوں
مرے اب و جدِ عالی نے اپنا خوں دے کر
وہ خون جس میں حرارت بھی اور نور بھی تھا
جوان امنگوں کا نشہ بھی تھا، شعور بھی تھا

مرے وطن، تری مٹی کی سوندھی سوندھی مہک
گلِ ارم کی مہک سے عزیز تر ہے مجھے
یہ سوندھی سوندھی مہک ذہن میں ابھارتی ہے
مرے جیالے رفیقوں کے تابناک نقوش
مرے جیالے رفیق — آہنی ارادہ لیے
جو رہگذارِ نیاگاں پہ گامزن ہو کر
جہاں سے دادِ شجاعت قبول کرتے ہوئے
لہو کا آتشیں نذرانہ دے گئے ہیں ابھی
کہ بجھ نہ جائیں کہیں بادِ جبر کے ہاتھوں
چراغ، جن کو فروزاں کیا بہ فیضِ جنوں
مرے اب و جدِ عالی نے اپنا خوں دے کر
اور آج جن کی ضیا رہے مری بقا کی امیں

ابن انشا

فرض کرو

فرض کرو ہم اہلِ وفا ہوں، فرض کرو دیوانے ہوں
فرض کرو یہ دونوں باتیں جھوٹی ہوں، افسانے ہوں
فرض کرو یہ جی کی بپتا، جی سے جوڑ سنائی ہو
فرض کرو ابھی اور ہو اتنی، آدھی ہم نے چھپائی ہو
فرض کرو تمہیں خوش کرنے کے ڈھونڈے ہم نے بہانے ہوں
فرض کرو یہ نین تمہارے سچ مچ کے میخانے ہوں
فرض کرو یہ روگ ہو جھوٹا، جھوٹی پیت ہماری ہو
فرض کرو اس پیت کے روگ میں سانس بھی ہم پر بھاری ہو
فرض کرو یہ جوگ بجوگ کا ہم نے ڈھونگ رچایا ہو
فرض کرو یہی ایک حقیقت، باقی سب کچھ مایا ہو

جان مری! ہاں کہہ گئے باہُو، کون دلوں کی جانے ۔ ہُو
بستی بستی صحرا صحرا لاکھوں کریں دِوانے، ہُو
جوگی کتنے، نگر نگر میں مارے مارے پھرتے ہیں
کاسا لیے، بھبوت رمائے سب کے دوارے پھرتے ہیں
شاعر بھی کیا میٹھی بولی بول کے من کو ہرتے ہیں
بنجارے بھی اُونچے داموں جی کے سودے کرتے ہیں
ان میں سچے موتی بھی ہیں، ان میں کنکر پتھر بھی
ان میں اُتھلے پانی بھی ہیں، ان میں گہرے ساگر بھی
دیکھ پرکھ کے آگے بڑھنا، سب کا جھوٹا سچا ـــــ ہُو
ڈوبنے والی ڈوب گئی، وہ گھڑا تھا جس کا کچا ۔ ہُو

ادا جعفری

ساتھی

تم بھی چلے تھے سوئے در، ہم بھی چلے تھے سوئے در
تم بھی اُٹھے بہ چشمِ نم، ہم بھی بڑھے بہ اشکِ تر
تم بھی وفا شناس تھے، ہم بھی وفا شعار تھے
ہم بھی گئے تھے سر بکف، تم بھی جگر فگار تھے
تم بھی تھے آبروئے گل، ہم بھی تھے غیرتِ سمن
تم بھی دریدہ جیب تھے، ہم بھی تھے چاک پیرہن
یاد تو ہوگا تم کو بھی، کتنی لگن کا ساتھ تھا
چاہتیں بھی تھیں، قرب بھی، ہاتھ میں اپنے ہاتھ تھا
جب بھی چلے ہیں ساتھ ہم، گام بہ گام تھے بہم
معرکۂ دل و نظر اپنے ہی خوں سے ہے رقم
شوق وہی، تپش وہی، درد وہی، خلش وہی
منزلِ آرزو وہی، راہ وہی، روش وہی
پھر بھی کھنچے کھنچے سے ہو، پھر بھی رُکے رُکے سے ہو
ایک ہے قصۂ جنوں، پھر بھی بٹے بٹے سے ہو

تابش صدیقی

میراجی

اُس کی آنکھیں، اس کی زلفیں
آج بھی مجھ کو یاد ہیں جیسے
میں نے اُن کو کل دیکھا ہے

آنکھوں کا معصوم تجسّس
آج بھی اُن کو ڈھونڈھ رہا ہے
اس کی تنہائی کا جنگل
جن کی یاد سے گونج رہا ہے

اُس کے چاہنے والے کیا کیا
اُس کا نام لیا کرتے تھے
اُس کے نئے پرانے نغمے
اس کی نثر لطیف کے ٹکڑے
اس کی اچھوتی دلکش باتیں
اُن کا رشتہ رجاں تھیں گویا
مجھ کو ان پر رشک آتا تھا

مجھ کو اس سے عشق نہیں تھا
میں اِک شرمیلا سا انساں
اس کے گیتوں کا دلدادہ

دور ہی دور سے،
ڈرتے ڈرتے
اس کو دیکھ لیا کرتا تھا
مجھ کو اس سے عشق نہیں تھا

مجھ کو اس سے عشق نہیں ہے
لیکن پھر بھی میری آنکھیں،
"اُن زلفوں کو"
ان آنکھوں کو
آج بھی ہر سُو دیکھ رہی ہیں
اور وہ آنکھیں،
نغمہ آنکھیں
حیران اور متجسّس آنکھیں
آنسو آنکھیں
ہر رستے پر آن کھڑی ہیں
اور ہر آنے جانے والے راہی سے یہ
پوچھ رہی ہیں
آج مرے عشّاق کہاں ہیں!
آج مرے عشّاق کہاں ہیں!

مصطفیٰ زیدی

لائنحل

زباں پہ مُہرِ گدائی ہے، کس سے بات کروں
حرُوف کاسۂ بے مایہ ہیں، قلم کشکول
ضمیر بے حس و حرکت ہے، زیست بے پہلو
شکن ہے سینۂ بے تہہ میں، آستین پہ جھول
میں خود طلسم کی پریوں سے بے کنار ہوا
کسے کہوں کہ مری روح کے دریچے کھول

میں اک سراب کی خواہش پہ بیچ آیا ہوں
تمام بادہ و ساغر تمام تشنہ لبی
حریمِ عقل میں جس کا کوئی جواز نہ تھا
نشاطِ دل تھی وہی زندگی کی بے سببی
اُجڑ گئے مرے گلگشت، میرے رکنا باد
مری دعائے سحر، میری آہِ نیم شبی

کہاں وہ دن تھے کہ پروائے ننگ و نام نہ تھی
کہاں یہ وقت کہ سایہ سنبھل کے چلتا ہے
مجھے کسی بھی تعیّن پہ اختیار نہیں
یہ کوئی اور مرے راستے بدلتا ہے
جنوں سے رسم نہ رکھوں تو جاں سلگتی ہے
طلب کا قرض اُتاروں تو جسم جلتا ہے

ظہور نظر

گنبد کی آواز

وقت کی محراب سے لپٹی ہوئی
ماورا کی بیل کو پانی نہ دو!
یہ ہری کب تھی جو اب ہوگی ہری!؟

ہیں ازل سے خشک اس کے شاخسار
پھیلتے رہتے ہیں صبح و شام جن کے تار و پود
مثلِ تارِ جبرِ ناپیدا کنار —!

نقطہ در نقطہ ہے اس کا مرکزِ لا منتہی
دائرہ در دائرہ، محراب در محراب ہے اس کا سواد
جس کے لامحدود و نامعلوم کی تخلیق ہیں
وسوسے، حیرانیاں، دہشت گہِ آدم نژاد
جس کی اک اک شاخ، اک اک برگ کے خاشاک پر
جم رہا ہے جانے والی آنے والی ان گنت صدیوں کا دود
جس کے پیچ و خم میں پیچ و تاب کھاتے ہیں مضافاتِ عدم
جس کے الجھاؤ میں الجھے ہیں مقاماتِ وجود

سب دھواں ہے —،
سرحدِ امکاں سے لے کر لامکاں تک سب دھواں
صرف یہ لمحہ کہ جو موجود ہے
اور اس لمحے کی زندانی غمِ جاں کی حقیقت کے سوا
کوئی شے اس دہر کی دائم نہیں

راستوں کی زد پہ ہیں سب راستے
بے اماں گردش میں ہے گیتی کا چاک
ہر جہت ہر راہِ ہست و بود میں
اڑ رہی ہے وقت کے قدموں کی خاک

جانے والی ساعتیں کب آئیں گی!؟
آنے والی ساعتیں کیا لائیں گی!؟
بھول جاؤ بھول جاؤ بھول جاؤ!!

اور یہ لمحہ کہ جو موجود ہے
ہے یہی سب کچھ اسی کے ناز اٹھاؤ!
ہے یہی سب کچھ اسی پر جاں گنواؤ!!
جاں گنواؤ جاں گنواؤ جاں گنواؤ!!!

احمد ظفر

تین نظمیں

مسافت

کل اک سُونی راہ گزر پر
ننھے ننھے کچھ پھول کھلے تھے
شام ہوئی تو راہ رَووں نے
جتنے پھول تھے توڑ لیے تھے
آج وہ راہگزر اک بیوہ
سر نیہوڑائے اُونگھ رہی ہے!

بساط

تو جھک بھی گئی تو کیا ہو گا
میں چپ بھی رہا تو کیا ہو گا
تو ڈالی ہے!
میں پتھر ہوں!
ڈالی میں پھول کھلا تو کیا
پتھر خاموش رہا تو کیا

ایک احساس

وہ اجنبی جو میرے خیالوں کا چاند ہے
ڈوبا ہے اس طرح کہ کوئی آشنا نہیں
میں غمزدہ ہوں جس طرح ساحل سے دور موج
میں بے نوا ہوں جس طرح خاموش پھول ہے

احمد فراز

کردار

ہم ابھی استادہ تھے
اب سے کچھ پہلے
وفا کے فرشِ پائندہ پہ
خوش وقتی کے رنگیں شامیانوں کے تلے

سینے ہاتھوں میں
قرار و قول کی شمعیں لیے

آندھیوں میں، زلزلوں میں
تا قیامت ساتھ دینے کے لیے آمادہ تھے
ایک دوسرے کے کس قدر دلدادہ تھے

دیکھنے والوں میں شامل

یار بھی، اغیار بھی
چند آنکھوں میں نمی
چند آنکھوں میں حقارت — برہمی
چند آنکھوں میں سکوتِ دائمی
جم گئے سائے اُدھر
اور کانپ اٹھی اس طرف دیوار بھی
دشمنوں کو بھی یقیں
اور بدگماں کچھ ہمنشیں — غمخوار بھی

دیکھنے والوں نے دیکھا
کس طرح صدیاں اچانک ثانیوں میں بٹ گئیں
شامیانوں کی طنابیں کٹ گئیں
فرشِ پائندہ و مرمر کی سلیں بھی پھٹ گئیں
اور وہ پیکر
خود اپنے آپ
خوں میں تر بتر
خاک پر افتادہ تھے
ہم ابھی استادہ تھے

جمیل ملک

ضبطِ اظہار

بجھ گیا رنگِ شفق
جگمگانے لگے پھر شام کی پلکوں پہ چراغ
رات آئی تو دھواں دھار گھٹا بھی لائی
بحر و بر گونج اُٹھے، ابر سے کوڑے برسے
سیٹیاں بجتی رہیں
تند، بلاخیز ہوا
کھڑکیوں سے، کبھی دروازوں سے ٹکراتی رہی
بند بازاروں میں، گلیوں میں، گھروں میں ہر سُو
موت منڈلاتی رہی
خوف کی چادریں تانے ہوئے دبکے رہے بے حس پیکر

کس قدر زور کا طوفاں تھا مگر
بوند پانی بھی تو برسا نہ کہیں
ضبطِ اظہار سے اپنی تو زباں سوکھ گئی
بجھ گئی جسم کی جوت
بڑھ گئی روح کی پیاس
تھم گئی وقت کی رو
سو گئی رات، ستاروں کی لویں ماند ہوئیں
کوئی آہٹ ہے، نہ دھڑکن ہے، نہ ارماں کوئی
دھند میں لپٹا ہوا دل ہے کہ اشکِ سرِ مژگاں کوئی

منتو بھائی

نیا پہلو

کپکپاتے ہاتھ پہلی بار شعلوں کی طرف لپکے، تپش محسوس کی
آگ ٹھنڈی پڑ گئی تو انگلیاں جلنے لگیں، دل نے خلش محسوس کی

دھڑکنوں کا شور اتنے زور کا تھا سوچ کی راہوں میں۔ حائل ہو گیا
راہرو سمجھے، تھکا ہارا مسافر تھا، ملا سایہ تو پڑ کر سو گیا

سارے رستے آزمائے جو پلٹ کر پھر نہ آئے، ایسی رہ کوئی نہ تھی
بانہیں پھیلائے ہوئے ان فاصلوں کو جو مٹائے، ایسی رہ کوئی نہ تھی

آرزو نے حسرتوں کے جس قدر موتی چُنے تھے، آنسوؤں میں بہہ گئے
جاگتی آنکھوں کے سپنے وقت کی رفتار کے محتاج ہو کر رہ گئے

خود پسندی خود فراموشی بنی تھی ۔ اپنا یہ پہلو ابھی دیکھا نہ تھا
حادثے دیکھے سُنے پر دل کو یوں روتے ہوئے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا

۔ پوچھنے والوں نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟" —— "کچھ بھی نہیں!"
اب تو اپنے پاس کہنے کو رہا کچھ بھی نہیں!

ساقی فاروقی

راز

دیکھی تصویر نرالی
دو کالے ہاتھ سوالی
دو آنکھیں اندھی خالی

یہ ہاتھ سوالی کیوں ہیں
یہ آنکھیں خالی کیوں ہیں

یہ بھید بہت گہرا ہے
دیوار گرا کر دیکھو!
دیوار کے پیچھے کیا ہے

سر مٹی چاٹ رہے ہیں
دھڑ قبروں سے نکلے ہیں
بیساکھی پر چلتے ہیں

یہ بیساکھی کیسی ہے
اور سروں پہ کیا گزری ہے

یہ بھید بہت گہرا ہے
دیوار گرا کر دیکھو!
دیوار کے پیچھے کیا ہے

احمد بشیر

میرے پست ارادے

لاکھوں چاند، کروڑوں سورج، اربوں تارے
ابد کے پیپل کے ٹہنوں میں گھونسلے ڈالے
بیٹھے
دیکھ رہے ہیں
کچھ کیڑے ہیں
اپنے اپنے ڈنک اُٹھائے، دانت نکالے، پنجوں پر زہراب چڑھائے
کس کو ماریں، کس کو چیریں، کس کو پھاڑیں، کس کو کھائیں
کس کے لہو سے پیاس بجھائیں
کون تھکا ہے!
کون گرا ہے!

ابد کے پیپل کا پھیلاؤ
میرے پست ارادوں، کالے بھتنوں کا مرگھٹ ہے
پیلی چڑیلوں کا مرگھٹ ہے
جن کو میں نے پسلی توڑ کے جنم دیا
(آرزوؤں نے کیسے کیسے سوانگ بھرے)
کالے بھتنے، پیلی چڑیلیں، جب من چاہیں جی اُٹھتے ہیں
بھیانک سایے میرا پیچھا کرتے ہیں
چیختی چیلیں میری آنکھیں نوچتی ہیں
اندھا، بہرا، گونگا
مٹی کا اک تودہ
میں منہ ڈھانپے سوچ رہا ہوں
کسی کل جُگ سے آیا ہوں؟
یہ کیسا کل جگ ہے؟
کس کل جگ کو جاؤں گا!

لاکھوں چاند، کروڑوں سورج، اربوں تارے
دیکھ رہے ہیں
ان سے ورا کچھ ہے کہ نہیں ہے

صلاح الدین محمد

مہرِ نو

نگارِ صبح کے بیمار دونوں
شبِ آخر بھی، روزِ مہرِ نو بھی

ستارے یوں بھی جل بجھنے کے قائل
شبِ آخر میں چشمِ نیم وا ہیں
شبِ آخر سیاہی سے گریزاں
ستارے بھی سیاہی سے خفا ہیں

نگارِ صبح سے وارفتگی سی
بڑھی تو رات نے سب کچھ لٹایا
ستارے بیچ ڈالے، نور بیچا
شبِ آفات نے سب کچھ لٹایا

نگارِ صبح کی چاہت نویلی
شبِ آخر سے مل کر بھی جدا ہے
سحر کے زیرِ بالیں مہرِ نو ہے
طلوعِ مہر سے محشر بپا ہے

شبِ آخر رقیبِ روشنی ہے
شبِ آخر سے دن کی دشمنی ہے

حسن حمیدی

آئینہ

اُس نے سوچا کہ "فسانۂ گل کا
دشت کی خشک زباں پر لکھ دوں"
اُس نے سوچا کہ "محبت کے اصول
وقت کے ریگِ رواں پر لکھ دوں؟"
"سب سنیں دل کے دھڑکنے کی صدا
فرصتِ جنبشِ لب سب کو ملے
اس طرح انجمن آرائی ہو
گوشۂ بزمِ طرب سب کو ملے"
سب نے دیکھا درِ زنداں کا ذہن
پےِ تعظیم کھلا رہنے ہوا
بارشِ سنگ ہوئی پھول کھلے
(کون اس راہ میں خورسند ہوا؟)
یہ کوئی قصۂ پارینہ ہے؟
یا مرے سامنے آئینہ ہے؟

رحمان فواز

بے نشاں

ہاں، یہ سچ ہے، ترے نگر میں، جہاں
روز چڑھتا ہُوا نیا سورج
تیرے اونچے مکان کی چھت پر
جھک کے تجھ کو سلام کرتا ہے
میں بھی رہتا ہوں، میرے حصے میں
اک شکستہ سا کلبۂ ویراں
میری مانند اُداس اور حیراں

میری قسمت کی نارسائی تھی
کہ کبھی تیری اک اچٹتی نظر
میرے حالِ زبوں پہ پڑ نہ سکی
میری نوکِ مژہ پہ آ نہ سکا
ایک آنسو — جو میرے دل کا حال
تجھ سے اپنی زباں میں کہہ جاتا

عمر بھر منتظر رہا ہوں، مگر
رس میں ڈوبے وہ قہقہے تیرے
تیرے اُونچے مکاں کے زینوں سے
ایک لمحہ کو بھی اُتر نہ سکے
فاصلے دھڑکنوں کے بڑھتے گئے

صدیاں بیتی ہیں، مدتیں گذریں
اور میں بے نشان، نامعلوم
سوچتا ہوں، میری وفا کا مآل؟
میری خاموشیوں کے لب پہ کبھی
کاش آئے کوئی مچلتا سوال
میری پلکوں سے ٹوٹ کر کوئی اشک
میرے رخسار پر ڈھلک آئے
تجھ کو میرا سراغ مل جائے

جون ایلیا

لوحِ دائرہ

(ایک طویل رزمیہ نظم 'نئی آگ' کے عہد نامے کی ایک لوح)

میں دائرے پر پڑا ہوا اپنے خوں کے دھبوں کو چاٹتا ہوں
کہ میرے ہونے کا سارا الزام میرے سر ہے
لبوں کی دہلیز پر مری روح کب سے فریاد کر رہی ہے
میں اپنے سینے میں جل رہا ہوں، میں اپنی آنکھوں میں بجھ رہا ہوں
یہ شاہراہوں کا حادثہ ہے مگر کسی کو خبر نہیں ہے
مجھے بچالو، مجھے بچالو
ہجومِ آدم جواب دے۔ کیا یہ کوئی صحرا ہے شہر کی رہگزر نہیں ہے؟
میں پھر نہ آؤں گا میری آواز پھر نہ آئے گی
میرا اثبات پھر نہ ٹکرائے گا تمھاری بطالتوں سے
—— مگر مرا بال بال مقروض ہے مرے جبرِ آگہی کا
میں اپنی آواز کا بدن ہوں
جو چپ ہے اس کی زبان اس کے دہن میں سڑ جائے گی۔
میں بولوں گا اور مرا بولنا ہی میرا زیاں بھی ٹھیرے گا
میرے سینے میں جو خراشیں سلگ رہی ہیں
وہ آخرِ کار میری لوحِ مزار کا حاشیہ بنیں گی

جواب کی بستیوں کے دروازے بند ہیں اور مرا گلا خشک ہو چکا ہے
تمام انسان اپنی پرچھائیوں کو اوڑھے ہوئے ہیں اور شام بہہ رہی ہے
دھند نے چوک کے بڑے برج کا مثلث نگل لیا ہے
سکوت کا زہر ریشوں میں گھل چکا ہے
میں ایک سنگیں مجسمہ ہوں جسے بنا کر جسے خیاباں میں نصب کر کے
مجسمہ ساز اور معمار اپنا روزینہ پا چکے ہیں
میں ایک سنگیں مجسمہ ہوں
جو دھند کی طیلسان اوڑھے ہوئے ہیولوں کو تک رہا ہے
مگر سماعت کا جال اب جلد بن لیا جائے
سُن لیا جائے
میرے اطراف ایک طوفان اُٹھنے والا ہے
جو زمینوں کو یوں نگل لے گا جیسے یہ لوگ اپنے لوگوں کا
خونِ بستہ نگل رہے ہیں
میں اپنے سینے میں جل رہا ہوں، اپنی آنکھوں میں بجھ رہا ہوں

فہمیدہ ریاض

مدت سے ہے یہ عالم دل کا

مدت سے ہے یہ عالم دل کا، ہنسنا بھی نہیں، رونا بھی نہیں
ماضی بھی کبھی دل میں نہ چبھا، آیندہ کا سوچا بھی نہیں

وہ میرے ہونٹ پہ لکھا ہے جو حرف مکمل ہو نہ سکا
وہ میری آنکھ میں بستا ہے جو خواب کبھی دیکھا بھی نہیں

شامل ہے ہوا کی آہوں میں وہ گیت، جو لب تک آ نہ سکا
میری ہر نظم کا عنواں ہے جو شعر ابھی لکھا بھی نہیں

چلتے چلتے کچھ تھم جانا، پھر بوجھل قدموں سے چلنا
یہ کیسی کسک سی باقی ہے، جب پاؤں میں وہ کانٹا بھی نہیں

دھندلی سوئی شاموں میں کوئی پرچھائیں سی پھرتی رہتی ہے
میں آہٹ سنتی ہوں جس کی، وہ وہم نہیں، سایا بھی نہیں

تزئینِ لب و گیسو کیسی، پندار کا شیشہ ٹوٹ گیا
تھی جس کے لیے سب آرائش، اس نے تو ہمیں دیکھا بھی نہیں

جب سست قدم شب بیت چلی، ہولے ہولے نیند آ ہی گئی
سب افسوں وقت جگاتا ہے اور وقت کبھی ٹھہرا بھی نہیں

فہمیدہ ریاض

کچھ لوگ

دنیا کی لمبی راہوں پر ہم یوں تو چلتے جاتے ہیں
کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو یاد ہمیشہ آتے ہیں

وہ راہ بدلتے ہیں اپنی اور مڑ کر ہاتھ ہلاتے ہیں
لیکن وہ دلوں کو، یادوں کی خوشبو بن کر، مہکاتے ہیں

ایسے ہی سفر کرتے کرتے، اک شخص ملا ہم کو بھی کہیں
دنیا میں اچھے لوگ بہت، لیکن اس کی سی بات نہیں

وہ دھیمے لہجے والا تھا اور وہ دھیرے سے ہنستا تھا
جتنے بھی لوگ ملے ہم کو، سچ جانو، سب سے اچھا تھا

تھی لاگ نہ اس کے بولوں میں، کی بات نہ کوئی لگاوٹ کی
اس کے فقرے ٹوٹے ٹوٹے، اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی

کہ کر ہی نہ دے جو ہم چاہیں، سو چا ہی کرے بیٹھا بیٹھا
پر دیکھے ایسی نرمی سے، اک بار تو ہو جائے دھوکا

گو ساتھ ہمارا خوب رہا، اس کو نہ ہوئی پہچان بہت
گر بوجھ لے دل کی بات کبھی ہو جاتا تھا حیران بہت

اور ہم اس کی حیرانی پہ شرمندہ ہو کر رہ جاتے
کچھ اور ہمارا مطلب تھا — پھر دیر تلک یہ سمجھاتے

اب چہرہ اس کا اجلا ہو، یا آنکھیں اس کی ہوں گہری
یا اس کے پیارے ہونٹوں کی ہر بات لگے ٹھہری ٹھہری

کچھ لوگ جو اچھے ہوتے ہیں، وہ راہوں میں مل جاتے ہیں
ہیں ان کو اپنے کام بہت، کب اپنا وقت گنواتے ہیں
کب پیار سے پیار سے ہنستے ہیں، کب جی کو روگ لگاتے ہیں

فہمیدہ ریاض

قطرہ قطرہ

قطرہ قطرہ دل میں آنسو گرتے ہیں

اک آنسو اس شخص کا، جو بے گانہ ہے
اِک آنسو اس نام کا، جو ہم لے نہ سکے
اِک آنسو اس دعا کا، جو پوری نہ ہوئی
ایک فضول سی بات کہ جو بے سود کہی
(آنسو میرا خواب، میں جس سے گھبراؤں
آنسو میری مراد، جسے میں بہلاؤں)
اک آنسو اس چہرے کا، جو یاد رہے
آنکھوں کے رستے جو دل میں اُتر جائے
اک آنسو اس ٹھہرے ٹھہرے لہجے کا
اک آنسو اس وہم کا ذہن میں جو آیا
اک آنسو اس جھوٹ کا، جو اوروں سے کہا
پھیکی ہنسی سے کیسے قصہ ختم کیا
لمحہ لمحہ رات گزرتی جاتی ہے

قطرہ قطرہ دل میں آنسو گرتے ہیں

کمار پاشی

بونوں کے درمیان

کس قدر بے کار سی باتوں میں الجھے ہیں سبھی
چاہتے ہیں رنگ دیں اپنے لہو سے
یہ در و دیوار ـــ
سارا شہر ـــ یہ ساری زمیں

اس مشینی دور سے آگے بھی ہیں کچھ منزلیں
اور وہ تنہا، اکیلا آدمی
آج بھی جس کو زوال آیا نہیں

تم سے لاکھوں اور بھی تھے
جن کی دھرتی کو سمندر کھا گئے
اور جو پرچھائیوں کے جنگلوں میں
گھر کے بونے ہو گئے
مجھ سے بھی چھوٹے ہو گئے

پیش گوئی

تماشے کی حقیقت کھل چکی ساری
سبھی رستوں سے آکر آ ملے ہیں موت کے پیاسے
ہماری صبح گھائل ہو کے اب دم توڑتی ہو گی
کسی ویراں سرائے میں
ہمارا آسماں بھی ٹوٹ کر ساگر کے کالے پانیوں میں
ریزہ ریزہ گھل چکا ہو گا

ہم اپنی چھت پہ چڑھ کے موت کو للکارتے ہوں گے
وہ تھک کر سو چکی ہو گی
اور اس کی چھاتیوں میں گرم نیزے گڑ چکے ہوں گے

اعجاز فاروقی

تاریخ کا پہلا باب

مجھے سکھایا گیا ہے
میرے ہی باپ دادا نے آ کے اس سرزمین کو نورِ علم و دانش عطا کیا
وگرنہ یاں تو ہر سمت گھور تاریکیاں تھیں
یہ سرزمیں، یہ دھرتی، مرا وطن۔
جس کے ذرّے ذرّے کی دلفریبی پہ میری آنکھیں خوشی سے
موتی بکھیرتی ہیں

یہ اونچے اونچے پہاڑ
اقدارِ عالیہ کی علامتیں
یہ رواں دواں نرم رَو سی ندّی
نشانِ طبعِ رواں
یہ اشجار کے گھنے سائے
گود ماں کی
یہ ڈالیاں، جھومتی، لچکتی
خیال کے نرم نرم ہلکورے
لالہ و گل
یہ زندگی کے حسین لمحوں کی پتّیاں

وہ لوگ آئے
تو ان کے سر میں عقاب تھے
جسم ناگ تھے
دل تھے منجمد خوں

انھیں پہاڑوں کی ندّیوں نے وہ ان کی آنکھوں کا خون
دھویا
اسی زمیں نے انھیں بھی چاندنی عطا کی

مرا یہ جسم اس زمیں کی مٹّی
مرے لہو میں جو چاندنی ہے
وہ اس زمیں کے شکم کی آتش نے مجھ کو بخشی

اعجاز فاروقی

میں اور تو

میں اک بھونرا
پنکھ پنکھ کا رس چوسوں
تو اک ایسا کنول
جو بھونرے کو آغوش میں لے کر
بند کلی بن جائے

میں اک پودا
جو شبنم سے پھولے پھلے
تیرے حسن کا ایسا موسم
صبح سویرے کہرا پڑ جائے

میں اک سورج
جس سے دن کا اُجالا ہو
تو اک بدلی
سورج کو دامن میں چھپاکر
گھور اندھیرا کرے

اجنبی شہر

وہ پیڑ اب کٹ گیا ہے
جس کے تلے جوانی کے گرم لمحوں کو ٹھنڈے سائے ملے
جو اک موڑ کا نشاں تھا
جہاں سے ہم اک نئی جہت کو چلے تھے
اب وہ نشان بھی مٹ گیا ہے

وہاں پہ اب اک سڑک ہے
جو گرمیوں میں پگھلی ہوئی سی رہتی ہے
(آدمی بھی پگھل رہا ہے)
وہاں پہ اب موٹروں کا دریا سا بہہ رہا ہے
اور ان کے پیچھے دھوئیں کے پردے پڑے ہیں
(کوئی نہ ان کو پہچان پائے)
اک شور ہارنوں کا بپا ہے
(کوئی نہ سُن سکے چہچے پرندوں کے)
ابتری ہے

مگر میں اک چاپ سن رہا ہوں
وہ چاپ، جیسے کوئی بہت دور جا چکا ہے

حسن اختر جلیل

ہم آرہے ہیں

ہوا کے جھونکوں
گرج کی لہروں
چمکتی بجلی کے سرخ کوڑوں
سے بھی سبک تر

ہم آرہے ہیں

تمہاری شاداب کھیتیوں کو
غنیم کی آگ سے بچانے
تمہاری گلرنگ وادیوں پہ
جمی ہوئی زردیوں
کے سفاک پاسبانوں کی راکھ اڑانے

ہم آرہے ہیں

ہماری نظریں ہیں برقِ خاطف
ہمارے بازو دمکتے خنجر
اسی یخ آلود رات کے آخری پہر میں
بہار کے خوشگوار سورج کی دھوپ بن کر
ہم آرہے ہیں

راج نرائن راز

نیا سال

زندگی اک کتاب ہے جس کے
لفظ — لمحے ہیں
میٹھے
کڑوے بھی
جملے — گھڑیاں ہیں
سہل
مشکل بھی
سطریں — دن ہیں
برے بھی
اچھے بھی
ماہ — اوراق
خشم گیں
دم ساز
سال ابواب
زخم
مرہم بھی

حد تو یہ ہے کہ یہ ادھوری ہے
آخری اور اولیں صفحات
جانے کس تیرگی میں کھوئے ہیں
کیسے غائب ہوئے نہیں معلوم!
ان کی بس داستاں سی باقی ہے
— اور یہ وہ کتاب ہے جس کو
ہر کوئی درمیاں سے پڑھتا ہے

میں نے آج ایک باب پڑھ ڈالا!

عرفانہ عزیز

کربِ آفرینش

کربِ تخلیق سے معمور فضا
مضطرب موجِ صبا
اوجِ افلاک سے تسکین طلب
شاخساروں کی دعا
کتنے نغموں کو جنم دیتی ہے
ایک غنچے کے چٹکنے کی صدا !!

اخترِ لرزاں

میرا پندارِ نظر ٹوٹ گیا
مجھ کو اب زیست کا حاصل نہ کہو
میں ہوں اک اخترِ لرزاں کی ضیا !

جنبشِ رنگ ـــــ سکوتِ شبنم
میں نہیں نکہتِ گل ـــــ موجِ صبا
پیکرِ نور، نہ رنگین قبا !

پرشوتم دیپ

تذبذب

چاندنی مضمحل تھی تا بہ نظر
اور آوارہ چاند ٹھٹھرا ہوا
دور برگد کے پھیلے پیڑوں میں
ڈھانپتا پھر رہا تھا عریانی
سہمی سہمی تھی رات کی دیوی
اور تارے فلک کے دامن پر
بکھرے تھے۔ جیسے خون کے چھینٹے
میرے ماتھے کے دیپ بجھنے لگے
اور احساس کی تڑپتی ہوا
اتنی شدت سے چیخی چلائی
میری آنکھوں کی جادو نگری میں
کھل گئے چند اور دروازے
میں نے دیکھا
زمیں پہ تا بہ نظر
میرے آگے ستارے بکھرے تھے
اور ہنستا ہوا سجیلا چاند
میرے قدموں سے کچھ ذرا آگے
اک اُڑن طشتری سی لگتا تھا
جس سے کچھ اجنبی سے سیمیں ہاتھ
اپنی جانب مجھے بلاتے تھے۔
میں نے اک سرد آہ بھر کے کہا
"کیسے آؤں وہاں، میں عریاں ہوں"
چاند نے مسکرا کے مجھ سے کہا
"بے خطر ہو کے آگے بڑھتا آ
چاندنی کی یہ ریشمیں چادر
ڈھانپ لے گی تمام عریانی"
ڈگمگا کر میں جونہی آگے بڑھا
میری ہاری ہوئی تمنائیں
میرا شانہ جھنجھوڑ کر بولیں
"کس طرف جا رہا ہے اے پگلے
تیرے آگے مہیب دریا ہے
جس کے شفاف نیلے پانی میں
عکس ہی عکس ہیں فضاؤں کے"

دُرانجم صدیقی

مجسّمہ

تودۂ سنگ پہ پھیلے ہوئے خوش رنگ نقوش
ایک ترشا ہوا شفاف بدن، پیکرِ خاکی سے ہم آہنگ نقوش
جس پہ بکھرے ہیں مہ و سال کے صدیوں کے غبار
جیسے تاریخ کے اوراق پہ محفوظ سطور
تیرے بُت خانوں میں بکھری ہوئی خوشبو کا دھواں
اور کسی شام کے معبد میں کہیں جلتے ہوئے سر دھوئیں والے چراغ
وہ پراسرار مہک ـــــ اور ترے قرب و جوار
کتنی مہکی ہوئی سانسوں کے تقدس کا نشہ
خاکدانوں کے تصرف میں وہ آدم کا وقار
وہ خداؤں کے قرینوں میں خدائی کا شعار
اور یہ گرمیٔ صد شام و سحر
بخش دیتی ہے حرارت ترے اجزا کو، مگر
یہ تری سرد جبیں ابھری ہوئی، ترشی ہوئی، پھیلی ہوئی،
یہ کسی ماہرِ فن کا شہکار
خاکِ انساں کے برابر تو نہیں!
تودۂ سنگ ہے یہ، خاک کا پیکر تو نہیں!

احمد ندیم قاسمی

بیسویں صدی

بات وجدان کی ہوتی تو بڑی بات نہ تھی
کہ رگِ سنگ سے خوشبو کے شرارے جھڑتے
ربطِ انسان کا افلاک سے آسنا بڑھتا
وہ جب اٹھتا تو ستاروں پہ بھی سائے پڑتے
اپنے محور پہ زمانے کو گھمانے لگتا،
آدمی، گردشِ ایام سے لڑتے لڑتے
کیا خبر تھی کہ اک ایسی بھی گھڑی آئے گی
عقل، وجدان کی باہوں میں سما جائے گی

آج جو شخص یہ کہتا ہے کہ سورج ہے سیاہ
اس کو اک روز صداقت کا ملے گا انعام
آج کے لوگ بایں دعوۂ عدل و انصاف
چاند بجھتا ہے تو دھرتے ہیں صبا پر الزام
برف سے آگ ٹپکتی ہے تو شعلے سے نمی
اور کہتے ہیں کہ بدلا نہیں فطرت کا نظام
عقل جو سوچ رہی ہے، وہی وجدان میں ہے
پہلے ممکن جو نہ تھا، اب وہی امکان میں ہے

عصمت چغتائی

کلّو

۱۹۵۰ء میں محترمہ عصمت چغتائی نے ایک کہانی لکھی اور محترم سردار جعفری اسے پڑھنے کے لئے گھر لے گئے۔ جعفری صاحب یہ کہانی لوٹانا بھول گئے مگر عصمت صاحبہ بھی بھول گئیں کہ انھوں نے "کلو" نام کی کوئی کہانی لکھی بھی تھی۔ اس کہانی کے کردار انہیں پریشان کرتے رہے اور آخر انھوں نے وہی کہانی ایک بار پھر لکھ کر حال ہی میں ایک رسالے کو بھجوا دی۔ دونوں کہانیوں کا نام ایک ہے۔ کردار اور واقعات ایک ہیں۔ ان کی تخلیق بھی ایک ہی ہے مگر انداز بیان کے لحاظ سے یہ دو کہانیاں ہیں۔ دونوں کو "قومی زبان" کے شکریے کے ساتھ یکجا شائع کیا جا رہا ہے کہ یہ ایک دلچسپ ادبی دستاویز ہے —— ادارہ

کلو کی عمر مشکل سے چھ سات سال کی ہوگی مگر وہ دو جوان آدمیوں کے برابر کام کرتا تھا۔ صبح سویرے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا جاتا۔ جاڑے میں بھیّا کی پرانی مرغئی اور چچا میاں کا پرانا کنٹوپ پہنے وہ ننھا سا بونا معلوم ہوتا تھا۔ سوں سوں ناک بجاتا وہ کام پر جُٹ جاتا۔ اسے منہ دھونے سے چڑ تھی۔ دراصل وہ ٹھنڈے پانی سے بہت ڈرتا تھا۔ دانت بھی بس یونہی سے انگلی کے پورے سے کبھی کبھی گھس لیتا اس لئے اس کے دانتوں پر مستقل پھپھوندی چڑھی رہتی تھی۔

صبح اٹھ کر سب سے پہلے وہ انگیٹھی سلگاتا۔ چائے کا پانی چڑھا کر میز پر پیالیاں اور پلیٹیں لگاتا اور دروازے کے ہزاروں پھیرے کرتا۔ مکھن لاتا پھر ڈبل روٹی والا آتا۔ پھر دودھ اور انڈے والا۔ سٹر پٹر وہ پھٹی سلیپر گھسیٹتا۔ دروازے سے باورچی خانے کے چکر لگاتا۔ پھر جب ماما ناشتہ تیار کر دیتی تو وہ دوڑ دوڑ کر گرم پراٹھے اور توس میز پر پہونچاتا۔ اس کی عمر کے بچوں کو زبردستی دودھ پارج انڈے اور جیلی کھلائی جاتی تاکہ وہ دبلے نہ ہو جائیں۔ اور وہ خاموش کھڑا نوالے گنا کرتا۔ جب ناشتہ ختم ہو جاتا تب وہ باورچی خانے میں بیٹھ کر سب کے آگے کے بچے ہوئے توس اور پراٹھوں کے جلے ہوئے کنارے چائے کے ساتھ کھاتا۔ اس کے بعد ادھر ادھر کا کام کرتا۔ طیبہ بی کی گرگابی پالش کرتا۔ حمیدہ بی کے ربن ڈھونڈ کر لاتا۔ اختر بھائی کے موزے تلاش کرتا۔ سلمہ بی کا بستہ ڈھونڈتا۔ ممانی جان کے لئے کنگھا الماری سے لاتا۔ ابا جان کا سگریٹ کیس ان کے سرہانے سے لاتا۔ غرض جب تک سب دفتر یا اسکول نہ چلے جاتے وہ پھرکی کی طرح ناچا کرتا۔ سب کے جانے کے بعد وہ ننھے کے پوتڑے دھوتا، پھر صفیہ بی کو کھلانے بیٹھ جاتا۔ بیچ بیچ میں کبھی دروازے سے ڈاک لینے جانا پڑتا۔ کبھی کوئی ملنے والا آتا تو اس کا نام پوچھنے جانا پڑتا۔ پھر ماما اسے مٹر چھیلنے کو دے دیتی یا ساگ چنواتی۔ کھانے کے وقت وہ دوڑ دوڑ کر گرم روٹیاں لاتا۔ ساتھ ساتھ ننھے کا پنگوڑا بھی ہلا دیتا غرض کہاں تک لکھوں وہ اتنی سی عمر میں آیا، بیرے اور مہتر کا کام بھی کرتا اور سب کچھ صرف دو روپیہ ماہوار اور پھٹے پرانے کپڑوں پر۔ اس کی ماں گاؤں میں رہتی تھی۔ اس نے کلو کو ہمارے ہاں چھوڑ دیا تھا کہ کم سے کم پیٹ کو روٹی تو مل جائے گی۔ وہ خود زمیندار کے ہاں کھانا پکانے پر نوکر تھی۔

کبھی کبھی تیج تہوار پر وہ چلی آتی۔ گڑ چنے یا بھٹے لا کر دیتی مگر وہ بھی کلو سے کام ہی لیتی۔

"اے میرے پوت ذرا میری پیٹھ کھجا دے"

"دو بوند پانی پلا دے"

"ذرا باورچی خانے سے دو روٹیاں تو اٹھا لا، تھوڑی سی دال بھی۔ بوا سے مانگ لیجیو"

"ذرا میری پیٹھ دبا دے"

"کمر دبا دے"

"سر دبا دے"

"ویسے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پیر دبوانے میں سب ہی کو مزا آتا۔ جس دن وہ جس کے ہاتھ چڑھ جاتا ساری دوپہر پیر دبا دبا کر پڑتے۔ کبھی کبھی نیند کے جھونک میں وہ پیروں پر لڑھک سوجاتا تب اسے لات مار کر جگا دیا جاتا۔

کلو کو کبھی کھیلنے کی فرصت نہیں ملتی تھی جب کچھ ذرا دم لینے کی مہلت ملتی تو وہ اتنا تھک جاتا تھا کہ چپ چاپ احمقوں کی طرح بیٹھا نہ جانے کیا گھورا کرتا۔ لوگ اسے یوں بے وقوفوں کی طرح بیٹھے دیکھ کر کبھی کبھی اس کے کان میں تنکا چبھوتے تب وہ مسکرا کر چونک پڑتا اور شرما کر کسی کام میں لگ جاتا۔

حلیمہ باجی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دن بھر بس شادیوں کے ذکر ہوا کرتے۔ فلاں کی شادی کیسے ہوئی تھی، فلاں کی کس سے ہوئی تھی، اور فلاں کی کس سے ہونا چاہیئے۔

"تو کس سے بیاہ کرے گی بیٹی" ممانی جان مذاق میں ننھی سے پوچھتیں۔

"آپا سے" ننھی تتلا کر کہتی اور سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

"تو کس سے بیاہ کرے گا رے کلوے" ایک دن اماں نے مذاق میں پوچھا۔

کلو اپنے پیلے پیلے دانت نکوس کر شرما گیا جب بہت پوچھا تو نیچی نظریں کر کے بولا "سلیمہ بی بی سے"

"چل مونڈی کاٹے، غارت ہو، پھٹکار ہو تیری صورت پر" ممانی جان سب کے ہنسنے پر چڑ گئیں اور کلو کے ایک چپت لگائی۔

پھر ایک دن سلیمہ کے ساتھ کھیلتے کھیلتے کلو نے پوچھا "کیوں سلیمہ بی بی ہم سے بیاہ کرو گی نا؟"

"ہاں آں" سلیمہ بی بی نے من بھر کی منڈیا ہلا دی۔

ممانی جان دھوپ میں بیٹھی کنگھی کر رہی تھیں، مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گئیں، اٹھ کے سنڈل، کلو کی مرمت کر دی۔ چوٹ کچھ غلط پڑ گئی کلو کی نکسیر پھوٹ گئی، کان کے نیچے سے خون بہنے لگا۔ کلو کی ماں جو شبرات پر آئی ہوئی تھی خون دیکھ کر دہاڑنے لگی "ہائے میرے پوت کو مار ڈالا رے" "نکل میرے گھر سے نیل ہائی" کھڑے کھڑے ممانی جان نے دونوں کو نکال باہر کیا۔ کلو کی ماں نے بہتیرے ہاتھ پیر جوڑے مگر شنوائی نہ ہوئی۔

سال پل بن کر گزر گئے۔ کلو کو لوگ بھول بھال گئے جیسے اور نوکروں کو جو اس کے بعد آئے اور گئے۔ حلیمہ بی کے بال بچے ہو گئے۔ حمیدہ بی نے باقر بھائی کے غم میں سدا کنواری رہنے کی قسم کھا لی۔ آدھا خاندان ہندوستان میں آدھا پاکستان میں لڑکیوں کے لئے بر ملنا مشکل ہو گئے۔ حمیدہ سے چھوٹی سعدیہ، میمونہ اور سلیمہ تعلیم ختم کر کے شادی کے انتظار میں سوکھنے لگیں۔

ویسے شمسہ، احمدی اور ریحانہ خالہ بی کی لڑکیاں بھی جوان بیٹھی تھیں۔ سال بھر سے وہ پاکستان جا کر لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں

نہیں۔ ہمارے خاندان میں کچھ لڑکیاں ہیں بھی بہت۔ ایک لڑکے کے پیچھے چار لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔

چچا میاں دن رات لڑکوں کی تلاش میں لگے رہتے۔ انہی نے حلیمہ باجی کی شادی کرائی تھی۔ وہی زرا سرکاری حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے مگر وہ بھی مجبور تھے۔ زمانہ ہی کچھ ایسا خراب ہے۔ لڑکے ملتے نہیں۔ جو ملتے ہیں تو منہ پھاڑ کر جہیز میں موٹر اور ولایت جانے کا خرچ مانگتے ہیں۔ ایک دو لڑکیاں ہوں تو کوئی دے بھی دے۔ اتنی بڑی فوج کو بھلا کون بھگتے۔ ویسے زمینداری کے ختم ہو جانے سے رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو چکی، نہ وہ دعوتیں رہیں نہ یا ملنا۔ نہ اتنا میل جول۔ لڑکیوں کے نصیبے کھلیں تو کیسے۔ جہاں جہاں دعوت یا پارٹی ہوتی لڑکیوں کو سنوار کے جایا جاتا۔ ایسے موقعے کم آتے تھے اس لئے جب نئے ڈپٹی کلکٹر مسٹر دین کے اعزاز میں پارٹی دی گئی اور بلاوا آیا تو کئی دن پہلے سے تیاریاں ہونے لگیں۔

مسٹر دین کنوارے تھے اور سارے شہر کی کنواری لڑکیوں کی ماؤں کی نگاہیں ان پر گڑی ہوئی تھیں۔ مسٹر دین کو دیکھ کر ہم لوگ تو سنائے میں رہ گئے۔ چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا قد، سانولی رنگت، بے انتہا جاذب شکل اور دانت تو جیسے اصلی سچے موتی جڑے ہوں۔ جب ہم لوگوں سے تعارف کرایا گیا تو وہ حلیمہ کے نام پر یکدم چپ سے ہو گئے اور جلدی سے دوسرے مہمانوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔

ہم جب واپس جانے کے لئے سوار ہوئے تو چچا میاں بوکھلائے ہوئے آئے۔ "تم نے یہ مسٹر دین کون ہیں؟"

"کون ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر ہیں اور کون ہیں۔" ممانی نے کیسے منہ سے کہا۔

"ارے نہیں! ... میرا مطلب ہے تم نے پہچانا بھی۔ اے بی یہ وہی ہمارا کلوا ہے۔"

"کلوا؟" ممانی بی نے ناک سکوڑی۔

"ہاں ہاں.... کلوا.... کلیم الدین۔ حد ہو گئی۔"

"ارے وہی جو اپنے ہاں اوپر کے کام پر تھا، بونا سا تھا۔"

"ہاں ہاں.... جو حلیمہ بی سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کرنے پر سینڈل سے پٹا تھا۔" چچا نے زوردار قہقہہ لگایا۔

توبہ ہے آج کل کی سرکار بھنگی چمار ہر ایک کو سر پر بٹھا دیتی ہے۔ میں کہتی ہوں یہ ہوا کیسے؟"

"کیوں.... ذات کا کوئی نیچ نہیں۔ قریشی ہیں۔ وقت پڑا تھا تو تمہاری جوتیاں بھی کھائیں۔" خالہ بی نے طعنہ دیا۔

"ایسے ہے تو آپ کر دیجئے نا اپنی بیٹی کی شادی۔" ممانی تنک کر بولیں۔

"میری لڑکیوں کے ایسے نصیب۔ میں تو خوشی خوشی کر دوں۔" خالہ بی بولیں "پر وہ اس خاندان سے جہاں اس کی یہ بے قدری ہوئی کاہے کو واسطے رکھے گا۔ عائشہ نے اسے ہمارے ہاں اسی لئے چھوڑا تھا کہ پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جائے گا۔ پر تم لوگوں نے لت تو کرنا ڈالا۔"

چچا بولے "آخر بے چاری نے سلائی کر کے، جھوٹے برتن مانجھ کے آج اسے اس قابل بنا دیا کہ بڑے بڑے لوگ اپنی بیٹیاں تھال میں سجا کر دینے کو تیار ہیں۔"

"ہوں گے کوئی نفقتے یہاں کسی کو مار نہیں پڑی ہے۔" ممانی بی نے منہ پھلا کر کہا۔

ایک دن چچا میاں حسب عادت بوکھلائے ہوئے آئے۔

"مطلب ہے کلیم الدین باتیں کرتے میرے ساتھ آ گئے۔ بھائی کچھ کر دو نا۔ کچھ چائے پانی دو

خالہ بی تو جلدی سے باورچی خانے کی طرف لپکیں مگر ممانی منہ تھوتھائے بیٹھی رہیں۔ لڑکیوں کے رنگ فق ہو گئے، خاص طور پر سلیمہ کے تو پسینے چھوٹ گئے۔ اب یہ بحث ہونے لگی کہ کلیم صاحب کو اندر بلایا جائے یا خواتین باہر جائیں یا اکیلے چچا بھگت لیں۔

"وہ انتقام لینے آیا ہے" سلیمہ نے ڈرایا اور ممانی بی لرز اٹھیں۔ سلیمہ کا رنگ اور بھی اڑا۔ خالہ بی نے کہہ دیا کچھ ہو جائے، وہ خود آیا ہے یہ اس کی شرافت ہے اب ہمیں بھی فراخ دلی سے کام لینا چاہیے۔"

"نہیں بی میں ذلیل و خوار ہونا نہیں چاہتی" ممانی بی نے غرور سے کہا۔ "تم شوق سے اپنی بیٹیوں کو لے جاؤ میری کوئی نہ جائے گی۔ اپنی طاقت کا گھمنڈ دکھانے آیا ہے۔"

"میں بھی نہیں جاؤں گی بی اماں" سلیمہ نے شرارت سے کہا۔ "میری تو شادی ہو چکی۔"

"مگر آپ تو اس قدر چپتیایا کرتی تھیں کہ توبہ بھلی" میں نے یاد دلایا۔

"اے تو مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن وہ یوں لاٹ صاحب بن کے نازل ہو جائے گا۔"

طے ہوا کہ ممانی بی کی لڑکیوں کے سوا علیمہ باجی کو چھوڑ کر باقی لڑکیاں جائیں۔ "وہ کیا سوچے گا کیسے جنگلی لوگ ہیں" چچا ابا بدحواس ہو گئے۔

جب ہم لوگ باہر لان پر گئے تو "کلیم صاحب" بڑے بشاشی سے جو اسی زمانے کا تھا گذرے ہوئے دنوں کا ذکر سن کر قہقہے لگا رہے تھے۔ بیچارا شتی کچھ کھسیانا، نادم سا مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مبدو چچا" تم پکارتے تھے۔ "پانی لا ... ن۔ تو ہم دلہن بی کے آگے چادر تان کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ سچ بتاؤ چچا، رومال میں سے تم جھانکا کرتے تھے نا۔" انھوں نے زور سے قہقہہ لگایا، پھر ہمیں دیکھ کر ایک دم سے مڑے۔

"یاد ہے طلیحہ بی دانت نہ مانجھنے پر آپ کیا میرے کان کھینچا کرتی تھیں" انھوں نے جلسے کے درمیان میں کہا۔ طلیحہ کھسیانی ہو گئیں۔

"بچپنا خواہ وہ کتنا برا گذرے، سہانے خواب کی طرح ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ آپ لوگ تو مجھے بھول بھال گئے ہوں گے مگر میں نے آپ کو نہیں بھلایا۔" تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے ہنستے رہے۔ ان کی بے تکلفی کے آگے ہماری جھجک بھی ہوا ہو گئی۔

"دلہن بی کو میرا سلام کہہ دیجیے گا" چلتے وقت انھوں نے کہا۔ وہ ممانی کو ہمیشہ دلہن بی کہتے تھے۔

"ان کی طبیعت اچھی نہیں" طیبہ نے جھوٹ بولا اور انھوں نے قہقہہ لگایا۔

"معاف کیجیے گا طلیحہ بی میرا حافظہ کمبخت بہت تیز ہے جب دلہن بی کسی سے ناراض ہوتی تھیں تو ان کی طبیعت خراب ہو جاتی تھی۔ اس وقت مجھے ایک بجے ڈنر پر جانا ہے، پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔"

بڑی رات تک "کلیم صاحب" کا ذکر ہوتا رہا۔

"اگر انھوں نے پیغام بھیجا تو ..." چچا نے گول گول بات کی۔

"میری لڑکیوں کو تو بخشیں" ممانی بی ہنہنائیں۔

"وہ کیوں؟" خالہ بی نے ناک چڑھائی۔

"بس میری مرضی" ممانی بی نے جواب دیا۔

یہ سب اوپری دل سے باتیں ہو رہی تھیں۔ ممانی بی کے دل کا حال بس اللہ جانتا تھا۔

سلیمہ غریب روہانسی ہو گئی۔ ہم سب مسکرا مسکرا کر اسے چھیڑتے رہے۔

مہینہ بھر گزر گیا، ہم لوگ بھول بھال چلے تھے کہ ایک دن پھر چچا کے ساتھ کلیم صاحب آن پہونچے۔ اب کے چچا نے ممانی بی سے کچھ نہ کہا مجھ سے اور ملیحہ باجی سے کہا "وہ ان نک چڑھی سے ملنا چاہتا ہے، کیا کیا جائے یہ کم بخت بہاتھ نہیں دھرنے دیتیں" "ٹھے ہوا ویسے تو راضی نہ ہوں گی۔ بس انھیں اندر بلا لیجئے، دیکھیں پھر ممانی جان کیا کرتی ہیں۔

"ارے وہ پوری جنات ٹھہریں کچھ کر بیٹھیں تو قسم خدا کی شہر میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔" چچا سہم کر بولے۔

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اماں بی کوئی بچہ نہیں۔ میں انھیں لاتی ہوں۔ آپ انھیں بلا لائیے" ملیحہ باجی نے کہا۔

ہم لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے ممانی بی بم کے گولے کی طرح پھٹ پڑیں تو۔۔۔؟ میں اور ملیحہ باجی رہ گئے۔ باقی لڑکیاں کونے کھدروں میں جا چھپیں۔

"کلیم صاحب آئے تو ممانی بی بیٹھی مونڈھے پاندان صاف کرنے میں لگی تھیں۔

"اے ملیحہ ذرا کتھے کا پیالہ توشہ دان سے اٹھا لانا۔" انھوں نے پکارا۔

کتھے کا پیالہ انھوں نے ملیحہ باجی سے لے لیا اور جا کر ممانی بی کو دے دیا۔ انھوں نے لے لیا پھر بولیں "بیٹی ذرا سا پانی بھی" پھر جو انھوں نے نظر اٹھائی تو کلیم صاحب کو کھڑے پایا۔

"آداب عرض" انھوں نے سہمی ہوئی آواز میں نظریں جھکا کر کہا۔

"جیتے رہو۔" ممانی بی نے مری ہوئی آواز میں کہا اور چھچی سے کتھا کھرچنے لگیں۔ "اچھے تو رہے؟"

"آپ کی دعا ہے۔"

"اے کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔" رکھائی سے کہا۔

وہ اور وان پر بیٹھ گئے۔

"اے ہے اروان ٹوٹ جائے گی۔" وہ چلائیں اور کلیم اچک کر کھڑے ہو گئے۔

ممانی بی نے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ چچا کھسک گئے۔ ڈر گئے پٹھانی کے غصے سے۔ ممانی بی مسکراہٹ روک کر جھلا کر بولیں۔

"اے لڑکے بیٹھے گا بھی کہ کھڑے بیر کا روزہ رکھا ہے؟ اے لڑکیو! کہاں مر گئیں؟ ٹوٹے ہاتھوں سے مونڈھا بھی نہیں سرکایا جاتا۔"

لپک کے انھوں نے ملیحہ باجی کے ہاتھ سے مونڈھا لے لیا اور فرماں بردار بچے کی طرح پاس بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ ایک دم سے ممانی بی غرائیں "کیا میرا کھیل بنایا ہے؟" انھوں نے روہانسی ہو کر کہا "کہاں مر گئیں لڑکیاں۔ یہ میرا منہ کیا تک رہی ہو تم لوگ۔ کوئی میرے سر پر سینگ ہیں!"

اور جب انھوں نے سلیمہ کے لئے پیغام دیا تو اڑ گئیں ممانی جان کہ "حشر ہو جائے سلیمہ تو نہیں دوں گی۔" لاکھ پوچھا "بھئی آخر وجہ؟" مگر بس "میری مرضی تم لوگ کون ہوتے؟"

مگر کلیم صاحب نے کہا "بڑی بی کی کیا حقیقت ہے میں نے زندگی سے کبھی ہار نہیں مانی۔"

چنانچہ ایک دن وہ دل میں فیصلہ کرنے کی ٹھان کر مونڈھے پر ڈٹ گئے۔ ہم لوگ ایسے مشتاق نظروں سے چاروں طرف جمع ہو گئے جیسے

دو پہلوانوں میں دنگل ہونے والا ہو۔

"تم ہیں صاف بات کئے بغیر نہیں ٹلوں گا" انھوں نے سختی سے کہا۔

ممانی بی نے تیوریاں چڑھائیں۔

"اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے..... یعنی خود تو مارا اور اُلٹی مجھے سزا دے رہی ہو" چچا بولے

"آپ رہنے دیجیے میاں۔ میں خود نمٹ لوں گا" انھوں نے چچا کو الگ ہٹایا۔

"مجھے اپنا قصور تو معلوم ہو دلہن بی" اُنھوں نے شکایتًا کہا

"دلہن بی!..... ہوں! جب تک تو مجھے دلہن بی کہے گا......" ممانی بی بھنائیں۔

"اماں بی" اُنھوں نے گلوگیر آواز سے کہا۔ اور ممانی بی کے بھی آنسو چھلک آئے۔ ایک دم ہم پر برس پڑیں۔

"کیا بندر کا تماشا ہو رہا ہے بی؟ کھڑی گدھیوں کی طرح منھ تک رہی ہیں۔ بھلا یہ شادی کا انتظام کریں گی! مجھی کو ہاتھ پیر توڑنے پڑیں گے۔ کوڑی کام کی نہیں یہ لڑکیاں" ممانی بی کی جلی کٹی باتیں شہنائیوں سے بھی زیادہ سریلی ہو گئیں۔

کلو ــــــ (دوسرا افسانہ)

آندھی آتی ہے تو الگنی پر لٹکے چیتھڑے موری میں اور گھورے کا کوڑا آنگن میں آن پڑتا ہے۔ ملک میں جب آندھی چلی تب بھی یہی ہوا۔ سب کچھ تہ و بالا ہو گیا۔ کون سا خاندان ہے جو سالم رہ گیا۔

رشید میاں صفو بی کو اب بلاتے ہیں اور تب بلاتے ہیں۔ آخر کو سنا انھوں نے وہاں دوسری شادی کر لی۔ صفو بی کے منہ کو تالا لگ گیا۔ شاید چپ چپاکر رو لی پیٹی بھی ہوں پر چہرے پر کسی نے شکن نہیں دیکھی۔ پٹھان ماں کی بیٹی تھی نا۔ پٹھان بھی چچی بی کے میکے والے، مرنے میں آ جائیں تو جہاں پسینہ گرے وہاں خون گرا دیں۔ ہاں آ جائے تو جہاں خون گرے وہاں تھوکیں بھی نہیں۔ مزید بی اور ننھو میاں تو خیر پہلے ہی جم چکے تھے۔ رضیہ، نوشابہ اور حمیرہ سہرے کے پھول کھلنے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ لوگوں نے بہت چچی بی سے کہا لڑکیوں کو لیکر پاکستان کا ایک چکر لگا آؤ سب کا نصیبہ کھل جائے۔ نیکی پڑے چچی بی کے لمبی ناک والے میکے کی عقل پر۔

ـــــ "نا بہن مجھ سے تو لڑکیوں کو خوان میں سجا کے غیرے میرے دروازے کی ہیرا پھیری ہو گی نہیں"

"اے بی! اُدھر کے لڑکوں کو اِدھر آنے کی اجازت جو نہیں ملتی" چھوٹے چچا بولے "کیا شان ہوتی ہے، جوان تو بس وہاں کے ہوتے ہیں"

زمینداری نام کو رہ گئی۔ مکانوں کا کرایہ اور بڑے چچا کی پنشن۔ اس مہنگائی کے زمانے میں ڈیڑھ پاڑیوں کا بوجھ تو نہیں اُٹھا سکتی۔ پھر بھی اللہ بھلا کرے چھوٹے چچا کا، شہر کی کوئی بھی ایجوکیشنل پارٹی ہوتی ہو گی جہاں کا رقعہ وہ نہ جھٹک لاتے ہوں۔ چھوٹے چچا نہ جانے کیوں ہمارے میرج ایجنٹ بن گئے اور ہمارے لئے بر ڈھونڈنے کی خاطر گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے۔ جہاں کوئی ٹٹ پونجیا شکار نظر آتا چاروں طرف سے جھاپے کہ اس پر پورا خاندان دھاوا بول دیتا کبھی ایک آدھ چپ جاتا ورنہ ٹھیکیاں خالی ہی پڑی رہتیں۔

خالہ زاد، ماموں زاد، چچا زاد بھائی سب ہی تو چلے گئے۔ زندگی کس قدر غیر رومانی ہو کر رہ گئی ہے۔ بھائیوں کے ساتھ بھائیوں کے دوست بھی

گئے۔ شادی کی جوٹ میں۔ کچھ دلچسپی تو زندہ رہے۔ پلنگوں پر جا رہے ہیں۔ دو روٹھ رہے ہیں چار من رہے ہیں۔ کبھی کبھی ہنسی میں کھنسی ہو جاتی۔ رونا پیٹنا پڑ جاتا راتوں رات نکاح ہوتے اور ستوا لیسے بچے پیدا ہوتے، کیا ہلچل تھی زندگی میں۔ کبھی کبھی پورے خاندان لڑ بیٹھتے۔ ایک کا جھگڑا ہوتا تو فوراً دو کیمپ بن جاتے۔ پیار کرنے والے بچھڑ جاتے۔ چھپ چھپ کے خط پتر چلتے۔ پھر کسی شادی بیاہ پہ مناؤنیاں ہوتیں۔ خوب گلے مل کر رو دیا جاتا اور پھر وہی ہنگامہ، وہی موسیقی، وہی زندہ دلی —— پر اب کون رہ گیا ہے جس سے روٹھیں، روٹھے تو کون منائے گا؟

چھوٹے چچا کی بدولت اتنا تھا کہ ڈنر پارٹیوں میں پہنچ جاتے یا کبھی کالج کے دوست جمع ہو جاتے مگر ان باتوں سے چچی بی کی ڈھارس کہاں بندھتی تھی۔ چھاپہ اور حمیرہ کی فکر انہیں کھائے جاتی تھی۔ تہمینہ تو خیر سے ابھی چھوٹی تھی۔

کئی دن سے ہم لوگ چھوٹے چچا کی جان کھا رہے تھے کہ نئے ڈپٹی صاحب کو جو خوش آمدید کا ایٹ ہوم دیا جا رہا ہے کہیں سے اس کے انویٹیشن لائیں۔ کیونکہ سُنا تھا کہ وہاں کچھ رقص و سرود کا بھی انتظام ہوگا۔ ایک فلم بھی دکھائی جائے گی۔

"میری وہاں پہنچ نہیں" چچا ٹال جاتے تھے۔ ایک دن بچّو کھلائے ہکّا بکّا آئے "خدا کی قسم" انھوں نے چھوٹتے ہی قسم کھائی اور جب چچا قسم کھائیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کے اعصاب پر برا زور پڑ رہا ہے۔ کسی نے توجہ نہ دی کیونکہ جب سے زمینداری کا معاملہ ٹھنڈا پڑا تھا۔ چچا کی حرم میں آئے دن گھمسان مچی رہتی تھی اور عموماً قسمیں کھانا پڑتی تھیں۔ "حد ہو گئی" چھوٹے چچا نے دوسرا بم چھوڑا۔

"کیا ہوا چھوٹے چچا۔ کیا پھر چچی اماں کو دورہ پڑا؟"

"نہیں بی خاک ڈالو اپنی چچی کی صورت پر —— اے بھابی اے سنتی ہو" وہ چچی بی کا گھٹنا ہلا کے بولے۔

"کیا ہے؟" حسب عادت چچی بی کسمسائیں۔

"جانتی ہو یہ جو اپنا نیا ڈپٹی آیا ہے کون ہے؟"

"جانے میری جوتی" چچی بی چچا کے جوش پر ٹھنڈا چھینٹا مار دیتی ہیں۔

"سنو گی تو چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

"اے چل ادھر میں نہیں سنتی تیری بکواس" چچی بی نے لاپروائی سے کہا۔

"اے بی یہ وہی تمہارا کلّو ہے جو ڈپٹی کلکٹر بن کر آیا ہے۔"

بات یہ تھی کہ آپا بی کا جہیز سل رہا تھا سب کے دل و دماغ پر بیاہ چھایا ہوا تھا۔ دن بھر بیاہ شادیوں کے ذکر ہوتے۔ پرانی شادیوں کے قصے سنائے جاتے نئے جوڑ لگائے جاتے۔ فلاں کی منگنی فلاں سے۔ پیٹ کے بچوں تک کے جوڑے لگائے جاتے۔ کلّو کی ماں جو ہماری دور کے رشتے سے پھوپی لگتی تھیں، بیوگی کے دن کاٹ رہی تھیں بے چاری یوں ہی تیرے میرے گھر کا کام کاج کر کے پیٹ پال لیتیں۔ کہنے کو بڑا کنبہ تھا پر بیٹھ کر کھلانے والا کوئی نہ تھا۔ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ کلّو کی ماں کی بھی وہی گت تھی۔ کلّو اس وقت چار پانچ سال کا ہوگا۔ لاڈ میں آکر کلّو کی اماں ہنس کر بولیں۔ "اے کلّو تو کس سے بیاہ کرے گا؟"

"چھاپہ بی سے!" کلّو نے مسکرا کر سال بھر کی گول مول نوشابہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ سب تو ہنس پڑے پر چچی بی کو تاؤ آ گیا۔ جوتی لے کر بے بھاؤ کی لگا دیں۔ کلّو کی نکسیر پھوٹ گئی۔ بیوہ ماں کا دل ہول گیا۔ اسی وقت بچے کو کندھے پر ڈال کر نکل کھڑی ہوئیں۔ خدا جانے کیسی بیتی پر آج بیس سال بعد کلّو ڈپٹی کلیم الدین کی صورت میں ہمارے شہر کا راجا بن کر آیا تھا۔

"مستانی وہ ڈپٹی بن کر آیا ہے اب۔ بولو کیا کہتی ہو؟" چچا نے چھیڑا۔

"میری پیزار کو کچھ کہنے کی کیا غرض۔ کوئی ڈپٹی بنے کہ کلکٹر!"

"ذرا زبان سنبھال کے۔ ہاں جیل میں چکی پسوا دے گا۔"

"مر گئے چکی پسوانے والے۔ ہوگا ڈپٹی اپنے گھر کا۔"

"دیکھ لینا تمہاری یہ زبان ایک دن تمہیں خوار کرے گی۔ ابھی کیا وہ جوتیوں کی مار بھول گیا ہوگا۔ ایک ایک سے چن چن کر بدلے لے گا۔"

"ارے بہت دیکھے ہیں بدلے لینے والے ـــــ پٹھانی ہوں کوئی مغل بچی نہیں جو کسی ایرے غیرے نتھو خیرے سے ڈروں۔ ہاں جی جوتیوں سے مارا، بیچ کھیت مارا، ایسے ہی ماریں گے۔"

"اب بھی مارو گی؟"

"ہاں ماریں گے۔"

"ڈپٹی کو مارو گی، شامت آئی ہے تمہاری جیل میں سفید چونڈے کے سڑو گی۔"

"جیل میں سڑیں میرے دشمن۔ دیکھو جی، تم زیادہ میرے منہ لگے تو۔" اور وہ جھکیں جوتی اٹھانے۔ چچا کان دبا کر بھاگے۔

"بالکل سڑن ہیں کم بخت۔ لڑکیوں میں نے انڈی پینڈنٹ کا انتظام کر لیا ہے۔"

"کوئی نہیں جانے گا سُنا۔" چچی بی بولیں۔ اور ہم سب سہم کر رہ گئے۔ چچا نے بہت سمجھایا کہ "بھلا دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر پالنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ گزشتہ واقعات آئندہ راحت کا مگر ان کے دماغ میں تو بھس بھرے ہیں۔ خرد ماغ کہیں کی۔"

چچی نے دانت کچکچا کر سرونہ گھما کر پھینکا۔ اگر وہ ابھی نشانہ باز ہوتیں تو ضرور چچا کانے ہو جاتے۔ سرونہ ان سے دو گز دور موری میں جا گرا۔

کیا زبردست دعوت تھی۔ بہ چچا تک کی ہمت جانے کی نہ ہوئی سنے ڈپٹی کلیم الدین کیا آئے ہماری ہری بھری زندگی پر بھی مردنی چھا گئی۔ چچی بی کا غصہ تگنا ہو گیا اور پھر ایک دن انھوں نے پاسپورٹ بنوانے کا فیصلہ کر ہی ڈالا۔

"ڈپٹی کلکٹر کے تو دستخط لینے ہی ہوں گے۔" دہ چچی بی نے نہ چھوٹے چچا کو سا، نہ گالیاں دیں۔ اس بار سر جھکا لیا "خیر نصیبوں میں ذلت لکھی ہی ہے تو بھگتنا ہی ہوگا۔ ایک بار بیت گئی تو چھٹکارا مل جائے گا۔"

"اور جو اس نے نہ دی اجازت؟" چچا نے پھر چھیڑا۔

"اس کے تو فرشتے دیں گے خدا کی قسم میں ہاتھ کٹا کے نہیں بیٹھی ہوں۔"

"چچی بی ہم بھی تو سنیں کیا کرو گی۔ سرکاری آدمی ہے کوئی ہنسی ٹھٹھا ہے۔"

"میں بھی نگوڑی ناٹھی نہیں جا کے کسی وزیر کا گریبان نہ پکڑ لیا تو نام پلٹ کے رکھ دینا۔"

"لو بھئی وزیر بے چارے نے کیا قصور کیا جو اس کے گریبان کی شامت آگئی۔ اے بھابی سچ میں تمہارے سارے خاندان کی عقل اوندھی ہے۔"

"اور خود انھوں نے کا ہے کو قصور کیا ہوتا۔ یہ یہ کلموہا ہماری بہو بیٹیوں کو تاکے اور ہم کچھ کہیں تو جیل اور پھانسی۔ کیوں جی یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ سنو، اسے بی ہوا خبط ہے انھوں نے بچاروں نے کب تمہاری صاحبزادیوں کو تاکا۔ کیا بیس بائیس برس پہلے جو پانچ برس کے بچے سے گستاخی ہو گئی تھی اس کا مقدمہ قائم کرو گی۔" چچا نے اور چھیڑا اور چچی بی رو پڑیں۔ سب نے سمجھایا بے کار کی باتوں میں آکر آپ پریشان ہو رہی ہیں۔

وہ بے چارا بھول بھال چکا ہوگا۔" چچی بی مصر تھیں کہ پاسپورٹ بنوا دو نہیں تو کچھ کھا کے سو رہوں گی۔

پارٹیوں میں جانا کم ہو گیا۔ بند کیا ہوتا۔ اور پھر ایک دن وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ ایک دن کالج کے لیکچر گلشن میں اچانک چچا دوڑے ہوئے آئے۔

"وہ تم لوگوں سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ٹال کے آ گیا ہوں۔ بولو کیا کروں؟" چچا کی بے چاری کی پنڈلیاں تھرانے لگیں۔

"مجھ سے کیا تپاک سے ملا ہے۔ بھئی سید ہے نا، شرافت کہاں جائے گی؟" پھر ذرا فکرمند ہو کے بولے "بھئی کہتا ہے مجھے سب یاد ہیں۔ اب بولو کیا کروں۔ یہ تمہاری چچی نے تو خاندان کی ناک کٹوا دی۔ پٹھانوں کا میل ہمیشہ رنگ لاتا ہے۔ لڑکیو کچھ منہ سے پھوٹو۔"

"ہم ضرور ملیں گے۔" میں نے سب کی سرغنہ کی حیثیت سے فیصلہ کیا۔ نوشابہ اور حمیرہ میرا ہاتھ دباتی رہیں "تم بھی نری احمق ہو، بیس برس کی بات کیا وہ گرہ میں باندھ کے لایا ہوگا؟"

جب کلیم صاحب سے ہمارا تعارف کرایا گیا تو ہم تھوڑی دیر کے لئے بھونچکے رہ گئے۔ ناک سڑ سڑاتا، ڈھیلے پیرول والا اتران پہننے کا عادی کلو دبلے پتلے وجیہہ نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بچپن میں تو لگتا تھا ٹھٹھر کے رہ جائے گا۔ کیا خاک بڑھے گا؟ وہ بال تو ہمیشہ منڈھے ہی رہتے تھے کیونکہ کمبخت کے جوئیں پڑتی تھیں۔ یہ پتہ ہی نہ تھا کہ اتنے گھنے اور خمدار ہو جائیں گے وہ بال۔

نوشابہ کو تو ایک اچٹتا ہوا سلام جھاڑا اور پوچھنے لگے "دلہن بی کیسی ہیں؟" کلو ہمیشہ چچی بی کو اپنی ماں کی طرح دلہن بی کہتا تھا۔ "میں کسی وقت حاضر ہوں گا۔" وہ جلد ہی ادھر ادھر کی باتیں کر کے رخصت ہو گئے کیونکہ انھیں کہیں اور بھی تقسیم انعامات کے جلسہ کی صدارت کرنی تھی۔

"لو بھئی اب وہ حاضر ہوگا۔" چچا دہشت زدہ ہو کے بولے "خدا کی قسم" چچا کے اعصاب پر شدت کا دباؤ پڑ رہا تھا۔ "مالیخولیا ہو گیا ہے تمہاری چچی کو۔"

چچی بی نے ہم سب کو توم کر رکھ دیا ہمارے ساتھ یونیورسٹی، شعبۂ تعلیم اور حکومت جو موری کے کیڑے کو سر پر چڑھا دیتی ہے، رپن کے رکھ دیا۔

"اور جو وہ تمہاری لڑکیوں سے کسی کو پیغام دے بیٹھے۔" چچا چھیڑنے سے کب باز آتے۔

"اس کی ہمت ہے جو پیغام دے۔" اور انھوں نے کلو اور کلو کی ذات پات کی دھجیاں اڑا دیں۔

"اے سرت ہو تم کیا عیب ہے اس لڑکے میں۔ لوگ تھال میں سجا کے دیں گے بیٹی۔ اے بی ملتے کہاں ہیں ایسے لڑکے کسی کو۔"

"تم دینا اپنی بیٹیاں تھال میں سجا کے —— میری تو کنواری مر جائیں پر..."

"اللہ قسم میں اس کی جگہ ہوتا تو سولی پر چڑھوا دیتا۔" چچا نے اور جلایا اور بھاوج دیور کی پرانی تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ دلہن کا منہ دیکھ کر جو چچا نے بھاوج کی چٹکی لی تھی سو اب تک وہی رشتہ قائم تھا۔ ابا جی کے انتقال کے بعد ایک دن چچا نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا "اے بی چاہو تو نکاح پڑھا لو۔" اور چچی بی نے جوتی لے کر ان پر حملہ کر دیا۔

"شرع کی بات کہتا ہوں نیک بخت۔"

"تیری شرع کی ایسی تیسی نفقتے۔" جوتیاں اور برسیں۔ چچا باز آنے والے اسامی نہ تھے۔ پھر جب موقع ہوتا کہتے "بڑی بھابی ماں کے برابر ہوتی ہے نا بی" ذرا دس روپے تو نکالو۔" اور جان چھڑانے کے لئے روپے دینے پڑتے۔

"بھئی لڑکیو! وہ تو حاضر ہونے کو کہتا ہے۔ بتاؤ کیا بہانہ کروں؟"

"کہہ دیجئے گھر میں سفیدی ہو رہی ہے" ہم نے رائے دی۔

پھر ایک دن چچا بوکھلائے ہوئے آئے "وہ آگیا"

"کون آگیا؟" ہم نے بھی ان کے اثر سے ڈر کر پوچھا

"اے بی وہی کلو ڈپٹی۔ میں نے اسے لان پر بٹھا دیا ہے کہ ذرا گھر میں خبر کردوں، بولو کیا کروں۔ یہ سرّن تو جھکا سنے لگیں گی" انھوں نے چچی بی کی طرف اشارہ کیا جو مہترانی سے لڑ رہی تھیں "یہ دیکھ تیرے پیچھے میں پرسوں کے چاول پڑے ہیں" وہ موری کی طرف چلکیوں سے اشارے کر رہی تھیں۔

"لو اور سنو۔ کمو نیک بخت یہ موری ہے یا مہترانی کا کلیجہ۔ کیا بھونڈی تشبیہ ہے۔ اللہ بخشے بھائی صاحب کا دل گردہ تھا جو آتش فشاں پہاڑ کو بھگتا۔"

"چچا میاں سے تو چچی بی بہت ڈرتی تھیں۔"

"ہاں بھئی وہ گھنّے جو تھے۔ منہ سے نہیں بولتے تھے پر شیر کے سے دیدے دکھاتے تھے تو میاں مر جاتی تھی بیگم کی، پر یہ تو بتاؤ کیا کروں؟"

"میں اور جمیرو چپکے سے چلتے ہیں۔"

"تم جاؤ میں نہیں بھگتوں گا۔" وہ سرک لئے۔

"چچی بی ذرا چمن میں ہو آئیں۔"

ہاں آں بیٹی، اے نوشابہ ہٹا یہ موا اخبار۔ لڑکی تھوا ہی بیٹھی رہتی ہے۔"

نوشابہ اٹھ کر اندر چلی گئی میں نے سوچا جو ہوگی سو دیکھی جائے گی۔"

جب ہم لان پر پہنچے تو کلیم صاحب، بوڑھے موروثی بہشتی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے" رمضان ماموں کہتے تھے "پانی لاؤں" تو دلہن بی کہتیں۔

"اندھیری ڈال کر بلالو" میں شرط بدتا ہوں ماموں تم اندھیری میں سے جھانکا کرتے تھے۔"

بڈھے رمضان نے کھسیانا ہو کر ہنسنا شروع کر دیا۔ کون ایسا نوکر تھا جس نے اپنے زمانے میں کلیم صاحب کے کان نہ کھینچے تھے۔ یا چپتیا یا نہیں تھا۔

"اور سب کیسے ہیں؟" آنکھوں ہی آنکھوں میں انھوں نے نوشابہ کو ڈھونڈا۔ "دلہن بی تو خیریت ہیں؟"

"ان کے سر میں درد ہے" میں نے بہانہ کیا۔

"مجھے یاد ہے جب، وہ کسی سے غصہ ہوا کرتی تھیں تو جھوٹ موٹ سر پر رومال باندھ کر پڑ جایا کرتی تھیں۔ ان کی پرانی عادت گئی نہیں؟ کیا اب بھی ویسے ہی غصے ہوا کرتی ہیں؟"

"جب میں نے بتایا کہ عمر کے ساتھ ساتھ غصّہ بھی پروان چڑھ کر سبحان اللہ ہو گیا ہے" تو وہ بولے "پھر کسی اور دن۔"

ادھر اُدھر کی باتیں کر کے وہ جانے لگے تو میں نے دبی زبان سے کھانے کو پوچھا۔ ہنس پڑے کہنے لگے "مجھ سے یہ غیریت زیادہ نہیں نبھائی جائے گی آپ لوگوں کے لئے تو میں دور چلا گیا تھا لیکن آپ لوگ ہمیشہ میرے بہت قریب رہے۔"

تہمینہ کٹیا نے سب جا کے اماں سے جڑ دیا۔

"لو بھلا اندھیر ہے کہ نہیں۔ جوان جہان لڑکیاں اتنا نہیں ہوتا کہ منہ سے کہہ تو دیتیں۔" اس سے قبل کہ وہ سارے چیتھڑے بکھیرتیں۔ چچا ان سے اُلجھ پڑے۔ اُدھر وہ بچیں چیخنے لگیں ادھر ہم کھسک گئے۔

"تم ہوتے کون ہو میری لڑکیوں کی فکر میں گھلنے والے ہو؟"

"لڑکیوں کی بات چھوڑو۔ ہم تو اللہ والے آدمی ٹھہرے۔ تمہاری فکر میں کیا کم گھلتے ہیں۔ اللہ پاک کاش بیٹیوں کی طرح کوئی بھابیاں بھی بیاہ سکتا تو کب کا میں نے تمہارا پاپ کاٹا ہوتا۔"

باوجود غصہ کے چچی بی کو ہنسی چھپانے کے لئے چھالیا پھانکنا پڑی۔ انھیں دیکھ کر چچا اور بڑھے "اے کیا باچھیں کھل گئیں بیاہ کے نام پر۔"

"ڈر موے نوج میری باچھیں کھلیں۔" چچا اور کھلے۔

"بھابی سچ بتاؤ تم مجھے پسند تو شروع ہی سے کرتی تھیں؟"

"اے لعنت مجھے سدا سے نفرت تھی۔"

"تو پھر اپنی بہنچی مجھے کاہے کو چپکے سے پکڑا دی تھی؟"

"جھاڑو پھرے تری صورت پر، ایک تو بہنچی چرا کے خود ہڑپ کر دی، اوپر سے بہتان۔" چچا سب ہی کو ہاتھ کی صفائی دکھا چکے تھے۔ مگر اس بہنچی پر ہمیشہ بحث ہوا کرتی تھی۔

تیسرے چوتھے دن پھر چچا سٹپٹاتے قسمیں کھاتے آئے "وہ کمبخت ان کمینو ڑی سے مل کے جائے گا۔"

"آپ نے بتا دیا ہوتا صاف صاف۔" ہم نے کہا۔

"بتا دیا بھئی تو کہتا ہے بھگت لوں گا۔ لو بھلا بھئی ان بلا کو بھگت لے گا۔ مذاق ہے کوئی۔"

"پھر کیا کریں چھوٹے چچا؟"

"گدھی ہو تم سب، الٹا مجھ سے پوچھ رہی ہو، بتاؤ اسے کیسے روکوں؟"

"مت روکئے۔"

"تو پھر آنے دوں، یہ باؤلی کتیا کچا چبا جائیں گی۔"

"چچی بی نے ہزار بار مارا ہے، ایک دفعہ اور سہی۔" ہم سب ڈسپریٹ ہو چکے تھے۔

چچی بی ہماری آنکھوں سے بے خبر عصر کی نماز پڑھ کر بیٹھی پان کھا رہی تھیں۔ جوں ہی کلیم اندر داخل ہوئے، چچی بی پکاریں "اے تمو بیٹی ذرا کتھے کا پیالہ تو نکال لا۔"

تمو کے ہاتھ سے کتھے کا پیالہ انھوں نے لے لیا اور آہستہ سے بڑھا دیا۔ بغیر دیکھے انھوں نے پاندان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سکتے میں رہ گئیں۔

"آداب عرض دلہن بی۔" ایک لمحے سکوت رہا۔ ہم سب نے سانسیں روک لیں۔

"جیتے رہو" کھائی سے کہا اور لیے کتھا پیالی میں ڈالنے لگیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"آپ مجھ سے خفا ہیں؟"

"اوئی میں کاہے کو خفا ہوتی۔" نہایت خشگی سے بولیں۔ تھوڑی دیر دونوں طرف خاموشی رہی دونوں کی زبان گنگ ہو گئی۔ "اے لڑکے یہ میرے سر پہ کھمبے کی طرح کیوں کھڑا ہے۔" انھوں نے پاندان اپنی طرف کھسکا کے جگہ دی۔ کلیم فوراً بیٹھ گئے۔ چچی کا منہ اب بھی پھولا ہوا تھا۔

"الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" چچا نے مبنے نشتر سنبھالے "یعنی کہ خود ہی مارا اور خود ہی تھوتھنی پھلائے بیٹھی ہیں۔"

"ارے میاں آپ میرے بیچ میں نہ بولئے۔" کلیم صاحب نے گھبرا کر کہا "میں خود ہی نمٹ لوں گا۔" کلو چچا میاں کو سدا میاں کہا کرتا تھا۔

"ہاں ہاں ایسے ہی مارا اور سو دفعہ ماریں گے۔ بس کسی کے باپ کا دینا نہیں آتا۔" وہ چچا سے لڑیں۔

"میاں آپ تو اور بھڑکا دیتے ہیں۔"

"ہاں ہاں میں نگوڑی ہوئی جو اس نگوڑے کے بھڑکانے سے بھڑکنے لگوں گی۔"

"میرا یہ مطلب نہیں۔" کلیم گھبرائے۔

"میں سب مطلب وطلب سمجھتی ہوں۔ غضب خدا کا، ہمارا کھیل بنایا جا رہا ہے۔ صاحبزادیاں کھڑی ٹھٹھے کر رہی ہیں۔ جانور بندر کا تماشا ہو رہا ہے۔" چچی بی رو پڑیں۔

"تم ہو بھی تو بن داموں کا تماشا۔"

"چل چخے۔" گرما گرم دونوں طرف سے گولہ باری ہونے لگی۔

جب ذرا ٹھنڈی ہوئیں چچی تو کلیم پھر بڑے صبر سے بولے "وہ میں اس غرض سے حاضر ہوا تھا کہ ... آپ کے سوا میرا ہے کون جو ..."

"یہ جو ہیں تمہارے۔" انھوں نے چچا کی ناک کے پاس سروتا گھمایا۔

"مجھے بالکل تجربہ نہیں۔" کلیم نے پھر ٹھنڈا کر کے کہنا شروع کیا "آپ ہی کو سب کچھ کرنا ہوگا۔"

"اوئی کیا کرنا ہوگا۔ لڑکے یہ پہیلیاں کیوں بجھوا رہا ہے۔"

"بڑی کوڑھ مغز ہو اللہ قسم۔" چچا بولے "ارے بھائی شادی کا انتظام، نہیں تو تم سمجھیں تمہیں لام پر بھیجا جا رہا ہے۔"

شادی کا انتظام چچی کی کمزوری تھی لیکن محلے ٹولے میں شادی ہوتی یہ اپنی نیند حرام کر لیتیں۔ جہیز سل رہا ہے، کرتا ٹوپی سل رہا ہے، چھٹی چھوچھک تیار ہو رہی ہے، مشغلہ تھا بے چاری کا۔

"کب ہے شادی؟"

"جب آپ مناسب سمجھیں۔"

"اوئی میں کون مناسب سمجھنے والی۔"

"ہاں جی یہ کون ہوتی ہیں، تین میں نہ تیرہ میں۔" چچا نے چٹکی لی۔

"اوتھہرو خبطی۔" شادی کا موضوع زیادہ دلچسپ پا کر انھوں نے چچا کی سنی ان سنی کر دی۔

"لڑکی تو دیکھی بھالی ہوگی؟"

"جی ہاں دیکھی تو ہے۔" کلیم نے سہم کر کہا۔

"تو یوں کہو فیشن ایبل شادی ہے۔ کہاں طے ہوئی ہے؟"

"یہ ... یہ بھی آپ ہی کو طے کرنا ہوگا۔"

اب بدکیں چچی بی، ضرور دال میں کالا ہے۔ ایک غرّائی ہوئی نگاہ انھوں نے چاروں طرف ڈالی۔ ہمیں سہما ہوا دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گئیں اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولیں، کلیم نے کہا:

"یہ سامنے جوتی پڑی ہوئی ہے۔ مناسب سمجھیں تو بیس برس پرانی سزا دہرا دیجیے۔ مگر اتنا خیال رہے آپ کی سزا کا خزانہ تھک جائے گا۔"

"اے ڈوب مرد شرم والی ہو تو میں ہوتا اس جگہ تو ــــ"

"تو بتا موئے کیا کرتا؟" چچی بی غرائیں۔

"اللہ پاک سے دعا کرتا کہ وہ تمہاری مٹی عزیز کرے۔"

چچی بی بھونچکی رہ گئیں اور ہم سب قہقہہ مار کر ہنس دیئے اور وہ ہم پر برس پڑیں "لوٹا کی لوٹا ہو گئے، بس جب دیکھو ہی ہی۔ شادی آج کل کے زمانے میں کوئی کھیل ہے۔ ان میں تو اتنا بھی نہیں کہ دو ٹانکے مار دیں۔ اللہ ماری آنکھیں ہی نہیں رہیں۔"

"شکر اللہ کا میرا صبر پڑا" چچا بولے۔

"میری مانو تو میاں، ایسا کرو کسی کو کیٹ دو کیس کے گئیں ہیں؛ عربی اور سات آٹھ برس کی قید۔ سکا ہو جائیں گی۔"

چچی بی کو پھر چھالیا پھانکنی پڑی۔

"اگلے مہینے تک کچھ ہو جاتا ۔۔۔" کلیم نے مسمسی صورت بنا کر کہا "پھر میری چھٹی کی میعاد ختم ہو جائے گی۔"

"بس بس کہہ دیا ۔۔۔ ہم سوچیں گے اور ہاں دیکھو لڑکے کل سے یوں دندناتے نہ چلے آنا۔ تو شایہ کا تم سے پردہ رہے گا۔"

"بہتر حکم" کلیم نے نہایت مسکین صورت بنا کر کہا۔

"ہیں؟ آخر کو جاہل لٹھ۔ نیک بخت آج کل کون پردہ کرتا ہے۔"

"گنوار لٹھ تم اور تمہارے ہوتے سوتے۔"

"نہ پڑیں تم میرے پلے خدا کی قسم۔"

"کیا کر لیتا تو میرا؟"

"منہ دکھائی میں چوہے مارنے کا زہر ٹکا دیتا۔"

چچی بی اور چھوٹے چچا کو اوپر تلے کے بچوں کی طرح لڑتا چھوڑ کر ہم لان پر آ گئے۔

خدیجہ مستور

ثریّا

مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میری پرانی مہترانی کیوں چلی گئی اور اس کی جگہ نئی مہترانی کس طرح آگئی۔ دوسری مہترانی کو دیکھ کر مجھے سخت اچنبھا ہوا کہ کیا وہ میرے گھر کا کام چھوڑ سکتی ہے جبکہ میں نے کبھی اسے کام کی خرابی پر ڈانٹا تک نہیں! بعد میں تفصیل معلوم ہوئی کہ خانساماں صاحب کی اس سے لڑائی ہوگئی۔ اور انھوں نے اسے نکال دیا۔ خانساماں صاحب کو اس گھر میں جتنے اختیارات حاصل ہیں، میں نے ان پر کبھی بھی مالکانہ چھاپہ مارنے کی کوشش نہیں کی اسی لئے خون کا گھونٹ پی کر چپ ہو رہی۔ پہلی مہترانی ہمارے گھر میں چار سال سے کام کر رہی تھی اور بڑا ستھرا کام کرتی تھی۔ نئی مہترانی گیارہ بارہ سال کی پیاری سی صورت کی بچی تھی۔ پہلے دن وہ اپنی ماں کے ساتھ کام کرنے آئی تھی۔ اس کی ماں کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ اس حقیر پیشے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے چہرے پر عجیب سا وقار تھا۔

انھوں نے بڑی محنت سے کام کیا مگر مجھے یہ دیکھ کر غصہ آگیا کہ نہ تو انھیں فرش صاف کرنا آتا تھا اور نہ قالین پر برش پھیرنے کی تمیز تھی۔

جب انھوں نے جانے کی اجازت مانگی تو میں نے انھیں پاس بلا کر ذرا غصے سے پوچھا "کیا تم کب سے کام کر رہی ہو؟ اسی طرح صفائی ہوتی ہے؟"

ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہونٹ بھینچے خاموش کھڑی رہی مگر اس کی لڑکی کی زبان قینچی کی طرح چل پڑی: "امی کو تو کوئی کام کرنا آتا ہی نہیں، بس گھر کا کام کرتی ہے۔ میں اور دادی کوٹھیوں کی صفائی کرتے ہیں۔ آج تو امی ساتھ تھی اس لئے کام خراب ہوگیا۔ کل سے آپ دیکھئے گا جی کہ میں کیسا کام کرتی ہوں۔ سب کہتے ہیں کہ ثریا تو تو بڑی ہوشیار ہے۔ آپ کو خوش کردوں گی۔" اس کے پھولے پھولے گال خوشی سے تمتا رہے تھے مگر اس کی ماں نے بیٹی کی باتوں پر ذرا بھی احتجاج نہ کیا اور خود کو نالائق تسلیم کرتے ہوئے اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ مجھے اس اتنی سی بچی کی ایسی پکی پکی باتوں پر ہنسی آرہی تھی۔

دوسرے دن ثریا کام کرنے آئی تو اس طرح صفائی کی کہ سارے گھر کو چندن بنا دیا۔ میں حیران رہ گئی کہ ایک دن میں ایسا سلیقہ کس طرح آگیا مجھے یقین ہوگیا کہ کل محض بدذاتی کی وجہ سے خراب کام کیا تھا۔ چلو اچھا ہوا کہ پہلی ہی جھڑکی سے عقل ٹھکانے آگئی۔

کام ختم کرنے کے بعد ثریا نے مجھے بڑے فخر سے دیکھا: "ٹھیک ہے نا بی بی جی؟"

"شاباش" میں نے بھی اس کی ہمت بڑھائی۔ "تم نے بڑی اچھی صفائی کی ہے۔"

"سب کہتے ہیں کہ ثریا تو تو بڑی ہوشیار ہے۔ میری دادی کو بھی ایسا کام نہیں آتا۔ پہلے پہلے تو وہ جس کوٹھی میں جاتی تھی، بس دو دن بعد نکال دی جاتی۔" اپنی تعریف سن کر وہ اس وقت بڑی مغرور نظر آرہی تھی۔

"پہلے کیا کام کرتی تھی تمہاری دادی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، گھر میں کام کرتی تھی۔ گھر کا کام بہت ہوتا ہے جی۔" جانے کیوں اس کا چہرہ کمھلا گیا۔

"تو کیا اب گھر کا کام ختم ہو گیا؟"

"نہیں بی بی جی" ذرا دیر کو چپ ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ "وہ جو ہماری برادری کے لوگ ہوتے ہیں نا، وہ باتیں کرتے تھے کہ گھروں میں بیٹھ کر شہزادیوں کی طرح روٹی کھاتی ہیں، اور بھی ایسی ویسی باتیں۔ اسی لئے میں اور دادی کام کرنے لگے۔ تیس روپے دادی کو مل جاتے ہیں، بیس روپے مجھے ملیں گے۔ اچھا ہی ہے نا بی بی جی، کچھ آ جائے گا جائے گا تو نہیں!"

"بالکل ٹھیک ہے، کام کرنا تو بہت اچھی بات ہے" میں نے ثریا سے ایسی دانائی کی باتیں سن کر اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

کتنی مہترانیاں آئیں اور چلی گئیں۔ ان کی عجیب عجیب عادتیں تھیں۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب وہ مانگنے کی عادت سے چوکتی ہوں۔ دوپٹہ، شلوار، ایک اٹھنی، تھوڑا سا گھی، آٹا، اور جب کچھ نہ ملے تو روٹی کی فرمائش یقینی ہوتی۔ کچھ مل گیا تو واہ واہ نہ ملے تو ٹکا سا جواب سن کر ڈھٹائی سے چلی گئیں کسی ملال یا کھسیانے پن کے آثار نظر آتے۔ مگر ثریا جب سے آئی تھی اس نے کبھی کچھ نہ مانگا۔ ایک آدھ بار ملازم نے اسے روٹی کھلانی چاہی تو اس نے صاف انکار کر دیا "اپنے گھر سے بڑا کچھ کھا کر آئی ہوں۔"

دسویں پندرھویں دن ثریا کی ماں یا دادی جاتیں اور یہ پوچھ کر چلی جاتیں کہ وہ ٹھیک کام کرتی ہے یا نہیں، اور یہ کہ مجھے اس سے کوئی شکایت تو نہیں۔ میرے اطمینان دلانے اور ثریا کی تعریف کرنے سے وہ خوش ہو کر پلٹ جاتیں۔

ثریا کو کام کرتے مجھے کئی مہینے ہو گئے۔ اب وہ مجھے ایسی اچھی لگنے لگی تھی کہ جب کبھی مجھے فرصت ہوتی تو اسے اپنے پاس بٹھا لیتی اور باتیں کرنے لگتی۔ اس کی پکی پکی باتیں سن کر کبھی کبھی مجھے شبہ ہونے لگتا کہ یہ لڑکی گیارہ بارہ سال کے بجائے پچاس برس کی ہے۔ وہ اس طرح لئے دیئے رہتی کہ حیرت ہوتی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے دنیا کو دیکھا ہے، برتا ہے اور بڑی تجربے کار ہے۔ جب مجھے اس کی باتوں پر ہنسی آتی تو وہ حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگتی۔ اس وقت وہ مجھے بالکل چھوٹی سی اور نری اُلّو لگتی کیونکہ میری ہنسی کی وجہ اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

ایک بار میں نے اس کی باتوں اور کام سے خوش ہو کر اسے انعام میں ایک روپیہ دیا مگر اس نے روپے کو بُری چیز کی طرح میز پر رکھ دیا "بڑا کچھ ہے اپنے گھر میں بی بی جی۔ بس تنخواہ لوں گی اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

میں نے بہت اصرار کیا مگر اس نے روپے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ مجھے اس کی اس حرکت سے سخت ہتک کا احساس ہوا۔ بڑی لاٹ صاحب کی بچی بنتی ہے۔ میرا جی چاہا کہ دو تھپڑ لگاؤں کمبخت کے۔ "کیا کیا ہے تیرے گھر میں، جو اتنا بنتی ہے" میں نے غصے کو دبا کر پوچھا۔

"بڑا کچھ ہے بی بی جی! ایک بھینس ہے، پکا سات سیر دودھ صبح دیتی ہے، سات سیر شام۔ ایک ٹائم کا دودھ امی بازار میں دے دیتی ہے۔ دوسرے ٹائم کے دودھ سے گھی اور لسی بنا لیتی ہے اور امی کے پاس ایک اتنا بڑا، آپ کے چھوٹے کمرے جتنا بکس ہے، اس میں چھینٹ کے چھ نئے لحاف، چھ گدے اور دس کھیس بھرے ہیں جب برادری والوں کے گھر بہت سے مہمان آ جائیں تو وہ سارے ہمارے گھر سے لحاف گدے مانگ کر لے جاتے ہیں اور ہمارے گھر بہت سے برتن ہیں، اُن پر پھول بنے ہیں، وہ امی نے پرچھتی پر سجا رکھے ہیں۔ اتنا بڑا شیشہ ہے ——" اس نے ہاتھ پھیلا کر شیشے کی لمبائی بتائی —— "اور ہماری امی کے پاس اس کی شادی کے پانچ جوڑے ہیں سب میں گوٹا لگا ہوا ہے اور ——"

"اور وہ جوڑے تیری امی تیرے جہیز میں دے دے گی؟" میں نے اسے چھیڑا تو وہ ایسی شرمائی کہ سر نیوڑھا کر بیٹھ گئی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میرا سارا غصہ رفو چکر ہو گیا تھا اور میں ثریا کے گھر سے مرعوب ہو گئی تھی۔ اپنا تو یہ حال تھا کہ مدت ہوئی خالص دودھ کا ایک گھونٹ نصیب ہوا ڈالڈا کھا کھا کر جی اُٹھ گیا۔ خالص گھی کی خوشبو تک یاد نہیں۔ کبھی بھینس پالنے کا تصور تک نہ آیا، صرف اس خوف سے کہ چھ سات مہینے تو دودھ گھی کی واہ جب وہ

گا بھن ہو تو مفت میں کھلاؤ اور پھر اسی بازار کے دودھ اور بڑا الڈا کو بھگتو"

"اور بی بی جی ہمارے گھر مٹی کی اتنی بڑی کٹھالی ہے جس میں گیہوں بھرا رہتا ہے اور پچھلے سال تو امی نے کرسمس پر میرے لئے ایک گوٹے کا جوڑا بنوایا تھا۔ اب کے بھی اسی کو پہنوں گی۔ آپ کرسمس کو جانتی ہیں نا؟ یہ ہماری عید ہوتی ہے جیسی آپ کی عید ہوتی ہے نا؟"

"مجھے پتہ ہے پگلی" میں ہنس پڑی مگر جانے کیا بات تھی کہ کرسمس کا ذکر کرتے ہوئے اس کا منہ اتر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بجھ گئی تھیں اور وہ جانے کس سوچ میں پڑ گئی تھی

"کیوں ثریا سنجیدہ کیوں ہو گئیں؟" میں نے پیار سے پوچھا

"کچھ نہیں اتنے دن بعد آئے گی ہماری عید"

"بس اتنی سی بات!" میں ہنس رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ لاکھ پکی پکی باتیں کرے مگر آخر تو بچہ ہے۔

دس بارہ دن سے میں بے حد مصروف تھی۔ ویسے مصروف ہوتی کب نہیں چھوٹے چھوٹے کتنے بہت سے کام ہوتے ہیں جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے مگر ادھر تو اتنے مہمان آئے کہ مجھے سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ ثریا آتی، کام کرتی اور خاموشی سے چلی جاتی۔ اس سے جب تک خود بات نہ کرو تو کیا مجال ہے کہ وہ بول جائے۔ ان دنوں میں ایک بار اس کی دادی بھی آئی مگر مہمانوں کو دیکھ کر ثریا کے کام کے سلسلے میں کچھ پوچھے بغیر ہی چلی گئی۔

آج مجھے فرصت ملی تو سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا اور اس وقت جب ثریا کام ختم کر کے جانے لگی تو میں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ بات کرنے کو جی تو نہ چاہ رہا تھا مگر باہر بڑے زور سے بادل گرج رہے تھے۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ غریب بارش میں نہ بھیگ جائے۔ میں نے اسے اتنے دن بعد جو قریب سے دیکھا تو وہ مجھے بے حد کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے رخسار بچپن کی تازگی کھو چکے تھے۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ "اری ثریا تو اتنی دبلی کیوں ہو گئی؟" میں اس کے لئے واقعی فکرمند ہو گئی۔

"نہیں تو بی بی جی" وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر سہلانے لگی۔

"تیرے گھر میں تو بھینس ہے کیا تجھے پینے کو دودھ نہیں ملتا؟"

"امی تو اتنا کہتی ہے کہ پی، مگر مجھے دودھ سے الٹی آتی ہے"

اب مجھے یقین ہو گیا کہ ثریا ضرور بیمار ہے۔ اس کا اگر ابھی علاج ہو جائے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ان لوگوں کی جہالت تو اس وقت بیماری کا احساس دلاتی ہے جب خدا کو پیارے ہونے کے قریب ہو جائیں۔ مجھے اس اتنی پیاری بچی پر سخت رحم آ رہا تھا "چل تجھے میں ڈاکٹر کو دکھا لاؤں، اپنی امی کو بھی ساتھ لے لے"

"توبہ توبہ! میں کیوں جاؤں ڈاکٹر کے پاس۔ مجھے اس کے نام سے بھی ڈر آتا ہے۔ ٹیکہ لگا دیتے ہیں۔ میری چھوٹی بہن کو ٹیکہ لگایا تھا تو دو دن بعد مر گئی تھی۔ میری امی اب تک یاد کر کے روتی ہے" اس نے بڑے بوڑھوں کی طرح ٹھنڈی سانس بھری۔

"تو پھر کچھ دن اپنے گھر آرام کر اتنے دنوں کے لئے میں دوسرا انتظام کر لوں گی" میں نے مشورہ دیا مگر ثریا کا پیارا چہرہ اور بھی پیلا ہو گیا۔ وہ عجیب عجیب آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی اور پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ "آپ مجھے نکال رہی ہیں۔ مجھے تو آپ سے پیار ہے بی بی جی، میں اس گھر میں کبھی کوئی کام کرنے نہ آنے دوں گی" اس نے ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہا

اور پھر اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے بہت تھک گئی ہو۔

"اری پاگل تجھے کون نکال رہا ہے؟" — میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگی — "بھلا میں اپنی ثریا کو نکال سکتی ہوں!"

وہ آنسو پونچھ کر مسکرانے لگی۔ آج پہلی بار وہ میرے بالکل قریب آ گئی تھی۔ اس کے کپڑوں سے ایسی سخت بساہند آ رہی تھی کہ میں نے مشکل سے آتی ہوئی اُبکائی کو روکا۔ میں نے تو کبھی یہ خیال ہی نہ کیا تھا کہ اس کے کپڑے اتنے غلیظ ہوتے ہیں اور یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ جب سے آئی ہے اس کے تن پر یہی جوڑا ہوتا ہے۔

"شاباش، روتے نہیں، اب بیٹھ جاؤ۔"

جب وہ بیٹھ گئی تو میں نے اسے نصیحت کی کہ وہ روز نہایا کرے اور دوسرے تیسرے دن کپڑے بدلا کرے۔ گندے رہنے سے صحت بھی خراب ہوتی ہے۔

"گھر میں بنے کپڑے ہیں بی بی جی۔ گھر جا کر یہ کپڑے اتار دیتی ہوں اور دوسرے پہن لیتی ہوں۔ یہ کپڑے تو گندا کام کرنے کے وقت پہنتی ہوں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔"

وہ ذرا دیر بیٹھی رہی اور پھر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں برابر سوچتی رہی کہ آخر میں نے ثریا کو ہٹانے کی بات ہی کیوں کی۔ اگر میں نے یہ بات نہ کی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ثریا کے آنسو سارا دن میرے لئے عذاب بنے رہے۔ بہرحال میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ کل جب وہ آئے گی تو اس سے خوب محبت سے باتیں کروں گی۔

دوسرے دن ثریا آئی اور جب کام ختم کر کے جانے لگی تو میں نے اسے بٹھا لیا مگر ابھی کوئی بات نہ کرنے پائی تھی کہ اس کی دادی آ گئی اور ثریا کے قریب بیٹھ گئی۔ "کام ٹھیک ہوتا ہے بی بی جی؟"

"بالکل ٹھیک، میں تو کہتی ہوں کہ ایسا کام اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔" ثریا کی تعریف کر کے میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے فخریہ انداز سے مسکرا رہی تھی۔

"اب تو جانا۔" ثریا نے اپنی دادی کو ٹہوکا دیا۔ "گھر میں کتنے بہت سے کام ہوتے ہیں، یہاں ایویں بیٹھی ہے!"

ثریا کی دادی جیسی بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ وہ میری طرف ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آج کوئی ایسی بات تھی جسے میں کسی طرح بھی نہ سمجھ پا رہی تھی۔

"بی بی جی!" اس کی دادی نے مجھے ہولے سے پکارا۔

"کیا بات ہے؟"

"بی بی جی، ثریا کی تنخواہ سے پانچ روپے پیشگی دے دیں۔ کل سے گھر میں روٹی نہیں پکی، اب تو بھوکے پیٹ کام بھی نہیں ہوتا، ثریا کی ماں الگ —" وہ جانے اور کیا کہنے والی تھی، اس کی آواز بھی کیسی، جیا تھی مگر ثریا تو ایک دم بپھر کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنی دادی پر جھپٹ پڑی۔ وہ اپنی پوری طاقت سے دادی کو مار رہی تھی، نوچ رہی تھی، اور ساتھ ساتھ چیختی جا رہی تھی — "بے شرم نہیں تو، ابھی سے مانگنے لگی۔ صبر نہ آیا تجھے، تیرے کہنے نے بھی کبھی کسی سے کچھ مانگا تھا؟ اللہ کرے تو بھوکی مرے، تیری لاش اُٹھے، اور تو —"

میں نے کھینچ کر ثریا کو الگ کرنا چاہا مگر وہ نہ ہٹی۔ اس نے اپنی دادی کا منہ ناخنوں سے کھرچ کھرچ خون نکال دیا تھا۔ اس کی دادی کیسی خاموشی سے بیٹھی پٹ رہی تھی۔ اس نے ذرا سی بھی مزاحمت نہ کی۔ بس، اس کی سیلی میلی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

جب میں نے ثریا کو زور سے کھینچ کر الگ کیا تو وہ منہ چھپا کر زور زور سے روتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔ میں حیران کھڑی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔

"آخر بات کیا ہے ثریا کی دادی؟"

"کچھ نہیں بی بی جی۔ جب سے برا وقت پڑا ہے تو چار چار فاقے کاٹنے میں پر ثریا کی یہی ضد ہوتی ہے کہ کسی سے کچھ نہ مانگو چاہے مر جاؤ۔" وہ سسک کر روتی اور پھر اپنے چہرے پر سے خون پونچھنے لگی ——— "بی بی جی ہم لوگوں نے کبھی یہ مہتروں والا کام نہیں کیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اللہ کا دیا ہوا سب کچھ تھا۔ اپنی بھینس تھی، اپنا گھر تھا۔ اپنی تھوڑی سی زمین بھی تھی جس پر ثریا کا ابا لہسن پیاز اور سبزیاں بوتا، پھر انہیں شہر لا کر بیچ دیتا۔ پیسے کی کمی نہ تھی۔ پھر زمینداروں کی زمینوں پر بھی کام کرتا تھا۔ سال تک کھانے کو گندم مل جاتی۔ لحاف گدے سے بکسے بھرے پڑے تھے۔ ثریا کو اس کا ابا رانیوں کی طرح رکھتا تھا۔ پھر بی بی جی! راتوں رات پتہ چلا کہ لڑائی ہو گئی۔ ہندوستان کی فوجیں آگئیں۔ بس جو ایک ایک جوڑا کپڑا تن پر تھا۔ اسی حالت میں بھاگ کر لاہور آگئے۔ یہاں کیسے جھونپڑا ڈال کر پڑے ہیں۔ جب دوسری عورتوں نے بھوکے مرتے دیکھا تو اس کام پر لگا دیا۔ پر ثریا اب تک اپنے کو گاؤں والی ثریا جانتی ہے۔ چار دن بھوکی رہے تو کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ پر میں بوڑھی ——— " وہ پھر رونے لگی۔

میں دم بخود بیٹھی تھی۔ میری کچھ ایسی کیفیت ہو رہی تھی کہ نہ بولا جاتا تھا نہ رویا جاتا۔ میرے دل میں بس دکھ کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔ میں کیسی بیتاب تھی کہ ثریا کو اپنے کلیجے سے لگا لوں۔

میں بڑی مشکل سے اٹھی اور ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ اسے دے دی اور اپنی طرف سے بھی دس روپے دے دیئے۔ "اس سے تم اپنے لئے آٹا خرید لینا۔"

وہ مجھے دعائیں دیتی اور چہرے سے خون صاف کرتی ہوئی چلی گئی۔

ثریا پھر کبھی میرے گھر نہیں آئی۔ میں کتنے دن تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ اسے خوابوں میں دیکھتی رہی۔

فوجیں واپس چلی گئیں۔ سب گھروں کو اپنے اپنے گھروں میں جانے کی اجازت بھی مل گئی۔ میرے ہاں کئی مہترانیاں آئیں اور چلی گئیں مگر آج بھی جب وہ کچھ مانگتی ہیں تو مجھے ثریا کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ "اپنے گھر بڑا کچھ ہے بی بی جی!"

محمد احسن فاروقی

پھٹّی

مجھے اس سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ صرف انسانی ہمدردی۔ ایک شریف خاندان کی لڑکی کو اپنی زندگی بنانے کا شوق تھا۔ مجھ سے کچھ رشتہ بھی تھا۔ میں ہر ایک کی مدد کر دینے کا عادی تھا۔ میں نے کہا چلو اس کی بھی مدد کر دوں۔ مگر کیا معلوم تھا کہ وہ کس قدر پھٹّی ہے اور آخر میں یہ پھٹّاپن نمایاں ہو کر ہی رہے گا اور مجھے نفرت ہو جائے گی۔ واللہ صورت سے نفرت نام سے نفرت۔ پھٹّی کہیں کی! غصہ آتا ہے اس پر اور اس سے زیادہ اپنی حماقت پر کہ اتنا وقت اور رقم ضائع کی اور اتنی پریشانی اٹھائی۔

انسان کی سب میں بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ دھوکے میں آ جاتا ہے اور یہاں مٹتی ہوئی تہذیب کے آثار بڑا دھوکا دیتے ہیں۔ یہ پرانے خاندان والے شاہی خاندان سے ہونے پر ناز کرتے ہیں۔ اپنے احساسِ کمتری کو ہم نواب کہہ کر تسکین دیتے ہیں سمجھ لیجئے آٹھ روپیہ کا وظیفہ کیا ہوا مگر تیس روپیہ کے مزدور کو نیچی نگاہ سے دیکھیں گے اور وہ کمبخت بھی نواب صاحب اور حضور سے بات کرے گا۔ چوڑی دار پاجامہ پیروں پر ضرور ہوگا چاہے وہ کتنا ہی چکٹ ہو گیا ہو اور پھٹ پھٹ کر اترا رہا ہو۔ شیروانی ہی پہن کر گھر سے نکلیں گے چاہے آستینیں اور گلا اور کہنیاں بالکل ہی ریزے ریزے نظر آتی ہوں۔ اپنے مخصوص طریقے سے آداب بجا لائیں گے اور عجیب شیریں لہجہ میں بات کریں گے واللہ دیکھ کر دل یہی کہتا ہے کہ ع آثار کہہ رہے ہیں عمارت عظیم ہے
غریب ہو گئے مگر شرافت ضرور باقی رہی ہوگی مگر غور سے دیکھئے تو آپ کے قریب آ جائیں گے اور آپ کو متمول دیکھ کر کچھ مدد چاہیں گے۔ آپ مدد دینے لگیں تو یہ ظاہر کریں گے کہ جیسے آپ انھیں خراج دے رہے ہیں اور پھر چوری سے باز نہ آئیں گے۔ دھوکا دے کے آپ کو چوٹ دے جائیں گے۔ بس کیا کہوں آپ انھیں چھو دیجئے پھر تو دق کی طرح لگ جائیں گے اور مار کر ہی پیچھا چھوڑیں گے۔

ہاں خاندانی ہونے سے ایک خوبی ان میں بلکہ ان کے گھر کی عورتوں میں ضرور ہوتی ہے یعنی ان کے چہروں کے رنگ روپ نکھ سکھ اکثر قیامت نکل جاتے ہیں۔ قبول صورت لڑکی ان کا اکثر بہت ہی بڑا سرمایہ ٹھہرتی ہے جس کا وجود قسم قسم سے آمدنیاں بڑھاتا رہتا ہے۔ لڑکی کو اکثر یہ لکشمی کہتے ہیں یعنی دولت کی دیوی اور اکثر یہ بھی کہتے ہیں کہ "فلاں لڑکی کے پیرے سے فلاں کے یہاں دھن برسنے لگا" خیر جس پھٹّی کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ سے اس کے باپ کے گھر میں دھن تو نہیں برسنے لگا تھا مگر یہ دیکھ کر کہ وہ لڑکی اپنے خاندان اور طبقے میں سب سے زیادہ پڑھنے کا خیال رکھتی ہے ایک صاحب نے اس کا وظیفہ برائے تعلیم کر دیا تھا۔ یہ رقم باپ کے وظیفہ سے دو روپیہ زیادہ تھی اور اس سے تعلیم تو خیر جس طرح ہوئی وہ ہوئی مگر گھر کے خراجات میں اضافہ ہو گیا۔ نواب صاحب کے دن پھر گئے۔ بالائیاں، وہ پراٹھے اڑنے لگے اور جھونپڑوں میں دو کوٹھوں کے خواب دیکھے جانے لگے۔

جن صاحب نے وظیفہ مقرر کیا تھا وہ آسودہ متمول ضرور تھے۔ نواب صاحب ان کے ہاں جاتے تو بہرحال خاندان سے نواب ہونے کی بنا پر کرسی ضرور بڑھائی جاتی حالانکہ حقیقت میں وہ ان صاحب کے معمولی خدمت گاروں سے بھی کم نظر آتے۔ اکثر خدمتگار انھیں نظر انداز کر جاتے مگر خود صاحب کو نہ معلوم کیوں ان کا

بہت خیال تھا اور لڑکی کو وظیفہ دینے کے علاوہ بیشتر دو چار روپے ان کے ہاتھ میں بھی رکھ دیتے تھے۔ اکثر کھانے پینے کی چیزیں کوئی کپڑا دوپٹا بھی ساتھ کر دیتے تھے کہ یہ بیگم صاحب کے لئے ہے، یہ لڑکی کے لئے ہے۔ ہر نواب کی طرح کثیر الاولاد بھی وہ تھے۔ ان کے بچے ننگے کھلے پھرا ہی کرتے تھے۔ اکثر کو بنگتے کھاتے بھی دیکھا مگر وہ لڑکی سب کے لئے اہم ہو گئی تھی۔ اس کی قسمت سے وہ دو چیزیں آجاتی تھیں کہ اگر روز نہیں تو کبھی کبھی گھر میں عیش ہو جاتا تھا۔ اس گھر کی حالت کا نقشہ کھینچنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ مجھے بھی اس لڑکی کی مدد کرنے کا خیال ہو ہی گیا۔

لوگوں نے اِدھر اُدھر کی بہت کچھ اُڑائی۔ میری بیوی کو بھی کچھ شبہ ہوا مگر وہ بیچاری بھی ترس خدا رکھتی تھی۔ ان کے سامنے بھی لڑکیاں تھیں، اور ایک غریب شریف لڑکی کو اپنی لڑکیوں کی خیرات دے دینا انھیں کار ثواب نظر آتا تھا۔ اب میں کیا بتاؤں کہ میں نے اس کے لئے کیا کیا کیا۔ وہ کچھ کیا جو اپنی لڑکیوں کے لئے نہیں کیا۔ خیر ان سب باتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ عرصہ تک میں اسے کچھ صحیح قسم کی لڑکی سمجھتا رہا اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ وہ ایسی ٹچی نکلے گی۔

اس کا سارا خاندان ہی ٹچا تھا اور اس کا ٹچا ہونا بھی ضروری تھا۔ روپیہ حاصل کرنے کی خواہش اور اس سلسلے میں کوشش کوئی بُری چیز نہیں ہے مگر ٹچا پن یہ ہے کہ لالچ میں آکر انسان اندھا ہو جائے اور یہ بھی نہ دیکھے کہ جو شخص روپیہ والا بن کر آیا ہے اس کے پاس کچھ ہے بھی نہیں۔ پڑھی لکھی لڑکی اگر کسی جاہل کے دکھاوے سے مرعوب ہو کر اس پر لوٹ پڑے تو اس سے بڑا ٹچا پن اور کیا ہو گا۔

خیر قصہ سنیئے۔ ہوا یہ کہ ایک شخص نظر آیا۔ نہایت دُبلا، لمبا، منہ چُرمُرایا ہوا مگر نہایت عمدہ سوٹ پہنے ہوئے، نہایت مستعلیق طریقہ پر باتیں کرتا تھا۔ سب کا ادب کرتا تھا معلوم ہوا کہ یہ اپنی شادی کرنے آیا ہے۔ اس کی والدہ لکھنؤ ہی کی تھیں مگر والد کلکتے کے تھے اور وہیں تجارت کرتے تھے۔ تجارت بڑی لمبی تھی اور وہ سب ان صاحبزادے کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بڑے روپے والے معلوم ہوتے تھے۔ تانگے والے کو پانچ روپیہ کا نوٹ دے دیا اور پیسے واپس نہیں لئے۔ کرایہ زیادہ سے زیادہ بارہ آنے ہوا ہو گا مگر دے دیئے پانچ روپے۔ ہر ایک پر رعب پڑا۔ بولے "مجھے غریب لوگوں کا بہت خیال ہے۔ بیچارے! میں انھیں خوش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تانگے والا کتنا خوش ہوا ہو گا اور اس کے بال بچے بھی۔" جو فقیر سامنے آیا اس کو کھٹ روپیہ نکال کر دیدیا۔ ظاہر ہے کہ چڑوں کے خاندان پر اس کا کتنا رعب پڑا ہو گا۔ ان صاحبزادے کے والد نے مجھ سے یہ سب آکر بیان کیا اور کہا "کلکتہ سے یہاں تک آیا اور اس فراوانی سے دریا دلی سے روپیہ خرچ کر رہا ہے تو اس کے پاس نہ معلوم کتنا روپیہ ہو گا سوچیئے تو۔"

ایک بات اور خاص سُنی کہ وہ زیادہ تر ہر مقام پر سَو روپیہ کا نوٹ نکالتا تھا۔ کسی دکان پر کوئی چیز خریدی، دوکاندار کو سَو کا نوٹ دیا۔ کسی چائے خانہ میں گیا، بیرے کو سَو روپیہ کا نوٹ دیا۔ سینما دیکھنے گیا، کھڑکی پر سَو کا نوٹ نکال کر ٹکٹ لئے۔ پورے خاندان کو شہر بھر میں گھماتا پھرا اور گھر کا ایک ایک فرد اس کی دولت کے رعب میں آتا چلا گیا۔ آخر میں اس نے شادی کا پیغام دے دیا۔ اب باپ ہیں تو بھائی ہیں تو، بہنیں ہیں تو ماں ہیں، تو پھولے نہیں سماتے، زمین پر قدم نہیں رکھتے۔ باپ نے مجھ سے آکر کہا "میں نہیں جانتا تھا اس کی قسمت ایسی کھلے گی۔ میں کہتا ہوں جلد سے جلد نکاح ہو جائے ورنہ ایسے لڑکے کو پھانسنے والے اس لکھنؤ میں لاکھوں نکل آئیں گے۔"

"سچ مچ مالدار ہے بھی یا محض دکھاوا ہے؟" میں نے کہا۔

"واہ آپ بھی واللہ۔ عیاں را چہ بیاں کی کیا حاجت ہے"

"مجھے تو شک ہوتا ہے"

"آپ نہیں چاہتے کہ وہ اتنی اچھی جگہ جائے۔ آپ نہیں دیکھ سکتے اس کو اتنا اونچا" انھوں نے جھلّا کر کہا۔

میں نے بھی دل میں کہا کہ جائیں چولہے بھاڑ میں یہ بھی اور ان کی لڑکی بھی، مجھے کیا پڑی ہے۔ ترس خدا ہیں میں ان کی مدد کر دیتا تھا۔ اب بھی لڑکی کے بُرے پھنس جانے کے خیال سے میں نے کہا نہیں تو مجھے کیا پڑی تھی۔ اب وہ مجھے جل کٹا سمجھ رہے تھے تو جائیں اپنا سر کھائیں۔

لڑکی سے تو اس طرح کی صاف باتیں ہونا ناممکن تھیں۔ وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ ان صاحبزادے کے ساتھ ساتھ شہر بھر میں گھومی تھی اور یہ مقام پہنچ کا نوٹ نکلتے اور خرچ ہوتے دیکھا تھا۔ نوٹ کا نوٹ سب کے لئے بڑی نعمت تھی۔ اس کی آنکھیں ضرور پھٹ گئی تھیں۔ میں نے اشارے کنایوں سے اس کی مرضی جاننا چاہی اور مجھے یوں معلوم ہوگئی کہ باتوں باتوں میں وہ بولی "تجارتی لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں ہر روز روپیہ آرہے ہیں نوکر پیشہ بُرے۔ مہینے مہینے تنخواہ ملتی ہے۔ بیس دن کے بعد ہر مہینے فاقہ پڑ رہا ہے قرض لے رہے ہیں۔" میں نے یہ سن کر آگے بات نہیں کی۔ باپ کو شادی کے لئے کچھ روپیہ کی فکر ہوئی مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے مدد کر دی اور دوسروں سے بھی مدد کروادی۔ شادی کے لئے عین وقت پر پہونچا اور کہنے لگا "میرا بڑا نقصان ہو جائے گا مجھے جلد واپس جانا ہے اس لئے رسمیں وسمیں کچھ نہ ہوں۔" باپ نے بھی دیکھا کہ خرچہ بچتا ہے۔ جھٹ پٹ نکاح اور رخصتی کردی۔ شام کو آیا۔ رات کو دس بجے نکاح ہوا۔ ایک صاحب ساتھ تھے جن کو منیجر منیجر کہتا تھا۔ وہ کاروبار کے لمبے چوڑے قصے سناتے تھے۔ صبح کو سب روانہ ہوگئے۔

کئی مہینے کے بعد صاحبزادی واپس آتی ہیں۔ کیسی۔ ایک آنکھ دباتی ہیں تو چار آنسو نکلتے ہیں ارے بھئی یہ کیا، جنت ارضی مل گئی تھی۔ رونا کاہے کا۔ معلوم ہوا کہ وہ مکار کسی دوکان پر نوکر تھا۔ دوکان کے مالک نے اپنے محل کے شاگرد پیشے میں ایک کوٹھری دیدی تھی جس میں صاحبزادی کو رہنا پڑا تھا۔ خود کھانا پکاتیں اور دن بھر اکیلی پڑی رہتیں۔ ہاں کبھی کبھی سینما لے جاتا تھا اور بس۔ گھر جانے کے لئے تیسرے درجے کے زنانے ڈبے میں بٹھا دیا تھا۔ یہاں اتر کر تانگے میں بیٹھیں اور گھر پہونچ گئیں۔ مجھے واللہ ترس آیا۔ بڑا ترس آیا۔ یوں تو ان سب بچوں پر مجھے غصہ آیا کرتا تھا۔ ارے پیسے کی لالچ سہی مگر عقل پر ایسے پتھر کہ یہ بھی نہ دیکھ کہ پیسہ ہے بھی کہ نہیں۔ مگر میں نے سوچا کہ لڑکی کو زیادہ الزام نہیں دیا جا سکتا اور وہ قابلِ رحم ہے۔ وہ کہنے لگی "میں اسے چھوڑ دوں گی بچے کو" میں نے کہا اس سے کوئی فائدہ نہیں آج کل تو بن بیاہی لڑکیوں کو بر ملنا مشکل ہیں، چھوڑی ہوئی کو کون پوچھے گا۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" کچھ ہی دنوں میں سارے محلے میں خبر عام ہوگئی۔ جو لوگ یہ دیکھ کر جل گئے تھے کہ اسے ایسی جگہ ملی اب خوش ہو کر فقرے چھوڑنے لگے، طعنے مارنے لگے۔ ایک صاحبہ نے کہا "اے ہے تو کیا، اپنے گھر سے اب بھی اچھی ہی رہیں۔ آخر باپ سے تو زیادہ ہی آمدنی ہوگی میاں کی اور کیا لچھن۔ ہاں دماغ میں ہوائی جہاز چھوٹے ہوئے تھے وہ چھٹ چکے۔ یہی ہوتا ہے جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنے کا نتیجہ۔"

خیر وہ جب پھر میکے آئی اور میں نے اُسے دیکھا تو پیٹ سے تھی، اور رونا دھونا، شکوہ شکایت حد پر پہونچی ہوئی تھی۔ میرا ترس اور بھی بڑھ گیا تھا۔ میں سچ سچ چاہنے لگا کہ اس کے لئے کچھ ایسا ہو جائے کہ وہ خوش زندگی گزار سکے۔ مگر میں نے دیکھا کہ اسے ہر شخص سے جلن ہوگئی۔ میرے بڑے لڑکے کی ملازمت کی خبر آتی وہ سن کر روٹھنے لگی۔ میری بڑی لڑکی کی شادی ایک مناسب جگہ ٹھہری وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا میاں بھی کئی دفعہ آیا۔ دیکھتا ہوں کہ محفل چھوڑ کر خاص طور سے رئیسوں کی صحبت سے گریز کرتا، ناک چڑھاتا۔ اپنی آمدنی کی ڈینگیں مارتا اور ذرا سے مذاق پر بگڑ جاتا۔ مستقل جل ککڑا تھا اور کسی کو اچھے عالم میں دیکھ کر اس کا لمبا منہ اور بھی لمبا ہو جاتا، سنت جاتا۔ ناک بھی زیادہ نوک دار ہو جاتی اور ماتھے پر عجیب طرح کی شکن آتی اور چہرہ پر غصہ سے کچھ چمک سی پیدا ہو جاتی۔ میرے داماد اور میری بہو کا اس نے سامنا ہی نہ کیا۔ عجیب چیز تھا۔ اس کو کئی بار دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ یہ بھی ٹچا ہی تھا اور پھر یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ یہ صاحبزادی بھی ٹچی ہی تھیں۔ پیسہ دیکھ کر بکھر جانا، ذرا سی تکلیف میں رونا دھونا اور برسوں روتا دھوتا رہنا۔ ہر ایک سے جلن اور اس جلن کا پھوہڑپن سے اظہار کر دینا سب ٹچاپن ہی تھا۔ ٹچا اور ٹچی خوب مل گئے، اللہ سب کام ٹھیک ہی کرتا ہے۔

خیر اس کا ٹچاپن آخر میں عجیب طریقہ پر ظاہر ہوا۔ جب سے ہی مجھے پورا یقین ہوگیا کہ بس ٹچی ہی ہے۔ ٹچی پیدائش ہی سے کہیئے، آخر خاندان والے

سب ایسے تھے پھر اس بچے سے شادی ہونا اور دن رات کا رونا دھونا۔ یہ دوسرا درجہ ہوا۔ اب اس کا آخر یا خاتمہ آتا ہے اور روشن ہو جاتا ہے کہ وہ نری بچی ہی ہے۔

اس کے میاں کی کوئی بہن کسی تجارت کے پاس تھی۔ میرا بھی ایک دفعہ کلکتہ جانا ہو گیا۔ میں اس کے ہاں پہونچتا ہوں تو اپنے میاں کی بہن کے سوا اور کچھ بات آتی ہی نہیں۔ "باجی جان کے بڑے بڑے محل ہیں۔ باجی جان پر انگریز نرسیں لڑکے ہیں جو ان کے بال بناتی ہیں، باجی جان کے نوکر چھوٹی کاروں پر پھرتے ہیں۔ باجی جان کی خود کے لئے کئی بڑی کاریں ہیں" خیر میں نے اس کا کوارٹر بھی دیکھ لیا اور جس طرح وہ رہتی تھی وہ بھی دیکھ لیا۔ اس کی تعریفوں کے پل سے باجی جان کو بھی دیکھنے کا شوق ہوا۔ معلوم ہوا کہ ان کے میاں دلال ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی، آدمی پر لطف تھے۔ بولے "ایک مٹی کی صراحی سے لے کر گھوڑے ہاتھی سب ہی کچھ بیچتا ہوں"۔ بکری کے لئے وہ موٹر بھی لیتے تھے اور لوگوں کو دکھاتے پھرتے تھے۔ بڑے بڑے مکانات بھی بکواتے تھے۔ خود ایک کباڑ میں رہتے تھے۔ انھوں نے ڈینگ کی نہیں لی مگر وہ بچی بیگم اور ان کے میاں کی تعریفوں کے پل باندھتے۔ ہے۔

"آخر باجی جان کے پاس سب کچھ ہے تمہارے پاس کیا ہے؟" آخر ایک دن میں نے دُکتا کر کہا۔

"میرے میاں کو اتنے بڑے بڑے لوگ جانتے ہیں۔ آپ سے زیادہ ان کے تعلقات ہیں"

"مجھ سے مقابلے کی کیا ضرورت ہے"

"آپ سے اچھے کپڑے ان کے پاس ہیں"

"میں کپڑوں وپڑوں کا خاص خیال نہیں رکھتا اور پھر اس مقابلے کی کیا ضرورت ہے۔ اس خواہ مخواہ کی ہوا باندھنے سے کیا فائدہ"

"آپ کے اتنی ان کی آمدنی بھی ہے"۔

"مجھ سے زیادہ کیوں نہ کہو"

"ہاں زیادہ ہی ہوگی"

"تم تو پڑھی لکھی ہو۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہوائیں باندھنے سے کوئی فائدہ نہیں سچی بات معلوم ہو کر رہتی ہے اور اس طرح جھوٹ میں حقیقت کو چھپانے سے آدمی ذلیل ہی ہوتا ہے"۔

"واہ جھوٹ کیسا۔ سب سچ ہے۔ آپ کو کوئی تمیز ہی نہیں ہے کسی بات کی"

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ حماقت میں ڈوبتی ہی چلی جا رہی تھی

"بات یہ ہے کہ آپ جلن ہیں ہم لوگوں کو دیکھ نہیں سکتے"۔

"میں جلن ہیں، میں جلتا ہوں؟"

"ہاں آپ جلتے ہیں"

مجھے غصہ آ گیا اور اُٹھ کر چلا آیا۔ وہ دن اور آج کا دن پھر میں نے اس کی طرف رُخ نہیں کیا۔

محمد خالد اختر

تیسرے قومی منصوبے کے آغاز تک

از

خاکپائے اولیاء فقیر حقیر لوشاہ سجادہ نشین درگاہ حضرت بستے شاہ، مصری شاہ، لاہور

بعد مدت مدید اور عرصہ بعید کی فرقت کے بعد یہ ناچیز فقیر حقیر لوشاہ آپ کے وصال کا طالب ہوتا ہے۔ پانچ سال پہلے اس ناچیز نے ایک سالہ نام "فالنامہ" انتخابی تصنیف کیا تھا، جو ایک مجلّے ادب کے میں (کہ ایک نوجوان کامل، خوبصورت اور خوب سیرت ہفتہ ہفتہ اسے نکالتا تھا) شائع ہو کر مطبوع خلائق ہر خاص و عام ہوا۔ بہت سوں کو اس سے ہدایت ملی اور کئی ایک کا شجر امید پھل پتے لایا۔ وہ صاحبان دنیا جہان میں سرفراز ہوئے اور اسمبلی ہال میں مسند نشین ہوئے۔ ناقدریٔ زمانہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ جب فقیر کے فالنامے کی بدولت وہ اپنی منزل پر پہنچے تھے اس کو کسی نے یاد تک نہ کیا ورنہ درگاہ حضرت بستے شاہ کہ مسکن اس فقیر کا تھی، بڑے ڈاک خانے یعنی پوسٹ آفس جنرل سے صرف چار کوس کا فاصلہ ہے۔ ہر چند کہ یہ فقیر دنیاوی جاہ و عزت کا بھوکا نہیں اور خدائے کریم نے اس کا دامن روحانی فیض سے مالا مال کر رکھا ہے، پھر بھی پیٹ کا دوزخ ہر غریب امیر کے ساتھ لگا ہے اس کو دو وقت بھرے بغیر چارہ نہیں۔ آج کل زمانہ عجیب ہے اللہ کے درویشوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ کئی درویشوں کو دیکھا ہے کہ لوگوں کو خیرات کے لئے اُکسانے کی خاطر دیا سلائی کی ڈبیاں اور غبارے اُٹھائے چلتے ہیں۔ فالنامہ تصنیف ہونے سے امید بندھی تھی کہ اچھے دن آجائیں گے۔ ساحل مراد پر پہنچنے والے دستِ شفقت رکھیں گے۔ حکومتِ وقت سے بھی ناچیز کو توقع تھی کہ اس قومی خدمت کو جو اس رسالے کے شائع ہونے سے میں نے کی بنظر قدر دیکھے گی اور انعام و اکرام کا مستحق قرار دے گی۔ یہ توقع بھی عبث ثابت ہوئی۔ سالانہ اعزازات کی فہرست ایک ہومیو پیتھک طبیب کی دوکان پر ایک روزنامے میں دو تین بار پڑھ ڈالی کہیں اپنا نام دکھائی نہ دیا ایک نام البتہ اپنے نام سے ملتا جلتا نظر پڑا۔ لال چودھری یا لالی بہادر کہ اسے تمغۂ خدمت بنایا گیا تھا۔ خیال گزرا کہ کہیں دھوکا نہ ہوا ہو اور ایک بار پھر فہرست پڑھنے کا عزم کیا۔ اتنے میں اس طبیب کا ایک گستاخ بد وضع اہل کار مجھ سے مخاطب ہو کر گویا ہوا کہ "آدھ گھنٹے سے تو یہاں بیٹھا ہے، اندر طبیب صاحب کے پاس نہیں جاتا۔ مجھے لگتا ہے کہ اخبار پڑھنے آیا ہے۔" اس سنے وہاں سے بڑبڑاتے ہوئے چلتا کیا۔ میں نے بھی بددعا اس ناخلف کو دی اور جاتے جاتے آنکھ بچا کر میز پر سے ایک بارش مریض کی ترکی ٹوپی سر پر رکھ کر چلتا بنا۔ وہ مریض بھی طبیب کے بلاوے کے انتظار میں اخبار میں گم تھا۔ طبیب کے اہل کار نے یہ سمجھ کر کہ ٹوپی میری ہے کچھ نہ کہا۔

قصہ مختصر، بہت کچھ زمانے کی نیرنگیاں اور ستمگاریاں میں نے دیکھیں، سب لکھوں تو اس کے سمانے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس شہر لاہور میں کہ کل عالم میں انتخاب ہے، کام کرنے والے کے پیشے بے شمار ہیں۔ آدمی کے دست و پا سلامت ہوں تو سو کام یہاں کرنے کے ہیں۔ ایک ہنرمند عزیز کو دیکھا کہ علی الصبح جیب میں قینچی اور استرا لے کر بس کے اڈے پر جا پہنچتا اور شام کو ایک آدھ ہٹوا لے کر گھر واپس آتا۔ اپنی کمائی کی رقم سے پوٹ سوٹ پہنے اور سگرٹ کے دھوئیں اڑاتا ہوا ہجولیوں کے ساتھ بولتی تصویروں سے دل بہلاتا۔ ایک اور نوجوان کو دیکھا کہ اکثر موچی دروازے میں مجھے دودھ والے کی دوکان میں

بہڑوں والا دودھ پیتا اور خوش گپیاں اُڑاتا تھا۔ گذارے کی سبیل اس کی معلوم نہ ہوتی تھی۔ ایک رات میں کچھ کام سے بادشاہی مسجد جاتا تھا کہ وہ نوجوان منہ پر ڈھاٹا باندھے اور سر پر ایک آہنی طشتری رکھے آتا نظر پڑا۔ نزدیک سے گذرا تو وہ آہنی طشتری وہ ڈھکنا نکلی جو بدرو کے سوراخوں کو ڈھانپنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ سخت حیرت ہوئی۔ بعد میں اس شخص کی خوش حالی اور خوش خوراکی کا عقدہ حل ہوا کہ روز دو تین ڈھکنے سڑکوں اور گلیوں میں سے اُٹھا لاتا اور لنڈے بازار میں بیچ ڈالتا۔ بلدیہ کے بعض عمال اس میں اس کی سرپرستی کرتے۔ ایک بار یہ فقیر بھی ایک عزیز کی ہنرمندی کا شکار ہوتے بال بال بچا۔ ریلوے سٹیشن پر ایک بنچ پر پڑا سوتا تھا اور بیساکھی بنچ کے سہارے پائنتی کی طرف کھڑی کر رکھی تھی۔ گویا خواب کے عالم میں دیکھا کہ کوئی بیساکھی کو کھسکا رہا ہے۔ آنکھ کھلی تو سچ مچ ایک گھٹے سر اور مڑے ہوئے کانوں کا کریہہ الہیئت شخص اسے کندھے پر ڈالے جا رہا تھا۔ میں نے واویلا کیا۔ ایک لشکری نے جو وہاں پہرہ دیتا تھا اسے جا دبوچا۔ میری بیساکھی مجھے لا کر دی مگر ساتھ ہی پوچھا کہ تمہیں کون سی گاڑی پکڑنا ہے۔ میں نے اسے خوش گپیوں میں لگانے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی، کہنے لگا کہ رستہ پکڑو اور چلتے نظر آؤ پھر تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔ وہ رات چلتے پھرتے بسر کی۔

ایک دن ایک ورق میں، کہ جس میں پان بند ہو کر آیا تھا، پڑھا کہ کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔ سوچ میں پڑا کہ کون سے ہنر اور کسب میں کمال حاصل کروں کہ دنیا آکر قدم پکڑے۔ کسب تو بہت سے ذہن میں آئے لیکن یہ فقیر بے چارا اپاہج، بیساکھی کے سہارے چلنے والا، کمال پیدا کروں تو کس میں کروں۔ اُٹھ کر پیشے کی جستجو میں سرکلر روڈ پر چل کھڑا ہوا۔ ایک جگہ ٹاٹ پر بہت سی کتابیں بکھری دیکھیں۔ میں نے بہت سے نسخے بغل میں داب لیے اور آگے بڑھا کہ پیچھے سے ایک مرد کہ ہیئت اس کی لومڑی کی تھی چلایا "ابے او لنگڑے دین! کتابیں رکھ جا کہاں لیے جاتا ہے۔" بھاگا آیا اور کتابیں چھین لیں۔ بولا "یہ مفت کا مال نہیں۔" ماتھا ٹھنکا کہ یہ دوکان ہے۔ ان کتابوں میں ایک نسخہ حاضرات، استخارے، قیافہ، رمل، تقدیر و تدبیر کسی ڈاکٹر جناتی کا لکھا ہوا تھا۔ فوراً پیشہ سمجھ میں آیا۔ اپنے آپ سے کہا "لالو شاہ! ان علوم میں کمال حاصل کر، اپنا بیڑا بھی پار کر اور دوسروں کا بھی۔ ایک عالم تجھے دعائیں دے گا۔" دو آنے میں نسخہ خریدا اور پیدل چلنے والوں کی پٹڑی پر بیٹھ کر اس کے اوراق اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔ کتاب کام کی تھی۔ البتہ استخارہ کرنے کے لیے جن احتیاطوں کا ہونا بقول مصنف عامل آدمی کے لیے لازم تھا وہ اپنے میں نظر نہ آئیں۔ اس عزیز نے لکھا تھا کہ عامل کے ہاتھ پاؤں تندرست ہونے چاہئیں۔ وہ سچ بولتا ہو، خلوت پسند ہو، کم گو ہو، اور غذا دو دن میں صرف ایک بار کھائے۔ عمل کرنے کے لیے الگ کمرے کی بھی شرط تھی جو پھول، الائچی، اگربتی سے خوشبودار اور معطر ہو۔ ابھی یہی پڑھتا تھا کہ ایک سائیکل بیٹھ میں آن لگی خیر وہاں سے چلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے ایک فربہ کیلی داڑھی والا آدمی کہ جس کے چہرے پر تمکنت اور جلال کی پرچھائیں تھی۔ ایک نجومی کی دکان لگائے بیٹھا ہے اور علم نجوم کی مدد سے ایک پچاس برس کی عورت کو بتاتا ہے کہ دو سال میں اس کی گود ہری ہو جائے گی۔ مجھے اس شخص کا چہرہ آشنا سا لگا چشمہ لگا کر بغور دیکھا تو یہ نجومی میرا لنگوٹیا نسیم احمد تھا کہ ہم ایک ساتھ ہی محکمہ بحالیات سے تخفیف میں آئے تھے۔ وہ بڑھیا سے فارغ ہوا تو میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ دکھایا۔ اس نے نہیں پہچانا کہنے لگا "پہلے چار آنے ہتھیلی پر رکھ پھر غیب کی باتیں بتاؤں گا کہ تو حیران ہوگا تیرا ہاتھ وزیر کا ہاتھ ہے۔" چار آنے میں نے اس کی ہتھیلی پر رکھے کہ ذرا اس کو آزماؤں۔ کہنے لگا "تیرا نام لالی خاں ہے۔ اور تیرے باپ کا نام استقلال خاں" اور حالات وکوائف ٹھیک ٹھیک بتانے لگا۔ مجھے شک گزرا کہ پہچان گیا ہے اور ٹھٹھا تخول کرتا ہے۔ میں نے کہا "چھوڑو یہ مذاق میں تمہارا دوست لالی خاں ہوں۔" ہم دونوں خوب ہنسے۔ نسیم احمد نے کہا "بات یہ ہے کہ مجھے ضروری کام کے لئے ذرا راولپنڈی جانا ہے۔ تو یہاں کام سنبھال چھ سات روپے روز کے کہیں نہیں گئے۔"

اس طرح میں نے نجوم کا پیشہ اختیار کیا، خدا نے بڑی برکت دی۔ آٹھ نو روپے کما کر اُٹھتا اور سجدۂ شکر بجا لاتا۔ ساتھ ہی اپنے پرانے شوق یعنی تصنیف کتب کا وقت نکالا اور حاضرات، استخارے پر ایک رسالے کا آغاز کیا۔ اس عزیز ڈاکٹر جناتی کی کتاب میں بہت سی غلطیاں تھیں

ایک نسخہ تو نسیم احمد، اسلم، اور میں نے مل کر آزمایا۔ بالکل غلط ثابت ہوا۔ روحوں کو بلانے کے لئے ڈاکٹر جناتی نے حسب ذیل نسخہ تحریر فرمایا ہے:

> کیرم بورڈ پر چار کپ یا چھوٹا گلاس رکھ کر تین آدمی اپنی اپنی انگلی اس پر رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کپ یا گلاس حرکت میں آجاتا ہے۔ تینوں آدمی دل میں یہ خیال کر کے بیٹھتے ہیں کہ کوئی قریب ترین روح اس کپ یا گلاس میں آجائے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں کپ یا گلاس حرکت میں آجاتا ہے۔ اب اس روح سے سوال و جواب کر کے استفادہ کرتے ہیں۔ سوال و جواب کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کیرم بورڈ کے چاروں طرف دس تک ہندسے اور حروف ابجد لکھے ہوتے ہیں۔ روح سے مثلاً آپ سوال کرتے ہیں کہ مسٹر روح آپ کا نام کیا ہے (تم یا تیرا استعمال کرنے سے ارواح کی ہتک ہوتی ہے، اور یہ سراسر سوءِ ادب کے منافی ہے۔ عمل یوں غلط ہو جائے گا) تو کپ یا گلاس نہایت سرعت سے بھاگ کر اپنے نام کے پہلے حرف کی طرف جاتا ہے اور اس حرف کو بتا کر واپس کیرم بورڈ کے سنٹر میں جہاں سے چلا تھا، آجاتا ہے۔ مثلاً روح کا نام امام دین ہے تو کپ یا گلاس پہلے الف کی طرف بھاگے گا پھر سنٹر میں آئے گا پھر نام کے اگلے حرف م کی طرف دوڑے گا اور پھر واپس سنٹر میں آئے گا۔ روح کا نام معلوم ہو جائے تو اس سے مزید استفسارات کئے جا سکتے ہیں۔ وغیرہ

نسیم احمد نے ایک شاعرِ بے مثل کی تقلید میں (جس کا ہر شعر گوہر آبدار ہے اور ذوقِ سخن سے بہرہ ور اس کے کلام کی توصیف و تعریف میں رطب اللسان ہیں) فیض اپنا تخلص رکھا ہے۔ نسیم احمد پنجابی میں دوہے، نظمیں اور حکامِ اعلیٰ قدر کے قصیدے لکھتا ہے اور تاثیر کا طلسم خدا نے اسے عطا فرمایا ہے۔ ایک الوداعی مجلس میں اس نے یہاں کے نائب کوتوال کی تعریف میں قصیدہ پڑھا اور دعا مانگی کہ وہ اور بلند اقبال ہو۔ دوسرے دن ہی وہ دعا قاضی الحاجات کی بارگاہ میں مستجاب ہوئی اور نائب کوتوال ترقی پا کر کوتوال کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوا۔ شاعری کے لئے مشقِ قلندری کے کسی اُستادِ کامل کی دستگیری لازم ہے ورنہ یہ کسب حاصل نہیں ہوتا۔ آج کل کا زمانہ ہے، ہر بوالہوس نے رسمِ عاشقی شعار کر رکھی ہے اور بے بحر اور بے قافیہ لکھنے والے شعراء کی بھرمار ہے۔ نسیم احمد کے استاد مرحوم، طوطیٔ ہند، بلبلِ خطۂ پنجاب حضرت استاد امام دین گجراتی بی۔ ال۔ ال ڈی تھے۔ انہی کے فیض نے نسیم احمد کو زمانے کا سعدی بنایا۔ نسیم احمد نے کہا کہ اُستاد مرحوم کی روح کو بلانا چاہیئے کہ ایک کلام میں ان کی اصلاح لینی ضروری ہے۔ چنانچہ نسیم احمد کے مکان میں ایک شام سب انتظام ڈاکٹر جناتی کی ہدایت کے مطابق مکمل کر کے ہم تینوں رفیق اکٹھے ہوئے۔ چار گھنٹے تک استاد امام دین کی شبیہ مبارک تخیل کی آنکھ میں رکھے کیرم بورڈ پر انگلی دھرے بیٹھے رہے گلاس یا پیالہ حرکت میں نہ آیا اور آخر اسے خود ہاتھ سے ہلا کر اُستاد کے نام کے حروف پر لانا پڑا۔ علم اس کا خداوند تعالیٰ کو ہوگا کہ اُستاد مرحوم کی روح گلاس میں آئی یا نہیں۔ بس فقیر نے ایک دو بار گلاس میں جھانک کر دیکھا، کوئی روح وہاں دکھائی نہ پڑی۔

نسیم احمد اور میں نے دوسرے روز سوچا کہ اس ڈاکٹر جناتی کا پتہ کریں کہ کون شخص ہے کہ یہ رسالہ جھوٹ موٹ کے ٹوٹکوں کا مرتب کر کے ناحق لوگوں کی جیبوں پر ڈاکا ڈالتا ہے اور کل عالم کو اس نے گمراہ کیا ہے۔ رسالے پر ناشر کا پتہ درج تھا۔ گلی بہار نونہال بک ڈپو کوچہ ہنسی چرکاں۔ اندرون بھاٹی گیٹ۔ وہاں ایک شام پہنچ کر پوچھ گچھ کی۔ ایک حلوائی نانبائی کی دوکان پر بک ڈپو کا بورڈ لٹکا تھا۔ نانبائی نے بتایا کہ ایک نونہال خشخشی داڑھی والا اوپر رہتا ہے جو محکمہ آبکاری میں کلرک ہے۔ کنڈی کھٹکھٹائی وہ عزیز نیچے آیا۔ آنکھیں چندھی، چہرہ ہونق، بال عنکبوت، خشخشی داڑھی، ایک تنگ مہری کی پتلون پہنے تھا کہ فی زمانہ اس شہر کے مدرسوں اور جامعوں کے طلبا اس کو اپنی ٹانگوں پر کسے پھرتے ہیں۔

اس نوجوان نے پوچھا کہ "ارشاد فرمایئے کیسے آنا ہوا" خوش خلقی اس کی دیکھ کر کچھ کہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ نسیم احمد آدمی منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے رہ نہ سکا۔ بولا "یہ رسالہ آپ نے تالیف کیا ہے؟ ڈاکٹر جناتی آپ ہیں؟" وہ نوجوان کچھ مسکایا۔ بولا "میں کتابیں چھاپتا ہوں۔ میرے حاضرات میرے تابع ہیں کتابیں لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جناتی بھی ان میں سے ایک ہے۔" ہم حیران ہوئے۔

نسیم احمد نے کہا "اس ڈاکٹر جناتی نے الٹ سلٹ چیزیں اس رسالے میں لکھ دی ہیں۔ ایک دیا ہے کہ دن دن بھر روزہ رکھتی ہے اور شیر برنج سے افطار کرتی ہے تاکہ سالک کے منصب پر پہنچے اور استخارہ کرنے کے قابل ہو۔ اتنی جان جوکھوں کے بعد ہدایات پر عمل کرتی ہے مگر حاضرات تو حاضرات ایک چوہا بھی نمودار نہیں ہوتا۔" ہم نے اس نوجوان کو کیرم بورڈ کا واقعہ عرض کیا۔

وہ بولا "ڈاکٹر جناتی جھوٹ نہیں بولتا کیا آپ نے عمل سے پہلے نوچندی جمعرات کے دن عین طلوع آفتاب سے ایک پہر کے درمیان زعفران سے مرکب تیار کر کے انار کی تازہ شاخ کے قلم سے یہ نقش اپنی پیشانی پہ مرقوم کیا تھا؟ انشاء اللہ، ماشاء اللہ؟"

ہم نے اقرار ایسا نہ کرنے کا کیا کہ انار کا درخت عام تام نظر نہیں آتا۔ وہ نوجوان بولا "تو مجھے کیا کہتے ہو۔ شرط عامل کی تم نے پوری نہیں کی۔"

نسیم احمد نے کہا "وہ تو ایک اور استخارے کی شرط ہے۔ ڈاکٹر جناتی سے ہمیں ملاؤ۔"

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا اور جواب دیا "سب حاضرات رات کو آتے ہیں۔ اب بھاگو یہاں سے مجھے آرام کرنے دو۔"

ہم وہاں سے چلے آئے۔ جہاں تک فقیر کی رائے ہے یہ شخص خود ہی ڈاکٹر جناتی تھا۔ اس بات پر البتہ ہم نے غور کیا کہ اگر حاضرات تابع ہوں اور تصنیف و تالیف میں لگا دیئے جائیں تو مکتبہ آسانی سے قائم ہو سکتا ہے۔ کتابت بھی حاضرات کر سکتے ہیں۔

یہ قصہ طول طویل محض آپ کے تفنن طبع کی خاطر قلمبند کیا ہے۔ فقیر اب نسیم احمد کے گھر رہتا تھا اور مدت کے بعد مولا نے دولت سکون کی دی۔ جیب میں پیسے کھنکنے لگے۔ چنانچہ ایک درزی خانم مارکیٹ میں بیٹھنے والے سے تنگ مہری کی پتلون کا نصف حصہ سلوایا اور ایک ٹائی لگا کر شام کو مال روڈ پر گشت کرنے نکل جاتا۔ مال روڈ اس شہر لاہور کی قابل دید شے ہے۔ یہاں زندگی کا تماشا دیکھا۔ مہ وشان آفت خیز، تنگ اور چست قمیص، شلوار میں ملبوس، حنائی ہاتھوں میں چرمی بیگ اٹھائے یہاں پر اٹھلاتی گزرتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر خدائے ذوالجلال کی قدرت یاد آتی ہے۔ سکوٹر پر زن و مرد اکٹھے شانہ بشانہ بیٹھے اڑے جا رہے ہیں۔ خیالات اس فقیر کے یہ نظارے دیکھ دیکھ کر پراگندہ رہنے لگے۔ چنانچہ ایک استخارے کا ارادہ کیا۔ اس کے لئے کالے مور کی کلغی کی ضرورت تھی۔ سارا لاہور شہر چھان مارا۔ دستیاب نہ ہوا تو خیال ترک کیا۔

ایک دن نسیم احمد نے کہا، حلقۂ ادبا میں تجھے پہچانتے ہیں۔ فالنامہ انتخابی تیرا میں نے بھی پڑھا تھا۔ نہایت لاجواب ہے۔ تو کسی اخبار میں ملازمت کیوں نہیں کرتا؟

میں نے کہا: "اخبار کے دفتر میں بادشاہ کو کون رکھے گا؟"

وہ بولا: "میں تجھے بتاتا ہوں۔ اخباروں میں پہلے خبریں چھپتی تھیں اور لوگ خبروں کے لئے انہیں پڑھتے تھے۔ اب خبروں کے سوا سب الابلا ہوتی ہے۔ ایک شخص خود اغوا ہو جاتا ہے اور چار صفحوں میں بتاتا ہے کہ اغوا ہونے والے کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ کوئی اپنی ڈائری میں اس بات کا رونا روتا ہے کہ لوگوں نے گھوڑے پر سواری کرنا چھوڑ دیا ہے اور دلیری کی روایات رخصت ہو رہی ہیں۔ ایک دانا بینگن یا چقندر کے فوائد گنتا ہے۔ ایک خواتین کا صفحہ ہوتا ہے نہایت باغ و بہار۔ تو علم روحانیات پر عبور رکھتا ہے کسی اخبار کے ایڈیٹر سے مل اور اسے مشورہ دے کہ ایک روحانیات کا صفحہ ہونا ضروری ہے اور اس کے لئے اپنی خدمات پیش کر۔"

بات نسیم احمد کی میرے دل کو لگی۔ ایک دفتر اخبار کا پرانی انارکلی میں دیکھا۔ روزنامہ "شور و شر" کا بڑا سا تختہ کوئی ایک فرلانگ لمبا پیشانی پر آویزاں تھا کھٹ کھٹ اوپر چڑھا۔ ایک شخص سے کہ کاغذ گھٹنے پر رکھے کچھ لکھتا تھا پوچھا کہ ایڈیٹر سے ملنا ہے۔ اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ٹائی پتلون پہن رکھا تھا کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک کرسی پر ایک نوعمر مولانا کو بیٹھے دیکھا۔ سیاہ سوٹ زیب تن کئے اور سیاہ داڑھی رکھے، اس سے کچھ واقفیت پہلے تھی۔ یہ عزیز اب اخبار میں

روزانہ ایک کالم "ماضی مرحوم" نام کا لکھتا ہے۔ شائستگیٔ اسلوب اور حسنِ بیان میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ البتہ نام اس کے کالم کا "حالِ مرحوم" ہونا چاہیئے کہ یہ عزیزِ گرامی قدر غلط فہمی سے ماضی کو حال سمجھے بیٹھا ہے۔

ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد مدعا آنے کا زبان پر لایا۔ اس نے کہا "مسٹر لاتوشاہ، مشورہ تمہارا خوب ہے۔ بات بھاتی ہے۔ فیصلہ اس کا ٹرسٹ کے خداوند کریں گے۔ تم کو اطلاع دوں گا۔"

تین چار دن اطلاع نہ آئی تو ایک شام پھر وہاں پہنچا، پتہ چلا کہ ایک حلقہ دانشوروں کا یہاں ہر سنیچر کے سنیچر عیسائی پادریوں کے ہال میں اجلاس کرتا ہے۔ وہاں گیا ہے جوں توں کر کے فقیر بھی وہاں اجلاس میں جا پہنچا۔ بیٹھے ہوؤں نے کنکھیوں سے دیکھا اور کچھ مسکرائے۔ میں بھی دل تنگ ہوا۔ ایک طرف ایک ڈبی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بہت سے لمبے بالوں والے صاحبزادے وہاں جمع تھے محویت کا عالم طاری اور سگریٹ کے کش پہ کش کھینچتے۔ وہ عزیز وسط میں ایک کرسی پہ پان چباتا ہوا مسند نشیں تھا اور سب اس سے مخاطب ہوتے تھے اتنے میں دیکھا کہ کہن سال بزرگ داخلِ مجلس ہوئے۔ قد میانہ، آنکھیں سبزی مائل، سر پر پٹے ہاتھ میں جریب بوسیدہ سا پتلون کوٹ پہنے اور گلے میں ایک میلی سی ٹائی۔ ان کے ہمراہ ایک خاتون آئیں۔ پستہ قد، بال بیے کے گھونسلے کی طرح اور جامنی رنگ پر لپ سٹک اور پاؤڈر تھوپا ہوا سن یہی کوئی پچیس چھبیس کا ہوگا۔ یہ فقیر سمجھا کہ یہ اس بزرگ کی بیٹی یا شاگرد ہوگی۔ ایک نوجوان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ بزرگ کوئی ایف ٹی ہوتے تھے۔ اور یہ خاتون ان کی غالباً بیوی تھی یا ان کی مصاحبت پر رہتی تھی۔ ان کے آتے ہی محفل میں جان پڑ گئی۔

"شور و شر" والے عزیز مولانا کی فرمائش پر ایک اونچی پیشانی کے نوجوان نے پچھلے اجلاس کی روداد سنائی۔ اس کے بعد صدر (وہی شور و شر والا عزیز) نے حاضرینِ مجلس سے پوچھا کہ کسی کو اس پر اعتراض تو نہیں؟ سب نے اتفاق کیا ماسوا ایک چشمہ لگے منحنی لاغر اندام نوجوان کے۔ کہ میں نے وہ الفاظ ہرگز نہیں کہے جو اجلاس کے منشی نے مجھ سے منسوب کئے ہیں۔ اس پر تکرار چلی بعضوں نے کہا کہ اس نے کہے تھے اور ضرور کہے تھے۔ صدر نے کہا سنتے تو میں نے بھی تھے منشی کو ہدایت کی کہ اسے روداد میں سے علیحدہ کر دو۔ اس کے بعد صاحبِ صدر نے ایک کاغذ کو دیکھ کر کہ اس کے سامنے رکھا تھا ایک محجوب سے نوجوان سے درخواست کی کہ وہ اپنا مقالہ "اردو شاعری میں جنسی علامات" پیش کریں۔ وہ صاحبزادے ایسی آواز میں پڑھنے لگے جیسے منہ میں گھنگنیاں ڈال کر آئے ہیں۔ مقالہ تو اسے نہیں کہا جا سکتا، پوری کتاب گھر سے لکھ کر لائے تھے، اور سب کی سب سنانے پر تلے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کچھ مصری اور یونانی اصنام تراشی کا چکر تھا، کچھ ایلورا کے غاروں کا ذکر۔ زبان بھی غالباً یونانی یا سنسکرت تھی۔ کئی حاضرین کو دیکھا کہ بے صبر ہو کر پہلو بہ پہلو بدلتے ہیں اور بار بار جامنی خاتون کو دیکھتے ہیں۔ خدا خدا کر کے مقالہ ختم ہوا۔ اس اجلاس کا دستور ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اس پہ لوگ باری باری رائے دیتے ہیں اور بحث کرتے ہیں۔ پڑھنے والے کو اجازت نہیں کہ کچھ کہے۔ بحث کافی طول پکڑ گئی۔ جدلیاتی قدریں اور مابعد الطبیعیاتی تاثرات قسم کے الفاظ بار بار کانوں میں پڑے۔ جریب والے بزرگ بھی کچھ بولے کچھ اس قسم کی بات تھی کہ دھارمک شاعری میں گھوڑا جنسی علامت ہے اور اس کے ثبوت میں رامائن کے کچھ اشعار اصل سنسکرت میں پڑھے۔ اجلاس کا منشی پوری مستعدی سے سب گفتگو لکھتا جاتا تھا۔

اس کے بعد ایک صاحب نے ایک افسانہ پڑھا عنوان میں نے اچھی طرح نہیں سُنا، غالباً "دو بلاؤ" تھا۔ میں ٹانگیں کرسی پر رکھ کر سو گیا۔ خواب سے بیدار ہوا تو ایک صاحبزادے خوش وضع خوش قطع، بانکے ترچھے اپنی نظم سنا رہے تھے۔ قافیہ ردیف سرے سے غائب۔ فقیر کہنے لگا تھا کہ میاں صاحبزادے یہ نثر ہے شاعری اس کو نہیں کہتے۔ پھر سوچا آدابِ مجلس کے خلاف ہوگا چپکے بیٹھے رہو۔ اس پر بھی ایک ایک مصرعے پر بڑی لے دے ہوئی۔ کوئی کہتا تھا کہ شاعر کی مراد یوں ہے یوں نہیں۔ دو صاحبزادے اس بحث میں اُلجھ گئے، اور دوسروں نے بیچ میں پڑ کر ان کو چھڑایا۔ بارے یہ مجلس ختم ہوئی۔ میں بیٹھا سوچتا تھا اللہ تیری قدرت۔ یہ لوگ یہاں بیٹھ کر مفت میں دماغ سوزی کرتے ہیں اور بال کی کھال اتارتے ہیں۔ ہر کوئی ان میں سے خود کو سخن کے میدان میں

شاہسوار سمجھتا ہے۔ پانچ چھ فقرے رٹے ہیں جو کبھی کسی انداز سے دہراتے ہیں کبھی کسی انداز سے۔ دل چاہا کہ ان کو کہوں صاحبو! اور مفید کام تمہارے کرنے کے ہیں خواہ مخواہ اپنے ذہنوں کو پریشان کرتے ہو۔

بارے عزیز مولانا اپنی مسند سے اُٹھا۔ میں نے بڑھ کر خندہ پیشانی سے معانقہ کیا۔ خوش خبری دی کہ "تمہارا کام ہوگیا۔ کارپردازان نے فیصلہ کیا ہے کہ روحانیت کا صفحہ ہونا چاہئے تاکہ لوگ فیضیاب ہوں۔ تم کل سے دفتر میں آؤ اور نمونہ کا کالم لکھو۔ تمہارا کام پسند خاطر ہوا تو ساڑھے چھ سو روپے ماہوار تمہیں ملیں گے۔"

دل چاہا اس عزیز کے قدم چوم لوں۔ بارگاہ رب عزت کا شکر بجا لایا۔ گھر آ کر نسیم احمد کے مشورے سے ایک کالم حاضرات کے فوائد پر تحریر کیا اور اگلی صبح اس عزیز کے پاس لے گیا۔ اس نے سراہا اور کہا کہ ٹھیک ہے البتہ زبان تمہاری میں قدیمی رنگ ہے۔ اس کو جدید اخباری زبان میں ڈھالنا پڑے گا۔

چنانچہ میں اس اخبار میں کام کرنے لگا۔ ایک کالم روز لکھتا۔ کبھی علم استخارات پر، کبھی حاضرات کی مختلف قسموں پر، اور کبھی تقدیر و تدبیر پر۔ اس عزیز نے جس کی بدولت اس مرتبۂ عالی پر پہنچا تھا ہر طرح خاطرداری کی میری بھی اس کے ساتھ ہر دم مصاحبت تھی اور درویشی کی باتوں سے اس کے آئینۂ قلب کو چمکاتا تھا۔ کاربراری اور دلجوئی کی خاطر اس کو روحانی ٹونے ٹوٹکے اور عمل بتاتا کہ ہنوز گو عمر اس کی پینتیس سال سے اوپر ہو چلی تھی، ابھی ناکتخدا تھا۔ کبھی امیرزادوں کی طرح شادی کے جھنجھٹوں سے خائف تھا۔ تحریر میں اس کی جدید بانکپن سا تھا۔ وہ میری زبان کے قدیمی رنگ میں اپنی اصلاح سے نئی رعنائی کی آب لے آتا۔ کالم اس فقیر کا امید سے زیادہ ہر خاص و عام کو بھایا۔ تعریفوں کے ڈونگرے برسنے لگے اور اخبار کی اشاعت زینۂ ترقی پر چڑھنے لگی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا اب خدا نے وہ اوج بخشا کہ گویا اس عزیز ایڈیٹر کی ناک کا بال تھا اور باوردی اہلکار میری خدمت میں مامور تھا کہ گھنٹی بجانے پر اندر آتا تھا۔ پھر بھی دل میں کھٹک تھی۔ اپنے مربی عزیز کے تیور دیکھا کرتا۔ کالم میں اس عزیز کے مشورے پر علامہ ابن کنفی کے نام سے لکھا کرتا۔ چند دن کالم نگاری کو ہوئے کہ خط پر خط اخبار کے پڑھنے والوں کے آنے لگے۔ بیشتر ان میں سے خواتین کے ہوتے تھے۔ اس نتیجہ پر پہنچا کہ طبقۂ اناث میں روحانیت کو بڑا دخل ہے۔ بڑے بھلے اناپ شناپ ان کو مشورے دیتا۔

زمانے کا دستور ہے کہ کبھو یکلخت آنکھ بدل لیتا ہے۔ ایک دن اس عزیز مولانا کا انداز اور ہوا۔ وجہ یہ ہوئی کہ اس نے ایک کالم ایک نئی مطبوعہ نظم کی کتاب 'جگمگاڈے' پر تحریر کیا۔ مصنف اس کے سرکار شاہی میں عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے کئی امرا کی خواہش ہوتی ہے کہ صاحبان کمال میں ان کا شمار ہو اور جھوٹی علمیت کے بال و پر لگا کر فضائے سخن میں کلیلیں بھریں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ سخن کی دیوی متمول لوگوں کے آستانوں کے پاس نہیں پھٹکتی اور جنم لیتی ہے تو فلک زدوں کے گھر۔ کلام اس امیرالامرا کا جیسا تھا ظاہر ہے۔ جن کو شاعری سے تھوڑی بھی شد بد تھی تمسخر کئے نہ رہ سکے کہ کلام واقعی مبتذل اور مضحکہ خیز تھا گویا کسی بچے نے تک بندی کی ہو۔ میرے مربی اور مہربان صاحبزادے نے جو عموماً اپنے ہم عصروں کی قلم کی جھپٹ سے خاک اڑا دیتا تھا اس کتاب کی خوب جی بھر کے تعریف کی بلکہ یہاں تک کہہ ڈالا کہ ہر شعر اس کا آتش چقماق کی تاثیر اپنے میں رکھتا ہے اور بعد شبلی اور اقبال سیالکوٹی کے اگر علامہ کا خطاب کسی پر منطبق ہو سکتا ہے تو مصنف پر۔ اہل کمال کو اپنی مطلب براری اور امرا کی خوشنودی کے لئے سب ہتھکنڈے کرنے پڑتے ہیں۔ اس تنقید پر مرے اس مربی پر چہار سو سے لعن طعن ہوئی کہ تُو تو اپنے کو بڑا حق پرور اور لگی لپٹی نہ رکھنے والا کہتا تھا۔ یہاں اس امیر کے جاہ و منصب کی چکاچوند کے آگے کیسے گھٹنے ٹیک دیئے اور اس جاہل مطلق کو فخر پاکستان بنا دیا۔ میں نے بھی ایک دن اسے یہ جتایا کہ اس نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔ سب امیرزادوں کی طرح حساس اور زود رنج تھا اتنی سی بات پر بگڑ گیا۔ کہنے لگا جو کچھ میں نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے۔ ٹھیک اور سچ لکھا ہے۔ بحث بڑھی۔ مرے سر پر بھی اس دن حاضرات میں سے کوئی سوار تھا میرے منہ سے بات نکل گئی: "صاحبزادے، تم نے جو کچھ لکھا جھک ماری۔ سخنوری یوں محلوں کے آستانوں پر پانی نہیں بھرتی۔" بگڑی بڑھی۔ اس کے دل کے آئینے پر کدورت آگئی۔ اور دوسری صبح میں فقیر دفتر پہنچا تو اسی باوردی گھنٹی والے اہلکار نے میرے دفتر کے دروازے پر مجھے روکا کہ ٹھیر جاؤ، اندر

کیا کہنے جاتے ہو۔ یہ لو پروانہ۔ آج سے تمہاری ملازمت ختم۔ کوئی اور صاحبزادہ انھوں نے فقیر کی جگہ روحانیت کا کالم لکھنے کے لئے نوکر رکھ لیا۔ فقیر نے فلک ستمگر کی نیرنگیاں بہت دیکھی ہیں اور آج تک زمانے کو کسی کے ساتھ نباہ کرتے نہیں دیکھا۔ اس لئے اس انقلاب پر حیرت نہ ہوئی ہلکا سا ملال کیا سا۔ صدمۂ قلب پر پہنچا بھی تو اتنی سی بات آٹھ سو کی نوکری ہاتھ سے نکل رہی۔ زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ حسینوں کے نامے آنے لگے تھے اور ان سے روحانیت پر خط و کتابت جاری تھی۔ ایک دو ستمگروں نے اپنی عکسی تصاویر بھی بھجوائی تھیں اور میں اس رنڈاپے کی کیفیت کو تنہائی کی نقرئی سیج پر گلرنگ کرنے کے منصوبے باندھ رہا تھا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

کسی سے وہاں کچھ کہے سنے بغیر اُلٹے پاؤں پھرا۔ دوست مہربان نسیم احمد موجود تھا اور اس کے گھر کو اپنا گھر بنا رکھا تھا۔ یہ معلوم تھا کہ جاؤں گا تو دو لفظ تسلی کے کہے گا اور دل کے زخم پر پھاہے رکھے گا۔

اہل کمال کو خدا نے طبیعت میں وہ بدمزاجی اور عالی دماغی ودیعت کی ہے کہ زمانہ کی ستمگاریاں ان کے نخلِ امید کو اکھاڑ نہیں سکتیں۔ نسیم احمد کے پاس جانے سے پہلے فقیر مال روڈ پر ہائی کورٹ کے سامنے فٹ پاتھ کی پٹڑی پر بیٹھا رہا۔ چند سرکار کے اہلکار "تیسرے منصوبے کو کامیاب بناؤ" کی عبارت کے رنگین کپڑے سڑک کے آر پار کھمبوں سے ٹانگ رہے تھے۔ حیرت زدہ ہو کر دو تین صاحبزادوں سے کہ جامعہ سے آتے تھے پوچھا کہ یہ تیسرا منصوبہ کیا ہے؟

ان نوجوانوں کے چہروں سے بھانپا کہ واقفیت ان کی بھی مجھ سے زیادہ نہیں۔

(راقم خاکپائے اولیا، فقیر حقیر لالو شاہ
سجادہ نشین، درگاہ حضرت بوٹے شاہ صاحب
مغربی شاہ عالمی لاہور)

نثار عزیز بٹ

خوف

نیم شعوری احساسات، نیم شعوری خواہشات اور نیم شعوری خوف جو مدتوں کر روزا کی مختصر زندگی پر چھائے رہے تھے، روزا کی موت سے گویا ایک ہی وار میں چھٹ گئے اور اس کے بدلے شہناز نے احساس و شعور کی چندھیا دینے والی بھرپور روشنی میں اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اور چھ برس کی عمر سے ہی آگہی کی باریک تیز دھار نے اس کی ہستی کو کاٹنا شروع کر دیا اور جس طرح اس کی ماں نیم شعور کی دھند میں لپٹی لپٹی محفوظ اور قدرے ناخوش اور حیران کھڑی اپنی زندگی کا تماشا دیکھتی رہی تھی، اسی طرح اب شہناز شعور کے بند غاروں میں ابھی قدرے زخمی اور بے حد غیر محفوظ اپنی زندگی کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ خانم کا عظیم الجثہ گھر، جو شہناز کو اپنے چھوٹے وجود کے مقابلے میں حقیقت سے زیادہ عظیم الجثہ دکھائی دیتا تھا، شہناز کو ایک بڑے دیو کی طرح دکھائی دیتا تھا جس کے شکنجے میں وہ گرفتار رہیں۔ دن تو کسی نہ کسی طرح کھیل کود، سکول، نہلائی دھلائی اور خالاؤں سے چھپکے چھپکے سرگوشیوں میں گزر ہی جاتا لیکن رات کو وہ دیوہیکل مکان ہر طرف سے اپنے پنجے اس کی طرف بڑھانے شروع کرتا۔ عثمان علی کے مکان میں ابھی بجلی کا انتظام نہ ہوا تھا۔ بہتے بڑے گھر میں چھوٹی چھوٹی لالٹینیں اندھیرے کے پھیلے ہوئے ہمہ گیر وجود کے سامنے بے بسی سے ٹمٹماتی رہتیں اور سایوں اور مدھم روشنی کے کھیل سے نامعلوم چیزوں کو اور زیادہ دھندلے نئے روپوں میں اجاگر کرتی رہتیں۔ تخت پر پڑا ہوا گاؤ تکیہ دبکا ہوا آدمی نظر آنے لگتا اور ہر ہر قدم پر مرئی اور غیر مرئی خطرے تھرکتے رہتے۔ انگوروں کی بیلوں میں مستقل دیوؤں کے بچے لال لال پوٹلیوں میں بندھے پڑے رہتے۔ بڑے دالان میں پُراسرار سفید پوش عورتیں کھڑی فاتحہ پڑھتی رہتیں اور راتوں کو چھتوں اور سیڑھیوں پر اجنبی قدموں کی چاپیں سنائی دیتی رہتیں۔ ماں کی موت کے دن کی واضح یادوں کے بعد جو دوسری واضح یاد شہناز کے ذہن میں باقی تھی وہ اس دیوہیکل مکان میں ایک رات کی یاد تھی۔ روزا کو مرے ہوئے جانے ایک روز ہوا تھا یا ایک ہفتہ یا ایک مہینہ اس کا شہناز کو کچھ علم نہ تھا، جب اچانک رات کی گہری تنہائی میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اسی برآمدے میں لیٹی ہوئی تھی جس میں روزا نے جان دی تھی۔ ہر طرف چارپائیاں ہی چارپائیاں تھیں جن پر لوگ سوئے ہوئے تھے لیکن بہت دور، خاموش اور پہنچ سے باہر تھے۔ البتہ سامنے باورچی خانے کے اوپر جو چھوٹی سی چھتی تھی، وہاں بستروں کا ایک زندہ ڈھیر بے طرح کلبلا رہا تھا۔ جنوں کے بچوں کا ایک انبار تھا جو اس پر سرخ پوٹلیوں میں بندھا رکھا تھا اور ان کو دیکھ دیکھ کر شہناز کا مارے خوف کے سانس رک رہا تھا۔ جب اس کا خوف بالکل ہی برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے ہمت کی، اور جا کے اپنی خالہ نوشابہ کو جگایا۔ لیکن نوشابہ کو جگانے سے پہلے وہ کئی لمحے برآمدے کے وسط میں کھڑی چارپائیوں کے ہجوم کو دیکھ کر تذبذب میں رہی کہ کس کو جگائے، کس کو جگانا چاہیے۔ پھر جانے کس منطق کے تحت اس نے نوشابہ کو جگایا اور کہا، "خالہ خالہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

دن بھر کی تھکی نوشابہ نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں "کیا ہے شہنو؟ کیا بات ہے؟" اس نے بیدار ہوتے ہوئے پوچھا۔

"خالہ مجھے ڈر لگ رہا ہے"

"جاؤ اپنے بستر پر لیٹ کر یہ پڑھو" اللہ میرا واد ہے۔ محمد میرا شاد ہے" (اللہ میرا واحد ہے۔ محمد میرا شاہد ہے) ڈر نہیں لگے گا" اور یہ کہہ کر کروٹ بدل کر نوشابہ سو گئی۔

شہناز بہت تنہائی کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی اور بڑی حیرت سے "اللہ میرا واد ہے۔ محمد میرا شاد ہے" کا ورد کرتی رہی لیکن خوف دور کرنے کی یہ ترکیب اسے اتنی حیران کن نظر آئی کہ تھوڑی دیر کے لئے جنوں کے بچوں کی پوٹلیوں کو بھول گئی۔ اس مختصر وظیفے کا فائدہ اٹھا کر نیند واپس آ گئی۔ اس رات کے بعد راتیں اکثر و بیشتر مشکل ہو گئیں اور خوف صرف شہناز کا ہی مسئلہ نہ تھا، پورے گھر کا مسئلہ تھا۔ راتوں کو جب سب پلنگوں پر لیٹ جاتے اور خانم موڈ میں ہوتیں تو کسی ڈراؤنی رات کا قصہ دہرائیں کہ کس طرح رات کے ایک بجے چھت پر کھٹ کھٹ کی آواز آنا شروع ہوئی جیسے پچھلی دیوار سے کود کر کوئی چھت پہ اترا ہو، اور چھت پار کر رہا ہو، پھر انہی پر اسرار قدموں کی چاپ سیڑھیوں پر سنائی دی، اور کوئی اوپر سے اتر کر ان کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ پھر خانم بتاتیں کہ کس طرح اس آواز کو سنتے ہی وہ عثمان علی سے باتیں کرنے لگیں "جمال افروز کے ابا! آپ نے رات کو سوتے وقت ہربڑ کا مربہ کھا لیا تھا؟" یہ جتانے کو کہ گویا وہ دونوں جاگ رہے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں حالانکہ جمال افروز کے ابا اتنی گہری نیند میں تھے کہ انھوں نے سنا تک نہیں کہ خانم کیا کہہ رہی ہیں۔ اور یوں آوازیں سنتے ہی چور الٹے پاؤں بھاگ گیا۔ اور یہ ساری کہانیاں جب اس قسم کے حقائق سے سچ ثابت ہوتی رہتیں کہ ہمسایوں کے مکان میں چوروں نے نقب لگا کر چھوٹی سی کھڑکی بنا لی اور اندر گھس کر پورے مکان میں جھاڑو پھیر دی تو بچوں کو خانم کی باتیں بے حد حقیقی معلوم ہوتیں۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے مکان کی دیواروں میں بڑی صفائی سے نکالی ہوئی اینٹوں کے خلا دیکھے تھے جن کے گرد کئی کئی روز پولیس کا پہرہ رہتا اور کسی بچے کو قریب آنے کی اجازت نہ ہوتی۔

پھر صرف جن، چور اور فاتحہ پڑھنے والیوں کی پرچھائیاں ہی نہیں تھیں، جنھوں نے مکان کے مکینوں کے تصورات بسا رکھے تھے۔ کئی اور قسم کے دشمن بھی ہر طرف پھل پھول رہے تھے۔ موسم گرما میں ہر بڑا اور بچہ مسلسل چوکنا رہتا کہ سانپ اور بچھو کہاں براجمان ہیں۔ گھر میں سانپ کا نکلنا بڑا اہم اور سنسنی خیز واقعہ ہوتا تھا اور مہینوں سالوں زیر بحث رہتا۔ شہناز کو اس قسم کے کئی واقعات بڑی تفصیل سے یاد تھے۔ جیسے گرمیوں کی ایک دوپہر سب عثمان علی کے دالان میں چاندنی کے فرش پر پڑے سو رہے تھے۔ باہر اینٹوں کا صحن بھٹی کی طرح دہک رہا تھا لیکن اندھیرے کمرے میں کپڑے کے بڑے سے پنکھے کے باعث خنکی تھی۔ پنکھے کی ڈور دروازے سے گزر کر ساتھ والی پچھلی کوٹھری تک جاتی تھی جہاں بانو لیٹی ہوئی پاؤں کے انگوٹھے میں ڈور اٹکائے انگوٹھے کی مسلسل حرکت سے پنکھے کو حرکت میں رکھتی تھی۔ یوں تو بانو اس وقت ہوش سے غنودگی میں کھسکنے والی تھی لیکن پنکھا ہلاتے رہنے کی ضرورت کے پیش نظر زبردستی آنکھیں کھولے ہوئے تھی تب پلنگ کے نیچے اسے ایک ڈھیلا سا پڑا ہوا نظر آیا۔ خانم کے مکان میں چونکہ صفائی کی انتہا تھی اس لئے بانو کو یہ بے جگہ پڑا ہوا ڈھیلا قابل توجہ نظر آیا۔ وہ نیند کے خلاف جدوجہد کرتی ہوئی سوچتی رہی کہ شاید یہ دنداسا ہے جس سے دانت صاف کئے جاتے۔ اس فیصلے سے اس کو کچھ دلچسپی ہوئی اور اس نے سوچا کہ دنداسے کا ٹکڑا اٹھا لینا چاہیے۔ دنداسہ اخروٹ کے درخت کی چھال سے بنتا تھا اور نہ صرف دانتوں کو صاف کرتا تھا بلکہ اس سے ہونٹ بھی لال لال ہو جاتے ہیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ پنکھا ہاتھ سے پکڑ کر اور آگے بڑھ کر دنداسہ اٹھا لے کہ "دنداسے" میں حرکت ہوئی اور نہ صرف حرکت ہوئی بلکہ وہ غائب ہو گیا۔ اب چونکہ سانپ ہر ہوشمند آدمی کے ذہن کی سب سے اوپر والی تہہ پر موجود رہتا تھا اس لئے بانو کے ذہن پر بھی فوراً سانپ کا لفظ لہرایا اور باوجودیکہ وہ خانم سے بے حد ڈرتی تھی۔ اس نے ہمت کر کے نوشابہ کو جگا لیا اور اسے بات سنا کر اپنے ساتھ غائب شدہ دنداسے کی تحقیق پر مقرر کیا۔

سہ پہر میں سب جاگے تو صورت حال عام ہوگئی اور مقابلے کے نظام پر غور ہونے لگا، چونکہ سانپ کا دکھا جانا عام طور سے اہم واقعات میں سے تھا اس لئے فوراً چوکیداروں اور گھر کے نیازمندوں کے ایک گروہ کو اطلاع کی گئی۔ وہ بڑے بڑے ڈنڈے لے کر آگئے عورتیں پردے میں ہوگئیں اور سانپ کو بل سے نکالنے کی تجویزوں پر غور ہونے لگا۔ کسی کو خیال آیا کہ پانی کا لوٹا بل میں انڈیلنا چاہئے۔ اس دوران میں بیچ والے دالان میں نماز کے تخت پر کھڑے قرآن شریف کی حفاظت ڈھونڈتے ہوئے خوف و اضطراب سے پھڑکی بنے ہوئے تھے۔ گویا سانپ بل سے نکل کر پانچ ہٹے کٹے ڈنڈوں سے لیس آدمیوں کے بیچ میں سے گزر کر سیدھا تخت پر چڑھ کر ان کو ڈس لے گا۔ شہناز کو سانپ سے اتنی دہشت اور اتنی سرشاری ہوتی تھی کہ وہ مرے ہوئے سانپ کو بھی چھونے کو تیار نہ تھی لیکن ہر سپیرے کی آواز پر بے چین ہو اٹھتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح محفوظ فاصلے سے اس رینگتے ہوئے دشمنِ جاں کو دیکھ لے۔

بہرصورت پانی کا لوٹا کامیاب ہوا اور سانپ صاحب بوکھلا کر بل سے باہر آگئے جہاں پانچ ڈنڈوں سے ان کا استقبال کیا گیا اور بڑی ہی فتح و کامرانی سے ان کو لا کر صحن میں ڈالا گیا اور دیر تک سب رائے زنی کرتے رہے۔

"ڈھائی گھڑی کا سانپ ہے۔ ڈس لے اور بس ختم"

شہاب نے اسے چھونے کی کوشش کی تو سب نے "ہائیں ہائیں" کا کورس اٹھایا۔ "ارے سانپ چوبیس گھنٹے تک نہیں مرتا۔ ہاتھ مت لگانا" سانپ صاحب کا سر چپٹی ہوگیا تھا لیکن یہ صحیح ہے کہ دھوپ میں پڑا پڑا جسم کانپ جاتا تھا۔ اس دن کی سیر دن بازو تھیں۔ یہ اور اس قسم کے کئی اور واقعات بچوں کو ازبر تھے۔ پھر گرمیوں کی راتوں کو جب سب صحن میں پلنگوں پر پڑ کر لیٹ جاتے تو شاہ اور شکار کرنے نکلتیں۔ یہ شکار بے حد آسان تھا۔ لالٹین لے کر لڑکیاں سیڑھیوں میں غسل خانے میں، کوٹھریوں کے توشہ خانے میں دروازوں کے پیچھے جھانکنا شروع کرتیں۔ در بچھو گویا وہاں موجود ہوتے۔ چنانچہ چمٹے سے پکڑ کر ان کو صحن میں لا کر مار دیا جاتا اور ان کے زہریلے پن پر کافی دیر بحث ہوتی رہتی۔ پرانے مکانوں میں سانپوں بچھوؤں کی کوئی کمی نہ تھی۔ جو سردیوں بھر تو غائب رہتے لیکن گرمی کی شدت سے گھبرا کر نکل آتے اور مستقل گھر والوں سے آنکھ مچولی کھیلتے رہتے کہ کس کا وار پہلے پڑتا ہے۔ بچے مارے اضطراب کے جیلی کی طرح بستروں پر تھرکتے رہتے۔

معاملہ جنوں، چوروں، آسیبوں اور سانپ بچھوؤں تک ہی رہتا تو پھر بھی غنیمت ہوتا کہ یہ سب رات کے پاسی ہیں اور چھ سات سال کا بچہ رات کو کتنی دیر نیند کے خلاف جدوجہد کر سکتا ہے، چاہے خوف کی بنا پر ہی کیوں نہ، لیکن یہاں اس مکان میں تو گویا خوف کی مکمل بادشاہت تھی۔ گھر پر خانم کے خوف سے کانپتا رہتا کچھ معلوم نہ تھا کہ کس وقت اور کس بات پر ان کو غصہ آجائے۔ شہناز کو ڈیوڑھی میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ صحن میں خانم کی آنکھوں کے سامنے کھیلنے کا مطلب تھا صحن میں دیواروں سے لگے ہوئے بڑے بڑے تختوں پر چپکے بیٹھ کر عمر بسر کرنا۔ اب اگر کہیں زیادی بسر ہو سکتی تھی تو بچپن کو ٹھریاں اور دالان تھے لیکن وہاں یہ مسئلہ در پیش تھا کہ یا تو وہ اکیلی ہوتی اور جو اتفاقاً شہاب پرویز گھر پر ہوتے تو ہر دس منٹ کے بعد پرویز پکارتا "وہ کالا سانپ شوں شوں کرکے اندر سے نکل رہا ہے!" اب تینوں کو معلوم تھا کہ یہ گپ ہے لیکن عادتاً ہی وہ تینوں دوڑنا شروع کر دیتے اور تھوڑی دیر صحن میں آکر چپکے خانم کے دبدبے کی حفاظت میں بیٹھے رہتے۔ یہاں تک کہ اکتا کر شہاب پرویز باہر چلے جاتے، اور شہناز پھر اکیلی رہ جاتی۔

ایک آدھ مرتبہ ہی شہناز نے مکان کی قید کا بند توڑنے کی کوشش کی، اور چپکے سے گھر سے نکل کر سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ کس سے ایا پر ہوا۔ بالکل ہی بلا ارادہ اور بے ساختہ ہوا لیکن وہ باتیں کرتے سر اٹھائے چلتے گئے۔ شہناز کو ہوش اس وقت آیا جب اس نے دیکھا کہ وہ تینوں نہر کے کنارے کھڑے ہیں اور سامنے درختوں کے جھنڈ میں قبرستان ہے جہاں اس کی ماں کی قبر ہے۔ تب دفعتاً وہ تینوں دہشت زدہ

ہو گئے کیونکہ اتنا انھیں معلوم تھا کہ قبرستان گھر سے بہت دور ہے۔

خاک دھول میں لت پت وہ گھر اس طرح پہنچے کہ کاٹو تو ان کے بدن میں لہو نہیں لیکن تھوڑی دیر تک نہ خانم گرجیں اور نہ کوئی ان پر بیدپڑے بلکہ دُرشہوار نے ان کو پاس بلا کر کہا "چلو جھٹ پٹ اتار کر نہاؤ۔ کنوئیں میں تربوز ٹھنڈا ہونے ڈالا ہوا ہے۔ ابھی سب کو ملے گا۔" بچے تربوز بے حد پسند کرتے تھے خصوصاً اس اہتمام کے ساتھ کہ پہلے اسے دھو کر کنوئیں میں لٹکایا جائے اور جب وہ شام تک ٹھنڈا ہو تو پھر سرخ سرخ قاشیں بن کر سامنے آئے۔ اپنی خوش بختی پر یقین نہ کرتے ہوئے انھوں نے کپڑے اتار دیے۔ نہ صرف انھیں اتنی دور بھٹک جانے کی سزا نہ ملی تھی بلکہ تربوز بھی ملنے والا تھا۔ شہناز کا دل اس اچانک کا یا پلٹ سے قلابازیاں کھانے لگا۔ پھر خانم کی آواز آئی "باقو باہر کا دروازہ بند کر دو۔" بچوں نے اپنا باہر بھاگنے کا راستہ بند ہوتے دیکھ کر جلدی سے مڑ کر دیکھا تو خانم بید لیے کھڑی تھی اور تھوڑی دیر میں بید ان پر برس رہے تھے۔ "بولو۔ پھر کبھی اس طرح باہر جاؤ گے؟ بولو۔" اب جانے بچوں نے کیا کیا چھلانگیں لگائیں اور کتنا گڑگڑائے۔ یہ سب شہناز کو بالکل یاد نہ رہا۔ اس کے ذہن پر یہ قصہ صرف دو ساکت تابلوز کی صورت میں نقش تھا۔ بغیر ربط و تسلسل کے۔

پہلا سین، ندی کا کنارہ ۔ دھول ۔ درخت ۔ سکون اور ان کا حیرتناک انکشاف کہ وہ قبرستان کے سامنے کھڑے ہیں۔

دوسرا سین، گھر کا صحن ۔ تین چھوٹے چھوٹے ننگے جسم اور بند دروازہ۔

اس سارے عہد سے شہناز کی جو اکا دکا خوشگوار یادیں وابستہ تھیں وہ کھانے پینے سے تعلق رکھتی تھیں۔ خانم خود پکاتی تھیں اور شاید اچھا پکاتی تھیں۔ کیونکہ اکثر جب عثمان علی کھانا کھا رہے ہوتے تو وہ باتیں سناتے جاتے بیچ میں اچانک بول اٹھتیں "جمال افروز کے ابا۔ کھانا پھر آپ کو مزے کا نہیں لگا؟"

عثمان علی فوراً کھانے کی تعریف کر دیتے۔ لیکن خانم تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس موضوع کی طرف لوٹ آتیں "تو جمال افروز کے ابا ۔ بالکل مزا نہیں آیا آپ کو؟" بچوں کو خانم کی اس کمزوری کا پتہ چل گیا تھا۔ چنانچہ جب چولہے کے قریب صاف شفاف اینٹوں کے فرش پر دری بچھا کر خانم بچوں کے لیے دسترخوان لگواتیں اور انھیں اپنے سامنے کھانا کھلاتیں تو بچے خوب تعریف کرتے اور خانم خوب خوش ہو ہو کر کھلاتیں ۔ اور یوں سب طرف امن و آشتی کی فضا رہتی۔

(زیر تصنیف ناول "نے چراغ نے گلے" کا ایک باب)

الطاف فاطمہ

اصحابِ تحیّر

"بلو چھا بیگم ... میں یہاں ہوں اور یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ خیر جو کچھ ہو رہا ہے، اچھا ہو رہے گا۔ اب کہنے کی بات یہی ہے کہ ہم لوگوں کو جو اس وقت اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں بجز اچھے اور دل بڑھانے والے خطوں کے۔ اور کیا تمہارے خیال میں یہ ایک معقول ضرورت نہیں ہوگی؟ مجھے باقاعدگی سے خط لکھتی رہو۔ یہ کچھ اسی قسم کا مضمون تھا اس خط کا۔ ارے ہاں اب خط تو میرے پاس محفوظ نہیں جو حرف بحرف نقل اتار کر رکھ دوں۔ وہ تو کب کا جل جلا گیا ہوگا یوں کہ زندگی اور اس سے متعلق ہر شے میری نظر میں اتنی حقیر اور اتنی ہیچ ہو چکی تھی۔ چیز کا بچا کھچا کر رکھنا بڑا ہی مضحکہ خیز لگنے لگا تھا ـــــ تو ہاں میں نے وہ خط یوں ہی ڈال دیا تھا اور پھر حیرت کرنے لگی تھی کہ یا الٰہی یہ بھی کوئی ماجرا ہوا "میں یہاں ہوں ... اور یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

بھئی اب کون جانے کہ "میں یہاں" سے کون سا علاقہ اور کون سا محاذ مراد ہے۔ مجھے تو اخبار دیکھنے کے خیال ہی سے وحشت ہونے لگی ہے۔ اخبار کی جلی حروف میں لکھی سرخیوں کی طرف نظر کرنے کی تو میرے اندر ہمت ہی نہیں۔ میں تو اخبار دیکھتے ہی فوراً باورچی خانے میں سرک آتی ہوں اور پتھر کی میز پر رکھے تیل کے چولہے کو جلا کر چائے کا پانی پکانے لگتی ہوں پھر بھی دل دھڑ دھڑ کرتا رہتا ہے۔ "اور جو کبھی کسی نے اونچی آواز سے یہ خبر پڑھ دی کہ فلاں جگہ پر ہمارا مورچہ کمزور پڑ رہا ہے یا دشمن اتنے میل اندر آگیا تو میں کیا کروں گی!"

مگر ہوتا یہ ہے کہ فضول ہی چائے کی پتی، سارا دودھ اور شکر ضائع ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان دنوں اخبار دیر سے آتے اور لوگوں کو ناشتہ کئے دیر ہو چکی ہوتی ہے اور اب وہ خبروں پر خیال آرائی کرتے وقت بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں چائے کی پیالی بھی ہو اور اخبار میں ایسی کوئی خبر نہیں ہوتی کہ جس سے فوراً حاصل کرنے کے لئے انسان باورچی خانے میں سرک آئے اور مٹی کے تیل کا چولہا جلا کر چائے کا پانی گرم کرنا شروع کر دے۔

اور اب مجھے اس بات پر بھی حیرت ہو رہی ہے کہ ایسی تمام خبروں کا مداوا مٹی کے تیل کا چولہا اور کیتلی میں ابلتا ہوا پانی کیونکر ہو سکتا ہے۔

مگر سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بوڑھے جنرل! تم نے مجھے یاد کیا اور کام کی چیز سمجھا۔ اس لئے کہ ہم اور تم کبھی اتنے اچھے ٹرمس میں رہے ہی نہیں کہ ایک دوسرے کو اچھے اچھے خط لکھیں۔ اب یہی وجہ تو کہ ہم نے تم کو تمہاری لفٹیننٹی کے زمانے سے بوڑھے جنرل کے لقب سے نوازا اور اس کے سوا تمہیں کسی دوسرے نام سے پکارا ہی نہیں ورنہ یہ بھی تو ممکن نہ تھا کہ جب بھی تمہارا کوئی رینک بڑھتا ہم تم کو اسی نام سے پکارنے لگتے۔ اب موجودہ مجبوری کی صورت میں تم کو کس کے نام سے مخاطب کرتے۔ ہمارا تو یہ ہے کہ پوری وضعداری سے بس ایک ہی نام سے پکارتے چلے گئے اور اب حرمت سے تو تم نے بھی اعتراف کر لیا ہے کہ ہاں تم بوڑھے جنرل ہو۔

اور حیرت کی بات تو یہ بھی ہے کہ تم نے معقولیت کا ناطہ میری ذات سے کیونکر استوار کر لیا حالانکہ مجھے یقین ہے کہ ان دونوں کو تم نے کبھی یکجا نہ پایا ہوگا۔

قصہ یہ ہے کہ اب میں مزید حیرت زدہ ہونے کی تاب اپنے اندر نہیں پا رہی ہوں۔ اس لئے اب میں نے کتاب اٹھا لی ہے۔

"حضور نے زبان مبارک سے فرمایا کہ عارف طریقت وہ شخص ہے کہ وہ ہر لحظہ اور ہر لمحہ تحیر و تفکر میں رہے اور کسی چیز اور خلقت کی آمد و رفت وغیرہ کی خبر نہ رہے اور عالم غیب میں اس پر ہر وقت اور دم بدم ایک خاص حالت پیدا ہو۔

اس کے بعد ایک عزیز نے کہ خدمت میں حاضر تھا آداب بجا لا کر عرض کیا کہ میرے ایک یار نے کہ واصل حق تھا یہ حکایت کی کہ ایک دفعہ میں ملک بدخشاں میں تھا۔ اس ملک میں چند نفر سیاح تھے جو صاحب نعمت درویش تھے ایک ماہ تک وہ عالم تحیر میں رہے دونوں آنکھیں آسمان کی طرف جمائے تھے اور خلقت کی آمد و رفت سے بالکل بے خبر۔ مگر جب نماز کا وقت آتا تھا نماز ادا کرتے تھے"

اور تم نے چونڈہ کا معرکہ نہیں دیکھا وہ سب کے سب عالم تحیر میں تھے۔ دشمن کی کثرت اور آمد و رفت سے بے خبر مگر جب حملے کا وقت آتا تھا تو وہ حملہ کرتے تھے۔

اچھا تو پھر کیا مطلب ہے؛...... کیا وہ سب کے سب اصحاب تحیر میں سے تھے ٹھیک ہے ہو سکتا ہے۔ اہرابات درست ہو گئیں کیا کر سکتی ہوں کرفیو کا وقت ہو چکا ہے اور بلیک آؤٹ ہو گیا ہے اور اب شاید سائرن بھی ہونے والا ہے۔

اندھیرے میں میرا دل بے طرح چاہ رہا ہے کہ کوئی مجھے مونگ پھلیاں لا دے، یا نہیں تو پھر مولا بخش کی دوکان سے خوشبو والا ایک پان ہی لا دے۔ پتہ نہیں کیوں کرفیو اور بلیک آؤٹ کے اندھیرے میں بھی یہ یقین رہتا ہے کہ مولا بخش کی دوکان بدستور کھلی ہوئی ہے، ریڈیو بج رہا ہے اور پان بنائے جا رہے ہیں مجھے معلوم ہے مجھے نہ کوئی مونگ پھلیاں لا کر دے گا اور نہ ہی ہمارے اس شہر میں پان دستیاب ہیں اور یہ کہ اب اس وقت توپوں کی دھمک کی آوازوں کے علاوہ، برآمدے کے مشرقی در کی طرف سے بجلی کے سے کوندے بھی چلے آ رہے ہیں۔ اس لئے میں نے چپ چاپ آخری در میں چٹائی ڈال کر اس پر اپنی تو شک پھیلا لی ہے۔ میں نے اپنی چادر تہہ کر کے سامنے رکھ چھوڑی ہے سب کہتے ہیں کہ سفید چادر نہ بچھاؤ اندھیرے میں اوپر سے سفید چیز صاف نظر آئے گی۔ ایسی کوئی حرکت نہ کرو جس سے ان کو مدد ملنے کا ذرا بھی اندیشہ ہو ورنہ تمہارا شمار غداروں میں ہوگا۔ وہیں ہر روز اجلی چادر کو سامنے رکھ کر سوچتی ہوں۔ اللہ میرے، میں تو کبھی چادر بنا سوئی ہی نہ تھی۔ اجلی اجلی چادر کی سوندھی سوندھی خوشبو، یہی تو میری سب سے بڑی عیاشی ہے تو خیر آج بھی میں نے ہر روز کی طرح چادر کو تکیے تلے رکھ لیا ہے۔ نرم زمین پر چھوٹے چھوٹے کانٹے کا سے پھولوں والی تو شک تلے چٹائی چر چر بول رہی ہے۔ اس کے نیچے زمین ہے اور یوں میں زمین سے متصل ہوں۔ اس لڑائی نے میری چادر اور پلنگ دونوں ہی مجھ سے چھین لئے۔ چھ ستمبر کی رات سے اب تک میں پلنگ پر نہیں سوئی۔ اس لئے کہ پلنگ کی صورت دیکھ کر مجھے خفقان ہوتا ہے اور پتہ نہیں یہ وہم کیوں ہو گیا ہے کہ اگر میں زمین سے اٹھ کر پلنگ پر لیٹ گئی تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔

آدمی کے پاس مونگ پھلیاں نہ ہوں، پان نہ ہو اور پھر آدمی پڑھ بھی نہ سکے تو رات کتنی رائگاں اور زندگی کتنی ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ اس مرتبہ تو ہم نے خربوزے کے بیج بھی دھو کر نہ سکھائے۔ دو مہینے سے تو دل پر ایسی وحشت تھی کہ کسی کام پر دل ہی نہ جمتا تھا۔ خربوزے کے بیج کھٹکنے کو نہ ہوں تو پھر خط لکھنے کو جی چاہتا ہے

کتاب کے صفحوں کے بیچ میں تمہارا خط رکھا ہے۔ اب میں اس کو پڑھ بھی نہیں سکتی ہوں لیکن اس کا مضمون میرے ذہن میں یوں گھوم

...ہا ہے جیسے میں ابھی اُسے پڑھ رہی ہوں۔ خط کے آخر میں بھین نے لکھا ہے:

"بھیا نے چند رسالے بھجوا دیئے تھے لیکن فی الحال ان کو پڑھنا ممکن نہیں۔"

تو اب اس کا مطلب یہی ہے کہ تم کو اچھے اچھے خط لکھے جائیں، اور ان اچھے اچھے خطوں کا مضمون کیا ہو۔ یہی تو مجھ کو حیرت ہے کہ تم کو لکھا جائے تو کیا لکھا جائے، بات یہ ہے بڑے جنرل، کہ خط کے مضمون تو سو طرح کے ہو سکتے ہیں۔

ایک تو یہی کہ ہاں بھئی بگ اپ! خوب ڈٹ کر لڑتے رہو اور دل چاہے تو شہید بھی ہو جاؤ پھر ہم فخر سے آنسو بھری آنکھیں چمکا کر پبلک میں تمہارا ذکر کریں گے اور اگر زخم کھانے کا خیال ہے تو بے شک کھا لو۔ فکر نہ کرنا میرے خون کا گروپ او O ہے اور یہ کہ اچھا خدا حافظ! کہ اب سائرن ہو رہا ہے اور ہم باہر مورچے میں چھپنے جا رہے ہیں۔

اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنی دھن میں لکھ جاؤں کہ:

"بھین، ذرا اپنا ٹینک بچا کر چلا کرو اور دیکھو، سنو۔ دشمن کا جہاز اوپر اڑا کرے تو "الم ترکیف" پڑھ کر اپنے آپ پر دم کر لیا کرو۔ دیکھو بھئی بڑے جنرل، اپنے آپ کو بچا کر رکھنا اور یہ کہ یہ تاکید ہے۔ اس لئے کہ پھر ہم بڈھا جنرل کسے کہا کریں گے۔ اور یہ کہ ایک تم ہی تو ہو جو ہیں اب تک چھما چھم کئے ہو۔ اور یہ کہ تمہاری صورت دیکھتے ہی ہمیں یاد آ جاتا ہے کہ تمہارے کان میں سونے کا دُر پڑا رہتا تھا جس کی بنا پر لوگ باگ تم کو بندو پوما کہا کرتے اور ہم سب تم کو چڑایا کرتے تھے۔

بندو پوما نام کا بھی اور ذات کا بھی پوما۔ اور پھر یہ کہ جب تم کہیں چھوٹے موٹے سفر پر جایا کرتے تھے تو خالہ بیگم کھڑ دونا مانتیں۔ اور تمہاری واپسی پر دیا کرتی تھیں اور یوں ہم نے تمہارے کو دونوں کی بہت مٹھائیاں کھائی ہیں۔۔

اور اب تو وہ بہت ٹھیٹ قسم کی ماں بن گئی ہیں یعنی جب تم کو پیغام بھیجتی ہیں تو کہلواتی ہیں کہ بھیا سے کہہ دینا۔ تم فکر نہ کرو کسی بات کی ہم بالکل پریشان نہیں۔ بس بھیا اس زمین پر غیر کے قدم نہ جمنے دینا۔

اور پھر یہ بالکل الگ بات ہے کہ اب معاہدہ تاشقند ہونے کے بعد بھی وہ ہر جمعرات کو روکھی روٹی پانی کے ساتھ کھاتی ہیں، اور کہتی ہیں کہ کسی بات کی کچھ خبر نہیں جس دن بھیا خیر خیریت سے بالکل آ جائے گا تو جمعرات کو مستحق کھلاؤں گی اور پھر ان کے دسترخوان کا بچا کھچا سمیٹ کر خود بھی کھاؤں گی اور بھیا کو بھی کھلاؤں گی۔ ان کے کیسے کے اندر کاغذ میں لپٹی روٹی دیکھ کر، ان کی منت کی تفصیل سُن کر سوئم کی اُداس محفل میں بیٹھ کر چنے پڑھتے ہوئے لوگ بھی کھل کھل ہنسنے لگے تھے۔

مگر خیر یہ اب کی بات ہے اور جب کی بات اور تھی جب ہم نے تمہاری فرمائش کے مطابق ایک عدد خط تم کو لکھ دیا تھا اور یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا مضمون کیا تھا۔

اور اس کے جواب کی کسے توقع تھی۔ اس لئے کہ خط روانہ کرنے کے دوسرے ہی دن سیالکوٹ سے پھر خون کی بڑی مانگ آئی تھی۔ اور ہم لوگ بیٹھے کھڑے محض خون کی مانگ سے اندازہ لگایا کرتے کہ اب کس طرف گھمسان کا رن پڑ رہا ہے۔

خیر اس کے علاوہ ایک یہ بھی تو بات ہے کہ تمہارے جواب کے انتظار کا ارادہ بھی کس نے کیا تھا۔ عام حالات میں تمہاری اور ہماری کچھ اچھی تو نہیں نبھتی نہ رہا یہ ہے کہ جب تم اداس ہوتے ہو تو لگنے کا موڈ ہوتا ہو، خوب بڑھیا بڑھیا شعر سناتے ہو اور اس کو بھی ساتھ لگے اداس کر دیتے ہو۔ اور جب دوسرا کوئی کتنی ہی اچھی بات کرے، تم فوراً اپنے کان بجنے اور اس کی بنا پر اونچا سننے کا دکھڑا شروع کر دو گے اور پھر یہ کہ وہ وہ بور کتابیں چھانٹ

دے کر پڑھوانے کی کوشش کروگے کہ کیا کہئے۔ تم نے ہم کو . . . . (ڈینیز روبنز) تک پڑھوا دی ہے۔ اور پھر جو کتاب ہم پڑھیں گے تم اس میں کیڑے ڈالوگے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے پڑھنے پر فضیحتے بکھیروگے۔ تو خیر بہت دن گذرے اب نہ معلوم گنتی میں ملا کر وہ سب کتنے دن بنتے ہیں اس لئے کہ ان دنوں ایک ایک دن کئی کئی روز کا معلوم ہوتا تھا اور پھر ان دنوں خط کے جوابوں کی طمع بھی کس کو رہ گئی تھی۔

"ایک روز شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز بیٹھے تھے اور درویش ان کے گرد بیٹھے تھے۔ سلوک کی گفتگو ہو رہی تھی۔ حضرت شیخ کو حالت پیدا ہوئی۔ عالم تحیر میں پڑ گئے۔ سات دن رات تک عالم تحیر میں رہے کہ اپنے سے کچھ خبر نہ تھی اور جب نماز کا وقت آتا تھا نماز ادا کرتے تھے پھر اپنے عالم میں مشغول ہو جاتے تھے۔"

اور لوگ عالم تحیر میں خوب پڑ جاتے ہیں۔ اب یہی کہ بڈھے جنرل نے لکھا ہے:

"بس میں کیا کہوں مجھے خود حیرت ہے کہ ہماری کہی باتوں پر یقین کون کرے گا۔ جیجا جم اگر میں یہ کہوں کہ یہاں دن رات معجزے ہو رہے ہیں تو کیا تم یقین کروگی؟"

اور اب میں حیرت کے عالم میں ہوں۔ بھیتن تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن کو لوگ بداعتقاد کہتے ہیں۔ تمہارے عقیدے ٹھیک ہو گئے یا پھر تم اوہام پرست ہو گئے ہو، بہرحال اس جنگ نے یہ خوب کیا کہ تمہارا اتنے سال تک لندن جاکر رہنا رائگاں ہی گیا۔ اس لئے کہ اب تم اتنی عجیب و غریب باتیں لکھ رہے ہو۔

"میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے ہر بار اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھا مگر مجھے وہی نظر آیا جو میں دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے اپنے جوانوں کو اوندھے لیٹ کر پوزیشن لیتے اور پھر اٹھتے دیکھا اور میں کیا بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا، پوزیشن لیتے اور اس پر سے اٹھتے وقت ان کی ایڑی سے زمین پر جو گڑھا بنتا ہے میں نے ان گڑھوں میں سے ہر بار بے شمار چاند طلوع ہوتے دیکھے ہیں۔"

تم بھی حیران ہو اور مجھے بھی حیرانی ہے! کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم سب اصحاب تحیر ہوں اور عالم تحیر میں پڑ گئے ہوں۔ مگر تم نے جوانوں کی ایڑی کے ساتھ والے گڑھوں میں چاند طلوع ہوتے دیکھے ہیں اور میں خلقت کی آمد و رفت سے باخبر ہوں۔ اور میں نے ابھی ابھی دھماکے پھر سنے ہیں۔
یہ کتاب چھوٹی اور موٹی ہے اور اس کے کونے پر چکنائی کا ایک بڑا سا داغ پڑا ہوا ہے۔ کیا پتہ وہ شخص جس کی ملکیت یہ کتاب رہی ہوگی اسی ہاتھ سے پوریاں بھی کھاتا جا رہا ہو۔ مگر یہاں اس پرائی زمین پر یعنی میرے اور تمہارے میدانوں میں اس کو پوریاں تل کر کون دے دیتا۔ ممکن ہے بے خیالی میں مکھن کی ٹکیہ اس پر رکھ دی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بھوکا ہی اس پر سر رکھ کر سو گیا ہو۔ اور یہ اس کے بالوں کی چکنائی کا داغ ہو اور اب میرا دل اس لئے کڑھ رہا ہے۔ ہائے نگوڑا جانے بھوکا ہی اٹھ کر بھاگ لیا ہو۔

خیر مجھے خوشی ہے اس کتاب پر خون کا خفیف سا دھبہ تو ایک طرف، ایک چھینٹ تک نہیں ہے کہتے ہیں جس چیز پر خون لگ جائے وہ نجس ہو جاتی ہے۔

تم نے اچھا ہی کیا بھیتن جو یہ اٹھا لی اور یہاں بھیج دی ورنہ اتنی ننھی سی بے حقیقت سی کتاب تو بھاری بھاری بوٹوں تلے ہی روندی جاتی۔
"سری بھگوان نے کہا وہ جو اپنا فرض کسی صلے کی تمنا کے بغیر ادا کرتا ہے وہ سنیاسی ہے، سانکھیا یوگی بھی اور کرما یوگی بھی۔ اور خالی عملی تیاگ کرنے سے انسان یوگی نہیں بن سکتا۔"
"ارجن نے کہا سنیاسی کی تعریف کیا ہے جس طرح کوئی یوگی اس وقت تک یوگ نہیں پاتا جب تک وہ ترک اور تیاگ نہ کرے وہ گیانی

آتما جو کرم یوگ کی انتہا تک پہنچنے کا خواہشمند ہے۔ اس کو شکتی کی ضرورت ہے۔ ایسے گیان اور ایسی سوچ کی جو اس کو علائق دنیوی سے آزاد کرے اور ہر خیال کو اس کے دھیان سے نکال دے۔"

"یہ وہ کتاب تو نہیں ہے جس کو میں چھ ستمبر سے برابر پڑھ رہی تھی اور اس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ___ کہ عارف طریقت کون ہے اور وہ کون ہے جو ہر لحظہ اور ہر لمحہ عالم تحیر و تفکر میں رہتا ہے۔ یہ تو بھگوت گیتا کا وہ نسخہ ہے جو بوڑھے جنرل نے کسی محاذ پر سے بھاگے ہوؤں کے بکھرے ہوئے سامان میں سے اُٹھایا اور یہاں بھیج دیا۔ اس کے ہندی شلوکوں کے نیچے انگریزی ترجمہ ہے نہیں معلوم جس کی یہ کتاب تھی وہ اس کے ہندی شلوک پڑھتا تھا یا میری طرح محض ترجمے پر گذارا کرتا تھا۔ پتہ نہیں اس نے سے کیا مطلب لیا تھا اور یہ کہاں کہاں اور کب کب ہوا کرتی ہے۔ ٹھیرو اب ذرا مجھے اپنی وہ کتاب تو تلاش کر لینے دو۔ اونہہ! نہ معلوم کدھر گئی۔ نہیں معلوم اس میں واقعی یہ لکھا تھا یا پھر یوں ہی مجھے خیال ہے کہ میں نے اس میں دیکھا تھا۔

"فرمایا کہ خواجہ جنید بغدادی قدس سرہ العزیز نے بیس سال تک کسی سے بات نہ کی اور نہ جانا کہ آج کون سا دن ہے یا کون سا مہینہ یا کونسا سال ہے اور جب عالم تحیر میں ہوتے تو دس دن رات تک اور عالم میں جاتے۔ اور زیادہ کھڑے ہونے کے باعث پائے مبارک پھٹ جاتے اور خون رواں ہو جاتا۔"

خیر وہ کتاب تو میں ان دنوں پڑھ ہی رہی تھی اور اب ان دنوں کو گذرے بھی بہت دن ہو چکے ہیں پہلے فائر بندی ہوئی پھر اعلان تاشقند ہوا۔ اب فوجیں واپس آئیں اور اب واقعات کتنی جلدی جلدی طے ہونے لگے ہیں۔ رات کو ہم اچھے بھلے سوتے ہیں صبح اُٹھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نکرومہ کا تختہ اُلٹ گیا۔ ابھی بات پوری نہیں کر پاتے کہ معلوم ہوتا ہے ....

یہ ممکن ہے کہ بات یوں نہ ہو بلکہ یوں ہو کہ ہمیں پتہ ہی نہ چلتا کہ آج کون سا دن، کون سا مہینہ یا کون سا سال ہے۔ اور اس سال میں کیلنڈر کی تاریخیں بدلنا بھول بھول جاتی ہوں، وقت جلد جلد بدل رہا ہو یا نہ بدل رہا ہو، حالات جلد جلد بدل رہے ہیں۔ اب ہم نے جنگ کی باتیں کرنا چھوڑ دی ہیں۔ ان لوگوں نے بھی جو لڑائی سے یوں راضی تھے کہ اس طرح ان کو بہت سی ان باتوں کے متعلق سوچنا نہیں پڑتا تھا، جن کے متعلق وہ سوچنا نہیں چاہتے تھے۔

اب بھتیجی مجھ کو خط نہیں لکھتا اور میں بھتیجی کو خط نہیں لکھتی اچھا بوڑھے جنرل، اب کبھی ہماری تمہاری زندگی میں پھر کوئی لڑائی آئی تو ہم ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔ اور جب ہم آپس میں ملیں گے تو تم مجھے نند کی، بیوی کی اور چھوٹی بٹیا کی خیریت بتانا اور پھر ہم تم سے پوچھیں گے "بھیا چائے بناؤں، پیو گے؟"

اور پھر جب تم چائے پی چکنا تو ٹھنڈی سانس لے کر پوچھا کرنا: "اور سناؤ بھیا جیم؟" اور اپنا سگریٹ نکال کر خود ہی پینے لگنا۔ کیا سنائیں یار۔ اور پھر کچھ دیر بعد میں کہوں گی: اچھا تو اور سناؤ بوڑھے جنرل" اور تم اچانک کھڑے ہو جایا کرنا۔

"اچھا پھر چلتے، خدا حافظ"

"خدا حافظ"۔ اور پھر میں کتاب کھول کر دیکھنے لگوں گی مگر یہ بھگوت گیتا کس قسم کی کتاب ہے۔ اس میں ارجن مغفید اور پریشان ہے وہ گھڑی گھڑی سری بھگوان سے سوال پوچھتا ہے ___

وہ حیران رہتا ہے کہ آخر دھرت راشٹر کے بیٹوں کا خون بہانے کے بعد ہم خوش کس طرح رہ سکیں گے۔ اور جو اس خوں ریزی

کے بعد گناہ ہم پر مسلط ہو گیا تو؟"

اور سری بھگوان اس کو سمجھا سمجھا کر تھکے جاتے ہیں۔

نہیں معلوم ارجن کی اس تمام سوچ اور حیرانی کا بنے گا کیا؟ یہ بھی آخر دیکھنے اور جاننے کی بات ہے۔

مگر میں ان دنوں بہت ڈبڈبیاں بھگتا رہی ہوں۔ مثلاً یہی کہ تیزی سے یکے بعد دیگرے ہونے والے فنکشنوں کو جبریہ مستعدی سے اٹینڈ کرتے کرتے مستقل سوچ رہی ہوں کہ آخر ہم سال بہ سال اسی طرح کتنے فنکشن اسی پابندی سے اٹینڈ کرتے رہیں گے۔ اور کبھی کبھی یہ بھی گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ تو فقط وہی ایک اور پہلا فنکشن ہے جو میں نے اٹینڈ کیا، اور شاید اسی کو دیکھتی رہ گئی ہوں اور مجھے اب تک پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کون سا سال کون سا دن یا کون سا مہینہ ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہوں اور مجھے وقت کی آمد و رفت کا پتہ نہ لگ پا رہا ہو!

غنیمت ہے کہ ارجن کے زمانے میں فنکشن نہیں ہوتے تھے! اور نہ ہی ان میں پابندی سے شرکت لازمی تھی ورنہ سری بھگوان کو اس سلسلے میں بھی جواب دہ ہونا پڑتا۔

تو خیر ایک دن فرصت سے یہ بھی معلوم کرنا پڑے گا کہ ارجن کی حیرانی اور پریشانی کا کیا بنا۔ لیکن اس وقت کچھ نہیں معلوم کر سکتی ہوں اس لئے کہ میں بہت تھکی ہوئی ہوں اور اس لمحے مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ میرا انگ انگ مجھ سے جدا ہو چکا ہے۔

اور اب کئی دن سے میرے اندر بے وجہ پریشانی سی اٹھ رہی ہے اور میرا دل کھڑے کھڑے پھرنے کو چاہ رہا ہے۔ میں اداس ہوتا جا رہی ہوں۔

ڈاک آنے کا ایک نقصان یہ بھی تو ہے کہ پھر آپ کو خط کھولنا اور پڑھنا بھی پڑتے ہیں۔ اس خط کو کھول کر حیرت سے میری چیخ نکل گئی تھی۔

بوڑھا جنرل!

بوڑھے جنرل نے خط کے بیچ میں ایک تصویر رکھی تھی اور عجیب عجیب باتیں لکھی تھیں "ہم نے یہاں آ کر سب سے پہلے تو مساجد کو صاف کیا اور ان میں نماز پڑھی اور پھر تمام گاؤں سے قرآن کریم کے جلے اور پھٹے ہوئے اوراق جمع کئے اور ان کو دفن کیا اور پھر بارود کی سرنگوں کی تلاش شروع کر دی"

اچھا بھئی تو تم نے نماز پڑھی تھی، مجھے رونا بھی نہیں آ رہا ہے اور ہنسی بھی نہیں آ رہی ہے۔

آگے چل کر اس نے لکھا ہے "انسانیت کا ایسا مذاق اڑایا ہے کہ شرم سے ہر جاندار اس علاقے سے فرار ہو گیا —— کتے، چڑیاں، کوے چیلیں۔ بس ایک مکمل سکوت اور ویرانی .... رات کے سناٹے میں بھٹکی ہوئی روحیں ماتم کرتی ہیں۔

یہاں تک لکھنے کے بعد بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اور نہ لکھوں تاکہ جو دماغی حالت میری ہے تم اس سے محفوظ رہو۔ مگر پھر سوچا کہ کسی سے تو کہوں۔

اور اب ذرا اس ویرانے کی سیر ہو جائے جو وقت نے نہیں انسانوں نے ویرانے بنائے ہیں۔

یہ چھوٹا گھروندا کس کا تھا؟ دیواریں ٹوٹ گئیں اور چھت آگ کی نذر ہو گئی۔ طاق میں رکھا ہوا دیا موجود ہے۔ ملبے میں کپڑے کی ایک گڑیا دبی ہوئی ہے اور اس کا ایک ہاتھ اٹھا ہوا ہے۔ نجانے اس گڑیا کو اب کون سی بچی اٹھائے گی۔ دروازے کے قریب ایک

چھوٹی سی چپل پڑی ہے۔ نہ جانے چپل والی خیریت سے چلی بھی گئی کہ نہیں۔

اب لوگ اپنے گھروں کو واپس آنے لگے ہیں مگر میں کس طرح ان لوگوں کے سامنے وہ گنے کے کھیت کا راز کہہ سکتا ہوں۔ میں خط اونچی آواز سے پڑھ رہی ہوں اور میرے ارد گرد سب بیٹھے سن رہے ہیں۔ اُترے ہوئے چہروں اور بھیگی آنکھوں سے۔ میرا دل چاہ رہا ہے بھیّن کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں۔ مت کہو بھیّا۔ رازوں کو فاش نہیں کیا کرتے۔ تم نے وہ دیکھا جو تم نے دیکھنا نہ چاہا اور اب تم کو لازم ہے کہ آنکھ کا عذاب آنکھ ہی سے جاہو۔

اور تم کو چاہیئے کہ جرجیس کا قصہ پڑھو جس کو ایک بار پھر عالم وجود میں پاکر بادشاہ نے کہا۔

"کہ تو تو مر گیا تھا اور خاکستر ہو گیا تھا پھر کیونکر زندہ ہو گیا؟ اے جرجیس معلوم ہو گیا کہ تو سچ کہتا ہے۔ اور تیرا خدا قادر ہے"

بھیّن تم حیران و پریشان ہو۔ میں بھی حیران ہوں اور ارجن بھی حیران و پریشان تھا۔

تو اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم میں سے اصحاب تحیر میں کون شامل ہوا اور پھر مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ ارجن کی پریشانی کا کیا بنا۔ سنو، ارجن نے کہا تھا "پھر میرے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ دھرت راشٹر کے مسلح سپوت مجھ نہتے کو رن میں ہلاک کر دیں اور یوں ملول اور شکستہ خاطر ارجن نے اپنی تیر کمان رکھ دی اور اپنی رتھ کے پچھلے حصے میں دھنس گیا"

تو ارجن کا یہ انجام ہوا۔ اب رہ گئے ہم تم کہ خلقت کی آمد و رفت سے باخبر ہیں اور بیس سال تو درکنار ایک پل کو اپنی زبان بند نہیں رکھتے۔

تو پھر اصحاب تحیر کون ہوئے...... اور وہ گنے والے کھیت کا راز کیا تھا؟

وہ جس کو تم نے دیکھنا نہ چاہا، اور پھر بھی دیکھا اور تم پر لازم ہوا کہ آنکھ کا عذاب آنکھ ہی سے جاہو اور اپنی زبان بند رکھو۔ گنے کے کھیت کا راز یہ تصویر خود بیان کرے گی۔

ہاں بھیّن یہ بیسویں صدی ہے اس میں تصویر منہ سے بولے گی اور اپنے راز آپ فاش کرے گی۔

گنے کے اس کھیت کے پچھواڑے سات عورتوں کی کھوپڑیاں ہیں، پھٹے کپڑے، شراب کی بوتلیں اور چوڑیوں کے ٹکڑے ہیں۔

اور تم نے لکھا ہے "یہ وہ کہانی ہے جسے سن کر خون کھول جائے اور آنسو رک جائیں۔ تم مجھے معاف کر دینا کہ میں یہ تصویر بھیج رہا ہوں۔"

بندے جنرل، معافی تو درکنار تم نے خوب کیا جو یہ تصویر بھیجی۔ اب ذہن میں پڑی وہ اتنے عرصے کی گتھی خود بخود کھل رہی ہے اور گتھیاں بھی بہت قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو ارجن کے ذہن میں پڑی اور اس نے بالآخر اسے خود ہی کھولا۔ ایک گرہ وہ جو میں نے اپنے آپ میں محسوس کی۔

اور پھر ایک قطار سے چنی ہوئی ان سات کھوپڑیوں کو دیکھا۔ یہ ساکت و صامت ہیں اور خلقت کی آمد و رفت سے بے خبر۔ ان کی آنکھوں کے خالی حلقے ایک حیرت کے عالم میں آسمان کی سمت تک رہے ہیں۔ یہ کسی سے ہمکلام نہیں اور انھوں نے نہ جانا کہ آج کون سا دن ہے یا کونسا مہینہ یا کون سا سال ہے۔

اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اب یہ عالم سکر میں پکار اٹھیں گی۔

تمّت تمّت

انور خواجہ

غُبار، غُبارے

چھٹتی ہوئی دھند میں پہلی چیز جو نظر آئی وہ چار شاداب نسوانی چہرے تھے جن کے سروں پر لپٹے ہوئے رنگین آنچلوں کے اطراف کالے بالوں کے چھلّے نکلے ہوئے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔

پھر اُس نے آنکھیں مل کر پھر غور سے دیکھا۔ وہ چہرے کھڑکی سے اندر کمرے میں جھانک رہے تھے۔ اُن کی مست مست آنکھوں میں شرارت اور شوخی ناچ رہی تھی، وہ سوچ میں پڑ گیا کہ یہ چہرے حقیقی ہیں یا اس کے خیالات کے ہیولے ہیں۔

چند لمحے قبل جب اُس کی آنکھ کھلی تھی تو اُس نے فوراً لحاف سے منہ باہر نکال لیا۔ روشن دانوں اور کھڑکیوں کے شیشوں سے صبح کی روشنی چھن کر اندر آرہی تھی لیکن پھر کوئی بوجھل کثیف اور دودھیا سی چیز شیشوں سے باہر گذرنے لگی، اُس نے لحاف پرے پھینکا اور کود کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں پٹ کھول کر وہ باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ نیچے گہری عمیق کھائیوں میں چیل اور دیودار کے اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں پر دھند کے مرغولے زلفوں کی طرح کھلتے اور پھیلتے جارہے تھے۔ غبار گاڑھا ہو کر ہیولوں اور کھائیوں میں بھرتا جارہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں حدِ نگاہ تک ایک سفید چٹیل میدان سا بن گیا۔ چھانگلہ گلی کی چوٹیوں تک ایک ہموار راستہ پیدا ہوگیا۔ بے اختیار اُس کا جی چاہا کہ اس غبار میں کود جائے اور اس کی نرم ریشمی سطح پر پھسلتا ہوا موج پوری کی چوٹی تک چلا جائے۔

جانے وہ کتنی دیر اس نظارے میں محو رہا پھر غبار چھٹنے لگا اور درختوں کے چہرے دوبارہ نظر آنے لگے۔ وہ آکر بستر پر دراز ہوگیا اب دوبارہ اُس نے شیشوں کی جانب دیکھا تو اُسے دھند کے رقیق غبار سے چار حسین چہرے ابھرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اُس نے سوچا یہ فریب نظر ہے، لیکن ان کی نگاہیں ایک آبشار کی طرح کمرے میں مسلسل گر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ دھند کے مرغولے اپنی جون چھوڑ کر نسوانی چہروں میں ڈھل گئے ہیں۔

اُس نے ایک بار پھر جست لگائی اور دروازے کے پٹ کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ لڑکیاں اُسے دیکھتے ہی آناً فاناً دھند کے غبار میں غوطہ کھا گئیں جیسے وہ ایک پریوں کا غول تھا جو پُراسرار طریقے سے آیا اور غائب ہوگیا۔

وہ سوچنے لگا کہ ڈونگا گلی کی پہلی صبح ہی کتنی سہانی اور رومان پرور ہے۔

شیو کر کے اُس نے غسل خانے کا رُخ کیا کپڑے بدل کر باہر آیا تو ناشتہ میز پر چنا ہوا تھا۔ چائے دانی سے گرم گرم بھینی بھینی بھاپ اور خوشبو نکل کر کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ عرفان نسواری سوٹ میں ملبوس کرسی پر براجمان نہایت وجیہہ، مستعد اور صحت مند لگ رہا تھا۔

"جلدی سے ناشتہ کرو حضور — مری چلنا ہے" عرفان نے کہا۔

"یار ابھی تو پَو پھٹی ہے ذرا تو دم لو"

"دس بج رہے ہیں قبلہ۔"

"صبح؟"

"ہاں جناب — ڈنگاگلی میں دس بجے ہی صبح ہوتی ہے۔"

"آج صبح تو بڑی مبارک ہوئی — آنکھ کھلتے ہی حسینوں کے درشن ہوئے۔"

"سامنے منڈیر پر؟"

"ہاں"

"تو پھر آج شام اُن سے تمہاری ملاقات کرا دی — کیا یاد کرو گے؟"

"جھوٹ — بالکل جھوٹ — تم نمبر ایک حریص ہو۔"

دیکھ لینا بڑی شاندار لڑکیاں ہیں۔ آج رات اُن سے ملنے کا پروگرام ہے۔"

"تم نے یہ ہیرا پھیری نہیں چھوڑی — ایک عدد خوبصورت بیوی کے مالک ہو کر بھی ایسے لالچی ہو۔"

"یار تم اس نازک بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ بیوی اور محبوبہ میں فرق ہوتا ہے۔"

"یہ فرق ورق بکواس ہے — بھابی کے ساتھ یہ سراسر ناانصافی ہے۔"

"آہستہ بولو اس کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو دونوں کی خیر نہیں — وہ پہلے ہی تمہاری آمد سے خائف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اکیلا تو کچھ کر نہیں سکتا تھا اب دونوں مل کر ضرور کوئی حرام زدگی کریں گے۔"

دونوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

اندھیرے کے غبار موج پوری کی پہاڑیوں سے ڈونگا گلی اور خانپور کی وادیوں میں دھیرے دھیرے اتر رہے تھے۔

نیچے سڑک پر عرفان کی جیگر کے غرانے اور ایک دم خاموش ہو جانے کی آواز آئی۔ اوپر بنگلے کے برآمدے میں آرام کرسیوں پر بیٹھی ہوئی بیگم عرفان اور ان کی سہیلی طلعت کو فوراً معلوم ہو گیا کہ وہ مری سے لوٹ آئے ہیں۔

چند ثانیوں بعد وہ بنگلے کی طرف آتی ہوئی پگڈنڈی پر آگے پیچھے نوجوان لڑکوں کی طرح بھاگتے نظر آئے۔ پھر ایک ہی جست میں برآمدہ عبور کر کے اُن کے پاس پہنچ گئے۔ اُن کے سانس پھولے ہوئے تھے اور چہرے تمتائے ہوئے۔

"بھابی! آپ کی امانت صحیح سلامت لے آیا ہوں۔" پرواز نے بیگم عرفان سے مخاطب ہو کر کہا اور پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"شکریہ" بیگم کی آواز میں طنز کا زہر گھلا تھا۔

اچانک بادلوں کے بجرے تیرتے ہوئے برآمدے میں اُتر آتے اور وہ سب اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں پناہ گیر ہو گئے۔ خنکی بڑھ گئی اور بوندا باندی ہونے لگی۔

"یہ برسات کا موسم ان پہاڑوں میں بڑا ذلیل ہوتا ہے۔ کمبخت رات دن میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا۔ دھند، سیلن، بارش — طبیعت اکتا جاتی ہے۔" بجلی کی روشنی میں بارش کے چمکتے قطروں کو دیکھ کر عرفان نے بیزاری سے کہا۔ ٹین کی چھتوں پر بارش کے قطرے گرنے سے جیسے جلترنگ سا بج رہا تھا۔ پرواز کو یہ آواز، وہ موسم بے حد سہانا اور رومان خیز لگ رہا تھا۔ جانے عرفان اتنا بور کیوں تھا "بارش اگر جاری

رہی تو پروگرام کا ستیاناس ہو جائے گا" عرفان نے اس کے کان میں کہا۔

بیگم عرفان اور طلعت ان کو سرگوشیاں کرتے دیکھ کر چونکی ہوئی سی نظر آتی تھیں۔ عورت کتنی پیاری مخلوق ہے لیکن اُس کا یہ روپ کتنا خوفناک ہے۔

آٹھ بجے انھوں نے کھانا کھایا۔ پھر قہوے کا دور چلا ـــــ ماحول پر ایک عجیب ناخوشگوار خاموشی سی طاری رہی۔ عرفان نے گھڑی دیکھی پونے نو بج رہے تھے۔ اُس نے سگریٹ سلگایا اور باہر جھانکا "بارش تھم گئی ہے لیکن دھند کا سیلاب کمبخت پھیل رہا ہے ـــــ کیا بدذوقیت ہے زندگی عذاب میں آگئی ہے"

"آپ کو کہیں جانا ہے؟" بیگم عرفان نے پوچھا

"ذرا ٹہلنے چلیں گے ـــ پرواز کا پیٹ صبح سے پھولا ہوا ہے"

"ہمیں بھی ساتھ لے چلیں" بیگم نے کہا۔

"نہیں جی ـــ پھسلن ہے، دھند ہے۔ پھر ہمیں ذرا خلیل کے گھر تک جانا ہے۔ ذرا تاش سے دل بہلائیں گے"

بیگم عرفان نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اُن کے چہرے پر کدورت اور غصے سے سیاہ دھبے سے نمودار ہوگئے۔

ٹھیک نو بجے دو ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ٹارچیں لے کر سنبھل سنبھل کر نکلے۔ پگڈنڈی دھند کے طوفان میں بالکل نظر نہیں آتی تھی۔ وہ دھند کے ایک اتھاہ سمندر میں ڈوبتے چلے گئے۔ پرواز کا دم گھٹنے لگا۔ بمشکل دو قدم آگے تک ٹارچ کی روشنی پہنچتی تھی۔ نیچے اترنے کے ساتھ دھند بھی کم ہوتی گئی کچھ دیر بعد وہ پانی کے تالاب کے پاس پہنچ گئے۔ رات بے حد گمبھیر، خاموش، خنک اور وحشت ناک لگ رہی تھی۔ اردگرد کے پہاڑوں پر دیودار اور چیڑ کے بلند و بالا درخت چپ چاپ ایستادہ تھے ان کا عکس پانی میں کسی پھیلی ہوئی کالی سیاہ چیز کی طرح پڑ رہا تھا۔ تالاب سے اُس طرف ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں سہانی روشنی کے نیچے کچھ لوگ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔

دور سے قدموں کی چاپ، نسوانی چیخوں اور قہقہوں کی دلکش آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دونوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔

ان کے سامنے پگڈنڈی کا جو خم تھا اُس سے، اچانک روشنی کا فوارہ نکلا اور ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ دونوں نے اپنی ٹارچوں کا رُخ اس روشنی کے فوارے کی طرف کر دیا پھر چیخوں اور سسکیوں کی بہت سی ملی جلی مترنم آوازیں، رات کے سکوت کو مرتعش کرنے لگیں۔ اُن کے بدنوں میں جیسے لذت و مسرت کے فوارے جاری ہو گئے۔ دونوں دوستوں نے روشنی کا رخ اوپر درختوں کی طرف پھیر دیا اور خم سے نکلتا ہوا روشنی کا فوارہ بھی جھیل کے درختوں پر پڑنے لگا۔

اب وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔ ان کے سامنے پانچ لڑکیاں رنگ برنگی چمکیلے اور چست لباس پہنے شرما لجا رہی تھیں۔

پرواز کو انھیں اتنا قریب پا کر جھرجھری سی آئی۔

"یہ ہمارے دوست پرواز صاحب ہیں۔ بڑے دلچسپ اور مخلص آدمی ہیں۔ ذرا حسن پرست ہیں سو آپ لوگ ہوشیار رہیں ـــ اور یہ ہماری سہیلیاں ہیں۔ شیریں نسرین جبین حسین . . . . اور نازک اندام"

عرفان نے ایک نازک چھوٹی موٹی لڑکی کی لپک کر کلائی پکڑ لی۔ وہ شرماتی لجاتی کسمسانے لگی۔ اس تعارف پر سب نے ایک زور کا قہقہہ لگایا! فضا نغموں سے گونج اٹھی۔

پھر یہ حسین قافلہ دھیرے دھیرے باقی پگڈنڈی سے اُترنے لگا۔ راستہ اب زیادہ خراب تھا ـــ پھسلن، کیچڑ اور پانی کے کھڈ قدم قدم پر ملتے تھے

جو کوئی پھسل جاتا دوسرے اُس کو سنبھال لیتے۔ پھر چیخیں اور ہنسی سے فضا مرتعش ہوتی۔ پرواز سوچتا کہ مرد و عورت کے ایک جگہ اکٹھے ہونے میں کتنی لذت اور تسکین ہے۔

آگے آگے عرفان تھا۔ اُس نے نازک اندام کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ نازک اندام نے دوسری لڑکی کا ـــ دوسری نے تیسری کا ـــ اور آخر میں آخری لڑکی کو پرواز نے سنبھالا ہوا تھا۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کے سہارے پہاڑی سے نیچے اتر کر ایبٹ آباد مری روڈ پر آگئے۔ پہاڑ کے گردونواح بنگلے اور مکان بنے ہوئے تھے سڑک سے صرف چند مکانات دکھائی دیتے تھے۔ باقی پہاڑ کے پیچ و خم اور اونچے اونچے گنجان درختوں کی اوٹ میں چھپے تھے۔

سب کے ہاتھوں میں ٹارچیں روشن تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو چھیڑتے ہٹتے آگے بڑھ رہے تھے۔ دور سے یوں لگتا تھا کہ روشنی کی ایک قطار پہاڑ کے دامن میں متحرک تھی۔ رات بے حد تاریک اور گمبھیر تھی ـــ چاروں طرف سکوت تھا۔ آسمان پر سفید سفید بادلوں کے بجرے تیر رہے تھے۔ اُس خنکی میں اُن کے بدن ایک طرح کی لذت بخش آگ سے سلگ رہے تھے۔ ایک نامعلوم جذبہ ان کو کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔

موڑ پر روشنی کی ایک تیز دھار پڑی وہ سب ٹھٹھک کر رک گئے

"آپ یہاں" بیگم عرفان کی آواز کی کڑک اور کاٹ سے فضا گونج اٹھی۔ پرواز سناٹے میں آگیا۔ لڑکیاں سہم کر پیچھے سرک گئیں لیکن عرفان پر کوئی اثر نہ ہوا

"ارے بیگم، یہ تم ہو ـــ!" اُس نے اطمینان سے کہا "میں سمجھا کوئی ڈاکو نازل ہو گیا ہے یہ لڑکیاں بے چاری راستہ بھول گئی تھیں، ہم نے سوچا ان کو گھر پہنچا دیں ـــ دیکھو نا رات کتنی ڈراؤنی اور خوفناک ہے۔ یہ ہمارے قریب منڈیر کے اُس طرف جو سبز سی کاٹج ہے نا اُس میں رہتی ہیں"

"آپ فکر نہ کریں، ہم ان کو پہنچا دیں گی ـــ آپ سیر کے لئے جا سکتے ہیں" بیگم عرفان کی آواز کی کٹار چلی۔

وہ دونوں بجھے بجھے دل اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ نتھیا گلی کی طرف چل دئے۔

رات بھر عرفان اور اُس کی بیگم آپس میں لڑتے رہے۔ بیگم کی سسکیوں اور عرفان کے غرانے کی آواز نے اُسے ایک لمحے کو بھی سونے نہ دیا۔ محبت کی شادی کا یہ عبرتناک انجام دیکھ کر اُسے بے حد صدمہ ہوا۔ وہ اپنے آپ کو مفت ملامت کرنے لگا۔ اُس نے عرفان کو نہ صرف روکا نہیں تھا بلکہ اُس کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔

صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو دھوپ اندر آ رہی تھی۔ وہ بستر سے نکلا اور کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا۔ آسمان حد نگاہ تک گہرا نیلا تھا، دور نیچے گھاٹیوں میں چیل اور دیودار کے درخت سنہری دھوپ میں بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ دور نیچے گھاٹی میں پہاڑی ندی کا پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح چمک رہا تھا ـــ یہ نظارہ کتنا زندگی آمیز اور فرحت بخش تھا۔ لیکن گھر کی فضا عجیب بوجھل اور سوگوار سی لگ رہی تھی۔ کوئی ذی روح حرکت کرتا نظر نہیں آتا تھا ہر چیز ساکت و صامت تھی۔

پرواز کو یاد آیا صبح کے دھندلکے میں، عرفان اُس کے کمرے سے ایک اٹیچی کیس اٹھائے ہوئے گذرا تھا۔ شاید وہ مردان چلا گیا تھا۔

وہ کھڑکی سے ہٹ کر بستر میں گھس گیا اور لحاف میں منہ لپیٹ کر رات کے واقعات کا تجزیہ کرنے لگا۔ اس خوبصورت، خوش باش جوڑے کو دیکھ کر اُسے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ عرفان کبھی کبھی کی آوارگی کے باوجود اپنی بیوی سے بے حد محبت کرتا تھا وہ بھی اُسے والہانہ چاہتی تھی لیکن رات کے واقعہ نے ان کی محبت کا پول کھول دیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے۔

مرد کی فطرت میں یہ ہرجائی پن کیوں ہے، یہ آوارگی اور بے چینی کہاں سے آ جاتی ہے جو ایک چیز کے حصول کے بعد اسے دوسری

کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ کیا یہی مرد کا وہ اعلیٰ وصف ہے جس کے توسط سے اُس نے کائنات کو تسخیر کرنے کا عزم کیا ہوا ہے؟ قناعت اُس کی سرشت میں نہیں ـــــ لیکن آوارگی کا یہ جواز اُس کے جی کو اچھا نہیں لگا۔ یہ بھی تو خود فریبی کی ایک قسم ہے۔

جب وہ نہا کر اور کپڑے بدل کر باتھ روم سے باہر آیا تو اُس کے کمرے میں میز پر ناشتہ چنا ہوا تھا اور بیگم عرفان اندر کھلنے والے دروازے میں آویزاں پردے کو پکڑے کھڑی تھیں، اُن کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ زرد تھا۔ بدن ڈھیلا اور بے جان سا لگ رہا تھا۔ "آپ دوپہر کا کھانا نہیں کھائیے گا۔ عرفان مردان چلے گئے ہیں۔ میری سہیلی بھی لاہور جا رہی ہے۔ ہم اُسے چھوڑنے مری جائیں گے ـــ اگر آپ کو کوئی کام نہ ہو تو ہمارا ساتھ دیجئے گا۔"

"کیوں نہیں ـــ کیوں نہیں۔" بڑی مشکل سے اُس کے حلق سے یہ چند الفاظ نکلے۔

دوپہر انھوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ پرواز کے حلق سے لقمے اُترتے ہی نہ تھے۔ کھانے کے بعد وہ عرفان کی جیگر میں روانہ ہوئے۔ بیگم بڑی مہارت اور سلیقے سے پہاڑی سڑک کے خم و پیچ سے گاڑی کو لئے جا رہی تھیں۔

چھانگلہ گلی کی چوٹی پر پہنچ کر اُس نے جب کھلی کھڑکی سے گرد و نواح کے حسین و دلفریب مناظر پر نگاہ دوڑائی تو اُس کی آنکھوں کو طراوت سی محسوس ہونے لگی اور لطیف اور خنک ہوا سے طبیعت کا تکدر خاصا کم ہو گیا۔

بیگم عرفان کی گول گول سپید باہیں سٹیئرنگ کے ساتھ گھومتی ہوئی بڑی دلکش لگ رہی تھیں لیکن اُن کے چہرے پر ایک سنگین سنجیدگی سی طاری تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سٹیئرنگ پر ایک بت بیٹھا ہے۔

بیگم عرفان کی سہیلی جب لاہور کے لئے روانہ ہو گئیں تو وہ بے مقصد مال کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں کچھ لوگ گھوم رہے تھے لیکن شام قریب آئی تو رونق بڑھنے لگی۔ مال کے سارے کیفے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے مال کا ایک چکر کاٹا۔ پرواز بے حد بور اور بیزار ہو گیا۔ بیگم عرفان کا موڈ ایسا تھا کہ اُن سے کوئی گفتگو ناممکن تھی۔ اس لئے اُس نے سوچا کہ اگر کچھ وقت سینما میں گذارا جائے تو شاید بوریت کچھ کم ہو جائے۔ بیگم نے چپ چاپ سینما کی دعوت قبول کر لی۔ فلم پر لطف اور مزاحیہ تھی۔ اُس نے دونوں کے ذہنی کھچاؤ کو کافی کم کر دیا۔

جب وہ دوبارہ مال پر آئے تو وہاں کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ سیمابی روشنیوں میں نہائی برق چست پھبتے پھبتے ملبوسات میں عورتیں اور گرم سوٹوں میں ملبوس مرد چہل قدمی کر رہے تھے حُسن کی رنگینی فیشن کی فراوانی تھی۔ بدصورت عورتوں نے کچھ اس شدت سے میک اپ کر رکھا تھا کہ اُن کی بدصورتی ـــ چند ہو گئی تھی۔ بدن کی اس بے محابا نمائش کے سبب بعض اوقات نوجوانوں کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں۔

جب وہ بھی مال کی بھیڑ بھاڑ میں شامل ہو گئے تو خود تماشہ بن گئے۔ مال کے ایک دو چکر کاٹنے اور کتابوں کی دوکان پر رسالے وغیرہ الٹنے پلٹنے کے بعد وہ ایک نسبتاً تنہا سے کیفے میں جا بیٹھے اور مال پر گھومتے ہوئے لوگوں کا نظارہ کرنے لگے۔

پرواز کو مری کے کیفے بے حد پسند تھے۔ ان میں بیٹھ کر آدمی مری کے سارے لوگوں کا نظارہ کر سکتا ہے اور جی چاہے تو اُن پر تبصرہ بھی کر سکتا ہے لیکن کیف بخش اور فرحت آور چائے کے گھونٹ جب اُس کے حلق سے نیچے اُترتے تو اُس کے ذہن میں خیالات کی پریاں پھر سے اُڑنے لگیں۔ یہ شباب کی آنچ پر پکے جوان بدن، یہ مخالف سمت سے نیم برہنہ اعضا اور خدوخال اور یہ اونچے لمبے خوش پوش نوجوان رگوں میں ناآسودگی کا زہر بھرے یوں مال کے چکر کاٹ کر اپنی کوفت کو بڑھاتے ہیں اور اپنے تازہ دماغوں اور کارآمد جسموں کو تباہ کرتے ہیں۔ کیا وہ کوئی ایسی صورت نہیں پیدا کر سکتے کہ اپنی اس توانائی اس قوت کا رُخ پھیر دیں ـــ قربانی کریں ـــ اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کی ـــ قربانی ایک پرانا اور فرسودہ نعرہ ہے جو آج کے

نوجوانوں کی آرزوؤں کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہے کہ آنے والی نسل کے لئے قربانی کریں ـــ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے ـــ یہ لوگ ہمیشہ اپنے ماضی اور مستقبل سے کیوں لپٹے رہتے ہیں؟ وہ آج کو جنت کیوں نہیں بناتے؛ انہیں کل کی جنت نہیں چاہیے ـــ کیا بدن کی اس آسودگی اور ذہن کی اس کوفت کا کوئی علاج نہیں ـــ؟

اُس نے محسوس کیا کہ ہر طرف اندھیرا ہے جیل اور دیوار کے اونچے اونچے دیو ہیکل درخت اُسے نگلنے کے لئے اُس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ گھبرا کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ـــ دور بلندی پر مَری کی روشنیاں جھک رہی تھیں، اور وہ بیگم عرفان کی جیگر میں بیٹھا ہوا تاریکی کے اتھاہ سمندر میں اترتا ہوا جا رہا تھا۔ چھانگلا گلی کی چوٹی پر وہ ایک منٹ کے لئے رُکے۔ رات بے حد سیاہ، خنک اور ڈراؤنی تھی۔ بیگم عرفان نے تھرماس کھول کر چائے کا ایک پیالہ اُسے دیا اور ایک خود پیا۔ گرم گرم چائے کا گھونٹ حلق سے اُترتے ہی سارے بدن میں حرارت کی لہر دوڑ گئی اور اُس کے سوچنے کی قوت بھی لوٹ آئی۔

"کیا سارے مرد آوارہ ہوتے ہیں؟" بیگم عرفان کی آواز اُس کے کان سے ٹکرائی، یوں لگا جیسے کوئی دور سے پکار رہا ہو۔ اُس نے بیگم عرفان کی طرف دیکھا اندھیرے میں صرف اُن کی آنکھیں چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اُن کے بدن کی قربت سے ایک طرح کی آنچ اُٹھ رہی تھی ـــ خوشبو کی طرح ـــ وہ اس سارے ماحول کی پراسراریت سے سن ہو گیا تھا۔

"جی؟"

"کیا سارے مرد آوارہ ہوتے ہیں؟" بیگم نے سوال دوہرایا۔

"جی کچھ کہا نہیں جا سکتا" وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"آپ کا حلقۂ احباب وسیع ہے۔ آپ کو کچھ اندازہ تو ہوگا"

"اصل میں آوارگی کی مختلف منازل ہوتی ہیں" اُس کی آنکھیں بیگم کی آنکھوں سے چار ہوئیں اور اُس کے بدن میں تھرتھری سی ہونے لگی "بالکل نوجوانی میں جذباتی آوارگی ہوتی ہے" اُس نے کہا۔ سٹیرنگ سے لپٹا ہوا بیگم عرفان کا سپیدگول بازو سپیڈومیٹر کی روشنی میں نہایت بھلا لگ رہا تھا۔ ایک طرح کی نشہ آور آنچ اُٹھ کر اُس کے بدن کو سلگا رہی تھی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور یہ جو ایک نشہ کی ہلکی سی لہر اُس پر آئی تھی اُسے قائم رکھنے کی کوشش کرنے لگا ـــ لیکن وہ ناکام رہا۔ اُس نے پھر آنکھیں کھول دیں اور دور اندھیرے میں ایستادہ درختوں کو گھورنے لگا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا ـــ ہاں یاد آیا ـــ جذباتی آوارگی کے بعد جب ذرا سدھ بدھ بڑھ جاتی ہے تو جسمانی تسکین اور پھر ذہنی بلوغت ـــ جسمانی اور دماغی دونوں طرح کی تسکین چاہتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایک منزل پہ رہ جاتے ہیں ـــ اُن کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہو پاتی اور وہ مارے مارے پھرتے ہیں ـــ لوگ اُن کو آوارہ کہتے ہیں"

"لیکن ایک مرد جب بار بار ان منازل سے گذرنے کی خواہش کرے اُس کا کیا علاج ہے؟"

"ایسی صورت میں قصور عورت کا بھی ہوتا ہے" ـــ اُس نے اپنی نیم وا آنکھوں سے بیگم عرفان کی طرف دیکھا ـــ اُن کا جوان بدن غیر محسوس طور پر اُس سے چھو رہا تھا ـــ یہ لمس کیسا تھا کہ جیسے وہ کسی بوجھ کے نیچے دفن ہو رہا تھا۔

"عورت ـــ عورت" اُس نے آنکھیں بند کر دیں۔ کار کے گدے کی پشت سے سر لگا دیا اور رُک رُک کر بولنے لگا۔ "وہ اپنی طبیعت کے حسد سے مرد کی انفرادیت اور آزادی پر مختلف انداز سے حملہ آور ہوتی ہے ـــ اکثر یہ حملے جارحانہ ہوتے ہیں اور مرد کی انانیت بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے ـــ اور وہ انتقامی طور پر آوارگی کی ٹھان لیتا ہے"

آپ عورتوں کو بلاوجہ الزام دیتے ہیں"

نہیں ایسی بات نہیں"

سنیئے میری اور عرفان کی محبت کی شادی ہے ـــــ شادی کے فوراً بعد جب ہم مری آئے تو یہ جان کر میری عقل گم ہو گئی کہ میرے شوہر نامدار پڑوس کی ایک لڑکی سے محبت جتا رہے ہیں اور اُس کے لئے وہی الفاظ استعمال کر رہے ہیں جو میں سمجھتی تھی صرف میرے لئے مخصوص تھے ـــــ کل رات کے واقعے نے تو مجھے پاگل کر دیا ہے"

انسان ایک خواب پرست اور تخیل پسند مخلوق ہے" پرواز نے آنکھیں کھول کر بیگم کی طرف دیکھا، انھوں نے سٹیرنگ پر کہنی ٹیک کر سر کو سہارا دیا ہوا تھا اور بدن خم کھا کر اس کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں، اُس کے خیالات جذبات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، اُن میں پیہم ایک تصادم جاری تھا، اس کے ذہن میں دھند کے قافلے رواں تھے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک روشنی کی کرن تھی جو بیگم عرفان کے گول سپید بازو سے پھوٹ رہی تھی ـــ اسی کی راہنمائی میں خیالات کے دھارے کی طرف متوجہ ہوا تو راستہ صاف ہو گیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ انسان تخیل پرست ہے ـــــ شادی کے بعد بیویاں یہ سمجھتی ہیں کہ اُن کا حق ہے کہ اُن سے محبت کی جائے ـــــ یہ حقوق کا نعرہ بڑا غیر رومانی ہے مرد کی فطرت میں تمرد پیدا کرتا ہے اور اسے باغی بنا دیتا ہے محبت کی شادی اسی لئے ناکام ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں عموماً دیکھیے کی محبت محض جنسی ہوتی ہے یہ سب ناآسودگی کا ابال ہوتا ہے ـــــ اس تسکین سے آگے بھی ایک سطح ہے جہاں تک آج کل کے بہت کم نام نہاد محبت کرنے والے پہنچتے ہیں۔

"وہ سطح کیسے دریافت کی جائے؟"

"یہ ایک کٹھن مرحلہ ہے لیکن اگر طبیعتوں میں ہم آہنگی اور بردباری ہو تو اس منزل کو حاصل کیا جا سکتا ہے"

"آپ کی باتیں بڑی خوفناک اور بڑی دلچسپ ہیں" بیگم عرفان اس پر جھک سی گئیں۔

"دو محبت کرنے والوں کے درمیان جو نازک سا رشتہ ہوتا ہے اُس کا تعلق مخصوص جالوں اور جذبات کی دلکشیوں کے ماسوا ـــــ فریقین کے حوصلے اور بردباری سے بھی ہوتا ہے ـــــ عرفان اور آپ نے شادی سے قبل کئی دفعہ ایک دوسرے کی خطاؤں کو معاف کیا ہوگا۔ غلطیوں کو درگزر کیا ہوگا"

"ہاں ـــ ایسا کئی دفعہ ہوا ہے"

"لیکن شادی کے بعد حقوق کے تصور نے بدگمانی کو جنم دیا اور کشیدگی پیدا ہو گئی"

"خوب ـــ خوب ـــ آپ تو اچھے خاصے ماہر نفسیات ہیں"

ایک جھٹکے سے جیگر پھر سڑک پر دوڑنے لگی۔ پرواز کو اپنے الفاظ مُردوں کی طرح بے جان ہو کر کھائیوں میں گرتے نظر آنے لگے مرد کو جس آستانے سے تسکین مل جاتی ہے وہ پھر کہیں نہیں جاتا ـــ لیکن تسکین کہاں ـــ مرد میں ایک تڑپ ہے ازلی اور ابدی ـــــ شاید وہ اُن مردوں میں سے ایک ہے جو تمام عمر چند لمحوں، چند گھنٹوں کی تسکین سے بھی ہمکنار نہیں ہو سکتے ـــ جو شاید کبھی ایک عورت، ایک گھر اور ایک مقام پر پڑاؤ نہیں ڈال سکتے۔ یہ ایسا کیوں ہے؟

جیگر اندھیرے کے کنڈ میں اُترتی چلی جا رہی تھی، اُس کی تیز روشنیاں تلواروں کی طرح تاریک غبار کا جسم کاٹ رہی تھیں ـــ موج پوری کی چوٹی پر بجلی چمک رہی تھی۔ بیگم عرفان کا چہرہ مطمئن اور گلنار ہو رہا تھا۔

تیرگی کے ساگر میں جیگر اتر رہی تھی وہ مر رہا تھا ـــ اُسے تسکین سی حاصل ہو رہی تھی ورنہ اس کی ایسی قسمت کہاں ـــ دھند کے غبار اُن کے گرد پھیل رہے تھے۔ پہاڑوں پر چیل اور دیودار کے درخت دیوزادوں کی طرح کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔

چھانگا گلی کی روشنیاں کہاں تھیں ـــــ؟

ارے یہ تو ڈونگا گلی کی روشنی ہے ـــــ!

انور سجاد

شیرازے

چند لوگوں کو سرخ گلاب اگانے سے دلچسپی ہے۔ چند لوگ بھی نہیں، صرف الف سرخ گلاب اگاتا ہے۔ الف کے سر کے بال سفید برف ہیں چہرے پر صدیوں تک جھریوں کا نشان نہیں۔ اس کی چمکیلی آنکھیں سامنے کی چیز کو چیرتی پار دیکھتی ہیں۔ اُس کے سانس تک سے گلاب کی خوشبو آتی ہے۔ الف کہتا ہے کہ سرخ گلاب قبروں پر نچھاور کرنے کے لئے نہیں۔ وہ اپنے پھولوں سے شادی کے سہرے بھی نہیں بنانے دیتا۔ بوڑھے جھنجلا کر اس سے پوچھتے ہیں "تو پھر اتنے سارے گلابوں کا فائدہ؟" الف کے سر کے بال اور بھی سفید برف ہو جاتے ہیں۔ وہ خاموش سنجیدہ، اُفق سے پرے دیکھنے لگتا ہے۔ جب بوڑھے اپنے سروں کی سفیدی کا واسطہ دیتے ہیں تو الف کے چہرے پر جھریاں کئی صدیاں اور دور چلی جاتی ہیں۔ اس کی نظریں سرخ گلاب کی خوشبو کے پار ہوتی ہیں۔

"جو ڈھونڈتے ہیں، راز پاتے ہیں؟"

بوڑھوں میں اتنی سکت نہیں کہ الف کے ہاتھ سے قلمیں پکڑ کر ابتدا کی ابتدا کریں۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں "اس کے بال دھوپ میں سفید ہوئے" اور ہنستے ہنستے دوسرے قبرستان پر دل لوٹے کر تکیے کو چل دیتے ہیں جہاں گوف انہیں بڑی محنت سے چرس کے سگریٹ بنا کے دیتا ہے۔ وہ دم لگا کر دھے میں اترتے ہوئے اپنی نیم وا آنکھوں سے تکیے پر جھکے سبز درخت کی کسی برہنہ شاخ پر پھندا ڈالتے ہیں اور الف الف کہتے ہوئے گوف سے ایک اور بھرا سگریٹ لیتے ہیں۔

چند نوجوان جن کے پھیپھڑوں میں دمہ نہیں رچا جن کو سرخ گلاب میں چھپے، الف کے راز سے دلچسپی ہے، وہ اُن لوگوں سے چھپے چوری، رات کی روشنی میں، دن کی تاریکی میں آکر اس سے بھید جانتے ہیں، اس سے قلمیں لیتے ہیں۔ اس کی چمکیلی آنکھوں سے مناسب موسم کا انتظار کر کے سرخ گلاب کو سونگھتے اپنے پھیپھڑوں کو دمے سے بچاتے ہیں۔

سرخ گلاب کی زمانوں کے پیروں میں جھنڈوں کی آوازیں آسمان کو چیرتی ہیں لیکن پودوں کی نشوونما نہیں رکتی

شہر میں ایک نوزائیدہ بچہ پایا گیا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مر چکا ہے کہ بعض کو یقین ہے کہ ابھی کوئی کوئی سانس باقی ہے۔ کوئی نہیں مانتا کہ یہ اس کا بچہ ہے سب کہتے ہیں ہمارا بچہ تو تندرست صحت مند آنگن میں کھیل رہا ہے۔ اس نوزائیدہ بچے کے جسم پر سیاہ نشان ہیں اور اس سے آتی بارود کی بو، ہوا پر ہوئی سے جوم کی ناک بند ہو رہی ہیں۔ لوگ اس کی شناخت کے لئے دور دور سے آرہے ہیں۔ ہر جیا آنے والا نفی میں سر ہلا کہتا نہیں میرا نہیں اور

بھورا آنکھوں سے دوسروں کو دیکھنے لگتا ہے" میں اتنے معصوم بچے کو اتنے نزدیک سے گولی نہیں مار سکتا۔"

تکیے کے لوگ گاف سے پوچھتے ہیں، معاملہ کیا ہے۔ گاف دھوئیں سے جھانک کر کہتا ہے اب ڈوڈی کی کمادا اچھی بنے گی۔ سرخ گلاب کی پھلواڑی میں لوگ بار بار الف سے پوچھتے ہیں معاملہ کیا ہے۔ الف خوشبو کو گرد میں لے کر بار بار کہتا ہے، ابھی لوگ وہاں سے گئے نہیں ہیں؟

انیس سال کی کنواری انیس سال سے سہاگ کا جوڑا پہنے دروازے کے سامنے بیٹھی ہے۔ ہر نئے رشتے پر وہ اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ کر کہتی ہے "نہیں ابھی، میرے لیے گلاب کے سرخ پھولوں کی مسہری بناؤ" بڑی بوڑھیاں اسے سمجھاتی ہیں کہ الف پھول نہیں دیتا، صرف قلمیں دیتا ہے۔ کنواری کہتی ہے "تو پھر میں پہلی قلم سے پہلے گلاب کے پھوٹنے کا انتظار کروں گی"۔

گاف نے تکیے کے خزانے کے سانپ کو بڑی مشکل سے پکڑ کر روسٹ کیا ہے۔ یہ سانپ ہمیشہ ایس کی شکل میں کنڈلی مار کے بیٹھتا تھا۔ گاف ڈرتا ڈرتا ہر روز چرس کے لیے اپنی ضرورت کی رقم اٹھا لیا کرتا تھا لیکن آج اس سے رہا نہیں گیا تھا۔ اس نے چرس کی دھونی دے کر سانپ کو قابو میں کیا ہے اور روسٹ کر ڈالا ہے۔ بڑی بے صبری سے جلدی جلدی کھانے کے بعد منہ پر آتے آتے اس کا ہاتھ رک گیا ہے۔ سانپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ گاف نے اتنا کھا لیا ہے کہ اس سے سانس نہیں لیا جاتا۔ بیٹھتے ہوئے دل اور سر میں بجتی شریانوں پر قابو پانے کی کوشش میں آہستہ آہستہ گاف کے ہونٹوں پر سانپ کی مسکراہٹ پھیلنے لگی ہے۔

بینڈوں کے شور میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی اس لیے کسی کو جیگر کاؤنٹر کی آواز نہیں آ رہی۔ قریب کے جن لوگوں کو یہ آواز آ سکتی تھی وہ سانپ والے خزانے سے آئی ہوئی چرس میں بے ہوش ہیں۔ اس لیے کسی کو پتہ نہیں کہ تکیے کے پاس غیر ملکی جو اپنے دھاری دار لباس پر ٹنکے ہوئے ستاروں کی وجہ سے مداری معلوم ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں جیگر کاؤنٹر لیے کیا کہہ رہے ہیں۔ چند ایک بچے حیرت سے ان کے ہاتھ میں نئے کھلونے دیکھ رہے ہیں۔ ان دونوں مداریوں میں سے ایک نے بچوں میں ٹافیاں بانٹی ہیں۔ انہیں چپ رہنے کے اشارے کر رہا ہے اور دوسرا انہیں سمجھا رہا ہے کہ یہ جیگر کاؤنٹر ہے جس سے ریڈی ایشن کا پتا چلتا ہے۔ یہاں یورینیم بہت ہے۔ اس سے تمہیں بہت فائدہ پہنچے گا، مگر کسی کو بتانا نہیں۔ ننگے بچوں کی سمجھ میں نہیں آتا وہ ہاتھ میں ایک ایک ٹافی پکڑے حیرت سے نئے کھلونے کی آواز سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بینڈوں کی آواز، جیگر کاؤنٹر کے؛ اذان اور سرخ گلاب کی جھاڑیوں میں سرسراتی ہوا کے درمیان دب رہے۔

اسی خبر رساں ایجنسی کا کہنا ہے کہ کنواری کی ایک اور بہن بھی ہے جو اپنے سائے سے خوف کھانے لگی ہے۔ جس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر رات کے اندھیرے میں اسے ایک تاریک کمرے سے دوسرے تاریک کمرے میں لے جایا گیا ہے۔ پھر بھی پرچھائیں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ ہذیان میں کبھی اپنی بہن کو ڈستی ہے کبھی روڑی پر پڑے بچے کو اور کبھی الف کو بڑی فحش گالیاں دینے لگتی ہے۔ پھر تھک ہار کر وائرلیس کے کوڈ کے الفاظ بڑبڑانے لگتی ہے۔

باقی کے لوگ فاصلوں کی گرد پھانکتے کینٹین سے پلٹ کر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہیں اور صفحوں پر بھاگتے لفظوں کا پیچھا کرتے ہیں کہ کنواری ہیٹ پر ہاتھ جمائے دروازے میں بیٹھی ہے۔ اس کی بہن آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھے تاریک کمرے میں وائرلیس کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سامنے سے گتھم گتھا ہو رہی ہے۔ روڑی کی چوٹی پر کوئی لاؤڈ اسپیکر کے سامنے کھڑا تقریر کر رہا ہے۔ دو بوائے سکاؤٹ سبز یونیفارم پر سرخ گلاب کے بلّے لگائے نوزائیدہ بچے کو آرٹی فیشل ریسپریشن دے رہے ہیں۔ مداری اپنے تھیلے کا ڈمرو کی آواز کا پیچھا کرتے تکیے کا دروازہ توڑ کے اندر داخل ہو گئے ہیں جہاں بے ہوش لوگوں کو پھلانگتے گاف تک آئے ہیں۔ گاف کے سر کی شریان پھٹ گئی ہے۔ اس کے چہرے پر سانپ کی مسکراہٹ ہے۔ یہ طے کرنے کی ضرورت مجھے بغیر کہ سانپ نے گاف کو کھایا ہے یا گاف نے سانپ کو، ایک نے بڑھ کر سانپ کا سر جیب میں ڈال لیا ہے اور دوسرا کھدائی کرتا جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ اپنی جیب سے یورینیم نکال نکال کر وہاں دفن کرتا جا رہا ہے۔ گلاب کی جھاڑیوں کے پیروں میں بیٹھے گنگ ہو گئے ہیں کہ ان تک پہلی مرتبہ الف کی آواز پہنچی ہے، الف جس کے سر کے بال برف ہیں جس کے چہرے پر صدیوں پرے تک جھریوں کا نشان نہیں اور جس کی چمکیلی آنکھیں چیزوں کے پار دیکھتی ہیں اور جو سرخ گلاب اگا رہا ہے۔ ہاتھ میں قلمیں پکڑے جوانوں کو بشارت دے رہا ہے کہ بس موسم آنے ہی والا ہے۔

لوگ، بہت سارے لوگ صفحوں پر بھاگتے لفظوں کا پیچھا کر رہے ہیں کہ ـــــ

محمد کاظم

ماڈرن قلندر

دسمبر کا ایک خزاں رسیدہ دن تھا جب میں نے بالکل ناگہاں اس کی موت کی خبر سنی تھی!

یہ سات برس پہلے کی بات ہے۔ ہم اُن دنوں اپنے دفتر کی ایک تاریخی محل کی طرح قدیم اور دقیانوسی عمارت کی دوسری منزل میں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک لمبے اور چوڑے مقبرہ نما ہال کمرے میں چھ میز کرسیاں دو رویہ آمنے سامنے بچھی رہتی تھیں۔ اور ہم ایک دوسرے کی طرف منہ کئے ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر، کاغذوں پر جھکے رہتے۔ ہر طرف پراگندہ فائلوں کے انبار، خاک آلود دیواریں، گھٹی گھٹی ہوئی سرد ہوا اور ٹیلیفون کی بار بار بجتی ہوئی سمع خراش گھنٹی ―― ایک بے حد اکتا دینے والا ماحول تھا۔ اور جب ایسے ماحول میں ہماری روح کچھ ٹھٹھرنے لگتی تو ہم اُٹھ کر کسی ایک میز کے گرد جمع ہو جاتے۔ چائے کا دور چلتا۔ سگرٹوں کے دھوئیں میں چٹ پٹی اور خون کو گرمانے والی باتیں ہوتیں۔ اور ہم پھر سے اپنے کام میں جُتنے کے لئے تازہ دم ہو جاتے! ―― اس دن صبح سویرے ہی ایک میز پر دو تین دوستوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ وہ کیا موضوع تھا جس پر باتوں کا سلسلہ چل نکلا تھا، یہ تو مجھے اس وقت یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ ان باتوں کے درمیان، اچانک ایک جملہ میرے کان میں پڑا، اور بجلی کی طرح کوند کر میرے سینے میں اُتر گیا:

"ہاں بھئی، وہ خبر سُنی آپ نے؟ ―― بیچارے مختار مفتی کا انتقال ہو گیا"

میری رگوں میں خون برف ہو گیا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی، لیکن الفاظ میرے سوکھے ہوئے حلق سے اوپر نہ آسکے۔ ایک لمحہ کے لئے میں بالکل سُن بیٹھا رہا۔ پھر کوشش کر کے بھدّی آواز میں پوچھا "کب؟"

"تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ اپریشن کے بعد جو اس نے بجلی لگوانے کا علاج کرایا تھا۔ بس اُسی نے بیڑا غرق کیا۔ آخری دن بڑی تکلیف میں گذرے بیچارے کے"

میں کچھ دیر بولنے والے کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر بے خیالی میں اُٹھ کر اپنی جگہ پر آ گیا ―― بیچارہ مفتی: میں سوچنے لگا تو کیا وہ چل بھی دیا؟ ―― کیا وہ اتنا جلد مرنے والا لگتا تھا؟ ایسا زندہ اور جیالا انسان! ―― تو کیا وہ اس کا آخری خط تھا جس میں اس نے میرے پاس جہلم آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہاں وہ ایک فوجی کپتان کے دئیے ہوئے پانی سے اپنا علاج کرنا چاہتا تھا۔ اُس کپتان کے متعلق اُن دنوں یہ بہت مشہور تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں برقی تاثیر ہے۔ وہ جس پانی میں یہ ہاتھ ڈال دے وہ بہت سی بیماریوں کے لئے شفا ثابت ہوتا ہے ―― اس نے سوچا ہوگا جلد علاج کے حیلوں میں سے ایک حیلہ یہ بھی سہی! ―― "مادیت کے پاپڑ بیل چکا۔ اب قلندرانہ ہیئت میں ہجوم حجام کے مسرتنا مبادہ روحانیت ہو کر آتا ہوں" ―― لیکن اس فوجی افسر کی کرامات میرے زو میں جاننے والوں

کے معاملے میں بالکل بے اثر ثابت ہوئی تھی۔ میں نے یہی بات شاید مختار کو بھی جواب میں لکھ دی تھی۔ جس پر معلوم ہوتا ہے اس نے جہلم آنے کا ارادہ ترک کر دیا ــــــ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا! میں نے ایک ڈوبتے ہوئے انسان کو اس کر، دو تنکے کا سہارا بھی لے لینے دیا ہوتا! بھلا میرا اس میں کیا جاتا تھا؟ ــــــ یہ سوچتے ہوئے میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا اور غم کے احساس کے ساتھ حسرت اور پشیمانی کی ایک بے چین کرنے والی خلش بھی شامل ہو گئی!

اُن دنوں میں جہلم سے نیا نیا تبدیل ہو کر لاہور آیا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ مختار کو ایک اچھا سا خط لکھ کر اسے اچانک یہ خوش خبری سناؤں گا کہ میں ایک سو میل کا فاصلہ طے کر کے تمہارے اور قریب آ گیا ہوں، اب ہماری ملاقاتیں اکثر ہوا کریں گی ــــــ لیکن بے چارہ انسان کیا، اور اس کی سوچ کیا! اس کے بدلے میرے لئے اس خبرِ بد کا سننا مقدّر ہو چکا تھا کہ میرا دوست آگے اس جگہ چل دیا ہے جہاں ہم مرنے سے پہلے کبھی اس کے قریب نہ ہو سکیں گے، اور جہاں سے اس کی یاد کے ٹھنڈے جھونکوں کے سوا اب کوئی چیز اس دنیا میں نہیں آئے گی!

مختار احمد مفتی بہاولپور کے اُس پسماندہ خطّے کی پیداوار تھا جس کے فرزندوں میں بہت کم لوگ ناموری کے رتبے کو پہنچے ہیں۔ بہاولپور کے ادبی منظر میں خواجہ غلام فرید کی ذات اب بھی روشنی کے مینار کی طرح تن تنہا کھڑی نظر آتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ بہاولپور کا خطّہ مردم خیز نہیں، یا اس کی آب و ہوا کمال و ہنر کے ظہور کے لئے ناسازگار ہے۔ دراصل ایک خداداد جوہر بھی اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتا جب تک اسے اپنی تکمیل اور نمود کے لئے ایک خاص ماحول اور خاص فضا میسر نہ آئے۔ یہ ماحول اور یہ فضا ایک ترقی پذیر اور پیش رفت سوسائٹی میں میسر آ سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے اگر مختار کسی ایسی ہی سوسائٹی میں آنکھیں کھولتا، اور اپنی ذات کی تکمیل کے لئے بہتر مواقع اس زندگی میں پاتا، تو وہ اپنی شوخ ظرافت، اپنے عمدہ جمالیاتی ذوق، اور اپنی گرم گفتاری کی بدولت اس دنیا میں ضرور کوئی نام پیدا کرتا۔ لیکن افسوس کہ اس کی یہ سب چمکدار صلاحیتیں ایک بے حس اور خواب آور ماحول میں کملا کر رہ گئیں۔ ریگستان کے ایک پھول کی طرح وہ کِھلا، اور پیشتر اس کے کہ اس کی مہک کسی انجمن تک پہنچتی، وہ ایک ویرانے میں کملا کر گر پڑا۔

مختار درجہ اول کا ایک مجسٹریٹ تھا۔ انصاف کی کرسی پر بیٹھنا اور لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے کرنا اس کا پیشہ ورانہ معمول تھا۔ اس پیشے میں انسانی کمزوری کے سبب عموماً اپنے متعلق ایک غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے اور طبیعت پر ایک مصنوعی متانت کی چھاپ لگ جاتی ہے ــــــ لیکن میرا دوست اپنی نجی زندگی میں کسی پہلو سے بھی ایک متین اور با اختیار حاکم ہونے کا تاثر نہیں دیتا تھا۔ وہ بہت باتونی تھا اور دنیا جہان کی حکایتیں سناتا تھا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس نے اپنے عدالتی کارناموں کا کبھی بھولے سے بھی تذکرہ کیا ہو۔ وہ سرکاری افسروں اور حاکموں کی عام برادری سے بالکل الگ تھا۔ اس کا مزاج، اس کے خیالات، اس کی امنگیں سب اس کی اپنی تھیں۔ اس کی دنیا نرالی تھی۔ وہ ایک ایسی انسانی رُوح تھی جو اس مادی زندگی کی بیڑیوں سے آزاد ہو کر کائنات کی بے کراں وسعتوں میں آوارہ پھرنے کے لئے بے قرار رہتی تھی۔ اس نے اپنی مسرتوں کی ایک خیالی دنیا بسا رکھی تھی، اور جب وہ اپنے کسی قریبی دوست کے ساتھ ہوتا، اور اس پر وہ خاص کیفیت طاری ہوتی جو سب خیال پرست لوگوں پر طاری ہوا کرتی ہے، تو وہ باتوں کی رَو میں بہتا ہوا اپنے اس یوٹوپیا میں نکل جاتا۔ اس وقت اس کی آنکھیں مخمور اور نیم وا، دور اُفق کی طرف دیکھنے لگتیں، اس کا لہجہ کچھ جذباتی اور سرگرم ہو جاتا، اور وہ گہرے گہرے سانس لے کر کہتا:

"بار کاظم! اس دنیا میں ہر انسان کا ایک آئیڈیل ہوتا ہے۔ تمہارا بھی کوئی آئیڈیل ضرور ہوگا جس کے متعلق میں بعد میں پوچھوں گا کہ وہ کیا ہے۔ پہلے تم یہ سنو کہ اس دنیا میں میری سب سے بڑی خواہش کیا ہے ــــــ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ تم اور میں اپنے ان موجودہ جھمیلوں سے آزاد ہو کر ایک دن

نعرۂ مستانہ بلند کریں، اور پھر قلندروں اور درویشوں کی صفت ایک نامعلوم منزل کی طرف نکل کھڑے ہوں ـــ پہلے ہم مشرق کا رُخ کریں اور وہ تمام مقامات دیکھیں جہاں لارڈ بدھا اس دنیا کے شور و شر سے دور پہاڑوں اور جنگلوں میں دھیان گیان کیا کرتا تھا، اور جہاں اب اس کی یاد میں اُس کے پادریوں نے مندر تعمیر کر رکھے ہیں۔ ان مندروں کی خاموشی اور تنہائی میں کچھ دن بیٹھ کر ہم اس روحِ ازلی کے اسرار پر غور کریں کہ یہ کہاں سے آئی ہے اور کہاں اس کی منزل ہے ـــ اس طرح ہم پھرتے پھراتے ہم جنوبی ہند کی طرف نکل جائیں، اور وہاں اجنتا کے غاروں میں پتھر کی دیواروں پر ازمنۂ رفتہ کی وہ تصویریں ملاحظہ کریں جن میں جہاں سال راجے مہاراجے اپنا دربار سجاتے ہیں اور جن میں گول گول چھاتیوں والی رانیاں اپنے حُسن کی تعریف سُن کر شرما جاتی ہیں ـــ اجنتا کے پاس ایلورا کے مندر ہیں۔ قدیم سنگ تراشی کا ایک حیران کن نمونہ! ہم ان کے درمیان بھی کچھ دن بیٹھ کر اس کائنات کے مخفی رازوں کو ٹٹولنے کا جتن کر سکتے ہیں ـــ غرضیکہ اے موہن! اس طرح ہم چلتے چلتے اسرائیلی پیغمبروں اور فرعونوں کی سرزمین میں جا نکلیں گے اور وہاں توت عنخ آمون کی سونے کے کفن میں لپٹی ہوئی ممی کے سرہانے کھڑے ہو کر انسان کی ان تمام کوششوں پر ہمدردانہ غور کریں گے جو اس نے حیاتِ جاوداں کی تلاش میں کی ہیں ـــ پھر ہم شمال کا رُخ کریں گے۔ بغداد، شام، لبنان! ہم کچھ دن لبنان کی سبزپوش پہاڑیوں میں مارے مارے پھریں گے اور چشموں کا پانی پی پی کر گذارہ کریں گے اور پھر ... ‘‘

’’اتنی لمبی چھٹی مجھے تو نہیں مل سکے گی۔‘‘ میں اسے اس سنہری سپنے سے بیدار کرتے ہوئے کہتا۔

’’یار، تم نے پھر وہی دل جلانے والی بات کی؟‘‘ مختار جھنجھلا اٹھتا ’’تم اس طرح سوچتے ہی کیوں ہو کہ رخصتِ اتفاقیہ لے کر ہم اس سیاحت پر نکلیں گے۔ ہم تو ان ساری نوکریوں پر لات مار کر ایک ایسے مقدس سفر پر روانہ ہوں گے جو لا متناہی ہوگا۔ جو دنیا کے اس انتہائی سرے تک پہنچے گا جہاں سے لامکاں کی سرحد شروع ہوتی ہے ... ‘‘

’’پھر ٹھیک ہے۔‘‘ میں ایک دبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے چہرے پر ایک مطمئن کیفیت پیدا کرتے ہوئے کہتا۔ وہ رُک کر غور سے میرے چہرے کو دیکھتا۔ جو جیسے کچھ بھانپ کر میرے ساتھ کھلکھلا کر ہنسنے لگتا۔

لیکن مختار کا یہ رومان جو ہر بار ایک سنجیدہ لے پر ختم ہوتا تھا، صرف ایک خیالی ترنگ ہی نہیں تھی۔ فی الواقع مختار کی زندگی کے منصوبوں میں ـــ یعنی ان منصوبوں میں جو ہر انسان اپنے مثالی مستقبل کے بارے میں آخر وقت تک بناتا رہتا ہے ـــ ایک ایسے سفر پر جانا تھا جو اسے تمام موجودات سے بہت دور مخفی اور پراسرار کی طرف لے جائے۔ وہ اس نئی تہذیب کی چمک دمک اور ہاؤ ہو سے بہت پرے ایسی جگہوں پر جانے کا خواہشمند تھا جو الگ تھلگ اور گمنام ہوں، جہاں ہُو کا سماں ہو، جہاں سیاحوں اور گائیڈوں کی ریل پیل نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں دلّی اور آگرہ کے شاہی محلات سے زیادہ بدھ مت کے وہ دور افتادہ مندر اس کے تخیل کو مسحور کرتے تھے جو عام شاہراہوں سے ہٹ کر وندھیا کی دشوار گذار پہاڑیوں میں واقع ہوئے ہیں۔ اسی طرح مصر میں مشہور زمانہ اہرام کو چھوڑ کر وہ قاہرہ سے چار سو میل اوپر الاقصر (Luxor) کے ان فرعونی آثار میں حاضری دینا چاہتا تھا جہاں زائرین کا نسبتہً کم ہجوم رہتا ہے ـــ وہ اُردو اور انگریزی کے سب مصنفوں کو چھوڑ کر عربی کے جبران خلیل جبران کا والہ و شیدا تھا اور اس کی وجہ جبرانؔ کی وہ صوفیانہ باتیں، اور اس کا وہ پُراسرار اور انجیلی طرزِ تحریر تھا جس میں اس نے اپنے ذوق کی تسکین پائی تھی، اور جس نے اس کے تصورات و خیالات کو بھڑکا دیا تھا۔ جبران کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس کا اس نے کئی کئی مرتبہ مطالعہ نہ کیا ہو۔ جبران کی پوری عبارتیں اسے ازبر تھیں، اور وہ اپنی عام گفتگو میں، یا دوستانہ خط و کتابت میں، جب چاہتا جبرانؔ کے اسلوب میں باتیں کرتا چلا جاتا۔ وہ اپنے اس رومانوی سفر کے آخر میں لبنان ہمیشہ اس لئے جانا چاہتا تھا کہ وہاں اس کے ممدوح جبرانؔ کا مقبرہ تھا۔ ’’تم تو جبرانؔ کے زیادہ معتقد نہیں ہونا؟‘‘ وہ مجھ سے کہتا ’’اس لئے

میں تمہیں باہر کھڑا کروں گا، اور خود جبرآن کے مقبرے کے اندر باادب جاؤں گا، اور وہاں اس کے مواجہ میں کھڑے ہو کر یہ سوال کروں گا کہ اے روح! جو میری روح کو اتنا بے چین اور مضطرب کرنے کا سبب بنی ہو، اب کوئی ایسا گر بتاؤ کہ جس سے یہ امن و آسودگی سے ہمکنار ہو۔ مجھے یقین ہے کہ جبرآن کی روح مجھے کبھی نامراد نہیں لوٹائے گی۔"

اس طرح کی باتیں تھیں اور اس طرح کے ارادے اور ارمان تھے، اس شخص کے جس کا نام مختار مفتی تھا اور جو میرا بہت پیارا دوست تھا۔ وہ زندگی کے اس منصوبے کی تکمیل کبھی نہ کر سکا۔ اور ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنی زندگی میں اپنے ان خیالی منصوبوں کی تکمیل کر پاتے ہیں؟ کیا ہماری زندگی اپنے اس خیالی فردوس کے پیچھے ایک طویل اور ناکام سعی کا دوسرا نام نہیں؟

لیکن جتنا پیارا یہ میرا دوست تھا، اتنا ہی پیارا اور دلکش اس کی شخصیت کا تضاد تھا ــــ ایک طرف وہ روحانی مسرت، اور سکون اور تنہائی کی باتیں کرتا تھا۔ مہاتما بدھ اور جبران خلیل جبران اس کے مثالی نمونے تھے، اور اس کی باتوں میں لامکاں، پراسرار، اور ماورائی کیفیت جیسے الفاظ بار بار آتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے مزاج کی لطافت وجودِ نسوانی کے تصور میں بھی کثافت ہی کے معنی دیکھتی تھی۔ "خدا جانے کیوں" وہ مجھ سے کہتا، "عورت کا ذکر آتے ہی میرا ذہن اس ڈرٹی بزنس کی طرف چلا جاتا ہے جو مرد و زن کے رشتے کا منطقی نتیجہ ہے، اور جس میں میرے نزدیک حضرتِ انسان اپنی سب سے بھونڈی اور قابلِ مضحکہ حالت میں ہوتا ہے" ــــ ایک طرف یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف وہ ایک ٹھاٹھ دار زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ تنخواہ کے علاوہ اسے شاید اپنی زمینوں پر سے بھی کافی آمدنی ہو جاتی تھی، اسی لئے اس کا معیارِ زندگی اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں واضح طور پر بلند تھا۔ اس کے کپڑے ہمیشہ قیمتی اور عمدہ سلے ہوئے ہوتے تھے۔ ہر موسم میں اس کے پاس ایک سے ایک بڑھ کر سوٹ پہننے کے لئے موجود ہوتا تھا۔ وہ جہاں بھی رہتا کلب ضرور جاتا تھا۔ بہترین قسم کا ریکٹ ہاتھ میں لئے، سفید قمیص اور پتلون میں ملبوس جب وہ شام کو کلب جانے کے لئے باہر نکلتا تو انتظامیہ کا کوئی اعلیٰ افسر لگتا۔ بہاولنگر میں وہ جس مکان میں آ کر رہا تھا وہ باہر سے ایک سرخ اینٹوں والی دقیانوسی قسم کی عمارت تھی لیکن مختار نے جب اسے اپنے ساز و سامان سے آراستہ کیا تو اس کا سراپا ہی بدل گیا۔ باہر کے برآمدے میں تنی ہوئی سنہری سرکنڈے کی چقیں تھا کہ جب ہم اندر داخل ہوتے تو ہر طرف ایک اپنائیت اور تر و تازگی کا احساس ہوتا۔ ڈرائنگ، ڈائننگ، بیڈ ــــ سب کمرے الگ الگ اور خوبصورت فرنیچر سے آراستہ، ہر چیز اپنے مالک کے نفیس اور ستھرے ذوق پر دلالت کرتی ہوئی۔ اس کی خوابگاہ میں اس کے گدّے دار پلنگ کے پاس ایک خوبصورت، جدید ڈیزائن کی بیڈ ٹیبل پر کتابیں، رسالے اور ٹیبل لیمپ دھرا رہتا۔ ایک طرف کونے میں "تخت پوش" ہوتا تھا جس پر ایک موٹی قالین کی طرح کی نرم جا نماز بچھی رہتی تھی۔ ایک روز میں نے اس جا نماز کی اطلسی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی تعریف کی تو مختار نے فوراً کہا "بھئی نئی روشنی کے قلندر ہیں عبادت میں بھی آرام و آسائش چاہتے ہیں۔" میں اس کے ہاں کبھی کبھی جاتا تھا۔ لیکن جب بھی جاتا وہ اکثر ایک بہت ہی اعلیٰ قسم کی چائے سے میری تواضع کرتا۔ ایک دن اس نے ایک نام لیا "وائٹ جیسمین!" پھر مجھ سے پوچھنے لگا "یہ نام تو تم نے سنا ہوگا؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر تم نے یہ نام پڑھا تو ضرور ہوگا ــــ ذرا حافظے پر زور دو" وہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

"یاد نہیں آتا کہیں یہ نام پڑھا ہو"، میں نے بے بسی کا اظہار کیا۔

"بھئی کمال کرتے ہو، مولانا ابوالکلام کی "غبارِ خاطر" پڑھی ہے یا وہ بھی نہیں پڑھی؟"

"اچھا، اچھا۔ تو یہ وہی چائے ہے!" مجھے ایک دم یاد آیا اور میں نے آگے رکھی ہوئی پیالی میں دیکھا۔

"جنابِ عالی: یہ وہی چینی چائے ہے جس کی صفت میں مولانا نے بیس صفحوں میں اظہارِ خیال فرمایا ہے ——— بس وہ ذرا اول قسم کی تھی، یہ اس کی قسم دوم ہے۔"

مختار کی شفاف اور بے رنگ چائے فی الواقع بہت لذیذ تھی۔ اور اب "غبارِ خاطر" کا حوالہ سن کر میں اس کی عمدگی کا اور بھی معترف ہو گیا تھا۔ ——— لیکن مختار کے دل میں اب یہ کھٹک تھی کہ یہ سفید چینی چائے، چائے کی عام پیالیوں میں نہیں پی جاتی۔ اس کے لئے کافی کی پیالیوں کی طرح کے چھوٹے چھوٹے فنجان ہونے چاہئیں۔ کچھ عرصہ بعد جب میں اس کے ہاں گیا تو اس نے میری تواضع اب کے چائے کے عام سیٹ میں نہیں، بلکہ ایک نازک اور نفیس کافی سیٹ میں کی جو وہ لاہور سے پچاسی روپے میں خرید کر لایا تھا ——— صرف اس لئے کہ وہ اس میں اپنے چند قریبی دوستوں کو "وائٹ جیسمن" پیش کر سکے۔ وہ اس دن ایک بادشاہ کی طرح خوش تھا۔

مختار تنہائیوں اور ویرانیوں کا ذکر بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ کیا کرتا تھا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کی جیسی طبیعت کے آدمی کے لئے تنہائی کے لمحات گذارنا عموماً کٹھن ہوتا ہے۔ تنہا وہی شخص رہ سکتا ہے جو طبعاً خاموش ہو اور جس کو اپنے آپ کچھ سوچتے رہنے، یا دوسرے لفظوں میں اپنے دل کے ساتھ باتیں کرنے کی عادت ہو۔ مختار میں سوچنے کی صلاحیت تو ضرور تھی لیکن وہ مزاج کے اعتبار سے خاموش نہیں تھا، وہ ایک دلچسپ گفتگو کرنے والا انسان تھا، اور ایسے لوگ خلوت کے نہیں، انجمن کے آدمی ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ بہاولنگر جیسے شہر میں بھی ایک چھوڑ دو کلبوں کا ممبر تھا۔ کبھی وہ محکمۂ انہار کے کلب میں جاتا کبھی ریلوے کے کلب میں۔ لیکن پھر کچھ دن ایسے بھی ہوتے کہ اس کا کلب جانے کا موڈ بالکل نہ بنتا۔ ایسے دنوں میں وہ اکیلا نہ بیٹھ سکتا۔ کبھی خود میرے پاس آ جاتا، اور کبھی مجھے اپنے ہاں بلا لیتا۔

عورت کا موضوع بھی بظاہر اس کی دلچسپیوں سے کلیتہً خارج تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ شادی شدہ تھا، اور دو یا تین بچوں کا باپ بھی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کی ازدواجی زندگی اتنی ہی کامیاب تھی جتنی کامیاب وہ ہماری اس سوسائٹی میں ہو سکتی ہے۔ پھر ایک طرفہ بات یہ کہ کسی زمانے میں اس نے ایک غائبانہ رومان بھی کیا تھا جس کا قصہ اس نے مجھے ایک دفعہ داد طلب انداز میں سنایا تھا۔ یہ شاید اس کی شادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ انگلستان کی کسی یونیورسٹی میں ایک جرمن لڑکی زیرِ تعلیم تھی اس زمانے میں قلمی دوستی کے ایک ادارے کی معرفت اس کا پتہ مختار کو مل گیا۔ "میں نے اپنے خیال میں پہلے اس کی ایک تصویر بنائی، اور پھر اس کے ساتھ انگریزی میں خط وکتابت شروع کر دی۔ خط وکتابت سے معاملہ آگے بڑھا تو آپس میں تحفوں کا تبادلہ ہونے لگا پھر ایک دوسرے کو ہم نے اپنے فوٹو بھجوائے۔ ہمیں یوں لگتا تھا جیسے ہماری روحیں ازل سے ایک دوسرے سے آشنا تھیں۔ ...."

مختار نے اس کے نیلے نیلے خطوں کے پلندے سے اس کا ایک فوٹو نکال کر میری طرف بڑھایا اور استفہامیہ نظروں کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگا (کیا خیال ہے اچھے مولانا!) میں نے دیکھا تو وہ ایک ذہین چہرے والی، خوبصورت اور سڈول جسم کی لڑکی تھی ——— ایک مثالی جرمن فراؤن! میں نے حسد سے بھرپور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "یار تم تو چھپے رستم نکلے ... تو پھر تم نے کہاں تک پہنچایا یہ معاملہ؟" میری نظریں ابھی تک تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

"بس آگے کچھ نہ پوچھو یار! اصل میں ہمارے یہاں کے حالات ایسے ہیں کہ ان معاملوں میں آگے قدم اٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— ہاں اگر میں ان دنوں کسی طرح انگلینڈ چلا جاتا تو شاید کچھ ہو کر رہتا۔" مختار نے مجھے اس کے خط بھی ادھر ادھر سے پڑھ کر سنائے۔ اپنے اس پاکستانی مراسلہ نگار کی طرح وہ بھی حسن اور روح اور کائنات کی باتیں کرتی تھی (گوئٹے کی قوم سی!) اور مشرق کی بہت دلدادہ لگتی تھی ——— اس دن میں نے محسوس کیا کہ ایک پڑھی لکھی گل اندام لڑکی کے ساتھ غائبانہ دوستی اور خط وکتابت بھی کتنی بڑی اور ابدی مسرت کی چیز ہو سکتی ہے۔ اور مختار اس معاملہ میں کتنا خوش قسمت واقع ہوا تھا۔

مختار مفتی کو سب سے پہلے میں نے ایس۔ ای کالج بہاولپور کی لمبی سرنگ نما گیلریوں میں دیکھا تھا وہ فرسٹ ایر کلاس میں داخلے کے دن تھے اور داخلے کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے لئے ہمارے دن کا زیادہ حصہ ان گیلریوں میں چلتے پھرتے گذرتا تھا ہر طرف نئے چہروں کا ایک سیلاب امڈا پڑتا تھا عجیب و غریب چہرے، اجنبی اور بے مہر چہرے! کالج کا سارا ماحول ہی اجنبی اور بے مہر لگتا تھا۔ اور انسان کو بے اختیار اپنے سکول کے گھریلو اور دوستانہ ماحول کی یاد آتی تھی جہاں وہ آخری کلاسوں میں پہنچ کر کتنا نمایاں اور قابلِ التفات ہو گیا ہوتا تھا —— لیکن اس گرد و پیش میں مجھے ایک چہرہ شروع ہی سے مانوس اور دوستانہ دکھائی دینے لگا تھا۔ سانولی رنگت، بادامی آنکھیں اور ایک کشادہ دہانے میں سے مسکراتے ہوئے سفید چوکور دانت! میں جب بھی اس چہرے کو دیکھتا، مجھے یوں لگتا جیسے وہ میرے لئے کبھی اجنبی نہیں تھا۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے اور جب فرسٹ ایر کی کلاسیں لگنے کا وقت آیا تو ہم کلاس میں ایک ڈسک پر بیٹھنے لگے۔ اس دوران ہم نے اپنے اندر بہت سی ایسی باتیں دریافت کر لی تھیں جن کی بنا پر ہمارے درمیان پائدار دوستی استوار ہو سکتی تھی لیکن چرخ کج رفتار کو یہ منظور نہیں تھا۔ ہمارے درمیان دوستی ضرور قائم ہوئی لیکن بہت تھوڑے عرصے کے لئے! اور اس چند روزہ دوستی کی یاد اب میرے حافظے میں اتنی دھندلی ہو چلی ہے کہ مجھے اس زمانے کے بمشکل ایک دو واقعے یاد ہیں۔

ان میں سے ایک واقعہ کھیل کے میدان میں پیش آیا۔ ایک دن ہماری فرسٹ ایر کلاس کا پی۔ ٹی کا پیریڈ تھا۔ اور ہم میں ان لڑکوں کو جو فٹ بال کی ٹیم میں آنے کے خواہشمند ہوں باہر میدان میں جمع ہونے کے لئے کہا گیا تھا۔ ڈی۔ پی۔ ای نے (جسے ہم اختصار کے ساتھ پی۔ ڈی کہا کرتے تھے) گراؤنڈ کے وسط میں جا کر وسل بجائی اور ڈرل ماسٹروں کی سی اکھڑ اور سپاٹ انگریزی میں کہا "سب لوگ ایک لائن بنا کر قد وار کھڑے ہو جائیں —— وقت ضائع نہ کریں" ہم نے بالکل وقت ضائع نہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بیس پچیس لڑکوں کی ایک قطار قدوں کی ترتیب کے ساتھ بن گئی۔ جس میں میں اور مختار بالکل آخری سرے پر پہنچ گئے۔ مختار کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا لیکن میں اپنے سکول میں ایک اچھا وقت پر کام آنے والا کھلاڑی متصور ہوتا تھا۔ اس لئے میں اپنے انتخاب کے بارے میں کافی پر امید تھا۔

"اٹنشن پلیز" پی۔ ڈی کی آواز پھر گونجی۔ اور ہم سب خاموش ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "سب سے پہلے میں دائیں سرے والے آخری دو جنٹلمینوں سے درخواست کروں گا کہ وہ براہ مہربانی ایک طرف بیٹھ جائیں۔ ان کے لئے اچھا ہوگا کہ وہ فٹ بال کی بجائے کسی اور گیم کے لئے کوشش کریں" ہمارے دائیں طرف میں سے زیادہ تر گردنوں نے جھک کر ہماری طرف دیکھا اور پھر فضا میں بیک وقت اتنی ہی آوازوں کا ایک قہقہہ بلند ہوا —— ہم "دو جنٹلمین" ہکا بکا مارے شرم کے زمین میں گڑتے جا رہے تھے۔ ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم اسٹیج پر کھڑے ہوئے دو ایسے مسخرے ہوں جو دیکھنے والوں کے لئے مضحکہ اور حیرت کا سامان بنے ہوئے! —— دوسرے ہی لمحے ہم شکست خوردہ کھلاڑیوں کی طرح سر نیوڑھائے ایک طرف کو چل دئے —— چلتے چلتے جب ہم کچھ فاصلے تک گئے تو خدا جانے کیا ہوا کہ ہم پر ہنسی کا ایک پاگل کر دینے والا دورہ پڑا۔ اور ہم وہ ساری شرم و خفت بھول کر دیر تک بچوں کی طرح ہنستے رہے!

اس واقعہ نے ہمارے درمیان دوستی اور بے تکلفی کی بنیادیں اور گہری کر دیں۔ مجھے اس وقت یاد نہیں یہ اس دوستی کا اثر تھا یا مختار نے پہلے ہی سے فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اس نے فرسٹ ایر کلاس میں آرٹس کے بجائے سائنس کے مضامین اپنے لئے تھے حالانکہ انٹرنس میں اس نے سائنس بالکل نہیں پڑھی تھی۔ اس دوستی کے باعث ہم پریکٹیکل کی کلاسوں میں بھی ایک ہی میز پر کام کرنے لگے۔ لیکن کچھ دن بعد میں نے محسوس کیا کہ مختار کی یہ دوستی کم از کم سائنس کی لیبارٹری میں مجھے بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ سائنس کے مضمونوں میں وہ صاف سلیٹ تھا، اور میری اپنی

حالت بھی ان مضمونوں میں کچھ زیادہ قابلِ رشک نہ تھی۔ ایک ہی کشتی میں ہم دو اناڑی جمع ہو گئے تھے اور کشتی ڈولنے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے ساتھ کی میز پر ایک ذہین اور شوخ ہندو لڑکے کا سہارا لینا شروع کیا اور مختار سے آنکھ بچا کر دو تین عملی تجربے اُس کے ساتھ کر ڈالے۔ مختار چند روز تو صبر کے گھونٹ پی کر چپ رہا۔ آخر ایک دن چند دوستوں کے سامنے اُبل پڑا "بھئی ان شاہ صاحب سے کہیئے یہ ہماری فکر کیوں کرتے ہیں۔ یہ اپنی سیٹ بدل کر اپنے اس چہیتے کی میز پر کیوں نہیں چلے جاتے جو ہوشیار ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ بھئی ہم تو ہوئے نالائق۔ یہ بھلا کیوں اپنی تعلیم کا حرج کریں۔ پھر ہماری شکل بھی تو اتنی اچھی نہیں ہے......" مختار اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا، شاید اس خیال سے کہ میں اپنے کیے پر نادم ہو کر اس کی میز پر واپس آجاؤں گا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ مجھے اس کی اس بیجا اور تیسرے درجے کی طنز نے اُلٹا اس سے متنفر کر دیا۔ وہ ہندو لڑکا خوبصورت ضرور تھا لیکن میں خود ان دنوں عمر کی اس منزل میں تھا جس میں انسان کو دوسروں کی طرف متوجہ ہونے سے زیادہ اپنا بناؤ کھنے کی فکر ہوتی ہے۔ یہ بات مختار بھی اچھی طرح جانتا تھا لیکن دل جلا کیا کچھ نہیں کہہ گذرتا۔

یہ واقعہ میری اور مختار کی دوستی کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ اس دن سے ہماری بول چال بالکل بند ہو گئی، اور کچھ دن بعد میں نے یہ سُن کر اطمینان کا سانس لیا کہ مختار سائنس کو چھوڑ کر آرٹس میں چلا گیا، جہاں در اصل اسے پہلے ہی داخلہ لینا چاہیئے تھا۔ اب ہم ایک دوسرے کے لئے پھر سے اجنبی بن کر رہ گئے۔ اور جب تین سال کے بعد میں نے علی گڑھ جانے کے لئے کالج چھوڑا تو مختار کی شخصیت کا کوئی نقش بھی میرے حافظے میں موجود نہیں تھا۔ اس عرصہ میں ہمارے درمیان شاید علیک سلیک بھی نہیں رہی تھی۔

کالج کے زمانے کا مختار ایک ناٹے قد کا، گول مول قصباتی وضع کا لڑکا تھا۔ شلوار قمیص پہنتا اور اپنے گول سر اور خشخشے بالوں کے ساتھ یوں لگتا جیسے مسجد میں پڑھتے پڑھتے کالج میں چلا آیا ہو لیکن اس کی طبیعت میں ان دنوں بھی وہی چلبلا پن، وہی شوخی اور طراری پائی جاتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں میں اپنی باغ و بہار اور دلچسپ باتوں کی وجہ سے بہت چاہا جاتا تھا۔ اس کے منہ سے میں نے کبھی کوئی پھیکی بات یا مریل جملہ نہیں سنا تھا —— پھر جب سولہ برس کے ایک ناقابلِ یقین عرصے کے بعد ہم پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تو اس میں جسمانی طور پر بہت تبدیلی آچکی تھی۔ اب وہ ایک نکلتے ہوئے قد کا جوان رعنا تھا۔ اس کی رنگت بھی کچھ صاف اور اجلی ہو چکی تھی۔ اپنی ملاحت بھری رنگت، موٹے ہونٹوں اور سفید اُجلے دانتوں کے ساتھ وہ جنوبی سمندروں کے جزیروں کا شہزادہ لگتا تھا۔ ماڈل ٹاؤن بہاولپور میں اپنے ایک عزیز اور دوست کے مکان پر جب میری اس سے بالکل غیر متوقع طور پر ملاقات ہوئی تو وہ ایک نئے سمر سوٹ میں خوش رنگ ٹائی لگائے، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ بالکل صحیح اور سمارٹ قسم کے لباس میں جیسے کوئی سی۔ ایس۔ پی افسر بیٹھا ہو! وہی طاہرانہ شخصیت، وہی احساس برتری بیٹھنے کے انداز میں؛ اس کا باتیں کرنے کا اسلوب بھی اب اور نکھر آیا تھا۔ اس میں بڑھتی ہوئی عمر کی دانائی اور لطیفہ ء مطالعے کا ثمر نمایاں تھے۔ — اس دن اچانک یہیں ایک دوسرے سے مل کر اتنی خوشی ہوئی کہ اس کے جوش و خروش میں ہمیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ اب سے سولہ برس پہلے ہم کن حالات میں ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے۔ اور کس طرح ہماری دوستی کا سفینہ پاش پاش ہو کر زندگی کی لہروں پر بکھر گیا تھا۔ ہم اچھے پیار بھرے لوگوں کی طرح صاف دلی اور گرمجوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے اور دیر تک اچھی اور رُوح کو گرمانے والی باتیں کرتے رہے۔

اس پہلی ملاقات میں ہی مختار نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ جبران خلیل جبران کا کس قدر دلدادہ تھا۔ اس نے میرے متعلق کہیں سے یہ سُن رکھا تھا کہ میں نے عربی زبان میں کچھ عرصہ بڑھا لکھا ہے۔ چنانچہ اس نے جبران کے متعلق اتنے سوال اس دن مجھ سے کیئے کہ میں ایک عجیب گو مگو کی کیفیت میں پھنس گیا۔

"یار، شاہ صاحب تم عربی میں بڑے عالم فاضل بنتے ہو پھر جبران کو تو تم نے اصل عربی میں پڑھا ہوگا؟"

"جبران کو نہیں پڑھا؟ حیرت ہے، تو کیا آنجناب نے اس کا نام بھی نہیں سُنا؟"

"تو گویا عربی ادب میں جبران کا کوئی خاص مقام نہیں ہے، خوب!"

"اگر جبرانؔ بھی ادیب نہیں ہے تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے نزدیک ادیب کون ہے؟"

مختار دراصل مجھ سے یہ کہلوانا چاہتا تھا کہ عربی ادب میں ہر طرف جبرانؔ ہی کا طوطی بولتا ہے۔ لیکن میں ایک ایسی بات کیسے کہہ دیتا جو میرے نزدیک واقعہ کے خلاف تھی۔ جبرانؔ کو وہاں ادیب سے زیادہ ایک مفکر اور فلسفی تسلیم کیا جاتا ہے، یا زیادہ صحیح طور پر نثر میں شاعری کرنے والا ایک صوفی منش۔ اس وجہ سے وہ عربی ادب کے مرکزی حلقے میں نہیں آتا، اور اس سے کہیں بڑا ادیب اس کا وہ ہم وطن اور بچپن کا ساتھی میخائیل نعیمہ ہے جس نے اس کے سوانح لکھے ہیں۔۔۔۔

اب میں مختار کی خاطر ان حقائق کو کیسے جھٹلا دیتا چنانچہ اس دن جب ہم ایک دوسرے سے الگ ہوئے تو مجھے یوں لگا کہ میرے اور مختار کے درمیان ایک زبردست جذباتی اختلاف حائل تھا، اور ہم شاید آئندہ زندگی میں بھی اچھے دوست نہ بن سکیں گے!

لیکن مختار نے میرے اس اندازے کو بالکل غلط ثابت کر دکھایا۔ اُن دنوں وہ منٹگمری آباد میں مجسٹریٹ لگا ہوا تھا اور میں بہاولنگر کے بجلی گھر کا انجینیر تھا۔ میرا مکان شہر سے باہر زرد ریت کے ٹیلوں پر بنی ہوئی بجلی گھر کی کالونی میں واقع تھا۔۔۔ ایک دن جون کی تپتی ہوئی دوپہر کو میں دفتر سے فارغ ہو کر گھر آیا، اور کپڑے بدل کر کھانا کھانے کے لئے بیٹھنے لگا تو باہر برآمدے میں دستک ہوئی۔ اور ملازم کی زبانی میں یہ سُن کر حیران ہوا کہ "کوئی مختار صاحب" ملنے کے لئے آئے ہیں۔ میں اسی حیرانی میں اُٹھ کر باہر گیا، وہ اسے اندر لے آیا۔ اس دن میں نے بہت اصرار کر کے اُسے اپنا سادہ اور غریبانہ کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ اس کو میرا یہ خلوص اور بے ریائی بہت اچھی لگی۔ اور میں نے بھی واضح طور پر محسوس کیا کہ باوجود ہمارے جذباتی اور ذہنی اختلاف کے اسے میرے ساتھ ایک قلبی لگاؤ ہو گیا تھا، اور وہ مجھ جیسے کم آمیز شخص کے ساتھ بیٹھ کر بھی آسودگی محسوس کرتا تھا۔۔۔۔ اس دن کی یہ ملاقات ہمیں قریب لانے میں بہت کارگر ثابت ہوئی۔ اس نے اُٹھتے ہوئے میری کتابوں کا ایک جائزہ بھی لیا، اور جاتے ہوئے سمرسٹ مام کی "دی مون اینڈ سکس پنس" پڑھنے کے لئے ساتھ لیتا گیا۔ یہ کتاب اس نے پھر کبھی واپس نہ کی۔ وہ کتابوں کے لین دین کے معاملے میں بہت آزاد خیال تھا۔ ایک آدھ دفعہ میں نے یاد بھی کرایا، اس لئے کہ وہ کتاب میں نے خود کسی سے لی ہوئی تھی، تو بڑے اطمینان سے جواب دیا "یار اس کتاب کو بھول جاؤ، وہ ہمیں پسند آگئی ہے!"

اس ملاقات کے بعد ہماری دوستی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ منٹگمری آباد سے اس نے جلد ہی اپنا تبادلہ بہاولنگر کرا لیا۔ بہاولنگر میں ہم ایک دوسرے سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر رہتے تھے۔ اور دسویں پندرھویں ہماری ملاقات ضرور ہو جاتی تھی۔ وہ اکثر شام کے وقت میرے پاس آتا، اور میرے مکان کے آس پاس ریتلی زمین پر پھونک پھونک کر لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا میرے بیرونی برآمدے میں آکر کچھ دیر کے لیے رک جاتا، اور مشرق کی طرف دور تک پھیلی ہوئی صحرائی ویرانی کو تکتا، بناوٹ میرے اس مکان کا محل وقوع بہت پسند تھا "یار تم کتنے خوش نصیب ہو"! وہ رشک آمیز لہجے میں کہتا "جیسے تم خاموش اور تنہائی پسند ہو، خدا نے تمہیں گھر بھی ویسا ہی دیا ہے۔ چاروں طرف سناٹا اور ویرانی ہے، سامنے دور ایک گھنا اور پراسرار جنگل ہے جو افق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا ہے۔ میں اس سڑک پر جانے والی سواریوں اور راہگیروں کو جب اس جنگل کی تاریکی میں گم ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ انسان بھی اسی طرح ایک جیتی جاگتی روشن شاہراہ پر چلتے چلتے ایک دن اچانک ایک ان دیکھے اور پراسرار دھندلکے میں گم ہو جاتا ہے جس کے متعلق اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اندر کیا ہے اور اس کے ماوراء کونسی دنیا ہے:

"کیا تم کبھی اس جنگل کی طرف گئے ہو؟" ایک دفعہ اس نے اچانک سوال کیا۔

"ہاں، کبھی کبھی شام کو جاتا ہوں جب دوڑ لگانے کا شوق ہوتا ہے۔ یہ کوئی تین فرلانگ چوڑا ہے۔ اس کے بعد سڑک کے دونوں طرف پھر کھلی زمین شروع ہو جاتی ہے۔"

"خیر یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کبھی اس جنگل کی طرف نہ جاتا۔ اس پُراسرار چیز کو ہمیشہ پُراسرار ہی رہنے دیتا۔"

مختار ایک وسیع میل جول کا انسان تھا۔ وہ عموماً اپنے دوستوں اور محکمہ کے افسروں کو کسی نہ کسی یا چائے پر بلایا کرتا۔ ایسے موقعوں پر وہ میری خواہش کے برعکس مجھے بھی ضرور بلاتا۔ میرے پاس اس سے باقاعدہ دعوت نامے آتے، جن کے لفافے پر اس کی ظرافت و شگفتہ پن کے بہت عجیب نمونے دیکھنے میں آتے۔ بہاولنگر میں میرا عہدہ صرف ایس۔ ڈی۔ او یا ہاؤس تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک دعوتی لفافہ بھیجا جس پر میرا پتہ ان الفاظ میں تھا:

Mr Kazim Syed

S.D.O. Wires, poles, tools, Ruston Engines,

and repair of Electrons in the Space,

Bahawalnagar.

یہ مختار کی ایک عجیب سی عادت تھی کہ لفافے پر وہ نام اور پتہ لکھتے ہوئے اپنی حسِ مزاح کو بالکل قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ جب میں کچھ عرصہ بعد بہاولنگر سے تبدیل ہو کر جہلم چلا گیا تو وہاں اس کے خط سرکاری پتے پر آیا کرتے اور لفافے پر ہر بار میرا نام اور لقب ایک نیا روپ لئے ہوئے ہوتا: "سید محمد کاظم صاحب کاظمی صوبائی حاکم سائل (اسٹیجڈ آفیسر) محکمہ برقیات" یہ پہلے خط کا عنوان تھا۔ پھر "سید محمد کاظم مولا بخش"، "آغائے سید کاظم زیدی جہلم"، "علامہ سید کاظم رضا زیدی (ایم اے)" نے اسے لکھا تھا کہ جہلم میں بارشیں بہت ہوتی ہیں، اور اولے بھی اکثر پڑتے ہیں، اور خدا جانے کیا کیا خطاب جو اس نے مجھے خطوں میں دیئے تھے۔ میرے دفتر کا اہلکار جب یہ خط مجھے دینے کے لئے آتا تو زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہتا "آپ کے یہ دوست بہت بے تکلف معلوم ہوتے ہیں۔" آخری خط جو اس نے مجھے نقاہت اور تکلیف کی حالت میں لکھا تھا، اس میں بھی اس نے اپنی یہ روش نہیں بدلی تھی: "علامہ دہر قاضی میاں سید محمد کاظم صاحب جوناگڑھی" اس آخری لفافے کا عنوان تھا۔

بہاولنگر میں ہم کچھ ماہ اور ایک سال اکٹھے رہے۔ اس دوران میں اس نے جبران خلیل جبران کے بارے میں میری رائے کو کافی ہموار کر دیا۔ دو تین موقعوں پر جب اس نے جبران کی کتابوں کے کچھ ٹکڑے اپنے پُراثر لہجے میں سہج سہج پڑھ کر سنائے (ایک موقع پر میرا دوست محمد خالد اختر بھی میرے ساتھ تھا) تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ جبران کی کتابوں میں واقعی ایک فکر انگیز کیفیت اور تخیلی حکمت کی باتیں ہیں۔ میں اس کی طرح جبران کا دیوانہ تو نہ بن سکا۔ لیکن بر سبیلِ مفاہمت میں اسے کبھی کبھی پڑھنے ضرور لگ گیا۔ اور جب میں بہاولنگر سے چلنے لگا تو مختار کے نزدیک میں اس قابل ہو چکا تھا کہ اس نے جبران پر اپنی ایک محبوب کتاب میری نذر کی اور اس کے پہلے ورق پر اپنے قلم سے لکھا: "نذرِ عقیدت جبران ـــ مختار!"

بہاولنگر میں ہمارے تعلق کی کہانی کافی طویل ہے، لیکن میں ایک رات کا واقعہ بیان کئے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ اس لئے کہ یہ رات میری زندگی کی اُن چند راتوں میں سے ہے جن کا جادو کبھی ماند نہیں پڑے گا اور جن کی دھنک میرے خیالوں میں ہمیشہ روشن رہے گی!

دسمبر کی ایک چاندنی رات تھی۔ رات کے دس بجے کا وقت ہوگا۔ چاند ابھی پوری بلندی تک نہیں پہنچا تھا، اور اس کی ٹھنڈی نیلگوں چاندنی کا سکوت ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ گیدڑوں کی انسانی چیخیں جو سرِشام ہماری آبادی کے قریب سنائی دیتی تھیں، اب بہت دور ذخیرے کی طرف چلی گئی تھیں۔ میں اپنے صحن میں نیم خواب اور نیم بیداری کی حالت میں لیٹا ہوا تھا کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ کچھ لحظہ کے لئے میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ

دستک میں نے خواب میں سنی تھی یا جاگتے میں۔ ابھی میں اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ پھر دستک ہوئی۔ میں بڑبڑاتا ہوا اُٹھا، اور دروازہ کھول کر باہر نکلا تو مختار کے ملازم نے سلام کیا "صاحب نے بھیجا ہے، اور کہا ہے کہ جس طرح بیٹھے ہیں چلے آئیں"۔

"کیوں، خیریت تو ہے؟" میں نے تشویش ظاہر کی۔

"ہاں خیریت ہے، کوئی پروگرام معلوم ہوتا ہے"۔

مختار کے کمروں میں سے گذر کر جب میں اس کے کھلے مستطیل صحن میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو چار پائیوں پر سفید چاندنیوں کے بستر گاؤ تکیوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ایک پر مختار سفید کرتے اور پاجامے میں نیم دراز ہے اور دوسرا میرے لئے خالی رکھا ہے۔ اور ان کے سامنے درمیان میں ایک کرسی پر ایک اجنبی ہاتھ میں کوئی ساز لئے بیٹھا ہے۔ میں جب داخل ہوا تو اس اجنبی نے اُٹھ کر بڑے ادب سے سلام کیا۔ "یہ مسٹر.... ہیں" مختار نے تعارف کراتے ہوئے کہا "بھاولنگر کی اس نگری میں بھی کیسے کیسے اہل کمال پڑے ہیں، یہ تمہیں آج معلوم ہوگا —— یہ صاحب بمبئی میں تھے اور کلارنٹ بجاتے تھے، اچھی خاصی کمائی ہو جاتی تھی۔ یہاں پاکستان آئے تو کراچی میں بھی کسی نے بات نہ پوچھی۔ پھرتے پھراتے بیچارے یہاں آ پہنچے۔ اور یہاں بازار میں پان سگرٹ کا کاروبار کرتے ہیں"۔ میں نے تحسین کی نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ سائے میں ہونے کی وجہ سے مجھے ٹھیک طرح نظر نہ آسکا۔

"ہاں تو بسم اللہ کیجیے" مختار نے سند دی۔ اور اس اجنبی کی انگلیاں کلارنٹ پر چلنے لگیں!

میں موسیقی کا بہت دلدادہ ہوں اور ہر طرح کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لئے خدا نے مجھے کان دیئے ہیں، چاہے وہ کلاسیکی ہو، یا ہلکی پھلکی فلمی موسیقی۔ لیکن میں اس فن کی الف ب تک سے واقف نہیں، نہ مجھے راگ راگنیوں کے نام آتے ہیں۔ اس رات بمبئی کے اس فنکار نے الغوزے پر جو دھنیں چھیڑیں، وہ خدا جانے کون سی تھیں لیکن بہت ہی بیخود کر دینے والی تھیں۔ چاندنی رات کے اس رومان کے ساتھ موسیقی کی ان تانوں نے مل کر کچھ ایسا سماں باندھ دیا تھا کہ ہمیں اپنا وجود، اپنا ماحول، اپنا مکان سب غیر حقیقی لگنے لگے تھے اور ہمیں اپنے تئیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم الف لیلہ کے دو شہزادے، اپنے محل کے بالا خانے میں کسی عرب مغنی سے بوڑھا اس کے نغمے سن رہے ہوں! —— بارہ بجے کے قریب اس فنکار نے ہم سے اجازت چاہی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بھی اٹھنا چاہا تو مختار نے پکڑ کر بٹھا دیا "کمال کرتے ہو یار ایسی راتیں کبھی بار بار آتی ہیں۔ ہم کچھ دیر اس موسیقی کے سحر کے بارے میں باتیں کریں گے"۔ مختار نے سکواش کا ایک گلاس بنا کر میرے ہاتھ میں دیا اور کہنے لگا "موسیقی کے متعلق ایک حکایت ہے اور وہ میرے دل کو لگتی ہے کہ خدا نے جب انسان کا یہ پتلا بنایا تو روح کو حکم دیا کہ اس میں داخل ہو جاؤ، لیکن روح بیچاری بہت تڑپی اور مضطرب ہوئی کہ اسے اس تنگ کوٹھری میں نہ ڈالا جائے۔ خدا نے جب یہ دیکھا تو حکم دیا اور موسیقی کی ایک دھن چھیڑ دی گئی، اس دھن کو سنتے ہی وہ روح اتنی مدہوش ہوئی کہ خدا کے اشارے پر چپ چاپ اس جسم میں داخل ہو گئی —— اور اب وہ بیچاری اس کال کوٹھری میں جب بھی آزردہ اور ملول ہوتی ہے تو موسیقی ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے وہ اپنے آپ کو بہلا سکتی ہے۔

اس رات ہم نے دیر تک باتیں کیں۔ مختار کہنے لگا "یہ چاندنی رات، یہ موسیقی کا سحر، اور ایک ہم مزاج دوست کا ساتھ! ان چیزوں کے علاوہ بھی اسے مورکھ کوئی چیز ایسی ہے جس کی تم تمنا کرو؟"

"بس ایک عورت کی کمی ہے...." میں نے شرارت کے ساتھ کہا

"عورت کا وجود ٹھیک ہے یار اپنی جگہ ایک حد تک ضروری ہے" مختار کے ماتھے پر شکن نمودار ہوئے "لیکن میں پھر وہی چیز کہوں گا کہ عورت

اور مرد کے رشتے میں مجھے کچھ گراوٹ، کچھ ہلکا پن محسوس ہوتا ہے۔ اور معاف کرنا میرا خیال پھر اس ڈنگی بزنس کی طرف چلا جاتا ہے جس کا تصور ہی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے ـــــ خصوصاً ایسے لازوال اور نورانی لمحے میں!"

وہ لمحہ واقعی لازوال تھا بلکہ وہ رات لازوال تھی۔ میں جب گھر واپس آیا تو آسمان پر چاند اب کافی ڈھل چکا تھا!

مجھے یوں لگتا ہے کہ مختار کی باتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔ میں اس کے متعلق اتنا کچھ کہہ گیا ہوں، اور پھر کچھ بھی نہیں کہا۔ خدا جانے میں بھی اسے کچھ دے سکا یا نہیں لیکن میں نے اس سے جو کچھ لیا وہ میرے لئے زندگی کی راہوں میں ہمیشہ مشعل کا کام دے گا۔ میں نے اس سے یہ سیکھا کہ اس دنیا میں انسان کے لئے حسن اور مسرت کی تلاش سے زیادہ اور کوئی مقصد ارفع نہیں ہو سکتا۔ اور سب سے اچھی زندگی وہ ہے جو اپنی پوری intensity میں شوق اور ولولے کے ساتھ گزاری جائے۔ ہچکچاہٹ اور بے دلی کی زندگی دراصل موت کے انتظار میں جینا ہے۔ اور موت کا انتظار موت سے بھی شدید تر ہوتا ہے ـــ اور اس زندگی کے بہترین اور جاودان لمحات وہ ہوتے ہیں جو ایک ہم مزاج اور سچے دوست کی معیت میں بسر ہوتے ہیں۔ ایسے لمحوں کے لئے انسان جو کچھ بھی دے دے تھوڑا ہے ـــــ میں نے مختار سے اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لیا۔ اور اس کی ایک آخری نشانی جو اس وقت میرے سامنے ہے اور جو میرے لئے ایک ابدی مسرت کا خزانہ رہے گی، اس کے یہ خوبصورت پیڈ پر لکھے ہوئے خوبصورت خطوط ہیں جو اس نے میرے بہاولنگر سے چلے جانے کے بعد مجھے آٹھ دس ماہ کے عرصے میں لکھے تھے ان خطوں میں مختار کی رومانیت، اس کا باغ و بہار تصوف، اور اس کی شوخی اور بانکپن اس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آتے ہیں کہ شاید میرے اس سارے مضمون میں بھی وہ کیفیت پیدا نہ ہو سکی ہو۔ اس لئے میں اگر اپنے اس مضمون کی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کے آخر میں مختار کے ان خطوں کے ٹکڑے نقل کرنا چاہتا ہوں تو اس میں میں کسی حد تک معذور ہوں! ـــــــــ

> ...اور پھر یوں ہوا کہ گردنے امابادکو اور بادنے مانگر دکو ـــ دریۂ سکوت فضا کی لامتناہی وسعتوں میں چند سعید روحوں کا ایک مختصر ترانہ رواں ہو، جو دلچسپ راگ راگنیاں گاتا ہوا جا رہا تھا.... میں یہ سن کر بیدار ہوا، اور اس، اچھے داڑھی والے دوست کی یاد کے لاؤ روشن کرنے لگا میرے سامنے آگ جل رہی تھی، اور اس کے لرزاں شعلوں میں بلند ئی فن کی جھلک۔ پر اسرار دنیاؤں کی خاموشی، اور ذکر و تصور کا نظارہ تھا۔ ۔ میں نے نعرہ ہو لگایا کہ قلندروں کی صفت یہی ہے، اور اس کا نغم کے تصور میں کھو گیا جو یہاں کبھی کنار ریگ زار رہتا تھا، اور جنگل پھول اور جھنڈے کڑیوں برگندا رو کرتا تھا، اور یوں پرسکون ماحول سے ہم آغوش تھا اور اب سرائے عالمگیر میں مقیم ہے۔ جہاں سے نجانے تاریخ کی کتنی معلوم و غیر معلوم شخصیتیں پل بھر کو سستانے کے لئے گذری ہوں گی ـــ اور یہ ممکن ہے کہ اس عظیم برگد کے درخت کے نیچے کسی لمبی لمبی جٹاؤں والے قلندر نے دھونی بھی رمائی ہو، اور آنکھیں بند کر کے تصور یا وحدت میں غرق ہو گیا ہو، اور شاید کسی چابک سوار نے اسے بیدار دنیا سے زبردستی خواب آور دنیا میں دھکیل دیا ہو، اور وہ بے چارہ اپنا بوریا بستر لپیٹ کر بادشاہ عالمگیر کی سرائے سے چلتا بنا ہو ـــــ اور پھر کہکشاں کے راستے طویل و عریض خلاؤں میں گم ہو گیا ہو کہ اس بزرگ و برتر دیوتا کو دیکھنے اور کائنات کے پوشیدہ اسرار کو سمجھنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی مقام نہیں ـــ کیا تمہاری نظر میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی مقام ہے اے داڑھی والے؟ ہرگز نہیں۔ بہت خوب: تو پھر آؤ میرے دوست، اس مرد خدا کی تلاش میں اکٹھے ان راہوں پر چلیں جہاں سے ہو کر وہ گذرا تھا!....
>
> موسم خزاں آ گیا ہے۔ مرجھائے ہوئے پتے آوارہ بیابانوں کی مانند ادھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کل کو شاید بہار بھی آ جائے۔ تو پھر کیوں ہم اس سے پیشتر ان مغموم و افسردہ روحوں سے رشتہ گانٹھ لیں جو ہمیں ماورا سے بار بار تک رہی ہیں ـــــ میں آج سرِ شام ہی اداس

ہوں اور آگ کے گرد تنہا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہوں !　　　　　　　　　　تمہارا

مختار "

یہ اس کا پہلا خط تھا۔ پورے دو صفحے جبران کے اسی رومانوی اسلوب کا ایک عجیب نمونہ تھے۔ میں نے اس خط کا جواب اسی اسلوب میں تحریر کرنے کا منصوبہ بنایا، اور تین چار دن اس کوشش میں خون پسینہ ایک کر دیا۔ کتنے ہی مسودے میں نے لکھے، اور پھاڑ ڈالے۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ اتنے میں مختار کا دوسرا خط آ گیا۔ وہ اپریشن کے لئے لاہور آ کر البرٹ وکٹر ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔

"ایک عجیب تحیر و سکوت کا عالم ہے، میں خاموش ہوں اور اپنے آپ میں ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ میں نہیں ہوں۔ ایک ایسے موڑ پہ کھڑا ہوں جہاں مختلف النوع جذبات نے مجھے گھیر رکھا ہے، اور میں بزبان خامشی متلاطم جذبات کو سمجھنے کی سعی کر رہا ہوں ۔۔۔ زندگی بھی ایک طرفہ تماشا ہے ۔۔۔ میرا کل یہاں اپریشن ہو رہا ہے۔ دعا کرتے رہنا کہ بسا اوقات دوا سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے اور پھر تمہاری دعا کے تو کیا کہنے ـــ ایک نیک مرد آزاد ہو اور وہ جانسن کلبی کے فلسفے کے پیرو، صوفی صافی باقی باللہ کے علمبردار! اور یہ بات سوا رہی کہ مجھے داڑھی والے کا غم بھیا ہو میں تمہیں اکثر یاد کرتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ جب تم پر سکون روح اور بے نیاز دل کے مالک تھے تو کیا تم اس رہگزار میں مطمئن نہ تھے؟ تم اتنی جلدی وہاں سے کیوں چل دئے؟ صدیوں بعد ہم نے تم سے راہ و رسم پیدا کی، اور اس مضطرب روح کو تمہاری اجلی اجلی روح ملی تھی، تو تم نے ساتھ ہی چھوڑ دیا۔ شاید ہم ہی گندے تھے۔ اور ہمارے اندر کمی تھی کہ تمہارے معیار تک نہ پہنچ سکے۔

جبھی تو تم نے خط کا جواب بھی نہ دیا۔ خیر!

اچھا اب اجازت ہو کہ شب بھر کچھ سوچتا بھی رہوں اور بے بس انسان کا نوحہ اس روح اعظم کو سناتا بھی رہوں ـــ شاید اس طرح کچھ لمحات گذریں!

فراموش کردہ ـــ مختار "

مختار کی دائیں ٹانگ کے اوپر بلیڈر کے نیچے tumour ہو گیا تھا جس کا اس نے میو ہسپتال میں اپریشن کرایا۔ اپریشن کامیاب رہا۔ مختار ایک نئی زندگی حاصل کر کے بہت خوش تھا۔ وہ عید پر بہاولپور واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا: "تمہیں متفکر و پژمردہ دیکھ کر دکھ ہوا۔ سب نہیں کہتا تھا کہ ہم جیسے ماڈرن قلندر عرف پیر پکھیر کی بات مانو اور بہاولنگر سے نہ بھاگو۔ لیکن تم نے بات نہ مانی۔ اقرار کر لیا۔ اچھا اس بارے میں عید پر بہاولپور منطق لڑائیں گے" ـــ لیکن پھر ڈاکٹروں نے اسے Deep X-ray کے علاج کے لئے روک لیا۔ عید کے بعد اس نے ایک خط میں لکھا:

"کل ہو گا کہ ڈیڑھ مہینہ یہاں سے گذری تو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ تم نے عید پر خوب ڈٹ کے سویاں کھائیں۔ یہاں تک کہ اب تو سے موٹے تازے ہوتے جاتے ہو، اور پھر کمال جرأت نیت یہ کہ بند کمرے میں تیس پر طبق ختم کر دیئے۔ اللہ ۔۔۔ اللہ! کیا مقام شکر ہے کہ وہ مقام تم نے حاصل کیا ہے ـــ ایک فقیر حقیر پر تقصیر کی طرف سے مبارک قبول کرو کہ تم بہت خوش قسمت ترگام نکلے کہ ممی کو جا بسے اور ایک ہم بیچارے، محو صدائے جرس ہسپتال میں مقید ہیں کہ رال ہی ٹپکاتے رہے ۔۔۔۔

پھر کبھی کبھی کسی دبستان فکر میں جا نکلتا ہوں۔ کل ہی واپس آیا تو اکر بھٹک کر چاند کے ان عمیق غاروں کی طرف جا نکلا۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ کچھ دیر سنگریزوں سے کھیلتا رہا۔ پھر وہاں سے مشتری کی جانب چلا گیا۔ سہ پہر کی چائے ایک لب جو خیاباں کے کنارے پی، اور پھر روش روش ٹہلتا ہوا، خنکی بڑھی تو پھر واپس لوٹا۔ راستے میں ہر چند کہ مریخ والوں نے مجبور کیا کہ میں "ایچ واٹر" کے موضوع پر کچھ لیکچر دوں لیکن میں نے اپنی کم مائیگی کے پیش نظر معذرت کر لی ـــ بھلا ان عقلی مجتہدوں سے کون نمٹ سکتا ہے!　　ایک دیوانہ

مختار "

بدقسمتی کہ اپریشن کے بعد اس ڈیپ ایکس رے کا علاج اسے موافق نہ آیا۔ اور جو چیز اسے ایک کامیاب اپریشن سے حاصل ہوئی تھی۔ وہ اس اضافی علاج کی ناکامی نے اس سے چھین لی۔ اس علاج کے بعد اگرچہ وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر واپس بہاولنگر چلا گیا تھا لیکن اس کی حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی۔ امید کا دامن اس نے پھر بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اور نہ ایک جان لیوا مرض اس کی روح کی لطافت اور اس کے مزاج کی شگفتگی پر اثر انداز ہو سکا تھا۔ وہ بہت کمزور اور صاحب فراش تھا۔ جب اس نے مجھے یہ خط لکھا تھا، اور جہلم آکر علاج کرانے کی خواہش ظاہر کی تھی:

"...... اور جب میں چلا جاؤں گا تو تمہیں اس تکلیف کا احساس ہوگا لیکن بہرحال تم بھی ایک بھولے بادشاہ ہو۔ لہذا اس تکلیف کو بھول جاؤ گے۔ اور مجھے عقب سے مڑ مڑ کر دیکھتے رہو گے کہ ایک راہزن کس طرح آیا اور آکر چلا گیا ــــ اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے کہ اسے پکڑ بھی نہ سکے۔

داریب تم ایک بھولے بادشاہ ہو ــــ یہ آواز میں نے ابھی ابھی اپنی نئی کوٹھی سے کچھ دور واقع ٹیلے کے عقب سے سنی ہے بہرحال تمہیں اس سے آگاہ کرنا میرا فرض تھا کہ تم میرے یاد ایام بچپن کے رفیق ہو! نحیف و نزار ــــ محمد حسن"

یہ اس کے آخری خط کی آخری سطریں ہیں۔ یہ خط اس نے ۱۲ر اگست کو لکھا تھا، اور ۱۲ر ستمبر سے پہلے ہونے والی بات واقع ہو چکی تھی۔ اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا تھا کہ جانے والے کو پکڑ بھی نہ سکا۔ لیکن جانے والے نے مجھے یہ بتایا ہی کب تھا کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے ــــ جانے والے کب ایسی بات بتایا کرتے ہیں؟!

نکہت حسن

حصار

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو سب کچھ وہی تھا۔ صرف دیوار پر مکڑی کے جالے میں ایک چیونٹا اٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ برابر مکڑی کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مکڑی نے اپنی دونوں آگے والی ٹانگیں اس کی کمر اور گردن میں گاڑ رکھی تھیں۔ اور اوپر سے روپہلے روپہلے باریک تاروں کی چھتری نے اس کا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ چیونٹا تڑپ رہا تھا اور باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غیرارادی طور پر میں نے ہاتھ بڑھایا، اور پھر میں نے دیکھا، میرا ہاتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ بڑھتے بڑھتے پہلے ایک ٹہنی کی شکل میں تبدیل ہوا۔ پھر پورا کا پورا مضبوط بانس بن گیا۔ گٹھا ہوا سخت اور مضبوط بانس۔ اب میرے پاس بانس کے برابر لمبا اور مضبوط ہاتھ تھا۔ ہاتھ جو لمبا تھا اور مضبوط تھا۔ اور وہ سب کچھ کر سکتا تھا جو مجھے کرنے کی خواہش تھی۔ تب میں نے آگے بڑھ کر مکڑی کا جالا دیوار پر سے چھٹا دیا۔ چیونٹا اور مکڑی ایک ساتھ زمین پر گر پڑے۔ اور میں نے جھٹ سے اپنا پیر ان پر رکھ دیا۔ کالا اور مٹیالا خون اور پانی کا گرا گاڑھا لیپ زمین پر ایک چھلکے کی صورت میں جم کر رہ گیا۔ ہاتھ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں بالکل ہلکا پھلکا تھا۔ میرا ہاتھ مجھ سے چار چار فٹ آگے چل رہا تھا آس پڑوس والوں خصوصاً بچوں کے لئے اچھا تماشا تھا۔ لگڑ بھگا لگڑ بھگا کہہ کر انھوں نے محلہ سر پر اٹھا لیا تھا۔ اور پھر قطار باندھ کر اچھلتے کودتے، تالیاں بجاتے میرے پیچھے پیچھے چل پڑتے تھے مگر میں خوش تھا۔ ہاتھ جو عظیم ہے۔ وہ ہاتھ اب میرے پاس تھا۔ تب میں نے پورن کے کنوئیں میں ہاتھ ڈال کر اس کسن راج کمار پورن کو کنوئیں سے نکالا۔ وہ سالہا سال سے اس کنوئیں میں قید تھا۔ پورن نے مجھ سے کہا "میرے ہاتھ پیر تو کنوئیں کی تہہ میں ہی رہ گئے ہیں۔"

میں نے پھر کنوئیں میں ہاتھ ڈالا اور پورا کنواں کھنگال ڈالا مگر پورن کے ہاتھ پیر نہیں ملے۔ تب میں نے پورن سے کہا "ایسی حالت میں تم میرے پلئے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتے ہو۔ لڑھکتے لڑھکتے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور بچوں کی اس پلٹن میں شامل ہو جاؤ۔ ان انسانی کیڑے مکوڑوں نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔"

اور تب میں نے دیکھا، بچے اوندھے سیدھے، بدحواس اور بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ پورن لڑھکتا لڑھکتا ان سے قریب پہنچ گیا تھا۔ اور پھر میں نے ایک آواز سنی، غڑاپ۔ شڑاپ قسم کی آواز۔ اور پھر راجو مستری کرم دین کا آٹھ سالہ لڑکا راجو ہانپ رہا تھا۔ اور بار بار کنوئیں کے اندر جھانک رہا تھا۔ رانی کنوئیں کے اندر گر گئی تھی۔ ننھی رانی، جو اندھا دھند بھاگی تھی۔ پورن سے ڈر کر چھپنے کی کوشش میں غڑاپ سے کنوئیں میں گر پڑی تھی۔ میں راجو سے کہا "روتے کیوں ہو؟ میں ابھی رانی کنوئیں سے نکال دیتا ہوں۔"

پھر میں نے اپنا لمبا ہاتھ کنوئیں میں ڈالا۔ دائیں بائیں، اندر باہر سب طرف ہاتھ گھما گھما کر رانی کو ڈھونڈا۔ میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا تب میرے ہاتھ نے گلگلی چیز کا لمس محسوس کیا۔ بھیگے بالوں کی لٹیں میرے ہاتھ پر لپٹ گئیں۔ تب میں نے زور سے بالوں کی لٹوں کو پکڑ کر اوپر کی طرف

گھسیٹ لیا۔ اور راجو کے سامنے زمین پر ڈال دیا۔ رانی بے سدھ اور بے دم پڑی تھی۔ میلی، زرد رنگت لئے لمبی لمبی لیٹی تھی اور راجو دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ میں نے سوچا میرے ہاتھ نے کوئی گناہ نہیں کیا!

اب اس سے پہلے مجھے اپنے جسم کے ہر عضو سے نفرت تھی۔ لمبے اور زرد ہاتھ پیر۔ جن کے سروں پر انگلیاں اس طرح چپکی ہوئی تھیں گویا کسی بچے نے کاغذ کے کنٹوپ بنا کر انگلیوں پر پہن لئے ہوں اور اپنے ارد گرد کھڑے ہوئے بچوں کو ہُو ہُو کر کے ڈرا رہا ہو۔ اور ناخن گوشت کے اندر پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ چھوٹے سے چہرے پر وسیع طول و عرض میں پھیلی ہوئی ناک، جس کی نوک پر پہاڑ سے، گرمی اور برسات ہر موسم میں بدبودار پسینے کے قطرے چمکتے رہتے تھے۔ جیسے سڑک کے نکڑ پر میونسپلٹی کا لگایا ہوا پانی کا نلکا جو بند ہونے پر ٹپکتا ہی رہتا ہے۔ اور آنکھیں اُبلتی ہوئی، باہر کو نکلی ہوئی، سرخ انگارہ آنکھیں ——— میں نے برسوں سے شیشے میں شکل نہیں دیکھی ہے۔ اور پھر لوہے کے ان آہنی پردوں کے پیچھے شیشے ہیں بھی کہاں؟ یہاں تو صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی اپنی شکل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نمبر تیئیس میں ایک لمبی خوبصورت چوٹی والی لڑکی ہے۔ اس کی آنکھیں بھی اُبلتی رہتی ہیں۔ سرخ انگاروں جیسی آنکھیں ——— پھر کلائیوں کے ساتھ جڑے ہوئے نازک نازک دودھیا ہاتھ ——— گویا مصری کے کوزے کلائیوں سے باندھ دیئے ہوں۔ مگر یہ ہاتھ ——— یہ ننھے ننھے خوبصورت ہاتھ ——— پانچ اور پانچ دس انگلیوں والے ہاتھ ——— جب گردن پر پڑتے ہیں۔ اُف خدایا! زینب، بسنتو اور چھنکو کی گردن پر یہی دس انگلیوں والے ہاتھ پڑے تھے۔ بھوک بھوک کہہ کر ہلکان ہوئے جاتے تھے۔ اور زینب روز ایک ہی رٹ لگائے رکھتی تھی۔ نردیدی، پیٹ پچارن ——— روٹی روٹی پکارتی ہوئی مر گئی۔ ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ سخت اور تنگ بالکل اس سامنے والے دروازے میں لٹکے ہوئے پڑے کے آہنی چھلے کی طرح تنگ ——— اور پھر زینب، بسنتو اور چھنکو کی آنکھیں اُبلنے سی لگیں۔ باہر کو نکلنے لگیں۔ نمبر تیئیس کی خوبصورت لمبی چوٹی والی لڑکی کی طرح ساری کی ساری اُبل پڑیں۔ اور اس کے ساتھ ہی گردن کے ساتھ چپکی ہوئی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی۔ اور ہاتھ کندھے کے سہارے جھولنے لگا اور پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے کندھے کے ساتھ بانس کے برابر لمبا تڑنگا ہاتھ لٹک رہا تھا۔ اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر میں نے بہت سے کام کئے۔ میں نے کنوئیں کی تہیں کھنگال ڈالیں۔ میں نے سمندروں کو گھنگول ڈالا۔ اور میں نے اونچے اونچے پہاڑ کی چوٹیوں پر اُگنے والی خاردار جھاڑیوں کو نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ جب ہندو یاتری اپنے مذہبی سفر سے پلٹتے ہیں تو جوتے اُتار دیتے ہیں۔ اور تب ان کے پیروں میں ببول کے کانٹے چبھ جاتے ہیں۔ پھر قریب کے آشرم سے کوئی بال دودھوا چنگی بھر آٹے کا پلٹس پکا کر لاتی ہے اور زخم پر مرہم پٹی کر کے چلی جاتی ہے۔ اب میں نے پہاڑی راستوں پر سے ان کانٹوں اور جھاڑیوں کو اُکھاڑ پھینکا ہے، جو یاتریوں کے مذہبی سفر میں رکاوٹ بنتے تھے۔ میرے اس ہاتھ نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ پھر بھی نرس روز مجھے ایک گولی دے کر چلی جاتی ہے۔ ابھی میں نے گولی کھائی ہے۔ اور ابھی سے آنکھوں کے گرد پتنگے سے ناچنے لگے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد سارے اعضا سکڑنے لگیں گے۔ ہاتھ کے آخری سرے پر خوب خارش ہو گی مجھے گولی کھانے کے بعد ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہاتھ کے آخری سرے پر کوئی چیز اُبھر رہی ہے چھوٹی چھوٹی گانٹھیں سی۔ رحیم بھائی کہتا ہے "انگلیاں ہیں!"

اور انگلیوں والے تمام ہاتھوں سے مجھے دہشت ہوتی ہے۔ انسانی جسم کے ساتھ چپکے ہوئے یہ ہاتھ کس قدر کمزور اور بے بس دکھائی دیتے ہیں، مگر جب گردن پر پڑتے ہیں۔ اُف توبہ ——— برابر کے پلنگ پر لیٹے ہوئے رحیم بھائی کے ہاتھ ——— اس نے ان ہی ہاتھوں

سے خوب اپنا درآمد برآمد کا کاروبار چمکایا تھا اور جب میاں جی کو گھگھاتا ہوا نو گاؤں پران ہی ہاتھوں سے طمانچے مارتا گلیوں گلیوں پھرا۔ محلے والوں نے کہا ولی ہوگیا ہے" خوب —— تو یہ استغفار کا بھی ڈھنگ اس کو سوجھا۔ اگر ولی ہوتا تو کسی کونے بچارے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا۔ یہ کیا کہ منہ کو طمانچوں سے سرخ انگارہ کئے شہر بھر میں مارا بڈارا پھر رہا ہے۔ اس کو ٹھوکا مار کر اٹھاتا ہوں۔ کب سے پڑا خراٹے لے رہا ہے۔" سیٹھ جی! اے سیٹھ جی! اے رحیم بھائی! ارے میاں درآمد برآمد والے! وہ اپنے داہنے ہاتھ کو تو دیکھو۔ پٹی کھل کر نیچے گر پڑی ہے اور پھاہے کے اندر سے جو چھنگلیا کی پور جھانک رہی ہے اس میں کس جہنم جلی کی نشانی پہن رکھی ہے؛ بھائی کیسے ہی سجاؤ ان ہاتھوں کو مگر ان کے کرتوت تھوڑی بدلتے ہیں۔ یہ میرا بانس کے برابر لمبا اور طاقتور ہاتھ تو نہیں جس نے کنویں کی تہہ سے کمسن راج کمار کو نکالا اور —— اس کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ مگر کرنے کرنے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بالکل ایسا ہی فرق جیسا میری اور تمہاری عقل میں ہے۔"

اس وقت میرے ہاتھ کے آخری سرے پر کھجلی ہو رہی ہے مجھے ڈر ہے کہ یہ گانٹھیں اگر اسی رفتار سے بڑھتی رہیں تو یقیناً انگلیوں کی صورت اختیار کر لیں گی معلوم نہیں نرس کیا دوا دے رہی ہے؟"

"دھتورا —— میاں مختار دھتورا۔ وہ ہم سب کو روز صبح دھتورے کی چٹکی پھنکا کر چلی جاتی ہے۔ تب ہی تو میں، تم، کلثوم، باقر اور غنی ایک ہی سے خراٹے لیتے ہیں۔ اور اگر وہ یہ چٹکی نہ دے تو پھر ہم سب مل کر اس کا گلا نہ دبا دیں گے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو درآمد برآمد والے سیٹھ بہاری مل! ارے معاف کرنا رحیم بھائی۔ میرا یہ لمبا ہاتھ گلا دبانے کے لئے نہیں ہے۔ اس نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔"

"بہک رہا ہے۔ دیکھ لینا سو جائے گا۔ پھر بارہ پندرہ گھنٹے تک سوتا رہے گا۔ پھر غنی اور ہم دونوں مل کر اس کے تکیے کے نیچے دبے ہوئے اس فوٹو کو نکالیں گے جس کو دیکھ دیکھ کر یہ روتا ہے۔ ضرور اس کی زندگی میں کوئی غمی ہے۔"

"غم سے کس کو رستگاری ہے رحیم بھائی! ہم سب کا اپنا اپنا ایک غم ہے۔"

"غنی میرے دو غم ہیں۔"

"کیوں رحیم بھائی! تم یہاں پر بھی کاروباری دھاندلی سے باز نہیں رہ سکتے؛ تو یہ توبہ کرتے ہو پھر وہی چور بازاری کی باتیں! یہاں یہ منافع خوری نہیں چلے گی۔ بس ایک غم۔ سب کا ایک غم۔"

"تم تو سو رہے تھے میاں مختار!"

"میں سوتے میں بھی جاگتا ہوں۔ تم نے سوتے جاگتے ابوالحسن کی کہانی سنی ہے۔ سخی تھا۔ ایک ہاتھ سے خیرات کرتا تھا۔ دوسرے کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کا ہاتھ بھی میاں مختار کا طاقتور اور مضبوط ہاتھ تھا۔ رحیم بھائی ذرا دیکھنا پلاسٹر کے اندر یہ ابھری ابھری کیا چیز ہے؟"

"انگلیاں ہیں میاں انگلیاں۔"

"نہیں —— رحیم بھائی انگلیوں والے ہاتھوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ انھوں نے زینب کا گلا دبایا تھا۔ بستو کی گردن مروڑی تھی اور چھٹکو کو جو صرف تین گھنٹے کا تھا اور جس کی پیدائش کے بعد زینب نے کہا تھا" مختار یہ تیرا سیدھا ہاتھ ہے۔ اب نہ کہنا کہ میں اکیلا ہوں بڑا ہوگا تو تیرا سہارا بنے گا" اور تب میں نے اس گلگلے گوشت کے لوتھڑے کو دیکھا تھا۔ سفید چہرے پر سیاہ آنکھیں اس طرح

چمک رہی تھیں جیسے گھنٹہ گھر کی گھڑی میں لگے ہوئے ہندسے۔ میں نے اس وقت بھی اس کے گال پر نفرت سے ایک طمانچہ مارا تھا۔ زینب کی نظر بچا کر۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے لئے دودھ کی فکر کرنی ہے۔ زینب کی سوکھی چمرخ چھاتیوں میں کون سی دودھ کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ وہ تو جب ہی سوکھ چکی تھیں جب بسنتو تین مہینے کی تھی۔ اس لئے چھنگو کو چومنے کے بجائے میرے دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ اس کا گلا دبا دوں لیکن زینب نے اُچک کر اس کو میرے ہاتھوں میں سے چھین لیا تھا۔ اور بجو کی شیرنی کی طرح مجھے گھورا تھا۔ اور پھر بلی کی طرح زبان نکال کر اس گوشت کے لوتھڑے کو چاٹنے لگی تھی۔ اور جب ہی میں نے زینب کی گردن دبا دی تھی۔ بسنتو کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اور چھنگو کو دیوار سے جا پٹخا تھا۔ اور پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو پھول کی طرح ہلکا تھا۔ سڑک کے بچے لکڑ بھگا، لکڑ بھگا چلا رہے تھے۔ اور میں خوش تھا۔

رحیم بھائی! تم نے زینب کو نہیں دیکھا۔ گیہوں کی فصل کٹ کر تیار ہو گئی تھی۔ زینب بڑے سے کھلیان پر بیٹھی ہوئی تھی اور دھول دھوں کر کے بھوسا اُڑا رہی تھی اور لہک لہک کر گا رہی تھی:

اے گیہوں کی بالیو! تم دھرتی کا گہنا ہو۔ جس پر چڑیاں پھدک رہی ہیں۔ اور ایک چڑیا گیہوں کے سنہرے تاروں کی ہنسلی پہنے، گالوں پر گلاب کھلائے بیٹھی ہے کہ شاید پُروائی چلے اور بھوسا دور تک اُڑتا جائے اور چڑے کو خبر دے۔ فصل کٹ چکی ہے۔ دھرتی سونے سے چمک اُٹھی ہے۔ آؤ کہ سنہری فصل تیار ہے۔

وہ یہ گانا شادی کے بعد بھی گاتی تھی۔ اونچے اونچے سروں میں، دھیمی دھیمی آوازوں میں، چلتے پھرتے بس گاتی ہی رہتی تھی۔ اس کو سنہری فصلوں سے پیار تھا۔ گیہوں کے خوشوں سے عشق تھا۔ شہر آنے کے بعد بھی وہ اپنے بابا کے سنہری کھیت کو نہیں بھولی تھی۔ میں کہتا تھا، زینب مت گا! کوئی راجہ پکڑ کر لے جائے گا۔

"لے جائے تو لے جائے سرکنڈے کی گاڑی بنا کر پودنا چڑا لائے گا۔"

مجھے اس گانے سے نفرت ہو گئی تھی۔ خواہ مخواہ کی نفرت۔ میں سوچتا یہ کیسی عورت ہے۔ گیہوں کے ڈھیر پر پلنے والی یہ نٹ یاری عورت دیوانی نہیں تو اور کیا ہے؟ فاقوں پر نوبت ہے اور وہ پھر بھی "سنہری فصل تیار ہے" کا نغمہ الاپ رہی ہے۔ اصل میں زینب کو زندگی سے بے طرح پیار تھا۔ وہ ہر وقت جھنجھنے کی طرح بجتی رہتی ہے۔ رحیم بھائی! تم نے زینب کو نہیں دیکھا۔ مگر دیکھا تو ہے۔ اور روز ہی دیکھتے ہو۔ عورتیں سب ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ یہ نرس جو روز صبح سویرے ہم سب کو ایک زرد زرد گولی دیتی ہے زینب ہی تو ہے۔ سوئی سوئی آنکھیں اور بھینچے ہوئے لب والی زینب۔ اور وہ نمبر تیئیس میں لمبی خوبصورت چوٹی والی لڑکی ہے نا۔ وہ بھی زینب ہے۔ کھل کھل کر ہنسنے والی زینب۔ لیکن اب زینب بالکل خاموش ہے۔ اور اس خاموش زینب سے مجھے خوف آتا ہے۔ دیکھو! اس تصویر کو دیکھو۔ زینب کے ہونٹ بھنچے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل چپک گئے ہیں۔ اگر یہ سب کھلیں گے تو ——— اور میں اسی وقت سے ڈرتا ہوں۔ مگر اب میں بہت بدلتا جا رہا ہوں۔ اس عظیم اور طاقتور ہاتھ نے مجھے بالکل بدل دیا ہے۔ جس تھکن کا احساس لے کر میں یہاں آیا تھا وہ بالکل غائب ہو رہا ہے۔ بس ہاتھ کے سرے پر خارش ہوتی ہے۔ گانٹھوں پر یہ محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی ان کو نوچ رہا ہے، آری سے چھیل رہا ہے۔ شاید یہ دوا کا اثر ہے۔ اگر اس دوا سے میرا ہاتھ عام آدمیوں جیسے ہاتھ کی شکل اختیار کرلے گا تو میں ایک مرتبہ پھر زینب کا گلا گھونٹ دوں گا۔ اس زینب کا جو روز مجھے گولی دیتی ہے پیلی پیلی۔ وہ گولی جیسے بسنتو کی آنکھیں میں کھنڈتی ہوئی زردی۔ یا چھنگو کے گالوں کے مرجھاتے کنول!

کمرے کے سب روشن دان بند ہیں۔ تمہیں بھی گرمی لگ رہی ہے رحیم بھائی! میں لیٹے ہی لیٹے انہیں کھول دوں گا۔ پھر باہر سے رات کی رانی کی خوشبو آئے گی بھینی بھینی مہک ـــــ زینب نے رات کی رانی کا پودا صحن میں لگا یا تھا۔ بسنتو روز اس میں پانی دیتی تھی۔ اور جب پھول آنے لگے تو نہ زینب رہی اور نہ بسنتو۔ پھر میں نے اس پودے کو زمین سے اکھیڑ کر باہر گلی میں پھینک دیا۔ اس کی لمبی لمبی جڑیں ایسے دانت نکوسے مجھے گھور رہی تھیں گویا کچا ہی چبا جائیں گی۔ صبح جھاڑو لگانے والی نے اسے بھنتے ہوئے پانی میں پھینک دیا۔ رحیم بھائی! تم جب یہاں سے جاؤ تو دروازے کے عین ساتھ مہکتا ہوا اس کی رانی کا پودا لیتے جانا اور زینب اور بسنتو کی قبر کے درمیان لگا دینا۔ یہ چوری ہے اور تمہارا ہاتھ چوری کرنے میں طاق ہے۔ چھوٹا اور کمزور ہاتھ ـــــ دس انگلیوں والے ہاتھ سب ایسا ہی کام کرتے ہیں۔ یہ میرا ہاتھ تو نہیں جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ مجھے اب اپنے اس لمبے ہاتھ سے بھی الجھن ہونے لگی ہے۔ اپنی بہت سی خواہشوں کا گلا دبانا پڑ رہا ہے۔ نرس کی ٹھوڑی کے درمیان چمکتے تل کو چومنے کی خواہش۔ اور رات کی رانی کا پودا اجاڑنے کی خواہش، ایک ساتھ ہی ابھری ہیں۔ بھلا بتاؤ کس کس کا گلا گھونٹوں؟ دیکھتے رہنا میں کچھ نہ کچھ کر گزروں گا۔ اب میں بالکل بدل گیا ہوں۔ پہلے ہر چیز میری پہنچ سے باہر تھی۔ اور ہر چیز مجھے اپنے سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔ اور میں ہر چیز سے خوف زدہ تھا، بھوک سے ڈرتا تھا۔ لباس سے خوف کھاتا تھا۔ بسنتو کو دیکھ کر کونے میں چھپ جاتا تھا۔ زینب کے بھینچے ہوئے لب دیکھ کر سہم جاتا تھا۔ اگر یہ کھل گئے ـــــ؟ میں سایوں اور پرچھائیوں سے بھی خوف زدہ تھا۔ دیوار پر اپنا چلتا پھرتا سایہ دیکھ کر سوچتا تھا۔ یہ میں تو نہیں ہوں۔ اتنا بڑا! اتنا گمبھیر ـــــ! پوری دیوار پر چھایا ہوا میں ہوں جسے ہر بڑی چیز سے دہشت ہوتی تھی اور ہر چیز اپنے سے بڑی لگتی تھی ننھی بسنتو بھی ـــــ! جو پانی کا چھوٹا سا بلوری گلاس بھر بھر کر کیاری میں لنڈھاتی رہتی تھی یہاں تک کہ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتا تھا۔ پیلے زرد گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی جھول آتی تھی۔ پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر چمکنے لگتے تھے۔ تب وہ میلے کچیلے فراک کا کونہ اٹھا کر پسینہ پونچھتی تھی۔ اور میں اس کا پسلیوں کے ساتھ لگا ہوا پیٹ دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔ کھونٹی پر سے اپنا سیاہ کوٹ اتارتا تھا۔ مفلر گلے میں لپیٹتا۔ جوتوں کو زبردستی پیروں میں ٹھونستا اور طاق پر رکھے ہوئے گول گول مڑے ہوئے کاغذوں کو اٹھا کر باہر نکل جاتا تھا۔ اور پھر جب شام کو گھر آتا تھا تو زینب کے بھینچے ہوئے لب دیکھ کر پھر ڈر جاتا تھا۔ ہر چیز بہت بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ زینب جس کو میں کندھوں سے پکڑ کر جھلا دیتا تھا اور جو کھل کھل ہنستی ہی رہتی تھی، بالکل چھوٹی سی گڑیا ہی تو تھی۔ کھیت میں ایسے کد کڑے لگاتی پھرتی تھی جیسے چنکیری بچھیا ہی تو ہو۔ اور پھر جب میں اس کو اپنے گھر لے کر آیا۔ تب بھی گڑیا ہی سی تھی۔ سرخ دوپٹہ گلے میں ڈالے، پاؤں کی پازیب چھنکاتی سارے گھر میں گھم گھمیا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے اونچے سیدھے خواب دیکھ کر میرے ساتھ چلی آئی تھی خواب۔ خواب جو ایک پڑھے لکھے آدمی کے ساتھ منسوب ہونے کے بعد سے ہی لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور زینب کی آنکھوں کے سامنے تو اسی دن سے روشنی کا ہنڈا جل رہا تھا جب میں نے دسویں کا امتحان پورے صوبے میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ تب ہی تو اس کے بابا نے بغیر کسی حیل وحجت کے زینب کو مجھے بیاہ دیا تھا۔ اور پھر جب میں اس کو اپنے گھر لے کر آیا۔ اور بان کی چارپائی پر لٹا کر اس کے برابر بیٹھا تو وہ پھر کھل اٹھی ہنستے ہنستے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ایک دن لالٹین کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا زینب بہت بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس کو چھو کر لگا ہوں سے گھورا۔ وہ مجھ سے کہیں بڑی دکھائی دیتی تھی۔ پہاڑ کی پہاڑ بسنتو کی ماں بن کر وہ اتنی بلند ہو گئی تھی کہ میں اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا بھی تھا، تو پھسل کر سطح پر آ جاتا تھا اور پھر جب اسی زینب نے چھنکو کو پیدا کیا، تو وہ پھیل کر اور بڑی ہو گئی۔ اس کا وجود پورے گھر پر چھا گیا۔ تخیل کی سرحدوں کو چھو چھو کر سوکھی ماری زینب کتنی بلند ہو گئی تھی! میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے کو ڈھونڈتا تھا مگر میں تھا کہاں جو ملتا۔ میں تو زینب، بسنتو اور چھنکو کے گرانڈیل وجود تلے دب کر رہ گیا تھا۔ پھر ہر چیز بڑی ہوتی گئی۔ ہر چیز پھیلتی گئی۔ رات کی رانی کا پودا لمبا ہو ہو کر جھومنے لگا۔ دیوار پر ان سب کے دیو قامت سایے پھیل پھیل کر مجھے ڈرانے لگے۔ تب میں نے اپنے کمزور ہاتھ سے

سب کو ختم کر دیا۔ کندھوں کو زور سے جھٹکا۔ ہاتھ کے آخری سرے سے کوئی چیز ٹوٹ کر نیچے گری۔ شاید داہنا پنجہ تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے کندھے کے سہارے بانس کے برابر ہاتھ جھول رہا تھا عظیم اور مضبوط ہاتھ۔

میں اب اپنے کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں بس کبھی کبھی ساری رگیں پھولنے لگتی ہیں۔ ہاتھ میں خارش ہوتی ہے۔ اور منہ میں بہت سی رال بھر جاتی ہے۔ تب مجھے ذرا الجھن ہوتی ہے اور دل چاہتا ہے اس تھوک بھرے منہ کی پچکاری نرس کے گالوں پر چھوڑ دوں مجھے اس نرس سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ یہ روزانہ ہی ایک دوا دیتی ہے جس کو کھانے کے بعد میرے ہاتھ کی نسیں کھنچنی شروع ہوتی ہیں۔ نیچے سے پھیلتی ہیں اور اوپر سے سکڑتی ہیں۔ پورے جسم میں سوئیاں سی چبھتی ہیں جیسے کوئی ڈنک مار رہا ہو۔ ایسی بے چینی اور گھبراہٹ ہوتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ داہنے بازو کو کاٹ کر پھینک دوں۔ اگر میرا ہاتھ عام آدمیوں جیسا مرگلا ہاتھ ہوتا تو میں کبھی کا اس کو اپنے جسم سے الگ کر کے پھینک دیتا۔ مگر یہ تو عظیم ہاتھ ہے۔ بے گناہ ہاتھ جس نے ہند ویاتریوں ——— اور تم رحیم بھائی کہہ رہے ہو کہ ہاتھ کے آخری سرے پر جہاں بچھو سے چبھتے ہیں اور پلاسٹر کے اندر رچا ہوا نظر آ رہے ہیں وہ انگلیاں ہیں۔

اس وقت بہت اندھیرا ہے کوئی چیز نظر نہیں آ رہی ہے۔ ورنہ میں دیکھتا کہ یہ ابھری ابھری چیز کیا ہے؟ اس اندھیرے میں تو مجھے اپنا لمبا اور مضبوط ہاتھ۔ زرد اور کمزور سا دکھائی دے رہا ہے۔ دو بجے کی ڈیوٹی پر نرس آئے گی۔ بجلی کا سوئچ دبا کر باری باری ہم سب کو دوا دے گی۔ اس وقت میں کمرے کی دیوار پر ہاتھ کی پرچھائیاں بناؤں گا۔ بچپن میں ہم ہاتھ کی انگلیوں سے دیوار پر ہاتھی گھوڑے بنایا کرتے تھے اب تو یہ لمبا تڑنگا ہاتھ اس قدر وزنی ہے کہ بستر سے اٹھایا بھی نہیں جا سکتا۔ کل میرے ہاتھ کا پلاسٹر کھل جائے گا۔ زخم گہرا نہیں ہے۔

اب نمبر تین کی بتی روشن ہے میرے سامنے والی دیوار پر دھیمی دھیمی روشنی پڑ رہی ہے۔ یہ روشنی بالکل ٹھیک ہے۔ میں دیوار پر ہاتھی گھوڑے بنا کر اندازہ لگا سکتا ہوں۔ پھر نرس آ جائے گی اور گولی کھانے کے بعد تشنج شروع ہو جائے گا۔ یہ۔ اس طرف ——— بالکل میرے سامنے والی دیوار پر کیا چیز ابھر رہی ہے؟ شاید انگلیوں کے ابھار ہیں۔ اور یہ اب دیوار پر کیسے ہاتھی گھوڑے ایسے پھدک رہے ہیں۔ ایک، دو اور تین اور یہ چار اور یہ انگوٹھا ——— یہ کیا؟ یہ سب سے الگ تھلگ ——— یہ انگوٹھا ہی تو ہے۔ نرس نے سخت پلاسٹر کے اندر جکڑ کر میرے ہاتھ کا حلیہ ہی بدل ڈالا۔ اس وقت مرا لمبا اور توانا قوی ہاتھ مرے ہوئے چوہے کی طرح زرد اور کمزور دکھائی دے رہا ہے۔ میں اب ایک مرتبہ پھر زینب کا گلا گھونٹ سکتا ہوں۔ رات کی رانی کا پودا اکھیڑ سکتا ہوں اور نرس کی ٹھوڑی کے نیچے چمکتے ہوئے تل کو چوم سکتا ہوں۔

تب میں اندھیرے میں اپنے بستر سے اٹھا۔ ٹٹول ٹٹول کر جوتے تلاش کئے اور نمبر تین میں گھستا چلا گیا۔ خوبصورت چوٹی والی لڑکی کے سرہانے زینب کھڑی تھی۔ اس کا لمبا چوڑا سایہ کمرے کی دیوار پر پھیلا ہوا تھا۔ میں پھر چھپنے لگا۔ تب اس نے ٹکٹکی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بھینچے ہوئے لب کھولے ہی تھے کہ میں نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبا دیا اور پھر ٹھوڑی کے درمیان چمکتے ہوئے تل کو چوما۔ زینب چیخی، خوبصورت چوٹی والی لڑکی چیخی۔ اور پھر سب ہی اٹھ گئے۔ حواس باختہ سے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ میں تیزی سے کمرے سے نکلا۔ اور دروازے کے ساتھ لگا ہوا رات کی رانی کا پودا اکھیڑتا ہوا، کانٹوں والی باڑھ کو پھلانگ کر سڑک پر نکل آیا ہوں۔

لڑکے لکڑ بھگا لکڑ بھگا کہہ کر چلا رہے ہیں اور میں رات کی رانی کا پودا لئے کھڑا ہوں۔ زینب اور بسنتو کی قبر پہلے ہی خود رو درختوں اور کینر کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اور میں ہاتھ میں گناہ کا بوجھ اٹھائے کھڑا ہوں۔

حمیدہ رضوی

ایک پل

یونائیٹڈ بینک سیالکوٹ میں جب وہ کئی ہزار کی رقم دفاعی فنڈ میں جمع کرا کے تھکے تھکے قدموں سے اقبال چوک کے قریب پہنچی تو اسے ایک دم یاد آیا کہ جاوید بھیا پٹرول پمپ کے قریب چونڈا جانے کے لئے اس کے منتظر ہوں گے۔ فائر بندی ہوئے آج صرف تین دن ہوئے تھے اور وہ آج پورے چار دن بعد گھر سے نکلی تھی اور خود کو جسمانی طور پر ہی نہیں، ذہنی طور پر ایک دم مصروف رکھے ہوئے تھی۔ رقم بینک میں جمع کرنے کے بعد جب ذہن کو کچھ سکون ملا تو جیسے نئے سرے سے اس کے گرد لامحدود تھکن کی دھند چھانے لگی اور اسے لگا کہ اگر وہ ذرا بھی غافل ہوئی تو اس دھند میں خود کو ہمیشہ کے لئے گم کر دے گی — اونہہ ابھی یوں تو نہ ہونا چاہیے، اس نے عجیب سے کرب سے خود کو سمجھایا اور پٹرول پمپ کے قریب پہنچی تو اس کے قدم متوازن تھے۔ — جاوید اور زہرہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ یقیناً ڈسکہ کیمپ سے ابھی نہیں لوٹے ہوں گے — اس نے سامنے ایک سیاسی رہنما کے دفتر کے سامنے جمع ستم رسیدہ اور بے گھر لوگوں کے ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا — یہ لوگ یہاں گرم کپڑوں اور لحافوں کے لئے آئے ہوئے تھے۔ بچے، بوڑھے، جوان سبھی شرمندہ سے نظر آتے تھے حالانکہ یہ قطعی شرمندہ ہونے کی بات نہیں تھی — اس نے ریلوے روڈ پر دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے سوچا — پٹرول پمپ کے ساتھ ریلوے اسٹیشن تک پھیلی ہوئی اس دیوار پر دشمن کے لیڈروں کے کارٹون بنانے میں خاصی فنکارانہ ذہانت برتی گئی تھی — ان کارٹونوں کے قریب دس گیارہ سال کے تین چار بچے کھڑے بین الاقوامی سیاست اور مسئلہ کشمیر پر بحث کر رہے تھے — پاکستان پر یہ حملہ کیا نہیں گیا ہے کرایا گیا ہے — حملہ کرانے والا ایشیا میں اپنا اڈہ قائم کرنا چاہتا ہے — جو بھی بغاوتیں ہوتی ہیں ان میں اسی ملک کا ہاتھ ہوتا ہے — قاہرہ میں ہمارے مسافر جہاز کی تباہی میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ اس کا اور اس کے ایجنٹوں کا — یہ آخری تبصرہ سن کر اس کے خشک ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی — یہ بچے بھی بعض وقت کیسی پتے کی بات کہتے ہیں۔ پھر وہ بچے — ہوٹل کے قریب رکنے والی ایک جیپ میں بیٹھے فوجی افسروں سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگے — ریلوے روڈ پر آج اٹھارہ دن سے مسلسل فوجی جیپیں اور ٹرک دوڑ رہے تھے اور سول ٹریفک جان بوجھ کر کم کر دی گئی تھی۔ بھارتی حملے کے بعد آج پہلی بار یہاں جیپوں کے ساتھ کاریں اور بسیں بھی دوڑ رہی تھیں — بسیں ابھی تک مٹی میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ پھر بھیا اپنی صابن دانی جیسی کار لے کر آ گئے۔

"بھئی جاوید بھیا یہ ناظم بھیا کو ضروری کام تھا۔ انھوں نے ہمیں روک لیا کہ ساتھ چلیں گے اس لئے دیر ہو گئی" — زہرہ نے معذرت کی۔

"ہاں بھئی افسوس ہے دیر ہو گئی — اچھا تم لوگ جاؤ، میں تو چلا" — ناظم بھیا دی گریٹ — خدا حافظ کہہ کر سڑک پار کر کے بھارتی حملے سے متاثرہ بے گھر لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو گئے

جاوید بھیا بولے "ٹھہرو تیل ویل چیک کر لیں"

اور رحیلہ کے چہرے پر ایک دم اکٹھی بہت سی زردی چھا گئی ——— اف! آج ہم پھر چونڈے جا رہے ہیں اکیس دنوں بعد ——— معمول کے خلاف اب کے یہ چکر ذرا جلد لگ رہا ہے ——— مگر ——— کیا کچھ نہیں ہو گیا ان اکیس دنوں میں! ——— یہ اکیس دن صرف اکیس دن ہی نہیں ہیں ——— یہ تو اکیس صدیاں معلوم ہوتی ہیں۔ صدیاں جن میں تجربوں کا نچوڑ سمٹ آتا ہے ——— ساری بات تو بس ایک پل کی ہوتی ہے جس میں کوئی واردات رونما ہو ——— وارداتیں جو انقلاب کو جنم دیتی ہیں اور انقلابات جو قوم کی تاریخ بناتے ہیں ——— اور یہ پل تو ایسا تھا کہ فرد کے ساتھ قوم اور قوم کے ساتھ فرد کی زندگی میں ایک واردات رونما ہوئی ——— مگر وقت کی اس اکائی میں واقعات کے ظہور کے اثرات ہر انسان پر مختلف ہوتے ہیں جبھی تو وہی ایک پل جو ایک انسان کے لئے مسرت بخش ثابت ہوتا ہے، دوسرے فرد کے لئے دکھ اور زخم لاتا ہے ——— لمحہ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر ایک بمباری کر رہا ہوتا ہے اور دوسرے پر بمباری ہو رہی ہوتی ہے ——— افوہ بھئی ہٹاؤ، یہ میں پہلے تو ایسے نہیں سوچا کرتی تھی۔

کار سیالکوٹ پسرور روڈ پر دوڑ رہی تھی ——— اس سڑک پر آج سے چھ سات مہینے پہلے وہ اپنی دونوں چچازاد بہنوں زہرہ اور عذرا کے ساتھ پھوپی اماں کے کمزور ترین بچیا سے ملنے چونڈا جا رہی تھی تو کار رک گئی تھی۔ پٹرول ختم ہو گیا۔ ڈوبتے سورج کی زرد دھوپ میں پسرور روڈ کی طرف سے آتی ہوئی ایک کار کو انھوں نے روکا تھا ——— کار میں کیپٹن فاروق تھا جو نارووال سے آ رہا تھا ——— وہ ان کے رکنے پر بےحد جھلایا تھا ——— پھر وہ دیر تک ان کے ایڈونچر کے شوق پر انھیں ڈانٹ پلاتا رہا تھا اور رحیلہ جو کسی سے مرعوب اور متاثر ہونا جانتی ہی نہ تھی، اس کے سامنے خاموش سی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی ہی کوئی بات تھی کہ آدمی دیکھے اور سوچتا رہ جائے۔ کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، ذرا زیادہ ہی لمبی ناک کے باوجود وجاہت کا ایک ہالہ تھا ——— ساڑھے پانچ سے کچھ نکلتا ہوا قد اور متناسب جسم پر فوجی وردی خوب سج رہی تھی ——— خیر یہ عام سی باتیں تھیں مگر اس میں ایک خاص بات تھی اور وہ تھی اس کی آنکھوں کی بےپناہ اثر کرنے والی چمک اور ترشے ہوئے خوبصورت ہونٹوں کا عجیب سا پرغرور انداز ——— اس کے اوپر والے ہونٹ کا بایاں گوشہ ذرا سا اٹھا ہوا تھا جس سے اس کے سارے چہرے پر عزم، قوت ارادی اور خود اعتمادی کا اظہار ہوتا، ساری دنیا کو ہیچ سمجھنے اور پاؤں تلے روند ڈالنے کا سا انداز ——— اور پھر گفتگو میں بھی وہی سنجیدگی جس میں سختی اور غرور کی ہلکی جھلک تھی۔ چنانچہ رحیلہ نے اس کے سامنے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی تھی اور وہ تھا کہ اسی کو مخاطب کر کے چلا رہا تھا۔ اور پھر اس کی ایک ایک بات پر عذرا کی بےساختہ ہنسی! رحیلہ اس دن بہت بیزار رہی تھی مگر آج وہ سب کتنا اچھا لگ رہا تھا ——— کاش وہ وقت کو لوٹا سکتی ——— ہاں! اور پھر اس نے بلاوجہ حجت کر کے اتنی دیر کر ڈالی کہ سورج ڈوب گیا ——— اور بارہ تاریخ کے چاند کی روشنی دور تک پھیلے ہوئے گیہوں کے کھیتوں اور ببول کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں وہ سڑک بڑی عجیب لگ رہی تھی اور خوف سے سب کی جان سوکھ رہی تھی ——— یکایک رحیلہ کے ابو کا نام سن کر وہ جیسے فوراً ہی انھیں چونڈا پہنچانے پر راضی ہو گیا تھا۔ پھر وہاں پہنچا بھی دیا تھا اور کار کے اس سانحے کی اطلاع دینے کے لئے واپس اس کا واقعہ بھی ابو جان کو پہنچ دیا تھا ——— اور اس رات رحیلہ نے اسی کے قلم سے اپنے ابو جان کو رقعہ لکھا تھا اور وہ رقعہ لے کر کچھ اس تیزی سے مڑا تھا کہ وہ حیران کھڑی رہ گئی تھی اور دیر تک اس کے قدموں کی چاپ ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ سنائی دیتی رہی تھی ——— وہ قلم اس کے پاس تھا۔ وہ اس دوران میں ایک دو بار آیا بھی مگر اس نے اپنے قلم کا تذکرہ نہیں کیا۔

پسرور روڈ پر کار سے اترتے ہوئے وہ اس کے لئے ایک دم اجنبی تھا ——— دوسرے تیسرے دن چونڈے سے واپسی پر امی اور ابو سے معلوم ہوا تھا کہ وہ کیپٹن فاروق کچھ نسب تقسیم کے بعد ان کا بھانجا نکلا۔ اس کی امی یعنی امی کی کزن کی وفات کے بعد بارہ سال سے امی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ شروع سے راولپنڈی میں اپنے والد کے ساتھ رہا ——— اور ایڈونچرس گروپ کی رحیلہ بیگم نے فرح کے لفظوں میں

جونک رکیپٹن فاروق کے بارے میں ڈھیروں ہی سوچ ڈالا ــــ مگر یہ کوئی ایسی سیریس بات تو نہ تھی ــ!

چنانچہ یہ وہی سڑک ہے ــــ اس نے کار سے باہر کی طرف دیکھا ــــ جگہ جگہ بمباری سے درخت ٹوٹ کر بکھرے پڑے تھے۔ ہر طرف مٹی کے ڈھیر تھے اور بڑے بڑے گڑھے تھے اور چار سو خاموشی اور ویرانی مسلط تھی۔ سرسبز کھیتوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ کار کے آگے جانے کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔ اس لیے جاوید نے کار وہیں روک دی اور وہ دونوں بھی ان کے ساتھ باہر آ گئیں۔ محاذ یہاں سے صرف چند میل پر تھا۔ اور جنگ بھی رک گئی تھی مگر ــــ مکئی، دھان، ماش اور کپاس کے کھیت ٹینکوں تلے کچلے گئے تھے خصوصاً گنے کے کھیتوں میں دشمن نے واپس ہوتے ہوئے بہت تباہی مچائی تھی ــ توپ کے گولوں سے میلوں تک کے درخت کٹے پڑے تھے۔ ام، ودکیلے اور مالٹے کے درختوں کو تو جیسے باقاعدہ چھیل ڈالا گیا تھا۔ شیشم، کیکر، دھریک اور جامن کے تناور، چھتنار درختوں کی شاخیں ٹوٹ کر لٹک رہی تھیں ــــ ارے یہی وہ بارونق قصبہ ہے جہاں اناج کی اتنی بڑی منڈی تھی اور دوکانیں تھیں اور ہائی اسکول تھے اور جہاں کے لڑکے اور لڑکیاں، سیکڑوں کی تعداد میں سیالکوٹ کے کالجوں اور پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور جہاں بلند و بالا پختہ مکانات تھے جو اب چھلنی پڑے تھے ــــ گلیوں میں اکا دکا لوگ بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح گھوم رہے تھے ــــ عجیب ہُو کا عالم تھا ــــ میدان میں جگہ جگہ بموں اور توپوں کے گولوں کے خول، بندوقوں کے کندے اور نالیں، دشمن کے جہازوں کے ڈھانچے، اس کے تباہ شدہ ٹینک اور اس کے پھینکے ہوئے راکٹوں کے خول بکھرے پڑے تھے اور ان پر سنہ باسٹھ کی امریکن مہریں لگی ہوئی تھیں اور یہی وہی میدان ہے جہاں دشمن کی ان گنت لاشوں کو دیکھ کر خود ہمارے فوجی افسروں کو ترس آ گیا تھا کہ آخر بیٹھے بٹھائے انھیں کیا سوجھی کہ پاکستان پر چل پڑے اور تقدیر انھیں اس سرزمین میں سو مربع میل تک کھینچ لائی ــــ محاذ کی سمت بدبوؤں کا ہجوم تھا اور تعفن کے مارے ماحول میں بے پناہ حبس ہو رہا تھا۔

چل چل کر رحیلہ کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ وہ بھارت کے ہاتھی کے نشان والے ایک تباہ شدہ ٹینک کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی ــــ "جاوید بھیا، آپ سارے محاذ کا چکر کاٹ کر اور پھوپی جان کے مکان وغیرہ دیکھ کر آ جائیے ہم جب تک سستا لیں" ــــ جاوید چلا گیا تو وہ خاموشی سے تباہ شدہ ٹینک کا جائزہ لینے لگیں۔ پھر جب انھوں نے ٹینک کے اندر جھانکا تو حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ اس حصے میں جہاں ٹینک کے عملے کے بیٹھنے کی جگہ تھی، انھیں چوڑے کی ایک پن، گلابی رنگ کا ایک زنانہ رومال زرد رنگ کا ایک دوپٹہ، اسٹیل ہیل کی زنانہ چپل، ایک سگریٹ کیس۔ کھوپڑی کی کھال کے ساتھ لگے ہوئے بال اور سوکھا ہوا خون دکھائی دیا ــــ اور تینوں چہروں پر شدید کرب لیے ہوئے اتر آئیں

رحیلہ بمباری سے گرے ہوئے شیشم کے درخت کی ایک شاخ پر بیٹھ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے پوری دنیا کا ماتم کرنے کے لیے اسے زندہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے خیال کے ویرانوں میں یادوں کے جھکڑ چلنے لگے۔

اس دن ستمبر کی چوتھی تھی بارہ بجے دوا ایم لے سوشیالوجی میں داخلہ لینے کے لیے معلومات حاصل کر کے سیالکوٹ واپس آئی تھی تو عذرا اور زہرہ جو عذرا کی نسرین باجی کی منگنی میں شرکت کے لیے جانے والی تھیں۔ سارا گھر جا چکا تھا صرف وہ دونوں اس کی منتظر تھیں ــ زہرہ نے جو ضلع بھر میں ایف ایس سی میں ٹاپ کیا تھا تو اس کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ ناظم بھیا خصوصیت سے اپنی ننھی سی کار اس کے لیے چھوڑ جایا کرتے، وہ تھی بھی تو بھیا کی چہیتی۔ ایڈونچر کا تو خیر تینوں کو خبط تھا چنانچہ یہ نادر موقع تھا کہ زہرہ اپنی کار ڈرائیوری کا کمال دکھائے۔ ٹرین سے جانے میں کوئی ایڈونچر نہ تھا ــ اس دن رحیلہ اور عذرا کا یہ پروگرام بھی تھا کہ پہلی بار

ساڑھیاں باندھیں گی۔ تب عذرا نے گلابی ساڑھی باندھی اور مسکرائی۔ اس کے گلابی گالوں پہ ننھے ننھے گڑھے ناچنے لگے۔ "ارے رحیلہ بجیا، کل صبح انور بھائی آئے تھے۔ فوجی وردی میں بڑے جچ رہے تھے۔ ان کا ٹرانسفر راولپنڈی سے سیالکوٹ ہو گیا ہے" زہرہ نے اپنی ٹائٹ شرٹ درست کرتے ہوئے بتایا ـــ چنانچہ رحیلہ کو عذرا کی خوشی کا راز مل گیا تھا ـــ انور جمال عذرا کا خالہ زاد بھائی تھا جسے وہ اس وقت سے چاہتی تھی جب اسے شعور بھی تھا کہ اسے چاہتی ہے۔ دو سال قبل اس کی عذرا سے منگنی ہوئی تھی اور اکتوبر میں ان کی شادی ہونے والی تھی۔ عذرا نے اسی سال رحیلہ کے ساتھ بی اے کیا تھا اور اس کا ایم اے کرنے کا قطعی کوئی موڈ نہ تھا۔ وہ بڑی ذہین، وہ پڑھائی میں بڑی تیز تھی۔ ڈرامہ کی اداکاری اور ستار بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ رحیلہ اور عذرا کی محبت ضرب المثل بن گئی تھی۔ انھوں نے ہر پروگرام ہمیشہ اکٹھا طے کیا۔ امتحان کی تیاری کے لیے چھٹیوں میں چونیاں چلی جاتیں۔ رحیلہ کیلے کے درختوں میں قانونِ تقلیل حاصل اور مارکس اور ہیگل سے الجھتی رہتی اور عذرا کمرے سے منڈیر پہ بیٹھی انور جمال کو لمبے لمبے خط لکھا کرتی ـــ بحث کرنے میں بھی دونوں بہت تیز تھیں ـــ ناظم بھیا کو شاید اسی لئے ان سے کچھ امید تھی کہ ممکن ہے ان میں ذہانت کے جراثیم موجود ہوں ـــ ناظم بھیا دی گریٹ جب لاہور سے لوٹتے تو انھیں سوچ بچار، تفکر و تدبر، معاشرہ، قوم، فلاح اور ترقی اور جانے کاہے کاہے پر لیکچر دیا کرتے ـــ اور عذرا اپنے اس گریٹ بھیا کے چلے جانے پہ خیال آرائی کرتی ـــ "بھیا کے بہت بڑے جغناسدھارا آدمی بن جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے ویسے ان کے کمیونسٹ ہونے کا قطعی امکان نہیں مگر ـــ شاید وہ کوئی ولی یا درویش ہو جائیں ـــ پھر انسانیت کے محسنوں میں بھیا کا نام آ گیا تو ہمیں مجبوراً کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا ورنہ تم جانو ہم زبانی بحث کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی ـــ ویسے بھیا جانے کیوں اس قدر غضب کے قابل اور انسانیت پرست ہوتے چلے جا رہے ہیں جبھی تو زبیدہ باجی بھی ان سے بحث کرتے کتراتی ہیں۔"

"اور ہاں یاد زبیدہ باجی دی گریٹ اگلی بار صوبائی اسمبلی کے لئے کھڑی ہو رہی ہیں۔" عذرا نے کار میں بیٹھتے ہوئے انکشاف کیا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے زہرہ نے کہا: "آپ دونوں کیرولین کی گلابی اور جامنی ساڑھی میں رحیلہ سلیمان اور عذرا افتخار کے بجائے بیگمات لگ رہی ہیں؟" اور پھر اس نے سیٹی بجاتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی تھی۔

"کیا لوفروں کی سی سیٹی بجاتی ہو" ـــ عذرا نے اسے ڈانٹ بتائی۔ اسے زہرہ کی لڑکوں جیسی حرکتوں پر سخت تاؤ آتا تھا۔

"آہا تو اب آپ بیگمات کی طرح "بی ہیو" بھی کریں گی" ـــ زہرہ نے ایک آنکھ بند کرکے سامنے والے آئینے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور عذرا نے چڑ کر بین الاقوامی سیاست پر بات شروع کر دی جس سے زہرہ کو کوئی دلچسپی تھی۔

"رحیلہ بجیا! کیپٹن فاروق بھی کل آئے تھے وہ انور بھائی کے دوست ہیں اور انھیں کی رجمنٹ میں ہیں۔ ایٹ پنجاب رجمنٹ"

زہرہ نے اپنے وجود کا احساس دلایا۔ اور رحیلہ کا دل دھڑک اٹھا۔

اور یہ اچھا ہوا کہ اسی لمحہ کار ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور عذرا نے زہرہ کو ڈانٹ بتائی ـــ "ارے تمہیں ساری عمر کار چلانا نہیں آئے گا۔"

اور زہرہ بولی: "میرا کیا قصور ہے۔ ادھر کیپٹن فاروق کا نام آیا ادھر کار نے انکار کر دیا۔"

زہرہ اتر کر کار کے انجن پر جھک گئی اور وہ دونوں ارد گرد کا جائزہ لینے لگیں۔ سرسبز کھیتوں میں ہوا سرسرا رہی تھی۔ شام کو زرد دھوپ کے سائے لمبے لمبے تھے اور سیالکوٹ پسرور روڈ پر بڑی ہی دقت تھا ـــ رحیلہ نے ارد گرد دیکھتے ہوئے اداسی سے سوچا ـــ یہی وقت تھا ـــ اس شام عذرا نے میری تصویریں کھینچی تھیں دھان کے کھیتوں میں۔ وہ دونوں سڑک کی داہنی سمت کی پگڈنڈی پہ اتر گئی تھیں۔ پگڈنڈی کے پار

میدان کے قریب ایک تالاب تھا جس میں بھینس نہا رہی تھی۔ تالاب کے بائیں کنارے پر جامن اور آم کے درختوں کی جھنڈ میں پندرہ سولہ برس کا ایک لڑکا آنکھیں بند کیے گیان دھیان کے انداز میں بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ جامن کے درخت کے نیچے چھوٹے چھوٹے دیہاتی بچے جامنیں جمع کر رہے تھے۔ پھر سب اپنا اپنا کام چھوڑ کر حیرت سے انھیں تکنے لگے تھے۔ سر پر اُپلوں کا ٹوکرا اُٹھائے ایک عورت نے بھی ٹھٹھک کر انھیں دیکھا تھا اور عذرا نے ان سب پیارے لوگوں اور پیارے مناظر کی تصاویر لی تھیں، واپسی پر انجن پر جھکی زہرہ کی بھی تصویر لی تھی۔۔۔ اور پھر رحیلہ نے عذرا کی ایک تصویر کھینچی تھی جس میں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ تصویر میں اس کے گالوں کے گڑھے بھی ضرور آئے ہوں گے۔۔۔ اور جب دور اُفق لالہ رنگ ہو گئے تھے اور شام کا سرمئی آنچل پھیل رہا تھا تو بمشکل زہرہ کار ٹھیک کر کے چلا سکی تھی اور جب وہ پھوپی اماں کے گھر کے قریب پہنچی تھیں تو شروع تاریخوں کا چاند سرمئی آسمان پر مسکرا رہا تھا اور پھر وہ درختوں کے سایوں کا نیم تاریک ماحول۔

رحیلہ تیزی سے گھر میں داخل ہو گئی۔۔۔ سب ان کے لیے پریشان تھے۔ انھوں نے بمشکل انھیں مطمئن کیا اور بڑے سے آنگن میں بھری عورتوں کے جمگھٹ کو پار کر کے جلدی سے نسرین بجیا کے کمرے میں گھس گئیں۔ نسرین بجیا جنھوں نے فرسٹ ڈویژن میں ایم۔ اے کیا اور جو لاہور میں لیکچرر تھیں مگر جن کے والدین جونڈا میں رہتے تھے اور ان کے ڈبل ایم۔ اے منگیتر کے گھر والے اس قصبے کے بی۔ ڈی ممبر کی لڑکی کو منگنی کی انگوٹھی پہنانے اس لمبے چوڑے پختہ حویلی نما مکان میں آئے ہوئے تھے۔۔۔ اور نسرین بجیا جو منگنی کا جوڑا اور زیورات پہنے بہت جچ رہی تھیں اور خالص روایتی لڑکیوں کے انداز میں سمٹی سمٹائی لجائی سی بیٹھی اسے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ان کی زبردست انٹلکچوئل سہیلی زبیدہ رشید ایم اے فلسفہ، ایم اے انگریزی، سفید بنارسی ساڑھی اور کالے بروکیڈ کے بلاوز میں کھِل رہی تھیں۔ وہاں پر جو کپڑوں اور سلائی اور زیوروں کے اسٹائل اور جہیزوں کی بیکار بحث چھڑی تو رات کے کھانے تک جاری رہی اور رحیلہ یہ حسرت لیے ہی سو گئی کہ اسے زبیدہ باجی سے مادھا کرشنن کے سرینگر میں دیے گئے تازہ بیانات پر تبصرہ کے لیے کہے۔

یہ زبیدہ باجی اسے پہلی بار "کل پاکستان یونین طالبات" کے اجتماع میں نسرین بجیا کے ساتھ ملی تھیں۔۔۔ وہ ان دنوں ایم۔ اے فلسفہ کرنے کے بعد ایم۔ اے انگریزی کر رہی تھیں۔۔۔ "یہ واقعی شاعرہ ہیں"۔۔۔ وہ سندھ کی فہمیدہ ریاض کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔۔۔ "تو کیا غیر حقیقی شاعرات کی بھی کوئی قسم ہوتی ہے"۔۔۔ عذرا نے دیدے گھما کر پوچھا۔۔۔ "یہاں سب چلتا ہے"۔۔۔ انھوں نے چائے کی پیالی میں نفاست سے شکر گھولتے ہوئے کہا۔۔۔ "مقابلے میں شرکت کرنے والی اکثر شاعرات کی شاعری مانگے تانگے کی ہوتی ہے۔۔۔" "ارے کون یہ دل گردے کا شخص انھیں لکھ کر دیتا ہے۔ میں تو اپنی اس غزل کا ایک مصرع بھی کسی کو پڑھنے کی اجازت نہ دوں جو میں پچھلے چار سالوں سے موزوں کر رہی ہوں اور جس کے اگلے چار سالوں میں بھی مکمل ہو جانے کا امکان نہیں" عذرا نے بڑی لاپروائی سے کہا اور قریب کھڑی لڑکیاں ہنس پڑیں۔۔۔ زبیدہ باجی نے تعریفی نظروں سے عذرا کو دیکھا۔۔۔ پھر نسرین بجیا نے تعارف کرایا تھا کہ رحیلہ اور عذرا میری ماموں زاد بہنیں ہیں، بہت ذہین ہیں، اور یہاں انھوں نے مضمون نویسی اور مشاعرے میں انعام لیا ہے اور یہ کہ سیالکوٹ سے آئی ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔

زبیدہ باجی نے پنڈی گورنمنٹ کالج کی نجمہ محمود کی بھی تعریف کی کہ یہ افسانہ نگار بن جائیں گی۔۔۔ انھوں نے یونیورسٹی اسکینڈل کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ یہ شاعر لڑکے بڑے چھچھورے ہوتے ہیں۔ بس ذرا کسی لڑکی پر مر مٹے اور اسے شاعرہ بنا دیا اور وہ بھی دوسروں کی لکھی غزلیں سر نکال نکال کر پڑھتی ہیں۔ سخت بور شاعر ہیں یہ لوگ۔۔۔ زبیدہ باجی کو تو سرے سے ہی مردوں سے نفرت تھی۔ ان میں انھیں دنیا بھر کے عیب نظر آتے۔۔۔ اس رات لاہور کالج کے ہوسٹل میں نسرین بجیا نے بتایا تھا کہ زبیدہ باجی بچپن سے اپنی خالہ کے پاس لکھنؤ رہی تھیں۔ گو کہ ان کے والدین

آزادی سے قبل ہی اِدھر آ کر کاروبار کر لیے تھے۔ اُنھوں نے آئی ٹی کالج سے بی اے کیا ہے۔ صرف چند سال قبل یہاں آگئی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے فلسفہ کیا ہے اور اب میرے ساتھ ایم لے انگریزی کر رہی ہیں۔ ویدانتی فلسفہ پر انھیں عبور حاصل ہے۔ مغربی فلسفے میں انھیں برگساں اور شوپنہاور اور کچھ کچھ نطشے پسند ہیں۔ بے حد قابل ہیں۔ لڑکے لڑکیاں حتیٰ کہ پروفیسر تک ان سے مرعوب ہیں کسی کو لفٹ نہیں دیتی ہیں۔۔۔ ڈھیروں ڈھیر لڑکے ان پر مرتے ہیں، موسیقی اور شاعری کو، خاص کر رومانی شاعری کو بورژوا ذہنیت کی تخلیق قرار دیتی ہیں اور بہت بڑے سرمایہ دار کی صاحبزادی ہیں ۔۔۔ ویسے کسی کی مشکل ہی تعریف کرتی ہیں۔ مگر ناظم بھیا کی لیاقت کا اعتراف کرتی ہیں اور یہ معلوم کر کے کہ رحیلہ اور عذرا ایف۔اے کی طالبات ہیں ان کی بھی حوصلہ افزائی کی تھی ۔۔۔ کندن کی سی رنگت والی سوپر اٹیلیکچوئیل زبیدہ آپا اسے بڑی انٹ لیلوی سی چیز نظر آئیں خاص کر اس لئے کہ وہ کنٹو بٹ فی اے کر کے آئی تھیں ۔۔۔ اسے ان کی باتیں بھلی بھی لگیں مگر رحیلہ کو ان کے ہندی لہجے میں انگریزی بولنے کا اسٹائل ذرا اچھا نہیں لگا۔

وہ تو بلا کی قابل ہیں مگر ناظم بھیا کا خیال ہے کہ وہ کنوئیں کی مینڈک ہیں جنھیں ہندو فلسفہ، ویدانت کے سوا کہیں کوئی خوبی نظر نہیں آتی ۔۔۔ اور یہ ناظم بھیا بھی خوب ہیں جنھوں نے بھارتی حملے کے درمیان عوامی فلاح و بہبود کی فکر میں ان کا چین اور راتوں کی نیند گنوائی اور کلبھ کے رہ کر کیمپوں میں کشمیری منیلبت زدگان کو سکون پہنچاتے رہتے۔ ان دنوں بھی وہ پنجاب یونیورسٹی میں اتنے ہی مخلص، پر خلوص اور مقبول تھے ۔۔۔ ایم۔اے سیاسیات کے بعد ناظم بھیا ان دنوں ایم۔اے سوشیالوجی کے فائنل میں تھے۔ چار سال سے ان کا اور زبیدہ باجی کا ساتھ تھا مگر سوائے رسمی بات چیت کے بھیا کو ان کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ انھیں بس اپنی ہی دھن تھی ۔۔۔ آل پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر یونین کے عہدے دار، بہترین مقرر اور جانے کیا کیا تھے ۔۔۔ سوئز پر اینگلو فرانسیسی حملے کے خلاف اُنھوں نے خوب مظاہرے کروائے تھے۔ طلبا کے وفد کے ساتھ مشرقی پاکستان اور پھر خیر سگالی، ورثقافتی وفد کے ساتھ مشرق وسطیٰ اور روس بھی گئے مگر ان کا فلسفہ حیات بڑا منفرد تھا اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم سے متنفر تھے مگر انہیں ساتھ ہی کمیونزم بھی بے معنی لگتا ۔۔۔ انھیں دنیا کے سارے ہی ازم سے چڑ تھی ۔۔۔ ترقی پسندوں کی شاعری بھی انھیں بے وقت کی راگنی لگتی جس میں عوام کے مصائب کی نفسیاتی، اور سماجی کشمکش اور معاشرتی انتشار پر حقیقت پسندانہ غور کئے بغیر غیر پسندیدہ نظام کو ان پر مسلط کر دینے کی آرزو ہے ۔۔۔ اشتراکیت پسندی بھی الٹرن پسندی یا رومانیت کی ایک صورت ہے ۔۔۔ جیسے سرمایہ پرستی۔ بھیا کو کامل یقین ہے کہ مذہب اسلام تمام مذاہب کے نامکمل احکامات کی تکمیل اور انسان کے بالغ ذہن کے مطابق ہر مسئلے کے حل کی قوت رکھتا ہے۔" اور اگر اپنی کم علمی اور کم ذوقی کے باعث آپ کو اپنے مذہب کی خوبیوں کا علم نہیں تو آپ اپنا مذہب تبدیل کر لیجئے زبیدہ محترمہ!" ایک دن بھیا نے زبیدہ باجی سے کہا تھا جب وہ ہندو فلسفہ کی خوبیاں بیان کر رہی تھیں "ہر علم کو اپنے ماحول میں سمجھئے۔"

"مگر اپنشدوں سے شوپن ہاور بھی متاثر ہے، کیا بغیر کسی خوبی کے؟" زبیدہ باجی نے چڑ کر پوچھا۔

"ارے گولی ماریئے شوپن ہاور کو، وہ تو خود مریضانہ رجحان کا ترجمان تھا، ویسا ہی آپ کا ویدانتی فلسفہ ہے جو نہ تو انسان کو غیر متوازن اور غیر منصفانہ طبقاتی بندشوں سے نجات دلا سکتا ہے ۔۔۔ نہ زندگی میں عزم و حوصلہ پیدا کر سکتا ہے۔ نہ آج کے معاشرتی انتشار کا حل پیش کر سکتا ہے۔ نہ ہی ارتقاء کے اس عمل میں معاون ہے جس کی طرف انسانیت گامزن ہے ۔۔۔ غور سے دیکھئے اس کا حل اسلام میں نظر آئے گا، کس قدر سائنٹفک ہے یہ مذہب ۔۔۔ اور جہاں تک آپ ہندو فلسفے اور معاشرت کی تعریف میں مگن ہیں تو اس معاشرت کی خوبیاں البیرونی سے پوچھ لیجئے، مگر بتائیے آپ کو کیا معلوم البیرونی کون ہے؟ ۔۔۔ اور جہاں تک ہندو فلسفے یا مغربی فلسفے کی خوبیوں کا تعلق ہے تو کسی مذہب یا فلسفے میں خوبیوں کا ہونا اس چیز کی دلیل نہیں کہ وہ آپ کے مذہب کی برائی ہیں۔ اور اسلام اس کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر بتائیے قرآن حکیم کے احکام میں کون سی برائی ہے؟ شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ نے کون سی بری باتیں کہی ہیں۔ اقبال نے

کونسا غلط راستہ بتایا ہے؟ — بھیا اُٹھ کر ٹہلنے لگے — ہم سب خاموش رہے — بھیا کی قابلیت کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ عربی، فارسی، فلسفہ، انگریزی ہر چیز پر انہیں عبور حاصل ہے۔ رحیلہ کو یاد آیا کہ اس رات بی۔ این۔ آر آڈیٹوریم سے باہر آتے ہوئے جب رحیلہ اور عذرا نے بھیا کو اپنے انعامات کے بارے میں بتایا تو جیسے انھوں نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

"ہونہہ — بیکار چیزوں میں انعام لیا ہے۔"

اے لیجیے یہاں تو کل پاکستان ذہین مقابلے میں انگریزی مضمون نویسی اور ستار میں انعام جیتا، اور آپ ہیں کہ اس کو لفٹ ہی نہیں دیتے، بیکار کہے دے رہے ہیں — اب ہم عمر خیام، ابنِ رشد، ابن خلدون، غزالی یا ملٹن تو ہونے سے رہے۔

بھیا عملی طور پر بے حد سادہ، پُرخلوص اور خوش اخلاق واقع ہوئے ہیں۔ وہ عذرا کی طرح ہنستے تو ان کے گالوں پہ بھی گڑھے پڑتے — مگر صنفِ نازک کے معاملے میں بھیا جمالیاتی حِس سے عاری ہیں — ان کے معیار کی ذہین لڑکی کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی اور بھیا کو یوں لڑکیوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی انہیں اپنے آئیڈیلز زیادہ عزیز تھے مگر ہم سب بہنوں کے بڑے پیارے بھائی ہیں — زبیدہ باجی بہرحال بڑے رکھ رکھاؤ کی لڑکی تھیں۔ اور نسرین باجی کی سہیلی تھیں۔ ان سے اکثر بحث مباحثہ چلتا رہتا۔ اکثر ہی مجلسیں جمتیں، اور گھنٹوں اردو ادب، انگریزی ادب، عالمی سیاست، خارجہ پالیسی، پاکستانی معاشرت وغیرہ وغیرہ پر سیالکوٹ والی کوٹھی میں بحثیں ہوتیں اور یہ سب سُن سُن کر عذرا کے اور میرے بھی ذہین ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے — ہمارے جاوید بھیا اور ناظم بھیا کے مرید تھے مگر انھوں نے زرعی یونیورسٹی لائلپور سے ایم۔ ایس سی کیا تھا۔ اور وہ ادبی مباحثوں میں کم حصہ لیتے — یوں دن گزرتے رہے — چنانچہ، ان دنوں زبیدہ باجی ملی تھیں پھر اکثر ملتیں۔ وہ رحیلہ کو بہت پیاری لگیں۔ ۴ ستمبر کی اس رات وہ زبیدہ باجی سے کوئی بحث نہ کر سکی۔ ناظم بھیا ویسے بھی موجود نہیں تھے۔ وہ شمالی افریقہ ایک غیر سرکاری وفد کے ساتھ جانے والے تھے، جہاں انھیں مسئلہ کشمیر کے بارے میں لوگوں کو صحیح حالات بتانا تھے — چنانچہ اس رات وہ بے مزہ ہو کر گیارہ بجے سو گئی تھی اور زندگی کے تپتے جزیروں پر ایک ایک پل ٹھٹھک کر گزر رہا تھا — اس رات کرگل اور دوہ حاجی پیر اور گجرات پر حملہ ہو چکا تھا اور رانی تمال اور کیپٹن فاروق کی چھٹیاں منسوخ ہو چکی تھیں اور انھیں ہیڈ کوارٹر میں حاضر ہونے کا حکم ملا تھا — یہ زہرہ نے بتایا تھا۔

(۳)

یہ امر واقعہ ہے — اس نے لیٹے ہوئے درخت سے ایک ٹہنی توڑتے ہوئے سوچا — کہ اس چار ستمبر کا سفر زندگی میں کوئی انقلاب لانے والا ہے — یہ خیال اسے اس رات آیا تھا مگر اس نے اسے محض وہم قرار دیا تھا — چنانچہ یہ خیال غلط نہیں تھا — اس کی آنکھ تین بجے سے کچھ پہلے ہی یوں کھل گئی جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو — مگر وہاں تو کوئی بھی نہ تھا — رات کے سناٹے میں کبھی کبھی چوکیدار کی آواز اُبھرتی اور پھر ڈوب جاتی — سامنے بڑے سارے کیکر کے درخت سے ایک الو اُڑا اور چیختا ہوا گزر گیا — مدھم چاندنی میں ہر شے بڑی سوگوار نظر آ رہی تھی۔ رات کی رانی، گلاب، چنبیلی اور موتیے کے پھولوں کی خوشبو ہوا کے دوش پہ بکھر گئی تھی پھوپی جان کے لمبے سے آنگن میں جنوبی سمت لگے ہوئے امرود، انار، لوکاٹ اور آلوچے کے درخت عجیب طرح کے ہیولے معلوم ہو رہے تھے اور ایسے میں اس کی نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار عجیب سی اداسی محسوس کر رہی تھی — جیسے یہ خاموشی کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔

مگر میں اداس کیوں ہوں — کیا اس سڑک پر سفر اور اس شام کا واقعہ — مگر وہ واقعہ ہی کیا تھا؟ — یہ کیپٹن فاروق ہے کیا؟ — بھئی بڑا عجیب انسان ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بے حد اسمارٹ اور وجیہہ انسان ہے — اس کی آنکھیں — مگر یہ کیا بدتمیزی کہ خوبصورت

آنکھیں میری کمزوری ہو گئی ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہر کسی کی آنکھیں مجھے یاد آجائیں۔ اور اس کے ہونٹ۔۔۔ مشت اس نے جھینپ کر خود ہی بیوقوفوں کی طرح آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔۔۔ بات یہ ہے کہ ہم دونوں! کامپلیکس میں مبتلا کر دیا گیا ہے بلکہ ہم خود بھی مبتلا ہیں کہ ہیں کسی مرد کی تعریف کی اور جھینپ۔۔۔ اسے بھئی۔ اللہ کی خوبصورت تخلیق کی تعریف کرنے میں کیا برائی ہے مرد ہو یا عورت۔۔۔ اس نے بحثیا کے انداز میں دلیل پیش کی۔۔۔ کہ مصیبت یہ ہے کہ میرا آئیڈیل صرف خوبصورتی کا نہیں ہے۔ حقیقتاً اس کی شخصیت نے مجھے مرعوب کیا تھا جبھی تو میں اس کے سامنے نروس ہو گئی ورنہ پی ٹی وی ریکارڈ پہ کبھی کسی آدمی سے بات کرتے ہوئے نروس نہیں ہوئی اور یوں تو کئی خوبصورت مارے پھرتے ہیں چلو ہو گی شخصیت بھی ہو تو اب اس کے بارے میں سوچنے کا کیا تک۔۔۔ اس نے ایک ایسی انوکھی کیفیت دل میں محسوس کی کہ وہ اسے کوئی نام نہ دے سکی۔ عجیب مضحکہ خیز پوزیشن ہے۔ لیجئے کیا خوب؟۔۔۔ وہ صاحب نہ جانے اس سمے کہاں ہیں اور ہم اپنی نیند یہاں خراب کر رہے ہیں۔۔۔ جی ہاں اور دوسرے کو خبر بھی نہیں۔۔۔ مگر یہ تو اور اچھی بات ہے کہ دوسرے کو خبر نہیں ورنہ پرسنیلٹی الگ ڈاؤن ہو اور۔۔۔

پھر گھنٹے نے تین بجے کا اعلان کیا اور اسے یاد آیا کہ وہ نک چڑھے حضرت بھی اس وقت چوکیاں تشریف لے جا رہے ہوں گے۔۔۔ تو کیا پاکستانی فوجیں جوڑیاں پہنچنے ہی والی ہیں۔۔۔ اوہو! تو یہ بادل کی سی گرج جس سے زمین دہلتی سی محسوس ہو رہی ہے حقیقت میں جوڑیاں کے محاذ پر توپوں کی گرج ہے!۔۔۔ اس نے اس دھمک کو محسوس کرتے ہوئے سوچا۔۔۔ اور اگر یہ آواز قریب آجائے تو شاید ہم پاگل ہو جائیں حقیقت میں جو لوگ محاذ پر ہیں ان کا کمال ہے۔۔۔ مگر یہ جنگ تو ہو کر ہی تھی۔ بھارت نے حملہ کر کے اچھا ہی کیا۔ ہم تو منتظر تھے۔۔۔ اسے قرآن پاک کی آیت یاد آئی۔۔۔ "اے اہل ایمان، تمہارے پاس کیا جواز ہے کہ تم اللہ کی راہ میں لڑتے نہیں حالانکہ ایک قریہ کے بے بس مرد، عورتیں اور بچے اپنے رب کے سامنے فریاد کرتے ہیں کہ ہمیں ظلم سے نکال اور ہمارے لئے اپنی مدد سے کوئی دوست عطا کر اور ہمارے لئے اپنی بارگاہ سے کوئی مددگار بھیج"۔ (النساء) ۔۔۔ چنانچہ اس کا اطلاق وادی کشمیر کے مظلوم لوگوں پر ہوتا ہے۔۔۔ اور یہ جنگ ناگزیر ہے۔ اگر بھارت ظلم کے لئے لڑ رہا ہے تو ہم انصاف کے لئے کیوں نہ لڑیں۔۔۔ رحیلہ نے اطمینان سے کمبل اوڑھتے ہوئے سوچا۔۔۔ اس کا ذہن نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

صبح رحیلہ ٹرانسسٹر لئے برآمدے کے تخت پر بیٹھی خبریں سن رہی تھی۔۔۔ ندرا ایک ادبی رسالے کا تازہ شمارہ دیکھ رہی تھی۔ امی اور بچی جان واپس سیالکوٹ جانے کے لئے تیار ہو رہی تھیں کیونکہ دوسرے دن سوموار کو گرمیوں کی تعطیلات کے بعد اسکول کھلنے والے تھے۔۔۔ کونے میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھی ہوئی پھیری اماں کی کام کرنے والی عورت برتن مانجھ رہی تھی اور نسرین بجیا ناشتہ تیار کرنے میں چھپنی اماں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔۔۔ اور زبیدہ باجی کمرے میں ابھی تک سو رہی تھیں کہ جانے کیا ہوا۔۔۔ ناگاہ ساری فضا پر ایک عجیب دہشتناک آواز چھا گئی۔ تقریباً آٹھ جہاز فضا میں چند منٹ موجود رہے پھر عجیب و غریب انداز میں ایک دوسرے کا پیچھا کرتے رہے۔۔۔ پھر دو ایک دھماکے ہوئے کچھ لگ جہاز واپس مشرقی سمت چلے گئے اور فضا پر ازلی سناٹا پھر چھا گیا۔۔۔ یہ سب کچھ اس قدر جلد ہوا کہ کسی کو ہوش بھی نہیں رہا کہ کیا ہوا۔ سب کے چہرے پر زردی تھی پھر حیرانی چھائی اور پھر قہقہے بلند ہوئے۔۔۔ تو گویا یہ شانتی کے ماننے والوں نے فضائی حملہ کیا تھا جو کامیابی سے پسپا کر دیا گیا۔ آخر ان کی سمجھ میں بات آ ہی گئی۔۔۔ زبیدہ باجی بستر پر بیٹھی حیرانی سے آنکھیں مل رہی تھیں۔۔۔ یہ پہلی فضائی لڑائی تھی جو انہوں نے کیا سیالکوٹ کے باسیوں نے جب سے دنیا آباد ہے پہلی دفعہ دیکھی تھی۔۔۔ تو گویا بھارت لمبے پیمانے پر جنگ چاہتا ہے۔۔۔ شاید اس کا پسندیدہ میدان یہی ہے جس کا اس نے مئی میں ذکر کیا تھا۔

زبیدہ باجی کو بھی آج ہی جانا تھا اور اب وہ تیار ہو کر بیٹھی ناخنوں پر شیڈ لگا رہی تھیں۔۔۔ وہ اس وقت ہوائی حملے سے کچھ اپ سیٹ

نظر آ رہی تھیں۔ زبیدہ باجی سویٹ۔۔۔ عذرا نے پلنگ پر لیٹے لیٹے پرچہ ایک طرف رکھا اور ان کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "کیا خیال ہے تم رادھا کرشنن مہاراج کے بیان کے جو انھوں نے سرینگر میں دیا تھا۔۔۔ بچاؤ کا ایک ہی طریقہ ہے جس سے ڈر لگے، اس پر حملہ کر دو۔۔۔ (خواہ دور سے توڑنے کا خیال بھی نہ ہو) گویا کہ بھوک کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ بھوکے سے رہا سہا کھانا بھی چھین لو۔۔۔ بحث جیتنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کوئی داغ دو، نہ رہے گا وہ انسان نہ اپنی معقولیت کی دھونس جمائے گا۔۔۔ اور آپ۔ رادھا کرشنن کو برٹرنڈرسل اور سارتر کا ہم پلہ قرار دیتی ہیں۔۔۔ لاحول ولا۔۔۔ پتہ بھی ہے برٹرنڈرسل کے قول اور فعل یعنی علم اور عمل میں، اتنا بھی فرق نہیں جتنا پھول اور خوشبو میں، اور رادھا کرشنن کے فلسفے اور عمل میں اتنا بھی تعلق نہیں جتنا تیلی میں اور میر کی غزلوں میں۔۔۔ خدا جانے کون بے وال کے بوم رادھا کرشنن سے متاثر ہیں"۔۔۔ عذرا نے مسکرا کر کہا۔۔۔ اصل میں زبیدہ باجی ہندو فلسفہ پڑھ پڑھ کر ایسی چڑچڑی ہو گئی تھیں کہ عذرا کو خواہ مخواہ انہیں چھیڑنے کو دل چاہتا۔

"بھئی یہ لوگ رادھا کرشنن کے کیوں پیچھے پڑ گئی ہو۔۔۔ فلسفہ اور سیاست دو مختلف چیزیں ہیں۔ ورنہ مجھے ان دونوں کو گڈمڈ کرنا پسند نہیں مجھے رادھا کرشنن کی علمیت سے لگاؤ ہے۔"

"میرے خیال میں یہ فلسفہ اور سیاست کو دو مختلف چیزیں تصور کرتی ہیں وہ خود ہندوازم کے نقطۂ نظر سے۔۔۔ تبھی تو نہرو سے رادھا کرشنن تک سبھی کچھ اور کہتے کچھ رہتے۔۔۔ ڈیر سویٹ زبیدہ باجی۔۔۔ یہ آدمی اور اس کا فلسفہ دو ٹکے کا بھی نہیں جس فلسفے کا اس کا علمبردار خود ہی ناقابل عمل قرار دے دے۔۔۔ آپ جانتی ہیں نا کہ اسلام صرف اس لئے تھوڑے سال میں رائج ہو گیا کہ اس کا علمبردار ہر لحظہ عملی طور پر ثابت کرتا رہا۔۔۔ لو آپ کو کیا معلوم ہو گا؟۔۔۔ اور میں نے بات بھی خواہ مخواہ اتنے اونچے انسان کی شروع کر دی۔۔۔ آپ کسی بھی فلسفی کی مثال لے سکتی ہیں۔۔۔ مثلاً سارتر جسے انسان سے سچی ہمدردی ہے انسانی اقدار سے پیار ہے اور اس کے لئے وہ اپنے حاکموں سے بھی جھگڑ اٹھے۔۔۔ پر سارے بھارت میں ایک بھی ایسا انسان دو۔۔۔ نہیں نہیں میں جانتی ہوں" عذرا نے دوبارہ پرچہ اٹھا لیا مگر بولتی رہی "سبھی کتابوں میں جو چاہے لکھئے اور حقیقت میں جو چاہے کیجئے آپ کو کامل آزادی ہے، یہ فلسفہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑے گا نفس کشی کے بجائے انسانوں کا خون بھی پی جایئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔ منو مہاراج نے ایک جگہ کہا بھی تو ہے۔۔۔ کہ شیر بن کر کھا جاؤ وغیرہ وغیرہ۔ ہے نا زبیدہ آپا؟"

زبیدہ آپا جواب دینے کے بجائے میکس فیکٹر کی مصنوعات کی ہمت افزائی کر کے بچے کھچے حسین چہرے کے پیچھے پڑ گئی تھیں، اس لئے عذرا نے باہر چلے جانے میں عافیت سمجھی۔۔۔ ایک بجے کی خبریں بتا رہی تھیں کہ آزاد کشمیر کی فوجوں نے پاکستانی فوجوں کی مدد سے جوڑیاں کی ایک زبردست چھاؤنی فتح کر لی۔ اور یہ دونوں فوجیں دریائے توی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔۔۔ ادھر بھارت نے دھڑا دھڑ ہوائی حملے کئے جس میں ان کے چار طیارے مار گرائے گئے۔۔۔ رجیلہ خوشی سے بول اٹھیں بڑی بجے میں سنے ہو یہ چھاؤنی فتح کی ہو۔۔۔ اس دن تین بجے کی ٹرین سے زبیدہ آپا، امی اور چچی جان اور فیروزہ پروین اور چھوٹے بچے سب سیالکوٹ چلے گئے اور وہ عذرا، نادرہ اور نسرین بجیا انہیں رخصت کرنے اسٹیشن تک گئی تھیں۔ یہی اسٹیشن جو اب ملبے کا ڈھیر ہو چکا ہے۔۔۔ اور وہ واپس آ کر شام کی چائے پی رہی تھیں تو اسکوٹر سے جاوید بھیا سیالکوٹ سے آئے تھے۔

"فاروق ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوا تھا"۔۔۔ جاوید بھیا نے فاروق کے بارے میں بجیا کو بتاتے ہوئے کہا۔

"مگر نامعقول ہم لوگوں سے مل کر کیا خوش ہوگا؟"۔۔۔ نسرین بجیا نے چائے میں شکر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے وہ ایسا ہی نامعقول ہے خوش ہونا تو بڑی بات۔۔۔ ایمان سے اب دوبارہ ملے تو سہی میں نے ناک میں دم نہ کر دیا تو یاد کرے گا۔۔۔ ظاہر ہے کہ بھیا پنڈی سے واپس نہیں آئے۔ وہ پرسوں مجاہدین کشمیر کے حق میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ لوگ جنگ بندی لائن کے اس پار مقبوضہ

کشمیر میں جاکر بھارتی سامراج کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں ـــــ مگر ہماری حکومت سخت اصول پرست ہے اور وہ اس کی اجازت نہیں دے رہی۔
اور پھر صدارتی انتخاب کی باتیں چھڑ گئیں۔

"اچھا بھئی میں پھر چلتا ہوں واپس کیونکہ مجھے صبح کچھ کام ہے، تم لوگ تو یہیں ہو اور امید ہے مزے میں ہو گی ـــــ او ہاں ـــــ بھیا نے اسکوٹر سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "لو جمال بھی آئے تھے، جانے کہاں کس جگہ جا رہے تھے۔ یہ فوجی کچھ بتاتے بھی نہیں۔ کہہ رہے تھے اب تو دیر ہی سے لوٹیں گے مگر خدا جانے ـــــ خدا جانے کیا چکر ہے بھئی ـــــ اسے بڑا افسوس ہے تم لوگوں سے نہ ملنے کا ویسے جانے کیوں ایسا خوش ہو رہا تھا جیسے دولہا بننے والا ہو ـــــ اچھا خدا حافظ!"

بھیا چلے گئے ـــــ وہ دولہا یوں بھی بننے والا تھا۔ چھ اکتوبر کو تو عذرا کی اس سے شادی ہونے والی تھی ـــــ مگر ـــــ ایک پل یوں طوفان بن کر بھی آتا ہے ـــــ رحیلہ نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے سوچا۔

وہ سب کافی رات گئے تک کھیتوں میں کالج کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ گھومتی رہیں۔ فرسٹ ایئر اور ففتھ ایئر کو کالج اور یونیورسٹی کھلنے کا شدت سے انتظار تھا کہ کالج میں آکر کھلنے والے تھے اور وہ سب لمبے چوڑے پروگرام بناتی اور مباحثے، ڈراموں، ریڈ کراس کے چندوں اور سوشل ورک کے پروگراموں کی باتیں کرتی رہیں اور رات گزر گئی۔

اور صبح پاکستانیوں نے ریڈیو پاکستان سے سنا کہ لاہور پر بھارتیوں نے حملہ کر دیا ہے اور بھارتی آکاش وانی کے نشریہ کے مطابق لاہور پر قبضہ بھی ہو چکا تھا اور راجیہ سبھا اور لوک سبھا کے ممبروں میں مٹھائی تقسیم ہو رہی تھی اور بھارت کے مقبوضہ لاہور سے پاکستانی ترانے نشر ہو رہے تھے۔

"بہت خوب، تو گویا اٹھارہ سال تک نفرت اور حسد کا جو لاوا بھارتی حکمرانوں کے دل میں پک رہا تھا، پھوٹ پڑا ـــــ چلو بہ جانے سے تکلیف کم ہو جائے گی۔" رحیلہ کو بھارتیوں کی حرکت پر سخت ہنسی آ رہی تھی ـــــ چہ خوب، لاہور اور سیالکوٹ پر قبضے کا خواب! ـــــ اس نے دور بھارتی علاقے کی طرف دیکھ کر سوچا ـــــ بس اس دن ہر دل محاذ کی طرف جانے کے لئے بے چین تھا اور ہر آنکھ غصے سے خون ہو رہی تھی اور اس دن بھارت کے پچاس سے زیادہ جہازوں نے وزیر آباد، راولپنڈی، کراچی کی شہری آبادیوں پر بمباری کی اور سرگودھا پر حملے کے نتیجے میں چھ جہاز گنوائے اور ایک یہاں پسرور کے قریب اچھا بھلا گھیر کر اتروا لیا گیا ـــــ وہ گاؤں بھر اکٹھا ہو کر اس خوفناک جہاز کو دیکھنے گیا۔ جس کی صرف آواز سے زمین دہل جاتی ہے۔

وہ سارا دن تو ایسے ہی خبروں کا بلیٹن سنتے ہی گذرا ـــــ عذرا بھی اداس تھی اور اس کی وجہ سے سب خاموش تھے ـــــ اور پھر رات آ گئی چاندنی پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ پھوپی جان کے لمبے چوڑے آنگن میں کناروں پر لگے ہوئے امرود کیلے اور آلوچوں کے درختوں کے سائے بھیس رہے تھے ـــــ اور دور تک سکوت کی حکمرانی تھی اور ہوا سرگوشی کرتی پتوں کی خوشبو چراتی ادھر ادھر گھوم رہی تھی ـــــ وہ چاروں خاموشی سے اپنے بستروں پر لیٹی اپنے اپنے خیالات میں گم تھیں ـــــ وہ رات بھی سابقہ چار پانچ راتوں کی طرح گھن گرج میں گذری۔ جوڑیاں کے محاذ پر ہونے والی جنگ نے سیالکوٹ، گجرات اور اس کے نواحی علاقوں میں زلزلہ برپا کر رکھا تھا ـــــ صبح ان کی آنکھ زمین کو دہلا دینے والے بھارتی مگ ہوائی جہازوں کی گڑگڑاہٹ سے کھلی۔ ابھی ملگجا سا اجالا پھیلا تھا۔ مسجدوں میں نماز کے بعد درس ہو رہے تھے ـــــ کچھ لوگ کھیتوں کو جا رہے تھے۔ کچھ ابھی سو رہے تھے۔ پھوپی اماں فجر کی نماز پڑھ رہی تھیں ـــــ لیکن اس قیامت خیز آواز سے بچہ، بوڑھا، جوان، عورت، مرد سب بوکھلا کر آسمان کو دیکھنے لگے ـــــ جہازوں نے نواحی علاقے میں ایک دو بم گرائے اور پھر پاکستانی جہازوں کے آتے ہی واپس بھاگ گئے ـــــ آٹھ بجے تک دوسرا ناکام ہوائی حملہ ہوا۔ لوگ مطمئن ہو کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور دن گذرتا رہا ـــــ رحیلہ کو سخت بوریت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا سیالکوٹ شہر چل کر

دیکھا جائے کیا حال ہے؟

شام کو رحیلہ خاموشی سے نسرین بجیا کے کمرے میں پلنگ پر اوندھی لیٹی تکیے پر کہنیاں ٹیکے، سامنے ٹنگے ہوئے کیلنڈر کو تکے جا رہی تھی۔ ساتھ تبر کا ہندسہ دائرہ در دائرہ پھیلتا ہوا فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ ٹرانسسٹر شور مچا رہا تھا۔ رن کا میدان لاشوں سے پٹ جائے گا ــــ چنانچہ پٹ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سوچا ــــ ہاں اور عذرا برآمدے میں آرام کرسی پر پڑی آنگن میں پھیلتے سایوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھوپی جان عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں اور چونکہ ابا جان بی ڈی ممبر تھے اور اس وجہ سے کسی کام کے سلسلے میں دو دن سے لاہور گئے ہوئے تھے اس لئے پھوپی جان سخت پریشان تھیں ــــ نسرین بجیا باورچی خانے میں کھانا پکانے والی عورت کو ہدایات دے رہی تھیں ــــ عدنان اور رحمان نسرین بجیا کے دونوں چھوٹے بھائی آنگن میں کرکٹ کھیل رہے تھے ــــ اسی وقت جاوید بھیا موٹر سائیکل پر آئے اور پھوپی جان کو بتایا کہ ابا اور چچا جان دونوں نے کہا ہے کہ آپ نسرین، رحیلہ وغیرہ کے ساتھ سیالکوٹ چلیں ــــ سب لوگ۔

"دیکھو صبح تک چلیں گے اب اس وقت کہاں ــــ" انھوں نے تسبیح میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں یہاں کیا مصیبت ہے؟" ــــ عذرا نے عجیب سے لہجے میں کہا ــــ وہ یوں بھی بڑی ایڈونچرس تھی۔ ہر لمحہ کسی نئے پن کی تلاش ــــ اور چونکہ ان کے خیال میں یہ صرف سرحدی جھڑپ تھی۔

"کالج کھلنے ہی والے ہیں اور یوں بھی تم لوگ کون سی ہمیشہ گاؤں میں رہتی ہو"

"میں نہیں جاؤں گی ــــ آخر محاذ پر بھی تو انسان ہی رہتے ہیں ــــ ایسا بھی کیا ڈر؟"

بجیا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ لاہور کی خبریں سن رہے تھے۔ شام دبے پاؤں چلی آئی۔ ایک اور دن کو اس نے افق کے پار دفن کر دیا۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو رات کے دس بج رہے تھے بچے گہری نیند سو چکے تھے۔ پھوپی جان کروٹیں بدل رہی تھیں رحیلہ عشا کی نماز پڑھ رہی تھی اور رات درختوں کی چھاؤں میں اونگھ رہی تھی۔ آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں چاند سلگ رہا تھا۔ ہر چیز کسی آنے والی واردات کی آہٹ کو محسوس کر رہی تھی۔ مشرق اور شمال مشرق میں بادل کی سی گرج کے ساتھ آج چمک بھی نظر آ رہی تھی جو بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف شعلے ہی شعلے نظر آ رہے تھے اور بارود کی بو فضا میں پھیل رہی تھی۔ انھوں نے سوچا یہ وہم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خوفناک آوازیں قریب تر محسوس ہو رہی ہیں۔ وہ خاموشی سے بیٹھے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتے رہے۔ اس شورِ قیامت میں سونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا ــــ اور پھر روشنی کے بم انھیں بالکل ہی قریب نظر آئے مگر جاوید بھیا کو حیرت تھی کہ پاکستانی علاقہ میں تو کسی لمبی چوڑی جنگ کی تیاری کا کوئی نشان نہیں اور یہ تو بڑا زبردست اور بھرپور حملہ ہے ــــ دور تک سیاہ دیوہیکل چیزیں اپنے سینکڑوں دہانوں سے آگ اگلتی چلی آ رہی تھیں ــــ اور پھر رات ایک دم بھیانک ہو گئی۔ چاند سہما ہوا تھا۔ تاروں کا کارواں بے حد تھکا تھکا سا رواں تھا اور آگ تھی، خون تھا، گوشت کے جلنے کی بو تھی چیخیں تھیں اور ان کی بازگشت تھی اور گولے ان کے اردگرد گر رہے تھے ــــ ساری بستی میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ ہر شخص ہراساں ہراساں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت ــــ میدان میں مقابلہ کرنا اور بات ہے اور سوتے میں ٹینکوں اور توپوں کے گولوں کی بارش ہو جانا اور ــــ دیوار کی آڑ لئے وہ سب کھڑے تھے بچے آنکھیں مل رہے تھے، ایسے میں عذرا کو جانے کیا سوجھی۔

"آخر یہ ذرا سی پٹاخہ بازی ہو رہی ہے اور لوگ ڈر کے مارے مرے جا رہے ہیں۔"

رحیلہ کو ہنسی آنے والی تھی مگر بیچ میں نسرین بجیا نے ٹوک دیا ــــ نسرین بجیا ذرا کھردرے لہجے میں بولیں ــــ "مگر آپ سب ہی بچ جائیں گی یقین جانیے سوائے میرے۔"

عذرا نے ہنس کر کہا جوانی کی موت اور وہ بھی شہادت کی بڑی پیاری چیز ہے۔

"عذرا کی بچی کیا بکتی ہو" — تو رحیلہ اور نسرین کو ایک وقت اس پر غصہ آ گیا — اور یہ آخری دن تھا جب اس نے عذرا کو اس زندہ دلی سے باتیں کرتے اور بستی کو، اس کے لوگوں کو، اور اس کے کھیتوں اور مرغزاروں کو دیکھا اور اپنے ذہن کے گوشوں میں منجمد کر لیا۔ کیونکہ پھر تو بیاروں طرف سے ہی آگ برس رہی تھی اور خون بہہ رہا تھا اور کراہیں اور چیخیں گونج رہی تھیں۔ اور ہراساں ہراساں ایک ہجوم تھا۔ ان کو اتنا یاد ہے، پھر اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ سب کس طرح ٹولیاں بنائے درمیان اسٹیشن تک پہنچے اور ادھر شدید گولہ باری کے باعث ایک ہجوم کی صورت میں زخمی ہوتے، گرتے پڑتے واپس سڑک کی جانب بھاگے۔ کب عذرا ایک گولے سے بری طرح زخمی ہوئی اور بھیا کے ہاتھوں میں آخری ہچکی لی۔

بس اتنا جب کے قریب عذرا کے ختم ہوتے ہی اس نے ایک درخت کا سہارا لیا تھا پھر آنکھ کھلی تو دوپہر کا سورج چمک رہا تھا اور وہ بستی کے دوسرے زخمیوں کے ساتھ ہسپتال میں پڑی تھی۔ سب ہی تھوڑے بہت زخمی ہوئے تھے مگر حیرت ہے کہ اسے نسرین بھیا کے مقابلے میں بالکل معمولی سا زخم تھا۔ وہ یوں بیہوش ہو گئی تھی۔ اس نے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی اور ساری باتیں اسے یاد آ گئیں — اس کے ذہن میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی اور آنکھوں کے سامنے جیسے چنگاریاں پھیل رہی تھیں۔ دھماکے ہو رہے تھے اور اس آگ کی لو میں اسے اپنے بدحواس ہوتی امی کا چہرہ نظر آیا — اور کوئی ہنستی ہوئی جس کی چمکدار آنکھیں — مگر پھر ایک دم سکون اور ٹھنڈک کی لہر چھا گئی — وہ ساری دنیا سے بے خبر سوتی رہی — اس دن خوب جلدی جلدی خطرے کے سائرن بج رہے تھے۔ جہازوں کی دوڑ فضا میں جاری تھی — طیارہ شکن توپوں کے دہانے کھل گئے تھے۔ میدانی توپیں آگ اگل رہی تھیں۔ سارے شہر میں زلزلہ برپا تھا اور دروازے بج رہے تھے۔ کھڑکیاں بج رہی تھیں — اور — بھارتی دورمار توپوں کے گولے رنگپورہ، سرکلر روڈ، آریہ سماج روڈ، ہیرا منڈی، پچہری روڈ جیسی گنجان شہری آبادی پر برس رہے تھے — اتفاق سے یہ شہری علاقے جموں سیالکوٹ بارڈر سے صرف تین چار میل دور ہیں — وہ جب گہری غنودگی کے بعد اسے ہوش آیا تو اسے جاوید بھیا نے بتایا کہ پورے تین گھنٹے اس کی آنکھ بچا کر بھاگ گئے ہیں۔

یہ محض یادوں کا سرمایہ ہے اگر ذہن کی موج در موج تاریکیاں یادوں کے نقوش کو محفوظ نہ کر لیں تو زندگی کا کوئی وجود نہ ہو — اتنا نے زہرہ کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے سوچا — اس شام وہ ہسپتال سے گھر آ گئی جہاں اسے ایک صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ انور جمال جسڑ کے محاذ پر ایک بھارتی ٹینک کے نیچے گرنیڈ رکھتے ہوئے شہید ہو گئے۔

لوگ سڑک پر خاموشی اور سنجیدگی سے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ انھوں نے خود ہی کچہری روڈ، ریلوے روڈ، سرکلر روڈ پر ٹریفک کم کر دی تھی — ہر طرف فوجی ٹرک اور جیپیں دوڑ رہی تھیں اور لوگوں سے خراج عقیدت وصول کر رہی تھیں — بلیک آؤٹ کی وجہ سے رات بہت تاریک تھی مگر تیرہ تاریک کے چاند کی روشنی سائے کے گہرے سمندر میں لہر کی طرح پھیل رہی تھی اور نبضِ حیات جیسے ڈوبی جا رہی تھی — عشا کے بعد فیروز اور پرویز رضاکاروں کی وردی پہن کر بازگشت کے لیے نکل گئے — سرپرستانہ سا کا راج تھا۔ بس گھنٹے آدھ گھنٹے پر میدانی توپ چلنے کی دھمک اٹھتی اور ایک بازگشت کے ساتھ کائنات کی لامحدود وسعتوں میں سما جاتی اور پھر زمین و آسمان کے درمیان وہی ازلی سناٹا — سارے کلب، سینما ہاؤس بلکہ ہوٹل اور ریسٹورانٹ بھی سات بجے کے بعد بند ہو جاتے — اور — رحیلہ نے پلنگ پر لیٹے لیٹے پٹ کر دیکھا — زہرہ آرام کرسی میں نیم دراز میز پر رکھی محدود سی روشنی کی لرزتی لو میں ڈائری لکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد اداس تھا اور لرزتی پلکوں سے موتی سے ٹپک رہے تھے — اس نے دو دن سے ڈائری نہیں لکھی، سات کے بعد آٹھ اور آج نو ہے — اور درمیان کے یہ لمحے حدیث بن کر انجانے میں اتر گئے ان کے لیے کیا لکھوں — وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی — چچی جان نماز پڑھ رہی تھیں — امی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، اور جاوید بھیا تین راتیں جاگنے کے بعد آج گہری نیند سو رہے تھے — چچا جان کی سب رات کو ہسپتال میں ڈیوٹی تھی۔ ڈیوٹی نہ بھی ہوتی تو ان کا

دل بے چین رہتا کہ کون جانے کب کوئی مریض آ جائے اور وہ اُس کے کام آ سکیں۔ وہ آکر بیرونی برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔

پھر وہ چھت پر چلی گئی کہیں بھی چین نہیں تھا۔ ایک عجیب سا ڈپریشن سوار تھی —— بھئی عذرا یہ تم نے کیا گھپلا کر دیا۔ کہاں ہے؟ اور میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گی؟ —— تم نے کیسے معصوم سپنے اکٹھے دیکھے تھے —— مگر اب تو ٹھوس حقیقت کی چٹان سامنے ہے —— اس نے شمال مشرق کی پہاڑیوں کی طرف پھیلی ہوئی سرخ آگ کو دیکھ کر سوچا —— سارا افق دھواں دھواں ہو رہا تھا اور اس دھوئیں میں چاندنی بھی گدلا گئی تھی —— سارا شہر اس آگ کی روشنی کی لپیٹ میں تھا اور دھوئیں اور آگ کے پس منظر میں کشمیر کی پہاڑیاں —— وہ کتنی ہی دیر اسے گھورتی رہی —— اب تو یہیں چلنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور جب ہوائی حملہ کا سائرن ہوا تو وہ نیچے آ گئی۔ نیند دور بہ دور تھی۔ پانی پینے کو طبیعت مناسب نہ لگا —— وہ ڈرائنگ روم میں آ کر صوفے پر گر گئی۔ کمرے کی سوئی ڈیڑھ بجا رہی تھی۔ زہرہ قالین پہ لیٹی بے مقصد کسی رسالے کے ورق پلٹ رہی تھی۔

اسے یہ سوچ سوچ کر حیرت تا ذرا ہا تھا کہ یہ ہولناک جنگ سے ہولناک کیوں نہیں لگ رہی —— آگ، خون اور موت اُگلتے اس دور میں فنا کے سائے ہمیں ڈراتے کیوں نہیں —— یہ آخر کونسا خیال ہے کہ ہم لوگ اتنے نان سیریس ہو رہے ہیں —— اور قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب سوچتی —— جہازوں کی گڑگڑاہٹ —— توپوں کی دھمک کے ساتھ اکٹھے کئی جگہوں پہ بجلی گرنے کا سا شور قیامت برپا جیسے آسمان شق ہو گیا ہو —— اور اس کے ساتھ ہی دیوار پر کی تصویریں زمین پر آ رہیں۔ گلدان لڑھک گئے بچے سوتے ہوئے چیخ کر اُٹھ بیٹھے اور سارا آسمان شعلے شعلے ہو گیا —— یہ سب کچھ ایک پل میں ہو گیا اور پھر خاموشی چھا گئی —— بھارتی جہاز شہر کے عین وسط میں ٹرنک بازار اور گھاس منڈی پر بمباری کر کے چلے گئے تھے۔ اور پھر تین منٹ کے اندر یہ ڈیڑھ سو سے اوپر دوکانیں اور مکان کھنڈر میں تبدیل ہو گئے اور یہاں چھ دن تک مسلسل کھدائی کے بعد بھی لاشیں نکلتی رہیں۔ سینکڑوں آدمی بے گناہ جل گئے۔

یہ تیسرا دن ہے کہ سیالکوٹ پر تباہی برس رہی ہے۔ ہم نے جنگ کے بارے میں —— ایسی جدید اسلحہ کی جنگ کے بارے میں صرف ناولوں میں پڑھا ہے یا انگریزی فلموں میں دیکھا ہے۔ مگر اب ہم خود جیتے جاگتے کردار ہیں اور اپنا کردار پہچانتے ہیں —— ہمیں کوئی پرواہ نہیں —— گر عذرا! —— اس کے ذہن میں آگ کا دریا اُبل پڑا —— ہونہہ! —— اس نے جلدی سے وضو کیا اور قرآن پاک کھول لیا۔ وہ کئی دنوں سے تلاوت نہ کر سکی تھی۔

"برابر نہیں وہ لوگ مسلمانوں میں جو جہاد فی سبیل اللہ سے گریزپا ہیں —— اور وہ مسلمان جو لڑتے ہیں اللہ کے لئے اپنے مال سے، اپنی جان اور مال جہاد میں خدا کے لئے قربان کرنے والوں کا درجہ اللہ نے جہاد سے بھاگنے والوں سے بہت بڑھا دیا ہے —— اور اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے —— اور راہِ حق میں لڑنے والوں کو اجرِ عظیم ملے گا جو کہ درجے میں اللہ کی طرف سے (روحانی) اور رحمت و بخشش —— اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ——

النساء —— اور فجر کی اذان کی آوازیں بلند ہوئیں —— جو توپوں کی گرج سے ہم آہنگ ہوتی رہیں —— اس نے آہستہ سے قرآن مقدس کو الماری میں رکھ دیا —— ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی —— یہ آخری رات تھی جب کہ اس پر ڈپریشن سوار رہی۔

ناظم بھیا کا دورہ از قسم فی الحال ملتوی ہو گیا تھا۔ وہ بے گھر مصیبت زدہ لوگوں کو سہولتیں مہیا کرنے کے لئے اپنے دوستوں کے ساتھ سیالکوٹ، ڈسکہ گوجرانوالہ سمبڑیال چکر لگاتے رہتے —— اس دن سارے لوگ گھر میں ہی تھے۔ چچا جان بھی آ گئے تھے اور ڈرائنگ روم میں زور و شور سے جنگ پہ بحث ہو رہی تھی۔ رحیلہ سو کر اُٹھی اور آنکھیں ملتی ہوئی باہر باغیچہ میں آ گئی —— اسے سخت کاہلی محسوس ہو رہی تھی —— وہ اور زہرہ خواتین کی سوشل ویلفیئر سوسائٹی کی ممبر تھیں اور انہیں بے گھر لوگوں کے لئے کچھ کرنا تھا۔ آج شام کی میٹنگ میں جانے کے متعلق وہ سوچ رہی تھی کہ اسے پیچھے سے بھاری آواز سنائی دی۔ "رحیلہ بیگم" —— وہ چونک کر مڑی —— ارے یہ کہاں —— تو گویا یہ حضرت ڈرائنگ روم میں براجمان تھے۔ وہ ذرا نروس ہوئی مگر جلد ہی قابو پا کر اس کی طرف دیکھنے لگی ——

"رحیلہ بھئی مجھے تم لوگوں کے بارے میں سخت تشویش رہی —— میں فوجی زخمیوں کے ساتھ ہسپتال گیا تھا۔ وہیں مجھے جاوید سے سب حال معلوم

ہوا۔ تم اس وقت بیہوش تھیں ـــــ تم اپنی بہت پیاری بہن اور دوست سے محروم ہو گئیں مجھے دلی صدمہ ہے" ـــ اس نے پہلی بار بڑے نرم لہجے میں اس اپنائیت سے کہا کہ وہ رو پڑتی مگر اسے کسی کے سامنے رونا ایک دم بیہودہ لگتا تھا ـــ چنانچہ وہ خاموشی سے زرد گلاب میں گھسنے والی ننھی سی نیلی چڑیا کو دیکھنے لگی، وہ بالکل بھول گئی کہ اس کے علاوہ بھی کوئی یہاں ہے ـــ اوہ ـــ یہ محاذ سے آئے ہیں اور وہیں واپس جا رہے ہیں اور مجھے اخلاقاً مزاج پرسی کرنی چاہئے۔ چنانچہ وہ اس کی طرف دیکھنے لگی ـــ اس کے چہرے پر تھکن، دہشت مشقت کے آثار تھے مگر ایک عجیب سی طمانیت بھی۔

"تم تو واقعی بہت افسردہ ہو ـــ مگر ـــ رحیلہ جی عظیم قوموں کی تاریخ عظیم روایات کی حامل ہوتی ہے اور عظیم روایات عظیم قربانیوں کی رہین منت ہوتی ہیں اور ہماری تاریخ ان روایات سے بھری ہے ہمیں انہیں زندہ رکھنا ہے" ـــ اس نے بزرگانہ انداز میں اسٹین گن کا کندا زمین پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"میں بھی عظیم قوم کی روایات دہرانے کی کوشش کروں گی" ـــ اس نے جیسے سرگوشی میں کہا ـــ "آپ آج کل کہاں ہیں؟ اور سب خیریت ہے؟" رحیلہ نے کچھ دیر خاموش رہ کر پوچھا ـــ

"میں تو بس ہر وقت رواں دواں رہتا ہوں جبر آڈے سے جسڑ تک روزانہ چکر لگانا پڑتا ہے، روز تمہارے شہر سے گزرتا ہوں۔ ڈیوٹی ہی ایسی ہے مگر زیادہ تر چونڈا کی طرف ہی سفر رہتا ہے ـــ اچھا خدا حافظ! اب چلتا ہوں" ـــ وہ سٹین گن ہاتھ میں تھام کر روش پر سے گزرتا ہوا گیٹ پار کر گیا ـــ میں روز تمہارے شہر سے گزرتا ہوں ـــ تو پھر جناب ـــ اس نے لاشعوری طور پر سوچا ـــ مگر کیوں ہے ـــ وہ دم بخود دیر تک کھڑی رہی ـــ بھئی یہ بیٹھے بٹھائے لوگ یوں اپنائیت کیوں جتانے لگتے ہیں؟ ـــ سخت پریشان کن بات ہے ـــ اسے بڑی الجھن ہوئی۔

(۴)

پھر یہ جنگ بڑے مزے سے روزمرہ کا معمول ہو گئی۔ محاذ پر کتنی صبحیں خنجر بدست اور کتنی شامیں خون آشام آئیں مگر ہر صبح لوگوں کے لئے سکون رساں ہی ہوتی ـــ ہوائی حملوں کا زور بھاگوٹ کا اڈہ اڑ جانے سے ایک دم کم ہو گیا۔ وہ ایک طرف سے فضا میں داخل ہوتے اور دوسری سے بدحواسی سے نکل جاتے۔ مشکل ہی کبھی ایک آدھ بم گرا پاتے ـــ ان کی بدحواسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ـــ رحیلہ تمام دن دفاعی فنڈ اور مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں گذارتی۔ اس نے ان لٹے ہوئے لوگوں سے بھارتی فوجوں کی بھیانک داستانیں سنیں اور حیران رہ گئیں ـــ کس طرح ان کے گھر اور بچے زندہ جلا دیئے گئے ـــ کس طرح لوگوں کے ہاتھ باندھ کر انہیں گولی سے اڑا دیا گیا اور کس طرح کئی لوگ مقابلہ کے لئے رائفل لے کر کھڑے ہو گئے تھے مگر ٹینکوں کے نیچے کچل دیئے گئے ـــ کئی عورتیں آج بھی پیچھے رہ جانے والے شوہروں کی منتظر تھیں

اپنے تمام رشتہ دار جو زخمی تھے ہسپتال سے واپس آ رہے تھے۔ بہت سے واقف کار ہسپتال میں ختم ہو گئے۔ کچھ کے شہید ہونے کی اطلاع مل چکی تھی مگر کچھ لاپتہ تھے ـــ تمام لوگ آج کل عبادت میں مصروف نظر آتے۔ رحیلہ کو بڑی حیرت ہوتی ـــ جب سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو پھر ایک ہی آستانہ رہ جاتا ہے ـــ مگر کیا انہیں پہلے ہی لوگ اس آستانے پر جھکتے ـــ "پاکستانی جنگ کے معاملے میں بہت سیریس معلوم ہوتے ہیں" ـــ فرانسیسی ٹیلی وژن کمپنی کے نمائندے نے اس سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا ـــ کیوں نہ ہوں؟ ـــ اس نے اطمینان سے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے سوچا ـــ

"صبح آکاش وانی پر تم نے کیا کہہ رہی تھی پرویز" ـــ فیروز نے جابٹ باندھتے کہا

"کیا؟" پرویز نے چائے کی پیالی منہ سے ہٹاتے پوچھا۔

"یہی کہ ہماری سینا سیالکوٹ پر قبضہ کر چکی ہے اور گلی گلی لڑائی ہو رہی ہے ـــ اور یہ کہ ہمارے جہازوں نے چونڈا کا ہوائی اڈہ تباہ

کردیا ہے۔ انھوں نے جہنگر سے شعلے اُٹھتے ہوئے بھی دیکھے۔"

"ارے یہ ہوائی اڈہ کب پیدا ہو گیا؟" زہرہ کو پرویز کی عقل پر غصہ آگیا۔

"آپ کو اس کا نہیں پتہ؟ — وہ بھارتی سینا اپنے ساتھ لائی تھی اور واپس بھاگتے وقت بدحواسی میں چھوڑ گئی" رحیلہ مسکرا کر اٹھی اور اپنے کمرے میں آکر ریڈیو سننے لگی — وہ تھوڑی دیر ریڈیو جالندھر سنتی رہی — اف وہ کس قدر تھرڈ کلاس اسٹائل ہے ان کے پروپیگنڈے کا — اور وہ ریڈیو بند کر کے باہر آگئی۔

اس وقت اس کی کلاس فیلو اور دوست فیروزہ محی الدین آگئیں۔ یہ صاحبہ حد درجہ مذاقیہ تھیں۔ ان کی ماں امریکن تھیں اور انھیں تین ماہ کا بچہ چھوڑ کر چل بسی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ امریکن ماں سے بے ماں کا ہونا بہتر ہے — انھیں ہر دم عجیب و غریب حرکتیں اور باتیں کئے جانے کا خبط تھا۔ ان کی دوستی شہر کے معزز ترین لوگوں سے لے کر گھر کے نوکروں تک اور ساٹھ سال کی بوڑھیوں سے دو سال کے بچے تک تھی۔ اسی لئے وہ حسب عادت چلائیں "رحیلہ ڈیر، یار میرے ننھیال والوں نے سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اس لئے ہم ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔"

"بھئی تم ان سے خواہ مخواہ شاکی ہو، بھارت انھیں پیارا لگتا ہے بس اس میں ان کا کیا قصور ہے" زہرہ نے کہا — پھر وہ مجاہد فنڈ کے بارے میں باتیں کر کے چلی گئی۔

شام جھک آئی — نیم تاریک کمرے میں لیٹے لیٹے رحیلہ نے انگڑائی لی اور اسے یاد آیا کہ کیپٹن فاروق کا پتہ نہیں کیا حال ہے۔ وہ دو دن سے آیا ہی نہیں۔ جانے کیوں وہ اس کے لئے سخت بے چین ہو گئی اور اسی لئے باورچی خانہ میں آکر کھانا پکانے والی عورت سے باتیں کرنے لگی۔

دوسرا تمام دن بے گھر لوگوں کے کیمپ میں کپڑے تقسیم کرنے کے بعد دنیا بھر کے اخباری نمائندوں کے ساتھ سر کھپانے میں گذر گیا — فیروزہ نے اس دن امریکن پریس رپورٹرز کو بہت تنگ کیا — وہ جو سوال کرتا اس کا وہ عجیب اُلٹ اور مضحکہ خیز انداز میں جواب دیتی — اور یہی ظاہر کرتی رہی کہ وہ انگریزی بالکل نہیں سمجھتی۔ اور اس کی باتوں سے اس کی ساتھی خواتین کا مارے ہنسی کے بُرا حال ہوا جا رہا تھا مگر وہ خود سنجیدہ تھی اور امریکن سخت بوکھلایا ہوا تھا — ڈیلی ایکسپریس لندن کے نامہ نگار سے باتیں کرتی رحیلہ قلعہ پر بمباری سے گری ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ سنبھل سنبھل کر نیچے آرہی تھی تو اسے بڑی حیرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ اب فیروزہ روسی اور چینی نامہ نگاروں سے بڑے ڈھنگ سے بات کر رہی تھی — واپسی پر جیب ایک ساتھی خاتون کو تحصیل بازار پہنچا کر رحیلہ کیفے ٹیریا کے پاس پہنچی تو ایک دم ہوائی حملے کا سائرن بجنے لگا اور دندناتے ہوئے کئی جہاز آگئے — وہ کھڑے ہو کر آسمان کو تکنے لگی۔

"محترمہ ہوائی حملے کے وقت کھلی جگہ میں کھڑے ہو کر تماشا نہیں دیکھا جاتا" کیپٹن فاروق کہہ رہا تھا۔

"جی —" وہ چونکی۔

"جی کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اندر چلئے" اس نے سخت لہجے میں کہا اور وہ خاموشی سے کیفے ٹیریا کے مختصر سے ہال میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی — ارے بڑے ہمدرد — اس نے اُسے گھورتے ہوئے سوچا جو اب اس کی طرف پیٹھ کئے باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا — یہ لڑکی جس کی خواب آلود کالی آنکھیں اسے بہت اچھی لگیں اور جس کی مسکراہٹ دلفریب معلوم ہوتی تھی — اور جس کے ہونٹوں کے درمیان ننھے سے گڑھے میں عجیب جذباتی اپیل کا سراغ ملتا تھا، تو کیا میں اسے چاہنے لگا ہوں — کیسی حیرت انگیز بات ہے۔ حالانکہ پہلے دن — وہ اس کی

طرف گھوما — یہ کتنی تیزی سے اس کے قریب ہو گئی ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس سادہ سی پرکشش شخصیت کی لڑکی کو خود بھی نہیں پتہ کہ — اونہہ — میں نے جو چیز چاہی ہے پالی ہے — وہ اُٹھ کھڑی ہوئی — "میں چلتی ہوں۔ خطرہ تو ٹل گیا۔"

"ہوں"۔ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا — "آں ہاں — ٹھیک ہے — اگر مجھے فرصت ملی تو شاید میں رات کو آؤں — اب شام ہو رہی ہے اور تم جا کے آرام کرو۔ سخت تھکی ہوئی نظر آ رہی ہو — اتنی محنت بھی ٹھیک نہیں۔" وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے کہے گیا — انسان کسی کے لئے اتنی گہری ہمدردی کیوں کر محسوس کرنے لگتا ہے

گھر آ کر رحیلہ نے خبریں سنیں۔ کیم کرن فتح ہو گیا تھا اور منا باؤ ریلوے اسٹیشن پر پاکستان کا قبضہ ہو چکا تھا — اور وہ اگھر سے چرائی ہوئی ادمنی بس کو دہلی میں وہ ہو رہ قبضہ کے ثبوت کے لئے پیش کیا جا رہا ہے — اس کا دل ایک دم چاہا کہ وہ خوب رٹے جائے کیوں؟ — وہ رات گرج چمک اور دھماکوں کے ساتھ بہت اداس گزری —

"کتنے بجے واپس آؤ گے؟" اس نے کشن پر سر ٹیکتے ہوئے پرویز سے پوچھا جو رضا کاروں کی وردی پہنے باہر جا رہا تھا —

"ڈیڑھ بجے" — اس نے اپنی سیٹی سنبھالتے ہوئے کہا اور نشست کے کمرے کے دروازے سے باہر چلا گیا — رحیلہ پھر خاموش ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے — پونے گیارہ بج چکے تھے اور سونے کا ذرا بھی موڈ نہیں تھا — زہرہ خاموشی سے دیوان میں دھنسی پچھلے مہینے کا "ٹائم" دیکھ رہی تھی — "اپی یہ امریکیوں کے دماغ کی چول ڈھیلی لگتی ہے؟"

"ہونہہ" — رحیلہ نے مختصر جواب دیا۔

"مجھے نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار نے بہت بور کیا — خواہ مخواہ جتانے والی باتیں — مگر فیروزہ نے اس کا دماغ درست کر دیا" — وہ خود ہی بڑبڑاتی رہی — پھر اُٹھ کر سونے کے لئے چلی گئی — رحیلہ کو سخت کوفت ہو رہی تھی "یہ میٹھے جتانے انسان پر ایسی بدریت کیوں سوار ہو جاتی ہے۔ — توپوں کی گرج کی موسیقی رات کے سکوت میں ابھر رہی تھی — جی ہاں اب اس قسم کی تشبیہات آئندہ ہماری شاعری میں دی جائیں گی — اور — یہ کہ بگ طیاروں کی روح پرور گڑگڑاہٹ سے اس پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی — ٹینکوں کے گولوں کی بارش سے دل کی مرجھائی ہوئی کلیاں کھل گئیں — مگر گولی مارو شاعری کو — اسے یکایک مصیبت زدہ کیمپ کی ایک خوبصورت دیہاتی لڑکی یاد آ گئی جس کی دس ستمبر کو شادی تھی مگر اس کا ہونے والا ماہی لاپتہ ہو گیا — بیچاری اب وہ انتظار میں بیٹھی ہے لیکن ہو سکتا ہے یہ انتظار لامتناہی ہو! — اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کشن پر ماتھا ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔

باہر آنگن میں امی کسی سے باتیں کر رہی تھیں — "ارے اس وقت؟ بیٹا خیریت تو ہے؟"

"جی سب خیریت ہے۔ مجھے دو بجے تک فرصت ہے اور میں سونا چاہتا ہوں۔ تین راتیں ایسی مصروف گذریں کہ سونے کا تصور ہی خواب ہو گیا۔"

"کھانا کھا لیا ہے؟"

"جی نہیں۔ مگر کھانا کھانے میں وقت ضائع ہو گا۔" وہ امی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا — رحیلہ ایک دم ٹھیک سے بیٹھ گئی۔

"کوئی دیر نہیں ہو گی، رحیلہ بہت تیز کام کرتی ہے۔ تمہیں ذرا کھانا گرم کر دے گی۔" امی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

رحیلہ کھڑی ہو گئی — وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا آیا — "چلو جلدی کرو۔ میں وہیں کچن میں کھا لیتا ہوں گرم کرنے کے چکر میں بھی نہ پڑو۔"

اس نے باورچی خانہ میں آ کر ہیٹر جلایا اور پلیٹیں اس کے سامنے رکھ دیں — وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا — پھر اس نے وہیں بیٹھ کر

جلدی جلدی کھا رہا تھا اور وہ اُسے دیکھتی رہی تھی ـــــ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور چہرے پر مدوربہ تھکن کے آثار تھے ـــــ اسے بے پناہ ہمدردی محسوس ہوئی

"چائے پئیں گے یا کافی؟" ـــ رحیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اس نیم روشن ماحول میں ہارے لرزتے سایے ورمیڑکی اُٹھنے والی روشنی میں اس کے تمتماتے ہوئے گال، بے پناہ کشش والے ہونٹ اور لرزتی ہوئی پلکیں ـــ بس وقت یہیں ابد تک ٹھہر جائے ـــ مگر کیوں؟ ـــ وہ ایک دم چونک پڑا ـــ دو بجے تو مجھے جسٹر جانا ہے ـــــ اس نے اس کی طرف دیکھا ـــــ

"آپ نے بتایا نہیں کہ آپ چائے پئیں گے یا کافی؟"

"اس وقت کچھ بھی نہیں۔ اگر چلتے وقت پی لیتا تو ٹھیک تھا، اب تو سونا ہے نیند خراب ہوگی" اس نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا اور برآمدے سے ہوتا ہوا نشست کے کمرے میں چلا گیا۔

برتن سمیٹ کر وہ آئی تو وہ ٹوپی میز پر رکھ کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے سو چکا تھا ـــ اس نے بڑی شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھا ـــ وہ سویا ہوا کتنا معصوم نظر آ رہا تھا ـــ بیوقوف ـــ وہ مسکرا کر اپنے کمرے میں چلی گئی ـــ ہاں اور اس رات ڈیڑھ بجے تک وہ جاگتی رہی تھی، شیلف کی کتابیں پلٹتی رہی تھی پھر اس نے چلتے وقت پرویز کی واپسی پر فاروق کو کافی بنا کے پلائی تھی ـــــ اسے ذرا بھی تو حیرت نہیں ہوئی تھی جیسے اسے اس کا یقین تھا، جیسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ تین گھنٹے سونے کے باوجود اس کی آنکھیں جوں کی توں بوجھل اور سرخ تھیں ـــــ اور وہ بڑے اطمینان سے سٹین گن تھامے باہر کی طرف چل پڑا تھا ـــ "مجھے دروازے تک چھوڑنے بھی نہیں چلو گی؟" ـــ اس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی ـــــ باہر باغیچے میں چاندنی کی پتیاں بکھری پڑی تھیں۔ رات تھکی ہاری اور نڈھال سکوڈ درختوں اور ویرانوں میں ہانپ رہی تھی ـــ جیسے اسے تیز چلنا پڑ رہا ہو ـــ ہوا کیسے کے درختوں میں سسک رہی تھی اور وہ چاندنی میں اس کے سامنے کھڑا تھا عجیب سی کشمکش میں مبتلا ـــ چاند کی مدہم روشنی میں اس کشمکش کا عکس اس کے چہرے سے عیاں تھا ـــ "اچھا خدا حافظ" ـــــ وہ گیٹ سے باہر چلا گیا ـــــ

وہ بیرونی برآمدہ کی دہلیز پر بیٹھ گئی بہت اداس، اور تھکی ہوئی ـــ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل بھائیں بھائیں کرتا ہوا ایک ویران کھنڈر بن چکا ہوا اور وہ کا صحرا ہے جہاں خزاں کی اجاڑ مردہ ہوائیں چل رہی ہیں ـــــ پھر اس نے کہنیوں کا حلقہ بنا کر انہیں گھٹنے پر رکھا اور پھر اس پر سر ٹیک دیا ـــ اور پل پل بیتے گیا ـــ توپوں کی گرج اور دھمک سے برپا زلزلوں سے ہم آہنگ ہوتی ہوئی اللہ اکبر کی آواز فضا میں بلند ہوئی ـــــ رات کی لاش کا بوجھ پھینک کر نئی صبح مسکراتی سامنے آ گئی ـــ اللہ واقعی بہت بڑا ہے۔ بڑا نہ ہوتا تو صرف اس کا نام ہی کیوں سکون بخش ہوتا ـــ اس نے ڈھلتی دھوپ کے زرد کفن میں ملبوس اردگرد درختوں کی لاشوں کو دیکھ کر اس نے سوچا

اس دن سخت بخار کی وجہ سے وہ زہرہ کے ساتھ خواتین کی میٹنگ میں شرکت کے لئے نہ جا سکی ـــ "زہرہ کے ہاتھ روپے بھیج رہی ہوں سامان خرید کر جمع کرا دینا" اس نے فیروزہ کو فون کیا اور اطمینان سے لیٹ کر "جاوید نامہ" پڑھنے لگی ـــ گھر کی خواتین میلاد شریف میں گئی ہوئی تھیں۔ بچے اپنے کمرے میں لوڈو کھیلنے میں مصروف تھے اور وہ سر کے درد سے پریشان تھی ـــ صحن میں گلو بابا "امروز" کا تازہ پرچہ پڑھ رہا تھا ـــ اس نے آنگن میں کھلنے والی کھڑکی سے دیکھا ـــ یہ گلو بابا آج کل بہت قابل ہی نہیں اچھے خاصے مبصر بھی ہو گئے تھے ـــ پرویز کا خیال تھا کہ اس دفعہ سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ گلو بابا کو بھی بھیج دیا جائے کیونکہ وہ کشمیری ہیں۔ اٹھارہ سال قبل ڈوگرہ حکومت نے ہو خون آشام

ہولی کھیلی تھی تو ان کے خاندان بھر کا خون بھی اس میں شامل تھا۔ باباجی خود کرلیں گے پلیڈ اپنا کیس ۔۔۔ چنانچہ رحیلہ نے سوچا کیوں نہ گلو بابا سے سیاسی بات چیت کی جائے شاید دل بہلے ۔۔۔

"بی بی جی آرام کرو طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی ۔۔۔" تب کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی ۔۔۔ گلو بابا نے پلٹ کر دیکھا۔ "او ہو، بسم اللہ بسم اللہ ۔۔۔ مجاہد آیا ہے ہمارا ۔۔۔"

چنانچہ کیپٹن فاروق سامنے کھڑے تھے۔ اس دن وہ بہت بشاش نظر آ رہے تھے۔

"یہ آپ کہاں سے ٹپک پڑے؟" اس نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں ۔۔۔

وہ وہیں برآمدے میں آرام کرسی میں دراز ہو گیا ۔۔۔ اس وقت ڈاک آئی تھی۔ وہ وہیں تخت پہ بیٹھی ایک ایک لفافہ کھول کھول کر پڑھتی رہی۔ ۔۔۔ سب جگہ سے دوستوں اور رشتہ داروں نے سیالکوٹ کی خیریت کے لئے تار اور خطوط بھیجے تھے۔ اس میں زبیدہ باجی کا بھی ایک لمبا چوڑا خط اور ایک تار تھا ۔۔۔ فارغ ہو کر وہ اس سے باتیں کرنے لگی ۔۔۔ وہ اس دن بڑے موڈ میں تھا۔ فلسفہ اور ادب اور کلچر اور مذاہب نے کیا کیا اور پھر خطرے کا سائرن بجنے لگا اور وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے اور پھر چونڈا کے محاذ کی جنگ کا ذکر چھڑ گیا۔

"ہمارے کتنے ہی دوست اپنے جسم سے بم باندھ کر بھارتی ٹینکوں کے نیچے لیٹے تھے، وہ کتنے ان میں گرنیڈ رکھتے ہوئے اُڑ گئے تھے۔ وہ اس وقت ڈیلی ایکسپریس کا نمائندہ موجود تھا اور اس کی آنکھوں میں پاگل ہو جانے والی حیرانی تھی ۔۔۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب حقیقت ہے ۔۔۔ پھر قربانی کی نفسیات پہ باتیں کرتے کرتے اسے جانے کیا سوجھی ۔۔۔ ویسے تم لڑکیاں قربانی کے معاملے میں عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتیں۔"

"ہونہہ۔ کیا بات کی ہے؟ ہسٹری اس کی لاکھوں مثالیں دے ڈالیں۔"

"نہیں بھئی یہ سب زبانی باتیں ہیں ۔۔۔ اچھا بتاؤ اگر ۔۔۔" وہ خاموش ہو کر ایش ٹرے میں راکھ جھاڑنے لگا۔

پھر کئی منٹ گزر گئے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ ایک دوبار اس نے رحیلہ کی طرف بے تعلقی سے دیکھا بھی مگر بولا کچھ نہیں ۔۔۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا ۔۔۔

"آپ کیا کہہ رہے تھے ۔۔۔" رحیلہ نے سلائیاں چلاتے ہوئے ہاتھ روک کر پوچھا ۔۔۔

"ہونہہ ۔۔۔" اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ تھی۔

"بتایئے نا۔" اس نے سوئٹر کے دانوں کو گنتے ہوئے کہا۔

"چلو چھوڑو جانے دو۔"

"بتایئے بھی نا۔" اسے غصہ آ گیا ۔۔۔ اور پھر وہ ایک دم حیران رہ گئی۔ جو بات اس نے کی تھی وہ ایسی ہی تھی ۔۔۔ حالات نارمل ہوتے تو اسے کوئی حیرت نہ ہوتی ۔۔۔ اس نے پروپوز کیا تھا ۔۔۔ "مگر سوچئے تو ۔۔۔ کہ ۔۔۔" اسے کوئی جواب نہ سوجھا

"میں نہیں کہہ رہا تھا کہ تم لڑکیاں بس زبانی ۔۔۔" اس نے طنزیہ لہجہ میں کہا ۔۔۔

وہ کئی منٹ سوچتی رہی ۔۔۔ عجیب طرح کی جذباتی کشمکش میں شاید اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جنھیں چھپانے کے لئے اس نے جھک کر بُنائی کے سوئٹر کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ نظم، ضبط اور خود داری۔ اس نے خود سے کہا ۔۔۔ اور پھر سنبھل کر اس کی طرف دیکھنے لگی ۔۔۔ "کیا سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں آپ؟"

"رحیلہ بیگم ہم لوگ تو فوری اور سنجیدہ فیصلے ہی کیا کرتے ہیں ۔۔۔ سنجیدہ، غیر سنجیدہ، سوچنا سمجھنا ۔۔۔ بحث مباحثہ تو تم لوگوں کے مشاغل ہیں ۔۔۔ اچھا چھوڑو اس بحث کو، میں چلتا ہوں ۔۔۔" پھر جانے کہاں سے اس کے دل میں ماں کا سا پیار اور شفقت اُمڈ آئی۔ زندگی تو یہی محدود ہے اس

زندگی میں ہم کسی کو سکھ دے سکیں تو کیا بُرا ہے بھئی یہ انسان — پتہ نہیں آگے کیا ہو۔ وقتی طور پر اسے رنجیدہ کرنا ٹھیک نہیں — اس نے اس کے چہرے کی اداسی کو دیکھ کر سوچا —

"اگر میں آپ کی تجویز منظور کر لوں تو آپ کو خوشی ہوگی؟"

نہیں غصہ آئے گا — اس نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

رحیلہ نے اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ننھے بچے ایسے تو نہ روٹھو —

وہ ایک دم کھِل گیا۔ "ہاں تو پھر؟" — وہ بندوق کا کندہ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔

"چلیے منظور" رحیلہ نے شفقت بھرے لہجے میں کہا — پھر وہ باہر آیا برآمدے سے بیگ اُٹھایا۔ رحیلہ گیٹ تک اسے چھوڑنے آئی۔

"اچھا کل میں ایک بڑی خطرناک مہم پر جا رہا ہوں۔ اگر شہید نہ ہوا تو پھر ملیں گے — ویسے اس عمر میں شہادت بڑی حسین چیز ہے"

"گڈ" — اس کے ذہن میں جیسے آگ سی بھڑک اُٹھی — "مسرت کے اس لمحے پر ساری زندگی بھی قربان ہو جائے تو کیا ہے؟ — ڈی۔ ایچ لارنس نے ایسی ہی کوئی بات کہی تھی ناکہ مسرت کی انتہا پر مر جانا چاہیئے وغیرہ — مگر میں ایسے تو مرنے کا قائل نہیں، کچھ کر کے مرنا چاہیئے" وہ سوچتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ ہلا کر جیپ اسٹارٹ کر دی۔

"واہ رے وقت — کیسا کھیل تو نے کیا — واحد لڑکی جو زندگی میں اچھی لگی مگر کیسے وقت؟ — وقت انسان کو کیسے دھوکے دیتا ہے، وہ کتنا بے رحم ہے — اسے حیرت تھی کہ وہ جو اتنا خودسر اور مغرور تھا کیوں اس لڑکی سے محبت کا جواب پانے کے لیے — مار دو گولی خودسری اور غرور کو — کبھی کبھی ہار جانے میں بھی لذت ہوتی ہے تو پھر عورت سے جیتنے کے لیے تو ہارنا ہی پڑتا ہے — میں نے پہلی بار جب پسرور روڈ پر اسے دیکھا تھا تو پہلی ہی نظر میں اسے دل کی تمام تر گہرائیوں سے چاہنے لگا تھا — اب منطقی لوگ خواہ اسے کچھ بھی کہیں۔

اس رات ہمیشہ سے زیادہ شور برپا تھا — ایسا شور کہ کان پھٹے جا رہے تھے اور دل دہلا جا رہا تھا — اس دن ہوائی حملے شہری علاقے پر بھی ہوئے گھمسا کام — اور پھر تین بجے فائر بندی ہو گئی مگر اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ یہاں فوجی ہسپتال میں کھڑی ہے اور کیپٹن فاروق پٹیوں میں جکڑے اس کے سامنے ہیں — اٹھارہ گھنٹوں بعد انہیں ہوش آیا ہے۔ کئی بوتلیں خون دیا جا چکا ہے — ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ وہ بڑی بے فکری سے مسکرا کر باتیں کر رہا تھا — رحیلہ کو حیرت ہو رہی تھی — میں اس شخص کو کبھی نہیں سمجھ سکتی — "جاوید یار مجھے دو تمنائیں تھیں دونوں پوری ہو گئیں" — اس نے سنجیدگی سے کہا — "ایک تو وطن کے دفاع میں شہید ہونے کی اور — اور — ویسے مجھے کل صبح مہم پر روانگی سے قبل معلوم ہو گیا تھا کہ میں شہید ہو جاؤں گا — جب میں نے حسب معمول برکت کے لئے قرآن پاک کھول کر دو چار آیتیں پڑھنا شروع کیں تو یہی آیت سامنے تھی — "ہم نے تم سے پہلے کسی آدمی کو لافانی نہیں بنایا — پھر کیا اگر تو مر گیا تو وہ رہ جائیں گے — ہر جی کو موت چکھنی ہے — ہم تم کو جانچتے ہیں بھلائی سے اور بُرائی سے اور سب کو ہماری طرف لوٹنا ہے" — یہ لڑائی بھی تو دوسری عالمی جنگ کے بعد ٹینکوں کی سب سے بڑی لڑائی تھی — رحیلہ بھئی تم کبھی جو مورتیں بڑی بہادر ہوتی ہیں —" وہ ہنس پڑا — رحیلہ تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ یہ اس بات پہ کس قدر نازاں ہے کہ — "میں خطرناک مہم پر گیا تھا وہ مقصد پورا ہو گیا — یہ اور بات کہ واپس آنے کا ہوش ہی نہ رہا اور مجاہد واپس آنے کی خواہش لے کر جاتا بھی کب ہے؟ — وہ کہے جا رہا تھا۔

اور پھر وہ اس رات چپکے سے ختم ہو گیا اور اس کی لاش کو راولپنڈی پہنچا دیا گیا — کمال ہے! گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو رے ان

مردوں کی ہر بات ہی نرالی ہوتی ہے ـــــ مرنا، جینا، محبت، نفرت، سب بے تکی ـــ اسے بھلا کیا ملا مجھے اس دشت ویران میں سرگرداں بھٹکنے کے لئے چھوڑ کر! ـــــ اس کے سامنے بے شمار کتابیں موجود تھیں مگر وہ خود وہاں موجود نہیں تھی ـــ البتہ اس کی خودداری نے اس کے چہرے پر شکن بھی نہ آنے دی، نہ کسی کو ذرا بھی پتہ چلا کہ اس پر سے کیسا طوفان گزر گیا ـــ اور پھر جب کسی طرح بھی اس کے سلگتے ذہن کو تسکین نہ ہوئی تو اس نے قرآن مقدس کھول لیا۔

وہ رات بے حد خاموش تھی۔ فائر بندی ہو چکی تھی اور اس تاریکی اور سکوت میں جانے کیسا احساس اس کے اندر رینگ رہا تھا ـــ غم ایک ایسی بھاری گھنٹی ہے جو ایک بار بلا دی جائے تو بجتی چلی جاتی ہے ـــ شیکسپیئر کی اس سے کیا مراد تھی ـــ یہی نا کہ ـــ کہ ـــ آسمان غمگین بادلوں میں گھرا ہوا تھا ـــ رات کی تاریکی کسی عفریت کی طرح ہر شے نگل رہی تھی ـــ اس لامحدود کائنات کا لازوال سکوت مجھے خوفزدہ کر دیتا ہے ـــ اسے پاسکل کا جملہ یاد آیا ـــ اور وہ تاریکی اور خلا میں گھورتی رہی ـــ سب واہمہ ہے غم اور خوشی اور آنند اور سکون ـــ پھر آیۃ خداوندی اسے یاد آئی اور وہ سکون کے ساتھ سو گئی۔

اور پھر زندگی کا وہی چلن ـــ یہ سب کچھ اتنے مختصر دنوں میں ہو گیا! وقت کا کیا ہے؟ اور واردات کا کیا ہے؟ بڑی سے بڑی واردات کے لئے بس ایک پل چاہیئے۔ سوال صرف واردات کی نوعیت کا ہے ـــ زندگی کے ہنگامے تیز تر ہو گئے۔ ایک انقلاب برپا ہو گیا ـــ مگر جب کسی پھول پر انفرادی طور پر خزاں آجائے اور اس کی پتیاں بکھر کر فنا ہو جائیں تو گلستاں میں لاکھ بہاریں آئیں پھر کیا! ـــ اس نے نظریں اٹھائیں۔ بھیا اس میجر کے ساتھ واپس آچکے تھے۔

"بھئی سب مکان بمباری اور گولہ باری سے ملبے کا ڈھیر ہو گئے اس لئے فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا۔ چلو واپس چلیں" ـــ یہ میجر صاحب ایسٹ بنگال رجمنٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ جاوید بھیا کہہ رہے تھے ـــ زہرہ ان سے باتیں کر رہی تھی، رحیلہ خالی خالی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی ـــ پھر کار واپس چل پڑی ـــ ہر طرف بس ویرانی اور بے سروسامانی چھا رہی تھی ـــ سب کچھ وہی ہے ـــ صرف وہی لٹ چکی ہے ـــ واردات کے لمحے بہت تیز بھاگے مگر وہ ان سے بھی آگے بڑھ گئی۔ ـــ

اس نے پچھلی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی ـــ اور اس کے آنسو جو آج تک ایک لمحے کو بھی نہ بہہ سکے تھے ـــ آج جونڈا کے محاذ کی ویرانی کو دیکھ کر بہہ نکلے ـــ ایک لمحہ منجمد ہو کر ٹھٹھک گیا ـــ خون آلود چہرہ لئے شام نیچے اتر آئی ـــ سیالکوٹ پسرور روڈ کی ویرانی کئی گنا بڑھ گئی ـــ پسرور روڈ پر ایک شام کے ایک پل نے پھیل کر زندگی کو جیسے محیط کر لیا ہے! ـــ اس نے اس پل میں ڈوبتے ہوئے سوچا۔

خالد طور

سائیں موسم

(۱)

بلکسر آئل کمپنی کی آؤٹ فیلڈ ہے چکوال سے تیرہ میل پرے، تلہ گنگ سے گیارہ میل ادھر، چکوال سے تلہ گنگ جانے والی تارکول کی چھوٹی سی سڑک دو تھمبوں کے بیچوں بیچ نمائشی سے گزر جاتی ہے۔ سڑک کے جنوب میں کچے مکانوں والا بلکسر گاؤں ہے۔ شمال میں خوبصورت بنگلوں، سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی لمبی لمبی کوارٹروں کی لائنوں والی بلکسر کالونی ہے۔ جنوبی بلکسر میں اکثر رات گئے تک دیوں اور لالٹینوں کی مدھم اداس روشنی میں لوگ بیٹھے میراثیوں کا تماشا دیکھتے ہیں۔ شمالی بلکسر میں اکثر رات گئے تک کلب میں تیز بجتی ہوئی دھنوں پر رقص ہوتا ہے۔

ہم شمالی بلکسر میں رہتے تھے۔

اگر ایک دائرہ کھینچ دیا جائے تو شمالی بلکسر کے ماسکہ پر دو خوبصورت لیکن تنہا بنگلے عجب متانت سے کھڑے نظر آئیں گے۔ نگاہ ان بنگلوں کے مشرق میں دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کے اوپر، اکا دکا درختوں میں سے ہوتی ہوئی افق سے پہلے ایک گدلی دھندلی لکیر پر جم جائے گی جہاں سے دھواں اٹھ رہا ہوگا۔ دو میل دور یہ ماڑی گاؤں ہے۔ مغرب میں ایک میل کے فاصلے پر اٹک آئل کمپنی کا پمپ اسٹیشن ہے جہاں چوبیس گھنٹے گیس جلتی رہتی ہے۔ جنوب میں ایک میل کے فاصلے پر چکوال سے تلہ گنگ جانے والی سڑک ہے۔ جنوب مشرق میں کلرکوں اور مزدوروں کے کوارٹر ہیں۔ بلکسر کا سب سے زیادہ آباد حصہ یہی ہے۔ جنوب مغرب میں کمپنی کا دفتر ہے۔ اس کے آگے سڑک کے جنوب میں بلکسر گاؤں ہے۔ شمال مغرب میں خوبصورت بنگلے ہیں۔ شمال میں دور تک جنگلی خودرو بیروں کی جھاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے جہاں کمپنی نے فالتو لوہے کا سامان ڈال رکھا ہے۔ اس سامان میں لوہے کے لمبے لمبے پائپ کثرت سے نظر آتے ہیں۔ مقامی لوگ جھاڑیوں کے اس سلسلے کو اس لحاظ سے "پمپ جھاڑ" کہتے ہیں۔ پمپ جھاڑ کے شمالی کنارے پر چھوٹے سے گاؤں کو منڈے کہتے ہیں۔

ماسکہ پر دو تنہا بنگلوں میں ایک ہمارا تھا۔

پمپ جھاڑ کے جنوبی کنارے پر ان بنگلوں سے چند سو گز کے فاصلے پر پیر قدرت اللہ شاہ کی ڈھوک ہے۔ ڈھوک کے سامنے ایک اونچا پھلاہی کا درخت خوفناک نزاکت سے جھکا ہوا ہے جس کے چاروں طرف مٹی کا گول سا چبوترہ بنا ہوا ہے۔ اس اونچے درخت پر پیر کا جھنڈا بڑی شان سے پھڑپھڑاتا رہتا ہے۔ مقامی لوگ اس ڈھوک کو "بادشاہ جی ڈھوک" کہتے ہیں۔ یہاں کے دیہاتی پیر کو ادب سے "باوا" کہتے ہیں۔

آج سے دس سال پہلے میری عمر دس سال تھی میری ہم عمر نوکرانی نارو اور میں اکثر دوپہر کو پمپ جھاڑ میں جنگلی بیر توڑنے جاتے تھے۔ ہم بے تکلف تھے۔ جب کسی جھاڑی میں کسی سرخ ہونے پر پہنچائی ہوئی نظر پڑ جائے جب میں خاردار ٹہنیوں کو پکڑتا تو نارو جھپٹ کر کشتی لڑنے لگ جاتی میں مڑ کر دیکھتا تو نارو اپنی شلوار گھٹنوں سے اوپر اٹھائے رانوں پر زور زور سے ہاتھ مار رہی ہوتی۔ لڑکی سے کشتی لڑنا آسان کام نہیں، میں کبھی نہ لڑ سکا۔ نارو زور زور سے چیخ کر رہی کسی لڑکے

سے لڑتے ہوئے اُسے گرا کر مجھے اتنا ہی لطف آتا تھا جتنا کسی بچے کو قینچی سے تتلی کا سر کاٹنے میں آتا ہے۔ اور نارو کوئی تتلی نہ تھی کہ اُس کا سر کاٹ دیا جاتا۔ گول سا چہرہ تھا، رنگ گورا تھا، آنکھیں نیلی اور بھوری تھیں۔ ناک غیر معمولی حد تک اونچی اُٹھی ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت تھی۔ امی اُسے بلی کہا کرتی تھیں۔ امی کا خیال تھا کہ وہ بلی کی طرح مکار تھی۔ شاید ہو گی، مجھے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ ہم بہت جلد علیحدہ ہو گئے تھے۔ بہرحال وہ مجھے اچھی لگتی تھی، ہم ساری دوپہر جنگلی بیر توڑنے، آنکھ مچولی کھیلنے، لڑنے اور پھر آپ ہی من جانے اور تھک کر لمبی لمبی گھاس پر لیٹ کر باتیں کرنے میں گزار دیتے تھے۔ جب ہم ساتھ ساتھ لمبی لمبی گھاس پر لیٹ جاتے تو نارو مجھے کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ کہانی ختم ہونے سے پہلے ہی ہم کسی نہ کسی بات پر ضرور اُلجھ پڑتے اور روٹھ کر، منہ بنا کر آگے پیچھے گھر چلے آتے۔ نارو چائے کی پیالیاں میز پر سجانے کے لئے ڈائننگ روم میں چلی جاتی اور میں باہر لان میں تتلیاں پکڑنے چل دیتا۔

وہ بہار کا موسم تھا۔ لان میں سُرخ اینٹوں سے بنی ہوئی چھوٹی سی روش، خوبصورت کیاریوں سے نکلتی ہوئی بیرونی پھاٹک تک چلی جاتی تھی۔ لان دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ دائیں جانب ڈیلیا اور پنک کے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ بائیں جانب گلاب اور سبز رنگ کے پھولوں کے درمیان بے شمار پیلے پیلے پھول تھے جن کا درمیانی حصہ سیاہ مخملیں روئیں دار اُبھرا ہوتا ہے۔ اس اُبھرے ہوئے حصے سے اُٹھتی ہوئی خوشبو کچھ یوں محسوس ہوتی تھی جیسے ایک مدت تک ہواؤں کے سمندروں میں مچھلی کی طرح تیرتی رہی ہے اور اس آوارگی نے اسے لطیف اور البیلا بنا دیا ہے۔

اُن پھولوں کے اُبھرے ہوئے سیاہ گول گول نقطوں سے شہد کی بھنبھناتی ہوئی مکھیاں دیوانہ وار ٹکراتی تھیں۔ میں بھنوروں اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں تتلیاں پکڑنا بھی بھول جایا کرتا تھا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سچ مچ کوئی پریوں کی شہزادی اُڑتی ہوئی آتی ہے اور اپنے غیر مرئی پروں سے میرے جسم کو چھوتی ہوئی نہ جانے کدھر کو نکل جاتی ہے۔ میرے بدن میں کپکپی سی دوڑ جاتی اور میں اس کے بعد آنے والے خوشبودار جھونکے میں اس اَن دیکھی شہزادی کا منتظر رہتا۔ پھر میرے چاروں طرف روشنی کا باریک پردہ سا تن جاتا۔ اس کے آگے دھند سی چھا جاتی۔ اس دائرے میں ایک میں ہوتا، پیلے پیلے پھول ہوتے، شہد کی بھنبھناتی ہوئی مکھیاں، اور بھیں بھیں کرتے بھونرے ہوتے، گھاس میں چھپے ہوئے، گاتے ہوئے ٹڈے ہوتے اور ایک اَن دیکھی پری اُڑتی پھرتی۔ میرا جی چاہتا کہ پھولوں پر لیٹ جاؤں اور زمین کا یہ پھولوں بھرا خوبصورت ٹکڑا ایسی جگہ چلا جائے جہاں اور کوئی نہ آ سکے پھر جب کوئی بھونرا میری آنکھوں کے سامنے ہوا میں تھرکنے لگتا تو مجھے شاید "خندہ" کا ایک جملہ یاد آ جاتا "تیرے چہرے پر بھونرے کو پھول کا دھوکا ہو گیا، اور وہ پاگلوں کی طرح تیرے چہرے کے چکر کاٹنے لگا"۔ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی کہ کوئی مجھ سے بھی یہ کہے لیکن وہاں کوئی نہ ہوتا۔ نارو مجھ سے روٹھی ہوتی۔ میں مڑ کر دیکھتا تو اکثر وہ برآمدے میں کھڑی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی ہوتی۔ میں غصے میں گھاس کو ٹھوکریں لگاتا اُس کی سمت چل دیتا۔ ٹھوکریں لگنے سے گھاس میں چھپے ہوئے ٹڈے میرے سامنے دور تک اُچھلتے چلے جاتے ۔ ۔ ۔ !

(۲)

پھر ایک ایسی دوپہر آئی جب ہم سب جھاڑ کے اونچی اونچی جھاڑیوں میں گھرے ہوئے لمبی لمبی گھاس کے ایک ٹکڑے پر بیٹھے تھے۔ نارو کے سُرخ دوپٹے پر ہم چار کڑے مارے آمنے سامنے بیٹھے جمع کئے ہوئے جنگلی بیر کھا رہے تھے۔ نارو نے ایک خوفناک کہانی کا آغاز کیا۔ جنوں کی باتیں، بھوتوں کے قصے، درندوں سے لڑائیاں، سانپوں کے ناچ، غرض دنیا بھر کی خوفناک باتیں اُس کہانی میں تھیں۔ کبھی کبھی میں چونک اُٹھتا اور خوفزدہ نگاہوں سے جھاڑیوں کو دیکھتا۔ مجھے اس طرح جھاڑیوں کو دیکھتا پا کر نارو بھی ڈر جاتی۔ کہانی اپنی بلندی پر تھی۔ دفعتہً نارو چھلانگ مار کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر اُس کے حلق سے ایک چیخ چنگھاڑ بن کر نکلی۔ اُس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ ایک تیز چبھتی ہوئی آواز آئی "کیا کر رہے ہو... ایں؟" میں آواز کی سمت گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی پوری طاقت کے ساتھ چلایا اور بھاگتی ہوئی نارو کے پیچھے بھاگا۔ بھاگتے ہوئے میں نے دوپٹے کا ایک کنارہ پکڑ لیا۔ ایک جھاڑی سے اُلجھ کر دوپٹے کا ایک کونہ جھاڑی کے ساتھ ہی لٹکتا رہ گیا۔ کپڑا پھٹنے کی آواز سے میرے جسم میں کپکپی سی

پیدا ہوئی۔ ہم جھاڑیوں میں آڑے ترچھے بھاگتے ہوئے غیر معمولی ہیبت ناک انداز سے چیخ رہے تھے۔ سڑک کی آواز پھر گونجی۔ دوپٹہ آدھا ایک جھاڑی سے اٹک گیا۔ ہم چیختے چلاتے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ پھر کپڑا پھٹنے کی آواز آئی۔ گھر کے قریب میرے ہاتھ میں دوپٹے کا بس وہی پلو رہ گیا جسے میں نے تھاما تھا۔

وہ کیا شے تھی؟ کیا وہ آدمی تھا؟ نہیں بس وہ ایک شے تھی ——— ایک ڈراؤنی شے۔ کالا رنگ تھا، ایک آنکھ، سر گنجا، بڑے بڑے مٹیالے دانت اور لٹکا ہوا نچلا ہونٹ۔ ٹیڑھے ہاتھ، خمیدہ ٹانگیں۔ کوئی کبڑی شے ——!

"وہ کیا تھا؟" نازو نے مجھ سے پوچھا۔ وہ تھر تھرا رہی تھی۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں

"وہ کیا تھا؟" میں نے نازو سے پوچھا اور ہم ایک بار پھر پہلے کی طرح خوفناک انداز سے چیختے چلاتے دالان میں دوڑے۔ خالی برآمدے میں یکلخت ہمیں امی نظر آئیں۔ ہم دونوں اُن سے لپٹ گئے۔ ہماری چیخیں اب رونے میں بدل گئیں

"کیا ہوا... کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ کیوں.... کیوں؟" امی بھی گھبرا گئیں۔ ہم امی کو کچھ نہ بتا سکے کہ وہ کیا تھا۔ ہمیں خود بھی معلوم نہ تھا ہم بس اتنا بتا سکے کہ وہ کوئی شے تھی جس نے ہمیں ڈرایا تھا امی نے ہمیں ایک ایک چانٹا جڑدیا اور غصے سے چیخ کر بولیں "خبردار جو آئندہ تم پیپ جھاڑ گئے..... جہنم میں جائیں تمہارے بیر"

پھر جب ہمارے حواس بحال ہوئے تو ہم نے خوب کہانیاں گھڑیں کہ وہ ایک بھوت تھا..... وہ آیا..... اُس نے ہمیں کہا کہ میں تمہیں کھا جاؤں گا۔ ہم نے کہا..... تو ہمیں کیوں کھائے گا..... وہ بولا ..... بس کھا جاؤں گا..... نگل جاؤں گا۔ ہم نے پوچھا ..... کیسے نگلے گا۔ وہ دانت نکال کر آگے بڑھا..... بس..... ہم نے اسے پتھر مارے اور پھر اسی طرح پتھر مارتے ہوئے گھر تک آگئے اور وہ بھاگ گیا.....!

"تین بجے کے قریب اباجی دفتر سے آئے تو امی نے بڑے ہی خوفناک ڈھب میں سب بات بتائی۔ نازو نے خود ساختہ قصہ سنایا۔ میں صرف اتنا سا سچ بولا کہ وہ کوئی ڈراؤنی شے تھی۔ سر گنجا تھا۔ ایک آنکھ پھوٹی ہوئی تھی۔ ٹیڑھے ہاتھ تھے اور ٹانگیں بھی مڑی ہوئی تھیں اور وہ شے کبڑی بھی تھی۔" یہاں ابا جی نے اونچا قہقہہ لگایا پھر انھوں نے نازو سے پوچھا کیا کہا تھا اُس نے؟..... میں تمہیں کھا جاؤں گا؟"

"جی ہاں — کہا تھا۔" نازو نے جھوٹ بولا

"اچھا میں پوچھوں گا اُس سے — بچوں کو ڈراتا ہے! میں سمجھتا تھا بڑا مسکین ہے۔" اباجی مسکرا رہے تھے۔

"کون ہے وہ؟" امی نے پوچھا

"سائیں موتم"

"سائیں موتم!" ہم سب بیک زبان حیرت سے بولے

"ہاں — موتم — نام ہے اُس کا۔" اباجی نے کہنا شروع کیا "پیر صلابت شاہ کا مرید ہے۔ تم نے دیکھے نہیں ملنگ لوگ — بس اسی طرح کا ہے۔ گلے میں مالا ہوتی ہے۔ ہاتھوں میں کڑے ہوتے ہیں۔"

"محسن ہوگا اس کا نام" امی نے کہا۔

"نہیں — محسن نہیں — موتم۔" اباجی نے ہنستے ہوئے کہا۔

مجھے اور نازو کو یقین نہ آیا کہ وہ ڈراؤنی شے کوئی انسان ہو سکتی ہے۔ امی آج تک اُسے سائیں محسن ہی کہتی ہیں۔ ہم پھر کبھی پیپ جھاڑ کی طرف نہ گئے اور پھر تعلیمی سلسلے سے مجھے بلکسر چھوڑنا پڑا۔

(۳)

چھ سال گزر گئے۔ میں واپس بلکسر جا رہا تھا۔ بس میں اپر کلاس کی اگلی سیٹ پر میں بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بھابی اور بہن عصمت تھی اور ان کے بائیں ہاتھ

کی سیٹ پر ایک بھینگا سا شخص بیٹھا تھا۔ ایک چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں بس رکی تو میں نیچے اترا۔ دھوپ خوشگوار تھی۔ اچانک وہ بھینگا سا شخص میرے قریب آیا۔

"میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

"دیکھا ہوگا —— کہاں دیکھا تھا آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ بلکسر میں رہتے تھے؟"

"ہاں —— وہیں رہتا تھا۔" میں نے اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کی

"پھر آپ کہیں چلے گئے تھے؟"

ہاں اب میں واپس جا رہا ہوں"

"آپ پمپ جھاڑ کے پاس والے بنگلوں میں سے ایک میں رہتے تھے" وہ مسکرایا

"ہاں —— اب بھی وہیں جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"جانتا ہوں ——" اس نے زور سے قہقہہ لگایا "تو آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں ملازمت شاہ کا بیٹا جابر شاہ ہوں۔ آپ کے بنگلے کے پاس وہ جو ڈھوک ہے نا —— ہماری ہے"

میرے ذہن میں سائیں موسم کا نام گونجا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "وہاں ڈھوک میں —— ایک سائیں ہے —— کیا نام ہے اس کا، سائیں موسم"

"ہاں —— ہاں، وہ ہمارا ہی بالکا ہے"

"کیا اب بھی وہیں ہے؟" میں نے پوچھا

"تو اور اسے کہاں جانا ہے" جابر شاہ نے "اور" کو غیر معمولی حد تک لمبا کھینچا

"بچپن میں ایک دن میں اس سے ڈر گیا تھا" میں نے مسکرا کر کہا

جابر شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا "وہ خبیث ہے ہی ڈراؤنا"

"موسم ——" میں نے کہنا شروع کیا "موسم —— بھئی نام خوب رکھا ہے اس نے"

"اجی اصلی نام سرفراز ہے"

"تو یہ موسم کیوں ——؟" میں نے پوچھا

"بس جی ..... اس کو یقین ہے کہ جب وہ مر جائے گا تو موسم ختم ہو جائیں گے یعنی اگر برسات میں مرا تو سدا برسات رہے گی اگر سردی میں مرا تو سردی اور اگر بہار میں ——"

"میں سمجھا —— میں سمجھ گیا" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ بس نے ہارن دیا اور ہم اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھے

"موسم —— اگر گرما میں مرے گا تو گرمی رہے گی۔ اگر سردی میں مرا تو سردی —— اسے کس موسم میں مرنا چاہئے؟" میں نے یونہی مسکراتے ہوئے سوچنا شروع کیا۔ بس چلتی رہی ——!

جب میں بلکسر پہنچا تو برسے بدل چکی تھی۔ نارو کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ پنڈی گھیب کے پاس گھیال نامی گاؤں میں ایک دوکاندار کی بیوی بن چکی تھی۔ نارو کا باپ مر چکا تھا۔ میں بھی چار فٹ پانچ انچ سے بڑھ کر پانچ فٹ دس انچ لمبا ہو چکا تھا۔ میرے گول ماتھے کے اطراف میں بال اڑ گئے تھے، وہ لڑکیں سی

---

۵ مرید

نکل آئی تھیں جنھیں دیکھ کر مجھے بڑے ہو جانے کا احساس ہوا کرتا تھا۔

وہ بہار ہی کا موسم تھا۔۔۔!

گاؤں میں اب بھی پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ پھولوں سے اُٹھتی ہوئی خوشبودار ہوا اب بھی وہی تھی۔ کسی غیر مرئی شے کا احساس، اب بھی تھا لیکن اِدراک بدل چکا تھا۔ اب وہ پریوں کی شہزادی نہ تھی۔ اب وہ سراپا میرے تخیل کا حسن تھی۔ وہ اب بھی اپنے اَن دیکھے ہاتھوں سے میرے چہرے کو چھو کر نکل جاتی۔ اب بھی میرے جسم میں کپکپی سی دوڑ جاتی۔ پیلے پیلے پھولوں کے اُبھرے ہوئے سیاہ نقطوں میں دانہ نما حصے سے اب بھی شہد کی مکھیاں ٹکرا کر بھنبھناہٹ پیدا کرتی تھیں۔ اب بھی بھونرے ہوا میں تھرکتے تھے لیکن مجھے کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور میں اُداس تھا۔

مجھے سائیں موسم کا خیال آیا۔ جبر شاہ نے مجھے راستے میں ڈھوک آنے کی دعوت دی تھی۔ میں ڈھوک کی سمت چل دیا۔ ڈھوک اور جنگلے کے درمیان بے ثمار جھاڑیوں اور آک کے پودوں کے درمیان پتھریلی پگڈنڈی ہے۔ جب میں ڈھوک کے قریب پہنچا تو اونچے مضبوط جسم اور چوڑے جبڑے والا ایک کتا جھاگیں لگاتا ہوا میری سمت آیا۔ میں بچاؤ کے لئے ایک جھاڑی کے پیچھے کود گیا اور پاؤں کے تلے بکھرے ہوئے اَن گنت پتھروں میں سے دو تین پتھر اٹھا لئے۔ کتا مجھے مسلح دیکھ کر چند گز کے فاصلے پر رک گیا اور زور زور سے غرّانے اور پچھلے پیروں سے مٹی اُڑانے لگا۔ ڈھوک سے ایک تیز چیختی ہوئی آواز آئی "ہے ریچھ۔۔ ہے حرام مال۔۔۔ مُڑ پیچھے۔۔۔ مَر تیری ماں۔۔۔"

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے یہ تیز چیختی ہوئی آواز میں نے کبھی کسی خواب میں بھی سُنی تھی۔ وہ سائیں موسم ہی تھا۔ وہی کبڑا جسم، پھوٹی ہوئی آنکھ، تیر سے ہاتھ، مُڑے ہوئے بازو، خمیدہ ٹانگیں اور لٹکے ہوئے نچلے ہونٹ کے اوپر لٹکتے ہوئے سیاہ گندے ٹوٹے ہوئے دانت، ویسی ہی تیز چیختی ہوئی آواز۔۔۔ میرے ذہن میں دو بچے تیزی سے دوڑے اور ایک دوپٹے کی دھجیاں ہوا میں اُڑ گئیں۔ میں مسکرا دیا۔ کتا دُم ہلاتا واپس سائیں کے قدموں میں چلا گیا۔

"تم سائیں موسم ہو؟"

"جی صاب جی" اُس نے کہا

"جبر کہاں ہے؟"

"باواجی و۔۔۔۔جی وہ اندر ہیں" سائیں نے ڈھوک کے اندرونی کمرے کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ ہم دونوں کمرے کی سمت چلے

"ہے لا۔۔۔۔ آؤ جی آؤ جی" جبر شاہ چارپائی سے چھلانگ لگا کر اٹھا "مجھے پتہ تھا جی۔۔۔ آپ آئیں گے۔"

"میں نے وعدہ جو کیا تھا" میں نے کہا

"بلے۔۔۔جی، وعدہ پورا کرنا مردوں کا کام ہے" ایک اور بولا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ بھوری بھوری خطرناک آنکھیں تھیں جسم خاصا مضبوط تھا، رنگ، زنگ لگے لوہے کی طرح جلا جلا سا تھا۔ وہ دانت پیس کر بات کرتا تھا اور ذرا سا لعاب باہر گرتا تھا۔ یہ سائیں ملک تھا۔ باقی کمرے میں ایک دُور وحی، ایک لنگڑا مصنوعی پلاسٹک کی ٹانگ والا چوکیدار اللہ داد تھا۔ یہ سب کو ترشاہ کے مرید تھے۔ جابر نے سب سے میرا تعارف کرایا۔

سب سے پہلے سائیں ملک بولا "کیا ذات ہے جی آپ کی؟"

"ذات؟" میں نے مسکرا کر کہا "کوئی ذات نہیں میری"

"نو جی۔۔۔ ایسا بھی کہیں ہوگا" لنگڑا اللہ داد بولا

"کوئی ذات تو ضرور ہوگی آپ کی" سائیں ملک نے کہا

"نہیں — میری کوئی ذات نہیں" میں نے ہنس کر کہا اور وہ سب کھلکھلا کر ہنس دیئے جیسے میں نے بڑی احمقانہ بات کی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ واقعی یہ میری حماقت تھی۔ پوٹھوہار اور دھنی کے علاقے میں پہلے ذات پوچھی جاتی ہے پھر سلام کیا جاتا ہے۔ پہلے نسب پوچھا جاتا ہے پھر حال اگر آپ سید ہیں ملک ہیں، راجہ ہیں تو آپ کی ہر احمقانہ بات درست تسلیم کی جائے گی۔ اگر آپ کچھ اور ہیں تو آپ کی ہر بات ہنسی میں اڑائی جائے گی یہاں عزت سے رہنے کے لئے سید، راجہ اور ملک ہونا بے حد ضروری ہے.....!

(۴)

جلسہ کے بجائیں بجائیں کرتے بنگلے میں مجھے "تنہائی کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا۔ ڈھوک میں چند دوست تھے لیکن آباجی میرا وہاں جانا پسند نہیں کرتے تھے، وہ کہتے تھے" بھنگیوں، چرسیوں اور بدنام لوگوں کی جگہ ہے۔ شریفوں کا وہاں کوئی کام نہیں۔ یہاں مجھے شرافت کے نام سے چڑ آتی تھی۔ شریف ہونا بھی اچھی خاصی مصیبت ہے۔ جب میں دو تین بار ڈھوک گیا تو ہمارے پڑوسی میجر نے مجھے بلایا۔ وہ بڑے غصے سے بولا "وائے — یور فادر از این آفیسر — ہی از اے نوبل پرسن۔ یور ایکٹیویٹیز آر ویری بیڈ — تم وہاں کیوں جاتے ہو؟ — اپنے ڈیڈی کی پوزیشن کا خیال کرو تم میرے ساتھ کلب جایا کرو — وہاں اچھی سوسائٹی ہے۔ تمہاری ایج کی لڑکیاں ہیں، لڑکے ہیں — اُن سے دوستی بناؤ — ویز آر آل لیجر — شاید تم وہاں نشہ کرنے جاتے ہو — میں ڈیوٹی پر جاتا ہوں تو جاؤ — میرے فریج سے وہسکی کی بوتل نکال لو — بھنگ تو ذلیل لوگ پیتے ہیں — اِٹ از ویری بیڈ — ویری بیڈ"

بھنگ ذلیل لوگ پیتے ہیں۔ وہسکی باعزت لوگوں کے لئے ہے۔ سب درست ہے۔ میں ہر بات تسلیم کرتا ہوں۔ اس لئے کہ کسی کے سامنے میں اُسی کے ذہن کے مطابق سوچتا ہوں اور جو کچھ کوئی کہتا ہے اپنے ذہن میں درست سمجھ کر ہی کہتا ہے لیکن کسی بات کو اپنے طور پہ ماننا یا نہ ماننا تو میرے اپنے بس میں ہے۔

دوسرے دن میں پھر ڈھوک چلا گیا۔ مئی کے آخری ایام تھے، وہ لوگ پھلاہی کے جھنڈے والے درخت کے نیچے چٹائیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ سائیں موسم اور سائیں ملک بھنگ گھوٹ رہے تھے۔ سائیں موسم نے کالی ململ کی صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس میں وہ ننگا ہو رہا تھا۔ اپنی لوٹی ہوئی انگلیوں میں مشکل ڈنڈا تھامے وہ بھنگ کے پتوں کو دھادھم کوٹ رہا تھا۔ میں مٹی کے بنے ہوئے چبوترے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چبوترے کی سختی کو اپنی پشت پر محسوس کرتے ہوئے میں نے جابر شاہ کو دیکھا" یہ چبوترہ کس لئے بنایا گیا؟"

"یہاں ہمارے داداجی نے ڈیرہ لگایا تھا" جابر شاہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ بڑے فخر سے بولا" اُس وقت یہاں صرف جنگل ہی جنگل تھا۔ یہ پھلاہی کا درخت باواجی نے خود لگایا تھا، اور یہ جگہ — جابر شاہ نے چبوترے کی سمت ہاتھ اُٹھایا" یہ وہ جگہ ہے جہاں باواجی بیٹھ کر چلہ کاٹتے تھے — ہاں اور —"

"ہاں — ٹھیک ہے" میں نے کہا

"جی دیکھئے نا — ہمارے لئے یہ جگہ — "

"ہاں درست ہے" میں نے کہا

"اسی لیے یہاں ہم نے چبوترہ بنایا۔ آخر وہ بھی تو بارہے —"

"میں سمجھ گیا۔ ہاں — یہ درست ہے" میں نے تیزی سے کہا۔

سائیں موتم اور ملک بھنگ کو ململ کے کپڑے میں چھان رہے تھے۔

"پی لو بچی سرکار نال پیالا
ہو وئے جھوٹیاں نال منہ کالا ۔ ۔ ۔ ۔ ایلی"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے سائیں موتم نے آدھ سیر کا ہتھل[1] چار مرتبہ پیا اور آستین سے منہ پونچھ کر بڑبڑایا۔ چند لمحوں بعد سائیں کے جسم میں رعشہ سا نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹوٹی ہوئی انگلیاں چٹائی پر ٹیک دیں۔ ذرا سا جھکا اور سارے وجود کو جھٹکا سا دیا۔ سارا جسم ذرا اٹھا اور گر گیا۔ سائیں کی آنکھیں پھر سی گئیں ـــــ "مدد کر مولا!"

دوسرے جھٹکے پر وہ اٹھ گیا۔ ننگا رعشہ زدہ بدن ڈگمگاتا کمرے کی جانب آگے پیچھے یوں ہلتا چلا گیا جیسے کوئی آہنوسی لکڑی پر کلہاڑا چلا رہا تھا سائیں کے اندر جاتے ہی کمپنی کا چھٹی کا وسل بجا۔ میں اٹھا اور گھر کی سمت چلدیا۔ پھلاہی کی ٹھنڈی چھاؤں سے نکلتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ہوا میں تپش ہے۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے پیڑ کا جھنڈا پھڑپھڑایا میری نگاہیں اس پر جم سی گئیں۔ اچانک مجھے ایک بات سوجھی۔
میں آج سے اسے پھلاہی کا عظیم درخت کہوں گا ـــــ !

(۵)

جون کا پہلا ہفتہ تھا۔ دوپہر تھی۔ میں پھلاہی کے عظیم درخت کی چھاؤں میں چبوترے سے گندا سا تکیہ جمائے لیٹا تھا۔ میری نگاہیں پتوں سے چھن چھن کر آنے والی چمکیلی کرنوں سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے دائروں پر جم سی گئی تھیں۔ اپنی ناک کے نیچے ایک انچ کے فاصلے پر بنے ہوئے ایک چھوٹے سے دائرے میں سے گزرتی ہوئی ایک چمکیلی چیونٹی مجھے کافی بڑی نظر آئی۔ چند گز کے فاصلے پر ببولوں کی ٹہنیوں سے چمٹے ہوئے جھینگر بول رہے تھے۔ جون کی تپتی دوپہروں میں ان کی آواز بیزار کن حد تک اداس محسوس ہوتی ہے۔

اس وقت اداسی کا احساس کچھ زیادہ شدید تھا۔ اس بار معمولی سے وقت میں کئی واقعات ایسے پیش آئے جنھوں نے ہم سب دوستوں کو بیزار کر دیا۔ میں اداس لیٹا تھا۔ جابر شاہ میرے قریب تیوری چڑھائے بیٹھا تھا۔ سائیں موتم اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ سائیں ملک سر جھکائے، چٹائی پر نظریں جمائے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ لنگڑا اللہ داد اپنی پلاسٹک کی مصنوعی ٹانگ کو ایک چھڑی سے مسلسل بجا رہا تھا۔ ہم سب بیزار تھے۔

اس بار جب میں ڈھوک میں گیا تو سائیں ملک اور سائیں موتم کسی بات پر الجھ رہے تھے۔ پھر وہ سنجیدگی سے لڑنے لگے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھ" وہ گالی گلوچ پر اتر آئے۔ جابر شاہ پہلے تو خاموش بیٹھا رہا پھر چیخ اٹھا "او ملکا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الو کے بچے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کنجر خانہ ختم کرو ۔ ۔ ۔ ۔ اوئے کیا ہوگیا جو لے لیا موتم نے تیرا تمباکو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مر تو نہیں گیا تو ۔"

"اوپر باورچی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ملک چیخا "کوئی ایک بار ہو تو خیر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں تو بس باپ کا گھر سمجھ رکھا ہے خبیث نے ۔"

"تو خبیث ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیرا باپ خبیث ۔ ۔ ۔ ۔ تیرا ۔ ۔ ۔ ۔" سائیں موتم چلایا۔

جابر شاہ نے غصے سے کانپتے ہوئے اٹھ کر سائیں موتم کی پشت پر گھونسا مارا۔ وہ چلایا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا ہاتھ پڑتا میں نے جابر شاہ کو مضبوطی سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"چھوڑ دو ۔ ۔ ۔ ختم کرو ۔ ۔ ۔ ۔ بس ختم کرو" اب میں بھی چلا رہا تھا۔ جابر شاہ نے دانت کٹکٹائے۔ میری گرفت سے نکلنے کے لئے پہلو بدلے سائیں موتم کو جلتی ہوئی نظروں سے دیکھا "ماں کا ۔ ۔ ۔ پاؤلی کا پتر ۔ ۔ ۔ ۔ حرامی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاؤلی کے پتر ۔ ۔ ۔ ۔ اوئے" جابر شاہ نے میری گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی

[1] بھنگ کا پیالا

"اوے..... تیری ماں کو سؤر لے جائیں..... تیری ماں کو کتے لے جائیں ..... باحرامی..... پاؤلی کے پتر"

سائیں سر جھکائے، مار کھائے ہوئے کتے کی طرح دانت نکالتا اندر چلا گیا۔ پھر سب خاموش ہو گئے۔ میں جابر شاہ کو ملامت کرنا چاہتا تھا، نہ کر سکا، جابر شاید کچھ اور گالیاں دینا چاہتا تھا، نہ دے سکا۔ لنگڑا اللہ داد دو مرتبہ بولنے کی کوشش میں بڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔ ملک کبھی کبھی جھکا ہوا سر اٹھا کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا، نہ کہہ سکا۔ طویل خاموشی نے اداسی کو شدید بنا دیا۔ اس پر جھینگروں کی تیز چبھتی ہوئی تانیں..... میں نے گھبرا کر کانوں میں انگلیاں دے لیں

"کیا ہے؟" جابر شاہ نے پوچھا

"یہ بینڈے....." میں نے کہنا شروع کیا" میرے تو کان پھٹ گئے ہیں"

"ان حرامیوں نے بھی کونسا تھوڑا سر کھایا ہے" جابر شاہ نے ملک کی طرف ہاتھ اٹھا کر اندر کمرے کی سمت جھٹکا دیا۔ "حرامی..... مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں اور حرام خوری کرتے ہیں..... سؤر کے..... دو دن فاقہ پڑے تو پتہ چل جائے لفنگوں کو"

ایک بار پھر خاموشی کے جھونکے ہمارے احساس پر تھپیڑے مارتے ہوئے چلے۔ پھر ایک سسکی سی ابھری۔ ملک نے سر اٹھایا" میرا کیا ہے....." وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے آگے کو جھکا "میرا کیا ہے..... ایک پیالا لسی اور ایک نمکین روٹی۔ میں اسی پر جی لوں گا"

انسان ہمیشہ المناکی کا تصور اپنی ذات سے ملا کر دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہوئے ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں جانتا تھا، ملک کو اپنی حالت کی عکاسی سے کہیں زیادہ ہمیں مرعوب کرنے کا خیال تھا.....!

(۶)

میں نے اکثر محسوس کیا کہ مجھے سائیں موسم کی ذات میں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو چکی ہے۔ اب میں ہر روز ڈھوک کا ایک چکر لگایا کرتا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ میں اتنی جلدی ان لوگوں سے کیسے گھل مل گیا؟ یہ ماحول ہی بے تکلفی کی گود میں پلتا ہے۔ مجبوراً مجھے بھی اس کا اثر قبول کرنا پڑا۔ اکثر محفلوں میں جھجک اور حجاب کا پیدا کردہ بناوٹ کا رنگ جو میرے ذہن پر چڑھ جاتا تھا۔ یہاں مفقود تھا۔ چند ہی دنوں میں ہم سب بے تکلف ہو چکے تھے۔ سائیں موسم سے جو قدرتی انس مجھے پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے میری توجہ کا مرکز اسی ہستی کو بنائے رکھا.....!

اس کا نام سرفراز تھا۔ بلکسر گاؤں کے ایک جولاہے کا بیٹا تھا۔ تھوڑی سی زمین بھی تھی، اور کچھ کھڈیاں تھیں جن پر دن رات سرفراز کے گھر والے بڑی جانفشانی سے کھیس اور چادریں بنتے تھے۔ سرفراز کے ذمے کھیتی باڑی کا کام تھا۔ اس وقت سرفراز کا جسم سیدھا تختے کی مانند تھا، مضبوط بازوؤں سے ہل تھامے بلند آواز سے دوہے گاتے، چمکیلی دھوپ میں بیلوں کو ٹخارتے ہوئے سرفراز سمجھتا تھا کہ زندگی کھلے کھیتوں میں ہل چلانے اور گانے کے سوا کچھ نہیں۔

چھپال میں، ایک دن پیر صلابت شاہ نے کہا کہ زندگی کا مقصد عظیم ہے۔ ہل چلانا اور گانا کچھ بھی نہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ زندگی کی عظمت کو حاصل کرے جو سچی سرکار کا دامن تھامنے سے ملتی ہے۔ انسان جب خودی کو ختم کر دیتا ہے، سچی سرکار اسے عظیم بنا دیتی ہے۔ سرفراز کے ذہن نے یہ استدلال بہت جلد قبول کر لیا۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ زندگی کا عظیم مقصد سامنے رکھوں گا اور سچی سرکار کا دامن تھام کے عظیم بنوں گا۔

ان دنوں پیر صلابت شاہ کی ڈھوک میں سائیں ملک اور چند دوسرے ملنگ رہتے تھے۔ اخراجات بڑھ گئے تھے۔ ایک صورت تھی کہ کوئی ملنگ کاسۂ گدائی اٹھائے، در بدر دروازے پر صدا لگائے۔ سب ملنگ پرانے گھاگ تھے، کوئی آمادہ نہ تھا۔ کسی نئے شکار کی ضرورت تھی۔

جال بچھایا گیا۔ سرفراز بڑی آسانی سے پھنس گیا۔ ڈھوک میں جابر شاہ نے سرفراز کو اپنے سامنے بٹھایا۔ سائیں ملک نے بھنگ تیار کی۔ بھنگ کا پیالہ جابر شاہ نے سرفراز کو خود پیش کیا۔ سنا ہے سرفراز نے پہلے تو انکار کیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ جابر شاہ کسی عامل کی طرح اس کے حواس پر چھا گیا۔ "کیا دیکھ رہے

ہو... پی جاؤ... دل کا میل دُھل جاتا ہے سرفراز... سچی سرکار کا پیالا تمام گناہوں کو دھو دیتا ہے... پی لو، دیکھو یہ میں تمہیں اپنے ہاتھ سے دے رہا ہوں... ڈرتے کیوں ہو... کچھ نہ ہوگا... شاباش... پی لو"

اور پیالا سرفراز کے ہونٹوں سے چپک گیا

"کیا دیکھ رہے ہو... کود جاؤ... دیکھو میں نے تمہیں اس بلندی پر پہنچایا ہے... نیچے دیکھو... ہاں اِن اندھے غاروں میں کود جاؤ... سچی سرکار کا یہی حکم ہے... تمہارے سب گناہ مٹ جائیں گے... گناہ کیا تم خود مٹ جاؤ گے... فنا ہو جاؤ گے... تباہ ہو جاؤ گے... شاباش... کود جاؤ... بڑھو... آگے بڑھو... ایک قدم اور... شاباش... اُچھلو... کود جاؤ... کود جاؤ..."

اور سرفراز گہرے تاریک دلدلی غاروں میں کود گیا۔ نہ جانے کتنے سیر بھنگ سرفراز کو پلائی گئی۔ وہ اٹھارہ گھنٹے کی بے ہوشی کے بعد جب اٹھا تو ہمیشہ کے لئے اپاہج ہو گیا۔ اُسے کسی نے ہسپتال تک نہ پہنچایا۔ گاؤں کے حکیموں نے اُس کا علاج کیا۔ اُس کی جان تو بچ گئی، لیکن اب وہ سرفراز نہ تھا۔ سیدھا تختے جیسا جسم آگے کو جھک گیا۔ لمبی مضبوط ٹانگیں خم کھا گئیں۔ سڈول بازو مڑ گئے۔ انگلیاں ٹوٹ گئیں۔ ایک آنکھ عضلات کے تناؤ سے ایسی بند ہوئی کہ پھر نہ کھل سکی۔ پہلی نظر میں وہ پھوٹی ہوئی لگتی تھی۔ اُسے گھر سے نکال دیا گیا۔ مجبوراً اُس نے ڈھوک میں پناہ لی جہاں اُس کا نام سائیں موہم رکھا گیا اُس کے گلے میں کاسہ گدائی لٹکا یا گیا اور کہا گیا کہ ہر دروازے پر صدا سچی سرکار کا نام لے کر لگائیں دو، کرنا تمہارا فرض ہے، اگر کوئی کچھ دے دے تو سچی سرکار کا انعام سمجھ کر لے لینا تمہارے ذمے سچی سرکار نے یہی کام لگایا ہے۔ تم خوش نصیب ہو... یہ ریاضت ہے ریاضت... یہ کسی کسی کو ملتی ہے" ——— کھلے کھیتوں میں متوالے گیت گانے والا سرفراز اب سائیں موہم بن کر ہر دروازے پر بھیک مانگنے لگا۔ اب وہ گدا تھا، فقیر تھا اب وہ ڈھوک کے شریف انسانوں کا پالا ہوا کتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا سائیں موہم کا ضمیر بھی مر چکا ہے۔ وہ ایک ایسا پتھر ہے جسے جس وقت جی چاہے، ٹھوکر لگائی جا سکتی ہے۔ یا پھر وہ پتھر کی سی چلتی پھرتی مورتی ہے۔ ٹیڑھے بازوؤں، خمیدہ ٹانگوں، ٹوٹی ہوئی انگلیوں والی کبڑی مورتی، جو اگر اپنی پھوٹی ہوئی آنکھ دبا کر، سر جھٹک کر، ٹوٹے ہوئے کرم خوردہ میلے دانت نکال کر اجنتا کے غاروں میں چلی جائے تو وہ بھی شرما جائیں یہ بھی انسان کی تخلیق ہے۔ قدرت نے تو اسے بڑے سادہ خدوخال عطا کئے تھے اسے انسانی فن نے عظیم بنا دیا۔ میرے دل میں فن کار کا رعب بیٹھ گیا۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا سائیں کو گریبان سے پکڑ لوں، اُسے جھنجھوڑتے ہوئے چیخ چیخ کر کہوں "سائیں تو نے کھیتوں میں گندم کے لہلہاتے پودوں میں کہیں کہیں کرم خوردہ سیاہ خوشے نہیں دیکھے تھے جنہیں کسان بے دردی سے اکھاڑ پھینکتے ہیں، ماں سے جدا کر دیتے ہیں، بہنیں جدا ہو جاتی ہیں، بھائی چھٹ جاتے ہیں، گھر چھٹ جاتا ہے۔ دامیں تو نے انہیں نہ دیکھا۔ تو نے اپنا انجام نہ سوچا، تو نہیں مانے گا، تو ضدی ہے۔ کاش تو جان سکے کہ تو گندم کا کرم خوردہ سیاہ خوشہ ہے جسے بے دردی سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔ ماں سے جدا کر دیا گیا ہے بہنیں چھین لی گئی ہیں۔ بھائی مار دیئے گئے ہیں۔ گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ جلا وطن کر دیا گیا ہے۔ تو اپنے دیس میں پردیسی ہے، تو اپنوں میں رہتے ہوئے بیگانہ ہے... اجنبی ہے... اسلم کا مجرم نہیں ہے یہ ڈھوک تیری منہ بولی بہن کی ڈھوک نہیں ہے۔ یہ ڈھوک تیرا گھر ہے، جہاں تو خارش زدہ مفلوج کتے کی طرح رہتا ہے۔ تو بہت پہلے کا خریدا ہوا کتا ہے۔ اب تیری کوئی اہمیت نہیں، خارش زدہ مفلوج کتا... ذلیل... کمینہ... اُلو کا پٹھا... تو بس اسی لئے ہے کہ جب تجھے گالیاں دی جائیں تو سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا تیرے سامنے پھینکا جائے۔ جب ٹھوکر لگائی جائے تو ٹھیکرے میں پانی پلایا جائے تو بس رحم کے قابل ہے مگر تجھ پر رحم آتا بھی ہے تو مارنے کے بعد... او پاؤلی کے پتر... تیری ماں کو کتے لے جائیں...!

پھر میرے دل میں ایک باغیانہ خیال شدت سے تڑپ اُٹھا "سائیں مجھے معاف کر دے ..... میں بڑا ظالم ہوں۔ میں بے درد کسان ہوں۔ میں کرم خوردہ خوشے کو توڑنا جانتا ہوں۔ میں نے کیڑے کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔ میں بڑا ظالم آقا ہوں مجھے تجھ پر رحم آتا ہے۔ اس لئے کہ میں تجھے خوراک دیتا ہوں ... لیکن تو کسی کام کا نہیں .... کاش تو کبڑا نہ ہوتا، کاش تیرے ہاتھ سلامت ہوتے ...... کاش تیرے بازو طاقتور ہوتے۔ کاش تو تیز دوڑ سکتا تو .... تو ماڑی کی ملیاری[1] اٹھانے کی سعادت تجھے بخشتا ...

"او باؤلی کے پتر ..... تو کسی کام کا نہیں۔"

(۷)

جولائی کی جلتی دھوپ میں عاشورہ کے دن آ گئے۔ بلکسر گاؤں میں امام باڑے اور مسجد اہل سنت کی چٹائیاں ہر شام سیاہ و سفید کپڑوں سے سجنے لگیں۔ سب گاؤں کے باشندے امام باڑے اور مسجد میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ چندہ اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ چکوال سے لاؤڈ اسپیکر منگوائے تھے۔ دسویں محرم کو ایک مشہور ذاکر اور ایک عظیم مولانا، سرگودھا اور جہلم سے آنے والی بسوں سے آگے پیچھے بلکسر اڈے پر اُترے، سیاہ و سفید جلوس آگے پیچھے گاؤں پہنچے۔

صبح کے دس بج رہے تھے۔ جب میں بلکسر کی مسجد کی جانب جا رہا تھا۔ میں مولانا صاحب اور ذاکر صاحب کے وعظ سننا اور ریکارڈ کرنا چاہتا تھا۔ میری جیب میں نوٹ بک اور قلم صبح سے رکھے تھے۔

جب میں گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوا تو مخصوص دیہاتی لہجے میں کوئی قریب سے بولا "کدھر چڑھائی ہے؟" یہ لنگڑا اللہ داد تھا۔ "باواجی نے آپ کو بلایا تھا۔"

مجھے یاد آیا جابر شاہ نے مجھے آنے کی تاکید کی تھی۔ میں اللہ داد کے ساتھ چل پڑا۔

"آج سائیں موسم نے چاقو مارے ہیں" اللہ داد نے کہا۔ میں چونک کر ٹھہر گیا۔

"کیا .....؟"

"چاقو مارے ہیں" اللہ داد مسکرا کر بولا "سائیں موسم نے۔"

"کسے مارے ہیں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا:

"ہاؤ ... " اللہ داد نے دانت نکالے "کسے مارے ہیں! .... او صاحب جی، اپنے سینے پر مارے ہیں ... کسے مارے گا باؤلی کا پتر۔"

میں خاموش ہو گیا۔ اللہ داد سارا راستہ باتیں کرتا رہا۔ میں نے کچھ نہیں کچھ نہ سنا۔ بیرونی دروازے پر مجھے چند دھبے نظر آئے جو قریب پہنچتے پہنچتے جمے ہوئے خون کی طرح سیاہی مائل سرخ ہو گئے۔ پھر کوئی قریب سے بولا "باؤلی کا پتر ..... !"

بے چارہ باؤلی کا پتر ایک کچے ستون کے قریب کوڑے کے ڈھیر کی طرح پڑا تھا۔ اس کی سیاہ قمیص خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔

پھر مجھے جابر شاہ نے بتایا "بھئی ایک کام کرو ..... وہ سائیں موسم ..... حالت خراب ہے اس کی۔"

"پھر ... " میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں نے ملک کو گھوڑی دینے کے لیے کہا ہے تم ذرا دوکو ساتھ لے کر اڈے پر اکرم کے ہوٹل میں اسے لے جاؤ ..... وہاں گھوڑی پہنچ جائے گی پھر اسے دھوک پہنچا دینا ... تمہیں بھی تو گھر جانا ہے .... پیدل کیسے جاؤ گے ..... یہ آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہو رہی ہے .... ہاں .... شاید تم ....."

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے کہا "میں اسے لے جاؤں گا ... ذوالو کہاں ہے؟"

[1] سبز لوبیہ بیچنے والی لڑکی

"ہاں..... جابر شاہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دائیں ہاتھ کچے ستون کی سمت چلدیا۔ میں بھی پیچھے پیچھے گیا۔ سائیں موسم ادھ موا پڑا تھا۔ ہم نے سائیں موسم کو سہارا دیا اور امام باڑے سے باہر آگئے۔ ڈوڑو اور سائیں ملک دروازے کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

"او ملکا..... او منحوس..... ابھی تک یہاں ہے..... میں نے کہا نہ تھا..... جابر شاہ چلایا۔

"یاد ہے..... باداجی..... بس جاتا ہوں .....، ملک دھوتی کا پلو جھٹک کر سیدھا گلی میں چل دیا۔ میں اور ڈوڑو سائیں موسم کو تقریباً کندھوں پر اٹھا کر اسٹم کے ہوٹل میں لائے۔ ڈوڑو واپس چلا گیا.....!

کچی اینٹوں سے بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے کی گارے سے لپی ہوئی کچی دیواروں میں جا بجا مٹی جھڑنے سے سوراخ نمایاں تھے کچے فرش پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ گیلی زمین کی مخصوص بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ صرف ایک چھوٹا سا دریچہ گاؤں کی سمت کھلتا تھا۔ کمرے میں دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ سائیں ایک چارپائی پر لیٹا یوں نظر آ رہا تھا جیسے کسی اونٹ کی کوہان پر کالی پوری رکھی ہو۔ میں دریچے کے قریب بیٹھ گیا سورج کی ہر شعاع عمودی تھی۔ باہر کھیتوں میں پھیلی ہوئی تیز روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔

ہر کرن ایک شعلہ تھی۔ سورج سے گرتے ہوئے لاتعداد شعلوں کو چیر کر گاؤں سے آنے والی چکی کی ٹُک ٹُک نے مجھے اداس کر دیا۔ کمرے کی تاریکی، اُمس اور خاموشی نے بے دردی سے مجھ پر اپنا سارا بوجھ ڈال دیا۔ سائیں کے کالے چولے کو جمے ہوئے خون کے داغوں نے جگہ جگہ پر اکڑا کر ابھار دیا تھا۔ مجھے ان دھبوں سے خوف آ رہا تھا۔

گھوڑی کی ٹاپیں دروازے کے قریب رکیں اور سائیں ملک اندر آیا۔ وہ پسینے سے بھیگ رہا تھا اور ہانپ رہا تھا "صاب جی..... بے جا اُس اپنی ماں کے لاڈلے کو..... ہنپ..... ہزار بار دت صاب سے کہا تھا..... اپنی بوٹی نہ پی..... پر..... یہ..... ہاں..... کس کی مانتا ہے یہ حرامی پاؤلی کا پتر" میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ملک کو دیکھ رہا تھا۔ ملک مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر کچھ گھبرایا پھر اس نے سائیں کو ایک بازو سے جھٹکا دیا۔

"آنہہ..... کون ہے؟" سائیں موسم کی آواز کسی کوئیں سے نکلتی محسوس ہوئی۔

"اُٹھ..... چل ڈھوک..... صاب جی کے ساتھ"، ملک چیخا۔

"آں..... صاب..... ہاں..... پانی"، سائیں موسم نے کروٹ کی۔ ملک باہر سے پانی لایا۔ پانی پی کر سائیں موسم نے آنکھ کھولی۔ اُف!——

سائیں کی آنکھ پکی ہوئی انجیر کی طرح گلی گلی سی تھی۔ دائیں بائیں پیلا پیلا سا گندا مواد بہہ رہا تھا۔ ہم نے سائیں کو سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ گھوڑی پر صرف ایک تہہ شدہ کمبل ڈالا گیا تھا۔ میں سوار ہوا اور سائیں ملک نے اُٹھا کر سائیں کو میرے پیچھے بٹھا دیا۔ سائیں نے سسکی سی بھری اور سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سینے کے زخم پھر رسنے لگے تھے۔ میں نے باگیں اٹھائیں۔ گھوڑی کی پہلی ٹاپ پر ہی سائیں اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اُس کے کالے کالے، سوکھے سوکھے بازوؤں نے میری گردن کو گھیرے میں لے لیا۔ اُس کا سر میرے کندھے پر بوجھ کی طرح آ ٹکا۔ آگے کو جھکا ہوا سینہ میری پشت سے مس کرنے لگا۔ مجھے اپنی پشت جلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سائیں کا گرم گرم سانس میری گردن کو جلانے لگا۔ پہلے مجھے دھبوں کا خیال آیا اور میں پشت کی جلن کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے کانپ سا گیا۔ پھر نہ جانے کیوں..... مجھے کینچوؤں کا خیال آیا اور گردن پر سانسوں کے مس سے میں لرز گیا۔ جس کچی سڑک پر ہم جا رہے تھے اُس کے کناروں پر جنگلی بیروں کی جھاڑیوں کا سلسلہ بہت دور تک چلا جاتا ہے۔ سورج شدت سے آگ برسا رہا تھا۔ میں پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ سائیں غیر متناسب وقفوں میں لمبی ہائے کھینچتا۔

سائیں کے سینے کے زخم رِس رہے ہیں۔ میرے ہاتھوں کی گرفت باگوں پر ڈھیلی ہو گئی۔ نیم بے ہوشی میں بھی وہ اس جلن کو محسوس کر رہا ہے مگر

مجھے نہ جانے کیا ہوا، مجھے تاؤ آگیا اور میں نے کہنا چاہا —— او سائیں ..... او اُلّو کے پٹھے ... اگر اب تو نے ہائے کی تو گھوڑی سے نیچے پٹک دوں گا!

تاحدِ نظر جنگلی بیروں کی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ کچے سوکھے سوکھے بیر ابھی تک ٹہنیوں میں پتوں کے آگے پیچھے، اوپر نیچے نظر آ رہے تھے۔ ایک جھاڑی کی اونچی ٹہنی پر ایک چیل آگے جھک کر اپنی کھلی آنکھوں جیسی دُم عمودی انداز سے اُٹھائے دوہری آواز میں چیخ رہی تھی۔ مدھم سے تیز، تیز سے سیٹی بجاتی ہوئی مدھم پھر مدھم سے تیز۔ اتھے بجھم بجھم سے اُتم پھر اُتم سے بجھم ..... کاش یہ بھی اور وقت ہوتا۔ اس وقت سائیں کی جونکوں جیسی بانہوں نے میرے کندھوں کے قریب اپنے کراہت انگیز پنجے گاڑے ہوئے تھے اور مجھے سارا ماحول دلدل دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ایک خیال میرے ذہن پر گھڑی کی ٹِپ کی طرح پڑا۔ "میں آج سائیں موسم سے اتنی شدید نفرت کیوں محسوس کر رہا ہوں؟"

سائیں بکھنت زور سے کانپا اور ایک طرف جھک گیا۔ میں نے باگیں چھوڑ کر سائیں کو تھاما اور پھر پہلے کی طرح سائیں میری پشت سے چمٹ گیا۔ پھر اچانک ایک جھاڑی سے ایک گلہری پھدکی، سرسراہٹ سے گھوڑی بدک کر ذرا سی اچھلی۔ سائیں پھر کانپا "مولا مدد!" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

گلہری اُچھل کر چِر چِر کرتی کچھ دور بھاگی، پھر عجب متانت آمیز شوخی سے اُس نے اپنے اگلے پنجے اُٹھائے، دُم ہلائی، کچھ دیر یونہی کھڑی رہی پھر چِر چِر کرتی ایک جھاڑی میں کود گئی جہاں ایک ببول کا درخت، زمین کو اور جھاڑیوں اور گھاس کو سورج سے گرتی ہوئی آگ سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا..... !

"مذہب بہت سے گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہے" میرے خیالات کا رُخ بدل گیا "مذہب بہت سے گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے متوازی ہر انسان کی آخری منزل تک چلے جاتے ہیں، چاہے وہ دو قدم پہ ہو، چاہے کوسوں دور ..... زندگی کی جلتی پگڈنڈی یہاں عافیت اور سکون میں چلتی ہے۔ اس کے باہر تپش ہے، جلن ہے۔ اس چھاؤں میں سب سے پہلے آنے والے لوگوں نے دوسروں کو پیار سے اس چھاؤں میں بلایا۔ اس کے بعد آنے والے اس انانیت میں سرشار کہ ہم نے عافیت کی راہ تلاش کر لی ہے۔ خاموشی سے گزر گئے۔ پھر یوں ہوا کہ اس چھاؤں میں چلنے والوں نے دھوپ میں جھلستے لوگوں سے بے جا ہمدردی جتانی شروع کر دی۔ اس کے بعد آنے والوں نے لوگوں کو بزورِ شمشیر اس چھاؤں میں کھینچا ..... لیکن سب کے بعد آنے والوں نے حد کر دی ..... اُنھوں نے درختوں کو دیکھا .... چھال سونگھی ..... پتے توڑ کر چکھے اور درخت اکھیڑ کر ساتھ لیتے گئے ..... اب زندگی کی جلتی پگڈنڈی اور اس عافیت کی راہ میں کوئی فرق باقی نہیں۔ وہاں بھی جلن تھی یہاں بھی جلن ہے ..... اب ہم کہاں جائیں؟"

پسینے کے نمکین قطرات میری آنکھوں میں سوزش پیدا کر رہے تھے۔

"میں اس مذہب کا متلاشی ہوں جو کسی بزرگ کے نورانی چہرے پر پھیلی ہوئی شگفتگی کی طرح تھا جو ایک معصوم بچے کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ کی طرح تھا۔ میں اُسے ڈھونڈتا ہوں جو کنارے پر جھکی ہوئی جھاڑیوں پر شفاف ندی کی چمکیلی لہروں کے عکس کی طرح تھا جس کا آغاز و انجام خلوص کے سوا کچھ نہ تھا جس کا عنوان محبت اور صرف محبت تھا۔ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں ..... مجھے بھی تو بتائیے وہ کہاں چھپ گیا ہے"

سائیں کا جسم بار بار کانپ رہا تھا، گرمی شدید تھی۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ میرے جسم میں جیسے بے شمار کانٹے چبھ رہے تھے۔ پسینہ یوں بہہ رہا تھا جیسے ان کانٹوں کے پیدا کردہ زخموں سے خون رِس رہا ہو۔ ابھی ڈھوک دور تھی۔ میں نے جلدی ڈھوک پہنچنے کے لئے گھوڑی کو سڑک سے ہٹا کر ایک تنگ ناہموار سی پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ راستہ اتنا تنگ تھا کہ گھوڑی کے سم بار بار پھسل جاتے تھے۔ میرے لئے سائیں یتیم کے ساتھ توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا، لیکن جلدی ڈھوک پہنچنے کی خواہش نے مجھے باگوں پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے گھوڑی کو شسترئی[1] میں

[1] ایک مخصوص چال

ڈال دیا۔ اس تنگ پگڈنڈی پر قدم قدم چلنا بھی مشکل تھا لیکن مجھ پر عجب وحشت سوار ہو چکی تھی۔ میرا جسم یوں جل رہا تھا جیسے سائیں موسم کا بدن بھنگ پینے کے بعد ہلکورے لیتا تھا مجھ پر بھی غنودگی سی چھا گئی۔ بہر حال میں ڈھوک پہنچ گیا پہلے خود گھوڑی سے کودا پھر سائیں موسم کو اتارا۔ گھوڑی کو کھونٹے سے باندھ کر میں نے سائیں کو اندر کمرے میں ایک اُلٹی بچھی ہوئی چارپائی پر لٹا دیا۔ ایک گندا سا تولیہ چارپائی کے سیدھے کھڑے پائے پر لٹک رہا تھا۔ اُسے اتار کر میں نے پانی میں بھگویا اور سائیں کے ماتھے پر رکھ دیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد سائیں خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے جیب سے نوٹ بک اور قلم نکالا اور صبح سے لے کر اس وقت تک تمام گزرے ہوئے واقعات کو ترتیب دے کر لکھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ تین بج گئے چھٹی کا وقت ہونے سے چند لمحے پہلے ڈوبد اور سائیں بت ڈھوک پہنچ گئے۔ سائیں کو ان کے سپرد کر کے میں بوجھل بوجھل قدم اُٹھاتے ہوئے بنگلے کی سمت چل دیا۔ تھکا تھکا سا... نشے کی سی حالت میں...!

(۸)

گھر پہنچ کر بھی میری طبیعت نہ سنبھلی۔ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی سریع الاثر زہر میری رگوں میں داخل ہو کر خون کو منجمد کر رہا ہے۔ اس ہیجانی کیفیت میں اپنی بہن کے پاس جا بیٹھا۔

"عصمت....." میں نے آہستہ سے کہا

"کیا ہے.... ارے یہ تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں" بہن نے مجھے غور سے دیکھا "کہاں گئے تھے؟"

میں نے تمام دن کی سرگزشت سنا دی۔ ایک طویل گفتگو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر کسی طرح سائیں موسم کے لاشعور میں دبی ہوئی خواہشات کو اس کے شعور میں اُبھار دیا جائے تو وہ ایک شدید نفرت سے مجبور ہو کر خود کو اس جہنم سے نکال لے گا۔

اگلے دن میں پھر ڈھوک میں بیٹھا تھا۔ سائیں کی حالت بہتر تھی۔ اُس نے چولا اتار رکھا تھا۔ سینے پر زخموں کے اوپر ہلدی کے رنگ کی کوئی دوا مل رکھی تھی۔

"کل مجھے خوب گالیاں دی گئیں" میں نے کہا

"کیا....؟" سائیں حیرت سے بولا

"کل مجھے ابا جی نے خوب گالیاں دیں" میں قدرے سنبھل کر بولا "کہنے لگے.... تم آوارہ ہو گئے ہو۔ سارا سارا دن غائب رہتے ہو۔ ڈھوک میں نہ جانے بھنگ پینے جاتے ہو یا چرس.... تمہاری آنکھیں سُرخ رہتی ہیں، تم نشے کی سی حالت میں رہتے ہو۔"

"لیکن..... صاب جی.... آپ نے تو کبھی نہیں پی" سائیں نے میرے سامنے میری صفائی پیش کی

"یہی تو بات ہے...." میں نے اونچے لہجے میں کہا "یہی تو بات ہے جس پر مجھے غصہ آتا ہے۔ اگر میں یہ سب کام کرتا تو شاید اتنا غصہ نہ آتا.... یہ کیا..... ہر وقت پابندی.... ہر وقت دوسروں کی محتاجی۔ اگر میں خود کفیل ہوتا تو کوئی بات نہ سنتا۔ گالیاں وہی سنتا ہے جو کسی کام کا نہ ہو۔" میرے لہجے میں تیزی تھی۔

"صاب جی.... یہاں کام کرنے پر بھی گالیاں دی جاتی ہیں۔ یہ دنیا کی ریت ہے" سائیں کی تیز چبھتی ہوئی آواز میں یہ جملہ سُن کر میں چونک گیا۔ ایک انجانی مسرت کے زیر اثر میں مسکراہٹ پر بھی قابو نہ پا سکا۔ میں نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

"سچ کہتے ہو...." میں نے دبی دبی آواز میں کہا "سچ کہتے ہو۔ یہاں کی ریت ہی ایسی ہے.... بس محتاجی.... سب سے بڑی لعنت.... میں بھی تو محتاج ہوں نا۔" سائیں مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہو۔ پھر بہت دیر تک ہم اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔ گھوڑی کی ٹاپوں سے ہم چونکے جابر شاہ آ رہا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے اُس نے میرا ہاتھ دبایا "تمہاری بڑی مہربانی یار.... کل اس بے چارے کو یہاں پہنچا کر بڑا احسان کیا ہے" وہ مسکرا رہا تھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں ..... بھئی دیکھونا ..... بات تو ہے ..... یعنی"

میں نے سائیں موسم کو دیکھا۔ وہ بابر شاہ کو تشکر سے بھرپور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرا دل بیٹھ سا گیا ... !

کچھ دنوں بعد میں اور سائیں موسم پھلاہی کے عظیم درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ سائیں نے چند سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے اپنے ٹوٹے ہوئے ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔ سامنے ریچھو اپنی لمبی دم ہلا ہلا کر پلّوں کی طرح چوں چوں کی لالچی آوازیں نکال رہا تھا۔

"یہ بھیک مانگتا ہے" میں نے کہا "اگر اس کے گلے میں کاسہ لٹکا دیا جائے تو یہ بھی بڑا کامیاب بھکاری بن سکتا ہے" سائیں نے مجھے دیکھا۔ چہرے پر ایسی کیفیت تھی جیسے مسکرانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ اتنے میں ایک اور مریل سا کتا، اچھلتا، کودتا، دم ہلاتا، عجیب اٹکھیلیاں کرتا ہوا ایک جھاڑی سے چھلاوے کی طرح نکل آیا۔ وہ کچھ دیر ریچھو کے گرد ناچا، پھر جب سائیں نے روٹی کا ٹکڑا پھینکا تو وہ بھی ریچھو کے ساتھ اچھل کر آگے بڑھا۔ ریچھو نے اگر جھپٹا مار کر وہ چھینتا چلا تا واپس جھاڑیوں کی سمت دوڑا۔ ریچھو کچھ دور اس کے پیچھے گیا پھر بھونکتا ہوا واپس آ گیا۔

"جانتے ہو سائیں ..." میں نے کہنا شروع کیا "جانتے ہو ریچھو اسے کیا کہہ رہا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم ..... میں تو ....."

"یہ کہہ رہا ہے ..... الو کا پٹھا ..... حرامی ..... سور ..... کمینہ ..... پاؤلی کا پتر" میں نے تیزی سے کہا۔

سائیں بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت کے تاثرات ابھرے "صاب جی ....." وہ کانپتے ہوئے بولا "آپ بھی ....."

"او نہیں ..... بھئی معاف کرنا منہ سے نکل گیا۔ دراصل حر بر شاہ اور ملک یہی کہتے رہتے ہیں نا میرے منہ سے بھی نکل گیا۔ ورنہ میں ..... بھئی معاف کرنا ..... میں تو کبھی بھی ..." میں نے اکھڑے اکھڑے لہجہ میں کہا۔ سائیں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

"سائیں ....." میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا "ناراض ہو گئے ہو؟"

"ہم غریبوں کو کسی پر کیا ناراض ہونا ہے جی ..... جو مرضی آئے کہہ لو" سائیں کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

"نہیں ..." میں نے گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا "نہیں ... ایسا کیوں ہوگا۔ وہ تو ... دیکھنا" میں نے سائیں کا بازو چھوڑ دیا "سائیں ..... یار ایک بات تو بتا"

"کیا ..... ؟"

"کیا پاؤلی کا پتر ہونا گناہ ہے"

"گناہ ..... شاید ..... ہاں ایک دن باوجی ..." سائیں نے روٹی کا آخری ٹکڑا بھی پھینک دیا۔ اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے مجھے دیکھا "ایک دن باوا جی کہہ رہے تھے کہ ....."

"ہاں ... کہو" میں نے تیزی سے کہا۔

"کچھ یاد نہیں ... ہاں کچھ یوں کہا تھا کہ جو روحیں پلید ہوتی ہیں انہیں ہی کمی٭ بننا پڑتا ہے۔ نیک اور پاک روحیں، ملک اور راجہ اور چوہدری اور ..... کچھ یونہی کہا تھا ..... دراصل یاد نہیں رہا ..... ہاں کچھ پتہ نہیں ..." سائیں کچھ سوچنے لگا

"سائیں مجھے تو یہ بتا" میں نے کہا "چل رہنے دے۔ تیرے بس کی بات نہیں"

٭ نیچ ذات

"کیا....؟"

"میرا مطلب ہے تیرے بس کی بات نہیں"

"پھر بھی بات کیا ہے؟" سائیں نے زور دیتے ہوئے کہا

"وہ .... ہاں میں پوچھ رہا تھا کہ روحیں پلید کیسے ہو جاتی ہیں"

"باواجی ...." سائیں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں چیخ اٹھا

"باواجی!.... باواجی!.... آخر یہ کیا مذاق ہے کہ جو بات باواجی نے کہی ہے وہ درست ہی ہو گی۔ باواجی غلط بھی کہہ سکتے ہیں"

"میں نہیں جانتا.... باواجی ــــ"

"باواجی کا کیا ہے۔ وہ تو بس باتیں کرنا جانتے ہیں۔ انھیں اس سے کیا کوئی جیے یا مرے.... انھیں تو بس باتیں کرنا ہے"

سائیں کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا وار کامیاب تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں نے چھوٹے چھوٹے واقعات کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا اور اسی طرح ہوا میں سائیں کو اس غلامانہ زندگی سے متنفر کرنے میں کامیاب ہو گیا وقت میرا ساتھ دے رہا تھا۔ سائیں کا رویہ بدل گیا تھا۔ وہ مدافعانہ انداز اختیار کر چکا تھا۔ اب جب اُسے الزام دیا جاتا تو وہ آسانی سے تسلیم نہ کرتا تھا۔ اس پر اُس کو مارا پیٹا جاتا تو اُس کے دل پر نفرت کا سایہ اور گہرا ہو جاتا۔

(۹)

رُت بدلی۔ شمالی ہوائیں سیٹیاں بجاتے جنگڑ جنوب کی سمت دوڑے۔ شمالی افق پر چھدرے چھدرے بادلوں کی کشتیاں اُبھریں اور گہرے نیلے آسمان پر تیرنے لگیں۔ ان کے پیچھے دیوہیکل جہاز اپنے سرمئی بادبان کھولے متانت سے اُٹھے۔ اس کے بعد آنے والی ہواؤں میں خنکی تھی گیلی زمین کی مہک تھی میرا دل ایک انجانی خواہش سے مجبور ہو کر ترنگ میں آکر جھومنے لگا۔ جب میری پوشاک اور میرے بال ہوا کے شوخ جھونکوں سے اُڑے تو میرا جی چاہا کہ کوئی میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور میری روح آزاد ہو کر ان اُمنڈتے بادلوں کے سنگ فضاؤں میں آوارہ گھومتی رہے۔

چند لمحوں بعد آسمان کی نیلاہٹ سرمئی رنگ میں تبدیل ہو گئی، پھوار پڑنی شروع ہو گئی۔ میں ڈھوک کی سمت چلدیا۔

ہلکی ہلکی پھوار کے بعد زمین کسی چیچک زدہ شخص کے چہرے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ ڈھوک پہنچتے پہنچتے ہوا میں غضب کی تیزی آگئی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ڈھوک میں سبھی موجود تھے۔ کوثر شاہ ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے والہانہ انداز سے جھوم رہا تھا یہی حال سب کا تھا، سب نے بھنگ پی رکھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کوثر شاہ نے نعرہ لگایا اور اُچھل کر لیٹ گیا۔ لنگڑا اللہ داد سائیں موسم سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ ملک بار بار اپنے دانتوں سے تھوک باہر اگل رہا تھا۔ ذوارو چلم کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ دفعتاً اللہ داد نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ سب چونکے۔ اللہ داد اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکا

"میں ہوں ایک مرغی" اللہ داد نے جھوم کر کہا

"واہ...." سب چیخے

"میں نے دیئے دو انڈے" اللہ داد اچک کر آگے جھکا

"آ ہا...." سب بولے۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کے ایک تاریک کونے سے میاؤں کی آواز آئی۔

"انڈوں پہ جھپٹی بلی" اللہ داد نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہاؤ......سب چلائے

"انڈوں سے نکلے دو کبوتر بچے" اللہ وادایک دم سائیں موتم کی طرف گھوم گیا اور اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی سائیں کی ناک سے ٹکرائی

"ایک یہ بیٹھا ہے۔ ... دوسرا بے چارہ مرگیا" اللہ وادو نے بین کیا اور سب بین میں شامل ہو گئے۔

ہوا میں خنکی تھی۔ موسم کا پیدا کردہ جبلتی تاثر ہر چہرے پر نمایاں تھا۔ سب بہک رہے تھے۔ ڈورو کمرے کے تاریک کونے سے بلی پکڑ لایا اور سچی سرکار کے نام لیواؤں نے وہ سفلی مظاہرے کئے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں وہاں سے بھاگا۔ سائیں موتم بھی میرے پیچھے نکل آیا۔ بارش تیز تھی۔ ہم بھیگ رہے تھے۔

"سائیں...... دیکھا تو نے" میں نے اپنے ماتھے پر گرے ہوئے بال اٹھائے۔

"ہاں دیکھا صاب جی" سائیں کی آنکھ چمک رہی تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ نشے میں نہ تھا یا شاید اس نے کم پی تھی۔

میں نے اسے گھورا "اب بتا... کون سچا ہے"

"آپ... آپ جی.... یہ سب حرامی ہیں.... ملک بھی، اللہ واد بھی، ڈورو بھی اور..... باواجی بھی.... سب کے سب" سرفراز چیخ اٹھا۔

میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ میرے کپڑے بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے۔ ہوا میں عجب کیف انگیز لطافت تھی۔ چند لمحوں بعد میرا ذہن کسی گرد آلود چٹان کی طرح بارش سے دھل چکا تھا۔

پھر بارش تھم گئی۔ میں بنگلے کے بیرونی پھاٹک سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دائیں ہاتھ افق پر بھیگی ہوئی فضا میں نیلاہٹ ایک بار پھر ابھری، پہلے مدھم.... پھر گہری....!

ایک بار پھر گہرے نیلے آسمان پر کچھ بادلوں کے ٹکڑے برفیلی چٹانوں کی طرح ابھرے۔ پھر اس نیلگوں جھیل کے ایک کنارے پر سفید رنگ شروع ہو کر سفیدی مائل سرمئی میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ پھر جب میری نگاہیں گہری سرمئی سطح پر جم گئیں تو میرا جی چاہا آسمان کی سمت بازو اٹھا دوں اور اسی طرح ہواہیں بازو اٹھائے اُڑتا چلا جاؤں۔ اس سرمئی سطح سے ٹکرا کر میرا جسم اس میں تحلیل ہو جائے۔ میرا کوئی وجود نہ رہے۔ کچھ دیر بعد میں ماحول سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا...!

(۱۰)

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ صبح جب میں چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے لان میں بھیگی ہوئی گھاس پر کھڑا تھا تو سامنے سڑک پر جابر شاہ سائیں ملک، ڈورو اور اللہ واد گھوڑوں پر سوار گزر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی جابر شاہ مخصوص انداز سے چنگھاڑا ..."سویرے سویرے ہی چلے گئے

یہ ہو گئے؟" میں نے پوچھا

"او نہیں.... اج تو بڑا پروگرام ہے" جابر شاہ بڑا خوش نظر آ رہا تھا

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے بیرونی پھاٹک پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا

"گراں ..... آج خوب پروگرام ہے..... او..... آج جھڑی لگی ہے" جابر شاہ نے قہقہہ لگایا

"آخر بات کیا ہے.... کیا پروگرام؟" میں نے پوچھا

"لینے جا رہے ہیں" جابر شاہ دھنی کے مخصوص ترین لہجے میں بولا "کوئی بوٹلیں... کوئی سوڈا... کوئی مرنا... کوئی سوجی.... کوئی کھنڈ" وہ زور سے ہنسا۔

۱؎ پٹے ۲؎ گاؤں ۳؎ کھانڈ

"بوتلیں اُڑیں گی ۔ مرغا کٹے گا ... پکوڑے بنیں گے ... باگیا پکے گا ... اَرے آج عیش ہوگی. جلدی جلدی ڈھوک پہنچو۔ ہم ابھی سامان لاتے ہیں جابر شاہ نے باگیں اُٹھائیں اور گھوڑا نرسری میں دوڑا۔ پیچھے پیچھے دوسرے گھوڑے بھی دوڑے۔ اسی لمحے عصمت لان میں آگئی۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" اُس نے پوچھا۔

"کہہ رہے تھے ..." میں مسکرا دیا "ساون کے استقبال میں مرغا کٹے گا۔ پکوڑے بنیں گے ..... باگیا پکے گا"
۱

"یہ باگیا کیا بلا ہے" عصمت بھی ہنس دی۔

"حلوہ ... جو دانتوں سے چپک جائے تو ٹوتھ برش سے بھی نہیں اُترتا۔"

"تمہیں بلایا ہوگا" عصمت نے کہا

"ہاں بلایا تو ہے"

"ایک بات کا خیال رکھنا" عصمت مسکرائی "پکوڑے نہ کھانا"

"کیوں ...؟"

"وہ لوگ بھنگ ملا دیں گے ... یاد ہے تمہیں ایک بار بھائی جان کو ڈونگیل میں دوستوں نے بھنگ والے پکوڑے کھلا دیئے تھے"

ہم وہ واقعہ یاد کرکے خوب ہنسے۔ پھر مجھے خیال آیا سائیں موسم ڈھوک میں اکیلا ہوگا۔ میں سلیپنگ سوٹ ہی میں ڈھوک کی سمت چل دیا۔ بارش پھر شروع ہوگئی۔ سائیں کمرے کی دہلیز پر بیٹھا تھا۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ دور ماڑی کی دھندلی گدلی لکیر ایک گہرے سفید پردے میں چھپ چکی تھی۔ ماڑی پر تیز بوندوں کی بوچھاڑیں برف کے گالوں کی طرح گر رہی تھیں جو رفتہ رفتہ ہماری سمت پھیلے ہوئے مینہ کے دھندلکوں کو چھپانے آ رہی تھیں چند لمحوں بعد پہلی بوچھاڑ نے ہمیں بھگو دیا۔ نہ میں اُٹھا نہ سائیں موسم ... ہم وہیں بیٹھے بھیگتے رہے۔ بجلی چمکتی تب مجھے گرج کا انتظار ہوتا۔ اس ذرا سے وقفے میں، میں بُری طرح منتظر رہتا۔ زور سے بجلی چمکتی تو گرج بھی زوردار ہوتی۔ ایک بار انتہائی غضبناک گڑگڑاہٹ کے بعد جب خاموشی چھا گئی تو سائیں خوفناک لہجے میں بولا "بجلی گری ہے ... کہیں صاف بجلی گری ہے" میں نے سائیں کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"کہیں قریب گرے تو مزا آجائے سائیں"

"مولا پنج تن پاک رکھے ... صاب جی ... ایسی باتیں نہ کیجئے ... خیر مولا خیر"

لیکن مجھے شدید انتظار رہتا۔ میرا جی چاہتا تھا میرے سامنے چند گز کے فاصلے پر کھڑے پھلاہی کے عظیم درخت پر بجلی گرے اور اسے آگ لگ جائے حالانکہ ایسا ہونے پر ہمارے بچنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی لیکن یہ احمقانہ خواہش بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ میرا جی چاہا خود کلہاڑا لے کر مسلسل ضربات سے اس عظیم درخت کو گرا دوں ... آگ لگا دوں ...!

"آج پروگرام کیسا ہے سائیں" میں نے پوچھا

"بس جی ... جھڑی کی خوشی میں" سائیں نے بوندوں کی طرف ہاتھ بڑھایا چند بوندیں اس ٹوٹے ہوئے پیالے میں بچ آ گئیں ... "سائیں ملک ذورو ... اللہ داد اور ... باداجی بھی گاؤں سے چیزیں لانے گئے ہیں ... مرغا ... سوجی ... بیسن ... گھی ... گُڑ اور دو بوتلیں وسکی کی" سائیں مسکرایا۔

"وسکی کہاں سے ملے گی" میں نے حیرت سے پوچھا "گاؤں میں تو ..."

"وہ جی ... بڑے کلب کا بیرہ ہے نا ... باداجی کا مرید ہے۔ بوتلوں کا انتظام وہ کرے گا"

---
۱ حلوہ

"یہ ہوگی؟" میں نے پوچھا

"ہم غریبوں کی قسمت میں کہاں جی ۔۔ ہم تو بُوٹی پر ہی گزارا کریں گے" سائیں کی آواز دبی تھی۔ وہ اُداس ہو گیا۔

"ہاں جی ۔۔ یہ بڑا گرام تو جابر شاہ اور اُس کے منہ چڑھے ملنگوں کے لئے ہے تجھے تو بچا کھچا ہی ملے گا ۔۔۔ تو غریب ہے اور معذور ہے ۔۔۔ یہ بے انصافی ہے سائیں" میں نے اداس لہجے میں کہا

"انصاف کہاں صاب جی"

"دیکھ سائیں ۔۔ انصاف صرف ایک طاقت کے ہاتھ میں ہے، تو اُس سے مانگ ۔۔۔ انھیں چھوڑ دے ۔۔۔ یہ سمجھتے ہیں انصاف ان کے ہاتھ میں ہے۔

"چھوڑ دوں تو کہاں جاؤں صاب جی" سائیں نے بغور مجھے دیکھا "گھر میں اب کوئی قدم نہ رکھنے دے گا"

"سائیں ۔۔۔ گھر پھر بھی گھر ہے، تو جب اُن سے جا کر معافی مانگے گا تو دیکھ لینا تو اسی گھر کا بادشاہ ہو گا ۔۔۔ فرض کیا اگر وہ کچھ دیر نہ بھی مانیں تو پھر بھی تیرا انتظام ہو جائے گا۔ تو میرے پاس آ جا سرونٹ کوارٹرز میں ایک خالی پڑا ہے، وہ تو لے لے ۔۔"

"کہاں جی؟" سائیں چونک کر بولا

"بھئی ۔۔۔ وہ نوکروں کے کوارٹر ہیں نا۔ ایک خالی پڑا ہے۔ وہ لے لینا"

سائیں کچھ دیر خاموش رہا اُس کا بھیگا ہوا چولا اُس کے کالے ڈھانچے سے چپٹا جاتا تھا اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا پھر جیسے کسی ناگہانی ارادے سے ایک عزم مصمم کا سا انداز لیے وہ آگے کو جھکا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا "منظور ہے صاب جی" سرفراز کی آنکھ ٹپک اٹھی "کل صبح میں ڈھوک چھوڑ دوں گا ۔۔۔!"

کچھ دیر بعد جب بارش تھمی تو میں گھر چلا گیا۔ جب دوبارہ میں ڈھوک پہنچا تو سب تنے ہوئے تھے۔ ایک نئی صورت بھی نظر آئی جابر شاہ نے تعارف کرایا۔ وہ ملنگ گاؤں کا میراثی اللہ دتہ تھا۔ ایک بڑا سا ڈھول اٹھائے وہ بڑی گرم جوشی سے ملا کمرے کی دہلیز کے سامنے ڈھلوان زمین پر پانی ٹھہر سکا اور وہ نم آلود بھی تھی اور خشک بھی۔ پھٹے بادل میں سے روشنی کی مدھم کرنیں اُس پر بکھری ہوئی تھیں اور وہ یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی رات بھر جاگی ہوئی برہن کا چہرہ صبح کاذب کے دھندلکوں میں کھویا کھویا سا ہو یہیں اینٹوں سے چولہے بنائے گئے، آگ جلائی گئی۔

جابر شاہ نے اعلان کیا کہ وہ باگیا پکائے گا۔ مرغ سائیں ملک کے ذمے تھا۔ لنگڑا اللہ دا آٹا بھگو رہا تھا۔ ڈورو لکڑیاں چیر رہا تھا۔ میں، سائیں اور میراثی اللہ دتہ چھوٹے موٹے کام کرنے کے لئے منتخب ہوئے۔ اللہ دتہ نے اپنے لئے ایک اہم کام ڈھونڈ نکالا۔ وہ گردن میں ڈھول لے کر بیٹھ گیا۔ کبھی اونچی تان اٹھاتا، کبھی زور زور سے کڑک دھم دھم ۔۔ کڑک دھم دھم ڈھول بجانا شروع کر دیتا جیسے گندم کاٹتے وقت وہ کسانوں کو جوش دلایا کرتا تھا۔ ڈھول کا اثر بہت جلد محسوس ہوا۔ سب ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ڈورو نے تو باقاعدہ ڈھول کی تھاپ پر کلہاڑا چلانا شروع کر دیا۔ سب چست ہو چکے تھے۔ بس سائیں مبہم نہایت بددلی سے کام کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی گرفت ہر شے پر ڈھیلی تھی۔ اُس کے پاؤں سست تھے۔ میں اِس تغیر پر بے حد خوش تھا۔

اچانک جابر شاہ نے پانی مانگا۔ چھوٹی سی دیگچی اٹھا کر سائیں نے گھڑے سے پانی لیا جابر شاہ کے پاؤں کے قریب پڑی ہوئی ایک لکڑی سے سائیں نے ٹھوکر کھائی۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ پانی اُچھل کر جابر شاہ کے دھانی رنگ کے لاچے پر گرا اور پھر چولہے میں دہکتے ہوئے کوئلے سوں سوں کرتے ہوئے بجھنے لگے۔

"حرامی ۔۔۔ ماں ۔۔۔ بہن ۔۔۔ اندھا ہے، آنکھیں نہیں ہیں تیری؟ ۔۔۔ ماں ۔۔۔" جابر شاہ چلایا۔

"باوا جی ... میں ... میرا ... میرا کیا قصور ہے ... لڑکی ..." سائیں موسم بھی تیز لہجے میں بولا

"قصور ...؟" جابر شاہ تڑپ کر اٹھا "بتاؤں تجھے قصور ...؟" وہ سائیں کی سمت بڑھا۔ میں چھلانگ لگا کر دونوں کے درمیان آ گیا۔

"بس کرو ... ختم کرو" میں چلایا

"نہیں ... جابر شاہ غصے سے کانپا "نہیں ... تجھے بتاتا ہوں قصور ... کیا کہا؟ ... قصور ... کمین ... بتاؤں تجھے؟" میں نے جابر شاہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور سائیں کو پرے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ سائیں نے فوراً تعمیل کی۔ میں نے بڑی مشکل سے جابر شاہ کو ٹھنڈا کیا۔ پھر دیر تک جابر شاہ گالیاں بکتا رہا اور سائیں بڑبڑاتا رہا۔

بارہ بجے غسل کے بعد آسمان پر گہرے بادل چھا گئے۔ ہم سب کمرے کے سامنے چٹائیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک بالٹی میں سوڈے کی بوتلیں کھول کر ڈالی گئیں۔ پھر جابر شاہ نے بوتلیں کھول کر بالٹی میں انڈیلیں۔ سائیں ملک نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور انہیں گیلا کر دیا۔ اللہ داد آنکھ دبا کر آگے کو جھکا۔ پھر اس نے نعرہ لگایا۔ سائیں موسم ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا پیالہ بھنگ سے بھر رکھا تھا۔ اسے وہسکی ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس نے دو تین بار جابر شاہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھا جن میں درخواست اور نفرت کے عناصر برابر تھے۔ پھر اس کی نگاہیں چٹائیوں پر بکھری ہوئی پیالیوں اور مٹی کی رکابیوں پر جم گئیں۔

پیالے بھرے گئے۔ ایک پیالہ مجھے بھی دیا گیا۔ میں نے گھبرا کر جابر شاہ کو دیکھا۔ "بس آج ... دیکھو یہ پروگرام ہے ... آج انکار ... نہیں ہوگا" وہ بولا۔

"اچھا دو" میں نے کہا۔

"ہے لا ... " جابر شاہ اچھلا

"بابا ہو ... " سب چلائے۔ میں نے پیالہ ہاتھوں میں تھام لیا۔ اب کیا کروں۔ سائیں کو دینے کے لئے بہانے کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک بات سوجھی۔ "تو کیا ..." میں نے خود سے پوچھا ہاں ایک گھونٹ ... میں نے بہانہ ڈھونڈ لیا۔ پیالہ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا سب بت بنے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سائیں موسم مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے پیالہ ہٹا لیا۔

"کیوں ...؟" جابر نے حیرت سے کہا

"پہلے تم سب پیو" میں نے مسکرا کر کہا

"نہیں ... پہلے مہمان پیتے ہیں۔ کیوں ملک؟" جابر شاہ نے ملک کو دیکھا۔

"ہاں جی ... پہلے مہمان" سائیں ملک نے تائید کی اور دوسرے زور سے بھی چلایا "ہاں جی ... پہلے مہمان"

میں نے پیالہ ہونٹوں سے لگایا۔ زندگی میں پہلی بار ... میں کچھ ڈر سا گیا۔ پھر حوصلہ کیا اور ایک گھونٹ پی گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک تیز جلتا ہوا خنجر میرا سینہ چیرتا ہوا نکل گیا ہے۔ میرا سر گھوم سا گیا۔ میں نے گھبرا کر پیالہ پیچھے ہٹایا۔ سب زور زور سے ہنس رہے تھے میں نے تیزی سے پیالہ سائیں موسم کو پکڑا دیا اور چیخ اٹھا "یہ مجھ سے نہ ہوگا ... اف ... بھئی معاف کرنا ... یہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ میرا تو سینہ جل گیا ہے ..."

جابر شاہ نے اچھل کر پیالہ سائیں سے چھیننا چاہا مگر وہ ہونٹوں سے لگا چکا تھا ... سب سہم سے گئے۔

"حرامی ..." جابر شاہ نے غضب آلود نگاہوں سے سائیں کو دیکھا۔ "شکل تو دیکھ اپنی ..." پھر وہ غصے اور بے چارگی کے ملے جلے احساس سے مجبور ہو کر ہنس دیا "جا کیا یاد کرے گا ... صاحب کو دعائیں دے پاؤلی کے پتر ... اور ہاں ..." پھر وہ زور سے ہنسا "کیا ہوا ..."

سینہ جل گیا؟" سب نے بھرپور قہقہے لگائے۔ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ اب سائیں موتم بھی ہنسی میں شامل تھا۔ پھر بے ہنگم شور مچا۔ پیالے ہونٹوں سے چپک گئے۔ سائیں موتم نے بھی نعرہ لگا کر بھنگ کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور سبز پانی کی تلچھٹ تک پی گیا۔ پھر اس شور میں زور زور سے ڈکارنے کی آوازیں آئیں اور کئی اُلٹے سیدھے فقرے سنائی دیئے۔ سائیں ملک اُٹھا اور مرغے والی ہانڈی اُٹھا لایا۔ ڈوردو باگیے کی پرات لے آیا۔ جابر شاہ نے بڑا سا لوہے کا چمچ ہوا میں لہرایا۔ دتا میراثی پکوڑے اور روٹیاں اُٹھا لایا۔ پکوڑے بھی سائیں ملک نے بنائے تھے۔ پکوڑوں اور مرغے میں بھی سائیں ملک نے بھنگ کے سبز پتے پھینکے تھے۔ میں نے دونوں چیزیں لینے سے انکار کر دیا اور باگیے کی پلیٹ اُٹھا لی۔ حلوے میں جابر شاہ نے دو تین سیر کھانڈ انڈیلی تھی۔ پہلے لقمے پر ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے منہ میں شیرے کا بھرا چمچ ڈال دیا ہے۔ میں نے ہاتھ ہٹا لیا۔

"کیوں ...؟" جابر شاہ نے پوچھا

"بس ... ذرا جی نہیں چاہتا ..." میں نے منہ بنایا۔ "میرے حلق میں جلن ہو رہی ہے۔"

جابر شاہ مسکرایا "پانی پی لو ... اوے ڈوردو ... پانی لا ... پانی پی لو ... ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ ہنس دیا۔ پھر وہ سب حیوانوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ مرغے کی آخری ہڈی تک چبا لی گئی۔ باگیے کی پرات سے چمٹا ہوا گھی بھی اُنگلیوں سے چاٹ لیا گیا۔ میں نے اپنی پلیٹ سائیں موتم کو دے دی کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ پھر سب بہکنے لگے۔ دتے میراثی نے ڈھول اٹھایا اور گود میں رکھ لیا "کڑک ڈم ڈم" ڈھول کی آواز پر سب جھومنے لگے۔

پھر جابر شاہ نے ہاتھ اُٹھایا "شاہ فرمایا ..." پھر جلدی سے گھبرا کر بولا "نہیں میرا مطلب ہے کہ ..." وہ آگے کو جھکا اور پھر جھومتے ہوئے پوری آواز سے چیخا "دھما دھم مست قلندر ..." دتے میراثی نے ڈھول پر یہی مصرع دہرایا۔ جابر شاہ پھر چیخا۔ سب نے ساتھ دیا، ایک نہایت پرجوش انداز سے ہاتھ ہلائے گئے، گردنوں کو پیچھے کی طرف جھٹکے دئے گئے۔

"دھما دھم مست قلندر

دھما دھم مست قلندر ... حق

دھما دھم مست قلندر ... حق ... دھما دھم ... مہ

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میدانِ جنگ میں سپاہی کسی شدید خونی جذبے سے مجبور ہو کر وحشت ناک انداز سے چیخ رہے ہوں۔ ہاتھوں کے ہلانے کا انداز بھی وحشیانہ تھا جیسے کسی پر تلوار چلائی جا رہی ہو۔ جوش بڑھتا رہا، گیت بدلتے رہے۔ پھر سب سے پہلے سائیں موتم پیچھے کو لڑھک گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا بھنگ کے سبز پانی کے قطرے اس کے ہونٹوں کے کناروں سے بہہ کر رخساروں کی ہڈیوں کے نیچے گڑھوں میں اتر گئے اور تھم گئے۔ وہ زمین پر چت لیٹا تھا۔ میں نے سائیں ملک سے کہا کہ اسے اندر چارپائی پر لٹا دینا چاہیے۔ سائیں ملک لڑکھڑاتا اُٹھا۔ اس نے سائیں موتم کو کندھوں سے بُری طرح پکڑا۔ میں نے سوکھی سوکھی ٹانگوں کو تھاما۔ سائیں جہاں لیٹا تھا وہاں اب تل چٹے رینگ رہے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے وہیں پڑا تھا۔ ساون کی اس لکڑی کی طرح جسے اُٹھانے پر نیچے کیڑے رینگتے نظر آتے ہیں۔ ہم نے سائیں کو اندر کمرے میں اُلٹی بچھی ہوئی چارپائی پر لٹا دیا۔ "کڑک ڈم ڈم" دتہ میراثی جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا وہ پوری طاقت سے ڈھول پر ضربات لگا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ گیتوں کی تانیں مدھم پڑنے لگیں۔ سب آدھ موئے ہو کر گرنے لگے۔ دتہ میراثی گیت ختم ہونے سے بے خبر ڈھول پیٹتا رہا اور آخر وہ بھی چٹائی پر لڑھک گیا۔ میں خاموشی سے بنگلے کی سمت چل دیا۔ میں نے وقت دیکھا تین بج رہے تھے۔ فضا میں خاموشی

تھی۔ میرے کانوں میں دیر تک "کڑک ڈھم ڈھم" گونجتا رہا۔

بنگلے کے قریب پہنچتے پہنچتے میرا ذہن فضا کے زیر اثر بے حد ہلکا ہو گیا۔ خاردار جھاڑیوں میں ہوا کے نرم جھونکوں سے مدھم مدھم سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ فطرت کے فن کار کی دھیمی انگلیاں اس انوکھے ستار پر الاپ کے دھیمے دھیمے میٹھے میٹھے سروں میں راگ بجا رہی تھیں۔ سرمئی خاک دھول بادلوں کے نیچے پتھریلی زمین پر سائے سے محروم چھوٹے چھوٹے جھاڑی کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ اتنے خاموش جیسے سچ مچ کسی نے کچھ کہہ دیا ہو۔ سرمئی تاریکی میں پرندے بھی خاموش ہو گئے۔ بس ایک ٹٹیری تھی جو عجب شوخی سے حادہ زاویہ بنائے فضا میں اٹھتی چلی جا رہی تھی۔ "ٹی آؤں ٹی ایں... ٹی آؤں ٹی ایں... ٹی آؤں ٹی ایں" جیسے خود سے کہہ رہی ہو... "میں جاؤں کہ نہیں... میں جاؤں کہ نہیں... میں جاؤں کہ نہیں...!"

(۱۱)

رات میں کھڑکی کے قریب پلنگ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ باہر زور دار بارش ہو رہی تھی۔ ایک ہیجانی کیفیت کے تحت میری نیند غائب تھی۔ مجھے بار بار سائیں موسم کا خیال آ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے پر بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔

"صبح سائیں ڈھوک چھوڑ دے گا"۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام ڈھوک کے رہنے والے سائیں کے اس ارادے سے واقف ہو چکے ہیں۔ انہوں نے سائیں کو رسیوں میں جکڑ رکھا ہے اور اسے بری طرح پیٹ رہے ہیں۔ میں نے ذہن سے یہ پراگندہ خیالات جھٹکنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ سیلاب کی مانند امڈے چلے آتے تھے۔ باہر بارش کا زور بڑھ گیا۔ ہوا پاگلوں کی طرح ان کے بنگلے سے سر ٹکرا رہی تھی۔ ہوا کے زور سے بیرونی پھاٹک کھل گیا تھا اور بار بار جنگلے سے ٹکرا رہا تھا۔ زور سے بجلی چمکتی تو بوندوں کی بوچھاڑیں یوں چمکتیں جیسے آسمان پر کوئی سنگ مرمر کا پہاڑ پھٹ پڑا ہے اور تمام کائنات اس کی لپیٹ میں ہے۔ اچانک میں ایک شدید احساس کے ریلے کی لپیٹ میں آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لاتعداد روحیں فضا میں چیخ رہی ہیں۔ صداؤں میں شدت کا کرب ہے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے کسی کو میری ضرورت ہے۔ کوئی مجھے مدد کے لئے پکار رہا ہے۔

لیکن میں کیا کر سکتا ہوں... میں کسی کی خاطر کیا کر سکتا ہوں، کوئی سامنے نہیں... کوئی میرے سامنے زرد رو خون سے لتھڑا ہوا، زمین پر گرا، کراہتا نظر نہیں آتا... یہ ماتم ہواؤں کا ہے... یہ نوحے روحوں کے ہیں۔ جو میری نگاہوں سے اوجھل ہیں... پھر بھی وہ چیخ چیخ کر مجھے بلا رہی ہیں... کیا میں ہواؤں کے پیچھے دوڑوں؟ کیا کسی چٹان پر خود کو دے ماروں... کیا کروں؟ کیا اپنی پوشاک پھاڑ دوں؟ کیا اپنے بال نوچ لوں؟... میں کیا کروں؟... میں مجبور ہوں... میں کچھ نہیں کر سکتا!

ایک اذیت دہ احساس نے مجھے اداسی کے گہرے پانیوں میں دھکیل دیا۔ کھڑکی کے شیشے پر بوندیں گرتی رہیں۔

رات بہت دیر سے سونے کے باوجود صبح میں بہت جلد اٹھ بیٹھا۔ سائیں موسم بری طرح میرے ذہن پر سوار تھا۔ جسم میں ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی سی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے خزاں کی اداس دھوپ میں، ہوا کے لطیف ٹھنڈے جھونکوں میں لمبی لمبی خشک گھاس کے سرسرانے سے غنودگی طاری ہو جانے کے بعد محسوس ہوا کرتی ہے۔ ناشتے کے بعد میں ڈھوک پہنچا۔ سب سو رہے تھے۔ سائیں موسم غائب تھا۔ میں مسرت اور پریشانی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کہاں گیا ہو گا اور میں کہاں جاؤں؟ میں ڈھوک سے نکلا تو میں نے سائیں موسم کو دیکھا۔ وہ چپ چاپ جھاڑی کی گھنی جھاڑیوں سے کسی درندے کی طرح نکلا۔ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں بھی کسی انجانے احساس سے مجبور ہو کر رک گیا۔ پھر ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔

"نہیں ہو گا...." سائیں زور سے چلایا "یہ نہیں ہو گا"

میں تیزی سے آگے بڑھا "کیا نہیں ہو گا" میں چلایا!

"میں ڈھوک نہیں چھوڑوں گا" سائیں نے اعلان کیا۔

"کیوں... آخر... تم نے کہا تھا کہ..."

"ہاں کہا تھا... بے وقوف تھا" سائیں غرایا "اندھا تھا... رات میری آنکھیں کھل گئیں۔

میں پاگلوں کی طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر آگے بڑھا "معاف کیجئے... ہاں مجھ سے یہ گناہ نہ ہوگا.. آپ مجھے گناہ کا راستہ دکھا رہے تھے... رات بڑے باواجی نے یہی کہا تھا"

"بڑے باواجی... "میں نے سوچا" وہ تو مر چکے ہیں" پھر اچانک میں کچھ سمجھ گیا۔

سائیں نے میرا بازو پکڑا "رات خواب میں بڑے باواجی کا دیدار ہوا۔ وہ کہنے لگے کہ سائیں.. سائیں.. ہاں... سائیں.. وہ کچھ سوچنے لگا "ہاں... انہوں نے کہا کہ سائیں تیرے لئے دوزخ کے دروازے کھل چکے ہیں۔ تو بھی سرکار سے منہ موڑ رہا ہے... تجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ یہ صاحب جی خود بھی دوزخ میں جائے گا اور ساتھ تجھے بھی لے کر جائے گا.. یہ تجھے گناہ کا راستہ دکھا رہا ہے۔ اور صاحب جی، مجھے معاف کریں۔ میں توبہ کر چکا ہوں میں دوزخ نہیں جاؤں گا میں توبہ کر چکا ہوں۔ میں سچی سرکار.. سچی سرکار..." وہ خاموش ہو گیا جیسے کوئی بڑا خیال ذہن میں آیا اور زبان مجبور ہو گئی۔ میں نے اُسے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے ایک سمت چل دیا۔

لمبی جھاڑی کی گھنی جھاڑیوں میں آڑے ترچھے چلتے ہوئے میری نگاہیں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک جھاڑی کے نیچے نرم نرم آلودہ زمین پر پڑے بڑے ایک پتھر کے نیچے سے بے شمار چھوٹے چھوٹے پروں والے جھینگے نکل رہے تھے۔ وہ کچھ دیر چلتے پھر اڑنے کی کوشش میں دو تین بار گرتے پھر اڑ جاتے.....!

بارش سے بھیگے ہوئے تنے، وہ رات بھر ہوا کے زوردار جھونکوں اور غضب آلود تھپیڑوں سے ایک طرف جھکی ہوئی جھاڑیاں، پتھریلی زمین پر گنہگار روحوں کی طرح نظر آ رہی تھیں جن کے سر اس زمین پر ہیں اور پاؤں پاتال کی نم آلود زمین پر باندھ دیئے گئے ہیں۔ ہوا بند تھی اور زمین سے مخصوص بو بخارات کی طرح اٹھ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں زیر زمین کسی اندھے تاریک غار میں محبوس ہوں۔ سب حالات اس قدر سرعت سے بدلتے گئے کہ مجھے سوچنے کا موقع نہ ملا۔ میں صورتِ حال کا مقابلہ نہ کر سکا۔ میں شکست کھا چکا تھا۔ مجھ میں وہاں ٹھہرنے کی ہمت نہ تھی میں ہار چکا تھا۔

میں نے سائیں مرتبہ کے لاشعور کی دبی ہوئی خواہشات کو اُبھارا انہیں شعور میں لا کر سائیں کو ان سے آگہی دی لیکن اسی جنگل میں ان گنت صدیوں کے بڑے ہوئے انسانی خون پر پلنے والا عقیدت کا اندھا درندہ چھلاوے کی طرح کودتا رہا۔ احتساب کی لچک نے میرا بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ میں نے اس آہنی فصیل پر کمند پھینکی تھی۔ ان اتھاہ گہرائیوں سے کسی کو اٹھایا تھا۔ ان تاریک غاروں میں کسی کو تھاما تھا۔ دو چار ہاتھ کنارے کے نیچے سب کچھ چھوٹ گیا۔ میں بے بس ہوں.... انسانی ذہن اس آگ کے سامنے موم ہے۔

اپنی صورتِ حال کی الم ناکی پر میرے آنسو نکل آئے۔ احساس اتنا شدید تھا کہ رینگنے والے حشرات الارض نے بھی میری ہنسی اڑائی...!

ہر ناکامی کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے فطرت مجھ سے انتقام لے رہی ہے میرا دل مجھے فطرت کے خلاف بغاوت پر اُکساتا ہے جب کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جسے الزام دیا جا سکے جس سے اُلجھا جا سکے تو میرا جی چاہتا ہے اپنے کپڑوں کو آگ لگا کر فطرت کی ہر حسین شے سے لپٹ کر اسے جھلس دوں جب ایسا ہونا ناممکن نظر آتا ہے تو میری خواہش ہوتی ہے کہ... کوئی نظر آئے اور میں اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں۔ ہاتھ جوڑ دوں اور گڑگڑا کر کہوں ——میں مانتا ہوں... میں ہر بات تسلیم کرتا ہوں... لیکن اس اذیت دہ تشدد سے نجات چاہتا ہوں... مجھے چھوڑ دو... مجھ سے انتقام نہ لو... میں ہاتھ جوڑتا ہوں... مجھے چھوڑ دو!

(۱۲)

جانے کتنے دن یوں ہی گزر گئے۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ میں نے ڈھوک جانا چھوڑ دیا جب شام کے سائے گہرے ہو جاتے

تو ان سایوں پر ایک اور سایہ ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے، بغل میں کاسۂ گدائی لٹکائے کوارٹر کی طرف جاتا۔ مگر مجھے بلکسر کی ہر شے سے نفرت ٹپکتی ہوئی نظر آتی۔ ہر سمت جہنمی مخلوق اُچھلتی کودتی نظر آتی مجھے بلکسر کی ہر شے سے وحشت ہونے لگی میں اپنے بھاگنے کے پر تولتا رہا۔ کھوڑ کی خشک چٹیل زمین اور خشک چٹانوں اور لمبی لمبی خشک گھاس پر خزاں کی روح رقص کرتی رہی۔ دھیمے دھیمے لشیلے جھونکے مجھے کسی اَن دیکھی بستی کی کہانیاں سناتے رہے جہاں ہر انسان دوسرے کے لئے دل میں محبت کا عظیم جذبہ رکھتا ہے۔ جہاں نہ کوئی جماعت ہے نہ کوئی فرقہ ... جہاں سب محبت کی مضبوط ڈور میں بندھے ہوئے ہیں جہاں کوئی پیر نہیں کوئی مرید نہیں۔ جہاں ایک دوسرے پر کیچڑ نہیں پھینکا جاتا۔ جہاں پگڑیاں نہیں اُچھالی جاتیں جہاں ڈاڑھیاں نہیں نوچی جاتیں۔ جہاں نہ مسجد ہے نہ امام باڑہ ... جہاں کے خوبصورت کھلے کھیت مسجد بھی ہیں مندر بھی۔ کعبہ بھی شوالے بھی۔ کنشت بھی کلیسا بھی۔ جہاں سب محبت کی عظیم طاقت کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ جہاں سے نفرت کے مکروہ عفریتوں کو نکال دیا گیا ہے۔ جہاں امن ہے جہاں سکون ہے ... جہاں جانے کے لئے میں بچپن سے تڑپ رہا ہوں جو کہیں بھی نہیں اور ہر جگہ موجود ہے جو ازل سے اس دنیا پر ہر جگہ اُبھرتی اور مٹتی رہی ..... میں جس کے دوبارہ اس خاک پر نمودار ہونے کا کب سے منتظر ہوں ... !

خزاں بھی گزر گئی ساگھ اپنے جوبن پر تھا جب یہ خبر ملی کہ آبا جی ریٹائر ہو گئے ہیں میں بلکسر پہنچا، اتوار کا دن تھا۔ تڑکے ہی دو بڑے بڑے ٹرک بنگلے کے سامنے رُکے اور مزدور انہیں سامان سے لادنے لگے۔ میں لان میں کھڑا تھا۔ کل سے یہ کسی اور کمپنی کے ملازم کے پاس ہوگا۔ مجھے وہ بنگلہ چھوڑتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے ملک بدر کیا جا رہا ہو۔

سردی شدید تھی مری سے آنے والی برفانی ہوا نے صبح کو جما سا دیا تھا۔ میں نے اوورکوٹ کے کالر اُٹھا لئے۔ سامنے کھلے کھیت دھند میں چھپے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ پیچھے ہٹتا ہوا کمرا کا فوری تھا۔ دائیں ہاتھ سڑک پر دھند میں لپٹا ہوا کوئی بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ سائیں موتم تھا۔ .. موٹا سا کمبل اوڑھے، منہ میں سگرٹ دبائے، وہ مال گاڑی کے انجن کی طرح پھک پھک کرتا آ رہا تھا۔ میرے قریب آ کر وہ رک گیا آنکھ دبا کر وہ بڑبڑایا۔ پھر مسکرایا "جا رہے ہیں؟" وہ بولا

"ہاں سائیں ... جا رہا ہوں" میں نے دبی دبی آواز میں کہا

"پھر کب آئیں گے؟" سائیں نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اُس کی آنکھ غیر معمولی طور پر چمکیلی نظر آ رہی تھی

"اب شاید ... کبھی نہیں" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیوں .....؟"

"ہم پکھیرو جو ٹھہرے" میں نے بچوں کے سے انداز میں کہا

سائیں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ پھر بمشکل ایک سمت جھکا۔ جب وہ سیدھا ہوا تو اُس کے ہاتھ میں لمبی ڈنڈی والا نرگس کا پھول تھا۔ وہ اسے ٹوٹی ہوئی انگلیوں سے لہراتا رہا۔ پھر اُس نے دو تین بار اُسے سونگھا چند لمحے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر آگے بڑھا مجھے پھول دے کر وہ مڑا اور آہستہ آہستہ دھند کے پردے میں چھپ گیا

اُس کے بعد آج تک میں نے سائیں کو کہیں سے نکلتے نہیں دیکھا۔

اس واقعہ کو چار سال ہو چکے ہیں۔ چند دن ہوئے ایک پرانی فائل اُٹھانے پر ایک سوکھا ہوا نرگس کا پھول نکل کر میرے پاؤں کے قریب گرا اور سوکھی لمبی ڈنڈی ٹوٹ گئی ..... !

تصدق سہیل

ٹیڑھا چکّر

اس کے جسم پر کسی کے سخت اور کھردرے ہاتھ رینگنے لگے۔ پھر یک دم کسی نے جیسے اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ وہ نیم بیہوشی کے عالم میں تھا مگر اسے اس کا احساس تھا کہ اسے ایک تاریک غار میں گھسیٹا جا رہا ہے جیسے اسے کوئی تنگ نالی سے گزار رہا ہو۔ اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ پھر نا گاہ جیسے وہ ٹھنڈے پانی کے تالاب میں آگرا۔ ٹھنڈی ہوا لگنے سے اسے جھرجھری سی آگئی اور جب کچھ ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھول لیں۔ مگر ایک عجیب سی روشنی نے اسے چندھیا دیا۔ تیز روشنی اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

پھر اس کے کانوں میں عجیب و غریب آوازیں گونجنے لگیں۔ یہ کونسی زبان تھی۔ وہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن ایک لفظ تک نہ سمجھ سکا۔

چند روز بعد جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک عجیب سی بستی میں تھا اور عجیب و غریب مخلوق میں گھرا ہوا تھا بلکہ جگہ خوبصورت پہاڑیاں اور آبشار تھے۔ ٹھنڈے درختوں کے سایوں میں معطر ہوائیں چلتی تھیں۔ پھولوں سے لدی ٹہنیوں پر رنگ برنگ پرندے چہچہاتے تھے۔ اس جزیرے کی ہوا میں یادداشت کھو دینے والی ایک عجیب کیفیت تھی۔ اس نے بہت سوچا کہ وہ کہاں سے آیا ہے مگر وہ کچھ بھی نہ یاد کر سکا۔ دوسروں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ خود نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں جا رہے تھے۔

پھر ایک سفید ریش بڈھا اسے زیادہ پریشان جان کر بولا "تمہیں ان چیزوں کے متعلق نہیں سوچنا چاہئے کیونکہ اس میں سوائے پریشانی کے اور کچھ نہیں۔ اگر تمہیں آئندہ کبھی ایسے خیالات پریشان کریں تو کالی پہاڑی پر بنے ہوئے بڑے مکان میں چلے جایا کرو تمہیں تسکین ملے گی۔"

ایک دن وہ اس کے کہنے کے مطابق اس پہاڑی پر گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے جگمگاتے ہوئے ہال کمرے میں بے شمار چھوٹے چھوٹے چکر بنے ہوئے تھے۔ ان چکروں میں کئی مرد عورتیں مختلف آسنوں سے کھڑے یا بیٹھے تھے۔ بعض سر کے بل کھڑے تھے بعض اکڑوں بیٹھے تھے۔ بعض ایک ٹانگ اٹھائے کھڑے تھے۔ بعض آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر اسے ہنسی آگئی اور اس نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر ضبط کیا۔

"یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" اس نے سفید ریش بزرگ سے پوچھا جس نے اسے یہاں آنے کا مشورہ بھی دیا تھا اور آج اسے یہاں چھوڑنے کے لئے بھی چلا آیا تھا۔

"یہ لوگ اس خیال کو بھولنے کی کوشش کر رہے ہیں جو تمہیں اکثر ستاتا رہتا ہے۔"

"مگر کیوں؟" اس نے پوچھا

"کیونکہ ان کے حق میں یہی بہتر ہے۔ ان خیالات میں سوائے پریشانی کے اور رکھا ہی کیا ہے!"

"لیکن ایسا کرنے سے انھیں کیا ملتا ہے؟"

"تسکین"

"مگر یہ مختلف قسم کے آسن، یہ مختلف قسم کے چکر ——؟"

"ہاں جسے جس چکر میں تسکین ملتی ہے وہ اسے اپنا لیتا ہے"

"تو کیا انھیں ان سب چکروں میں گھوم کر اپنا چکر پسند کرنا پڑتا ہے؟"

"نہیں۔ اکثر لوگ اس گھر کا چکر اپنا لیتے ہیں جہاں وہ قیام کے لئے آتے ہیں یا لائے جاتے ہیں۔ تمہارے گھر کا وہ سامنے والا چکر ہے"

"یہ سب درست ہے لیکن میں اس خیال کو بھلانا نہیں چاہتا، خواہ وہ مجھے پریشان ہی کیوں نہ کرے" وہ بولا "میں یہ بھولنا نہیں چاہتا کہ جو میں ہوں وہ نہیں ہوں، کہ میں یہاں زبردستی لایا گیا ہوں کہ میں اس بستی میں اجنبی ہوں۔ تم شاید میرے خیالات کو نہیں سمجھ رہے۔ میں ہوم سک ہوں۔ یہاں مجھے کوئی نہیں چاہتا۔ سب کے سب اجنبی ہیں۔ میری کوئی سننے والا نہیں ہے۔ کوئی اپنا کہنے والا نہیں۔ میں تنہا ہوں۔ اور تنہائی کا زہر میرے انگ انگ میں گھل رہا ہے۔ جب میں شہر سے گذرتا ہوں تو بلڈنگیں مجھے گھور گھور کر دیکھتی ہیں۔ گلیاں میری ہنسی اڑاتی ہیں۔ بازار مجھ پر قہقہے لگاتے ہیں اور پوچھتے ہیں تم کون ہو، کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہو؟"

"شروع شروع میں میں بھی تمہاری ہی طرح سوچا کرتا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ وقت نے مجھے سب کچھ بھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں ان لوگوں میں گھل مل گیا کہ میرے لئے یہی بہتر تھا۔ پھر میں نے یہاں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا۔ اور اسی بستی کو اپنا کر رہنے لگا۔ پھر میرے یہاں چند مہمان آ گئے۔ ان کی دیکھ بھال میں پلک جھپکتے میں وقت گذر گیا اور کبھی یہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ شاید ہر نیا آنے والا اسی طرح سوچتا ہے۔" وہ چند لمحوں کے لئے فضا میں گھورتا رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو اور پھر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی دیر چپ رہ کے بعد بولا "میرا خیال ہے تمہیں کوئی دوسرا چکر تلاش کرنا چاہئے"

"نہیں تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں تمہارے ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہاں سے آگے جانے کی کون سی راہ ہے۔ میرا مطلب ہے اگلی منزل کہاں ہے؟"

بڈھے نے اپنا عشنہ زدہ ہاتھ اٹھا کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ پہاڑی دیکھتے ہو؟"

اس نے دور اودوں میں چھپی پہاڑی پر بنے ہوئے مندر کے چمکتے ہوئے کلس کی طرف دیکھ کر کہا "ہاں"

"وہاں سے ایک عجیب و غریب آواز سنائی دیتی ہے تو آنے والا اس بستی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر کہیں چل دیتا ہے"

"کہاں چل دیتا ہے؟"

"یہ کسی کو معلوم نہیں۔ شاید وہیں جہاں سے وہ آیا ہوتا ہے یا کہیں اور۔ کون جانے!"

"لیکن میں نے تو کبھی کوئی آواز نہیں سنی"

"آواز صرف وہی سنتا ہے جسے جانا ہوتا ہے"

وہ دھند میں ڈوبی ہوئی پہاڑی پر چمکتے ہوئے سنہری مندر کو دیکھنے لگا۔ بڈھا اسے تنہا چھوڑ کر اپنے کسی کام سے چلا گیا تھا اور وہ ایک بار پھر تنہا رہ گیا تھا۔

دوپہر کے وقت وہ یوں ہی گھومتے پھرتے ایک باغ میں آکر بیٹھ گیا۔ اس باغ کے ایک کنج میں ایک چھوٹا سا گول حوض تھا جس میں ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی نہا رہی تھی۔ وہ اس صاف شفاف پانی میں ایک سنہری مچھلی کی طرح ڈبکیاں لگا رہی تھی جس کی وجہ سے سبھی لوگ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگا اچانک وہ پانی میں غوطے کھانے اور مدد کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ اس نے سوچا ابھی لوگ اس کی مدد کے لئے دوڑیں گے مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ سب کے سب منہ پھیر اپنی اپنی راہ لگ گئے۔ وہ انہیں لعن طعن کرتا ہوا بھاگا اور تالاب میں کود پڑا۔ جاتے ہی لڑکی کو اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا ــــــ وہ سدھ بدھ کھو چکی تھی۔ وہ اُسے اُٹھا کر تالاب سے باہر لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا توں توں پانی اسے پیچھے دھکیل دیتا۔ اور پھر اس کا دم پھولنے لگا اور پانی بڑھتے بڑھتے گلے تک آ گیا تو وہ مدد کے لئے پکارنے لگا۔ مگر دیکھنے والوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اچانک اُس کی نظر بڈھے پر پڑی۔ وہ اُس کی آواز سن کر کنارے تک آیا تو اس نے کہا "میری کسی طرح مدد کرو"

"میرے دوست، یہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا کہ بستی کا یہی دستور ہے" اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اسے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی چیز ان کے جسموں کو پانی کی تہہ کی طرف کھینچ رہی ہو پھر نیم بیہوشی کے عالم میں، اس نے محسوس کیا جیسے اس کے قدم پانی کی تہہ سے چھو رہے ہوں۔ اس نے لڑکی کا جسم جلتا ہوا سا محسوس کیا۔ ایک عجیب قسم کی حرارت لڑکی کے جسم سے نکل کر اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھی پھر اس کا جسم بھی ایک انجانی سی آگ میں جلنے لگا۔ اس کے انگ انگ میں جیسے شعلے بھڑکنے لگے۔ پھر ان دونوں کے جسم جلنے لگے اور پانی کے دباؤ میں دونوں جسم پینگ لینے لگے۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر زور زور سے تو چقماق پتھر کی طرح ان سے چنگاریاں پھوٹ نکلیں اور پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا۔ پھر جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو وہ تالاب کی تہہ میں اُگی ہوئی نرم نرم ریشمیں گھاس پر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ لڑکی نے آنکھیں کھول کر آہستہ سے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے تو تالاب ایک گھر کی سی شکل اختیار کر گیا۔ اور روشندان سے آتی ہوئی سورج کی سنہری کرنیں ان کے جسموں سے کھیلنے لگیں۔

"اب تمہارا کام پر جانے کا وقت ہو گیا ہے" وہ بولی اور اُٹھ کر ناشتہ بنانے لگی۔

فرخندہ لودھی

گولڈ فلیک

"مس نفیسہ، آپ سے ہمیں یہ اُمید نہ تھی"۔ مڈل سکول کی ادھیڑ عمر کرسچن ہیڈ مسٹرس نے قلم کو قلمدان میں رکھا اور نظریں اُٹھائیں۔ اُن کی آنکھوں میں رعب اور رعونت تھی۔ دبلی پتلی مس نفیسہ کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ گھبراہٹ اور غصے سے اُس کا تنفس تیز ہو گیا۔ اُس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا "لیکن مسز گھوش آپ۔ ... آپ کا مطلب ہیں ....."

"مطلب؟" مسز گھوش ایک دم جوش میں آگئیں، اور انھوں نے اپنے تمام وقار کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا: "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے آپ ذمہ دار پوسٹ پر ہیں مس نفیسہ! ایک اُستاد کا کردار مثالی ہونا چاہیئے"

"آپ کو میرے کردار پر شک ہے..... اوہ ....." نفیسہ پھوٹ پڑی اور اضطراری طور پر اُس کے پاؤں دروازے کی طرف مڑ گئے مسز گھوش اُسے آوازیں دیتی رہیں، مگر اُسے اب مزید کچھ نہ سننا تھا اور نہ سنائی دیتا تھا۔

چھوٹی بڑی لڑکیاں سکول کے صحن، برآمدوں، کمروں میں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ آدھی چھٹی کا وقت تھا اگر اُس کی آنکھوں کو کسی بچے نے بھیگا ہوا دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی ——"لڑکیو! مس نفیسہ رو رہی ہیں۔ خدا کی قسم ہم نے خود دیکھا ہے" —— اور پھر اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تمام لڑکیاں گروہوں میں سر جوڑ کر کھڑی ہو جائیں گی —— کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کس لئے ہوا؟ اور نہ جانے کیا کیا۔ اور بعض بچے تو قسمیہ کہہ دیں گے۔ "ہاں ہمیں سب کچھ معلوم ہے" —— یہ طبقہ بڑا ظالم ہوتا ہے اور وہ لڑکیاں نہایت خوش ہوں گی جن کو اُن کے ڈھیٹ اور نکمے ہونے پر وہ سزائیں دیا کرتی ہے۔

وہ سٹاف روم کے پاس سے بھی گزر گئی —— یہ اُستانیاں! توبہ ....!

کمرے میں جا کر وہ کرسی میں ڈھیر ہو گئی اور دیر تک بغیر سوچے سمجھے روتی رہی۔ وہ کیوں رو رہی ہے؟ وہ سمجھ نہ سکتی تھی مگر جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے دل پر چھائے ہوئے غبار کو دھو دے۔ مسز گھوش کی بات بہت سی تلخ باتوں اور یادوں کے ساتھ مل کر اُس کے ذہن میں تلاطم بپا کرتی ہوئی انھیں میں کہیں کھو گئی تھی۔ ذہن کے ساز کے تاروں پر یہ بات ایک مضراب کی طرح پھر گئی تھی جس سے سارے تار بج اُٹھے تھے اور سارے سُر ایک ساتھ چیخ اُٹھے تھے۔

وہ دیر تک اسی حالت میں پڑی رہی اور لوگ اُس کے دروازے کو جارحانہ انداز سے پیٹتے اور چیختے رہے۔ اُسے معلوم تھا لوگ اُسے بلانے آرہے ہیں۔ تین پیریڈ ابھی اور پڑھانا ہے۔ میری شکایت ہو جائے گی اور پھر اس کا انجام کیا ہو گا؟ اُس نے پل بھر کے لئے سوچا اور سر کو غصے اور بے پروائی سے جھٹکا —— "ہوں .. ہوا کرے ..... اس بڑے سمندر میں ایک بوند اور سہی ......" نفیسہ نے چٹخنی نہیں کھولی۔

تنہائی اُس کے لئے ایک گونہ تسکین کا باعث بن رہی تھی وہ اُس کو کیوں کھوتے۔

سکول میں چھٹی ہوگئی اور اُس کے کمرے کے سامنے سے مسلسل قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ فیشن ایبل استانیاں اونچی ایڑیاں بجاتی گزرتی رہیں۔۔۔ اُن کے چہروں پر آدھی چھٹی کے وقت لگائے گئے پوڈر کی تہہ میں پھر کیریں پڑ گئیں ہوں گی۔۔۔ اس نے سوچا۔۔۔ اور کاجل کی دھاریں چمگادڑ کے پروں کی مانند چوڑی، بھدی اور بے ہنگم ہوگئی ہوں گی۔۔۔ نفیسہ کی جھنجلاہٹ اور سوچ بڑھتی چلی گئی۔۔۔ استانیاں جب جماعتوں میں لڑکیوں کے سامنے بک بک کر تھک جاتی ہیں اور ان کی باچھوں میں تھوک اور میل جم جاتی ہے، لپ اسٹک پھیل جاتی ہے اور پھیکی پڑ جاتی ہے تو بچوں کو بار بار یہ خیال آتا ہے۔۔۔ آپا جی منہ صاف کیوں نہیں کر لیتیں۔۔۔ مگر وہ کہہ نہیں سکتے۔۔۔ استانی سب کچھ بھول کر بولتی چلی جاتی ہے۔ بچوں کے چھوٹے چھوٹے ذہن سبق کے راستے پر لڑھکتے، پھسلتے رہتے ہیں کہ پیریڈ گزر جاتا ہے اور کسی نازک طبع اور ذہین بچے کے ذہن میں آپا جی کے صرف گندے ہونٹ رہ جاتے ہیں اور بس۔۔۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے وہ خود کو آمادہ نہ کر سکی۔ اُس کی ساتھی استانیوں نے اُسے بلانے کے لیے مائی ماموں کو بھیجا۔ وہ آئی اور نفیسہ کا جواب سن کر واپس چلی گئی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ماموں پھر آئی اور اُسے دوبارہ ناکام جانا پڑا۔

باورچی خانے کی مائی ماموں کا مزاج جھوٹ کھانے والی بلیوں کی طرح کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کے حواس خمسہ خوب کام کرتے تھے۔ ان سب کی کارکردگی نے ایک چھٹی حس کو جنم دیا تھا جو اُسے ہر وقت بے قرار رکھتی اور اُس کو چھاج میں دانے کی طرح اِدھر سے اُدھر پٹخنیاں دیتی رہتی۔ اب کی بار وہ نفیسہ کے بند دروازے سے یوں لوٹ گئی جیسے اُسے کسی اہم سربستہ راز کا پکا پتہ چل گیا ہو۔

ایک ثانیہ کے بعد مائی ماموں کی قیادت میں دو استانیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آئیں۔ وہ تازہ دم دکھائی دیتی تھیں۔ بال چمک رہے تھے۔ اور قمیصوں کے دامن نئی نئی استری ہونے کی وجہ سے لش لش کر رہے تھے۔ غازے کا غبار اور ہونٹوں پر لپ اسٹک بالکل تازہ تھی۔ برآمدے میں پہنچ کر اُنھوں نے سانس روک لئے اور دبے پاؤں نفیسہ کے دروازے میں تھوتھنیاں ڈال کر کتوں کی مانند سونگھنے لگیں جیسے کمرے کے اندر کوئی مردہ لاش پڑی گلنے سڑنے لگی ہو اور کسی طور دروازہ کھل نہ پاتا ہو کہ وہ شکم سیری کر لیں۔ پھر انھوں نے ایک دوسری کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور ماموں مائی کی سچائی پر داد دینے کے لئے مڑیں مگر وہ جا چکی تھی۔

"دروازوں میں سے دبی بو آ رہی ہے"۔ دونوں میں سے بڑی عورت نے دھیمی آواز میں کہا۔ آغازِ گرما کی شام بڑی اجلی اور خوشبودار تھی۔ وہ دبے پاؤں باغیچے میں سرک آئیں۔ دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ چھوٹی عورت نے دوسری کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے سرد آہ بھری۔ اُس کے چہرے اور آنکھوں میں کوئی تمنا تھی کہ لرز رہی تھی: "یہ بو تو مجھے بھی بہت پسند ہے۔۔۔ بہت پسند ہے۔ سچ کہتی ہوں بہت پسند ہے"۔ آسمان پر دو پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑے جا رہے تھے۔ اُن کی چونچیں کھلی تھیں۔ وہ پیاسے تھے۔ پھر اُس کی انگلیوں نے بڑی عورت کے ہونٹوں کو چھوا اور اپنا رخسار اُس کے کندھے پر رگڑنے لگی۔

"مس کوکب!۔۔۔۔"

مس کوکب نے جھک کر اُس کے رخساروں کو چوما۔ پھر اُس کے ہونٹ سرکنے لگے۔ دوسری کے ہونٹوں پر آ کر وہ یوں رک گئے جیسے غنودگی کے عالم میں چلتے چلتے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو۔

"تنو!۔۔۔ مس کوکب کی آواز نشیلی اور بھاری تھی۔ اُس نے تنو کو جھٹک کر اس طرح الگ کیا کہ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

ماموں مائی سڑ پڑ کرتی ہوئی پھر آ دھمکی اور دونوں ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ کچھ جھینپ رہی تھیں

"آپا جی! مس صادقہ سچ ہی کہتی تھیں اور مجھ نگوڑی کی زبان پر کس کو یقین آتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کوئی مرد واہے" ماموں نے رازدارانہ طریقے سے مس کوکب کے قریب ہو کر کہا۔

"اچھا چل بک بک نہ کر" مس کوکب نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے ڈانٹ بتائی۔ "تمہیں کیا؟"

پھر اُس نے داد طلب نگاہوں سے تنو کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں کئی تسلیمات مضمر تھیں اور پلکیں کئی کورنشیں بجا لا رہی تھیں۔

"ہاں ہمیں کیا؛ عشق مشک چھپائے نہیں چھپتا آپا جی! ہم نے بہت دیکھی ہیں——خاوند نے نکال باہر کیا نا!" ماموں بکواس کرتے ہوئے چپنے لگی۔ مگر اشتیاق کی پھلجھڑی کو آگ دکھا کر گئی مس کوکب سے کہاں رہا جاتا۔ اُس نے عجلت سے ماموں کو پکارا۔

"او ہو کیا بیب میں بڑی صفر در رکھتا ہے" تنو ہنسی۔ وہ گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ مس کوکب نے بارعب اور پرمعنی نظریں اس پر ڈالیں۔ وہ خاموش ہو کر رہ گئی۔

"ماموں! تو کیا کہہ رہی تھی ابھی مس نفیسہ کے کمرے کے راز تو کچھ تجھے ہی معلوم ہیں؟"

ماموں اپنے سامنے کے ساڑھے تین دانتوں کے ساتھ ہنسی——"ہی ہی، آپا جی آپ تو مذاق کرتی ہیں۔ آپ تو سکول کی ہیڈ نگ ہیں بھلا آپ کو کچھ نہیں معلوم!" وہ جب خوشامد کے موڈ میں ہوتی تو مس کوکب کو ہمیشہ ہیڈ نگ کہتی۔ مس کوکب استانیوں میں سب سے سینیئر اور ہیڈ مسٹرس سے دوسرے نمبر پر تھی۔ ہوسٹل کی محدود سوسائٹی میں وہ سب سے بڑی اور واقعی ہیڈ نگ تھی۔ ماموں اور دوسرے نوکر اس سے دبنے کے ساتھ ساتھ اُس کے منہ بھی آ جاتے۔ وہ کرید کرید کر اُن سے باتیں پوچھتی۔ وہ سر چڑھنے کو آتے تو ذرا سا ڈانٹتی بھی۔

"ہاں ماموں! تو بنتی کیوں ہے اتنا—— ادھر کیا بات ہے؟ یہ آپا جی ہمارے سامنے تو بڑی معصوم صورت لے کر آئیں۔ اندر اندر نہ جانے کیا گند گھلتا ہے۔ زیادہ پڑھی لکھی ہیں تو ہوں گی تمہیں پتہ ہے میں ایسی ویسیوں کے ساتھ زیادہ تعلقات نہیں رکھتی، چہ جائیکہ کمرہ میں جانا۔ ان لوگوں کو اپنی غیرت کا احساس نہیں، بھلا ہمیں کیا سمجھیں؟"

تنو اس عرصے میں زمین سے گھاس نوچ نوچ کر پھینک رہی تھی مس کوکب نے اس کی طرف دیکھا، وہ بالکل بے نیاز بیٹھی تھی۔ ایسی لڑکی کی طرح جسے عشق کے درد کا نیا نیا احساس ہوا ہو اور وہ اپنے دل کے ہاتھوں مضطر ہو۔

ماموں نے بتایا: "آپا جی سنا ہے—— دیکھا تو نہیں ——جس نے جھوٹ کہا اُس کے منہ میں کیڑے۔ ہم تو جو سنتے ہیں کہتے ہیں۔ لیکن لوگ تنگ، اور کتنی کتنی جو کہتی ہیں۔ کوئی پوچھے تو . . . آپ بھی میری طرح بھولی بھالی اور سیدھی ہیں۔ لو بھلا معصوم کہہ دیا" ماموں نے تنو کی طرف گواہی لینے کے لیے دیکھا۔ وہ سراپا خوشامد اور چاپلوسی بن رہی تھی۔ تنو کی آنکھیں خاموش تھیں۔ انھوں نے کوئی گواہی نہ دی۔

ماموں پھر بولی "سنا ہے آج بڑی آپا جی نے بھی پوچھا تھا۔ اُن کی مائی راتی بتا رہی تھی جبھی تو کھاتا نہیں کھایا۔ لو بھلا ایسی باتیں چھپتی ہیں کہیں؟"

"بے دیکھے تم کیا کہہ سکتی ہو! وہ کوئی بھلا واقف ہو گا جو تمہاری ہماری نظریں بچا کر شام کو کمرے میں گھس جاتا ہے۔ تم کہتی ہو میاں نے چھوڑ دیا؟" کوکب نے سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا جھوٹ۔ ایسوں کے ساتھ کب تک نبھ سکتی ہے۔ آپ ہی کہیں آپا جی!"

مس کوکب نے آنکھوں سے چشمہ اُتار کر منہ سے بھاپ دی اور رومال سے صاف کرنے لگی۔ یہ اُس کے سوچنے کا انداز تھا۔ سب جانتے تھے۔ "ہوں ہوں، ٹھیک سے کچھ دکھائی نہیں دیتی ——— تم جاؤ مامو۔" وہ مامو سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔

شام کے دھندلکوں میں ابھی دن کی سپیدی کا احساس ہو رہا تھا اور کوکب کے بالوں کی کالی رات میں صبح صادق جھلکنے لگی تھی۔ وہ مس تھی اور زندگی میں جتنے چانس آئے دریا دلی سے مس کرتی رہی۔ پھر اب اُس کا جی چاہنے لگا تھا کہ لوگ اُس پر ریجھا کریں۔

ہوسٹل کی عمارت کے دائیں طرف سے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور مامو مائی بغلیں جھانکتی ہوئی فوراً دوسری طرف کھسک گئی۔ یہ گیٹ کا چپراسی تھا۔ مس کوکب کا ماتھا ٹھنکا۔ "آئی کوئی بیگار" اُس نے دل ہی دل میں ہیڈ مسٹرس کو کوسا۔ "خدا کسی کو چھوٹا نہ بنائے۔"

چپراسی نے سلام کے ساتھ ایک رقعہ مس کوکب کے ہاتھ میں تھما دیا اور بولا "وہ باہر کھڑے ہیں۔"

مس کوکب عینک کو ٹھیک کر کے رقعہ پڑھتے ہوئے زیر لب بولیں۔ "اُن سے کہو ابھی آتے ہیں۔" اُس کے چہرے پر مسکراہٹ اور چمک پھیل گئی تھی۔

چپراسی چلا گیا اور وہ خود برآمدے کی طرف بڑھی۔ تنو جو اب تک صبر کئے بیٹھی تھی اُس سے نہ رہا گیا۔ "سکول نہیں جہنم ہے۔ کیا مجال جو کہیں سکون میسر ہو۔" وہ گڑبڑائی ہوئی کوکب کے پیچھے ہولی۔ غصے کے مارے اُس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں؟ کیوں جا رہی ہیں؟ ابھی جا رہی ہیں؟ کب واپس ہوں گی؟" اُس نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر چھوڑے اور بڑھ کر مس کوکب کا ہاتھ پکڑ لیا اور لمس کا حظ اُٹھانے لگی۔

"ارے تم ......" مس کوکب ذرا دیر کو رکیں اور جھینپے میں آنکھیں پھاڑ کر تنو کے چہرے کو دیکھا ——— "تم تو رُوٹھنے والی ہو رہی ہو ......" پھر اُس کے گال پر زبردست چٹکی لی۔ تنو کھِل اُٹھی۔

"میں آپ کے کمرے میں سو رہوں آج؟" تنو کی آواز میں التجا تھی "اور آپ جلدی آئیے گا۔"

"کیوں ———؟"

"ڈر لگتا ہے ———"

"اونہہ دیوانی!" مس کوکب نے تنو کے سر کو اپنے ہاتھوں میں اس طرح جھلایا جیسے بلونی سے دہی بلویا جاتا ہے۔

جب سے نفیسہ قصبے کے اس سکول میں آئی تھی اُس کا دل اوپرا اوپرا ہی رہا۔ اُس کے طور اطوار ماحول کی کسوٹی پر پورے نہ اُترے۔ بعض اُستانیوں کی نظر میں وہ معصوم اور بدھو تھی، اور کئی اُسے چالاک اور گھُنی کہتی تھیں۔ عام طور پر وہ اپنے کمرے میں بڑی کتابیں پڑھتی رہی۔ ابھی لڑکیوں نے اُس پر مرنا شروع نہیں کیا تھا اور کسی جان دینے والی نے کوئی خط یا پھڑکتا ہوا شعر لکھ کر اس کی کھڑکی میں بھی نہ پھینکا تھا۔ ایک دن ایک چھوٹی سی لڑکی نے چھٹی کے وقت دن بھر کا باسی پھول نہ معلوم کس جوش میں آکر اُسے دے دیا۔ نفیسہ نے شکریہ کہتے ہوئے لیا، سونگھا اور انگلیوں میں نچاتی ہوئی چل دی۔ کئیوں نے کنکھیوں سے دیکھا اور ایک دوسری کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کیں جن میں سے اس کی سمجھ میں کچھ آئیں اور کچھ نہیں ———

بہر حال اس نے وہ پھول لا کر میز پر رکھ دیا۔ جہاں وہ کئی دن تک پڑا سوکھتا رہا ——— پھر کسی طرح اُس کی پتیاں بکھر گئیں اور اپنے آپ کہیں اُڑ گئیں۔

یہاں رہتے ہوئے نفیسہ نے محسوس کیا کہ کبھی لوگ اُسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ محتاط ہو گئی۔ کم سے کم گفتگو کرتی، وہ سرِ شام بتی گل کر کے بیٹھ جاتی۔ نیند بہت کم آتی تھی مگر وہ سونے کی پوری کوشش کرتی

قصبے کے اس مڈل اسکول میں علاقے بھر کی کریم آتی تھی۔ ہر رنگ، ہر مزاج کے لوگ یہاں موجود تھے۔ مگر بعض لوگوں کو اپنا ہم مزاج تلاش کرنے میں بڑی دیر لگتی ہے ——— آج ہیڈ مسٹرس کی بات نے اُس کی روح اور جسم کی ساری بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

رات کے دس بجے مسز گھوش راؤنڈ لیتی ہوئی اچانک سٹاف کے کمروں کی طرف آنکلیں۔ اُن کے بشرے سے دور اندیشی اور ذہن کی پختگی ظاہر ہوتی تھی وہ نفیسہ کو بڑا اچھا اور ذمہ دار سمجھتی تھیں لیکن جب سے مس کوکب نے ایک بات کہی تھی اُن کو تشویش پیدا ہو گئی۔ اُنھوں نے نوکروں چاکروں سے پوچھ کچھ کر کے شک رفع کرنے کی کوشش کی تسلی نہ ہوئی نفیسہ سے براہ راست پوچھا لیکن اس کی گھبراہٹ نے معاملہ اور زیادہ اُلجھا دیا۔ برآمدے میں پاؤں رکھتے ہی دھیمی دھیمی بو نے اُن کا سواگت کیا۔ مسز گھوش کا شک یقین میں بدل گیا۔ پھر وہ حوصلہ کر کے آگے بڑھیں اور دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ کھلا تھا۔ پردہ اُٹھا کر کھڑکی سے چھنتی ہوئی چاندنی کے ساتھ جھپٹتے سے کمرے میں دھواں تیرتا پھرتا تھا۔

"سگریٹ بو ــــ" انھوں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ نفیسہ سوئی ہوئی تھی۔ اور کمرے میں صرف ایک متنفس کا احساس ہوتا تھا ــــ یہاں کون ہے جو سگریٹ پیتا ہے" وہ معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ نفیسہ کو وہ یہاں آنے سے پہلے بھی جانتی تھیں کیا یہاں کوئی روح رہتی ہے جو سگریٹ پیتی رہتی ہے اور نفیسہ پر اُس آسیب کا اتنا اثر ہے کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ اُنھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نفیسہ یک لخت اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ بتی جلنے سے کمرہ روشن ہو گیا۔ نفیسہ کانپنے لگی اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مسز گھوش اُس کے کمرے میں اس وقت آ دھمکیں گی۔

"مسز گھوش ــــ مسز گھوش" آپ بیٹھ جائیے۔ آپ، آپ اس وقت کیسے؟ میں ابھی تک سوئی نہیں تھی"

جبھی دروازہ کھلا تھا۔ مسز گھوش اطمینان سے نفیسہ کے پلنگ پر بیٹھ گئیں تپائی پر پڑی ہوئی ایش ٹرے میں سگریٹ سلگ رہا تھا اور اس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔

"مس نفیسہ! آپ کو معلوم ہے۔ میں آپ سے کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی" مسز گھوش نے بلا تامل کہا

"جی ہاں جی ہاں ..."

"میرا مطلب تھا کہ میں آپ کے ساتھ مالکانہ گفتگو کروں مس نفیسہ۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ میرا مطلب تھا۔" مسز گھوش کو پھر الفاظ نہ مل رہے تھے۔ اور نفیسہ کو غصہ آ رہا تھا اُس نے تلملاتے ہوئے دل میں ارادہ کیا۔ یہ عورت اسی طرح بے عزتی کرتی رہی تو وہ چھوڑ جائے گی۔ ایسی نوکری پر لعنت ــــ

مسز گھوش نے پھر کہا "یعنی میرا مطلب ہے مس نفیسہ، آخر یہ سگریٹ کون پیتا ہے؟ آپ کو معلوم ہے یہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں تنگ نظر لوگوں کی بچیاں پڑھتی ہیں اور آپ کو اگر عادت ہے تو کھلے بندوں پیا کیجئے۔ ہم سٹاف ممبرز کے سامنے پینے میں کوئی حرج نہیں۔ کہانیاں گھڑنے کا موقع کیوں دیا جائے؟ لوگ کہتے ہیں کہ رات کو آپ کے کمرے میں کوئی آتا ہے۔ میں کیسے یقین کر لوں؟ آج اسی لئے خود تحقیق کرنے کے لئے چلی آئی۔ آپ برا نہ مانیں بات کا بتنگڑ بنانے کی تو لوگوں کو عادت ہوتی ہے، سنا ہے آپ دروازہ کھلا رکھ کر سوتی ہیں"

نفیسہ اس تمام عرصے میں چپ چاپ سنتی رہی۔ اور اُس کی آنکھوں کی تیرگی بڑھتی گئی" مسز گھوش! گولڈ فلیک کا دھواں مجھے پسند ہے۔ اس کی خوشبو مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں پیتی نہیں"

"آپ پیتی نہیں؟"

"میرے میاں پیتے تھے۔ اس کے دھوئیں سے مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ میرے آس پاس میرے قریب ہیں ــــ اور پھر میں دروازہ کھلا رکھتی ہوں کہ شاید وہ آجائیں" نفیسہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اُنھوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ سلگتے ہوئے سگریٹ کا دھواں مجھے آج بھی اُن کی موجودگی کے احساس سے مسرور کر دیتا ہے۔ اور جب میں اُن کی یاد میں سلگتی ہوں تو دنیا شک کرتی ہے۔ مسز گھوش! میرا کوئی قصور نہیں، مسز گھوش تو آپ یقین نہیں کریں گی۔ آپ یقین کیجئے نا"

مسز گھوش نے مادرانہ شفقت سے اُس کے سر کو گود میں رکھ لیا اور اس کے بالوں پر پیار کرنے لگیں۔ اُن کی بھیگی ہوئی آنکھوں میں ماضی کی یادیں اور محرومی کے غم تیرنے لگے۔

ہاشم مرزا

خون کا رِشتہ

توپوں کی گھن گرج سے زمین کا سینہ دہل رہا تھا اور گلی میں گھومتے ہوئے رضاکاروں کی ہنسی اطمینان دلا رہی تھی کہ دشمن خواہ کتنی ہی کثرت میں ہو، اس کے پاس کتنا ہی ساز و سامان ہو، وہ مجاہدین کے فولادی حصار کو توڑ کر آگے قدم نہیں اٹھا سکتا۔ جہاں وہ اس وقت ہے وہاں بھی اس کے قدم نہیں جم سکتے۔ اسے بھاگنا ہی پڑے گا اور شاید وہ اپنی لاشوں کے انبار دیکھ کر پسپا بھی ہو رہا ہو ——— شیخ صاحب کے سہ منزلہ مکان کے نچلے حصے میں مائی نوراں نے محلے کے چند غریب کنبوں کو دو دو کمرے کھول دیئے تھے، اور وہ اپنے شکستہ مکانوں سے اٹھ کر یہاں آ گئے تھے ——— شہر کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے یہ محلہ دشمن کی گولہ باری سے بظاہر محفوظ تھا۔ اور مائی نوراں شیخ صاحب کے جانے کے بعد اتنے بڑے مکان میں اکیلی رہ گئی تھی ——— اس نے خود ہی غریب کنبوں کو یہاں رہنے کی دعوت دی تھی اور ان کے آنے کے بعد اس نے یوں خوشی محسوس کی تھی جیسے اس نے اپنے جسم کے ایک حصے کو آگ میں جلنے سے بچا لیا ہو۔

شیخ صاحب پہلے دن کی بمباری اور گولہ باری سے بے حد متاثر ہو کر عورتوں اور بچوں کو اپنے بھائی کے پاس چھوڑنے راولپنڈی چلے گئے تھے ——— مائی نوراں کو بھی انہوں نے چلتے وقت مشورہ دیا تھا کہ دشمن جب کہ دو تین میل کے فاصلے پر گولہ باری کر رہا ہے اور وہ کمزور جان بُرے وقت میں کہیں جا بھی نہ سکے گی، بہتر ہے کہ وہ بھی ان کے ساتھ چند دن کے لئے راولپنڈی چل جائے۔ حالات بہتر ہونے پر وہ خود سب کو واپس لے آئیں گے۔

یہ سن کر مائی نوراں کو جھرجھری سی آ گئی تھی ——— شیخ صاحب کے چہرے پر نظریں جما کر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا ——— "شیخ جی اب بہت گزر گئی ہے جو تھوڑی باقی ہے اس کی حفاظت میں کیوں جی ہلکان کروں۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ آپ بچوں کو چھوڑ آئیں۔ میں سیالکوٹ کی زمین نہیں چھوڑ سکتی"۔

شیخ صاحب نے تانگے میں سوار ہوتے ہوئے کہا "تم کس کے لئے یہاں رہ رہی ہو، کوئی بیٹا نہ بہو ——— یہاں کیا رکھا ہے؟ پنڈی میں ہر خطرے سے محفوظ رہو گی ———"

مائی نوراں کا دل تڑپ اٹھا ——— میرے بیٹے کی قبر تو یہاں ہی ہے۔ میرے سہاگ کی ساری ہڈیاں سیالکوٹ ہی میں دفن ہیں۔ میں نے یہیں جنم لیا تھا اور یہیں سے جنازہ بھی اٹھے گا"۔

شیخ صاحب کا تانگہ دور نکل گیا تھا اور مائی نوراں دیر تک دہلیز پر گم سم بیٹھی رہی تھی ——— "اگر میرا بیٹا زندہ ہوتا تو کیا وہ یہاں سے جا سکتا تھا! ——— اپنا گھر چھوڑ سکتا تھا! ——— مجھ سے دور رہ سکتا تھا! ——— نہیں ایسا کبھی نہ ہوتا! ——— وہ سینہ تان کر دشمن کے سامنے کھڑا ہو جاتا ——— وہ دشمن کا وار خندہ پیشانی سے برداشت کرتا اور پھر اس پر ایسا بھرپور حملہ کرتا کہ اسے کہیں بھی امان نہ مل سکتی ——— ہاں میرا بہادر بیٹا یہاں سے جانے کا خیال تک بھی دل میں نہ لا سکتا تھا"۔ مائی نوراں کا دل غم کے بوجھ سے دبنے لگا ... "پر یہ تو ہونی کی باتیں ہیں نا ——— میرا تو کوئی بیٹا نہیں ——— جو تھا وہ اللہ کو پیارا ہو گیا ———"... اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کے بیٹے کی لاش سامنے پڑی ہو اور وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہو۔ اس نے آنکھیں زور سے جھپکیں اور اس کی پلکیں گیلی ہو گئیں اور اس نے اپنے

بدنت زور سے بھینچ لئے ۔ "یہ کوئی رونے کا وقت ہے۔ کون سدا زندہ رہے گا۔ کوئی آج گیا تو کوئی کل ـــــ" اسے کچھ سنبھالا مل گیا ـــــ اس کے زخموں پر جو کھرنڈ آ چکا تھا اس میں ٹیس تو پیدا ہوئی تھی مگر وہ چھلا نہیں اور اس ٹیس کو بھی زندگی اور موت کے مستقل کھیل کی جھلک نے دبا دیا تھا ـــــ وہ تو اب صبر و شکر کی عادی ہو چکی تھی۔

اپنے بیٹے حسن دین کی موت کے بعد مائی نوراں کے لئے بڑھاپا ایک کالی گرم چٹان بن گیا تھا جس کے تلے وہ بُری طرح جھلس رہی تھی ـــــ شیخ صاحب کو بھی دکھ ہوا تھا، سو وہ مائی نوراں کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ گھر کے کام کاج میں اس کے زخم سکڑنے لگے تھے ـــــ ان پر کھرنڈ آ گیا تھا ـــــ شیخ صاحب کے بچوں سے اسے اولاد جیسا اُنس پیدا ہو گیا تھا اور وہ مطمئن ہو گئی تھی کہ اس کی مٹی خراب نہ ہو گی۔

لیکن اب شیخ صاحب نے جاتے ہوئے اسے حسن دین کی یاد دلا دی تھی اور وہ دہلیز پر بیٹھی ماضی کے اندھے غار میں گرتی جا رہی تھی۔ اندر کمرے میں کسی بچے کی چیختی ہوئی رونے کی آواز سُن کر اس کے سارے جسم میں لرزش پیدا ہو گئی۔ گھٹنوں پر ہتھیلیوں کا سارا بوجھ ڈال کر جب وہ کھڑی ہوئی تو اسے شیخ صاحب کے گھر میں رہائش پذیر غریب کنبوں کا خیال آ گیا ـــــ "دشمن ہمارا بگاڑ بھی کیا سکتا ہے ـــــ وہ پہلے دن نالہ ایک ہی عبور نہ کر سکا۔ تو اب وہ کیسے شہر میں داخل ہو سکتا ہے۔ اللہ پاک ہمارے ساتھ ہے۔ ہماری توپیں کل رات سے کیسی دندنا رہی ہیں۔ دشمن کی طرف سے تو ایک گولہ تک آج ہماری طرف نہیں آ سکا ـــــ دشمن کو تو بھاگنے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ ہمارے بیٹے جنگ کر رہے ہیں اور ہم یہاں رہ کر ان کی فتح کی دعائیں مانگیں گی۔ اللہ پاک ہماری دعائیں ضرور قبول کرے گا ـــــ"

مائی نوراں اندر جانے کی بجائے بازار کی طرف آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگی ـــــ کبھی اس کے ذہن میں شیخ صاحب کے الفاظ گونجنے لگتے اور کبھی وہ زیرِ لب فتح کی دعائیں مانگنے لگتی۔ بازار کی ساری دکانیں کھلی تھیں۔ جگہ جگہ لوگ کھڑے اپنے ہوائی جہازوں کے کارناموں اور مجاہدین کی بہادری کی داستانیں اپنے خون کو گرما رہے تھے۔ دو ہی دن میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا تھا ـــــ چوروں کی طرح آنے والے دشمن نے پہلے ہی ریلے میں سیالکوٹ کی تسخیر کے خواب دیکھے تھے مگر اب ایک انچ بھی آگے بڑھنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا ـــــ مائی نوراں چند قدم چلنے کے بعد رک جاتی تھی اور توپوں کی گھن گرج اس کے چہرے پر فتح مندانہ چمک پیدا کر دیتی تھی۔ شہر کے اردگرد نصب شدہ توپیں دشمن پر آگ برسا رہی تھیں اور مائی نوراں کو یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کا لاڈلا حسن دین دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا ہو۔

موتی دروازے کے چوک میں اسے نعروں کی آواز سنائی دی اور اس کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ پُر اشتیاق نظریں اِدھر اُدھر گھما کر اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک نوجوان کو آواز دی ـــــ "اے بیٹا! ذرا ٹھہر تو ـــــ یہ نعروں کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟"

نوجوان نے رُکے بغیر گردن کو ذرا گھما کر اونچی آواز میں کہا ـــــ "ماں جی ہماری تازہ دم فوج سرحد کی طرف بڑھ رہی ہے۔ سب ہی نعرے لگا رہے ہیں"

"اچھا!" وہ سرکلر روڈ کی طرف تیز تیز قدم اُٹھانے لگی ـــــ سڑک کے دو رویہ کھڑے ہوئے لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ فوجی لاریوں میں بیٹھے ہوئے مجاہد بازو لہرا لہرا کر ان نعروں کا جواب دے رہے تھے ـــــ مائی نوراں لوگوں کی قطار کے پیچھے رک گئی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا اور چہرے کی جھریوں میں فتح مندیوں کے چراغ جھلملا رہے تھے۔

"اے بیٹا مجھے بھی آگے بڑھنے دو۔ میں بھی مجاہدوں کو دیکھنے کا ثواب حاصل کر لوں" مگر نعروں کی گونج میں کسی نے بھی اس کی آواز نہ سُنی وہ مضطربانہ انداز میں دائیں طرف قدم اُٹھانے لگی ـــــ "اللہ پاک سب کا محافظ ہے ـــــ ماں صدقے۔ اے بیٹا مجھے بھی آگے ہو لینے دو" اس کی نظر لکڑی کے بنچ پر پڑی جس پر کھڑا ہونے کو تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ ابھی وہ اس تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تیزی سے اس کے

پاس سے گزر کر وہاں جا کھڑا ہوا — وہ تلملا کر رہ گئی ——— ایسے تو وہ اگلی قطار تک کبھی نہ پہنچ سکے گی — — — وہ پھر دائیں طرف بڑھنے لگی۔ بڑی نالی کے پکے کنارے پر کھڑے ہوئے دو آدمیوں کے سامنے وہ رک گئی ۔ "یہ لوگ میری بات کیوں نہیں سنتے" ۔ اس نے روہانسی ہو کر کہا۔ اس دفعہ بھی اُسے کوئی جواب نہ ملا۔

ایک گٹھیلے بدن کا نوجوان ڈھیر سارے ہار پکڑے اس کے قریب آیا اور پھر قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کو ایک طرف دھکیلتا آگے بڑھنے لگا۔ مائی نوراں کو بھی موقع مل گیا۔ وہ اس نوجوان کے پیچھے لپکی اور سب سے آگے آ گئی — پھولوں کے ہاروں پر نظر پڑی تو اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے جیب ٹٹولنی شروع کر دی۔ اس کے پاس اس وقت چار آنے تھے۔ انہیں نکال کر اس نے اس نوجوان کی طرف بڑھا دیا۔ کسی نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر نعرہ لگایا "نعرۂ تکبیر" — اور "اللہ اکبر" کی گونج نے فضا میں اُبھرتی ہوئی توپوں کی گھن گرج کی شان بڑھا دی — پھر دوسرا نعرہ گونج اُٹھا اور نعروں کا جواب اب کے مائی نوراں نے بھی دیا۔ ہاروں پر دوبارہ نظر پڑتے ہی وہ چلا اُٹھی — "اے بیٹا چار ہار مجھے بھی دے دے — اللہ سلامت رکھے"۔

نوجوان نے سامنے سے گزرنے والے آخری ٹرک پر چند ہار اُچھال کر کہا — "ماں جی۔ میں ہار بیچتا نہیں — ان ہاروں کی قیمت کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا —" پھر اس نے باقی بچے ہوئے ہار مائی نوراں کو پکڑا دیئے۔

مائی نوراں کا خون جوش مارنے لگا۔ آخری ٹرک پر نظر ڈالی تو اسے اپنا لاڈلا حسن دین رائفل تھامے بیٹھا دکھائی دیا۔ پھر دوسرا حسن دین۔ تیسرا حسن دین، چوتھا حسن دین، سارے مجاہدوں کی شکلیں حسن دین کی سی تھیں۔

وہ ٹرک کے پیچھے تیز تیز قدم اُٹھانے لگی — "اے بیٹا۔ ماں واری۔ میرا پیار تو لیتا جا — حسن دین۔ تیرا اللہ والی —" وہ ٹرک سے چند قدم پرے تھی کہ ٹرک رک گیا اب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ٹرک کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے نوجوان مجاہد نے مائی نوراں کو ہار اوپر اُٹھاتے دیکھ کر گردن جھکا دی۔

"ایسے نہیں۔ ذرا نیچے آ جا۔ بیٹا — مائی نوراں بولی۔ نوجوان مجاہد نیچے اُتر پڑا۔ اس کے چہرے پر خون کی سرخی دمک رہی تھی — مائی نوراں نے والہانہ اسے سینے سے لگا لیا "میرا لاڈلا — میرا چاند — تیرے ہوتے مجھے دشمن کا کیا خوف! میں یہ جگہ کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟" پھر اس کی پیشانی کو بوسہ دے کر مائی نوراں نے ہار اس کے گلے میں ڈال دیئے۔

ٹرک چل پڑا اور نوجوان مجاہد اُچھل کر اس میں سوار ہو گیا۔ مائی نوراں یوں ہاتھ ہلا رہی تھی جیسے ممتا نے سب سے بڑا اعزاز حاصل کر لیا ہو۔

قیوم راہی

دریچہ

تانگہ اسٹینڈ کے قریب پہنچ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے صرف ایک ہی تانگہ نظر آیا جس کی اگلی سیٹ پر رحمت بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس نے اپنا رُخ دائیں جانب پھیر لیا۔ اس سڑک پر سواری ملنے کا امکان زیادہ تھا۔

تانگہ اسٹینڈ اس کی گلی سے نزدیک ہی تھا۔ تانگہ اسٹینڈ پر ہی کیا منحصر تھا، یہاں تو عام ضروریات کی بیشتر اشیاء قریب ہی سے مہیا ہو جاتی تھیں لیکن اس وقت تو وہ منزل تک پہنچ کر بھی منزل سے دور تھا۔

اس اگلی گلی میں جہاں اس نے ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا، مختلف طبقے کے لوگ آباد تھے۔ ساتھ والے مکان میں چودھری نعمت اللہ رہتے تھے جنھیں دنیا کی بہت سی نعمتیں میسر تھیں۔ آزادی سے قبل وہ ایک معمولی کلرک تھے لیکن اب ترقی کر کے ایک اہم منصب پر فائز ہو گئے تھے۔ یہ اُن کا ذاتی مکان تھا جس کے صدر دروازے پر ان کے نام کی پلیٹ پر جلی حروف میں "سپرنٹنڈنٹ" لکھا ہوا تھا۔ ان کا ڈرائنگ روم قیمتی فرنیچر اور دلآویز ساز و سامان سے مزین تھا۔ گلی میں سے گذرتے ہوئے اکثر اس کا اور چودھری صاحب کا آمنا سامنا ہو جاتا لیکن اب تک سوائے سلام علیک کے تعلقات کا سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ کمرے میں بیٹھا ہوتا، چودھری صاحب گلی میں سے گزرتے اور ایک اچٹتی نظر ڈال کر آگے چلے جاتے۔ گویا اگر انھوں نے ذرا بھی توقف کیا تو اُن کو زبردستی اس کمرے میں جانے کی تکلیف گوارا کرنی پڑ جائے گی —— اس کمرے میں جس کی دیواروں پر مدتوں سے سفیدی نہیں ہوئی تھی جن کا پلاسٹر جگہ جگہ سے اُدھڑا ہوا تھا، جہاں ایک پلنگ پر معمولی بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی میز تھی جس پر اخبار رسالے بکھرے ہوئے تھے۔ پرانی وضع کی ایک اکلوتی کرسی تھی۔ ایک گوشے میں کپڑوں کا صندوق پڑا تھا اور دوسری طرف چند برتن۔ چائے کی پیالیاں۔ پانی کا گھڑا اور کیروسین آئل اسٹوو۔

اس کمرے کے عین سامنے آنے کی ایک جگہ تھی جس سے ملحق ایک چھوٹی سی کوٹھری و صحن والے کوارٹر میں رحمت کوچوان رہتا تھا۔ رات کو وہ اپنا تانگہ گلی میں ہی کھولا کرتا تھا۔ گھوڑا بھی وہیں کھڑا ہوتا تھا اور وہ جگہ اس کمرے سے قریب ہی تھی۔ یوں اس کمرے کی فضا اکثر متعفن رہتی تھی۔ پھر جب رات کو رحمت گھوڑے کی مالش کرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ گھوڑے کی بجائے اس کے جسم کو رگڑ رہا ہو۔ مالش اور تھپکیوں اور خود رحمت کی ہوں ہاں کی ملی آوازیں اس کے ذہن پر مسلسل ضربیں لگاتی رہتی تھیں۔ یہ سلسلہ ختم ہوتا تو اکثر رات گئے تک رحمت زور زور سے کھانستا رہتا۔ رحمت اس گھر کے سکون کا مستقل دشمن تھا۔

"دیکھو رحمت۔ چپ رہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم سر پر ہی چڑھتے چلے جاؤ۔" ایک دن اس سے برداشت نہ ہو سکا۔

"کیا ہوا بابوجی؟" رحمت نے حیرت سے اسے دیکھا

"تو گویا بالکل انجان بنے ہوئے ہو —— جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔"

"ہاں۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا بابو جی ــ جاہل آدمی جو ٹھہرا ــ آپ ہی بتا دیجئے۔"

"اسی لئے تو آج یہاں آیا ہوں۔"

"آپ کی مہربانی ہے بابو جی"

"اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔"

"بہت اچھا بابو جی۔"

ایک ساعت تک خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنے اندر کا زہر اُگل ہی دیا۔ "یہ گھوڑا جو جناب یہاں میرے کمرے کے پاس کھڑا کرتے ہیں، یہ لید بھی کرتا ہے اور پیشاب بھی ــ اور ان دونوں چیزوں میں بدبو بھی ہوتی ہے۔ سمجھے جناب؟"

"جی گ" رحمت کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی "بس اتنی سی بات تھی بابو جی؟ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

اس کا جی جل گیا۔ اس جاہل کی دانست میں یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی ــ اتنی سی بات ــ اتنی سی بات ــ یہ الفاظ اس کے دماغ پر ہتھوڑوں کی مانند ضربیں لگانے لگے۔

"دیکھو رحمت، تم نے ضد کی تو میں دوسرا طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہوں ــ سمجھے؟" اس کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

"بابو جی کل سے گھوڑا یہاں سے دور کھڑا کر دیا کروں گا اور صفائی ستھرائی کا بھی خیال رکھوں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

اس وقت رحمت کے بے ڈھنگے گندے جوتوں پر گھوڑے کی لید سنی ہوئی تھی شلوار قمیص اس قدر میلی تھی جیسے اس نے کئی ماہ سے یہی لباس پہن رکھا ہو قمیص کا گریبان کھلا ہوا تھا جس میں سے بڑے بڑے بال باہر نکلے ہوئے تھے۔ بے ڈول ہاتھوں پر میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اور ناخن بھی بڑھے ہوئے تھے جن میں آگے کی طرف موٹی موٹی سیاہ دھاریاں بن گئیں تھیں اور سر پر مٹی کے رنگ کی پگڑی تھی۔

سامنے سڑک پر چودھری نعمت اللہ ٹیکسی میں سے باہر نکلے تو وہ یک لخت بڑی پھرتی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اگر چودھری صاحب نے اس کو ایسی حالت میں دیکھ لیا تو کیا سوچیں گے اس کے بارے میں یہی نا کہ اتنا پست ذوق، اس قدر گھٹیا آدمی ہے کہ رحمت کوچوان سے گپ لڑاتا ہے۔

چودھری صاحب خلاف معمول بڑی سرعت سے گذر گئے۔ انھوں نے اپنی گردن کو جنبش دینے کی بھی زحمت نہیں اُٹھائی ــ شاید انھوں نے دیکھ لیا ہے ــ اسے افسوس سا ہونے لگا ــ رہی سہی عزت بھی خاک میں مل گئی۔

رحمت نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا بھی کر دکھایا۔ لیکن کبھی کبھار کی صفائی اور گھوڑے کو ایک دو گز پرے کھڑا کرنے سے اس کے لئے کوئی فرق نہ پڑ سکا۔ وہ اکثر رات کو کروٹیں بدلنے پر مجبور ہو جاتا۔ ساکت پانیوں میں بلبلے اُٹھنے لگتے ــ سوچوں کا شیرازہ بکھر جاتا ــ ضبط کی ڈور ٹوٹ جاتی اور اس کے دماغ میں رحمت کے خلاف ملامت بھرے تلخ الفاظ بگولے بن کر چکر لگانے لگتے۔ رحمت اسے اور زیادہ کھلنے لگتا۔

وہ تو کبھی کا اس جگہ کو چھوڑ چکا ہوتا، پر کوئی معقول رہائش گاہ ملے بھی تو۔ پھر اس کی مالی حالت بھی زیادہ خرچ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

اس نے گھڑی دیکھی، اب وہ بمشکل پانچ منٹ اور انتظار کر سکتا تھا۔ اس کو ریلوے اسٹیشن پر اپنے چچا سے ملاقات کرنی تھی جو کراچی

سے راولپنڈی جا رہے تھے۔ بجلی کے کھمبے کے ساتھ کھڑے ہو کر وہ وہ کسی ٹیکسی یا موٹر رکشا کا انتظار کرنے لگا۔

رحمت اونگھتے اونگھتے جاگ گیا تھا اس نے اپنی مٹیالی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا ٹین کی ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک بیڑی نکال کر سلگا لی۔ پھر وہ ٹانگیں پھیلا کر گاڑھا گاڑھا دھواں تانگے کی چھت کی طرف چھوڑنے لگا۔ یکایک کھانسی نے اسے بے حال کر دیا۔ وہ مسلسل کھانستا رہا اور بلغم تھوکتا رہا جب یہ دورہ ختم ہوا تو نیم دراز ہو کر پھر بیڑی کے کش لینے لگا۔

پانچ منٹ بھی گذر گئے۔ کوئی ٹیکسی کوئی رکشا نمودار نہیں ہوئی۔ رحمت کا تانگہ اب بھی موجود تھا۔ وہ تانگے کی طرف اس بچے کی طرح چلا جو دال کھانے سے انکار کر چکا ہو مگر اب بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر ماں باپ کی نظر بچا کر دال کھانے چلا ہو۔

"اسٹیشن چلو گے؟"

"کیوں نہیں،" رحمت سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "بیٹھو بابو جی۔"

"کیا لو گے؟"

"جو مرضی آئے دے دینا بابو جی ——— آپ سے کوئی زیادہ پیسے تو نہیں لے لوں گا۔"

"وہ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ایم۔ اے۔ او کالج کے سامنے سڑک پر ایک لڑکی ہاتھ میں کتابیں لئے مٹکتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کی چال اور انداز میں بڑا بانکپن تھا۔ لباس اس قدر چست تھا کہ چلنے میں اس کے پٹھوں کی ایک ایک جنبش نمایاں ہو رہی تھی۔ کالج کا وقت بھی نہیں تھا پتہ نہیں یہ لڑکی اس وقت کہاں جا رہی تھی۔

رحمت نے بیڑی کا ایک طویل کش لیا۔ ایک غلیظ سی گالی دے کر گھوڑے کی پشت پر چابک مارا اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا "بہت بُرا زمانہ آگیا ہے ——— بہت بُرا زمانہ۔"

اس نے رحمت کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

رحمت اس کے باوجود بولتا رہا۔ "بابو جی!"

"ہوں۔"

"پڑھائی کا تو صرف بہانہ ہے ——— باہر نکلنے کا بہانہ ——— یاروں سے ملنے کا۔"

"ہوں۔" وہ رحمت سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"بابو جی، اب میں آپ کو کیا بتاؤں ——— حد ہو گئی ہے آوارگی کی ——— آپ کو تو شاید معلوم ہی ہو گا۔ . . . ."

اس کے ذہن پر ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یاد آیا، ابھی چند ہی دنوں کی تو بات تھی وہ جیل روڈ پر ایک تانگے میں جا رہا تھا۔ تانگے والے نے کچھ اسی قسم کا موضوع چھیڑ دیا تھا۔ پہلے تو یہ لوگ ایسی ویسی باتیں کر کے، آدمی کے مزاج کے بارے میں تصدیق کرتے ہیں۔ پھر اسی کے مطابق گفتگو کا رنگ بدل دیتے ہیں۔ اس دن بھی چند لڑکیاں ٹیڈی لباس زیب تن کئے فٹ پاتھ پر جا رہی تھیں۔ وہ تانگے میں اکیلا تھا۔ پہلے تو کوچوان نے زمانے کی خرابی اور آوارگیوں کا رونا رویا۔ پھر جب اس نے بھی قدرے دلچسپی سے جواب دئے تو کوچوان سمجھا ٹھکانے پھنس گیا۔ کہنے لگا "بابو صاحب! آپ بڑے سیدھے سادے اور اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک لڑکی باغبانپورہ میں پڑھتی ہے۔ آپ ہی کی طرح دبلی پتلی ہے۔ میرا مطلب ہے

بالکل آپ کے جوڑ کی ہے۔ آپ کی ملاقات کرادوں گا۔ شام کو پانچ بجے جیل روڈ کے اڈے پر آجانا۔"

وہ مسکرایا تو کوچوان نے مزید وضاحت کی "میں آپ سے کچھ بھی نہیں لوں گا بابو صاحب ——— آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں اور دوسروں سے تو بیس بیس روپے لے لیتا ہوں اس کام کے۔"

"اچھا"

"ہاں بابو صاحب ——— آپ ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گا ٹھیک پانچ بجے، پھر چاہے آپ اس کو سینما لے جائیے یا جہاں آپ کا جی چاہے۔"

جیل روڈ سے وہ پھر ایم، اے، کالج والی سڑک پر پہنچ گیا اور اس کے کانوں میں رحمت کے الفاظ کی چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اسے رحمت کا یہ انداز کھلنے لگا، جیسے جیل روڈ والے کوچوان نے رحمت کا روپ دھار لیا ہو۔ اس نے رحمت کو نفرت سے گھورا، ذلیل ——— بے شرم کمین کا ——— ایک ہملے سے ایسی بات کرتے لحاظ نہیں آیا کمینے کو۔

رحمت نے کچھ دیر جواب کا انتظار کر کے اپنا لیکچر پھر شروع کر دیا "مولا کا بڑا کرم ہے بابو جی جو یہ لاہور ابھی تک بچا ہوا ہے ——— دیکھا نہیں تھا آپ نے، پچھلے دنوں کیسا زبردست بھونچال آیا تھا ——— یہ شہر بس بال بال ہی بچ گیا۔

اتنے میں ایک خوش پوش نوجوان تانگے کی طرف لپکا، "اسٹیشن چلوگے بابا؟"

رحمت نے تانگے کی رفتار سست کر دی اور پچھلی سیٹ کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا گویا دریافت کر رہا ہو "بٹھا لوں بابو جی؟"

لیکن وہ تو کہیں اور ہی گم تھا۔ اس کی خاموشی کو رحمت نے اپنے حق میں فیصلہ سمجھ کر "بیٹھ جاؤ بابو جی ——— اسی طرف تو جا رہا ہوں۔ نوجوان اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو تانگے کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔

چلو اچھا ہوا ——— اس نے سوچا۔ اب گفتگو کی اس مسلسل بوچھار سے تو نجات مل جائے گی۔ وہ ایک بار پھر اس مسئلے کے بارے میں غور کرنا چاہتا تھا۔ جس پر اسے اپنے چچا سے ریلوے اسٹیشن پر بات کرنی تھی۔ یہ مسئلہ تھا بھی تو انتہائی اہم اور نازک، یہ اس کی چھوٹی بہن کے رشتے کا فیصلہ تھا جو گجرات میں اپنی خالہ کے پاس رہتی تھی۔

اجنبی نوجوان کی آمد اس کے لئے ایک نیک شگون ثابت ہوئی۔ رحمت نے اپنی تقریر ادھوری چھوڑ دی تھی اور وہ اپنے دل کی بھڑاس گالیاں بک کر اور گھوڑے پر چابک رسید کر کے نکال رہا تھا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

نوجوان ریلوے اسٹیشن سے تھوڑی دور پھلوں کی ایک دوکان کے پاس اتر گیا۔ رحمت نوجوان سے کرایہ کے پیسے لے کر اس سے مخاطب ہوا "ڈیوڑھے پر اترو گے بابو جی یا تیرڈ پر؟"

"انٹر پر"

"رحمت نے تانگہ انٹر کلاس کی طرف دوڑا دیا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ گاڑی پہنچنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ اس طرح وہ تھوڑی دیر پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر کے گذشتہ چند منٹوں کی بدمزگی بھی دور کر سکے گا۔

تانگہ رکا تو وہ فوراً نیچے اتر گیا۔ اس نے جیب سے بٹوا نکالا اور رحمت سے پوچھنے لگا "کتنے پیسے دوں؟"

رحمت مسکرایا۔ "رہنے دو بابو جی ——— کوئی بات نہیں۔"

"جلدی بتاؤ — گاڑی کا وقت ہو رہا ہے۔" اس نے اپنی ہتک محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"بابو جی آپ پہلی دفعہ میرے تانگے میں بیٹھے ہیں، پیسے لینے کو جی نہیں چاہتا — پھر دیکھا جائے گا۔ اس وقت رہنے دو بابو جی!"

اس نے رحمت کی گود میں ایک روپے کا نوٹ پھینک دیا اور سٹیشن کی عمارت میں داخل ہو گیا۔

بچا سے ملاقات ہوئی تو جیسے ہر سمت کرنیں ہی کرنیں بکھر گئی ہوں — مسرتوں کی پھوار پڑنے لگی ہو — انھوں نے نہ صرف اس کی رائے سے اتفاق کیا تھا بلکہ مالی امداد کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ تھوڑی دیر پہلے رحمت کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کی دھندلاہٹ تحلیل ہو گئی تھی۔

— — — —

ذمہ داری کا بارِ گراں جو ہر لحظہ اس پر سوار رہتا تھا اور اسے مضطرب کئے رکھتا تھا، اب ہٹ چکا تھا۔ وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ دن رات بڑی لگن، وارفتگی کے ساتھ اپنے پروگراموں کو آخری شکل دینے میں مصروف تھا۔ گاڑی فراٹے بھر رہی تھی۔ فاصلے گھٹتے جا رہے تھے۔ روشنیوں کا جگ مگ کرتا ہوا شہر بس آنے ہی والا تھا — اچانک بریک لگ گیا۔ گاڑی کو کئی جھٹکے لگے اور وہ رک گئی — بخار نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے ایسی حالت میں بھی آرام نہیں کیا۔ لیکن جب بخار کی گرفت مضبوط ہو گئی تو اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ اب وہ محض چائے پینے اور ڈاکٹر سے دوا لانے کے لئے ہی دو کانوں تک جاتا اور وہ بھی چند منٹوں کے لئے۔ اس کے بعد وہ ہوتا اور اس کا بستر — اور نیم کشادہ اجاڑ اجاڑ سا کمرہ۔

اس دن تڑکے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کی نگاہیں سامنے کھڑکی کے جنگلے پر جمی ہوئی تھیں۔ دور اُفق پر اندھیرے چھٹ رہے تھے اور اُجالوں کا نور آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا — آدھی رات تک کیسے کیسے بے ہنگم اور وحشیانہ خیالوں نے اس کی نیند اُچاٹ کر دی تھی اور پھر سوتے میں بھی اس نے کیسا بھیانک خواب دیکھا تھا۔

وہ اُٹھا تو اسے متلی ہونے لگی۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ بخار کی آگ تو خیر ٹھنڈی پڑ چکی تھی مگر نقاہت بے انتہا تھی۔ اس نے چھت کو دیکھا۔ وہاں کئی جگہ مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔ کڑیاں سیاہی مائل تھیں۔ دیواروں پر اُدھڑے ہوئے پلاسٹر کے نشانات عجیب و غریب ہیولوں کی شکلیں اختیار کر گئے تھے جن میں سے بعض کی مسخ شدہ صورتیں اس کو بڑی مکروہ معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر کچھ دیر بعد پھر کھول لیں۔ اب اس کی نگاہیں کمرے کے سامان پر گردش کرنے لگیں۔ میلے کپڑے، پرانے جوتے، اخبار، رسالے وغیرہ بڑی بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ چائے کے برتن اسی طرح پڑے تھے جیسے چند دن قبل رکھے گئے تھے۔

اس کے اندر یکایک چائے پینے کی خواہش جاگی۔ وہ اس وقت کچھ کھانا بھی چاہتا تھا۔ آخر کمزوری کا کچھ تو ازالہ ہو جیسے ہی اس نے اُٹھنے کی کوشش کی، اسے چکر آ گیا اور وہ لیٹ گیا۔

گلی میں کوئی موٹر رکشا آ کر رکا تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی کے ساتھ چاکلیٹ رنگ برقع والی عورت رکشا سے اُتری۔ دونوں چودھری نعمت اللہ کے مکان کی طرف چلے گئے۔

وہ پھر اپنے مرکز پر لوٹ آیا۔ چائے کی پیالی اور کیروسین آئل اسٹوو نے پھر اس کو بلایا لیکن وہ ان کے پاس نہیں جا سکا۔ یہ تھوڑا سا فاصلہ جیسے میلوں لمبا ہو گیا تھا۔

اور پھر آنِ واحد میں سارا منظر ہی بدل گیا۔ وہ ایک ایسے مہیب اور سنسان جنگل میں پہنچ گیا۔ جہاں دور دور آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ جہاں کی سائیں سائیں کرتی ہواؤں سے اس کا دل لرز رہا تھا ــــ جانے کتنی دیر وہ اس جنگل میں بھٹکتا رہا اور اس کے اندر گرد مایوسی کی دھول اڑتی رہی ــــ دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔

اس نے دیکھا سامنے رحمت کھڑا تھا۔ ٹھٹکا ہوا ــــ رکا رکا سا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

پھر ایک دم رحمت کمرے میں داخل ہو گیا اس کے قدم پلنگ تک پہنچ کر تھم گئے۔ رحمت کا یوں بے دھڑک چلا آنا اسے بڑا ناگوار معلوم ہوا۔ کمبخت نے اجازت لینی بھی ضروری نہیں سمجھی ــــ کمینہ مجھے پھانسنے کے لیے کیا کیا جتن کر رہا ہے۔ اس دن اسٹیشن پر کرایہ کے پیسے بھی نہیں لے رہا تھا۔

اور اب.....

وہ چپ چاپ پڑا رہا جیسے اسے رحمت کی آمد کا علم ہی نہ ہو۔

"بابو جی"

"کیا ہے؟" اس نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہے"

"بخار اتر گیا؟"

"ہاں"

"بڑے کمزور ہو گئے ہو بابو جی"

"اور کیا موٹا ہو جاتا؟" اس نے بیزار ہو کر کہا۔

"آپ کو تو غصہ آگیا بابو جی"

"سیدھی بات ہے۔ بیماری سے آدمی کمزور ہی ہو گا ــــ موٹا ہونے سے تو رہا"

"رحمت کچھ سوچ کر بولا "آپ ناراض معلوم ہوتے ہیں بابو جی! اس روز اسٹیشن پر بھی آپ کو غصہ آگیا تھا غریب کی تو ہر بات میں عیب نکلتا ہے بابو جی"

دو تین چڑیاں اڑ کر برتنوں کے پاس پھدکنے لگیں۔ وہ اپنے لئے دانا دنکا ڈھونڈ رہی تھیں۔ چائے کی ایک پلیٹ پر بسکٹوں کے چھوٹے چھوٹے ریزے دیکھے تو تینوں چڑیوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ ان کی چونچوں کی کھٹ کھٹ سے اس کا دھیان برتنوں کی جانب مبذول ہو گیا اور چائے کی طلب پھر اس کو تنگ کرنے لگی۔

رحمت کچھ دیر سر جھکائے کھڑا رہا پھر اس نے ایک لمبا سانس لے کر کہا "میں تو اپنے دل سے مجبور ہو کر چلا آیا تھا بابو جی۔ آخر پڑوسی کا بھی تو کوئی فرض ہوتا ہے بابو جی ــ انسان انسان کے کام نہ آئے گا تو کیا جانور کام آئیں گے؟"

اسی وقت گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے دیکھا چودھری نعمت اللہ حسب عادت سرسری نظروں سے ادھر دیکھ کر آگے چلے گئے۔

رحمت شاید اس کی طویل خاموشی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس لئے دکھ سے بولا "اچھا بابو جی ــــ خوش رہو"

رحمت کمرے سے باہر جانے کے لئے مڑا ـــــ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

"رحمت" اچانک اس نے پکارا۔

رحمت نے دروازے کی چوکھٹ پکڑ لی اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا "جی بابو جی!"

"ایک کام کرو گے میرا؟"

کیوں نہیں۔" رحمت کے چہرے پر اس دوران میں پہلی بار مسکراہٹ آئی اور یہ مسکراہٹ نہایت معصومانہ تھی" بابو جی، میں تو آیا ہی اس لئے تھا۔ آپ پتہ نہیں کیوں خفا ہو گئے تھے۔ پر اس میں آپ کا بھی کیا قصور ہے۔ بیماری سے طبیعت بھی تو چڑچڑی ہو جاتی ہے ـــــ بتاؤ کیا کام ہے؟"

تکیے کے نیچے سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس نے رحمت کو دیا "یہ لو ـــ پان والے کی دوکان کے برابر جو چائے کی دوکان ہے وہاں سے ہاف سیٹ چائے کا اور ایک ڈبہ نمکین بسکٹوں کا لے آؤ ـــ اور ـــ اور ایک ڈبہ میٹھے بسکٹوں کا بھی۔"

"بہت اچھا بابو جی" رحمت کے جسم میں ایک دم پھرتی آ گئی۔

رحمت جلد ہی واپس آ گیا۔ آتے ہی اس نے بقایا پیسے لوٹا دیئے "بابو جی چائے میں ذرا دیر تھی، دوکاندار نے کہا تم جاؤ، میں لڑکے کے ہاتھ بھیجتا ہوں۔"

اچھا کیا تم نے۔"

رحمت کو کمی نسی کا ایک دھکا آیا تو بلغم تھوکنے دروازے تک چلا گیا۔ واپس آ کر کہنے لگا "اچھا تو بابو جی کوئی اور کام تو نہیں ہے؟ ـــــ میں جاؤں؟"

"نہیں رحمت بیٹھ جاؤ ـــ چائے پی کر جانا"

"میں بابو جی ـــ؟"

"ہاں ہاں تم ـــ کھڑے کیوں ہو ـــ بیٹھ جاؤ"

"میں تو چائے پی کر آیا تھا بابو جی"

"ایک پیالی میرے ساتھ بھی پی لینا"

"بہت اچھا بابو جی ـــ آپ کہتے ہیں تو ٹھہر جاتا ہوں۔"

"رحمت پلنگ کی پائینتی پر بیٹھنے لگا تو وہ بولا "یہاں نہیں ـــ وہاں کرسی پر بیٹھو۔"

رحمت بڑی احتیاط سے کرسی پر بیٹھ گیا ـــ چند لمحوں تک وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا، پھر کرسی آگے کو سرکا کر بولا "لاؤ بابو جی میں آپ کا بدن دبا دوں ـــ یہ بخار بڑا ظالم ہوتا ہے۔ بڑی ہڈی دکھا دیتا ہے۔"

"نہیں رحمت" اس نے کہا۔ ذرا سے وقفے کے بعد بولا "بس ذرا سا سر دبا دو۔"

پھر جب رحمت اس کا سر دبا رہا تھا تو اس نے کہا "رحمت مجھے تم سے شکایت ہے۔ میں اتنے دنوں سے بیمار ہوں اور تمہیں آج میرا خیال آیا ہے۔"

پروین بشیر

اندھی

شبنم اور فیاض کیا آتے کہ ہنو کے گھر میں عید آجاتی۔ دن بھر بے فکری سے قہقہے اُبلتے، در کئی دنوں کے بعد اچھے اچھے کھانے پکتے۔۔۔ معمولی چیز تو فیاض کو پسند ہی نہیں تھی۔ اچھا کھاتا اور پانی کی طرح خرچ کرتا ــــ بازار کے چکر لگنے لگتے ہنو کی ٹانگوں میں درد ہونے لگتا۔ لیکن یہ سودا کچھ مہنگا بھی نہیں تھا۔ ہر چکر کے ساتھ اکنی یا دونی کی ٹافیاں یا کھٹ مٹھی گولیوں کا تصور اس کی چھوٹی سی زندگی کے لئے سب سے بڑا انعام تھا۔

سارا دن اور ساری رات چلنے والی بہو کی مشین بند ہو جاتی۔ بہت دنوں کے بعد نانی اماں کا پاندان کھل جاتا اور سروتے سے چھالیاں کترتے کترتے اُن کی آنکھوں میں سرخ سرخ بے جان بوٹیاں تیزی سے گھومنے لگتیں۔

"بڑے نصیبے ہیں ری تیرے شبنم ــ کیا شاہ دل میاں ہے تیرا۔"

اُپلوں کے دھوئیں سے افسر کی آنکھوں میں پانی آجاتا۔ اور برتن مانجھتے مانجھتے اُس کے ہاتھ چھل جاتے ــ لیکن ــ دم دیئے ہوئے پلاؤ سے اٹھتی ہوئی گرم مسالے کی بھینی بھینی خوشبو ــــ وہ تو ہر وقت دعا مانگتی کہ کاش دولہا بھائی ہمیشہ انھیں کے پاس آ رہیں صحن میں جنگلی بنا کر اکھاڑ کر دانھیں بید یں تو کیا اچھا ہو ــــ لیکن وہ مانتے تب نا ــ اور یہ دولہا بھائی ــ جانے کیا تھا اُن کی نظروں میں! جب بھی وہ انھیں چائے دینے جاتی تو جیسے بے ساختہ مسکراہٹوں کے درمیان اُن کے سانولے سانولے گالوں کی ساری تمتماہٹ چائے کے پیالے میں سمٹ آتی ــ جانے اُس کے ہاتھ کیوں کانپنے لگتے۔ دل زور زور سے دھڑکتا ہوگا ــــ جلدی سے دوپٹہ کو سینے پہ لپیٹتی ہوئی وہ باورچی خانے میں چلی آتی اور دولہا بھائی مسکرا کر شبنم کو دیکھنے لگتے ــــ

"اُف کاجل کس غضب سے ڈالتی تھی یہ شبنم!"

لیکن سرِ شام ہی ساری رونقیں اپنے ساتھ سمیٹ کر وہ چلے جاتے اور وہی پراسرار اداسی سارے گھر پر پھر سے چھا جاتی۔ بہو کی مشین رات گئے تک اندھیروں میں نوحے اُگلتی اور دیئے کی لو مسلسل کانپے جاتی۔ اُس سے اُٹھنے والی دھوئیں کی باریک سیاہ لکیر چھت پر مختلف زاویے بنائے جاتی ــ ٹیڑھے ــ ترچھے ــ آڑے اور جانے کیسے کیسے ــ بالکل اُس کے ہاتھ کی لکیروں کی طرح ــ! اور اُس کا دل بھی مسلسل کانپے جاتا ــ رات کو دیے کی لو کے ساتھ اور دن کو دھوپ چھاؤں کے ساتھ ــــ افسر جوان ہو رہی ہے ــــ ہواہیں سرسرائیں اور مشینیں پر اُس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگتے ــ کبھی کبھار کسی شلوار کا ایک حصہ دوسرے کے نیچے آکر سل جاتا ــ مشین رک جاتی اور سوئی پکڑ کر وہ شلوار کے بخیے پھر سے ادھیڑنے لگتی۔ اور جب بھی ایسا ہوتا اماں ضرور بول پڑتیں "بہو سو جا اب گھڑیال نے دو بجا دیئے"

اور وہ دیوار سے ٹیک لگا کر انگڑائی لیتی "صبح کپڑے دینے ہیں۔ ذرا یک تو سل گئے بس شلوار کا کام باقی رہ گیا ہے"

"اے بیٹی ایک بات کہوں" ... اماں بہت آہستہ سے کہتیں اور بہو بھی سمجھ جاتی کہ وہ کیا کہنے لگی ہیں ــ پھر بھی سادتاً بول پڑتی ــــ

"کہو" اور ہمیشہ کی طرح اماں اُٹھ کر بیٹھ جاتیں ——"یہ شبنم اور فیاض کا چکر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" ——وہ بڑے رازدارانہ انداز سے کہتیں۔ ان کے چہرے کی جھریوں کی گہرائیاں اور بھی سیاہ ہو جاتیں اور بڑی بے چینی سے اُن کے پاس ہی بڑی افسر کروٹیں بدلنے لگتی۔

"کوئی چکر بھی تو ہو——؟" وہ لاپروائی سے جواب دیتی

"اندھی ہو کیا——؟" ان کی آنکھوں کی سُرخ سرخ بے جان بوٹیاں اُس کے چہرے پر جم جاتیں ——"کبھی کسی میاں بیوی کو دوسروں کے گھر جا کر یوں چونچلے بکھیرتے بھی دیکھا ہے تو نے؟——پھر کون سے کوئی نزدیکی رشتہ دار ہیں۔ مجھے تو یاد بھی نہیں شبنم کی ماں سے میرا کیا رشتہ ہے۔ ہاں برادری سے ہے۔"

"تمہیں کیا پتہ اماں لوگ آزاد ہوتے جا رہے ہیں۔" بڑے اطمینان سے کہتی۔

"نہ بھئی ہم تو باز آئے اِس آزادی سے۔ غلام خدا کا سارا دن جورو کو چمٹائے پڑے رہو۔ سب کے سامنے۔ نہ شرم نہ حیا۔ مجھے تو اِس لڑکی اور اس کی ماں کے لچھن اچھے نہیں لگتے۔"

"نہیں اماں ایسا نہ کہو——تمہاری بھی نواسی جوان ہو رہی ہے۔"

"میں تو خدا لگتی کہوں گی——بھلا ایسا بھی ہوا ہے کبھی——اور پھر سال کی تو بات ہے——اپنے پہلے میاں سے طلاق لینے کو پھر رہی تھی یہ شبنم اور پھر تین ہی مہینے بعد اس فیاض کو لے کر آ گئی کہ میرا میاں ہے——واہ بھئی یہ اچھی رہی۔ پہلے میاں سے طلاق لئے تین ماہ بھی نہ ہوئے کہ دوسرا میاں تیار۔ میری مان۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے——"

"ہوا کرے، ہمیں کسی سے کیا لینا ہے——" وہ بے دلی سے جواب دیتی۔

"ہائے ایک بات ہے——لونڈا ہے بڑا شاہ دل۔" اماں کے ہاتھ ناگہانی طور پر پاس ہی لیٹی افسر کو ٹٹولنے لگتے——"شبنم بیٹی ورد پڑھ دے۔"

اور پھر جب وہ کام ختم کر کے سونے لگتی تو اُس کا انگ انگ بُری طرح درد کر رہا ہوتا۔ اُس کی کمر میں ٹیسیں اُٹھتیں اور بجھاتے ہوئے دیئے کے دھوئیں کی کثافت سے دیر تک دم کی فضا بوجھل رہتی——"لونڈا ہے بڑا شاہ دل——" بند کے کان اماں کے ان الفاظ سے بجنے لگتے "شاہ دل——"

وہ جھرجھری لیتی اور اسے افسر کے مرحوم ابا یاد آ جاتے۔ "کوئی تاجو سے بھی شاہ دل ہو گا بھلا۔" دو روپے کی تو روزانہ بس بی پی جاتا تھا——غرور سے اُس کا سینہ تن جاتا——"سردار تھا تاجو۔ سردار اڈے میں جب گرجتا تو بڑے بڑے جواریوں کے ہاتھوں سے پتے پھسل جاتے اور بڑے بڑے دل گردے والے شرابیوں کی تلیں لڑھک جاتیں۔ مجال تھی کسی کی جو چوں بھی کرتا——آدھی رات کے بعد بھی گھر لوٹتا تو یہ ڈھیر سا بھنا گوشت بغل میں دبائے لاتا——"اری سُنا تو نے گلاس لا——بھٹی دیکھ، رہی سہے سینے میں بھٹی——" کارک کھلتا اور بس۔ بوتل خالی ہو جاتی۔ گوشت صاف ہو جاتا تو وہ اسے گھورتا——آہ——اس کی سُرخ سرخ خون جیسی آنکھیں——!

وہ روئی کی طرح دھنی جاتی——اُس کا سارا گوشت قیمہ بن جاتا——کڑکڑ کرتی ہڈیاں جیسے گوشت سے الگ——بالکل الگ ہو جاتیں——وہ نڈھال ہو جاتی——اور جب صبح اسے ہوش آتا تو وہ اوندھے منہ پڑا ہوتا——بے خبر——شراب کی خالی بوتل کی طرح——!

کتنے ہی سال بیت گئے تھے۔ کتنے ہی بھٹے فضاؤں میں مرتعش رہ گئے تھے۔ ادھورے، مکمل سپنے . . . اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے . . . سپنے ہی سپنے . . . وہ تو گھر کی ہی رہ گئی تھی ان سپنوں کے درمیان . . . ایک ایک بات یاد تھی اُسے . . . تاجو کی گرم گرم اُکھڑی اُکھڑی سانسیں۔ اب بھی وہ اپنے رخساروں کے قریب محسوس کرتی تھی۔ اُس کی سرخ سرخ انگارہ آنکھوں کے نشتر اب بھی اُس کے دل میں آگ سی لگا دیتے تھے۔

اب بھی اُس کی ہڈیاں کڑکڑا پڑتیں ۔ اب بھی اُس کے گوشت کا قیمہ بن جاتا۔ اب بھی وہ نڈھال ہو کر سو جاتی — لیکن صبح جب اُس کی آنکھ کھلتی تو شراب کی خالی بوتل کی طرح اوندھے منہ پڑا تاجو نہ ہوتا — وہ سسک پڑتی "تاجو — تاجو — کہاں چلے گئے ظالم —" اور پپو کو لپٹا کر وہ بُری طرح چومنے لگتی — "تاجو —" اُس کے سانس کی ہر اکھڑن کہتی "تاجو" اُس کے دل سے ہوکیں اُٹھتیں "تاجو —!"

کتنے ہی سال بیت گئے — وہ سوچنے لگتی — افسر پانچ سال کی تھی — اور یہ پپو تو پیٹ ہی میں تھا — اسے اچھی طرح یاد تھا — ایک ایک بات اسے یاد تھی۔ وہ ہسپتال میں پڑا دم توڑ رہا تھا — اُس کی کمر پر چاقو کے تین گہرے گہرے گھاؤ تھے — "مت رو ری بتو — لابو تو پورا بھڑوا نکلا —" تاجو نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا — "بے خبری میں پیچھے سے وار کرنا مردوں کا شیوہ تو نہیں —" اُس کے ہاتھ کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی تھی — "پر تو فکر نہ کر... میں اچھا ہو جاؤں، بھڑوے کو مزا چکھا دوں گا" پھر اُس کی آنکھوں کے زاویے بدلنے لگے — اور بدلتے بدلتے اُس کے چہرے پر جم گئے — "پر لونڈیا کی عزت تو بچ گئی —" اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے — "بھڑوا تھا نا... کمینہ... کہے تھا گل خاں کی لونڈیا کو بھگانا ہے — بڑی خوبصورت ہے — خون پی جاؤں گا کمینے کا... ذلیل کہیں کا — ہڈیاں چباؤں گا۔ اُس کی ماں —" اُس نے محسوس کیا جیسے اُس کی فولادی انگلیاں اُس کی کلائی میں گڑ جائیں گی۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگی تھیں — اور جیسے بڑی دور سے اُس کی اکھڑی اکھڑی آواز اُس کے کانوں میں پڑ رہی تھی — "سنتی ہے ری بتو — یاد رکھنا تو... تاجو کی بیوی ہے... تاجو کی نہیں... تیـ —" اور ایک دم جیسے کارک اچھل پڑا تھا اور ساری شراب اُبل کر باہر آ پڑی تھی اور بوتل لڑھک کر ایک چھناکے کے ساتھ چکنا چور ہو گئی تھی۔

کتنے دن ہو گئے — شبنم اور فیاض نہیں آئے تھے — اماں نہ چاہتے ہوئے بھی چاہ رہی تھیں کہ وہ آئیں — مہینے کے آخری دن تھے اور ساری سلائی اُدھار میں چلی گئی تھی۔ آٹا ختم ہو گیا تھا اور دوکاندار نے مزید ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ قمیص پر استری کرتے ہوئے بتو نے افسر کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کرتے پر ترپائی کر رہی تھی "میں سوچتی ہوں" اُس نے سر اُٹھا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا "جانے کیسے ہیں لوگ۔ صبح کو کپڑا دے کر شام کو تیار چاہتے ہیں اور پیسے دینے کی باری جان نکل جاتی ہے"

"درزی کے پاس جائیں تو پتہ چلے —" نانی اماں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں — "افسر ذرا لوٹے میں پانی بھر دے، وضو کر لوں"

"ہفتے سے پہلے کون درزی لوٹاتا ہے کپڑے" بتو نے قمیص تہہ کر کے ایک طرف رکھ دی اور کرتے کو سنبھال لیا — "پیسے بھی تو دُگنے تگنے وصول کرتے ہیں" نانی اماں نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا "اور وہ بھی نقد"

دوپہر کا سویا پپو اُٹھ گیا تھا اور جاگنے کے ساتھ ہی بڑے اونچے سروں میں اپنا مخصوص راگ الاپنے لگا تھا — "میرا ابا... میرا ابا جے —" کرتہ افسر کے سپرد کر کے بتو نے اسے سنبھال لیا — "ماں —" وہ اُس کی گود میں پڑا پڑا مچلا — "دولہا بھائی کیوں نہیں آتے —؟"

"کوئی روز روز تھوڑی آتے ہیں لوگ —"

"کیوں روز روز کیوں نہیں آتے لوگ؟ تم بلا لو نا دولہا بھائی کو —"

"اچھا کل بلوا لوں گی —"

"اچھا —" وہ مطمئن سا ہو گیا — "ضرور بلوانا اور کہنا گولیاں بھی لے آئیں — اور چاکلیٹ بھی —"

"ہاں کہہ دوں گی — اچھا میری پٹاری میں ایک اکنی پڑی ہے۔ گڑ لے آ جا کہ تجھے میٹھے ٹکڑے بنا دوں — کھائے گا نا؟"

واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔ بھلا میٹھے ٹکڑوں سے کون انکار کرتا اور وہ بھی بجو۔ جب پڑوس میں رشید بھائی کی شادی ہوئی تھی تو اُسے یہ ڈھیر سا زردہ کھانے کو ملا تھا اور وہ کئی دن تک تصوّر ہی تصوّر میں اُس کے ذائقے کو یاد کر کے چٹخارے لیتا رہا تھا — اور پھر جب کئی دنوں تک وہ اپنی ماں کو زردے کے لئے تنگ کرتا رہا تو اس نے یہ اُسے یہ میٹھے ٹکڑے بنا دیئے تھے — "ابلی کا مربّہ ذرا کھٹ میٹھا ہوتا ہے" اُس نے سوچا تھا "ورنہ یہ ٹکڑے بھی کچھ کم مزیدار نہیں۔"

"جا اُٹھا لا رے — بھاگ کر لے آ گڑ —"

"رات جو ہو رہی ہے —" اُس نے پھیلتے ہوئے اندھیرے کی طرف اشارہ کیا۔ افسر نے کمرے میں دیا جلا دیا تھا۔ نانی اماں نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگ رہی تھیں۔

"نانی کو ساتھ بھیج دو —"

"واہ رے چھ سال کا ہو گیا ابھی تک ڈرتا ہے — اور مجھ اندھی کو جو کتے نے کاٹ لیا" نانی اماں نے چٹائی لپیٹتے ہوئے کہا۔

"مجال ہے جو کوئی تمہیں کچھ کہے — سالے کی ٹانگیں چیر دوں گا —" وہ بھاگ کر نانی سے لپٹ گیا۔

"تُو تو میری آنکھوں کی روشنی ہے رے بجو —" نانی اماں نے ٹٹول کر اُس کے گال چوم لئے۔

"چھی چھی —" وہ جھٹک کر ایک طرف ہو گیا اور گال صاف کرنے لگا — "یہ کیا تم میرے گالوں پر تھوک مل دیتی ہو —" اور نانی کی انگلی پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اُس نے شرارت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا — "نانی کتّے کو چھو چھو کر دو تو کیا ہوتا ہے —"

"بہت بہت دور ہے — میں نہیں جاتی تیرے ساتھ —" نانی اماں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"خبردار جو تو نے کچھ کیا — کبھی نہیں جاؤں گی پھر تیرے ساتھ — ہاں۔"

"اللہ قسم کچھ نہیں کروں گا — بس چھو چھو کروں گا —" وہ نانی کو گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"افسر بیٹی ٹکڑے بھگو دے — اللہ کا شکر ہے بجو نے ضد نہیں کی۔ اگر کچھ کھانے کو نہ ملے تو یہ تو آسمان اُٹھا لیتا ہے سر پر۔"

کوئی ہلکے سے کھنکھارا — اور ساتھ ہی اُس کی گردن دروازے کی طرف مڑ گئی — فیاض شبنم کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا — اُس کے ہاتھوں میں بنڈل تھے ... جن سے بریانی کی دلکش خوشبو آ رہی تھی۔ نانی اماں کو ان کا بے وقت کا آنا اچھا نہ لگا تھا لیکن پھر بھی وہ بات بات پر واری جا رہی تھی — سالی کے خستہ پانوں سے بہت دنوں کے بعد اس کا حلق تر ہو رہا تھا۔ بجو کے خیال تک سے میٹھے ٹکڑے نکل گئے تھے — بریانی کھاتے ہوئے ایک نظر وہ ٹافیوں کے بنڈل پر بھی ڈال لیتا — شفاف تھیلی میں لپٹے رنگ برنگے ... ریشمی ریشمی ٹکڑے — "اِس میں سنترے کا مزہ ہوگا — اس میں کیلے کا —" وہ سوچ رہا تھا — پتہ نہیں افسر اور بجو کے ساتھ بجو خود بھی کیوں ضد کرنے لگی تھی، بجو تو بجو خود نانی اماں اصرار سے انہیں روک رہی تھی "کہاں جاؤ گے۔ رات زیادہ ہو گئی ہے — اور ہم کوئی غیر تو نہیں —" حالانکہ نہ نانی اماں کا اور نہ بجو کا دل چاہ رہا تھا نہ دماغ — اور وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے — مان گئے — بجو نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں اور افسر نے اسے گود میں لے کر چوم لیا — نانی اماں کی آنکھوں کی سُرخ سُرخ بے جان پتلیاں بڑی تیزی سے گھومنے لگیں، بجو نے پریشانی سے اُن کی طرف دیکھا — "اب جانے کے لئے کہیں تو نہیں روکوں گی —" اُس نے سوچا۔

پھر اپنی اکلوتی چارپائی اُس نے اُن کے سپرد کر دی اور خود اماں اور افسر کے ساتھ بجو کو لے کر نیچے پڑ گئی۔ شبنم بھی اُس کے پاس ہی لیٹ گئی تھی۔ جانے کیوں آج کرید کرید کر وہ نانی اماں کے ساتھ اپنے رشتے کا کھوج لگا رہی تھی — "تیری اماں کا دادا اور میرے بڑے ابا ..." نانی اماں اسے سمجھا رہی تھیں۔ شبنم کا دل بُری طرح چاہ رہا تھا کہ کسی طرح نانی اماں سے اُس کا بہت ہی قریبی رشتہ نکل آئے "میرے ابا کے جدّ دادا تھے نا۔"

ان کے گھر تیری ماں کی نانی بہو بن کر آئی تھی ——"، نانی اماں نے سوچ کر کہا —— "یہ ہوئی نہ کوئی بات" شبنم خوش ہو گئی۔ گھڑیال نے ایک بجایا —— اور نانی اماں نے کروٹ لے کر لحاف میں منہ ڈال لیا —— "سو جا ری اب ایک بج گیا ——"

دیئے کے بجھنے سے دیر تک مٹی کے تیل کی بو کمرے میں پھیلی رہی۔ پھر فیاض کے سر میں درد ہونے لگا —— اور شبنم اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ چوڑیاں جھنکیں —— جانے کون جاگ رہا تھا اور کون سو رہا تھا لیکن بچہ کا سانس آپ ہی آپ پھول گیا —— وہ پسینے میں نہا گئی —— اور نڈھال سی ہو گئی۔

اور صبح نانی اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی تھیں —— "دیکھ ری یہ نہ ہو گا۔ میں پہلے ہی کہوں تھی کچھ گڑ بڑ ضرور ہے —— کوئی آفت نہ پڑ جائے ہمارے گھر ——"

"مجھ پر کیوں برس رہی ہو؟ روکا کیوں تھا؟"

"میں تو یونہی کہہ رہی تھی پر تو نے کیوں زور دیا ——"

"بس یونہی ——"

"نانی ——؟" اختر نے اٹھ کر آنکھیں ملیں۔ —— "دولہا بھائی چلے گئے کیا؟"

"چپ کر ری چنڈال —— بڑی آئی دولہا بھائی کی سالی ——"

تین ہی دن بعد صبح صبح شبنم پھر آ گئی —— لیکن فیاض کے ساتھ نہیں، اپنی ماں کے ساتھ —— وہ بری طرح رو رہی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں کا سارا کاجل بہہ گیا تھا —— "دیکھو بھائی میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔" نانی اطمینان سے کہہ رہی تھیں "یہ بات ٹھیک نہیں ——"

"مصیبت تو اور آن پڑی ہے ——" شبنم کی ماں بولی

"وہ کیا ——؟"

"شبنم کے میاں نے نوٹس بھجوایا ہے ——"

"شبنم کا میاں ——؟" باجی نے حیران ہو کر شبنم کو دیکھا۔

"ہاں بھئی بات یہ تھی کہ اس نے شبنم کو فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی اور یہ ایک سال ہوا گھر آ کر بیٹھ گئی۔"

"طلاق نہیں لی تھی اس سے؟"

"یہی تو مصیبت بن گئی ساری وہ کہتا تھا میرے تین سو روپوں کے زیور ہیں، پہلے وہ واپس کرو"

"کر دیتیں —— اس سے شادی ہوئے دو ماہ بھی تو نہ ہوئے تھے ——!"

"کہاں سے واپس کرتی، سب کچھ تو گھر میں خرچ ہو گیا تھا"

"دیکھ ری اختری ——" نانی اماں نے شبنم کی ماں کو مخاطب کیا "ہماری سمجھ میں تو تمہاری کوئی بات نہیں آئی —— خواہ مخواہ بیٹی کا بسا بسایا گھر اجاڑ دیا ——"

"میں نے کیا اجاڑا —— وہ تو خود ہی بے وقوف تھا —— شبنم فلم میں کام کر لیتی تو کیا بگڑ جاتا تھا۔ آخر شبنم کی بھی دو چھوٹی بہنیں ہیں، انھیں کون پالتا —— اور پھر سوکھے ٹکڑوں پر کوئی کب تک جیئے ——"

"اس فیاض کا کیا بگڑے گا ——؟"

"جبکہ اس اولاد نے ڈال دیا ہے —" اختری کی آنکھیں چمکیں "میں نے بچے ہی کہا تھا کہ جاٹ کر پرے پھینک — پر اس نے تو سینے ہی سے چمٹا لیا۔"

"بس کرو ماں" شبنم کی تیوریاں چڑھ گئیں "شرم نہیں آتی — فیاض ہی کے دم سے ابھی تک جی رہی ہو — توبہ ہے اتنا بھی کوئی ناشکرا نہ ہو۔"

"کون سی جائداد تیرے نام کر دی اس نے؟ کہا تھا کورنگی میں ایک کوارٹر ہی لے دو۔"

"چھوڑو بی —" شبنم کے چہرے پر نفرت اور طنز کی ملی جلی پرچھائیاں آگئیں "ایک سال سے لارے دے رہی ہو اُسے — پھر بھی دوزخ کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔"

"تو کیا تجھے اس کے سپرد کر دوں؟ لونڈیوں کا گلا گھونٹ دوں؟ اپنا سر پھوڑ دوں، کیا چاہتی ہے تو —؟ یوں بھی تو کوئی لڑنا ہو کسی سے —"

"کچھ کرو نہ کرو — میری تو زندگی برباد کر دی تم نے —"

واہ ری کسی بھڑوے کی جنی میں نے تیری زندگی برباد کر دی — ڈوب مر بے شرم، اری میرا کیا تھا — تیرے باپ کے مرنے کے بعد دوسرا خصم کر لیتی — پر میں نے تم لونڈیوں کو سینے سے لگائے رکھا — ہائے رے میرے نصیب — آج تم ہی مجھے آنکھیں دکھلاؤ ہو —"

جیسے کوئی طوفان آیا اور گزر گیا — ہمو کے گھر مکمل ایک ماہ تک سکون رہا — نہ فیاض آیا نہ شبنم آئی، نہ ہی ان کے بارے میں کوئی اطلاع آئی — اور نہ ہی کوئی چاہتا تھا کہ وہ آئیں — لیکن — پھر بھی جانے کیوں — جانے کس لئے — ہمو کا دل کبھی — کبھی — چاہنے لگتا — کبھی کبھی ڈوبنے لگتا — فیاض — سرخ سرخ آنا، جیسا فیاض — جانے کیا حال ہوگا اُس کا — اور شبنم — بدنصیب — وہ کبھی کبھی سوچنے لگتی — کچھ ہوگا — کچھ ضرور ہوگا — جو کچھ ہوا — یہ تو کچھ بھی نہ تھا — یہ تو معمولی آندھی تھی — درخت ہلے اور پتے جھڑ گئے — ابھی تو کچھ ہونا ہے — کچھ ضرور ہونا ہے .... درخت اکھڑیں گے .. شائیں شائیں — تیز تیز ہوائیں، سمندروں .. ندیوں .... نالوں اور دریاؤں کا اچھلتا پانی — بے بس گرتی چٹانیں — جانے اُن کے نیچے کون دب جائے گا اور کون اوپر کھڑا ہو کر قہقہے لگائے گا — خونخوار قہقہوں میں دبی دبی سسکیاں — مشین بڑی تیزی سے چلنے لگتی — شلوار کا کوئی حصہ دوسرے حصے کے نیچے تک سل جاتا — مشین رک جاتی — بخیے ادھڑنے لگتے — "اری سنتی ہے ہمو —" "اماں اُٹھ کر بیٹھ جاتیں —" کہو — "وہ عادتاً کہتی — افسر بڑی بے چینی سے کروٹیں بدلتی —" کچھ نہیں — "اماں پھر سے لیٹ جاتیں —" سو جا بیٹی رات بہت ہو گئی ہے —"

ایک دن فیاض آ گیا — سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا — بڑی بڑی شربتی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں — "تین سو روپے دے کر پہلے خاوند سے طلاق دلائی —" وہ انھیں بتلا رہا تھا — "اور خود جب بارات لے کر پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا — یہ اتنا بڑا تالا میرے نصیبوں پہ پڑا میرا منہ چڑا رہا تھا —" اُس کی آنکھیں بھیگ آئیں — "بڑی تلاش کے بعد وہ ایک کلب میں ملی — طبلے کی تھاپ اور ہارمونیم کے سروں پر اُس کے پاؤں تھرک رہے تھے — اُس کی دونوں چھوٹی بہنیں اور ماں بھی وہیں تھی — وہ ایک ڈرامے کی ریہرسل کر رہی تھی .... میں نے بہتیرا سمجھایا۔ وہ مان گئی —!"

"مان گئی —!" ہمو کو بڑی حیرت ہوئی

"ہاں —"

"اور اُس کی ماں؟" تائی اماں کا سر وتہ رک گیا

حسرت ناک سی سرد آہ فیاض کے ہونٹوں سے نکلی — "اس کی ماں —" فیاض نے اپنے ہونٹ چبائے — "اُسے کوٹھی چاہیے —

کار چاہیے... شوخ بھڑکیلے کپڑے چاہئیں ... میں یہ سب کچھ کہاں سے لاؤں ؟"

"پھر بھی اُس نے کہا کیا ؟"

"کہتی کیا، بڑے غصے سے اُس نے شبنم کی طرف دیکھا اور کہنے لگی ـــ" دیکھ ری شبنم! مجھے زہر دیدے اپنے ہاتھوں سے ـ پھر جیسے دل چاہے کر لیجیو!"

"پھر ـــ !؟"

"شبنم نے مجھے تین دن بعد آنے کو کہا "

"کہاں ـــ ؟"

"وہیں کلب میں ـــ اُس کا خیال تھا اِس عرصے میں اپنی ماں کو راضی کر لے گی لیکن جب میں تین دن بعد گیا تو ـ وہاں کوئی بھی نہ تھا ـ کلب کا سکریٹری میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں، اُسے اس کا پتہ بتلاؤں ـــ پانچ دن بعد اُن کا ڈرامہ ہو رہا تھا ـــ اور اس کا اعلان اخبار میں بھی کر دیا گیا تھا لیکن میں انھیں کیا بتلاتا ـ میں بتلا ہی کیا سکتا تھا ـ میں نے پھر ڈھونڈا ـ بہت ڈھونڈا ـــ اور پتہ بھی مل گیا ـــ" وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکا ـــ بڑا سا تھوک اُس نے نگلا ـــ "لیکن وہ ایسی جگہ پہنچ چکی تھی جہاں میں نہیں جا سکتا تھا ـ جہاں کوئی بھی شریف آدمی نہیں جا سکتا تھا ـ شاید اُس کی ماں کو وہاں بنگلہ مل جائے ـ کار مل جائے ـــ شوخ بھڑکیلے کپڑے مل جائیں ـــ" وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا رومال سے اُس نے آنکھیں صاف کیں ـــ "خدا کرے وہ خوش رہے ـــ"

بیّو بڑی حیرانی سے کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا ـــ "کیا گورے کالے بھی ہو جاتے ہیں؟" وہ اپنے سانولے ہاتھوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا ـ

"پھر تو کالے بھی گورے ہو جاتے ہوں گے" ـــ فیاض اسے دیکھ کر مسکرایا اور جیب سے ٹافیوں کا پیکٹ نکال کر اُسے دیا ـ

اچھا اب چلتا ہوں ـــ وہ دروازے کی طرف بڑھا ـــ

"دولہا بھائی ـــ" بیّو نے اُسے بلایا ـــ

"دولہا بھائی ـــ!" وہ پلٹ کر بڑبڑایا اور بے اختیار بیّو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ـــ نانی اماں کی بے جان سرخ سرخ پُتلیاں بھی بھیگ گئیں

"پھر کب آؤ گے دولہا بھائی ـــ" بیّو نے پھر کہا

"آؤں گا بیٹے، ضرور آؤں گا ـــ" فیاض نے اُٹھا کر بے اختیار اُسے چوم لیا ـ

"چھی چھی ـــ" بیّو نے اپنے گال صاف کئے ـــ "یہ کیا نانی کی طرح تم نے میرے گالوں پر تھوک مل دیا"

"ہاں بیٹے ضرور آنا تمہارا اپنا گھر ہے" ـــ نانی نے پہلی بار پورے خلوص سے کہا ـــ اور پاس ہی کھڑی افسر کا ہاتھ پکڑ لیا ـ

"آؤ گے نا ؟" بیّو کی آنکھیں چمکیں اور اُس نے افسر کی طرف دیکھا ـــ افسر اپنا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے اندر بھاگ گئی ـ

یہ کیا! ـــ یہ کیوں بھاگ گئی! ـــ اُس نے سوچا اور آپ ہی آپ مسکرا دیا ـــ "ہاں میں ضرور آؤں گا" ـــ اُس نے بیّو کی طرف دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا ـ

"ہائے ری بیّو ـــ" نانی اماں نے بڑی حسرت سے کہا ـــ "کیا شاہ دل لونڈا ہے یہ فیاض ـــ شبنم تو بالکل اندھی نکلی"

بنگالی: عبدالشکور

اردو: احمد سعدی

پیچ و خم

اُس پار بھیرب، اِس پار آشو گنج، درمیان میں میگھنا تھا اور اُس کے اوپر بھیرب کا پل۔ ٹرین پل عبور کر کے آشو گنج میں رُکنے والی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بریک لگی، اور ان کے ساتھ فولادی پہیے کچھ دور تک گھسٹتے چلے گئے۔ اس کے بعد ٹن ٹن گھنٹی بج اُٹھی اور ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اُترنے والے مسافروں سے سوار ہونے والوں کی تعداد کم تھی، پھر بھی انٹر کلاس کے ڈبے کے سامنے ایک بھیڑ سی لگ گئی۔

ایک بوڑھے آدمی کے جسم سے سٹ کر ایک جوان آدمی نے اپنے دُبلے پتلے جسم کو ترچھا کر کے اندر جانا چاہا۔ اس کی یہ جلد بازی دیکھ کر بوڑھے آدمی نے ایک جست بھری، اور وہ بات ذرا جا کر کھڑے ہونے کے بعد کرتے کے دامن سے پنکھے کا کام لیتے ہوئے بیزاری سے پوچھا "کیوں جناب! کیا آپ اکیلے ہی جانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں، نہیں، یعنی آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں، وقت کتنا کم ہے؟"

دو آدمی اتنی دیر میں ڈبے کے اندر چلا گیا۔ لیکن اس کے بعد یکایک اُسے محسوس ہوا جیسے وہ کمزوری کا ثبوت دے رہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بھی اُبل پڑا۔ "لیکن جناب! اس میں حرج ہی کیا ہے؟ راستے گھاٹ میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔"

بوڑھے آدمی کے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا، پھر بھی وہ جلد از جلد ڈبے کے اندر پہنچ جانے کے لئے بے چین تھا۔ اس نے پھر ایک جست بھری اور کسی طرح ڈبے میں داخل ہو ہی گیا۔ اس کے بعد وہ ایک کونے میں جا کر تھوڑی سی جگہ پر سمٹ کر بیٹھ گیا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اُف کتنی سخت گرمی پڑ رہی ہے! ٹرین بھی تو چھوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔"

اتنے میں ایک بھاری بھرکم جسم والے آدمی نے، جو ایک درجن گٹھریاں اور زیرِ تعمیر مکان کی کھڑکیوں کو جنگلے سے ڈبے میں پھینک کر بدحواسی کے عالم میں سوار ہو چکے تھے، اپنی ذمہ داری کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس بوڑھے آدمی کو ٹوکنا ضروری سمجھا۔ "جناب، اس طرح شوق سے خالی ہاتھ سفر کرنے والے کو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ کُل پانچ منٹ وقت ملتا ہے۔ اسی میں سامان چڑھاؤ، بیوی کو چڑھاؤ، بچوں کو چڑھاؤ، قلیوں کو فارغ کرو، خود لوگوں سے ملو اور ان سے رخصت ہو کر ٹرین میں چڑھو، چڑھ کر بقیہ پٹیوں کو گن کر دیکھو، اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ سنبھالنا پڑتا ہے اور آپ ہیں کہ چڑھتے ہی فرماتے ہیں گاڑی چھوٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔"

ایک ہی سانس میں اپنی باتیں ختم کر کے اُنھوں نے ایک چٹکی نسوار اپنی ناک میں بھر لی۔

دبلا پتلا آدمی آہستہ آہستہ کونے میں بیٹھے ہوئے آدمی کے پاس پہنچا اور اس کے جسم سے یوں سٹ کر بیٹھ گیا جیسے کچھ دیر پہلے پیدا ہونے والی تلخی کو ختم کر دینا چاہتا ہو۔ "آپ کے پاس ماچس ہے دادو؟"

دادو نے اپنی جیب ٹٹول کر ماچس دے دی لیکن اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

اس نے ایک قینچی سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر، پل ڈول کر اور بھی سٹ کر بیٹھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں پوچھا "آپ کہاں جائیں گے، اکھوڑا؟"

"کیوں اتنی جلدی بھول گئے؟ آپ نے ایک بار کاؤنٹر پر بھی تو پوچھا تھا؟" انھوں نے بڑی بے دلی سے جواب دیا جیسے اُسے لفٹ دینا نہیں چاہتے۔
"او، ہاں، آپ نے تو کوملا کا ٹکٹ لیا ہے، میں بھی وہیں تک جاؤں گا، چلیئے اچھا ہی ہے۔"

ٹرین گومتی پر سے گزر رہی تھی کوملا کے مسافر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ کوئی کھڑے ہو کر انگڑائی لینے لگا۔ کوئی جوتے کے فیتے باندھنے لگا۔ کوئی کھڑکی سے سر نکال کر اسٹیشن کی دوری دیکھنے لگا۔ ڈبے میں تاش کھیلنے والی جماعت نے گومتی کے پل کی آواز سُن کر جلدی جلدی باون پتوں کو سمیٹ کر رکھ لیا۔ اس عرصے میں وہ آدمی آشو گنج سے کوملا پہنچنے تک ڈھائی گھنٹے لگاتار قینچی سگریٹ پیتا رہا، ناک میں بار بار نسوار ڈالتا رہا اور برہمن بڑیا، اکھوڑا سے کرنین پور میں اپ ڈاؤن کراسنگ تک بار بار ٹرین سے اترتا رہا اور چڑھتا رہا۔ ٹرین رُکتے ہی وہ شخص پھر بے چین ہو گیا اور عجلت کے ساتھ اس نے بوڑھے آدمی سے پوچھا "دادو، آپ نہیں اتریں گے کیا؟ کوملا تو آ گیا۔"

"آپ کو اتنی جلدی کیا پڑی ہے، میں سو تو نہیں رہا ہوں، ٹرین کو رُکنے تو دیجئے۔"

آپ خفا کیوں ہو رہے ہیں دادو، بوڑھے آدمی ہیں اور گاڑی صرف پانچ منٹ....."

دادو کو شاید اس کی بات پسند آ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور تیزی سے نیچے اُتر گئے اور گیٹ پر ٹکٹ دکھا کر باہر چلے گئے۔

لیکن اتنی بھیڑ میں بھی ان کے ہمسفر نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ اُن کے ساتھ لگا رہا۔ باہر آ کر بوڑھا شخص پھر بکنگ آفس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا شخص بھی بکنگ آفس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی "اے مودک کے بچے! کیا بات ہے، بیڑی چھوڑ کر سگریٹ؟"

ایک ہاتھ میں بیڑی، دوسرے ہاتھ کی انگلی میں چونا لئے ہوئے ایک آدمی میلی پتلون کے اندر اوپر بھی میلی قمیص ڈالے ہوئے اس کے قریب آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی بے پروائی سے پان چباتے ہوئے مودک کی طرف دیکھا، لیکن یکایک اپنے پاؤں پر دباؤ محسوس کر کے وہ چونک اٹھا۔

مودک نے اس آدمی کا ہاتھ پکڑ کر دھیرے سے دبایا اور پھر تیزی سے دونوں پلیٹ فارم کی طرف چلے گئے۔ ریلوے کینٹین سے آگے جا کر سنسان جگہ میں دونوں کھڑے ہو گئے۔

"دھت سالا! پانچ آنہ پیسہ خرچ ہو گیا۔ منہ بھی خراب ہو گیا۔ ایک خاکی دو تو؟"

"کیوں استاد، آج کا جاترا ٹھیک نہیں ہوا؟"

"سالے اکھوڑا میں رہنے سے یہی حالت ہوتی ہے۔ سب سالی منحوس ہے۔ تمہاری مچھی بھی منحوس ہے۔ رات اسی کے پاس تھا۔"

"دیکھو بابا، مچھی کو بدنام مت کر۔ اس کا بدن چھو کر باہر نکلنے سے میری تو آمدنی دونی ہوتی ہے۔"

"گولی مار مچھی کو۔ اب کام کی بات سُن۔ مال خریدے گا؟ ایک نمبر مال ہے۔ ایک دم تگڑا ہے"

"تگڑا! سالے پھر تم نے اتنی دیر تک کیوں نہیں بتایا؟ کتنا؟

"ایک بڑی چتی، اس سے ایک پیسہ بھی کم نہیں ہو گا۔"

"ایک سو؟ تمہارا دماغ خراب ہوا ہے تو بابا؟"

"دماغ خراب نہیں ہوا استاد، دماغ ٹھیک ہے۔ ذہن مودک بوڑھیا مچھلی نہیں کھاتا۔ آشو گنج ہاٹ کے آفس سے پکڑ کر جا دولایا ہے۔" مچھی جوئی بیڑی کا

آخری سرا سلگا کر مودک نے اپنی بات ختم کر دی۔ "بابا، پانچ کا روپیہ ہے، بیس بیس نمبری نوٹ میں سے سالا مودک کا بچہ ایک بھی پانے کا حقدار نہیں ہے کیا؟"

کالو کی دونوں آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "آج اب اس ٹائم سالے کام پر جانے کا دل نہیں تھا سوچا تھا نین محل میں زخشی کا ناچ دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کریں گے۔"

اس کے بعد خرید و فروخت مکمل ہو گئی۔ مودک نے مال دکھا کر کالو کے حوالے کر دیا۔

جیناستی سے بارڈر پر، یا نہ جانے کہاں، ملٹری کی نقل و حرکت بڑھ گئی تھی۔ پلیٹ فارم سپاہیوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر ڈبے میں لوٹا اور کمبل لادے ہوئے تھے۔ ٹرین چھوٹنے میں ابھی کافی دیر تھی۔

کالو اور مودک ہندو ٹی اسٹال کے قریب ایک کونے میں بیٹھ گئے اور دو کپ چائے کا آرڈر دیا۔

"مجھے کالو، سالے مرشے کو پا کر میرا دل بہت خوش ہو گیا تھا۔ جے ایم سی سے پانچ بیچ کر آ رہا ہے۔ ڈبل ہزار کا معاملہ ہے۔ ایک دل چاہا کہ سالے کے پیٹ میں ہاتھ لگا کر زندگی بھر کا کام ختم کر دوں اور بیلا کو لے کر کشٹیا چلا جاؤں۔ اب کام کاج میں میرا دل نہیں لگتا۔ استاد جی چاہتا ہے گھر جا کر گھر سنسار کروں۔"

"دیکھو نوبا، تیری نیت خراب ہو گی تو ساعت نہیں بنے گی۔"

"پہلے میری بات تو سنو سالے۔ ایک پیکٹ سگریٹ خرید کر انٹر کلاس میں چڑھ گیا۔ اس کے بعد ٹٹول ٹٹول کر باندی کی اولاد کو حلوہ بنا دیا لیکن مال نہیں ملا۔ بد جو سمجھا تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ سونا بہت بڑا سیانا ہے۔ سالا نوبا مودک کو دھوکا دینا چاہتا ہے کو ملا تک کا ٹکٹ لے کر یہاں آیا ہے اور اب پھر یہاں سے ٹکٹ لے رہا ہے۔ سالا بہت چالو ہے۔"

کالو کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ "اب کام کیسے بنے گا کچھ بتاؤ تو استاد۔"

مودک چائے کی پیالی میں دوبارہ چسکی بھرنے کے بعد بولا۔ "ایسے نہیں ہو گا۔ اس مرتبہ اپر کلاس میں اس صاحب کی بات یاد ہے نا؟"

"کیا بات کی ہے استاد، انڈے کے لئے مرغی ہی ختم؟"

کالو کی بے چینی دیکھ کر مودک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ "ابے یار گھبراتا کیوں ہے، کسم میں مدھو گوپ کے اکھاڑے سے دو بوتل چڑھا کا پانی لے لینا بس مشکل آسان ہے۔"

کالو کو یہ بات بہت بری لگی۔ ایک آدمی کو قتل کرنے کے لئے نوبا مودک اس کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ "ارے گولی مارو مدھو گوپ کو، مارنے کے لئے کالو بوتل نہیں چڑھاتا۔"

"شاباش بیٹے! جیو جتنا دل چاہے۔"

ذہن مودک اور کالو جڑا ہے کہ کمناؤنے قہقہے سے ساری فضا تھرتھرا اٹھی۔ ایک قہقہہ لگا کر کالو نے پھر کاروباری بات شروع کر دی۔ "کوئی بات نہیں اگر فیلنی میں اترے تو رات ہی کو ختم کر دو گے اور اگر اس لائن میں نہ جائے تو کسم میں گونو استاد کے ہاتھ بیچ دو گے۔ تمہاری تو سالے کو میلا، فیلنی بڑے مزے کی لائن ہے موقع ملے تو تولا کھالی، چاند پور کا مال بھی خرید فروخت کر سکتے ہو۔ جلال لال مرغا اس طرف سے کومیلا بینک اور انکم ٹیکس کے آفس میں آتا ہے۔ کیا بتاؤں۔ مجھے سالے بھاگا سردار نے کومیلا بھیرب لائن میں روک کر میرے اوپر ظلم کیا ہے۔ سا تنا کہا کہ بابا کم از کم بھیرب۔ نرسنگھدی تک میری بدلی کر دو، مگر نہیں کیا۔ سالا سردار کہتا ہے کہ اس لائن میں موٹا کاروبار ہوتا ہے، تجربہ کار آدمی کی ضرورت ہے۔ موقع ملا تو اسی ناگی کے بچے کی جیب پر ہاتھ صاف کر دوں گا۔ لے نوبا، کان کھول کر سن لے۔ اب بھی بہت دیر ہے۔ استاد سے بے ایمانی کرو گے تو کبھی کام نہیں سیکھ سکو گے سکھے دیتا ہوں۔"

"دھنا کہاں ہے رے کالو؟"

"تھری اپ سے اکھوڑا گیا ہے۔ شاید سلہٹ لائن میں ہے"

"اور ٹو؟"

"ٹو ڈاؤن سے پھنس گیا ہے۔ ٹکسم میں رُک گیا ہے۔ سنا ہے فائو اپ سے آ جائے گا۔"

"وہاں نہیں رُکے گا تو کہاں رُکے گا۔ سالے نذیر سے۔ نے پاکس نے ڈھاکہ میل سے ایک بیرنگ خوراک اُٹھایا ہے۔" کالو کی دونوں آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔

"پھر تو تم لوگوں کا پورا مہینہ ہے سالے۔ جاؤ، حصہ بٹاؤ جا کر۔" مودک کے منہ سے جیسے رال ٹپک پڑی۔

"دھت سالے، اتنی دیر تک کہیں رہتا ہے؟"

اتنے میں گھنٹی بج اُٹھی۔

"اچھا اب چلتا ہوں۔ دے ایک سگریٹ دے۔"

پھر انجن نے سیٹی دی۔

"استاد سے میرا سلام کہہ دو گے۔"

ٹرین کھل گئی اور ڈبہ سامنے آتے ہی کالو نے ہینڈل پکڑ کے پائے دان پر پاؤں جما دیا۔

پون گھنٹے کے بعد ٹرین ٹکسم پہنچی اور ٹرین رُکنے سے پہلے ہی کالو جست بھر کر اُتر گیا اور ایک نمبر پلیٹ فارم کے شمالی جانب ٹی اسٹال کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا رے کالا، کیا خبر ہے؟" ایک لڑکے نے جو لنگی پہنے ہوئے تھا کالو کی پیٹھ تھپک کر پوچھا

"نہیں بھائی، کوئی خاص بات نہیں، تم چائے پیو، میں ابھی آتا ہوں۔ بارک میاں ایک کپ چائے دے دو اس کو۔"

کالو تیزی سے جا کر اوور برج کے اوپر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں گدھ کی طرح اپنا شکار تلاش کر رہی تھیں۔ پٹ سن کا تاجر بکنگ آفس کے سامنے تھا۔

ڈاکھائی کی آخری ٹرین ساڑھے سات بجے کھلتی تھی اس وقت چار نمبر پلیٹ فارم پر خالی ڈبوں کی شنٹنگ ہو رہی تھی۔

کالو کا قیاس صحیح نکلا، ٹکٹ لے کر ایک سو روپے میں خریدا ہوا اس کا شکار ڈاکھائی کی گاڑی میں انٹر کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اتنی دیر کے بعد پہلی بار کالو کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہوئی وہ آپ ہی آپ جھنجھلا اُٹھا۔ آخر کار اتنا اچھا مرغا اُسے بیچ دینا ہو گا۔

ریلوے لائن عبور کر کے کالو پھر اسی ٹی اسٹال پر آ گیا "چل مٹا، استاد سے ملاقات کرنا ہے۔ ضروری کام ہے۔"

"چل، استاد دوسرے ہی پہر ہے۔ کیا بات ہے؟ بہت جلدی میں ہو۔ ہاتھ میں کوئی مال وال ہے نا کیا؟"

"ہاں تو سچ مچ مال ہے بھائی، ایک دم فس کلاس لیکن میری قسمت کا نہیں، ڈاکھائی لائن کا ہے۔"

"اگر جلا سالا ہوتا تو ایک دان مار لیتے بھائی۔ سچ سچ سچ، مٹا بھی افسوس کرنے لگا۔

"میری قسمت ہی خراب ہے بھائی کتنی کوشش کے بعد اس چاند پور لائن میں آیا تھا لیکن دیکھتا ہوں اپنا دیسی لائن ہی اچھا تھا۔"

اڈے پر گویا آندھی بری طرح جو آپ پر برس رہا تھا اور گویا استاد کا سارا جسم غصہ کے مارے بُری طرح کانپ رہا تھا اور وہ تو ایک مجرم کی طرح

ایک کونے میں بیٹھا ہوا سر کھجا رہا تھا۔

آج تک اس کی آنکھ نکالی ہوں گا جیب کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ ایک جیب میں ہاتھ ڈالنے کے بعد دوسری جیب میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوئی سالا جیتگیاں جیبیت۔ گوڈو استاد اپنے باپ کو بھی بٹھا کر نہیں کھلاتا۔

یکایک کالو پر نظر پڑتے ہی استاد کا غصہ اتر گیا، اس نے نرم لہجے میں پوچھا "کیا رے کالو، کیا خبر ہے۔ کوئی مال وال ہے کیا؟ بیٹھ۔ بیٹھ، بیڑی پی لے"

"ہے استاد، لیکن دام زیادہ ہے۔"

"تم کو کتنا چاہیئے، وہی بات کہو؟"

"دلال پتی"

"مرغی ہے یا مرغا؟"

"مرغا ہی کیا پوچھتے ہو استاد، پورے دو ہزار کا بکرا ہے"

"دو ہزار ——؟"

"ہاں استاد ——"

گوڈو میاں سنبھل کر بیٹھ گیا "رات کو رہو گے یا چلے جاؤ گے؟"

"کام ملنے سے فاگواپ سے چلا جاؤں گا ورنہ جا نگام پنجرے فیتی چلا جاؤں گا۔ یہاں نہیں رہوں گا۔"

گوڈو میاں نے دس دس روپے کے بیس نوٹ پھینک کر اس سے شکار کا حلیہ پوچھا اور چند ضروری باتیں بھی دریافت کیں جو عام طور سے خرید و فروخت سے پہلے اس لائن میں دریافت کرنا منع ہے۔ اور پوچھنے پر بھی کوئی نہیں بتاتا، کیونکہ اس سے کاروباری ساکھ خراب ہوتی ہے۔

"بتاؤ ——"

کالو نے شروع سے آخر تک گوڈو استاد کو تمام باتیں بتا دیں۔ اور اس کی باتیں سن کر گوڈو استاد کی ابھری ابھری آنکھوں میں چمک آگئی

"کہاں جائے گا، تم نے بتایا؟"

"ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا، لیکن لگتا کہ اسی کا ہے"

"ٹھیک ہے، سمجھ گیا جو وہاں کا ہوگا۔ بلاّ کہاں گیا رے بیٹا ٹھگوں کی اولاد، سن!"

چلم میں پھونک مارتے ہوئے بجلے نے استاد کی طرف حقہ بڑھا دیا۔

"آج تیرا آخری امتحان ہے۔ یا تو مال لے کر آئے گا، یا اپنا ٹوٹا ہوا جبڑا۔"

"مال نہیں ملا تو میں اس ٹھگوان کی گردن لے آؤں گا۔"

جلا تھوڑی دیر پہلے جیب نہ ہاتھ لگنے کی خفت مٹانے کے لئے زور سے چہکا۔

٭ کالو عرف جیتا جو ہگام کا رہنے والا تھا۔ وہ کہتا —— "میں ٹھگوں کی اولاد ہوں جس کو باپ کہہ دیا اسے باپ سمجھوں گا لیکن اگر کسی

کو دیکھتا ہوگا تو اس کا کلیجہ نکال کر دم لوں گا۔۔۔ لیکن اس دعوے کے باوجود وہ کام میں بے حد سست تھا کبھی تو ایسا ہوتا کہ چھوٹی سی مچھلی بھی ہاتھ سے نکل جاتی اور کبھی وہ بڑی مچھلی بھی پکڑ لاتا۔ وہ گوڑو استاد جیسے ماہر فن کی شاگردی میں داؤں پیچ سیکھ رہا تھا اور اسے اس بات کی خوشی تھی کہ زندگی کے خفیہ رازوں سے ہمکنار ہو رہے تھے اور اسی لئے اُسے یقین تھا کہ گوڑو میاں گیانی آدمی ہے۔۔۔ گوڑو میاں گنی آدمی ہے۔ جو تو استاد کی دعا چاہتا تھا تاکہ [illegible] ایک جال بھی بنا دے۔۔۔!

ڈالکھالی کی آخری ٹرین کا انٹر کلاس عموماً خالی ہی جاتا تھا وہ موقع ملتے ہی دولت گنج اور ناتھیر پور اسٹیشن کے [illegible] میاں اپنا کام کر لے گا، طویل فاصلہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو جوموہانی اسٹیشن سے گودام تک جانے کا راستہ بے حد محفوظ ہے۔ رات دس بجے کے بعد عام طور پر اس راستے پر ایک آدمی بھی نہیں ملتا ہے۔ جو کر اپنا کام ختم کر کے پہلی ٹرین ہی سے واپس چلا آئے گا۔

گوڑو میاں نے بار بار تاکید کی تھی کہ دیکھو شکار چھوٹنے نہ پائے۔ شکار چونکہ جوموہانی کا تھا اس لئے [illegible] خود جانا ممکن نہیں تھا۔ کون جانے کوئی شناسا [illegible] لے ورنہ اتنے بڑے شکار کے معاملے میں گوڑو استاد دوسروں پر کبھی بھروسہ نہ کرتا تھا، ہمیشہ خود جاتا تھا۔

جو تو نے قسم کھا کر استاد کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کام میں ذرا سی بھی غفلت نہیں برتے گا اور استاد نے آتے وقت ایک بار پھر تاکید کر دی تھی۔ "ضرورت پڑے تو گھڑی بند کر دو گے۔۔۔"

دل کی دھڑکن کو استاد ہمیشہ "گھڑی" ہی کہتا تھا۔

وہ جو تو اپنے استاد کی تمام ہدایات کو گرہ میں باندھ کر بسم اللہ کر کے کالو کے ساتھ اسٹیشن کی طرف [illegible] ہوئے دس دس روپے کے بیس نوٹ تھے اور اسے اس کا دس گنا کر استاد کو واپس کرنا تھا۔ جو تو نے ایک بار پھر اپنی ذمہ داری [illegible] کر کے صدق [illegible] سے [illegible] کو یاد کیا۔۔۔ تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔۔۔!

پلیٹ فارم پر آ کر جو تو نے اپنے شکار کو تلاش کر لیا۔ ٹرین میں تمام مسافر سوار ہو چکے تھے لیکن پھر بھی شکار بالکل تنہا تھا۔ انٹر کلاس کے ڈبے میں ایک کوئی دوسرا مسافر سوار نہیں ہوا تھا۔ پلیٹ فارم پر دو تین چکر لگانے کے بعد وہ رک گیا۔ چلتی ٹرین میں ہینڈل پکڑ کر سوار ہونے اور خواہ مخواہ شکار کو بدگمان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹرین چھوٹنے سے پہلے ہی شریف آدمیوں کی طرح جو تو انٹر کلاس میں داخل ہو گیا۔ چند لمحوں تک دروازے پر کھڑا رہا پھر شکار کے قریب جا بیٹھا۔

"آیئے آیئے۔ خیر، اتنی دیر میں ایک ساتھی تو ملا ہے۔۔۔"

جو تو شکار سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھ گیا۔۔۔ اس شخص کو مزید اطمینان دلانے کے لئے [illegible] باتیں کرنے کی ضرورت [illegible] لیکن یوں خاموش بیٹھے رہنا بھی تو ٹھیک نہیں کہیں یہ شخص اس کی طرف سے مشکوک تو نہیں۔۔۔ ارے دوست جو تو کیا یہ ڈالکھالی کا بھوت کیا بگاڑ سکے گا [illegible] کسی طرح دولت گنج کا اسٹیشن گزر جائے۔ اس کے بعد تو جیسے . . . . . . بس ایک ہی بار میں ہوا ختم۔ جو کو ایک ہی وار میں [illegible] کرنے لگا؟ [illegible] آج استاد نے کتنی گالیاں دی ہیں۔

"آپ کہاں تک جائیں گے بابا؟"

"جوموہانی۔"

"جوموہانی؟"

"ہاں۔۔۔"

"وہاں کیا کوئی کام دھام کرتے ہیں؟"

"ہاں، آشو بابو کے مل میں میکنک کا کام کرتا ہوں۔"

"ہمارے آشو بابو کے سُتری گوپال آئل مل میں۔"

"ہاں ——— اور آپ کہاں جائیں گے؟"

"میں بھی چومو ہانی ہی جاؤں گا، وہاں میرا پاٹ کا کاروبار ہے ——— آپ ابھی کہاں سے آرہے ہیں؟"

"چاٹگام گیا تھا، مشین کے پرزے کے لئے، تین دن سے مل بند ہے۔"

"ہاں کل تو آشو بابو بھی گئے ہیں، ٹرین میں ملاقات ہوئی تھی، کہہ رہے تھے، پرزوں کے لئے مستری گیا ہوا ہے لیکن کچھ مزید پرزوں کی ضرورت پڑ گئی ہے، اس لئے خود جا رہے ہیں۔"

"ہاں، میں چلا آیا، مشین کو کھولنا پڑے گا، ایک ایک دن میں کافی نقصان ہو رہا ہے۔"

جدو کا ایک ملاقاتی اسی مل میں بڑا مستری تھا، آج دوپہر اس سے ٹرین میں ملاقات ہو گئی تھی، وہ چاٹگام سے مشین کے پرزے خرید کر واپس آرہا تھا ——— جدو نے اس مستری سے سُنی ہوئی تمام باتیں بڑی خوبصورتی سے اپنے نام منسوب کر لی تھیں ——— کون کہتا ہے کہ جدو چالاک نہیں ہے؛ لیکن زیادہ آگے بڑھنا مناسب نہیں، وہ ناک صاف کرنے کے بہانے وہاں سے اُٹھ کر دوسری طرف چلا گیا ——— بس ایک اسٹیشن اور باقی رہ گیا ہے، وہ گزر جائے پھر جدو اپنا میکنک کا کام دکھائے گا، مشین کھولنا اُسے معلوم نہیں تھا مگر بند کرنا تو وہ جانتا تھا ——— ٹرین پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔

"چومو ہانی میں آپ کہاں پر رہتے ہیں؟"

"مل ہی میں ——" اب کے جدو کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"خیر بھائی، آپ کے آنے سے سہارا مل گیا ہے۔ رات کا سفر ہے۔ اکیلے کچھ خوف سا لگ رہا تھا، کل پاٹ لے کر آشو گنج گیا تھا۔ گرمی اور پسینے سے میری حالت ابتر ہے۔ بس اب تو آپ آگئے ہیں بھائی، میں تھوڑی دیر آرام کر لوں۔ اگر نیند آجائے تو چومو ہانی میں جگا دیجئے گا ———"

جدو کی بند مٹھی جیب کے اندر کھل گئی۔ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ سیار کے پاس مرغی امانت! کہیں اس نے اسے سچ مچ چور تو نہیں سمجھ لیا ہے اور اسی لئے "چور کے پاس رکھی ہوئی امانت گم نہیں ہوتی" کے مصداق اپنا جان و مال وہ جدو کو سونپے دے رہا ہے ———

جدو چور ہے؟ ایک مرتبہ رات کے وقت کئی آدمیوں نے مل کر اُسے رگید دیا تھا، وہی چور؟ نہیں، اب جدو نے بیڑا کاٹنا اور جیب کاٹنا چھوڑ دیا تھا ——— اب وہ مکمل ہے۔ کہیں اس کا چہرا انظر تو نہیں آ رہا ہے؟

جدو نے مسکرا کر اس خیال کی تردید کر دی۔

اس کی نبض ڈوب رہی ہے کیا؟

جدو نے بیڑی سلگالی۔

وہ پسینے میں بھیگ گیا ہے کیا؟

جدو نے رومال سے اپنا چہرہ پونچھ لیا۔

اس کا سارا بدن کانپ رہا ہے کیا؟ ——— نہیں، یہ ٹرین کے ہچکولے ہیں۔ جدو سنبھل کر بیٹھ گیا۔

پھر بھی یہ کام کسی طرح ......

جوتو یکایک سہم اٹھا، اُسے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ قتل کرنے سے نہیں ڈرتا مگر اب اس بھوت کو کیا کرے۔ اس بھوت نے اس کے بہت سے کاموں میں رکاوٹ ڈال دی ہے

جوتو نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ پھر وہ دروازے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا نہیں، دراصل اس آدمی نے اس پر اعتماد کیا ہے۔ مگر اس نے کیوں اعتماد کیا؟ مانا کہ وہ دونوں باوا آدم کی اولاد ہیں، لیکن کیا اسی وجہ سے ...... مگر جوتو بھی آخر اتنا کیوں سوچ رہا ہے!

ٹرین پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی اور وہ شخص کھڑکی کی طرف رکھی ہوئی پوٹلی پر ہاتھ ٹیک کر بے سدھ پڑا سو رہا تھا تو کیا وہ چالیس پینتالیس سال پہلے چابی دی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک بند کر دے؟ جب تک وہ اسے بند نہیں کرے گا اس کا کام تو نہیں ہو گا۔

جوتو نے دوسری بیڑی سلگائی۔ پھر اس نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر آگے اور پیچھے کے ڈبوں کا جائزہ لیا۔ کہیں سے بھی کوئی سر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسٹیشن بھی ابھی کافی دور تھا اور باہر کی ہر چیز گہرے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی کھلے میدان، لہلہاتے کھیت، گھر باغ، ہر چیز —

جوتو نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈال لیا اور بیڑی کے دو چار لمبے کش لے کر اُسے دور پھینک دیا۔

"ضرورت پڑے تو گھڑی بند کر دو گے" اسے گوتو میاں کی بات یاد آگئی۔

وہ تو بند کر ہی دے گا۔ ذرا دھمکا کر کام بنانا ہو تو اپنی توہین سمجھتا ہے —— ایک سوراخ کر دو اور بس۔ مال لے کر مردوں کی طرح اتر جاؤ۔ جوتو کے ہاتھ میں اصلی فولاد سے تیار کیا ہوا چھرا اچھل اٹھا۔ جوتو آگے بڑھ گیا اور اس کے سر کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جیب سے اس کا ہاتھ باہر نکل آیا اور اس کے ساتھ ہی گوتو میاں کی دعا بھی۔ جوتو کی رگیں یکبارگی تن گئیں، اس کے سارے بدن میں ایک کھچاؤ پیدا ہوا اور . . .

یہ کیسی روشنی ہے؟ نہیں کچھ نہیں، سان پر چڑھایا ہوا چھرا چمک رہا ہے۔ وہ شخص مر گیا ہے کیا؟ —— نہیں سو رہا ہے، ممکن ہے جاگا ہوا ہی ہو —— پھر بھی اس نے اس پر بھروسہ کیا ہے اس نے اسے جوتو غنڈے کی بجائے ایک انسان سمجھا ہے ——

جوتو دھپ سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہو، وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اس شخص نے زنجیر کھینچی ہے کیا؟ نہیں ٹرین اسٹیشن میں داخل ہو رہی ہے —— ناتھیر پٹھا اسٹیشن آ گیا ہے ——

گاڑی رکتے ہی دو مسافر آ کر اسی ڈبے میں سوار ہو گئے۔

جوتو نے بڑی ناگواری سے ان دونوں کی طرف دیکھا —— کیا ان دونوں کو اس کے سوا کوئی دوسری ٹرین نہیں مل سکتی تھی ——؟

جمو ہانی میں ٹرین رکتے ہی وہ شخص ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور تیزی سے دروازے کے پاس آ کر جست بھر کر پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ "اچھا بھائی، اب جاتا ہوں، آپ آرل کی طرف جائیے گا ——"

اور جوتو کا دماغ سن سے ہو گیا۔ یکایک اُسے گوتو اُستاد کی بات یاد آئی۔ —— یا تو مال لے کر آئے گا یا اپنا ٹوٹا ہوا جبڑا —— جوتو مسافروں کو دھکیلتا ہوا تیزی سے گیٹ کی طرف لپکا۔ اس کا دماغ بری طرح کھول رہا تھا —— اس نے باہر نکل کر اسٹیشن کی روشنی میں دیکھا —— وہ شخص بہت دور آگے نکل گیا تھا ——

" گوتو اُستاد اپنے باپ کو بھی بٹھا کر نہیں کھلاتا —— "

اُستاد کو دو سو روپیہ؛ دو سو کیوں دو ہزار روپیہ —— جوتو کے قدم اور بھی تیز ہو گئے ——

اس نے ٹرین میں اتنے اچھے موقع سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا؟ اسی کی طرح جوتو کے بھی دو ہاتھ اور دو پاؤں ہیں، اس سے کونسی

رشتہ داری پیدا ہو گئی جو.....

"خیر بھائی آپ کے آنے سے سہارا مل گیا ہے، رات کا سفر ہے....."

اس کی جان کی حفاظت کرنے کی جوگی کے باپ کو کیا ضرورت تھی ہ ــــ اس نے دیکھا وہ شخص تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اگر استاد کا دو سو روپیہ ڈوب گیا تو اس کی جان ؟ ان لوگوں کے یہاں کوئی لکھا پڑھی نہ ہونے کے باوجود بڑے سخت قوانین اور ضابطے تھے ــــ جوگی کا دل بری طرح دھڑک اٹھا اور خوف کے مارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

جوگی کے قدم اور بھی تیز ہو گئے۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا، پھر بھی وہ بار بار مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ دور دور تک اس سڑک پر کوئی آدمی نہیں تھا۔

اتنی دیر میں وہ شخص ایک بڑے سے گودام کے زینے پر آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور جیب ٹٹول کر چابی یا کوئی اور چیز نکال رہا تھا۔ دور سے ٹری گوپال آئل مل کی آتی ہوئی روشنی میں وہ جگہ نیم تاریک تھی۔

دائیں ہاتھ کو پیٹھ کے پیچھے چھپائے ہوئے جوگی دبے پاؤں جا کر اس شخص کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اور گوزو میاں کا نام لے کر اس نے ہاتھ بلند کر دیا ــــ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی نگاہوں کے سامنے ایک چہرہ آ گیا ــــ اس نے دیکھا چلتی ہوئی ٹرین میں ایک شخص دو ہزار روپیہ لئے ہوئے بے سدھ پڑا سو رہا ہے۔ اور اس اعتماد کے ساتھ سو رہا ہے کہ آدم کی ایک اولاد اس کے ساتھ ہے ــــ

جوگی کا ہاتھ پھر جیب کے اندر چلا گیا۔

تالا کھولنے کے لئے جھکتے ہی وہ شخص پلٹ کر کھڑا ہو گیا

"آپ ــــ ؟"

جوگی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ــــ

"ہاں، میرا مطلب ہے .... وہ راستہ بڑا گندہ ہے، اس لئے اسی راستے پر آ گیا ہوں"

باقی صدیقی

اُدّھا بھائیا

ایک پنجابی لوک کہانی کی منظوم تمثیل

کردار

بادشاہ	پانچ شہزادے
بیگم	اُدھا بھائیا
وزیر	بڑھیا
درویش	حسینہ

راوی

(بادشاہ کا دعا کرنا کچھ عرصے بعد)

بادشاہ: الٰہی تو خالقِ جہاں ہے
ترے کرم کا نہیں ٹھکانہ
مگر مرے واسطے تری رحمتوں کا دروازہ بند کیوں ہے
مری جوانی کٹی تھی جس غم میں
اب بڑھاپا اُسی خلا میں سسک رہا ہے
ترے خزانے میں ایک موتی بھی کیا مرے واسطے نہیں ہے
جو میری ان ظلمتوں کو روشن کرے
مری زندگی اُجالے
میں ایک شاخِ شکستہ کی طرح، زندگی کے درخت سے لٹک رہا
ایک جھونکے کا منتظر ہوں
فنا کے دستِ ستم سے پہلے
بس ایک موتی، بس ایک تارا
جو میرے گرتے ہوئے بڑھاپے کو دے سہارا
الٰہی تو خالقِ جہاں ہے

(آنا وزیر کا)

وزیر: شہنشاہِ عالم
بادشاہ: وزیرِ جہاں گیر کیا ماجرا ہے کہو کیسے آئے
وزیر: شہنشاہِ عالم، نمک خوار کیسے کہے سوچتا ہوں کہیں بہ خاطر، بات میری
بادشاہ: کہو بے دھڑک تم کہو
تم مرے دستِ بازو ہو، تم مرا دل ہو، مرا ذہن ہو، میری تلوار ہو
میرے غم خوار ہو تم
وزیر: شہنشاہِ عالم، عنایت ہے یہ آپ کی
ورنہ میں اس ستائش کے قابل نہیں ہوں
بادشاہ: نہیں میرے بھائی، مرے دل کی آواز ہے یہ
تمہاری وفا کا مرے دل میں احساس ہے

تم کہو، مجھ کو ہر بات کا پاس ہے

وزیر: شہنشاہِ عالم بہت روز سے آپ نے سلطنت کا کوئی کام دیکھا نہیں ہے

یہ اچھا نہیں ہے

بادشاہ: بجا کہہ رہے ہو وزیرِ جہاں گیر

لیکن مرا دل زمانے سے اب بھر گیا ہے

وہ جذبہ، میں جس کے سہارے یہ زندہ تھا اب مر گیا ہے

تمہیں یہ بتاؤ، یہ جاہ و حشم، یہ خزانے، یہ نوکر، یہ لشکر،

یہ تاجِ مرصع، یہ تختِ طلائی ہے کس کام کا

جب کوئی اس کا وارث نہیں ہے

وزیر: شہنشاہِ عالم بجا ہے یہ غم آپ کا

لیکن اِس کی کوئی انتہا بھی،

کوئی چیز ہے مالکِ دو جہاں کی رضا بھی

بادشاہ: یہ سب ٹھیک ہے

میں بھی دل کو یہ اکثر بتاتا ہوں

احسان اُس خالقِ بحر و بر کا جتاتا ہوں

تقدیر کا زنگ، اُس کو دکھاتا ہوں

لیکن یہ دل قعرِ غم سے اُبھرتا نہیں ہے

مجھے کُنجِ دولت میں رہنے دو، نقد برکے رنج سہنے دو،

میرے لئے اب یہی تو سکوں ہے

وزیر: شہنشاہِ عالم مجھے یاد آیا

سُنا ہے کہ دریا کے اُس پار جنگل میں اک مردِ درویش رہتا ہے

جو منہ سے کہتا ہے، وہ ہو کے رہتا ہے

بادشاہ: اچھا!

وزیر: خدا نے اسے وہ کرامات دی ہیں

دعا وہ کرے تو شکستہ شجر با ثمر ہوں

وہ دیکھے نظر اک، تو کوتاہ ایماں بھی اہلِ نظر ہوں

کرے وہ اشارہ تو دریا سے موتی اُچھل کر کنارے پہ آ جائیں

زمیں اپنے سارے خزانے اُگل دے

خزانے ہیں کیا، اپنا محور بدل دے

بادشاہ: یہ سچ ہے تو اُس کو بلاؤ

ابھی جا کے لاؤ

اگر میری اُمید پوری ہوئی تو جو مانگے گا اُس سے سوا دوں گا اُس کو

خزانے کا مالک بنا دوں گا اُس کو

وزیر: شہنشاہِ عالم

یہ کیا آپ فرما رہے ہیں

وہ مردِ قلندر ہے، دولت کی اُس کو ضرورت نہیں ہے

وہ خود ایک دولت ہے اُس کی نظر لعل و گوہر بہ کف تازیانہ ہے

وہ اک خزانہ ہے لیکن سیم و زر کا نہیں، نورِ حق کا

اُسے فقر کی دی ہے دولت خدا نے

کوئی شے نہیں اُس کے آگے خزانے

بادشاہ: تو کیا ہو

وزیر: شہنشاہِ عالم، سلامت رہے آپ کی حکمرانی

کبھی چل کے آتا نہیں ہے پیاسے کے قدموں میں پانی

بادشاہ: بجا کہہ رہے ہو

منگاؤ سبک گام گھوڑے

ابھی میں چلوں گا

میں اس آستانے کی مٹی بھی منہ پر ملوں گا

[بادشاہ اور وزیر کا جانا جنگل کی طرف

قدرت کا نظارہ دیکھ کر خوش ہونا بادشاہ کا]

بادشاہ: وزیرِ جہاں گیر

وزیر: شہنشاہِ عالم

بادشاہ: کیا سہانا سماں ہے

یہ جنگل تو جائے اماں ہے

یہاں کی فضاؤں میں کتنا سکوں ہے

پرندوں کے نغموں میں کتنی جوانی ہے، کتنا فسوں ہے
یہ فطرت کی آغوش، گلشن میں ہنستی ہوئی زندگانی
یہ پھولوں کی خوشبو سے لبریز ٹھنڈی ہوائیں
یہ کہسار کی چوٹیوں سے پھسلتی ہوئی اودی اودی گھٹائیں
یہ دریا کی سیّال چاندی
یہ ہر سمت پھیلی ہوئی سبز مخمل
یہ شاخوں کے ہاتھوں میں شبنم سے لبریز خوش رنگ نازک کٹورے
یہ پتوں میں لپٹے ہوئے نیلے پیلے نگینے •
یہاں کے نظارے ہیں معصوم کتنے
یہاں زندگی کے ہیں مفہوم کتنے
ہم ان سے ہیں محروم کتنے

وزیر: شہنشاہ عالم فضا شہر کے زہر آلود ہو سے بہت دور ہے یہ
یہاں حرص کا تازیانہ نہیں ہے
یہاں کوئی سکہ نہیں، کارخانہ نہیں ہے
یہاں کوئی انسان آتا نہیں، دل دکھاتا نہیں ہے۔
وہاں ہے دھواں اور یہاں چاندنی ہے
وہاں ہے اندھیرا، یہاں روشنی ہے
یہ جنگل نہیں قدرتِ حق کی تصویر ہے شاہِ عالم
یہاں ذرّے ذرّے پہ اک رازِ تحریر ہے شاہِ عالم
یہ جنگل اُسی مردِ درویش کا آستاں ہے

بادشاہ: مگر وہ کہاں ہے

وزیر: وہ دیکھیں، گھنا ڈھپ برگد کے نیچے وہ درویش بیٹھا ہوا ہے
مجسّم محبت، سراپا شفقت

بادشاہ: اُدھر باگ گھوڑے کی موڑ دو

وزیر: شہنشاہ عالم، مناسب ہے اب ہم یہیں چھوڑ دیں اپنے گھوڑے
یہ درویش کا آستاں ہے
یہاں کی زمیں آسماں ہے
یہاں عاجزی کی ضرورت ہے اے شاہِ عالم

(دونوں کا حاضر ہونا درویش کی خدمت میں)

درویش: ہاں

بادشاہ: اک بندۂ ناچیز خدا نے سے ہر طرح کی دولت بخشی
تاج کا زور دیا، تخت کی عزت بخشی
پر نہ بخشا تو وہ معصوم سہارا جسے فرزند کہیں
دل کہیں، دلبند کہیں
بیویاں چھ ہیں، مگر ایک صدف نے مجھے موتی نہ دیا

درویش: (ہونہہ)

بادشاہ: اے شہِ فقر، مرے پاس وہ الفاظ نہیں۔
جو مری روح، مرے دل مری حسرت مرے احساس کی آواز بنیں
میرے آنسو ہی زباں ہیں میری
آستانے پہ بہت دور سے آیا ہوں میں
اس تمنا پہ کہ دنیا کی طرح مجھ کو بھی سوغات ملے
اے شہِ فقر، میں بدبخت ہوں، اک بیٹا خدا سے پاؤں
اس بڑھاپے میں جواں ہو جاؤں
تخت آباد ہو، دل شاد ہو، ہر بات ملے
اس بھکاری کو بھی خیرات ملے

درویش: (ہونہہ)

بادشاہ: اے شہِ فقر، مری عرض، مری بات، مری آس نہ پوری ہوگی؟

درویش: ہوگی!
تیری فریاد خدا نے سن لی
یہ چھڑی لے،
اسے برگد کی کسی شاخ پہ مار!
جس قدر پتے گریں وہ چن لے
وہی پتے تری قسمت ہوں گے
ترے ان اشکوں کی قیمت ہوں گے
تری دولت ہوں گے سن لے

بیویوں کو وہ کھلا دے جا کر
دل سے ہر رنج مٹا دے جا کر
تیری فریاد خدا نے سن لی
لے چھڑی
ہے بہت نیک گھڑی

راوی: شاہ نے اُٹھ کے جو برگد پہ چھڑی وہ ماری
شاخ کی گود سے لہرا کے گرے چھ پتے
سبز چھ پتے زمرد کے نگینوں کی طرح
چل پڑا شاہ وہ مٹھی میں دبا کر پتے
آئینہ خانۂ حیرت میں سجا کر پتے
بدنگاہوں سے بچا کر پتے
دل سے لگا کر پتے
وہ چھ پتے

(بادشاہ کا محل، بیگم کا گفتگو کرنا اپنے آپ سے)

بیگم: یہ پتہ ہے
برگد کا سبز پتہ
یہ پتہ ہے یا میرا بچہ
مرا لال، میری تمنا کا حاصل
مری جاں، مرا دل
شہنشاہِ عالم بھی سادہ ہیں کتنے
یہ پتہ بدل دے گا تقدیر کیسے
یہ پتہ مجھے دے گا توقیر کیسے (کچھ سوچ کر)
مگر شاہ کہتے ہیں
تحفے ہیں یہ ایک درویش کے آستاں کے
ہماری طرح کے کئی لوگ جاروب کش ہیں جہاں کے
تو کیا میں بھی کھاؤں یہ پتہ
"غزالہ" نے کھایا
"دلآرا" نے بھی؛
"شگفتہ" نے بھی کھا لیا ہے
"دلآرام" بھی کھا چکی ہے
"زمرد" کو بھی میں نے دیکھا ہے کھاتے
تو میں کیوں نہ کھاؤں
عجب کیا، خدا میری سنسان گودی کی آواز سن لے
یہ پتہ میں کھا لوں
مگر ایسی جلدی بھی کیا ہے میں پہلے نہا لوں
مرے بال بکھرے ہوئے ہیں بنا لوں
یہیں رکھ دوں اس کو

(بیگم کا نہا کر آنا اور آئینے میں اپنا عکس دیکھنا)

بیگم: آج کیا بات ہے کیوں عکس مرا غیر نظر آتا ہے
آئینہ کیا مجھے سمجھاتا ہے

میں جواں ہوں، ابھی احساس میں کس بل ہے وہی
رخ پہ سونا ہے وہی، زلفوں میں کاجل ہے وہی
آنکھ میں ضو ہے وہی، ہونٹوں کا شربت ہے وہی
ناز میں نشہ ہے وہی، نشہ میں شرارت ہے وہی
میری صبحوں میں ابھی شام کے آثار نہیں
میری سانسوں سے ابھی لوہا پگھل سکتا ہے
میری رفتار کی گرمی سے ابھی راستہ جل سکتا ہے
پھر یہ کیا باعث ہے ہر شے مجھے حیران نظر آتی ہے
کیوں مری بلی بڑے غور سے تکتی ہے مجھے
میری مینا بھی عجب طور سے تکتی ہے مجھے
کچھ نہیں یونہی تصور ہے مرا
یہ تماشا تو مقدر ہے مرا
ختم ہو جائے گا یہ دورِ گراں یا کسی طرح سے غم کو ٹالوں
یاد آیا، میں وہ پتہ کھا لوں
(تیز تیز جانا)

(حیرت سے) یہ پتہ تو آدھا ہے
کس نے آدھا کھایا ہے
کیوں ری مانو
کون یہاں آیا ہے
کیوں ری مینا
میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو
بولو
کس کی کارستانی ہے یہ
میرے اللہ اب کیا ہوگا
اب کیا ہوگا
ایسا بھی ہو سکتا ہے معلوم نہیں تھا
میں نے کی تاخیر
مگر تاخیر کا یہ مفہوم نہیں تھا
میرے اللہ اس غفلت پر نادم ہوں میں
تیرے سچے درویشوں کی خادم ہوں میں
تو ہی جانے اس پتے میں راز ہے کیا
تو ہی دانا
تو ہی بینا
تو ہی جانے، کس کارن یہ بات ہوئی ہے
رکھنا میری عزت رکھنا
ورنہ میری خالی گود مجھے کھائے گی
میں آدھا ہی پتہ کھا لیتی ہوں

راوی: جاگ اٹھا شاہ کا بخت آخر کار
رحمتِ حق کے کھلے دروازے
ایک بیٹے کی تمنا تھی، ہوئے چھ بیٹے
پانچ مضبوط و خوش اندام مگر اک بیٹا
آدھے پتے کا صلہ

پھر بھی ماں خوش تھی کہ بیٹا تو ملا
جب ہوئے سارے جواں
سب سے ہنستا رو وہ بونا نکلا
سب جسے نابا سمجھتے تھے وہ سونا نکلا
شہ اسے دیکھ کے خوش ہوتا تھا
بھائی بھی اس کو سمجھتے تھے عزیز،
اور کہتے تھے اسے پیار سے "آدھا بھائیا"

(خطاب کرنا بادشاہ کا بیٹوں سے)

بادشاہ: مرے عزیزو، مرے سہارو
میں آج تم سے وہ بات کہتا ہوں
جو میری زندگی کا حاصل ہے، میرا مقصد ہے
جس کی خاطر خدا سے مانگا ہے میں نے تم کو
بتاؤ تم کون ہو، تمہاری حیات کیا ہے
مجھے تمہاری تھی کیا ضرورت، میں کس لئے تم کو چاہتا تھا
میں کس لئے تم کو چاہتا ہوں
خدا نے جس کے لئے تمہیں زندگی عطا کی، وہ بات کیا ہے

پہلا شہزادہ: ہے مرے دم سے ہر اک شے کا شعور
ہے مری ضو سے جہاں تابندہ
میں نہ ہوتا تو نظر کیا آتا
کوئی تصویر نہ بنتی نہ تصور ہوتا
پاؤں کس کس کو ٹٹولا کرتے
ہاتھ اندھے کا کہاں تک جاتا

دوسرا شہزادہ: مجھ سے الفاظ میں جاں
مجھ سے احساسِ دل و جاں گویا
مجھ سے ہر بات میں معنی آئے
میں نہ ہوتا تو جہاں گنبدِ بے در کی طرح چپ ہوتا
ہے ہر اک لب پہ کہانی میری
بات ہوتی ہے زبانی میری

تیسرا شہزادہ: مجھ سے آواز کا احساس ہوا
میں نے ہر بات کا رشتہ جوڑا
مجھ سے ہر ایک صدا ہے زندہ
ساز ہے زندہ، نوا ہے زندہ
میں نہ ہوتا تو حیات اپنی خبر کیا پاتی
اپنی آواز نہ خود تک آتی

چوتھا شہزادہ: مجھ سے لذت کا تصور ہے
ہر اک شے کا مزا ہے مجھ سے
قند اور زہر کا احساس دلایا میں نے
میں نے چکھا تو جہاں نے کھایا
تنا حاوی دل و جاں پر ہوا ہے
بات کی طرح زباں پر ہوں میں

پانچواں شہزادہ: میں تصور میں نہ آؤں نہ بیاں میں آؤں
صرف احساس ہی احساس ہوں میں
بو ہے نفرت مری، خوشبو ہے محبت میری
میں نہ ہوتا تو بہار
کاغذی پھول کی مانند نظر تک رہتی
اپنی خوشبو سے کلی کیا کہتی

اُدھا بھائیا: اُدھا بھائیا میرا نام
جتنا سمجھو، اتنا ہوں میں
جتنا جانو اُتنا طاق
ہر اک بات سے بات نکالوں
جتنا تیز اُتنا چالاک
سوچ کے چلنا میرا کام
اُدھا بھائیا میرا نام
ذہن ہے میرے حکم کے تابع
دل ہے میرا واقفِ حال
میرے دم سے حسنِ سیاست
مات مرے آگے ہر چال
عشق نہ سمجھے میرے دام
اُدھا بھائیا میرا نام

بادشاہ: مرے عزیزو، مرے سہارو
تمہارے احساس سے ہے میرا وجود زندہ
جو تم نہ ہوتے
تو میں زمانے کے ہاتھ میں ایک لاش ہوتا
تمہیں سے میں نے حیات پائی
تمہیں سے مجھ کو بقا ملے گی
تمہارے دم سے ہے میری ہستی
تمہاری رفعت ہے میری رفعت
تمہاری پستی ہے میری پستی
خیال رکھنا
یہ کارگاہِ جہاں ہے پردہ کسی جہاں کا
قدم قدم پر نئی اداؤں سے سامنے آئے گی یہ دنیا
کبھی خوشی کے چراغ لے کر
کبھی ہوس کے حسین و گلرنگ ایاغ لے کر
نہ حد سے بڑھنا
نہ پردۂ رنگ و بو پہ جانا
نہ دل کی ہر آرزو پہ جانا
کہ زندگی صرف حسنِ دیوار و در نہیں ہے
ہر ایک پردہ اُٹھا کے تکنا
یہاں نگاہ میں لاگ ہوگی
یہاں گلوں کے شگفتہ رنگوں میں آگ ہوگی
کرم کے پردے میں قہر ہوگا
نبات کی تہہ میں زہر ہوگا
جہاں کے رنگوں میں رنگ اپنا تلاش کرنا

جو خود کو پایا تو جیت ہوگی
دگرنہ ہار، اور بڑی ندامت

مرے عزیزو،
جو مجھ کو کہنا تھا کہہ دیا ہے
تم اب بہارِ حیات دیکھو
کھلے ورق کی طرح جہاں ہے تمہارے آگے

[سیر کے لئے جانا شہزادوں کا،
ایک باغ سے گانے کی آواز کا آنا]

راہی آ۔

اے میرے متوالے راہی آ
کس نگری سے آیا ہے تو
کیا سندیسہ لایا ہے تو
اپنے دل کی بات بتا، راہی آ

بھر دوں گی میں دل کا کاسہ
کیوں پھرتا ہے پیاسا پیاسا
حُسن کی شبنم پیتا جا، راہی آ

نگر نگر میری خوشبو ہے
میرے ہر جلوے میں تو ہے
پاس تو آ کے دیکھ ذرا، راہی آ

کیوں ہٹ ہٹ کے چلتا ہے تو
اپنی دھوپ میں جلتا ہے تو
آ میری آغوش میں آ، راہی آ

میری نظر دل کے پٹ کھولے
میں بولوں تو پتھر بولے
تو بھی کوئی بات سنا، راہی آ

[آواز سن کر شہزادوں کا حیران ہونا
اور آپس میں گفت گو کرنا]

تیسرا شہزادہ: مرے بھائی دیکھو یہ کیسی صدا آئی
جیسے کوئی نغمہ مرمریں چاند تاروں کے ساز وں سے
رِستا ہوا آ رہا ہے
فضاؤں میں کلیاں چٹکتی ہیں، سکوں کی جھنکار ہے
یا کوئی جل پری گا رہی ہے
گلے میں ہے ریشم کا لوچ اور آواز میں ساغروں کی کھنک ہے
مری رُوح پر تو نشہ چھا رہا ہے

پہلا شہزادہ: مرے بھائی سچ کہہ رہے ہو
یہ نغمہ تو بہتی ہوئی چاندنی ہے
یہ نغمہ تو ہنستی ہوئی زندگی ہے
یہ نغمہ پُراسرار خوابوں کی جاں ہے
یہ نغمہ تو میری نظر بن گیا ہے
میں اس میں ستاروں کی اُجلی جوانی کی نمو دیکھتا ہوں
یہ نغمہ نہیں، موسمِ گل کے رنگوں کی آواز ہے یہ
یہ نغمہ مری رُوح پر نور برسا رہا ہے

پانچواں شہزادہ: یہ آواز اُس باغ سے آ رہی ہے
ہے نغمے میں پھولوں کی خوشبو، شگوفوں کی سانسیں، صبا کی لطافت
حِنا کی مہک اور کلی کا پسینہ
اسی کے ہے احساس کا نام جینا
یہ نغمہ مری رُوح میں بُوئے گُل کی طرح بس گیا ہے
یہ نغمہ مجھے اجنبی راستوں پر لئے جا رہا ہے

چوتھا شہزادہ: یہ نغمہ عجب ہے
یہ نغمہ تو موجِ طرب ہے
یہ نغمہ تو ہے شہد کی طرح میٹھا
یہ نغمہ تو امرت کی لہریں، جوانی کا بھرپور نشہ ہے،
حوروں کے ہونٹوں کا رس ہے
یہ نغمہ تو لذت ہی لذت ہے مستی ہی مستی ہے، حیرت ہی
حیرت ہے

میری رگوں میں کسی ریشمی جسم کے مس کی طرح لہرا رہا ہے

دوسرا شہزادہ: یہ نغمہ تو رنگیں کہانی، شگفتہ فسانہ، مرصع غزل ہے
یہ نغمہ تو جنت کا نعم البدل ہے
یہ نغمہ دھڑکتے دلوں کی حسیں گفتگو ہے
یہ نغمہ محبت کا اظہار ہے
میرے ہونٹوں پہ نام اس کا تحریر ہوتا چلا جا رہا ہے

اُدھا بھائیا: مرے بھائیو تم بجا کہہ رہے ہو
مگر اپنی حد سے نہ گذرو
نہ نظروں کے دھوکے میں آؤ
نہ لذت پہ جاؤ
نہ خوشبو پہ ایمان لاؤ
نہ لفظوں کا قصہ بناؤ
نہ آواز پر ڈگمگاؤ

ہماری یہ منزل نہیں ہے
ہمیں اس سے آگے ہے جانا
ہمارا ہے اوجِ ثریا سے آگے ٹھکانا
یہ نغمہ تمہاری تمنا کے احساس تک ہے
بس اک عارضی سی چمک ہے

پانچوں شہزادے: نہیں اُدھا بھائیا
ہمیں اجنبی سرزمیں کی بہاروں نے آغوش میں لے لیا ہے
ہمیں اس میں گھلنے دو، ملنے دو، بسنے دو، اور اس کے نزدیک ہونے دو
ہم اس مسرت کی اب انتہا چاہتے ہیں

(شہزادوں کا باغ کی طرف جانا
حسینہ کا استقبال کرنا)

حسینہ: آؤ آؤ مرا گھر بار نچھاور تم پر
یہ زر و سیم کے انبار نچھاور تم پر
میں تمہاری ہوں، تمہارا ہے ہر اک رنگ مرا
مری خوشبو، مرے جلوے، مرے انداز تمہارے ہیں سب
مرے نغمے، مری آواز، مرے ساز تمہارے ہیں سب
مری بانہیں، مری گھاتیں، مرے اعجاز تمہارے ہیں سب
گیت بن جاتا ہے ہر گام یہاں
ہر مسافر کو نئی زیست عطا کرتے ہیں
میرے ہونٹوں کے حسیں جام یہاں
غمِ جاں کیا، غمِ دنیا کیسا
زندگی عیش کا ہے نام یہاں
آؤ آؤ مری آغوش میں خوشبو کی طرح کھو جاؤ
آؤ آؤ مرے رنگوں پہ زباں رکھ کے امر ہو جاؤ
لوریاں دیں گی ہوائیں مری، سو جاؤ
سو جاؤ، سو جاؤ

(شہزادوں کا سو جانا
اور حسینہ کا روپ بدلنا)

بڑھیا: یہ سب سو گئے ہیں
یہ سب میری دلکش اداؤں کے طوفان میں کھو گئے ہیں
یہ میرے پرستار ہیں
میری ہنستی ہوئی روشنی کے خریدار ہیں
یہ مرغن غذاؤں سے پالے ہوئے جسم میرے ہیں اب
یہ جوانی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم میرے ہیں اب
ان کو میش و طرب کا مزا اب چکھاؤں گی میں
ان کے تکے بناؤں گی میں

(چھری تیز کرنا)

ادھا بھائیا: میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں
وہ حسینہ ہے کہاں
رنگ و بو کا وہ سفینہ ہے کہاں
کیا ہمیں رہ سے ہٹانے کے لئے

ایک ڈائن نے حسین روپ بدل رکھا تھا
کیا وہ ہر رنگ، وہ ہر نغمہ وہ ہر کیف، وہ ہر جلوہ بس اک دھوکا تھا
جال میں آ گئے آخر بھائی
شکل کتنی ہے بھیانک اس کی
جیسے خونخوار درندہ کوئی
سان پر کیسے لگاتی ہے چھری
اِس کی نیت نظر آتی ہے بُری
اِس کے پھندے سے بچیں اب کیسے

ادھا بھائیا: بڈھی مائی کے ٹنکیندی کے طیندی ادھا بھائیا جاگدا
بڑھیا (اپنے آپ سے): کون بولا ہے کدھر سے یہ صدا آئی ہے
کیا مجھے دیکھ رہا ہے کوئی
کھڑکیاں بند ہیں، در بند ہے
یہ لوگ بھی خاموش ہیں
ہاں! نیند میں مدہوش ہیں
پھر کون تھا یہ کس کی صدا آئی ہے

اُدھا بھائیا: بڑی بی یہ کیا ہو رہا ہے
بڑھیا: ارے تم
ابھی تک تمہیں نیند آئی نہیں کیا
اُدھا بھائیا: بڑی بی تمہارا یہ گھر ایک جنت ہے
لیکن یہ پہلی ہے پردیس میں رات میری
بہت کی ہے سونے کی کوشش مگر نیند آتی نہیں ہے
مجھے اپنی ماں یاد آئی
وہ دیتی ہے اس وقت چاول پکا کے
مَیں سوتا ہوں کھا کے
بڑھیا: تو یہ کون سی بات ایسی ہے بیٹا
یہ گھر بھی تم اپنا ہی سمجھو
مرے گھر میں ہر چیز موجود ہے

میں ابھی تم کو دیتی ہوں چاول پکا کے
مرا بیٹا سوئے گا کھا کے

(بڑھیا کا چاول پکانا)

بڑھیا: یہ لو میرے بیٹے
اُدھا بھائیا: بہت نیک ہو تم بڑی بی
ہزاروں میں بس ایک ہو تم بڑی بی
بہت اچھے تم نے پکائے ہیں چاول

(چاول کھا کے ادھے بھائیا کا خموش ہو جانا)

بڑھیا: سو گیا یہ بھی چلو بات بنی
سب سے پہلے میں اِسی سے نپٹوں
پھر نہ جاگ اُٹھے کہیں
اِس کی نظریں بڑی تیکھی تھیں

(چھری تیز کرنا)

اَدھا بھائیا: بڈھی مائی کے طیندی کے ٹنکیندی اَدھا بھائیا جاگدا
بڑھیا: ارے تم ابھی تک نہیں سوئے
کیا ماجرا ہے
اَدھا بھائیا: بڑی بی مری نیند پھر اُڑ گئی ہے
مجھے یاد آیا
مری ماں پلاؤ کے کچھ بعد دیتی ہے حلوہ پکا کے
میں سوتا ہوں کھا کے
بڑھیا: بڑے تم چٹورے ہو بیٹا
مگر خیر! تم میرے مہمان ہو
اور مہمان ہوتا ہے رحمت خدا کی
مرے پاس سوجی ہے، چینی ہے، گھی ہے
ابھی تم کو دیتی ہوں حلوہ پکا کے
مرا بیٹا سوئے گا کھا کے

(بڑھیا کا حلوہ پکانا)

یہ لو میرے بیٹے
میں حلوہ بھی لائی

اَدھا بھائیا: بڑی بی بہت نیک ہو تم
ہزاروں میں بس ایک ہو تم
رہے گی مجھے یاد مہماں نوازی تمہاری

(اَدھا بھائیا کا حلوہ کھانا اور لیٹ جانا)

بڑھیا: کیا مصیبت ہے یہ اَدھا بھائیا
سو گیا ہوگا یہ مردود اب تو
میرا بر آنے کا مقصود اب تو
میں کیا اب اِس کے بتاتی ہوں ابھی
حلوے مانڈے کا مزا اس کو چکھاتی ہوں ابھی

(پھر چھری تیز کرنا)

اَدھا بھائیا: بڈھی مائی کے ملیندی کے لشکیندی اَدھا بھائیا جاگدا

بڑھیا: (اپنے آپ سے) یہ مردود تو جاگتا ہے
خدا جانے کب نیند آئے گی اس کو
(بلند آواز سے) ابھی تک نہیں سوئے تم کیا

اَدھا بھائیا: بڑی بی مجھے یاد آیا کہ حلوہ کھلا کے
مری امی دریا سے چھلنی میں لا کر پلاتی تھی پانی
یہ عادت ہے میری بہت ہی پرانی
وہ پانی میں پیتا ہوں تب نیند آتی ہے مجھ کو

بڑھیا: بہت اچھا بیٹا
تمہارے لئے یہ بھی کر دیکھتی ہوں
تمہیں میں بھی ماں کی نظر دیکھتی ہوں
تمہارے لئے جا کے لاتی ہوں پانی
سدا یاد آئے گی تجھ کو مری میزبانی

میں جاتی ہوں دریا کنارے
ابھی تو بہت وقت ہے صبح میں
جاگتے ہیں ابھی آسماں پر ستارے

(بڑھیا کا دریا کے کنارے جانا)

راوی: چھوڑ کر تیز چھری، ہاتھ میں چھلنی لے کر
گھر سے بجلی کی طرح نکلی بڑی بی آخر
منہ میں کف، آنکھ میں خوں، دل میں غضب اور بدن میں لرزہ
اوج پر آگئی تقدیر ہوس کی آخر
خود سے لڑتی ہوئی پس ماندہ مسافر کی طرح
جس کی خواہش کو کچل دے کوئی
جس طرح لوہے کو بل دے کوئی
پیچ کھاتی لبِ دریا آئی
پر بھرے چھلنی میں پانی کیسے
آئے قابو میں روانی کیسے
جب بھرے پانی، وہیں رہ جائے
اِس طرف روکے، اُدھر بہہ جائے
تا سحر یونہی وہ بھرتی رہی، بل کھاتی رہی
پر نہ اک قطرہ بھی چھلنی میں ٹھہرنے پایا
حرص کا دامنِ صد تار نہ بھرنے پایا
کام اُدھر کر گیا اَدھا بھائیا
کر دیا راہ کے خطرے سے خبردار جگا کر سب کو
لے گیا موت کے چنگل سے بچا کر سب کو

بڑھیا کی چیخیں اور
دریا کی تیز موجیں

(ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے نشر ہوا)

میرزا ادیب

گود

ایک تمثیل ـــــ دو منظر میں

افرادِ تمثیل!

صفدر ــــــــــ
بیگم ــــــــــ
فضل ــــــــــ
بڑھیا ــــــــــ
عورت ــــــــــ

پہلا منظر

سٹیج کسی کوٹھی کا ایک ایسا کمرہ پیش کر رہی ہے جس کا سامان ابھی بے ترتیبی سے بکھرا پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سارا سامان آج ہی یہاں منتقل ہوا ہے اور اسے ترتیب کے ساتھ رکھنے میں کچھ وقت لگے گا۔

ایک طرف چند کرسیاں تپائیاں۔ تصویریں۔ لپٹا ہوا ایک قالین، پردے، گلدان اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پڑی ہیں۔

کمرے کے وسط میں ایک کوچ۔ پاس ایک چھوٹی میز۔

دائیں طرف کا دروازہ باہر کھلتا ہے۔ اس دروازے کو بیرونی دروازہ کہا جائے گا اور دوسرا دروازہ جو دائیں دیوار میں ہے۔ کمرے کے کسی اور کمرے کے سامنے واقع ہے۔

وقت: خزاں کا ایک دن۔ تیسرا پہر شروع ہو چکا ہے۔

سامنے کمرے میں جو کھڑکی ہے اُس میں دُھندلی فضا کے پیش منظر ایک درخت کا کوئی حصہ دکھائی دیتا ہے۔ پتے مسلسل گر رہے ہیں۔

سٹیج پر صرف صفدر کوچ کے پاس کھڑا ہے۔

دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ادھ جلا سگرٹ۔ لباس پتلون قمیص۔ عمر چالیس سے اوپر اور غالباً پینتالیس سے کم۔ چہرے پر سنجیدگی جو اس کے حقیقت پسند اور غیر جذباتی ہونے کا اظہار کر رہی ہے۔ نگاہیں سامان پر جمی ہوئی۔ شاید اس بات پر غور کر رہا ہے کہ کون سی چیز کہاں رکھی جائے گی اور کمرے کی آرائش و تزئین کس انداز میں ہوگی۔

اندرونی دروازے سے فضل آتا ہے۔ ہاتھ میں ٹرے جس میں چائے اور پلیٹ میں کچھ بسکٹ۔ فضل اندر آکر ٹرے میز پر رکھ دیتا ہے۔

(صفدر اسے آتے دیکھ کر سگرٹ فرش پر پھینک کر اسے بوٹ سے مسل دیتا ہے۔ فضل چائے کی پیالی اٹھانے لگتا ہے۔)

صفدر: فضل!

فضل: (چائے کی پیالی دیتے ہوئے) جی

صفدر: تم — اِن — بی بی کیا کر رہی ہیں؟

فضل: صحن میں ہیں۔

(فضل بسکٹوں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتا ہے)

صفدر: آج ہوا کافی تیز ہے

فضل: (کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے) بند کر دوں؟

صفدر: (اپنے خیال میں) صحن کی حالت تو بڑی خراب معلوم ہوتی ہے۔

(پلیٹ سے ایک بسکٹ نکال کر منہ میں ڈالتا ہے)

فضل: حالت یہ ہے میاں جی کہ ہاتھ لگاؤ تو چونا گرنے لگتا ہے۔

صفدر: شکر کرو کوئی اینٹ نہیں گر پڑتی۔ بڑی پرانی کوٹھی ہے۔

فضل: مرمت ہوگی میاں جی!

(فضل بسکٹوں کی پلیٹ ٹرے میں رکھ دیتا ہے)

صفدر: ہوگی ہونی چاہیئے اور بہت جلد ہونی چاہیئے۔ اس کے بغیر تو یہاں رہنا محال ہے۔ اس کمرے کے سوا باقی سب کی دیواریں بڑی خراب ہیں

(صفدر دائیں دیوار کی طرف جاتا ہے اسے غور سے دیکھتا ہے بائیں ہاتھ میں پیالی تھام کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اسے چھونے لگتا ہے
اندرونی دروازے سے بیگم آتی ہے عمر تیس کے لگ بھگ قمیص شلوار اور دوپٹے میں ملبوس۔ چہرے پر ملائمت جو اس کے
کسی قدر جذباتی ہونے کی علامت ہے ہاتھ میں پیالی)

بیگم: کیا دیکھ رہے ہیں آپ!

صفدر: (اسی حالت میں) یہ کمرہ قدرے بہتر ہے۔

بیگم: فضل دیکھنا سٹوو بند کر دیا ہے یا نہیں!

(فضل اندرونی دروازے سے چلا جاتا ہے۔ صفدر چائے کے دو گھونٹ پی کر بیوی کی طرف بڑھتا ہے)

صفدر: کوٹھی اچھی ہے مگر مرمت کے بغیر بے کار ہے۔

بیگم: صحن والا حصہ کچھ خراب ہے

صفدر: وہ تو کھنڈر ہے — کھنڈر

بیگم: اچھی بھلی کوٹھی ہے، کھنڈر کہاں ہے۔

صفدر: تمہیں کھنڈر اچھا معلوم ہوتا ہے — کیا کرتی رہی ہو صحن میں۔

بیگم: کیا کرتی رہی ہوں ــ آج ہوا تیز ہے نا؟

صفدر: ہاں خزاں کی تیز ہوا چل رہی ہے!

بیگم: ہوتا یہ ہے کہ ہر پانچ منٹ کے بعد صحن پتوں سے بھر جاتا ہے۔ تین مرتبہ صفائی کر چکی ہوں۔ گر پتے ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

صفدر: خزاں میں یہی کچھ ہوتا ہے

بیگم: بے تحاشا پتے گر رہے ہیں اب تک ہزاروں کی تعداد میں گر چکے ہوں گے، بے چارے۔

صفدر: کون؟

بیگم: یہی پتے اور کون!

صفدر: پتوں کا بڑا خیال ہے تمہیں:

بیگم: سوچتی ہوں جو پتے شاخوں سے بکھر گئے ــــ وہ بچھڑ گئے۔ اب کبھی اپنی ماں کی گود میں واپس نہیں جا سکتے جھونکے انھیں اڑا کر کہاں سے کہاں لے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک المیہ ہے۔

صفدر: المیہ ہے؟

بیگم: اور کیا!

صفدر: بہر حال اس المیے یا مسئلے پر غور کرنا ہمارا کام نہیں ہے، اس کا کام ہے جس نے درخت پیدا کئے ہیں۔ ہمارا مسئلہ اس سے مختلف ہے

بیگم: ہمارا مسئلہ:

(صفدر کو یک لخت چائے کا خیال آتا ہے جلدی جلدی باقی گھونٹ پی کر پیالی ٹرے میں رکھ دیتا ہے)

صفدر: چائے کو شربت بنا کر پینا چاہتی ہو کیا؟

بیگم: اوہ ــ واقعی ٹھنڈی ہو گئی ہے

صفدر: گرم کروا لو ــ

بیگم: نہیں

(بیگم پیالی ٹرے میں رکھ دیتی ہے)

کیا کہا ہے آپ نے؟

صفدر: میں اپنے مسئلے کے متعلق بات کر رہا تھا ــــ ہم نے یہ کوٹھی خریدی ہے اور اس لئے خریدی ہے کہ اس میں ہمیں رہنا ہے۔

بیگم: ٹھیک ہے۔

صفدر: تو اسے رہنے کے قابل بنانا کس کا کام ہے؟

بیگم: ظاہر ہے یہ کام ہمارا ہے

صفدر: تو پھر ہمیں اس مسئلے پر سوچنا چاہیئے۔ پیسے سارے کے سارے کوٹھی کے خریدنے پر اٹھ گئے۔ مرمت کے لئے بھی معقول رقم چاہیئے اور اس کا فوراً انتظام ہونا چاہیئے۔

بیگم: کیا سوچا ہے آپ نے؟

(صفدر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالتا ہے۔ سگریٹ سلگاتا ہے اور اس کے دو کش لیتا ہے)

صفدر: انتظام ہو گیا ہے!

بیگم: وہ کیسے؟

صفدر: وہ اس طرح کہ کوٹھی نے اپنی مرمت کی ذمے داری خود اٹھالی ہے

بیگم: کچھ سمجھ نہیں سکی۔ (صفدر مسکرا کر بیوی کو دیکھتا ہے، بیوی کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمودار ہوتے ہیں)

صفدر: جس پیڑ کے پتوں سے تم اس قدر پریشان ہو گئی ہو۔ اسے ایک صاحب خرید رہے ہیں بلکہ خرید چکے ہیں۔

بیگم: خرید چکے ہیں!

صفدر: انھیں فرنیچر کے لئے لکڑی کی ضرورت ہے۔ ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ اور پیڑ لگوا لیں گے۔

بیگم: (جذباتی انداز میں) ہائے نہ

صفدر: وہ کیوں؟

بیگم: اچھا لگتا ہے۔

صفدر: اچھا کیا لگتا ہے بڑا پرانا اور کھوکھلا درخت ہے۔

بیگم: پھر بھی!

صفدر: پھر بھی کیا؟

بیگم: اس کی شاخوں میں ایک عجیب طلسم ہے، ایک عظمت ہے۔

صفدر: عظمت؟ بیگم! اس بوڑھے درخت میں کیا عظمت ہو گی؟

بیگم: آپ محسوس نہیں کرتے — میں کرتی ہوں!

صفدر: اب اس کی عظمت دیکھیں یا کوٹھی کی مرمت کا خیال کریں۔

بیگم: میں تو یہی کہوں گی۔ اس کا برا نہ مانئے، چند روپے نہ بھی ملیں تو کیا حرج ہے؟

صفدر: ہمارے پاس مرمت کے لئے فالتو پیسے ہیں کیا؟

بیگم: اور کوئی انتظام نہیں ہو سکتا؟

صفدر: جب آسانی سے انتظام ہو جائے تو دردسری کی کیا ضرورت ہے؟

بیگم: آپ ذرا اس کے نیچے جا کر دیکھیں تو سہی، ہر طرف شاخیں پھیلی ہوئی ہیں — جھکی ہوئی ہیں، جیسے یہ اپنے ہاتھ آپ کی طرف بڑھا رہا ہے:

صفدر: کیا قصہ لے بیٹھی ہو بیگم! اس آدمی نے میرے سامنے آرہ کش سے بھی کہہ دیا تھا اور وہ شاید آتا ہی ہو گا:

بیگم: آرہ کش سے بھی کہہ دیا ہے؟

صفدر: اور کیا! — وقت کیا ہو گا؟

(کلائی کی گھڑی دیکھتا ہے)

اسے اب تک آجانا چاہیئے تھا۔

بیگم: کس کو؟

صفدر: اسی آرہ کش کا ذکر کر رہا ہوں:

(بیگم خاموش رہتی ہے۔ صفدر اس کی ذہنی کیفیت محسوس کر لیتا ہے)

بیگم: اس معاملے میں خواہ مخواہ جذباتی بن رہی ہو۔ اگر تم نے خود اسے اپنے ہاتھ سے لگایا ہوتا تو بات بھی تھی اب تمہارا اس سے کیا واسطہ!— اچھی خاصی رقم مل رہی ہے۔ مفت میں کوٹھی کی مرمت ہو جائے گی۔ ہمیں کوئی تردد نہیں کرنا پڑے گا۔

(فضل آتا ہے)

فضل: ایک بڑھیا آئی ہے۔

صفدر: بڑھیا؟

بیگم: بھیج دو اُسے — پتا نہیں کون ہے؟

(دونوں میاں بیوی بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ دروازے پر ایک بوڑھیا آتی ہے شلوار اور پھول دار کرتے میں ملبوس۔ آنکھوں پر عینک۔ دائیں ہاتھ میں لاٹھی شکل سے معلوم ہوتا بیمار ہے۔ باتیں کرتے وقت کھانستی رہے گی)

بیگم: آؤ اماں:

(بوڑھیا وہیں کھڑی رہتی ہے)

صفدر: کیا بات ہے مائی!

بوڑھیا: آپ لوگ آئے ہیں کوٹھی میں

صفدر: ہاں!

بیگم: اندر آجاؤ نا اماں!

بوڑھیا: اچھا — مہربانی!

(بوڑھیا اندر آنے لگتی ہے)

اللہ مبارک کرے۔ جیو، پھلو، پھولو! او —

(بوڑھیا کھانستی ہے)

بیگم: بیٹھ جاؤ!

بوڑھیا: مہربانی!

(بوڑھیا ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

صفدر: کہاں سے آئی ہو مائی؟

بوڑھیا: یہیں سے بیٹا!

صفدر: یہیں سے کیا مطلب؟

بیگم: اماں آپ یہیں کہیں رہتی ہیں؟

بوڑھیا: ہاں پیچھے کھیتوں کے پاس جو مکان ہیں ان میں چھوٹی اینٹوں کا جو ہے — اس میں رہتی ہوں۔

بیگم: اچھا اماں! آپ ہماری ہمسائی ہوئیں

صفدر: یہاں کیسے آئی ہو؟

بوڑھیا: آپ وہ پیڑ کٹوانے لگے ہیں؟

صفدر: ہاں مائی! پاس رہنے والے لوگوں کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ان کے گھروں میں دھوپ نہیں جا سکتی۔ سب کو بڑی شکایت ہے۔

بوڑھیا: پر پہلے تو کبھی کسی نے کچھ نہیں کہا!

صفدر: ہم سے لوگ کہہ رہے ہیں!

بوڑھیا: اچھا (کھانستی ہے)، ہائے اللہ! — کن — لوگوں نے کہا ہے

صفدر: جن کو تکلیف ہوتی ہے۔

بوڑھیا: اب انہیں تکلیف ہونے لگی!

بیگم: اماں! تم کیا چاہتی ہو؟

بوڑھیا: میں تو چاہتی ہوں یہ پیڑ نہ کاٹا جائے بی بی!

بیگم: اچھا اماں! نہیں کٹوائیں گے! پر اماں! تم یہ چاہتی کیوں ہو؟

(صفدر سگریٹ کے کش لے لے کر دیواروں کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ بیگم بوڑھیا سے باتیں کرے گی اور وہ پہلے دائیں دیوار کے پاس جائے گا اور پھر بائیں دیوار کے پاس)

بوڑھیا: کیا بتاؤں بی بی!

بیگم: تمہیں یہ پیڑ پیارا لگتا ہے؟

(بوڑھیا کھانستی ہے اور ساتھ ہی اثبات میں سر ہلانے کی کوشش بھی کرتی ہے)

بیگم: کیوں پیارا لگتا ہے؟

بوڑھیا: جب میری شادی ہوئی اور میں یہاں آئی تو یہ ایک پودا تھا

بیگم: تم یہاں آتی تھیں؟

بوڑھیا: کیوں نہیں۔ اس وقت اس کوٹھی میں بڑے ہی اچھے لوگ رہتے تھے۔ میرا گھر والا ان کا باورچی تھا۔ میں بھی ان کا کام کاج کر دیتی تھی، اس باغ میں گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ اس زمانے میں اتنی آبادی نہیں ہوئی تھی۔ کوٹھی اور میرے گھر کو ایک ہی راستہ جاتا تھا۔

بیگم: تو یہ پودا تمہارے سامنے درخت بنا؟

بوڑھیا: ہاں! وہ لوگ ولایت چلے گئے تو نئے لوگ آ گئے۔ وہ بھی بڑے اچھے تھے۔ میں دیر تک اس کے نیچے بیٹھ کر لوگوں کے کپڑے سیا کرتی تھی

(بوڑھیا کھانستی ہے)

آس پاس جتنے لوگ رہتے ہیں ان کے بچے تو اس کے نیچے کھیلا کرتے ہیں۔ وہ خود بھی جب بچے تھے تو یہیں کھیلتے تھے۔

بیگم: اماں! بس یہی بات کہنے آئی تھیں؟

بوڑھیا: پتا نہیں مجھ سے کس نے کہا کوٹھی والے اب پیڑ کٹوانے والے ہیں مجھے بڑا دکھ ہوا۔ بڑی مشکل سے چل کر آئی ہوں! — بیمار ہوں بی بی!

بیگم: اوہو!

بوڑھیا: بے چارا پیڑ کیا لیتا ہے کسی سے!

بیگم: کچھ نہیں اماں!

بوڑھیا: سایہ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ دو پہر کو جا تو ربھی اس کے نیچے آ جاتے ہیں

بیگم: اماں! پیڑ نہیں کٹے گا۔

(صفدر ایک دم مڑ کر بیوی کو دیکھتا ہے۔ بیوی اس وقت اس سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے)

بوڑھیا: اللہ تیرا بھلا کرے، ہمیشہ سکھی رہو بی بی!

(بوڑھیا اٹھنا چاہتی ہے۔ بیگم اسے اٹھنے میں مدد دیتی ہے)

کبھی کوئی داغ نہ لگے دل کو!

بیگم: اماں تو اکیلی رہتی ہے؟

بوڑھیا: اور کون رہے گا میرے ساتھ!

بیگم: کیوں؟

بوڑھیا: (لمبی آہ بھر کر) سب مر کھپ گئے ہیں — میں بھی جا رہی ہوں — تھوڑی سی رہ گئی ہے، بیت جائے گی۔ اچھا تم — اللہ تمہیں سدا سکھی رکھے

بیگم: اماں بالکل بے فکر ہو جاؤ: پیڑ سلامت رہے گا۔

بوڑھیا: اللہ تیری ساری مرادیں پوری ہوں۔

(صفدر جو اس دوران میں بیوی کے پاس آ گیا ہے غور سے بیوی کو دیکھ رہا ہے۔ بیگم بوڑھیا کو تکلیف کے ساتھ جاتے دیکھتی ہے تو "فضل" کو آواز دیتی ہے اور خود اس کا ہاتھ پکڑ کر بیرونی دروازے کی طرف جانے لگتی ہے)

نہ نہ — یہ تکلیف نہ کر — خدا تجھے —

(بوڑھیا کا دعائیہ فقرہ کھانسی میں ڈوب جاتا ہے۔ فضل آتا ہے)

بیگم: اسے گھر چھوڑ آؤ۔

(فضل بوڑھیا کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے — بوڑھیا جب تک دروازے سے نکل نہیں جاتی۔ بیگم دروازے

(کے پاس کھڑی رہتی ہے جب وہ دروازے سے نکل جاتی ہے تو لوٹتی ہے)

صفدر: اس قدر جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

بیگم: آپ نہیں سمجھ سکتے اس بے جادی کی کتنی سہانی یادیں اس سے وابستہ ہیں ہم اس کی یادوں پر کلہاڑا کیوں چلائیں۔ جو چیز ہر وقت پاس رہے وہ انسان کی ساتھی بن جاتی ہے۔ کون جانے اس بڑھیا اور درخت کا کتنا پرانا ساتھ ہے۔ اور یہ اُس کے آخری دن ہیں۔

صفدر: مگر ہمارا مسئلہ؟

بیگم: کوئی اور انتظام نہیں ہو سکتا آپ تو اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے یہ کوئی بڑا کٹھن مسئلہ ہے — معمولی سی بات ہے۔ ہو جائے گا کوئی نہ کوئی انتظام۔

(بیگم یہ فقرہ کہہ رہی ہے اور پردہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا ہے)

دوسرا منظر

یہ منظر پہلے منظر سے چند دن بعد وقوع پذیر ہوتا ہے

(یہی کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ سامان ابھی تک اسی بے ترتیبی سے پڑا ہے۔ رات کا پہلا پہر ہے۔ سامنے کی کھڑکی بند ہے مگر تیز و تند ہوا کا شور سنائی دے رہا ہے۔

صفدر کرسی میں بیٹھا سگرٹ کے کش لگا رہا ہے۔ بیگم اس سے کچھ دور کرسی میں بیٹھی ہے اور کسی کتاب کے ورق اُلٹ رہی ہے مطالعے میں دل نہیں لگ رہا۔

صفدر دیواروں کا جائزہ لے رہا ہے۔)

صفدر: تو اب کیا صورت بنے گی؟

بیگم: بن جائے گی۔

صفدر: (انگلی سے سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے) کس طرح بن جائے گی، درخت بک نہیں سکتا اور قرض کوئی دیتا نہیں۔

بیگم: ابھی دو ہی گھروں سے تو مانگا ہے۔ صبح خالہ جان سے پوچھوں گی۔

صفدر: مل جائے گی رقم؟

بیگم: ضرور مل جائے گی۔

صفدر: کوٹھی ٹھیک ٹھاک ہو۔ سامان قرینے سے لگایا جائے تو رہنے میں لطف بھی آئے اب کیا ہے، مسافروں کی طرح پڑے ہیں۔

(صفدر اندرونی دروازے کا رُخ کر کے فضل کو آواز دیتا ہے)

فضل: (کسی قدر دور سے) جی آیا!

صفدر: ایک کپ چائے پی کر سو رہوں گا۔

بیگم: کھانا نہیں کھائیں گے؟

صفدر: غنودگی سی طاری ہے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی ہے۔

بیگم: سو رہیں پھر!

صفدر: ارادہ تو یہی ہے: بڑا بور موسم ہے، اتنی تیز ہوا۔ اتنا شور ـــــ

(فضل آتا ہے)

(دیکھ) فضل ـــــ چائے بنا دو جلدی سے!

فضل: میاں جی!

صفدر: کیا ہے؟

فضل: کوئی اُدھر چل رہا ہے۔

صفدر اور بیگم: (ایک ساتھ) کہاں؟

فضل: درخت کے نیچے!

صفدر: درخت کے نیچے؟

فضل: جی ہاں باورچی خانے کی کھڑکی سے دیکھا ہے میں نے!

بیگم: تمہارا وہم ہوگا

صفدر: اور کیا!

بیگم: جاؤ چائے بناؤ

صفدر: (کچھ سوچ کر) کہاں دیکھا ہے تم نے؟

فضل: (کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے) اُدھر!

(صفدر سامنے کی دیوار کی طرف جاتا ہے، کھڑکی کھولتا ہے، باہر دیکھنے لگتا ہے، شور بڑھ جاتا ہے بیگم

اور فضل بھی ادھر بڑھتے ہیں)

بیگم: کوئی ہے؟

(صفدر کھڑکی سے ہٹ کر بیرونی دروازے کی طرف جانے لگتا ہے)

کہاں چلے؟

صفدر: کوئی ہے تو ضرور!

(صفدر تیزی سے باہر نکل جاتا ہے اس کے پیچھے فضل بھی چلا جاتا ہے۔ بیگم دروازے کی طرف جانا چاہتی ہے

دروازے کے قریب پہنچتی ہے۔ پھر رک جاتی ہے اور کھڑکی کی طرف جاتی ہے۔ کھڑکی میں سے باہر دیکھتی ہے۔

تیز دستک ہوا کا شور مسلسل ہو رہا ہے

بیگم چند لمحے ادھر دیکھتی رہتی ہے)

صفدر کی باہر سے آواز آتی ہے "چلو، اندر چلو۔ چلو" ۔ بیگم دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔

صفدر کی پھر آواز آتی ہے "میں کہتا ہوں چلو" بیگم دروازے سے باہر نکلتی ہے۔

اب سٹیج چند لمحوں کے لئے خالی رہے گی۔

سب سے پہلے صفدر آئے گا۔ پھر ایک عورت۔ اس کے پیچھے بیگم اور آخر میں فضل۔

عورت بڑی پریشان دکھائی دیتی ہے

لباس۔ شلوار قمیص اور اوپر چادر بادامی رنگ کی، چہرے سے عمر تیس بتیس کے قریب معلوم ہوتی ہے

صفدر عورت کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔

صفدر: اب کہو!

عورت: کیا کہوں؟

صفدر: کون ہو تم؟

عورت: میں — آپ دیکھ نہیں رہے مجھے!

صفدر: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک چور ہو۔

(عورت کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوتے ہیں جنھیں صفدر محسوس نہیں کرتا بیگم محسوس کرتی ہے، چنانچہ جب وہ بولے گی تو اس کا لہجہ نرم ہوگا)

بیگم: (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) بیٹھ جائیے!

(عورت بدستور کھڑی رہتی ہے)

عورت: میں چور نہیں ہوں!

صفدر: تو ادھر تمہارا کیا کام؟

عورت: گزر رہی تھی!

صفدر: یہ کوئی گزرگاہ نہیں ہے:

عورت: تو — تو پھر کیا ہے؟

صفدر: بڑی چالاک بنتی ہو۔ اس طرح دھوکا نہیں دے سکتیں تم! سنا!

عورت: یہ راستا ہی تو ہے

بیگم: راستا تو ضرور ہے مگر عام گزرگاہ نہیں ہے۔

عورت: اچھا!

صفدر: گویا تمہیں خبر ہی نہیں تھی! کیسا بھولپن ہے۔

عورت: میں نے اسے راستا ہی سمجھا تھا۔

بیگم: جانا کہاں چاہتی تھیں۔
عورت: (ہاتھ کے اشارے سے) اُدھر
بیگم: اُدھر کون ہے؟
عورت: اُدھر ایک گھر ہے:
بیگم: کون ہے اُس گھر میں؟
صفدر: اگر تمہیں کہیں جانا تھا تو کوٹھی کے اندر آنے کی کیا ضرورت تھی؟
عورت: سچ میں کوٹھی کے اندر نہیں آئی
صفدر: فضل کھڑکی بند کر دے!
فضل: اچھا میاں جی!

(فضل کھڑکی بند کر دیتا ہے۔ شور تھم جاتا ہے)

بیگم: آپ نے اسے کہاں دیکھا تھا؟
صفدر: درخت کے پاس!
بیگم: (عورت سے) تمہارا کوئی عزیز رہتا ہے یہاں؟
عورت: ہاں۔
بیگم: کتنی مدت بعد آئی ہو ادھر؟
عورت: بڑی مدت بعد!
بیگم: تم غلط فہمی سے تو ادھر نہیں آگئیں۔
صفدر: کیا بات کہہ رہی ہو بیگم! غلط فہمی کیسی! کسی خاص نیت سے ادھر آئی ہے۔ سوچا ہوگا موسم بہت خراب ہے۔ آسانی سے موقع مل جائے گا۔ کچھ نہ کچھ لے کر چمپت ہو جاؤں گی۔

(عورت کے چہرے پر کرب کے آثار ابھرے ہو جاتے ہیں)

عورت: نہیں — نہیں — نہیں!

(عورت یہ لفظ اس انداز اور جذباتی شدت کے عالم میں کہتی ہے کہ تینوں ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں)

بیگم: (شوہر سے) آپ کو معلوم ہے آبادی سے پہلے یہاں سے گزرنے کا ایک راستا تھا

(صفدر بیوی کی طرف گھور کر دیکھتا ہے)

صفدر: درست ہے۔
بیگم: اب راستے الگ ہو گئے ہیں۔
صفدر: وہ تو نہ جانے کب کی پرانی بات ہے۔

بیگم: یہ بھی تو بڑی مدت کے بعد آئی ہے۔
صفدر: مدت کے بعد آئی ہے۔ صدیوں کے بعد تو نہیں آئی
بیگم: اسے معلوم نہیں کہ پرانا راستہ بند ہو گیا ہے۔
صفدر: جی ہاں یہی وجہ ہے
بیگم: میں سمجھتی ہوں یہی بات ہے (عورت سے مخاطب ہو کر) بیٹھ جاؤ

(عورت اس انداز میں کھڑی ہے جیسے گفتگو اس کے بارے میں نہیں ہو رہی کسی اور کے بارے میں ہو رہی ہے
کرسی میں بیٹھتی بھی نہیں)

صفدر: مصیبت یہ ہے تم ہر معاملے میں جذباتی ہو جاتی ہو۔
بیگم: فضل!

(فضل جو خاموش تماشائی ہے، اپنا نام سن کر چونک سا پڑتا ہے)

فضل: جی!
بیگم: چائے بناؤ!
فضل: اچھا جی!

(فضل اندرونی کمرے کی طرف جانے لگتا ہے)

بیگم: میں نے کہا آپ کی طبیعت خراب ہے، آرام کریں۔
صفدر: مگر—
بیگم: میں نپٹ لوں گی، آپ اطمینان کے ساتھ لیٹ جائیں جا کر۔

(صفدر وہیں کھڑا رہتا ہے)

فکر کی کوئی بات نہیں!

(صفدر اس انداز سے بیوی کو دیکھتا ہے جیسے کہتا ہو مجھے تمہاری یہ حرکت ناپسند ہے لیکن
اندرونی دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگتا ہے)

(اب سٹیج پر بیگم اور عورت نظر آتی ہیں)

تشریف رکھیے!

(عورت بیگم کے ان الفاظ پر حیران رہ جاتی ہے)

عورت: کیا فرمایا؟
بیگم: میں نے یہ کہا ہے بہن! کرسی میں بیٹھ جائیں!
عورت: مجھے جانے دیجیے۔

بیگم: آخر آپ کو جانا ہی ہوگا۔ کچھ دیر بعد سہی

عورت: میں چور نہیں ہوں۔

بیگم: میں جانتی ہوں آپ چور نہیں ہیں۔

عورت: پھر آپ مجھے کیوں روک رہی ہیں

بیگم: کیونکہ آپ چور نہیں ہیں! اگر آپ وہ ہوتیں جو میرا شوہر آپ کو سمجھ رہا ہے تو کم از کم میں آپ کو ہرگز نہ روکتی اور یہ معاملہ میرے شوہر ہی کے ہاتھ میں ہوتا۔ میں آپ کو چور کی بجائے ایک دکھی عورت سمجھ رہی ہوں اس لئے اب آپ کی ذات کا تعلق صرف میری ذات سے ہے۔ میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں۔ آپ کچھ اور سمجھتی ہوں تو آپ جانیں۔

عورت: آپ کا شکریہ!

بیگم: صرف لفظی؟

عورت: میں کچھ سمجھی نہیں

بیگم: (مسکرا کر) عملی طور پر شکریہ ادا کریں۔

عورت: وہ کس طرح؟

بیگم: سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اطمینان کے ساتھ اس کرسی میں بیٹھ جائیں۔

عورت: اگر اطمینان کے ساتھ بیٹھ سکتی تو ضرور بیٹھ جاتی۔

بیگم: آپ بیٹھئے تو سہی!

(بیگم عورت کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے کرسی میں بٹھاتی ہے)

اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھ پر اعتماد کریں۔

عورت: اعتماد کیسا؟

بیگم: مجھے آپ سے ہمدردی ہے

عورت: مہربانی!

بیگم: میں آپ کو نہیں جانتی۔ آپ بھی مجھے بالکل نہیں جانتیں۔ پھر بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور ایک دوسرے کو بتائیں کہ ہم کیا ہیں۔ میری ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے آپ کو دلچسپی ہو ہم نے چند دن ہوئے یہ کوٹھی خریدی ہے۔ یہاں رہنے کا ارادہ ہے ان باتوں سے بھلا آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

عورت: اور میری باتوں سے —

بیگم: مجھے دلچسپی ہے۔

عورت: مجھے جانے دیجئے۔ شکریہ بہت بہت۔

(عورت کرسی سے اٹھ بیٹھتی ہے)

بیگم: آپ مجھ پر اعتماد نہیں کر رہیں!
عورت: اعتماد کا کیا سوال ہے بہن— آپ نے جب اندازہ لگا لیا ہے کہ میں چور نہیں ہوں، پھر مجھے کیوں روک رہی ہیں؟
بیگم: اس کی وجہ تو بتا دی ہے۔

(فضل چائے کی ٹرے لے کر آتا ہے اور اسے تپائی پر رکھ دیتا ہے)

میاں صاحب کیا کر رہے ہیں فضل؟
فضل: صوفے پر لیٹے ہیں!
بیگم: چائے دے دی انہیں؟
فضل: جی ہاں!
بیگم: ہمیں کچھ بسکٹ وسکٹ بھی دے جاؤ
فضل: بہتر!

(فضل کمرے سے نکل جاتا ہے۔ بیگم چائے بنانے لگتی ہے)

بیگم: سچ مانو مجھے تم سے ہمدردی ہے
عورت: ہمدردی ہے تو مجھے مت روکیں۔
بیگم: جانا کہاں ہے تمہیں؟
عورت: گھر!
بیگم: کس کے گھر؟
عورت: کس کے گھر— اپنے گھر!

(بیگم اسے چونک کر دیکھتی ہے اور چائے بنا کر پیالی اس کی طرف بڑھاتی ہے)

بیگم: لو بہن!

(عورت پیالی لے لیتی ہے۔ فضل ایک پلیٹ میں چند ٹکڑے پیسٹری کے اور کچھ بسکٹ لے کر آتا ہے

بیگم پلیٹ تپائی پر رکھ کر تپائی عورت کی طرف بڑھاتی ہے)

یہ بھی لیجئے نا— لیجئے نا!

عورت ہاتھ بڑھا کر ایک بسکٹ لے لیتی ہے۔ فضل چلا جاتا ہے

عورت: شکریہ!
بیگم: آپ اپنے گھر جا رہی ہیں؟
عورت: ہاں!
بیگم: اگر میں کہوں، لوگ اس طرح تو اپنے گھروں کو نہیں جایا کرتے جس طرح آپ جا رہی ہیں تو شاید آپ کو اعتراض ہوگا

عورت : نہیں !

بیگم : اعتراض نہیں ہوگا ؟

عورت : مجھے کسی بات پر بھی اعتراض نہیں ہے

بیگم : آپنے خود ہی کہا تھا ناکہ ایک مدت کے بعد اپنے گھر جا رہی ہوں !

عورت : کہا تھا !

(عورت نے ابھی تک پیالی اپنے ہونٹوں سے نہیں لگائی)

بیگم : چائے پی لیجئے

عورت : اوہ —

(عورت آہستہ آہستہ چائے پینے لگتی ہے)

بیگم : اپنے گھر جا رہی ہیں نا ؟

(عورت اثبات میں سر ہلاتی ہے)

وہاں کون ہے ؟

عورت : میری ماں !

بیگم : صرف ماں ؟

عورت : ہاں !

بیگم : کیا اسے معلوم ہے آپ آرہی ہیں ؟

عورت : نہیں !

بیگم : نہیں — پھر بھی وہ خوش نصیب ہے کہ اس کی بیٹی آخر لوٹ آئی۔

عورت خوش نصیب ؟

بیگم : کیوں ، خوش نصیب کیوں نہیں ؟

(عورت پیالی پر نظریں گاڑ کر ایک لمبی آہ بھرتی ہے)

کون ہے وہ ؟

عورت : میری ماں !

بیگم : آپ کی ماں — کون ہے — کہاں رہتی ہے ؟

عورت : اس کوٹھی کے پیچھے !

بیگم : (کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) ابھی تک میں نے صرف ایک بوڑھی عورت کو دیکھا ہے

(بیگم عورت کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگتی ہے)

آپ کے خد و خال ان کے خد و خال سے ملتے ہیں۔ شاید وہی آپ کی ماں ہے

عورت: آپ جانتی ہیں اسے؟

بیگم: نہیں جانتی نہیں ہوں۔ فقط ایک بار دیکھا ہے۔ ہم وہ درخت کٹوانا چاہتے تھے۔

عورت: کونسا درخت؟

بیگم: وہی درخت جس کے پاس سے آپ گزر رہی تھیں۔ بڑھیا بیتاب ہو کر چلی آئی تھی کہتی تھی اسے مت کٹواؤ ـــ یقیناً اس کے ساتھ اس کی نہ جانے کتنی پرانی اور پیاری یادیں وابستہ ہیں۔

عورت: میں اس پیڑ کے نیچے کھیلا کرتی تھی۔

بیگم: اس پیڑ کے نیچے؟

عورت: اس کے باذوؤں میں رات دن جھولا جھولتی تھی ـــ میری معصوم خوشیوں کی ننھی سی دنیا اس کے سائے میں آباد تھی!

بیگم: جب تو آپ کو اس سے بڑا پیار ہوگا۔

عورت: اسے مجھ سے زیادہ پیار تھا۔ اس کی ہر شاخ جیسے مجھے دیکھ کر مسکرا پڑتی تھی ـــ اس کا ہر پتا گویا مجھ پر نچھاور ہونے لگتا تھا۔

بیگم: پھر کیا ہوا؟

عورت: پھر کیا ہوا؟

بیگم: کیا ہوا بہن؟

عورت: میری خوشیوں بھری دنیا جل کر راکھ ہو گئی۔

بیگم: خدا کی پناہ!

عورت: سمجھتی تھی میری خوشیاں مجھ سے کبھی نہیں بچھڑیں گی، میری پیاری ماں ـــ میرا پیارا گھر اور میرا پیارا پیڑ ـــ سب کچھ سلامت رہے، سب کچھ سلامت رہا ـــ پر میں ہی بدنصیب چلی گئی!

بیگم: کہاں؟

عورت: باپ کے مرنے کے بعد ماں نے مجھے پوری آزادی دے رکھی تھی۔ جہاں چاہتی تھی کھیلنے کے لئے چلی جاتی تھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی! ـــ وہ دن خزاں کا ایک منحوس دن تھا۔ پیڑ سے پتے بے تحاشا گر رہے تھے، میں اس کے باذوؤں میں جھول رہی تھی کہ یکایک مجھے خیال آیا کہ اس میدان میں چلی جاؤں جہاں شہر بھر کے بچے کھیلا کرتے تھے۔ یہ سوچا اور نیچے کود پڑی۔ اب سمجھتی ہوں کہ پیڑ بار بار میرے راستے میں سینکڑوں پتے کیوں بکھیر دیتا تھا اور مجھے جانے سے روک رہا تھا۔

بیگم: اس کی محبت کا یہی تقاضا تھا۔

عورت: میں چلی گئی ـــ میدان میں پہنچ گئی۔ اس وقت وہاں بہت کم بچے آئے تھے اور جو آئے تھے وہ بھی جا رہے تھے۔

بیگم: اور آپ؟

عورت: میں وہیں کھیلتی رہی۔ آخر میری وہ سہیلی بھی جانے لگی جس کے ساتھ میں کھیل رہی تھی۔ میں اسے اس کے گھر چھوڑنے چلی گئی۔ کافی دور تھا اس کا گھر!

بیگم: تو تنہا واپس آنے لگیں۔

عورت: میں اکیلی تھی راستا ویران اور غیر آباد ــ یکایک ایک طرف دو گھورتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں۔ یہ آنکھیں میرے قریب آنے لگیں ــ بالکل قریب آگئیں۔ پھر میں نہیں جانتی کیا ہوا؟ ــ جب ہوش آیا تو ایک عجیب ماحول میں پہنچ گئی تھی۔

بیگم: او ہو!

عورت: عجیب ماحول، اجنبی لوگ ــ اس وسیع اور پھیلی ہوئی دنیا میں بالکل تنہا تھی۔ وہ لوگ مجھے ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے گئے ــ پھر تیسرے شہر میں ــ میں اپنے گھر سے دور ہوتی چلی گئی۔ حالات کی لہریں مجھے بہا کر کہاں سے کہاں لئے جا رہی تھیں ــ اور میں بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھی! ــ اور وقت گزر رہا تھا۔ گندہ تالاب چلا جا رہا تھا مجھے کبھی آزادی نصیب نہیں ہوئی تھی ــ اور جب آزادی ملی تو مجھے محسوس ہوا کہ جس رات مجھے اغوا کیا گیا۔ اس کی ساری سیاہی میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھی میری ماں نے مجھے ایک معصوم بچی کے روپ میں دیکھا تھا اور اب وہ بچی ــ

بیگم: آپ بے گناہ تھیں۔

عورت: جب سوچتی تھی کہ اب کیا منہ لے کر جاؤں گی اپنی ماں کے پاس اب کن ہاتھوں سے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دوں گی۔ اب کس زبان سے ماں کو امی کہوں گی ــ

(عورت شدت جذبات میں خاموش ہو جاتی ہے)

بیگم: آپ کو لوٹ آنا چاہئے تھا۔ ماں آخری سانس تک ماں ہی رہتی ہے ــ اس کے گھر کا دروازہ اپنی اولاد پر کبھی بند نہیں ہو سکتا

عورت: میں نے اپنے ماضی کو بھول جانے کی کوشش کی میں نے چاہا کہ میری بچپن کی زندگی مجھ سے کٹ جائے اور شاید میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

بیگم: نہیں ــ آپ کامیاب نہیں ہوئی تھیں

عورت: کئی سال گزر گئے ــ اور میں اپنی حالت پر مطمئن سی ہو گئی! ــ شاید یہ ایک فریب تھا؟

بیگم: یقیناً!

عورت: اور چند روز ہوئے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے کوئی دور سے بلا رہا ہے ــ ایک آواز ہر لمحہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے ایک ایسی آواز جو کہہ رہی ہے ــ آ جاؤ ــ لوٹ آؤ ــ لوٹ آؤ!

(عورت خاموش ہو جاتی ہے)

بیگم: اور آپ آ گئیں!

عورت: میں بہت تھک چکی ہوں ــ بہت لمبا سفر طے کیا ہے میں نے۔ میرا عضو عضو نڈھال ہو چکا ہے ــ میرے پاؤں میں چھالے پڑ چکے ہیں ــ مجھے وہ میٹھی نیند چاہئے جو ماں کی پیار بھری گود ہی دے سکتی ہے ــ جو ماں کے پرشفقت بازو ہی دے سکتے ہیں،

بیگم: یہ نیند آپ کو مل جائے گی!

عورت: مل جائے گی؟

بیگم: کیوں نہیں ملے گی ــ ملے گی اور ضرور ملے گی!

عورت: وہ اپنی بدنصیب بیٹی کو دیکھ کر کیا کہے گی؟

بیگم: وہی جو ایک ماں اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی کو دوبارہ دیکھ کر کہہ سکتی ہے۔

عورت: وہ ـــ

بیگم: ہاں وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ مر کھپ گئی ؛ اور اب جب آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے گی تو اس کی رگ رگ میں خوشیوں کا طوفان برپا ہو جائے گا

عورت: (مُڑ کر) سچ؟

بیگم: اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا!

(بیگم عورت کے بازو پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)

جائیے بس جائیے اس دروازے پر دستک دیجئے جس کے پیچھے دو بوڑھی آنکھیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جہاں آپ کے لئے پیار ہے۔ سکون ہے ـ میٹھی نیند ہے! جائیے

(دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگتی ہیں)

آپ کی بچھڑی ہوئی خوشیاں آپ کو واپس مل رہی ہیں!

(عورت اس کو کوئی جواب نہیں دیتی، بیرونی دروازے کی طرف جانے لگتی ہے)

خدا حافظ!

(عورت دروازے میں سے نکل جاتی ہے

اب سٹیج پر بیگم اکیلی ہے اس کی ہر حرکت سے معلوم ہوگا کہ وہ بہت مضطرب ہے)

عورت کے جانے کے دو تین لمحوں کے بعد خود بھی دروازے سے باہر جاتی ہے اور پھر واپس آ جاتی ہے

کمرے میں دو تین چکر لگاتی ہے.

سامنے جا کر کھڑکی کھول دیتی ہے. تیز و تند ہوا کا شور طوفانی صورت اختیار کر لیتا ہے.

وہ کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی ہے ـ پھر اُسے کھلا چھوڑ کر اندرونی دروازے میں جاتی ہے اور آواز

دیتی ہے "فضل"۔ فضل کی دور سے "جی" کہتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ بیگم واپس آتی ہے۔ فضل آتا ہے)

بیگم: میاں جی سو گئے؟

فضل: جی ہاں ـ صوفے پر ہی سو گئے ہیں.

بیگم: تم بھی سو جاؤ جا کر!

فضل: بی بی جی! ـ وہ چلی گئی

بیگم: اپنی ماں کے پاس ـــ وہ جو بڑھیا آئی تھی نا ـ وہی اس کی ماں ہے

فضل: وہ بوڑھیا جس نے کہا تھا بیڑہ کا ٹے ـ وہ بیچاری کل صبح مر گئی تھی بی بی جی.

بیگم: مر گئی تھی ـــ اوہ میرے اللہ! ـــ میرے اللہ!!

فضل: میں اندر سے گذرا تھا تو دیکھا تھا.

بیگم: دیکھے میں انتہائی تھی، ماں مر گئی تو ـــ

(فضل چائے کے برتن اٹھانے لگتا ہے۔ یکایک بڑے زور سے دھماکا ہوتا ہے۔ فضل کے ہاتھ سے
ٹرے گر پڑتی ہے۔ برتن فرش پر گر کر ٹوٹ جاتے ہیں۔
بیگم کے منہ سے چیخ نکلتی ہے۔ فضل ایک دم پکارتا ہے "بی بی جی"
صفدر بھاگتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے "کیا ہوا" یہ سب کچھ ایک ساتھ ہوگا!
فضل کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ باہر دیکھتا ہے)

فضل: میاں جی! پیڑ گر پڑا۔
صفدر اور بیگم: (ایک ساتھ) پیڑ گر پڑا!

(صفدر اور فضل بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہیں اور پھر تیزی سے باہر نکل جاتے ہیں۔
ان کے تین چار لمحوں کے بعد بیگم بھی دروازے سے غائب ہو جاتی ہیں۔ اب سٹیج پر کوئی نہیں سے
طوفانی ہوا کا شور مسلسل ہوتا ہے۔
بیگم اندر آتی ہے۔ مگر اس انداز سے کہ نگاہیں دروازے پر جمی رہتی ہیں اور پاؤں پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔
تین چار قدم پیچھے ہٹ کر وہ دائیں جانب ہٹ جاتی ہے۔ صفدر اور فضل عورت کو اٹھائے آتے ہیں)

بیگم: کیا ہوا!
فضل: درخت کے نیچے آگئی۔

(صفدر اور فضل عورت کو کوچ پر لٹا دیتے ہیں۔ وہ لہولہان ہے۔ بیگم فرش پر بیٹھ کر اس پر جھک جاتی ہے)

بیگم: تم ——
عورت: میں —— گھر گئی —— پر یہاں مجھے ماں کی گود نہیں ملی ——
بیگم: وہ ——
عورت: میں نے سمجھ لیا —— میرے مقدر میں میٹھی نیند نہیں ہے —— اور میں لوٹ چلی —— پیڑ کے پاس سے گزرنے لگی تو پتے بے تحاشا میرے پاؤں میں گرنے لگے —— وہ پھر اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا —— جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو —— اپنے سینے سے لگا لیتی ہے —— اور مجھے میٹھی نیند دے دی —— میٹھی نیند —— میٹھی —— چین بھری نیند —— میٹھی نیند —— ماں کی گود میں ——!!!

(عورت کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں —— بیگم سسکیاں بھرتی ہوئی پیچھے ہٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں
سے چہرہ ڈھانپ لیتی ہے۔
صفدر اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور غمناک آواز میں کہتا ہے "بیگم"
فضل بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا ہے۔
شور مسلسل برپا ہے اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

محمد خالد اختر

سواتی مہم

ریستوراں کار

"ہم تم لوگوں کو سیدو سے تار دیں گے — پرسوں شام کو ہم سیدو کے کوچوں میں گھوم رہے ہوں گے،" ہم نے خیبر میل کی ریستوراں کار میں پھلانگتے ہوئے پیٹر اور ہربرٹ سپنسر کو تنبیہہ کی۔

پیٹر اور ہربرٹ ہمیں میل پر چڑھانے کے لئے آئے تھے۔ وہ ہیں قدرے بچے بچے سے رشک کے احساس سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے انھیں یقین تھا کہ ہم ان کو بنا رہے ہیں، ور سیدو نہیں پہنچ سکیں گے۔

وہ ہمارے ساتھ چلتے لیکن اس وقت شاعر اور فلسفی دونوں دیوالیئے تھے۔ ہم نے اپنے خرچ پر انھیں ہمراہ لے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا جس سے ان کے دلوں کو صدمہ پہنچا تھا۔ پھر ہربرٹ کو ایک ضروری کام بھی تو تھا۔ اس نے اپنے کہنے کے مطابق ایک پولیس کانسٹیبل دوست کی مدد سے اپنے چند قرضداروں سے روپے وصول کرنے کا سوچ رکھا تھا۔ اس نے اخلاقی سہارے کے لئے اس مشن پر پیٹر کو بھی گاؤں میں ساتھ چلنے کی دعوت دے رکھی تھی پیٹر نے ازراہ اخلاص اس دعوت کو مجبوراً قبول کر لیا تھا۔ ہربرٹ کی رائے میں پیٹر کو روپے کی وصولیاں کرانے میں خاص ملکہ حاصل ہے ویسے پیٹر کی اس شہرت کی اصلاً کوئی بنیاد نہیں۔

"روپے وصول کر لینے دو" ہربرٹ نے حسرت نکالتے ہوئے ہم سے کہا "ہم بھی پھر سیدھے سیدو شریف پہنچ کر دم لیں گے۔۔۔ ہم سوات ہوٹل میں ٹھہریں گے۔"

سیدو شریف نام میں ہی کتنا طلسم تھا — زمردیں پہاڑوں کے بیچ میں پڑا ہوا تھا کوہستانی شہر ہمارے تخیل کی آنکھوں کے سامنے ابھرا نیلی کمن ساوتھ کی طرح یہ نام دماغ کو چڑھتا تھا "سیدو"! "سیدو"! اس نام سے کس آدمی کا دل بھر سکتا تھا؟ "سیدو"! "سیدو"! — اتنا دور اور ناممکن الحصول جتنا لاہسا یا تاشقند یا بخارا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی وہاں پہنچ سکنے کا یقین نہ تھا۔ ایسی اچھی قسمت ہماری کہاں ہو سکتی ہے — لیکن ہم اپنے پژمردہ دلوں کو رومانیت سے جگمگانے کی خاطر، اپنے دوستوں کی چھیڑ کی خاطر بار بار سیدو کا نام لیتے تھے سیدو شریف اس وقت ہمارے لئے ایسا ہی تھا جیسا کارٹز کے ہسپانوی البیلوں کے لئے سحر انگیز ایل دورِیدو — سونے اشرفیوں اور آبدار لعلوں کا شہر، جہاں پہنچنے کے لئے انسانوں کے ماندہ قدم سدا سرگرم راہ رہتے ہیں ور جس تک پہنچنا کسی کے مقسوم میں نہیں۔

خیبر میل کے ساتھ اس روز وہ چھوٹا ناٹا سا گارڈ تھا۔ وہ گویا کلف سے اکڑا ہوا تھا — چھڑی کی طرح — ہمیں اس بونے گارڈ سے محبت تھی۔ وہ ان گارڈوں میں سے ایک ہے جو سیٹیاں بجانے اور سبز اور لال جھنڈیاں ہلانے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور جو ناتھ ویسٹرن

ریلوے کی سب سے خوبصورت ایجاد ہیں۔

"وہی اسمارٹ گارڈ ہے"۔ ایپی کیورس نے خوشی اور طمانیت سے گارڈ کی طرف اشارہ کیا

"ہم خوش قسمت ہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

گارڈ نے پہلے ایک چھوٹے بچے کی طرح ایک تیز خوش کن سیٹی بجائی۔ پھر شوخی اور فخر سے اپنی سبز جھنڈی ہلائی اور اپنے ڈبے میں بڑی صفائی سے پھدک کر چڑھ گیا۔ اس کی حرکات میں ایک کٹ پتلی کی سی سختی اور صفائی تھی جو آدمی کو حیران کر دیتی تھی ــــ ڈیزل غرغرانے اور دھڑکنے لگا۔ اس نے ایک مختصر تشنہ بانگ لگائی اور پرجوش الوداعی ہاتھوں کے لہرانے کے درمیان ہم حرکت کرنے لگے ــــ سید و شریف کی سمت دھوپ میں بھیگتے ہوئے پلیٹ فارم پر پیٹر اور ہربرٹ کی شکلیں اکیلی اور کھوئی کھوئی سی لگتی تھیں۔

ریستوران کار کے ٹھنڈے، چوکھٹے لگے، پرسکون چھپٹے میں بیٹھے ہوئے ہم دھڑکتے دلوں سے پیلے کھیتوں اور کھجور کے درختوں کو گزرتے دیکھنے لگے۔ پنکھے اوپر پھڑپھڑا رہے اور لکڑی کے چوکھٹوں کا نیا پالش، ہرکن میگز بنوں میں بڑھیا وسکی کے اشتہاروں کی سی جھلک دیتا تھا۔ پالش بادہ احمریں کی رنگت کا تھا۔ ہم نے اپنے آپ کو نواب محسوس کیا۔

ہم نے سگرٹ پئے۔ ہم نے ڈیزل الیکٹرک انجنوں اور اسٹیم انجنوں کی نسبتی خوبیوں کا مقابلہ کیا۔ ایپی کیورس نے سٹیم انجنوں کو بے حد سراہا۔ اس کی رائے میں سٹیم انجن ایک اصلی ایماندار ریل کا انجن تھا ــــ بھاپ کی طاقت کا عناصری سمبل۔ اس نے ڈیزل کا مذاق اڑایا۔ "یہ بس کی طرح لگتا ہے۔ اصل انجن کی طرح ذرہ بھر بھی نہیں"۔ اس نے کہا۔ گفتگو کی خاطر میں نے ڈیزل انجنوں کی حمایت کی۔

وہ ان پر لنچ سرو کیا گیا۔ لنچ اچھا اور لذیذ تھا اور ایسا لگتا تھا اس کے کورس ختم ہونے میں نہیں آئیں گے۔ اپنے معدے میں ہضم کرنے والے کیمیائی رسوں کی کمی کی وجہ سے میں ہمیشہ شرم اور لازمی کے احساس کے ساتھ کھاتا ہوں۔ میں نے ایک دو کورس سکپ کئے۔ ایپی کیورس نے لنچ کو ایک سچے گورمے کے لطف سے کھایا اور مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے ایک بھرے ہوئے کورس سے دوسرے بھرے ہوئے کورس تک گذرتا رہا۔ فرائڈ فش اور پلاؤ کی اس نے دو دو ہیلپنگ لیں۔ میں نے اسے رشک کے جذبات سے دیکھا۔ ریستوران کار کا سٹاف بھی اسے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھنے لگا۔ بیرے اس کے اشاروں پر بھاگنے لگے، جیسے وہ کوئی ڈیوک ہو۔ مجھے انھوں نے غالباً ڈیوک کا کوئی "قسمت ہینگر آن" دوست سمجھا۔

"بھئی بے تحاشا کھانا کھا لیا ہے"۔ ایپی کیورس نے آئس کریم کی دوسری ہیلپنگ کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اب میٹھی کافی مل جائے تو جیون سپھل ہو جائے"۔

ریستوران کاروں میں وہ تمہیں کافی سرو کرتے ہیں، کافی سرو کی گئی اور ایپی کیورس نے مجھے ایک سگرٹ پینے کے لئے دیا۔ (یہ جانتے ہوئے کہ زیادہ سگرٹ میرے لئے اچھے نہیں، ایپی کیورس میری اپنی خواہش کے مطابق میرے سگرٹوں پر کنٹرول کر رہا تھا) ہم نے لاہور تک بورژوا آرام میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا لاہور تک ہمیں اپنے خاکی جسموں کو پوری طرح لاڈ پیار سے بگاڑنے کی اجازت تھی۔ اس سے آگے ہمیں انٹر یا تھرڈ میں جانا تھا اور "اصلی" ویگا بانڈز کی طرح سفر کرنا تھا..... کافی ختم کرتے کرتے گاڑی ملتان سٹیشن کی حدود میں داخل ہو چکی تھی ــــ چھاؤنی کا قلعہ جدا ہوتی، وہ آکر ملتی ہوئی یارڈ کی لائنیں اور نیلی منقش محرابوں والا ریلوے اسٹیشن۔ ہم گویا بھٹک کر ریلوے سٹیشن کی بجائے کسی بڑے ولی کے مزار میں گھس آئے تھے۔ ملتان اسٹیشن، اسٹیشن سے زیادہ ایک درگاہ کی طرح لگتا ہے، جیسے ریلوے کے معماروں نے اسٹیشن بنانے کی نیت سے کام شروع کیا ہو اور اس کی بجائے ایک مزار تعمیر کر ڈالا ہو۔ اور جب انھیں اس کا احساس ہوا ہو تو وہ اس کے متعلق کچھ نہ کر سکے ہوں۔ یہ یقیناً چند شریر جنات کی کارستانی تھی جو معماروں کے ڈیزائن کو بدل کر ان کا تماشا بناتے رہے تھے..... ہم پر اس وقت تک واضح طور پر نیند اور غنودگی کی کیفیات طاری ہو چکی تھیں۔ ہمارے اعضا پھیلنے کے آرزومند تھے۔ بک سٹال

پر ایک نظر ڈال کر ہم اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بھاگے۔ اینی کیورس نے جلدی سے دونوں بستر کھول کر ایک کو نچلی نشست پر اور دوسرے کو اوپر کی نشست پر بچھا دیا۔ ہم لیٹ گئے۔ کمپارٹمنٹ میں ایک محسوس گرمی تھی۔ مجھے تو نیند کچھ یونہی سی آئی مگر اینی کیورس صحیح معنوں میں گھوڑے بیچ کر سویا۔ وہ پورے پانچ بجے تک سویا رہا۔

منٹگمری پر میں نے اسے تیسری بار جگایا۔ "بھئی اینی کیورس، اٹھو، ریستوراں کار میں چل کر چائے وغیرہ پئیں۔" میں نے کہا۔ وہ بڑی عدیم الفرصتی کے موڈ میں اٹھا۔ اتنے میں میں نے کھڑکی میں سے پلیٹ فارم پر مجمع میں چند لمبی تنی اور پیلی خالصئی پگڑیاں اچھلتی دیکھیں۔

"مائی گاڈ، اینی کیورس" "میں چائے بغیر نہ رہ سکا" "یہاں تو سکھ ہیں۔۔۔۔ اٹھو انھیں دیکھیں۔" ہماری پچھلی سات سالہ زندگی میں یہ پہلے سکھ تھے۔ ہمارا اضطراب بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ہماری آنکھیں انھیں دیکھنے کے لئے ترس گئی تھیں، اور ہم انھیں کسی قیمت پر مس کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جلدی سے تیار ہو کر ہم پلیٹ فارم پر ریستوراں کار کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ منٹگمری کے لمبے فراخ پلیٹ فارم پر مسافروں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ سکھ یکدم غائب ہو چکے تھے۔

"تمہیں یقین ہے کہ تم نے واقعی سکھ دیکھے تھے؟" اینی کیورس نے پوچھا۔

"تھے تو سکھ ہی" میں اب کچھ شک میں پڑ گیا۔

دفعتاً ہم نے انھیں آتے دیکھا۔ وہ تین سکھ تھے۔ ایک پینتیس سال کا چھریرا لانبا نوجوان تھا۔ دوسرا بھرے اور گٹھے جسم کا تھا۔ تیسرا سلونی رنگت کا مضبوط گبرانڈ کا تھا جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ پہلا سکھ اپنے فاختئی سوٹ اور بھڑکیلی ٹائی میں کسی قدر ایک 'ڈینڈی' لگتا تھا ــــ مگر وہ ایک معصوم طریق پر ڈینڈی تھا۔ اور اس کی سج دھج ایک ایسا کمک تاثر دیتی تھی کہ اسے پسند کئے بغیر چارہ نہ تھا ــــ وہ تینوں سخت جوش میں ہو رہے تھے ــــ پتلا سکھ سب سے زیادہ ــــ اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے پلیٹ فارم پر ایک ایسی رفتار سے چل رہے تھے جو چلنے اور بھاگنے کے بین بین تھی۔ ان کا ایک چوتھا ساتھی بھی تھا ــــ ایک شوخ، خوشگوار چہرے والا مسلمان، اور وہ چاروں گاڑی میں جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔ "آؤ! سردار جی۔ ایتھے ریستوراں کار وچ ای چڑھ چلیے" مسلمان ساتھی نے تجویز پیش کی۔

"نہیں جی۔ ریستوراں کار وچ کی بیٹھنا اے" لانبے سکھ نے کچھ سوچ کر کہا اور وہ چاروں تیز تیز قدم چلتے اور بھرے کمپارٹمنٹوں میں جھانکتے آگے نکل گئے۔ وہ پھر واپس آئے۔ انھیں ابھی جگہ نہ ملی تھی۔۔۔ گارڈ نے وسل دے دی تھی اور گاڑی چلنے والی تھی مجبوراً وہ کسی قدر ہچکچاہٹ سے ریستوراں کار میں چڑھ آئے۔ ان کی ہچکچاہٹ اس لئے تھی کہ ان کے پاس انٹر کلاس کے ٹکٹ تھے اور جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے ریستوراں کار میں صرف اونچے درجے کے لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔

اینی کیورس نے چائے پینے سے پہلے لیمونیڈ کے ساتھ سکوئیش کا آرڈر دیا۔ اسے سڑکتے ہوئے ہم اپنے سکھوں کو استعجاب اور اشتیاق سے دیکھنے لگے۔ وہ ہمیں اکیزا ایک ( ) الگ سے لگے۔ وہ پاکستان میں تھے اس لئے بچوں کی طرح مضطرب اور خوش تھے۔ پتلا سکھ اپنے ساتھیوں سے کبھی انگریزی اور کبھی پنجابی میں ایک اونچے اور خود آگاہ انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ انگریزی بولنے کا زیادہ مشتاق تھا اور اس کے الفاظ محض اپنے ساتھیوں کے کانوں کے لئے ہی نہ تھے۔ وہ بالواسطہ ہمیں سنا رہا تھا اور باتوں کے درمیان وہ ہماری طرف بار بار نظر ڈالتا۔

ایک منٹ بعد ان کے پیچھے ہی کار میں چڑھ آیا۔ وہ ایک میلے چہرے کا سوکھی سڑا شخص تھا۔ میرا خیال ہے وہ ایسی چیزیں کھاتا تھا جو اسے راس نہ آتی تھیں۔ اس کا چہرہ بے حد زرد اور غیر صحت مندانہ تھا، اور اپنی سفید ریلوے کی یونیفارم میں وہ ایک چھپکلے کی یاد دلاتا تھا۔

یہ جانتے ہوئے کہ سکھوں کے پاس انٹر کلاس کے ٹکٹ ہیں۔ اس نے ارادتاً ٹکٹ چیک کرنے شروع کر دیئے "سردار جی ٹکٹ دکھاؤ"۔ سرداروں نے کچھ جھینپ کر اپنے انٹر کلاس کے ٹکٹ نکالے اور خاموشی سے انہیں ٹکٹ چیکر کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ انٹر کلاس کے ٹکٹ ہیں" چیکر نے ایک اہم انداز میں کہا "آپ سے سیکنڈ کلاس کا کرایہ چارج کیا جائے گا۔" ۔

اب اس شخص کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ سکھ کہیں اور جگہ نہ پا کر مجبوراً ریستوران کار میں آبیٹھے تھے اور وہ اس کے ملک میں ایک دو روز کے مہمان بن کر آئے تھے وہ ان کو نظر انداز کر سکتا تھا لیکن اس نے انہیں چارج کیا۔۔۔ شوخ چہرے والے مسلمان دوست نے ٹکٹ چیکر کو چھیڑا "بابو جی بیٹھو تو سہی کتنے پیسے لینے ہیں"۔ اس نے زائد کرایہ کی رقم جیب سے نکال کر ٹکٹ چیکر کو دی جو اپنی ٹکٹ کی کتاب نکال کر ٹکٹ بنانے لگا۔ ٹکٹ کاٹنے کے بعد وہ ایک ڈھیٹ چہرے کے ساتھ ہمارے مقابل کی میز پر آبیٹھا۔ وہ اپنی جیب میں سے ایک کتاب نکال کر اسے گویا پڑھنے لگا۔ یہ رئیس احمد جعفری کا کوئی اسلامی تاریخی ناول تھا۔ اسے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ ایک بے حد گھٹیا چیز تھی۔ اور یہ کہ کار میں ہر شخص اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے کمینے پن کو رئیس احمد جعفری کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن شوخ چہرے والے مسلمان نے اسے بالکل امن میں نہ چھوڑا۔ وہ ایک بے دھڑک اور منہ پھٹ لاہوریا تھا اور راستے بھر وہ ٹکٹ چیکر سے پر مذاق چھیڑ کرتا رہا۔ اس کے مذاق چٹکلے کو جزبز کرتے تھے۔ کار میں اپنے خلاف نفرت کی فضا محسوس کرتے ہوئے اس کے جواب دھیمے اور بے جان سے ہوتے، اور بولتے وقت اس کے چہرے پر اعصابی بوکھلاہٹ کا اظہار ہوتا تھا۔ اسے کم از کم اپنے فعل کی کچھ سزا تو ملی، وہ بالکل امن میں تو نہ بیٹھا رہا۔ اس چیز نے مجھے بہت مسرت دی اور زندہ دل لاہوریا مجھے بڑا پیارا لگنے لگا۔

اب اگر تم ان گھٹے ہوئے فرض شناس مزاج کے لوگوں میں سے ہو تو شاید تم اس ٹکٹ چیکر کے رویے کی طرفداری میں یہ دلیل دو گے کہ اس نے ان لوگوں سے کرایہ چارج کر کے اپنا فرض ادا کیا اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ اپنے فرض میں کوتاہی کا مجرم ہوتا۔ درست اگر فرض کا بہت زیادہ احساس ہو تو ایک غیر فیاض اور تنگ طبیعت کا آئینہ دار ہے، اور فرض سے زیادہ کئی اور چیزیں ایسی ہیں جو زیادہ ضروری ہوتی ہیں۔۔ مثلاً انسانی رفاقت، شرافت، خوش اخلاقی، ہمدردی۔ جہاں فرض کی بجا آوری سے ان سب چیزوں کا خون ہوتا ہو، وہاں بہتر ہو گا کہ تم ایسے فرض سے چشم پوشی کر لو۔ ہمارے اصول اتنے کڑے نہیں ہونے چاہئیں۔ وہ ہمارے ظالم آقا نہیں کہ انہیں کبھی ڈھیل نہ دی جا سکے اور زندگی کا عمل اقلیدس کی چیستیوں جیسا تو نہیں ہے۔ اصول اور فرض اپنی جگہ اچھی چیزیں ہیں مگر وہ شخص جو ہمیشہ اپنی زندگی کو ان کے مطابق چلاتا ہے میرا بھائی نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ ٹکٹ چیکر احساسِ فرض کا اتنا عینی پیکر نہ تھا جتنا وہ بن رہا تھا۔ فرض کرو کہ ان سکھوں کی بجائے اگر اس کے اپنے دوست اس طرح بیٹھے ہوتے تو کیا اسے اپنا فرض یاد ہوتا۔۔ اب بھی اس کے ساتھ ایک مستری قسم کا دوست بیٹھا ہوا تھا اس کے پاس یقیناً سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ یا پاس نہیں تھا۔

لاہوریے نے چٹکلے کی زندہ دلی سے للکارا "باؤ جی۔ ایہہ بندگی چہرے تہاڈے نال بیٹھے نے۔ ایہناں دے کول تے سکنڈ کلاس دا ٹکٹ ضرور ہووے گا"۔

"ان کے پاس ریلوے پاس ہے" چیکر نے لنگڑا جواب دیا۔

"اچھا۔ بابو جی خوش رہو" لاہوریے نے سارے ڈبے کو آنکھ مار کے اپنے مذاق میں شریک کر لیا۔ مگر اس واقعے کے کچھ دیر بعد تک ہمارے سرداروں کی اُبلتی ہوئی "سپرٹس" پر اوس سی پڑی رہی، ان کی بے تکلفانہ چہک چہک تقریباً بند ہو گئی۔ انہیں شاید اپنے سفر میں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ ایک غیر ملک میں اجنبی ہیں۔ کسی اور پر ان کے کرایوں کا بوجھ پڑا تھا، اس خیال نے بھی انہیں بجھا دیا۔۔۔

ہم نے ایک اور لیمن اسکواش پیا۔ اس کے بعد ہی کیوریس نے چائے کا آرڈر دیا۔ وہ بھی کیوریس حیاتی لذتوں کو زندگی میں مناسب جگہ

دینے کے حق میں ہے۔ اس نے چار بڑے پیالے پیئے اور بیرے کو چائے کا پاٹ دوبارہ لانا پڑا) ـــــ میرے سب دوستوں میں سے ایچ کیورس سے بڑھ کر اس خدائی پتی کا رسیا اور کوئی نہیں . . . اس نے کبھی چائے کا ایک اور پیالا پینے سے انکار نہیں کیا۔ میں نے خود اسے ایک دفعہ تین گھنٹوں میں آنکھ جھپکے بغیر پچیس پیالے پیتے دیکھا ہے

میرا خیال ہے یہ وکٹر کا اسٹیشن تھا کہ "ایفی شنٹ انسان کار کے اندر آیا۔ وہ ایک بڑا دوہرے جسم کا آدمی تھا۔ اس کے سیاہ چمڑے کے کرخت نقوش کے چہرے پر جلی حروف میں "بزنس اگزکٹو" چھاپے کی طرح صاف لکھا ہوا تھا۔ وہ خود اعتمادی اور حکمانہ صلاحیت کا مجسمہ تھا اس کی آواز پاٹ دار تھی۔ ایسے شخص کی آواز جو حکم چلانا اپنا حق سمجھتا ہو۔

اس نے آکر اندر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ کئی ایک میزیں خالی تھیں لیکن کسی وجہ سے وہ ہماری میز پر آ بیٹھا . . .

"ڈیری ہاٹ" ایفی شنٹ آدمی نے کہا۔

ایچ کیورس نے جواب دیا کہ موسم دو تین دن سے بدل گیا ہے۔

اس نے جھپاتے ہوئے سکھوں کو ایک بڑھیا قسم کی تحقیر سے دیکھا "سکھ بڑے نائزی ہیں۔ انھیں مینرز نہیں آتے ــ"

ایچ کیورس نے کہا "سکھ ایک جوشیلی ہارڈی قوم ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایسے تھے۔"

"مجھے خوش آیند شور بُرا نہیں لگتا" میں نے جواب دیا۔ ایفی شنٹ آدمی نے مجھے سرسری طور پر دیکھا۔ پھر جیسے اس نے فیصلہ کیا کہ میں کسی شمار میں نہیں۔ اس نے مجھے مکمل طور پر نظر انداز ہی کر دیا۔

"بیرا۔ کافی لاؤ۔ آپ کافی پئیں گے" اس نے ایچ کیورس سے پوچھا۔

ایچ کیورس نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس نے ایچ کیورس کو بتایا کہ وہ ایک فرم کا اگزکٹو ہے جو عمارتوں میں کام آنے والا ایک واٹر پروف پینٹ بناتی ہے۔ اس کا کارخانہ کراچی میں ہے اور وہ اب آرڈر کے لئے اور کاروباری تعلقات پیدا کرنے کے لئے پنجاب اور فرنٹیر کا ٹور کر رہا ہے۔ ایچ کیورس خود ایک سول انجینیر ہے۔ اس نے واٹر پروف پینٹ میں دلچسپی ظاہر کی۔ گفتگو بے حد ٹیکنیکل ہو گئی۔ بزنس اگزکٹو اب اپنی زمین پر تھا۔ واٹر پروف پینٹ ہی شاید ایک ایسا موضوع تھا جس پر وہ پوری واقفیت اور فیصلہ کن طریقے سے گفتگو کر سکنے کا اہل تھا۔ اس کے نزدیک دنیا کی موجودہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا واحد علاج اس کا واٹر پروف پینٹ تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ہمارے اور ہمارے انجینیرنگ ڈیپارٹمنٹ کے کئی افسروں کے پتے ڈائری میں نوٹ کرنے کے بعد ایفی شنٹ آدمی نے ہم سے اجازت چاہی ـــــ یہ خود اعتماد دنیاوی آدمی کتنے قابلِ رشک ہیں۔ کاش ہم سب ان کی طرح ہو سکتے۔ سب انسان ان کے لئے بیرے ہیں۔ دنیا ان کے بھاری قدموں کے نیچے ہے۔ ان کے دماغ میں کوئی ایچ پیچ، کوئی بکواس نہیں۔ وہ صرف روزانہ پیپر پڑھتے ہیں اور کبھی کبھار ایک جاسوسی ناول۔ کتنے مستعد، چالاک اور ہوشیار وہ اپنے کاروبار میں ہوتے ہیں آدمی ان کو حیرت سے نہ دیکھے تو کیا کرے! خدا جانے کس سکول اور ماحول میں ان کے یہ قابل دماغ تربیت پاتے ہیں۔ کونسا تقدیر کا چکر، کون سے خارجی حالات اور حادثات ایسے آدمیوں کو ڈھالتے ہیں جو "گو کر سکتے ہیں"! ـــ دماغ کی کون سی عجیب تعلیم ایسے کامیاب آگے بڑھنے والے لوگ پیدا کرتی ہے۔ ہم بے چارے نااہل بزدل آدمی محض تعجب ہی کر سکتے ہیں! مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ ایفی شنٹ انسان کا ٹائپ ہزاروں سال پہلے بھی اس کرۂ پر جانا پہچانا تھا۔ وہ وہ آدمی تھا جو کوڑے کے ساتھ گدوں پر آرام سے لیٹتا تھا۔ اور جب گیلی کے کئی سو کھینے والے غلام چپو چلاتے چلاتے نڈھال ہو کر سست ہو جاتے تھے تو اس کے کوڑے کی چٹاخ انھیں پھر ہوشیار کر دیتی تھی۔ یہ آدمی اصل رکم ہیں۔ ہم صرف ان کے غلام ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں روح

نہیں ہے اور ڈھلتی ہوئی شفق کا حسن بھی ان کے دل سے واٹر پروف پینٹ نہیں دھو سکتا۔ کیسی موٹی اور مضبوط کھال ان انڈیفرنٹ لوگوں کی ہوتی ہے!

کچھ عرصہ سے ایپی کیورس اور میں سرداروں کو چائے کی دعوت دینے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ہم دونوں چینی لوگوں سے گفتگو میں پہل کرنے کے معاملے میں شرمیلے ہیں۔ میں ایپی کیورس کو جا کر سرداروں کو مدعو کرنے کے لئے کہتا، اور وہ مجھے — آخر میں نے جی کڑا کیا۔ سرداروں کی میز کی طرف گیا۔ اور اس پر اپنے ہاتھ ٹیک کر میں نے لڑکھڑاتے لہجے اور سرخ چہرے سے انھیں اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی۔ پتلے سکھ نے انگریزی میں شائستگی سے معذرت کی۔ میں نے ٹکٹ چیکر کے رویے کے لئے معافی مانگی۔ انھوں نے ایک ایک کر کے اپنے نام بتائے۔ ان کے مسلمان لاہوریئے دوست کی باری آئی تو وہ پھر چھیڑ سے باز نہ رہ سکا۔ "میرا نام چپن وال ہے — انڈین نیشنل" اس کے ساتھی ہنسے۔ پھر میں نے اپنا تعارف کرایا۔ پتلے سکھ نے مجھے بتایا کہ وہ جالندھر میں کسی ٹینری کے امپورٹ کے کاروبار میں ہے . . . میں آخر اپنے مشن میں ناکامیاب ایپی کیورس کے پاس لوٹ آیا۔

ہم اب لاہور کے نزدیک تھے۔ اندھیری مخملی رات میں پیلی نیلی اور سرخ روشنیاں بکھر رہی تھیں۔ ہمارے دلوں نے وہ لذیذ دھڑکن محسوس کی جو لاہور میں وارد ہونے والے ہر سچے مسافر کو محسوس ہوتی ہے۔ تم خواہ پہلی بار لاہور کے نزدیک آؤ خواہ تمھیں بار، یہ عجیب طرح کی اُٹھان یہ پُر اشتیاق دھڑکن تمھیں ضرور محسوس ہوگی۔ لاہور ایک ایسی کافر محبوبہ ہے — لاتعداد دلربائیوں اور عشوہ طرازیوں کی حامل کہ اس کے چاہنے والے اس کے لئے ہمیشہ تڑپتے رہتے ہیں۔ گاڑی اسٹیشن سے پہلے رکی۔ پھر آہستہ آہستہ دبے پاؤں چلتی ہوئی جگمگاتے ہوئے پلیٹ فارم نمبر چار میں داخل ہو گئی۔

لاہور پورے دو سال کے بعد! —— باہر اسٹیشن کے وسیع ایوان میں کھڑا تھا۔ اسے آج ہمارے آن پہنچنے کی امید نہ تھی اس لئے وہ پلیٹ فارم پر نہ آیا تھا۔ وہ چند ٹیکسیوں کا مالک ہے۔ اس اچھے آدمی نے اپنی ایک ٹیکسی منگوا کر ہمارا سامان ڈکی میں رکھوا دیا۔ اس نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ہم سے پیسے نہیں لے۔ یہ کہتے ہوئے وہ ہنسا کیونکہ یہ بات کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ ہم قیصر کے کوزی آرام میں اس اسرار اور جادو کی دنیا میں پھسلتے ہوئے گئے جو شہر لاہور ہے۔ ہم پہلے پنجاب ٹرانسپورٹ کے اڈے پر جوہر آباد جانے والی بس کا پتہ کرنے کے لئے گئے۔ "ساڑھے پانچ بجے صبح بس چلتی ہے" ہمیں بتایا گیا۔ اس کے بعد ہم سیدھے ہوٹل میں آئے۔ ہوٹل مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر ہمیں ہوٹل کے بیک یارڈ میں ایک لمبا، قدرے افسردہ کمرہ مل گیا۔ یہ کمرہ قتل کے لئے بنا تھا۔ جب کبھی مجھے کسی شخص کو قتل کرنے کی خواہش ہوئی تو میں اسے ہوٹل کے اس کمرے میں لے جاؤں گا۔ کمرے کے پیچھے ایک کوڑے بھرا صحن بھی ہے نعش کو بڑے مزے اور چپکے سے وہاں پھینکا جا سکتا ہے۔

لاہور میں ہمیں جو سب سے ضروری کام کرنا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ہم نے "آن دی واٹر فرنٹ" فلم دیکھنا تھی جیسے ہی ہمارا سامان کمرے میں رکھا گیا۔ ہم اسے مقفل کر کے تانگے پر کراؤن سینما پہنچے۔ ہم دوسرے شو کے شروع ہونے سے چند منٹ پہلے ہی پہنچ گئے۔ فلم کو ہم نے پسند کیا کیونکہ یہ سات اکادمی ایوارڈ جیت چکی تھی۔ اسے ناپسند کرنا گویا اپنی کور ذوقی اور اوسط خیالی کا اقرار کرنا تھا۔ ایپی کیورس زیادہ تر فلم کے ہیرو مارلن برانڈو کی دماغی حالت کا مطالعہ کرنے گیا تھا۔ ہمیں پاگل یا تقریباً پاگل لوگوں سے بڑی محبت ہے۔ فلم کے بعد ایپی کیورس نے مجھے نہایت اطمینان سے خوش خبری دی کہ مارلن برانڈو اب دیوانگی کی مبارک منزل سے زیادہ دور نہیں —— یہ سارا مذاق نہیں پھر بھی فلم اپنی معمولی کہانی کے حقیر مصنوعی ڈھانچے کی حدود میں نہایت خوبی سے ایکٹ کی گئی تھی بلاشبہ اسے دیکھنا ایک پر شدت جذباتی تجربہ تھا اور اس میں دو تین ایسے سین تھے جو ہمیشہ کے لئے ذہنوں پر داغ ہو جاتے تھے۔ فلم سے آتے ہی ہم بستر بند کھول کر اپنے کپڑوں اور بوٹوں سمیت سو گئے۔ جب میری آنکھ کھلی، کمرے کی بتی آن تھی اور ایپی کیورس اُٹھ چکا تھا۔

"اٹھو بھئی" ایپی کیورس نے کہا "ساڑھے چار ہو گئے۔"

"کیا جوہر آباد جانا ضروری ہے" میں نے پوچھا۔

"قطعاً"

ایک دیہاتی الوداع

ہم بس کے اڈے پر پہنچے تو ابھی چھوٹی صبح کا وقت تھا۔ رات کے سائے ابھی چھائے ہوئے تھے۔ بکنگ کلرک ابھی نہیں آیا تھا۔ ہم چائے کی ایک چھوٹی دوکان میں میٹھی چائے اور مکھن لگے برے بنوں کا ناشتہ کیا۔ ان چھوٹی چائے کی دوکانوں میں، جو ساری رات کھلی رہتی ہیں مجھے کچھ رومانٹک ماحول نظر آتا ہے۔ ان کی کھردری لمبی میزیں، ٹین کی کرسیاں، نیلی تام چینی کی پیالے دانیاں ۔ ۔ ۔ ۔ میں ان سب سے محبت کرتا ہوں — اور لوگوں سے بھی جو وہاں آتے ہیں۔ یہاں ہمیشہ ایک رفاقت کی — خوشبو — ہوتی ہے اور تم وہاں زندگی کی گہما گہمی کا مزا چکھتے ہو۔ ہم نے اپنے آپ کو بچا، دیگا یا زندہ" محسوس کیا۔ وقت اب ساڑھے پانچ کا تھا۔ بکنگ کلرک اب بھی لاپتہ تھا۔ ہم نے سامان کو اپنی بس کی چھت پر رکھوا کر اس میں ڈیرہ جما دیا۔ کیور نے صبح کا اخبار ایک لڑکے سے خریدا اور ہم نے اسے پڑھنے کے لئے بس کی اندر کی روشنی کو آن کر دیا۔ جونہی ہم نے اسے آن کیا۔ وہ ڈھیلا ڈھالا مخولیہ کنڈکٹر اندر چلا آیا۔

بادشاہو تسیں لیٹ آن کر دتی اے بیٹری ڈاؤن ہو گئی تے رستے وچ ہی رہ جانگے۔ اس نے لائٹ آف کر دی۔ اس وجہ سے بس کنڈکٹر گویا ہمارا دوست بن گیا۔

بس اڈے سے چلی تو پو پھٹ رہی تھی۔ لاہور کا شہر بیدار ہو رہا تھا۔ بھوری اینٹ اور پتھر کی عمارتیں انگڑائی لے کر جاگ رہی تھیں۔ ویسے تو لاہور ہر وقت ہی خوبصورت ہے لیکن صبح تڑکے کے وقت شہر ایک طلسماتی — روپ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ بڑا عجیب ہے کہ ہمارے شاعروں نے لاہور کی صبح پر نظمیں نہیں لکھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو یہاں اصل شاعر ہیں ہی نہیں اور اگر ہیں تو انھوں نے لاہور میں صبح ہوتے دیکھی نہیں اتنے اہم اور عظیم منظر کا گذرنا کسی شاعر کو کیسے بے حس چھوڑ سکتا ہے۔ ہمارے جدید نوجوان اور طباع شاعروں میں سے ایک دو اس نوع پر ایک آدھ اور بیدگار سانیٹ لکھنے کے ضرور اہل ہیں۔ لیکن وہ اس وقت نئے "مذہبوں کے بانیوں پر قصیدے اور مرثیے مرتب کرنے میں مصروف ہیں جن کو وہ شاعری سمجھتے ہیں۔ ان کے یہ قصیدے دوسرے روز ہی اتنے پرانے ہو چکتے ہیں جتنا کل کا اخبار۔ آہ! شاعری کی کشت پر خزاں کا سایہ ہے۔ بڑے شاعروں کا زمانہ شاید اب ہمیشہ کے لئے بیت چکا۔ اردو شاعری کو غالب، میر اور اقبال پھر نصیب نہ ہوں اس لئے لاہور کی صبح کی رو بہو نقاشی اب شاید کبھی نہ ہوگی۔ ہمارے شاعر اتنے ہوشیار اور ترقی یافتہ ہو گئے ہیں کہ وہ اس قسم کی چیزوں پر مزید وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ ہر وہ چیز جس کا تعلق بالواسطہ ان کے محبوب موضوع سے نہیں ہے ان کے نزدیک فرسودہ اور بورژوا رجحانات کی حامل ہے۔

ہم راوی پر سے گذر کر شیخو پورہ جانے والی سڑک پر مڑے تو سورج نکل آیا۔ ہمارے گرد کی وسیع کھیتوں اور سبزے کی دنیا دیکھی۔ ہمارے دل گانے لگے۔ ہوا میں بہار کا سانس تھا۔ فصلیں کٹ چکی تھیں اور کٹے ہوئے کھیت پیلے سونے کے سے تھے۔ جن بجلی کے تاروں کو اٹھانے والے لوہے کے برج اس پرسکون دیہاتی سین پر دیووں کی طرح بدصورت لگتے تھے —————— ان کو یہاں ہونے کا کوئی حق نہ تھا —— بھینسیں اور گائیں کھیتوں میں کاہلی سے چر رہی تھیں اور دکھوں اور فکروں سے بھرے ہوئے دل کو عجیب سکون اور راحت دیتی تھیں۔ ان کی زندگی بیشتر انسانوں سے کہیں خوبصورت تھی — وہ گھنٹوں کھڑی ہو کر نیلے آسمان کو دیکھ سکتی تھیں۔

ہمارے شیخوپورہ پہنچتے پہنچتے ہلکے بادلوں کے آ جانے سے دن دھندلا گیا۔ ایک سیمیں سا کہرا اکبر کے تخت جگت شیخو بابا کے شہر پر اتر آیا۔ شیخو پورہ ایک رومانٹک نظر آتا ہوا شہر ہے۔ پنجاب کے بہت سے شہروں کی مثل۔ دودھ، دہی اور پھلوں کی دوکانوں سے بھرا ہوا۔ اس کے سرخ اینٹوں کے پرانے مکان بارش اور

ہوا کے اثر سے کالے ہو رہے ہیں۔ ایک اونچائی پر سیاہ تیوری کی طرح اپنے جھروکوں اور محراب دار بالکنیوں کے ساتھ پرانا قلعہ ہے جس کی پتھریلی سنگلاخ دیواریں مرورِ زمانہ سے سیاہی مائل ہو گئی ہیں۔ اور جو شہر پر چھایا ہوا ہے۔ شیخوپورہ سے اس کے قلعے کو لے لو تو اس میں سوائے اس کی غلیظ دکانوں اور سڑکوں اور ماضی کے باغوں کے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ شیخوپورہ ضلع کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ہماری لاری وہاں اڈے میں پندرہ منٹ رکی اور ہم نے وہاں ماضی کی خوبصورت شیخوپورہ سے چل کر ہم کھیتوں میں پڑے ہوئے کئی قصبوں اور چھوٹے شہروں میں سے گزر گئے۔ بعض میں تھوڑی دیر کے لئے رکتے ہوئے اور اکثر کو نظر انداز کرتے ہوئے کئی دفعہ دیہاتی مرد اور عورتیں ہاتھ کھڑے کر کے بس کو ٹھہراتے۔ ان میں سے کئی اپنے گاؤں سے گھوڑیوں پر چڑھ کر بس کے سٹاپ پر پہنچے تھے اور شاید گھنٹوں سے لاری کا انتظار کر رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر صفراوی المزاج چڑچڑے ڈرائیور اور اس کے کنڈکٹر میں ہمیشہ پیچ ہو جاتی۔ یہ دائمی کل کل اور تکرار ان میاں بیوی کے جھگڑوں کی سی لگتی جو بظاہر ایک دوسرے سے سیر ہو چکے ہوں۔ زبردستی ہمیشہ ڈرائیور کی ہوتی اور ہماری ہمدردیاں قطعی طور پر مقطع داڑھی والے چشمہ لگے کنڈکٹر کے ساتھ ہوتیں۔ یہ شخص کنڈکٹر سے زیادہ ایک امام مسجد لگتا تھا۔ اور مجھے شک ہے کہ ہم میں سے کئیوں کی طرح اپنے اس پیشے پر فٹ نہ آتا تھا۔ مگر وہ ایک سادہ دل، [illegible] آدمی تھا اور ڈرائیور کی جھڑکیوں کو ایک فلسفی کی طرح خوش مزاجی سے قبول کرتا تھا۔ ہم نے اسے صرف ایک بار قدرے برہم ہوتے دیکھا اور وہ بھی ایک لمحے کے لئے۔

بس کسی سواری کو چڑھانے کے لئے ٹھہرتی تو کنڈکٹر بڑے مزے سے نیچے اترتا اور چڑھنے والے دہقان سے پوچھتا "بزرگو! آپ نے کہاں جانا ہے؟" یہ ایک ضروری استفسار تھا کیونکہ کئی مسافروں کو سوار ہونے کے بعد پتہ چلتا کہ وہ غلط بس میں چڑھ گئے ہیں۔ کنڈکٹر سواریوں کو ایسے مطلع کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ وہ پہلے ہی اپنا اطمینان کر لیں کہ ان کے پاس منزل پر پہنچنے کے لئے پورا کرایہ موجود بھی ہے۔ اب ایسی پوچھ گچھ میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے مگر اس سے ڈرائیور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا۔

"اوئے مولوی!" ڈرائیور برہمی سے چلاتا "تم تو سواریوں سے باقاعدہ مجلس گرم کرنے لگ جاتے ہو۔"

"زبردستو" کنڈکٹر کہتا "پوچھ لینا اچھا ہوتا ہے، ورنہ میں نے ان سے کون سا گھوڑا لینا ہے۔"

ایک بار جب ایک ایسی سواری چڑھ آئی جسے اور لاری میں چڑھنا چاہئے تھا، تو ڈرائیور کے غصے کا پارہ چڑھ گیا۔ "اوئے مولوی! تم کو بس کنڈکٹر کس نے بنا دیا۔ تم کو یہ بھی پتہ نہیں کہ سواری کو پوچھے بغیر نہیں چڑھانا چاہئے۔"

ڈرائیور اپنے کنڈکٹر پر بلاوجہ برہم تھا۔ زبردست ہونے کی وجہ سے اس کا ٹھینگا ہمیشہ کنڈکٹر کے سر پر رہتا، خواہ اس کا قصور ہوتا یا نہ ہوتا۔ مولوی کنڈکٹر کا مزاج اس تکرار سے قطعاً مکدر نہ ہوتا۔ وہ اس کا عادی تھا۔ ممکن ہے وہ اس تکرار کو ناپسند نہ کرتا ہو۔ صرف ایک دفعہ وہ عاجز ہو کر ڈرائیور کے سامنے بول پڑا۔ بس چنیوٹ کے آگے چناب کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ ایک دہقان اپنے گدھوں کو ہنکاتا ہوا سامنے سے آ رہا تھا۔ اس نے اپنے گدھوں کو روکنے اور ایک طرف کرنے کی پوری کوشش کی مگر وہ کسی طرح ہٹتے نہ تھے اور سڑک کو روکے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے بس کو روک دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے گرم ہو کر کنڈکٹر کو ڈانٹا "مولوی تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اچھے کنڈکٹر ہو۔ نیچے اتر کر گدھوں کو کیوں نہیں ہٹاتے۔"

مولوی نے غصے میں کہا "میاں جی! یہ عجب تماشا ہے۔ کنڈکٹر کا یہ کام تو نہیں کہ گدھوں کو ہٹائے۔"

لیکن پھر اس نے بس سے اتر کر ڈرائیور کے حکم کی تعمیل کی اور دہقان کو گدھوں کے ہٹانے میں مدد دینے لگا مگر اس خوش مزاجی اور مسخرے پن سے کہ خود ڈرائیور بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

کوئی گیارہ کا وقت ہو گا کہ ہم ایک چھوٹے قصبے کے اڈے پر رکے جس کا نام شاید پنڈی بھٹیاں تھا۔ اڈے میں ایک ممتاز خوبی تھی۔ وہ دو رویہ درختوں

اور مسافر خانوں کے آخر میں ایک محرابوں والا اونچا دروازہ۔ سڑک اس میں سے ہو کر گذرتی تھی کھیتوں کی ہریالی یہاں ایک بھولی بسری کہانی تھی۔ قصبہ ایک خیالے اور کھردرے علاقے میں تھا۔ سورج کی گرمی اب تیز ہو رہی تھی اور اگرچہ یہ ابھی اپریل کا وسط ہی تھا مگر گرما کی دوپہروں کی ویران اداسی اڈے کی فضا پر محیط تھی۔ لاری یہاں کافی دیر ٹھہری، ہم نیچے اتر آئے۔ دیہاتی مردوں اور عورتوں کے ایک گروہ نے ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ایک کنبے کے افراد تھے دور اور نزدیک کے قرابت دار۔ اور اپنے ایک بیمار قرابتی کو لاری میں چڑھانے کے لئے آئے تھے۔ ایک چھوٹی سرخ رنگ کی گھوڑی جس پر ایک دیسی کاٹھی کسی تھی، پاس بندھی تھی۔ میں نے سوچا کہ بیمار قرابتی اس پر چڑھ کر آیا تھا۔ باقی گھرانے کے افراد کیا مرد کیا عورتیں اپنے دور کے گاؤں سے پیدل کر آئے تھے۔ مریض آدمی ایک بیس سالہ دبلا دیہاتی تھا۔ اس کا ہلکی داڑھی والا چہرہ مٹی کی رنگت کا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک مدقوق کی آنکھوں کی مانند عجیب بخار سے جلتی تھیں۔۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ واقعی دق کا مریض ہے اور سرگودھا کے ہسپتال میں داخل ہونے جا رہا ہے۔ اس کی ماں — ایک بوڑھی سکڑی ہوئی خمیدہ کمر عورت اپنے بیٹے کے ہمراہ جا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عمر کے غموں اور دکھوں نے اپنی نشانیاں ثبت کی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے بیٹے کی بیماری سے مارہی تھی۔ قرابت داروں میں سب سے معتبر ایک گھنے داڑھی مونچھوں والا چودھری تھا۔ اس کا سیاہ چمڑے کا چہرہ ایک اُلّو کے چہرے کی طرح سنجیدہ تھا۔ وہ الگ جگہ ایک لاٹ بنا ایستادہ تھا اور گھلتے ہوئے مریض اور اس کی ماں کو دلاسے اور تسلیاں دیتا تھا۔ "فکر نہ کر ماسی۔ اللہ حق داد کو شفا دے گا۔" دوسرے عزیزوں میں میں نے ایک نئے بیاہے ہوئے جوڑے کو نوٹ کیا۔ نو بیاہتا دیہاتی جوڑوں میں کھلتے ہوئے پھولوں کی رعنائی اور رنگینی ہوتی ہے۔ وہ تم ان کو ایک مجمع میں الگ کر کے بتا سکتے ہو۔ ان کی حرکات میں جوانی کی سہل بے پروائی ہوتی ہے اور ان کے چہروں میں بہار کی شادابی۔ بلاشبہ وہ ایک دائمی دھنک کے رنگوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ غم کے سانس نے ابھی ان کو نہیں چھوا ہوتا۔ وہ ایک اٹھارہ سال کا کڑیل لڑکا تھا۔ اس نے ایک لٹھے پھر کا سیاہ چولا پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں طِلّے دار جوتی، اور سر پر رنگا ہوا صافہ۔ شاید اس نے اس اہم ترین دن کو بھی یہی لباس پہنا ہوا تھا جب وہ گھوڑی پر لاڑا بنا ایک البیلے سورما کی طرح اپنی دلھن کو بیاہنے نکلا ہوگا۔ عورت اس کی ہم عمر تھی۔ اور ایک مطمئن اور نخریلی بلی کی طرح ایک درخت کے سایہ کے نیچے بیٹھی تھی اور نیم نیلی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ دق زدہ نوجوان کا جانا اس کے لئے کچھ نہ تھا جب بیمار بس میں چڑھنے لگا تو اس کے سارے عزیز اور اقربا اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس منظر میں ایک حزن تھا جسے کوئی الفاظ کبھی بیان نہ کر سکیں گے اس نے باری باری سب کو گلے سے لگایا۔ کئی آنکھوں میں آنسو ڈھلک آئے اور رندھی ہوئی آوازوں میں اس کی ماسیوں اور خالاؤں نے اسے دلاسے دیئے کہ وہ جلد ہی شفایاب ہو جائے گا۔ بیمار آدمی کی "صبوحی" کو میں نے نہ دیکھا۔ شاید اس کی "صبوحی" تھی ہی نہیں اور اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کو الوداع کہنے والے اقربا دل میں جانتے تھے کہ حق داد کی گھلا دینے والی بیماری مہلک اور جان لیوا ہے کہ اس دنیا میں اس کے ایام اب گنے ہوئے تھے۔ اس دیہاتی الوداع کی تصویر میرے ذہن میں نقش ہو گئی ہے۔ یہ احمد ندیم کے ایک افسانے روشن قطعے کی طرح ذہن میں ڈنگتی رہتی ہے اور صبوحی کے شاعر، عاشق نے ہماری خوش قسمتی سے ان دیہاتی مفاد قتوں کے احسن اور رومان کو سینے پر کار نقشوں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے ہم اس کے کتنے کتنے شکر گزار ہیں!

اس قصبہ سے آگے بیت گئے، دو سرخی، کل میدان تھے جن پر کبھی ہل نہیں چلا تھا۔ بھوری پہاڑیاں نمودار ہوئیں — جو میں پڑے ہوئے کاغذ کی ...۔ ہم چنیوٹ کے پاس چناب کی سرخ ابلتی ہوئی وسعت کے اوپر سے گذرے۔ دریا کے پرے "ربوہ" بیرک نما مکانوں کا ایک طویل شہر تھا۔ تین چار سیمنٹ کنکریٹ کی بنی ہوئی شاندار کوٹھیاں اس میں نمایاں تھیں اور اپنی کیوریس اور میں نے قیاس دوڑایا کہ احمدیہ جماعت کے موجودہ خلیفہ ان میں سے ایک میں رہتے ہوں گے۔ ربوہ میں زندگی کے آثار نہ تھے جھلستے ہوئے سورج کے نیچے شہر ایک مستقل ویرانی تھا۔

ایک چھوڑی ہوئی چھاؤنی۔ سنا ہے اس سے پرے میلوں زمین بھی احمدیہ جماعت نے حاصل کر رکھی ہے۔ یہ زرخیز چراگاہ ہے جس میں گھاس آدمی کے قد جتنی لمبی ہوتی ہے۔۔۔۔

ساڑھے بارہ بجے ہم سرگودھا میں سے گذرے۔ سرگودھا عمدہ عمارات، خوشنما کوٹھیوں اور باغات کا شہر ہے۔ علیل نوجوان اور اس کی خمیدہ ماں دق کے ہسپتال کے سامنے اُترے اور ہم نے ان کو مایوس ماندے قدموں کے ساتھ ہسپتال کی شاندار، بارعب عمارت کی طرف جاتے دیکھا۔ آگے خوشاب ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ یہاں تم گویا پربت کی سنہری پہاڑیوں کے سائے میں آ جاتے ہو اور اچانک ان کی موجودگی سے آگاہ ہو جاتے ہو۔ ہمارا احمد ندیم بھی تو انہی پہاڑوں کا رہنے والا ہے۔ ایچی کیوڈس نے مجھے بتایا کہ یہ پہاڑ نمک کا پہاڑ ہے۔ یہ نمک کا ہو سکتا ہے مگر یہ تو گلابی اور عنبر کے رنگ کا ہے۔ یہ ایک مستقل طور پہ جھانکتا ہوا پہاڑ ہے اور خوشاب کے بازاروں اور کوچوں کو ایک زندہ شفیق دوست کی مانند دیکھتا رہتا ہے۔ لوگ کڑیل اور صحتمند اور جاندار ہیں۔ ان میں اپنے وطن اور نسل کا غرور ہے اور وہ اپنے کو ایک مردانہ وجاہت سے گیری کرتے ہیں۔ دنیا میں بہترین چیز ایک پہاڑ پر رہنا ہے اور اس کے بعد دوسرے درجے پر ایک پہاڑ کے دامن میں یا اس کی دید میں رہنا ہے۔ کوہستانی لوگوں میں ایک ایسی کٹیلی مردانگی اور لطافت آ جاتی ہے جو میدانوں میں رہنے والوں میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

خوشاب سے ہماری منزل بمشکل چار میل تھی اور ایک بجے دوپہر کو ایچی کیوڈس اور میں جوہر آباد کے بس کے اڈے کے باہر تپتی دھوپ میں اپنے بستروں اور سوٹ کیسوں کے انبار کے پاس قدرے بجھے ہوئے کھڑے تھے۔ اس سارے سامان کو ایچی کیوڈس کے میزبان کے گھر لے جانا ہمارا پرابلم تھا۔ دور دور تک نہ کوئی تانگہ نظر آتا تھا اور نہ کوئی مزدور۔ ہم نے اپنے آپ کو اتنے سامان کے ساتھ سفر کرنے پر دل میں کوسا۔

(مسلسل)

فراق گورکھپوری

○

"فنون" کے ایک قاری نے ہندوستان کے کسی اردو رسالے کی تازہ اشاعت میں حضرت فراق کی ایک غزل پڑھی ہے اور ہمیں اس کا انتخاب بھجوا دیا ہے۔ اس انتخاب کو شکریے کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے۔
(ادارہ)

بیانِ شوق میں نازک مقاموں سے گزرنا ہے
مجھے تیرے سکوتِ ناز سے کچھ عرض کرنا ہے

نہ جینے کی طرح جینا، نہ مرنے کی طرح مرنا
یہ جینا کوئی جینا ہے، یہ مرنا کوئی مرنا ہے

نہ سمجھیں حرفِ آخر آج کے دورِ تمدن کو
بہت کچھ نظمِ انسانی کو بننا ہے سنورنا ہے

مگر وہ بات کیا ہے؟ عمر بھر کھلنے نہیں پایا
یہی سوچا کیا، تجھ سے مجھے کچھ بات کرنا ہے

یہ مانا زندگی ہے نام آگے بڑھتے رہنے کا
اسی ہلچل میں مجھ کو، تجھ سے دو اک بات کرنا ہے

عبارت ہے یہ دنیا کچھ لکیروں، کچھ صداؤں سے
یہاں کچھ رنگ بھرنا ہے، وہاں کچھ درد بھرنا ہے

فراق اوروں کو سطحِ زندگی سے کھیل لینے دو
ہماری شاعری کو اور بھی کچھ کام کرنا ہے

فیض احمد فیض

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
رات یوں مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

سایۂ چشم میں حیراں رُخِ روشن کا جمال
سرخیٔ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ

بے پیے ہوں، کہ اگر لطف کرو آخرِ شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ

چنگ و نَے رنگ پہ تھے اپنے لہو کے دم سے
دل نے لَے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ

اک سخن اور، کہ پھر رنگِ تکلّم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

سید عابد علی عابد

○

ہم آج سوئے دشتِ تمنّا چلے تو ہیں
منزل نہیں ہے راہ میں کچھ مرحلے تو ہیں
شعلے کی آنچ بھی نہیں حدِ نگاہ تک
اس انجمن کی خیر ہو کچھ دل جلے تو ہیں
اب تک نباہے جاتے ہیں رسمِ ستم گری
وہ کاروبارِ عشق میں اچھے بھلے تو ہیں
محرومیوں پہ طعن، مری حسرتوں پہ طنز
یارانِ باصفا کے لیے مشغلے تو ہیں
ہر چند آندھیوں کا ہے تانتا بندھا ہوا
کچھ باغ میرے شہر میں پھولے پھلے تو ہیں
ہم جرمِ حسنِ یار سے ناآشنا سہی
غمہائے روزگار کے نازوں پلے تو ہیں
اے دل طوافِ کوئے ملامت کو تو بھی چل
کچھ لوگ سوئے شہرِ نگاراں چلے تو ہیں
از بر ہیں رسمِ راہ کی سب ہم کو صورتیں
تابِ جمالِ یار نہ ہو، حوصلے تو ہیں
یہ اور بات، دل میں بھی اُڑنے لگی ہے خاک
صدمے فراقِ یار کے آخر ٹلے تو ہیں
احباب کے نفاق سے الجھے ہوئے ہیں ہم
عابد ہمارے دل میں ابھی ولولے تو ہیں

فارغ بخاری

○

کچھ کم نہیں تھے ہم بھی کسی اعتبار سے
خم کھا گئے ہیں اپنی شکستوں کے بار سے

کس کو ہے اب دماغ تمنائے رنگ و بُو
نادم ہیں دل کے جذبۂ بے اختیار سے

کوئی سکون پا نہ سکے جس کی چھاؤں میں
کیا فائدہ ہے اس شجرِ سایہ دار سے

کندن بنے ہیں آتشِ قلب و جگر سے ہم
بہتر ہے اپنا غم طربِ مستعار سے

بے مہر موسموں کے تلاطم میں گھر گیا
دل کو بچا کے لائے تھے اس رہگزار سے

شاید کہ تیرگی چھٹے، شاید کہ پَو پھٹے
حالات اب ہوئے تو ہیں کچھ سازگار سے

فارغ دلِ فگار گلستاں سے کم نہیں
نسبت ہے ایک گونہ ہمیں "گل بہار" سے

باقی صدیقی

○

چل سکے دل کے نہ ہمراہ نظر کے ساتھی
رہگزر میں ہی رہے راہگزر کے ساتھی

ہر کرن دل میں بسا لیتے ہیں ہم تو، لیکن
شام تک ساتھ بھی ہوں گے یہ سحر کے ساتھی!

ہر کنارے کی طرف صورتِ دریا دیکھو
راستہ روک بھی لیتے ہیں سفر کے ساتھی

قافلے شور مچاتے ہوئے گزرے لیکن
اپنی دیوار سے آئے نہ اُتر کے ساتھی

خشک شاخوں پہ سرِ شام جو آ بیٹھتے ہیں
وہی دو چار پرندے ہیں شجر کے ساتھی

چاکِ دامن کا گلہ کرتے رہے ہم باقی
اور محفل سے اُٹھے جھولیاں بھر کے ساتھی

باقی صدیقی

○

نگارِ دشت کی جانب کوئی قدم اب تو
ہجومِ شہر میں گھٹنے لگا ہے دم اب تو

کھڑا ہوں دل کے دوراہے پہ ہاتھ پھیلائے
چھپائے چھپتے نہیں زندگی کے غم اب تو

نئے خیال، نئے فاصلوں کے ساتھ آئے
نہ مل سکیں گے کسی راستے میں ہم اب تو

مسافرانِ محبت کا انتظار نہ کر
کہ دل میں آ گئے راہوں کے پیچ و خم اب تو

ہنسو کہ دل کے غموں کا کوئی علاج نہیں
ہے داغ اپنے ہی چہرے کا چشمِ نم اب تو

نکل گیا ہے سفینہ ترا کدھر، باقیؔ
صدائیں آتی ہیں ساحل سے دمبدم اب تو

قتیل شفائی

○

ذکرِ حبیب ہے کہیں فکرِ معاش ہے
سب کو یہاں کسی نہ کسی کی تلاش ہے

ہر دل میں حسرتوں کے ہیں مدفن بنے ہوئے
ہر شخص آپ اپنی امیدوں کی لاش ہے

سب جانتے ہیں پر کوئی پہچانتا نہیں
اس شہر میں ہماری بھی کیا بود و باش ہے

کہتا ہے جھیل سے کبھی کنکر کی داستاں
اب تک جو سطحِ آب پر اک ارتعاش ہے

احساس کے افق پہ سرِ شامِ غم قتیلؔ
نکلا ہے کوئی چاند مگر قاش قاش ہے

قتیل شفائی

○

تصویر کے رنگوں کا مزاج اور ہی کچھ ہے
وہ حسن جو کل اور تھا آج اور ہی کچھ ہے

بتخانے پرستش کو بنا کرتے تھے پہلے
اِس دور میں پوجا کا رواج اور ہی کچھ ہے

ماضی میں بھی اک جُرم تھا انسان کا جینا
جو ہم کو ملا ہے وہ سماج اور ہی کچھ ہے

مانا کہ بڑا چین ہے آنچل کی ہوا میں
لیکن مرے زخموں کا علاج اور ہی کچھ ہے

اے بادشہِ حسن! طلب کر نہ زر و مال
ہم اہلِ محبت کا خراج اور ہی کچھ ہے

جھک جائے قتیلؔ آپ کا سر جس کو پہن کر
اُس تاج کی کیا بات! وہ تاج اور ہی کچھ ہے

ناصر کاظمی

○

یوں ترے حسن کی تصویر غزل میں آئے
جیسے بلقیس سلیماں کے محل میں آئے

نہیں آتی ہے تو راتوں ہمیں آتی نہیں نیند
اور اگر آنے پہ آجائے تو پل میں آئے

ہر قدم دست و گریباں ہے یہاں خیر سے شر
ہم بھی کس معرکۂ جنگ و جدل میں آئے

جبر سے ایک ہوا ذائقۂ ہجر و وصال
اب کہاں سے وہ مزا صبر کے پھل میں آئے

میرے حصّے کا بھی اک دَور چلے آخرِ شب
اے فلک کچھ تو مکافاتِ عمل میں آئے

زندگی جن کے تصوّر سے جِلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے

ہمسفر تھی جہاں فرہاد کے تیشے کی صدا
وہ مقامات بھی کچھ سیرِ جبل میں آئے

کارِ دنیا میں تو ہم فرصتِ غم سے بھی گئے
چین سے ہیں جو تری زلف کے بل میں آئے

جن کی شیرینیٔ گفتار پہ تھا زعم ہمیں
آج وہ بھی لیے شمشیر بغل میں آئے

اُٹھ کے اک بار اُلٹ دوں غمِ دنیا کی بساط
اتنی طاقت تو مرے بازوئے شل میں آئے

یہ بھی آرائشِ ہستی کا تقاضا تھا کہ ہم
حلقۂ فکر سے میدانِ عمل میں آئے

نام چلتا ہے زمانے میں اُنھیں کا ناصر
کام جو عقدۂ حالات کے حل میں آئے

ادا جعفری

○

کیا جانیے، کس بات پہ مغرور رہی ہوں
کہنے کو تو جس راہ چلایا ہے چلی ہوں

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں، جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

پھولوں کے کٹوروں سے چھلک پڑتی ہے شبنم
ہنسنے کو ترے پیچھے بھی سو بار ہنسی ہوں

تیرے لیے تقدیر مری جنبشِ ابرو
اور میں ترا ایمائے نظر دیکھ رہی ہوں

دل خون ہو لیکن نہیں توہین گوارا
تم رُک کے بڑھے ہو تو کئی گام ہٹی ہوں

صدیوں سے مرے پاؤں تلے جنتِ انساں
میں جنتِ انساں کا پتہ پوچھ رہی ہوں

اس راہ پہ ٹکرایا ہے کس کس نے جبیں کو
کس آس پہ اے سنگِ سرِ راہ چلی ہوں

جس ہاتھ کی تقدیس نے گلشن کو سنوارا
اُس ہاتھ کی تقدیر پہ آزردہ رہی ہوں

قسمت کے کھلونے ہیں، اجالا کہ اندھیرا
میں شعلہ صفت تھی، سو بہرحال جلی ہوں

مظفّر علی سیّد

○

نہ سیم و زر سے یہ چولا بدل فقیرانہ
تو اَغنیا سے کوئی چال چل فقیرانہ

اُسے بتاؤ کہ جوگی کسی کا میت نہیں
اُسے سُناؤ یہ ضرب المَثَل فقیرانہ

سخی ملے جو کہیں پر، تو آنکھ نیچی کر
بخیل دے جو دکھائی، اُچھل فقیرانہ

کوئی خیال، کوئی یاد اپنے ساتھ نہ لے
ہے نااُمید تو گھر سے نکل فقیرانہ

رہِ طلب میں ملی قیس کے سوا کس کو
مسافرانہ جوانی، اَجَل فقیرانہ

سوال کرتے ہیں لیکن بڑے غرور کے ساتھ
مزاج اُن کا بھی ہے آج کل فقیرانہ

کرائیں اپنی زیارت ہی اولیا کی طرح
ملا جو کرتے تھے پہلے پہل، فقیرانہ

ہمارے دوست کہ کرسی نشیں ہوئے سیّد
اُنھیں کو ہم نے سنائی غزل فقیرانہ

مظفر علی سیّد

○

ہلّہ ہر نام پہ جب بول دیا ، اِلّا اللہ
پھر خدائی ہے ، نہ ہے کوئی خدا اِلّا اللہ

میرے انکار سے ایمان کی راہیں روشن
کوئی معبود نہ دنیا میں بچا اِلّا اللہ

حسن باطل ہے ترا ، آنکھ منافق میری
وہم ہی وہم ہے سب ما زاد اِلّا اللہ

کالکیں کھول کے رکھ زاغ کو رحمت ہی ترے
میں تو ہر قید سے آزاد ہوا ، اِلّا اللہ

دور سے کس نے کیا ، نعرۂ توحید بلند؟
پردۂ گوش سے اُٹھتی ہے صدا ، اِلّا اللہ

روز و شب بجتا ہے سازینۂ اجرامِ فلک
مل کے گاتے ہیں ندا ارض و سما ، اِلّا اللہ

لا الٰہ پڑھتا ہوں جب سامنے اُس کے سیّد
کتنے انداز سے کہتا ہے : بجا اِلّا اللہ

عبدالعزیز فطرت

○

پیار کے رنگ میں درد بہت ہیں، پھول کے روپ میں خار بہت
دل آزار طلب ہو اگر تو دنیا میں آزار بہت

سنگِ راہِ طلب پندار ہے اپنا، ورنہ چاہیں تو
گردشِ وقت کے دامن میں ہیں رنج و غم و افکار بہت

کچھ لوگوں کے ظلم کا شکوہ میرے سخن کی جان بنا
کچھ لوگوں کے لطف کا ذکر ہے اپنی زباں پر بار بہت

عشق فقط مقصود ہے اپنا، دل کا ہے مقصد ہار نہ جیت
ہم کو تجھ سے اے ذوقِ وفا! آئینِ وفا سے پیار بہت

موج ہوا بھی پاس سے گزرے تو دل چھنّے لگتا ہے
فطرتؔ اپنے سازِ دل کے کھنچ گئے شاید تار بہت

احمد فراز

○

بدن میں آگ ہے چہرہ گلاب جیسا ہے
کہ زہرِ غم کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی
یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

مگر کبھی کوئی دیکھے ہمیں پڑھے تو سہی
دل آئینہ ہے تو چہرہ کتاب جیسا ہے

بہارِ خوں سے چمن زار بن گئے مقتل
جو نخلِ دار ہے شاخِ گلاب جیسا ہے

کہاں وہ قرب کہ اب تو یہ حال ہے جیسے
ترے فراق کا عالم بھی خواب جیسا ہے

قریب ہو تو قیامت کا نہ ہو تو رات ہی رات
وہ آفتاب نہیں آفتاب جیسا ہے

فراز سنگِ ملامت سے زخم زخم سہی
ہمیں عزیز ہے خانہ خراب، جیسا ہے

احمد فراز

○

(نذرِ ندیم)

کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اُسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اُسے

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں، پھر بھی گلے لگاؤں اسے

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں سے
میں کیسے بات کروں اب کہاں سے لاؤں اُسے

مگر وہ زود فراموش زود رنج بھی ہے
کہ رُوٹھ جائے اگر یاد کچھ دلاؤں اُسے

وہی جو دولتِ دل ہے، وہی جو راحتِ جاں
تمہاری بات پہ اے ناصحو! گنواؤں اسے

جو ہمسفر سرِ منزل بچھڑ رہا ہے فرازؔ
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اسے

محسن احسان

○

دھڑکتی شام کی تنہائی میں رلاؤں اُسے
جو میرے بس میں ہو پھر یاد بھی نہ آؤں اُسے
وہ مل گیا کہ جدائی کا جس کی رنج نہ تھا
جدا جو ہو گیا کس طرح بھول جاؤں اُسے
جسے قریب سے جی بھر کے دیکھ سکتا ہوں
یہ کیا ضرور کہ اب ہاتھ بھی لگاؤں اُسے
وہ پاس ہو تو ہر اک بات پر بگڑ جاؤں
وہ دور ہو تو بڑی چاہ سے بلاؤں اُسے
وہ درد بن کے مری روح میں اُتر جائے
میں ابر بن کے کڑی دھوپ سے بچاؤں اُسے
نظر کے آئینہ خانے بھی ہو گئے ویراں
خرابۂ دلِ تنہا میں کیا بساؤں اُسے
یہ سوچتا ہوں کہ جس آگ سے میں راکھ ہوا
کسی بہانے اب اُس آگ میں جلاؤں اُسے
بہار بن کے ہے آباد دل میں جو محسنؔ
خزاں کی رُت کا کبھی آئینہ دکھاؤں اُسے

احمد ظفر

○

چاہت کے بازار میں رہ کر جینا میری پہلی بھول
ایک طرف کچھ پھول کھلے ہیں ایک طرف ہے دھول ہی دھول

سانولے چہرے میرے دل کو درد انوکھا دیتے ہیں
مٹی پہ بکھرے دیکھے ہیں گورے بدن کے کومل پھول

دیپ جلے تو ایک پتنگا بات انوکھی کہتا ہے
ایک بھی ہونٹ نہیں ملتا ہے ٹوٹ رہے ہیں کتنے اصول

شبنم بوجھ بنی تو بکھری پتھر بوجھ بنا تو مان!
شاخِ گلاب کی کاٹ رہے ہیں گلشن ہے پوجا کا ببول

چنتا کے آکاش کے تارے ابھرے پل بھر ڈوب گئے
بن آنکھوں کے کس نے دیکھے راگ رنگ سے کھلتے پھول

ریت پہ چتر بنانے والی گوری نے کب مانی بات
پون چلی تو چاروں جانب اڑتی دیکھی دھول ہی دھول

لوگ کویتا پڑھتے پڑھتے گہری نیند میں ڈوب گئے
تو بھی اپنے سپنے لے کر چاند نگر کا جھولا جھول

جمیل ملک

○

قضا سے بھی نہ بجھا عشق و آگہی کا چراغ
مرے لہو سے جلا، میری زندگی کا چراغ

الجھ رہی ہے سیاہی سے روشنی کی لکیر
یہ دشمنی کا دھواں ہے، وہ روشنی کا چراغ

اِن آندھیوں کا، بگولوں کا، کیا گِلہ کیجے!
جب آدمی ہی بجھاتا ہو آدمی کا چراغ!

یہ کس دیار سے آئی ہے رفتگاں کی صدا
ہنسی تمام ہوئی، گُل ہوا خوشی کا چراغ

کس آنے والے مسافر کے انتظار میں ہیں
زمانے بھر کی نگاہیں، تری گلی کا چراغ

دیے بجھے ہیں تو کیا، ضوفشاں ہے ماہِ تمام
تمہارے بس میں نہیں ہے یہ چاندنی کا چراغ

بڑھاؤ ہاتھ، کرو تیز روشنی یارو
تمہارے سامنے رکھا ہے زندگی کا چراغ

اِسی سے شمس و قمر کسبِ نور کرتے ہیں
مری نظر میں فروزاں ہے میرے جی کا چراغ

بغیر خونِ تمنّا، بجز خلوصِ نظر
جمیلؔ جل نہیں سکتا خود آگہی کا چراغ

منظور عارف

میں جن بلندیوں پہ تھا، جن سے گرا بھی تھا
میرا خیال ہے کہ وہاں پر خدا بھی تھا

اُترا زمیں پر تو نگاہیں چمک اُٹھیں
یہ حُسن گرچہ خُلد سے کم تھا، جُدا بھی تھا

اُس نے زمیں پر بھی نہ جینے دیا مجھے
یہ شیوۂ سزا کہ خدا کو روا بھی تھا

پیشِ نظر تھا حضرتِ آدم کے جو شجر
تھی لذّتِ ثمر تو خیالِ بقا بھی تھا

شاید کہ سوچتا بھی ہو میرے لیے وہ حُسن
مجھ کو نکال کر جو مجھے دیکھتا بھی تھا

کیوں اُس نے عرش و فرش پہ اپنا لیا مجھے
کیا تجھ سا دو جہاں میں کوئی دوسرا بھی تھا

عارفؔ وہ کر رہا تھا تبسم بھی زیرِ لب
جب عالمِ عتاب میں مجھ سے خفا بھی تھا

مشفق خواجہ

○

کیوں خلوتِ غم میں رہتے ہو، کیوں گوشہ نشیں بیکار ہوئے
آخر تمہیں صدمہ کیا پہنچا، کیا سوچ کے خود آزار ہوئے

کیوں صاف کشادہ رستوں پر تم ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہو
کیوں تیرہ و تار سی گلیوں میں تم آن کے خوش رفتار ہوئے

کیوں راستہ چھوڑ کے چلتے ہو، کیوں اوروں سے کتراتے ہو
کیوں چلتے پھرتے اپنے لیے تم آپ ہی اک دیوار ہوئے

کیا اُٹھتے بیٹھتے سوچتے ہو، کیا لکھتے پڑھتے رہتے ہو
اس عمر میں یہ بے کیفی کیوں، کس واسطے نیک اطوار ہوئے

کیوں ایسے سفر پہ نکلے ہو، منزل نہیں جس کی کوئی بھی
کیوں راہ پہ ایسی چلتے ہو، سائے بھی جہاں دیوار ہوئے

کیوں ترکِ علائق کو تم نے سمجھا ہے علاجِ غم آخر
دیکھو تو ولی صوفی بھی یہاں کس ٹھاٹھ سے دنیادار ہوئے

مایوسیِ پیہم سے تم نے یارانہ یہ کیسا گانٹھا ہے
اندوہ و الم تھے جتنے بھی آخر وہ گلے کا ہار ہوئے

اس کلبۂ احزاں سے ہرگز اُبھرے گا نہ سورج کوئی بھی
کب خاک ستارہ بار ہوئی، کب سائے سحر آثار ہوئے

کب صبح کے نور کام آئے، کیا گریۂ نیم شبی سے ملا
اس قریۂ خواب فروشاں میں تم کس کے لیے بیدار ہوئے

بیکار اُلجھتے رہتے ہو تم اُلٹی سیدھی باتوں میں
یہ مرحلے وصل و ہجراں کے اب ایسے بھی کیوں دشوار ہوئے

اُس کوچے کی راہ تو سمجھاؤ، جس کوچے میں جانا مشکل ہے
اُس شخص کا نام تو بتلاؤ، تم جس کے لیے بیمار ہوئے

مشفق نے یہ باتیں ہنس ہنس کے کہا، باتیں نہ ہوئیں اشعار ہوئے
یہ درد بٹانے والے بھی کس شان کے خوش گفتار ہوئے

صد شکر کہ خوش اسلوبی سے تکمیل کو پہنچی رسوائی
محتاجِ دعا تھے جو خود ہی آخر وہ مرے غم خوار ہوئے

شہزاد احمد

○

کس رُت کے منتظر ہیں یہ پیڑ راستوں پر / خود دھوپ میں کھڑے ہیں، سایہ مسافروں پر

مٹی جمی ہوئی تھی جب کوٹ کے کفوں پر / حیرت ہوئی تھی مجھ کو لوگوں کے قہقہوں پر

بھیگے ہوئے اندھیرے آسیب بن گئے تھے / دل ناچنے لگا تھا برسات کی دفوں پر

مانی تھیں میری باتیں اس نے بگڑ بگڑ کے / کیا کیا محل ہوئے تھے تعمیر، ابروؤں پر

پھوٹی ہے اک کرن سی بے نور بادلوں سے / میں ہنس پڑا ہوں شاید اپنے ہی آنسوؤں پر

آنکھوں کی پتلیوں نے تصویر تک نہ دیکھی / ابرِ کرم نہ برسا سوکھے ہوئے لبوں پر

ناؤ الٹ گئی ہے، تختے بکھر گئے ہیں / چھائی ہے مردنی سی ٹوٹی ہوئی صفوں پر

پختہ چھتیں تھیں جن کی، آنگن تھے صاف ستھرے / گرنے لگیں چٹانیں آ آ کے ان گھروں پر

ویرانیوں کے جنگل شاید ہرے بھرے ہوں / اب جھاڑیاں اُگی ہیں آباد راستوں پر

دیوار پر بسنتی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں / سبزہ اُگا ہوا ہے بیٹھی ہوئی چھتوں پر

جنگل کے اس سفر نے بے حال کر دیا ہے / میں خاک ڈالتا ہوں گزرے ہوئے دنوں پر

گھر میں اُداس پھرنا آسان ہو گیا ہے / یا تنگ ہو گئے ہیں رستے مسافروں پر

یہ اور بات آنکھیں مٹی سے بھر گئی ہیں / دیکھے ہیں چند چہرے جاتی ہوئی بسوں پر

شہزاد بے دلی کا افسانہ کہہ رہی ہے / پھیلی ہوئی سیاہی لکھے ہوئے خطوں پر

شکیب جلالی

○

شفق جو روئے سحر پہ گلال ملنے لگی
یہ بستیوں کی فضا کیوں دھواں اُگلنے لگی

اسی لیے تو ہوا رو پڑی درختوں میں
ابھی میں کُھل نہ سکا تھا کہ رُت بدلنے لگی

اتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا
زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

کسی کا جسم اگر چھو لیا خیال میں بھی
تو پور پور مری مثلِ شمع جلنے لگی

میں ناپتا چلا قدموں سے اپنے سائے کو
کبھی جو دشتِ مسافت میں دھوپ ڈھلنے لگی

مری نگاہ میں خواہش کا شائبہ بھی نہ تھا
یہ برف سی ترے چہرے پہ کیوں پگھلنے لگی

ہوا چلی سرِ صحرا تو یوں لگا جیسے
ردائے شام مرے دوش سے پھسلنے لگی

کہیں پڑا نہ ہو پرتو بہارِ رفتہ کا
یہ سبز بوند سی پلکوں پہ کیا مچلنے لگی

نہ جانے کیا کہا اس نے بہت ہی آہستہ
فضا کی ٹھہری ہوئی سانس پھر سے چلنے لگی

جو دل کا زہر تھا کاغذ پہ سب بکھیر دیا
پھر اپنے آپ طبیعت مری سنبھلنے لگی

جہاں شجر پہ لگا تھا تبر کا زخم شکیبؔ
وہیں پہ دیکھ لے کونپل نئی نکلنے لگی

سجّاد باقر رضوی

○

عہدِ وفا سبک ہوا، رنگِ وفا کے ساتھ ساتھ
روحِ سخن بدل گئی، طرزِ ادا کے ساتھ ساتھ

سر میں لیے تری ہوا، عازمِ شہرِ دل چلا
نکہتِ گُل کے ہم رکاب، بادِ صبا کے ساتھ ساتھ

ایک ترے خیال نے فکر کو پر لگا دیئے
ہم بھی ہواؤں میں رہے موجِ ہوا کے ساتھ ساتھ

ڈھنگ بدلتے جائیں گے، رنگ مچلتے آئیں گے
لغزشِ پا کی طرز ہیں، رنگِ حنا کے ساتھ ساتھ

تا یہ سفرِ حیات کا مقصدِ زندگی بنے
چاہیے مرکزِ نگاہ، گردشِ پا کے ساتھ ساتھ

لذتِ نا امیدیٔ شوق بھی مستقل تو ہو
ترکِ طلب بھی کیجئے ترکِ دعا کے ساتھ ساتھ

آپ ہی کہہ کے سنتے ہیں، آپ ہی سن کے ہنستے ہیں
اپنی ہی بازگشت ہیں، اپنی صدا کے ساتھ ساتھ

حق بھی ہے مصلحت طلب، رخ پہ ہوائے دہر کے
چلتے ہیں اب خدا پرست خلقِ خدا کے ساتھ ساتھ

باقرؔ کم عیار کی قدر کہاں تھی زیست میں
اُٹھ کے خموش چل دیا وہ بھی قضا کے ساتھ ساتھ

سجاد باقر رضوی

پوچھو مجھے اے ہمنفساں! کون ہوں کیا ہوں؟
یارو میں کوئی حشر کے میداں میں کھڑا ہوں

تم رنگ میں دیکھو تو ہوں مرجھایا ہوا پھول
آواز میں ہیں ٹوٹتے شیشے کی صدا ہوں

میری بھی حکایت ہے وہی دل زدگی کی
پر درد کے عنواں میں مضمونِ جدا ہوں

کچھ میرے ہی دم سے ہیں بہاروں کے معانی
میں پیروِ گل، گل کی طرح چاک قبا ہوں

ہوں بند خیالوں میں کہ جوں پھول میں خوشبو
آزادہ روی میں صفتِ موجِ صبا ہوں

خواہش پہ مجھے ٹوٹ کے گرنا نہیں آتا
پیاسا ہوں مگر ساحلِ دریا پہ کھڑا ہوں

شاید یہی تریاق بنے زہرِ فنا کا
میں تلخیٔ ایام کا ست کھینچ رہا ہوں

پھولوں کی رفاقت میں تو پائے ہیں پھپھولے
کانٹوں سے ہے امید کہ میں آبلہ پا ہوں

دن روزِ قیامت ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا
تنہا ہوں کہ خود سائے سے بھی اپنے جدا ہوں

رات آئے تو سو جاؤں اندھیرے سے لپٹ کر
میں صبح سے ڈرتا ہوں کہ سورج کا ڈسا ہوں

کترا کے نہ چل راہ بھٹک جائے گا راہی
میں رہروِ امید کا نقشِ کفِ پا ہوں

اس دورِ خرافات میں بے قدر ہوں، پھر بھی
تو جتنا سمجھتا ہے، میں کچھ اس سے سوا ہوں

ہر رنگ، ہر آہنگ مرے سامنے عاجز
میں کوہِ معانی کی بلندی پہ کھڑا ہوں

نکلیں گی چٹانوں سے مری فکر کی نہریں
میں لفظ کے تیشے سے انھیں کاٹ رہا ہوں

میں کیمیاگر خود کو جلاتا ہی رہوں گا
اور تو یہ سمجھتا ہے کہ جینے سے خفا ہوں

پیدا مرے نغموں سے ہوئیں نور کی لہریں
میں خالقِ تہذیب، اندھیروں کی ضیا ہوں

باقر مجھے کچھ دادِ سخن کی نہیں پروا
میں شہرِ خموشاں میں ہوں اور نغمہ سرا ہوں

سیف زلفی

○

میں یہ نہیں کہتا کہ بیاباں میں کھلا ہوں
خوشبو ہوں، مگر دوسرے پھولوں سے جدا ہوں

سن لو، تو اُتر جاؤں گا دل میں بہ صد انداز
نغمہ ہوں، چٹکتے ہوئے غنچوں کی صدا ہوں

ذہنوں میں جگاتا ہوں، نئی صبح کا احساس
میں فکر کے چڑھتے ہوئے سورج کی ضیا ہوں

پھیلوں، تو میں سرما کی سجل دھوپ کی خوشبو
برسوں، تو مہکتے ہوئے ساون کی گھٹا ہوں

مقتل سے چمن تک ہے مری ذات کا پرتو
جوں خونِ شہیداں، ترے ہاتھوں کی حنا ہوں

اک درد جگا دیتا ہوں سوئی ہوئی شب میں
میں عرش سے اک ٹوٹتے تارے کی بکا ہوں

اوروں کے کسی پھول کی خوشبو نہیں مجھ میں
جو کچھ بھی ہوں، بس اپنے ہی گلشن کی ہوا ہوں

طوفان بھی، ساحل ہوں، میں الہام ہوں، ابہام
شاعر ہوں، مفکر ہوں، پیمبر ہوں، خدا ہوں

تم چل کے مٹا ڈالو، مرے پاؤں کا ہر نقش
میں ریت کے صحرا میں اگر سمت نما ہوں

اوڑھا ہے، کسی وقت میں شیطاں کا لبادہ
وہ وقت بھی آیا ہے کہ جبریل بنا ہوں

نغمے بھی لکھے رات کو، پہرے بھی دیئے ہیں
اس جنگ میں میں بھی تو برابر سے لڑا ہوں

ہاں یوں بھی ہوا ہے کہ کبھی تجھ کو منا کر
میں تیرے تجاہل کے عوض، روٹھ گیا ہوں

ہاں یوں بھی ہوا ہے کہ کبھی زخم کھرچ کر
میں اپنے ہی اشکوں پہ کئی بار ہنسا ہوں

ہاں یوں بھی ہوا ہے کہ تجھے دھیان میں لا کر
میں فرطِ پرستش میں تجھے بھول گیا ہوں

ہاں یوں بھی ہوا ہے کہ ترے سامنے آ کر
قاصر ہوں سمجھنے سے کہ میں کون ہوں کیا ہوں

کیوں چاند کے مندر میں زمیں چھوڑ کے جاؤں
بیٹا ہوں میں جس ماں کا اُسے پوج رہا ہوں

ہے عجز کی صورت نہ تکبّر کی ضرورت
اچھا ہوں ہزاروں سے، ہزاروں سے بُرا ہوں

ہو اور تو سینے میں چھرا گھونپ کے مر جائے
جس کرب سے میں آج لہو تھوک رہا ہوں

اور اک غمِ ذات کے ہوتے ہوئے زلفی
ممکن نہیں مجھ سے کہ کسی اور کو چاہوں

سیف زلفی

○

سینے کی آگ، آتشِ محشر ہو جس طرح
یوں موجزن ہے غم، کہ سمندر ہو جس طرح

زخموں سے یوں ہے جسم کی دیوار ضَو فگن
شعلوں کا رقص، شاخِ شجر پہ ہو جس طرح

بادل کا شور، ہانپتے پیڑوں کی بے بسی
یوں دیکھتا ہوں، میرے ہی اندر ہو جس طرح

اُڑتے ہوئے غبار میں، آنکھوں کا دشت بھی
کچھ یوں لگا کہ خشک سمندر ہو جس طرح

بستی کے ایک موڑ پہ برسوں سے اک کھنڈر
یوں نوحہ گر ہے، میرا مقدر ہو جس طرح

ویرانیوں کا کس سے گلہ کیجیے، کہ دل،
اتنا اُداس ہے کہ لُٹا گھر ہو جس طرح

سکھ کی اُگی نہ دُوب، نہ دُکھ کی مٹی لکیر
یوں ہے مرا نصیب کہ پتھّر ہو جس طرح

احساس میں شدید تلاطم کے باوجود
چپ ہوں، مجھے سکون میسّر ہو جس طرح

یوں حسرتوں کے خون کی مہک میں بسا ہے دل
مہندی رچا وہ ہات، معطّر ہو جس طرح

پیاسا ہوں، پاس ہے وہ چھلکتا ہوا بدن
یوں ہاتھ کانپتا ہے، کوئی ڈر ہو جس طرح

پتھّر نہ جان، تجھ کو دکھاؤں گا آب و تاب
یوں قید ہوں کہ سیپ میں گوہر ہو جس طرح

زلفی کو کھینچو دار پہ، دیوار میں چُنو
سچ بولتا ہے یوں، کہ پیمبر ہو جس طرح

اختر ہوشیارپوری

○

دل میں اک جذبۂ بیداد وجفا ہی ہو گا
وہ خداوند بھی ہو گا تو خدا ہی ہو گا

گرد سی اڑتی نظر آتی ہے، آندھی ہو گی
دُور تک نقشِ قدم ہیں، کوئی راہی ہو گا

کون جیتا ہے تمنا کے لہو ہونے تک
اُجلی صبحوں کا نشاں رنگِ قبا ہی ہو گا

ہم سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو، ورنہ کل کو
کس کو اندازۂ ناکردہ گنہ ہی ہو گا

کہیں گرتی ہوئی دیواریں کہیں جھکتی چھتیں
آپ کہتے ہیں تو یہ قصرِ وفا ہی ہو گا

پھول سے ترشے ہوئے لوگ خرابوں میں کہاں
دشت وحشت میں کوئی آبلہ پا ہی ہو گا

جاتے جاتے مرے دروازے کے پٹ کھول گئی،
یہ بھی اختر کوئی اندازِ صبا ہی ہو گا

صادق نسیم

○

ہر زخمِ دل میں سوزِ تمنائے یار تھا
یخ بستہ کوئٹے میں بھی میں شعلہ بار تھا

راہِ وفا کا کرب تہی دامنی نہ پوچھ
وہ غم بھی چھن گیا جو مجھے سازگار تھا

کتنی جنوں فزا تھی تری یاد کی صبا
پھولوں کی طرح دامنِ دل تار تار تھا

تھی آب و تابِ اشک قطرہ پہ ہی دیدنی
دامن پہ جب گرا تو غریب الدیار تھا

تیری زمیں پہ کس نے جہنم کیے کشید
انساں کہاں گیا جو ترا شاہکار تھا

وہ لوگ بھی سروں پہ ہیں صحرا لیے ہوئے
جن کے دلوں پہ عکسِ تمنا بھی بار تھا

غربت کی ظلمتوں میں کرن بن کے بھی نسیم
میں عکسِ آئینہ کی طرح بے قرار تھا

جاوید شاہین

○

ناکردہ خطاؤں کی جو تعزیر نئی ہے
دل میرا دُکھانے کی یہ تدبیر نئی ہے

اس سال چمن میں، بہ فراوانیِ یک رنگ
اوراقِ گل و لالہ پہ تصویر نئی ہے

ایسا نہ ہو مٹ جائے، اسے غور سے پڑھ لے
مٹی پہ مرے خون کی تحریر نئی ہے

آزاد ہوں، پر اپنے خیالات میں محبوس
دیوانہ نیا ہوں، مری زنجیر نئی ہے

یہ فکر نہیں، کیا ہو تگ و تاز کا حاصل
میں خوش ہوں، مری کاوشِ تعمیر نئی ہے

بہتر ہے مجھے اس کی ذرا سخت سزا دے
خاموشیِ پیہم مری تقصیر نئی ہے

اس دور کا میں یوسفِ ثانی ہوں، مرے پاس
اُس خوابِ شہِ مصر کی تعبیر نئی ہے

اک بھید چھپا ہے پسِ دیوارِ خموشی
اس ٹھہرے ہوئے پانی کی تفسیر نئی ہے

بے مہریِ احباب کا شکوہ نہیں شاہینؔ
اس شہر کی مٹی ہی میں تاثیر نئی ہے

جاوید شاہین

○

موجۂ درد سے جسموں میں روانی دے جا
خشک دریاؤں، ندی نالوں کو پانی دے جا

کچھ تو سمجھا دے طلسماتِ شب و روز سے مجھے
اِن حصاروں میں کوئی بابِ معانی دے جا

ظلمتِ حبسِ دل و جاں میں جلا شمع ہوا
تو کہیں ہے تو مجھے اپنی نشانی دے جا

میں سبک سیر سہی، مجھ کو پرِ خس نہ بنا
ان ہواؤں میں مجھے تھوڑی گرانی دے جا

نامکمل ہے کوئی بابِ چمن جن کے بغیر
قصۂ گل کے وہ اوراقِ خزانی دے جا

آگ برساتے ہوئے دن کی حدیں باندھ کبھی
گرم شاموں میں کوئی شام سہانی دے جا

کب سے بے آب ہیں آئینے مری آنکھوں کے
ان نئے چہروں میں کچھ شکلیں پرانی دے جا

وہ بھی اپنا دلِ پُرخون لیے پھرتا رہے
حُسنِ مغرور کو رنگین نشانی دے جا

ہر گھڑی دل سے گریزاں ہیں امیدیں شاہیںؔ
ان مکینوں کو ذرا شوقِ مکانی دے جا

سلیم شاہد

○

ان در و دیوار کی آنکھوں سے پٹی کھول کر
ڈوبتے سورج کا منظر دیکھ کھڑکی کھول کر

اشک آنکھوں میں اگر کچھ ہیں تو کر شب کا سفر
راستے میں آسماں بیٹھا ہے جھولی کھول کر

اور کچھ تازہ لکیریں شکل کے خاکے پہ ہیں
دیکھا اپنے ہاتھ کا آئینہ مٹھی کھول کر

پیکرِ مفہوم بن کر بھی کبھی پہلو میں آ
لفظ دیتے ہیں صدا بابِ معانی کھول کر

سطحِ دریا پر بھڑک اٹھی ہے پھر موجوں کی آگ
کون اس طوفان میں اترے گا کشتی کھول کر

بڑھ گئی کچھ اور پیاسی کھیتیوں کی تشنگی
ابر چھایا تھا مگر برسا نہیں جی کھول کر

ہو گئے آباد میرے جسم کے دیوار و در
کون گھر میں آ گیا دروازہ خود ہی کھول کر

دھوپ سے سوکھے ہوئے پتے کھنک دینے لگے
سرد لب گویا ہوئے قفلِ خموشی کھول کر

کیا عجب شاہد کہ میری داستاں اس میں بھی ہو
جو کتاب اک بار بھی میں نے نہ دیکھی کھول کر

سلیم شاہد

○

اس کو مل کر دیکھ شاید وہ ترا آئینہ ہو
غائبانہ ہی تری اس کی شناسائی نہ ہو

مجھ پہ ظاہر ہے ترے جی میں ہیں کیا کیا خواہشیں
بات ایسی کر کہ جس میں تیری رسوائی نہ ہو

ہم اسے چھو کر یہی سمجھے کہ وہ پتھر نہیں
اِس سے بڑھ کر اور کیا کیجیے جو بینائی نہ ہو

احتیاطاً دیکھتا چل اپنے سائے کی طرف
اس طرح شاید تجھے احساسِ تنہائی نہ ہو

ڈھونڈتے ہیں کچھ بھاگتے لوگوں میں صورت آشنا
ان بگولوں میں گئے لمحوں کی پروائی نہ ہو

تھا سفر درپیش صحرا کا، گرہ میں رکھ دیے
اس نے کچھ کانٹے کہ عذرِ آبلہ پائی نہ ہو

کھینچ لے گا ابر سے بارش اگر سبزہ ہوا
تُو کسی کی چاہ میں بیکار سودائی نہ ہو

آسماں اک دشت کی صورت ستارے ریت ہیں
تو لبِ دریا سرابوں کا تمنائی نہ ہو

کھُل گئی جب آنکھ تو چادر ہٹا کر دیکھ لے
تیرے کمرے ہی میں ان خوابوں کی رعنائی نہ ہو

زخم تیرے دل کی زینت ہیں انھیں پردے میں رکھ
کوئی نامحرم ترے گھر کا تماشائی نہ ہو

آج شاہد اس کے دروازے پہ پاؤں رک گئے
ریڈیو بجتا تھا، میں چونکا کہ شہنائی نہ ہو

کشور ناہید

○

وہ اجنبی تھا، پھر بھی لگا آشنا مجھے
کس سمت لے چلا ہے نیا حادثہ مجھے

مجھ کو بھی ڈھونڈتی رہی ایام کی چمک
رکھتا عزیز گر کبھی میرا خدا مجھے

مجھ خستہ تن کو گھر میں کہاں ڈھونڈتے ہو اب
دو دشتِ نامرادیٔ دل میں صدا مجھے

واقف نہیں ہوں شکل سے اطوار سے مگر
لگتا ہے اس کا نام ہی اکثر بھلا مجھے

میں گھر کی روشنی ہوں، مجھے محفلوں سے کیا
چہروں کے میکدے میں نہ دینا صدا مجھے

اے کاش تو بھی سنتا کبھی آہٹوں کی گونج
تو بھی مری طرح سے کبھی ڈھونڈتا مجھے

پیروں کے آبلے نہ مرا ساتھ دے سکے
جب رہ نما بھی راہ کا پتھر لگا مجھے

ناہید اس کی یاد کا آنچل بھی صبح کو
اڑتا ہوا ہوا میں بگولا لگا مجھے

رضی اختر شوق

○

ہم جہاں نغمہ و آہنگ لیے پھرتے ہیں
لوگ ہاتھوں میں وہاں سنگ لیے پھرتے ہیں

ہم ہی اس عہد کا معیارِ تغیّر ہوں گے
ہم کہ ہر در پہ سو رنگ لیے پھرتے ہیں

کیا ہو شوریدہ سروں کی گزر اوقات کہ لوگ
دستِ بے فیض و دلِ تنگ لیے پھرتے ہیں

سب ترا حسن ترے حسن سہی قد میں نہیں
ہم بھی آنکھوں میں عجب رنگ لیے پھرتے ہیں

شوقؔ دشوار ہے اب معجزۂ فن کی نمود
لوگ اشعار میں فرہنگ لیے پھرتے ہیں

انور شعور

○

میں خاک ہوں آب ہوں ہوا ہوں — اور آگ کی طرح جل رہا ہوں
تہہ خانۂ ذہن میں نہ جانے — کیا شے ہے جسے ٹٹولتا ہوں
بہروپ نہیں بھرا ہے میں نے — جیسا بھی ہوں سامنے کھڑا ہوں
سُنتا تو سبھی کی ہوں مگر میں — کرتا ہوں وہی جو چاہتا ہوں
اچھوں کو تو سب ہی چاہتے ہیں — ہے کوئی؟ کہ میں بہت بُرا ہوں
بچنا ہے محال اِس مرض میں — جینے کے مرض میں مبتلا ہُوں
اوروں سے تو اجتناب تھا ہی — اب اپنے وجود سے خفا ہوں
باقی ہیں جو چند روز وہ بھی — تقدیر کے نام لکھ رہا ہوں

کہتا ہوں ہر ایک بات سُن کر
یہ بات تو میں بھی کہہ چکا ہوں

شہریار

○

کس فکر کس خیال میں کھویا ہُوا سا ہے
دل آج تیری یاد کو بھولا ہُوا سا ہے

گلشن میں اس طرح سے کب آئی تھی فصلِ گُل
ہر پھول اپنی شاخ سے ٹوٹا ہُوا سا ہے

چل چل کے تھک گیا ہے کہ منزل نہیں کوئی
کیوں وقت ایک موڑ پہ ٹھہرا ہُوا سا ہے

کیا حادثہ ہوا ہے جہاں میں کہ آج پھر
چہرا ہر ایک شخص کا اُترا ہُوا سا ہے

نذرانہ تیرے حُسن کو کیا دیں کہ اپنے پاس
لے دے کے ایک دل ہے، سو ٹوٹا ہُوا سا ہے

پہلے تھا جو بھی، آج مگر کاروبارِ عشق
دُنیا کے کاروبار سے ملتا ہُوا سا ہے

لگتا ہے اس کی باتوں سے یہ شہریار بھی
یاروں کے التفات کا مارا ہُوا سا ہے

صدیق افغانی

○

جب دھیان میں وہ چاند سا پیکر اُتر گیا
تاریک شب کے سینے میں خنجر اُتر گیا

جب سب پہ بند تھے مری آنکھوں کے راستے
پھر کیسے کوئی جسم کے اندر اُتر گیا

ساحل پہ ڈر گیا تھا میں لہروں کو دیکھ کر
جب غوطہ زن ہوا تو سمندر اُتر گیا

اک بھی لکیر ہاتھ پہ باقی نہیں رہی
دستِ طلب سے نقشِ مقدر اُتر گیا

وہ آئینے کے سامنے کیا رُو نما ہوئے
سادہ ورق پہ رنگ کا منظر اُتر گیا

چہرے کی تیز دھار بھی بے کار ہو گئی
جب چشمِ آبدار سے جوہر اُتر گیا

○

ٹھہرا تو ایک سنگِ گراں بار جسم تھا
ورنہ ہَوا سے اپنا سبک بار جسم تھا

آندھی اٹھی تو خاک کا تودہ لرز گیا
دریا چڑھا تو ریت کی دیوار جسم تھا

اندر سلگ رہا تھا دھوئیں میں کوئی کھنڈر
باہر سے ورنہ مصر کا بازار جسم تھا

سورج کی تابناک حرارت کے باوجود
سائے کی تیرگی میں گرفتار جسم تھا

پیش آئے ہر قدم پہ مجھے سخت مرحلے
بیمار روح تھی کبھی بیمار جسم تھا

روشن تمام رات رہا چاند کی طرح
تاریکیوں میں مطلعِ انوار جسم تھا

اقبال ساجد

○

تم مجھے بھی کانچ کی پوشاک پہنانے لگے
میں جسے دیکھوں وہی پتھر نظر آنے لگے

بے سبب، گھر سے نکل کر آ گئے بازار میں
آئینہ دیکھا نہیں، تصویر چھپوانے لگے

دشت میں پہنچے تو تنہائی مکمل ہو گئی
بڑھ گئی وحشت تو پھر خود سے ہی ٹکرانے لگے

خون کا نشہ چڑھا تو جسم زہریلا ہوا
خواہشوں کے پانیوں میں سانپ لہرانے لگے

کچھ نہیں ہے ذہن میں تو وہم کی شکلیں بنا
روشنی ہو گی اگر سائے نظر آنے لگے

دیکھنا چاہا تو وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا
چومنا چاہا تو میرے ہونٹ پتھرانے لگے

زنگ آخر لے ہی آیا میری سوچوں کا جمود
برف کے سورج بلا کی دھوپ پھیلانے لگے

چل پڑے تو ہو لیے اقبال ساجد اپنے ساتھ
تھک گئے تو اپنے ہی سائے میں سستانے لگے

کمار پاشی

○

اک انجانی دنیا ڈھونڈ رہا ہوں
تاریکی میں رستہ ڈھونڈ رہا ہوں

تنہا تنہا گھوم رہا ہوں گم سم
گلی گلی کوئی خود سا ڈھونڈ رہا ہوں

پتّہ پتّہ ناچ رہی ہے زردی
گلشن گلشن سبزہ ڈھونڈ رہا ہوں

رنگوں کے اس گھور گھنے جنگل میں
کھویا ہوا اک چہرہ ڈھونڈ رہا ہوں

تنہائی میں بیٹھ کے آپ اپنے سے
کوئی پرانا رشتہ ڈھونڈ رہا ہوں

○

کیسا عجب تماشا دیکھ رہا ہوں
عالم عالم سایا دیکھ رہا ہوں

ذرّہ ذرّہ ٹوٹ رہی ہے دھرتی
خود کو جیسے لٹتا دیکھ رہا ہوں

رستہ رستہ سہل ہُوا ہے چلنا
آگے آگے سایا دیکھ رہا ہوں

موسم موسم پھیل رہی ہے خوشبو
دُور سے تجھ کو آتا دیکھ رہا ہوں

بوچھاڑوں میں برس رہے ہیں بادل
اور میں خود کو جلتا دیکھ رہا ہوں

مسعود انور شفقی

○

ہیں منتظر کسی ہنستی ہوئی سحر کے لیے
امیدوار ہیں ہم تیری اک نظر کے لیے

ہمارے حال پہ روتی ہے خانہ ویرانی
سمیٹتے رہے خوشیاں پرائے گھر کے لیے

دلِ خراب کہ اب راستے کا پتھر ہے
مری جبیں کے لیے ہے نہ تیرے در کے لیے

اسی سے دل کی تمنا میں رنگ بھر لیں گے
یہ ایک زخم ملا ہے جو عمر بھر کے لیے

فقط ہمیں پہ گراں ہے ہماری موت انور
یہ بات اور بھی آساں ہے چارہ گر کے لیے

مرتضیٰ برلاس

○

ہمصفیروں سے جو کھٹکا دے وہ اعزاز نہ دے
شوق سے تو مجھے اب قوتِ پرواز نہ دے

دائرے ٹوٹ نہ جائیں مرے خوابوں کے کہیں
سو گیا ہوں مجھے اب کوئی بھی آواز نہ دے

رازداروں کا گماں کے یہ حال ہوا
مشورہ کوئی مجھے اب مرا ہمراز نہ دے

یا فضاؤں کو محیطِ مہ و خورشید نہ کر
یا مری فکر کو تو جرأتِ پرواز نہ دے

یا زمانے کو تو محرومِ سماعت کر دے
یا مجھے درد میں ڈوبی ہوئی آواز نہ دے

گوہر ہوشیارپوری

○

یوں ریا عام ہوئی ہے کہ روا لگتی ہے
تلخ سی بات سہی، بات خدا لگتی ہے

ہمہ تشہیر ہوا اب مرا گم سم رہنا
شاید اب میری خموشی بھی صدا لگتی ہے

وہی ریشم سے سبک ہاتھ ــ وہی پھول سا جسم
وہی صورت ہے جہاں آنکھ ذرا لگتی ہے

پاکے خوش بھی نہیں ــ کچھ کھو کے پریشاں بھی نہیں
آرزو عشق میں راضی برضا لگتی ہے

غمِ دوری بھی گیا، لطفِ حضوری بھی گیا
بے حسی دل کی عجب آج سوا لگتی ہے

پھر جنوں شہر میں تعزیر طلب ہے گوہر
نگہِ خلق پھر انگشت نما لگتی ہے

مشہود انور

○

ہوائے تازہ سے مانوس بھی، گریزاں بھی
کہ ہر گھڑی نئے لمحوں کا ہوں میں جوئندہ

کیا قمر نے اگر تیرگی سے سمجھوتہ
ردائے شب پہ ستارے تو ہوں گے رقصندہ

ہمیں شریف بنایا ہے خوفِ دنیا نے
ہم اپنے خوابوں سے کب تک رہیں گے شرمندہ

کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں ہمارے لیے
مگر لبوں کو تو دیکھا ہے ہم نے رخشندہ

خموش رہ کے ہمیں دیکھنے کا اذن ملے
کہیں سگے دل کا فسانہ ملے جو آیندہ

زباں سے لاکھ تمہارے ستم کا ذکر نہ ہو
مگر قلم تو لکھے گا حروفِ سوزندہ

توصیف تبسم

○

بجھا بھی دو، دلِ پُرسوز و چشمِ تر کے چراغ
یہ کس کے واسطے روشن رکھے ہیں گھر کے چراغ

مسافروں کو تو منزل پہ یاد بھی نہ رہا
نڈھال تھے سفرِ شب سے رہگزر کے چراغ

ڈبو ہی دے نہ کہیں چشمِ اشکبار ہمیں،
نظر سے چھپنے لگے اب تو بام و در کے چراغ

دھواں دھواں ہیں محبت میں چشم و دل جیسے
مرے ہی سینے میں جلتے ہوں شہر بھر کے چراغ

بجھا جو شعلۂ آواز تو ہوا محسوس
ہمارے خون سے روشن تھے نغمہ گر کے چراغ

بہت اُداس ہے توصیفؔ، حسنِ لالہ و گل
جلائے جس طرح کوئی لہو سے بھر کے چراغ

فاضل رشیدی

○

وہ دل ملے کہ وسعتِ صحرا جلا کرے
وہ غم ملے کہ دامنِ دل پر ہنسا کرے

ابھرے ہیں کچھ نقوش تو ڈھلنے لگی ہے رات
اُٹھے کوئی، درازیٔ شب کی دعا کرے

کتنا حسیں ہے شام کی ویرانیوں کا درد
جو چاند بن کے سینۂ شب میں اُٹھا کرے

اتنی سکت کہاں کہ نئی چوٹ سہہ سکیں
اب کے برس بہار نہ آئے، خدا کرے

اے دورِ ناسپاس، بھلا یہ تو کم سے کم
میں دیکھوں اور کوئی کسی سے وفا کرے

کتنے گلوں کی لاج ہے فاضلؔ وہ ایک خار
جس سے کسی کا چاکِ گریباں سلا کرے

مراتب اختر

ایک قیدی نے یہ دکھ درد لگاتار سہے
جسم نے جرم کیے روح نے آزار سہے

کیسے اس بارگہِ ارض کو ہمسر جانے
کیسے یہ ضرب خمِ گنبدِ دوّار سہے

سامنے کوئی نہ تھا، کس سے شکایت کرتے
زخم سینے پہ خموشی سے کئی بار سہے

کام ہر حال میں آیا ہے ضمیرِ مضمر
لغزشِ فکر کے اس ڈھال نے سب وار سہے

تم ہمہ وقت ہو آمادۂ احساں لیکن
بوجھ پھر بوجھ ہے کیوں شانۂ خوددار سہے

کھول دے بندِ بدن رخنۂ در کی خاطر
سقف کا بار بھی سر پر شدِ دیوار سہے

گنجِ گفتار کو گلیوں میں گنوا کر نکلے
ایک خاموشی کو چہرے پہ سجا کر نکلے

تیری دنیا نے تیرے بھید کو سمجھا نہ سُنا
اپنا منصب تو یہی تھا کہ سجھا کر نکلے

بنتِ کشمیر کی روتی ہوئی فریاد سنو!
اک خبر بیچنے بازار میں ہاکر نکلے

آگ تھے اور برستے رہے پانی بن کر
نفسِ باد تھے اور خاک اُڑا کر نکلے

راستہ ڈھونڈ لیا، خود سے جدا ہو گئے ہم
ایک نادیدہ کو جب سامنے پا کر نکلے

پاؤں جلتی ہوئی تلوار پہ دھر کر گزرے
سر پہ اک بارِ امانت کو اٹھا کر نکلے

روحی کنجاہی

○

پھر کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں
کوئی ان کی طرح ملا ہی نہیں

ہو چکی پتھروں کی بارش تک
زخمِ احساس جاگتا ہی نہیں

سر سے پانی گزر چکا ہے مگر
دل ہے کم بخت ڈوبتا ہی نہیں

طے ہوئے مرحلے کئی لیکن
فاصلہ تو کوئی مٹا ہی نہیں

اُن کو کیا کیا گلے رہے ہم سے
ہم کو جن سے کوئی گلہ ہی نہیں

آس نے آ کے دم کہاں توڑا
اب کے روحی پتہ چلا ہی نہیں

خالد شیرازی

○

کھل اُٹھے پھول، مہک مجھ کو ہوا سے آئی
ابر کے رُوپ میں بلقیس سبا سے آئی

کان کے ساتھ کھلی آنکھ کی پتلی، لیکن
کوئی تصویر اُبھر کر نہ صدا سے آئی

ریگِ ساحل کی تب و تاب کی دشمن ٹھہری
لہر جو بھی پسِ دیوار ہوا سے آئی

دائمی کر لیا اس کو کہ سرِ عرصۂ شب
دل کو جو ساعتِ غم دینے دلاسے آئی

جو تمنا کبھی آئی نہ تھی لب پر خالد
آج خوں ہو کے وہی دیدۂ وا سے آئی

زاھد فارانی

○

بساطِ شوق کے منظر بدلتے رہتے ہیں
ہوا کے رنگ برابر بدلتے رہتے ہیں

بتانِ رنگ بھی کچھ کم نہیں ہیولوں سے
قدم قدم پہ یہ پیکر بدلتے رہتے ہیں

چھپائے چھپتی نہیں اُن سے کہنگی دل کی
نئے لباس وہ ہر دم بدلتے رہتے ہیں

رہی نہیں کبھی یک رنگ آسماں کی زمیں
حروفِ لوحِ مقدر بدلتے رہتے ہیں

قیام کرتا نہیں دل میں چار دن کوئی
مکینِ خانۂ بے در بدلتے رہتے ہیں

بہت نیا تھا جو کل اب وہی پرانا ہے
مزارِ دہر کے پتھر بدلتے رہتے ہیں

○

وہ سرنگوں کھڑا ہے مجھے پا کے سامنے
دریا ہے دنگ وسعتِ صحرا کے سامنے

ڈالی نظر جو اس نے مرے رخ پہ جم گئی
موج آ کے ختم گئی لبِ دریا کے سامنے

سورج خجل ہے دستِ حنائی کے روبرو
آئینہ ہیچ، نقشِ کفِ پا کے سامنے

معنی سے لفظ آنکھ بچا کر نکل گئے
میں کچھ نہ کہہ سکا اُسے ٹھہرا کے سامنے

پاؤں تلے زمیں نہیں دھیان آسماں پہ ہے
کیا کچھ بجا ہے حسرتِ بے جا کے سامنے

زاہد نہیں مذاقِ سخن ہر دماغ کو
عرضِ ہنر کرو کسی دانا کے سامنے

سوز صدیقی

○

چڑھی پروان انا دل کی تو یزدان بنی
ہوئی بدنام ادا دل کی تو شیطان بنی
دل کی آواز جو ابھری تو وہ قرآن بنی
رسمِ الفت جو ہوئی عام تو ایمان بنی
داغ چمکے تو تیری مانگ کے وہ پھول بنے
آہ آوارہ ہوئی، زلف پریشان بنی
نالہ نکھرا تو ترا قہقہہ بن کر بکھرا
چوٹ جو دل پہ لگی شعر کا عنوان بنی
درد بھڑکا تو تبسم ترا بن کر چھلکا
یاد جو بھڑکی تو اشعار کا دیوان بنی
جس کے ہر خط کو نکھارا تھا قلم نے برسوں
اب وہی شکل ہمارے لیے انجان بنی
وقت کے ساتھ تجھے بھی جو بدلتے دیکھا
کیا بتاؤں تجھے کیا دل پہ مری جان بنی

ابراھیم سلیم

○

سخت مشکل میں پڑی ہے دنیا
اپنی چادر سے بڑی ہے دُنیا
ہاتھ میں صلح کی تلوار لیے
ایک عالم سے لڑی ہے دُنیا
ایک ذرّے سے پشیمان ہوئی
لوگ کہتے تھے بڑی ہے دُنیا
اپنی رفتار میں الجھی ایسی
راہ میں اوندھی پڑی ہے دُنیا
کب اندھیروں سے نمیا چھوٹی ہے
رات کی دھوپ گھڑی ہے دنیا
زہر اب چاند پہ پھیلانے کو
بسکہ تیار کھڑی ہے دُنیا
وقت ارفتار کا نقشِ کفِ پا
درمیاں ایک کڑی ہے دنیا

اختر امام رضوی

○

خزاں کے تن پہ ہواؤں کے تازیانے لگے
برنگِ زخم کئی پھول مسکرانے لگے

بس ایک موت کی خواہش کو اور جینے دو
کہیں حیات کی یہ لاش تو ٹھکانے لگے

کسی کی گود میں تو چاند بن کے ڈوب گیا
کسی کے ہاتھ تری یاد کے خزانے لگے

یہ شب کے سائے مری خامشی کا حسن بھی تھے
مگر یہ سائے تو اب شور بھی مچانے لگے

جنھیں بتایا تھا میں نے گدازِ گل کا اثر!
وہ پتھروں سے یہی داؤں آزمانے لگے

حیات سانس کے زنداں کا ایک لمحہ ہے
اس ایک بات کو کہتے ہوئے زمانے لگے

نظر نظر کو دکھاتے ہو زخمِ جاں اختر
مگر یہ لوگ مداوا کہاں بتانے لگے

صمد انصاری

○

تھم جاتے ہیں سب طوفاں لمحات کے صحرا میں
رہ جاتے ہیں سینوں میں یادوں کے شرر باقی

دیوار سا لگتا ہے ماحول کا سناٹا
کوئی نہیں دنیا میں اب راہ گزر باقی

جس خون میں ڈوبا ہے سورج شفق آلودہ
ہے صبح کے ہونٹوں پہ وہ خونِ جگر باقی

سرسراتے ہیں نگاہوں میں حریر و کمخواب
راہ تکتے ہی رہیں گے مگر آنکھوں کے سراب

یوں تو صدیوں سے چمکتی ہے مہِ نو کی کٹار
کون کاٹے گا مگر رات کے خیمے کی طناب

میرے پاؤں مری عمروں کی مسافت کی تھکن
میری آنکھیں مری گزری ہوئی راتوں کا حساب

احمد ندیم قاسمی

○

اب تو کچھ اور بھی اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی سورج نہ بجھایا جائے

گُل ہیں کمیاب اگر، خون تو ارزاں ہوگا
کسی عنواں تو کوئی رنگ جمایا جائے

آج کے دور میں انصاف کے معنی یہ ہیں
روح مرجائے مگر جسم بچایا جائے

کون شاہوں کو گداؤں سے الگ پہچانے
اب تو خلعت میں بھی پیوند لگایا جائے

آج انا الحق سے بڑی کوئی حقیقت ہی نہیں
مومنو! دار پہ کس کس کو چڑھایا جائے

نئے انساں سے تعارف جو ہوا تو بولا
میں ہوں سقراط، اب مجھے زہر پلایا جائے

موت سے کس کو مفر ہے، مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

یوں بھی ہو سکتی ہے آویزشِ خیر و شر ختم
پھر سے شیطاں کو عزازیل بنایا جائے

کوئی بھی تیرے سوا مونسِ تنہائی نہ تھا
اک خدا تھا مگر اس کو بھی چھپایا جائے

میں محبت کا پجاری ہوں عقیدوں کا نہیں
ان بتوں کو مرے رستے سے ہٹایا جائے

مجھ کو دعویٰ تو ہے کانٹوں کو بھی روندآنے کا
اور پھولوں سے بھی دامن نہ چھڑایا جائے

کس نے مانگی تھی مرے ترکِ تجسس کی دعا
میرے دشمن کو مرے سامنے لایا جائے

میں قیامت کا تو منکر نہیں، لیکن واعظ
مجھ سے انساں کو تماشا نہ بنایا جائے

حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیمؔ
زخم کو زخم نہیں پھول بتایا جائے

جمیلہ ملک

رضا ہمدانی

غزل رمز و ریزہ خیالی کا فن ہے۔ غزل کے ہر شعر کو ایک اکائی، ایک حادثے، ایک تجربے یا ایک ذرے سے مماثلت دی جا سکتی ہے۔ اکائیوں، حادثوں، تجربوں اور ذرّوں کی یہ دنیا اتنی بوقلموں، رنگارنگ اور وسیع ہے کہ اس صنفِ سخن میں زندگی بھر کے سرمائے کو اس طرح سمیٹنا کہ اس سے شاعر کی شاعری اور شخصیت کی ایک داستان مرتب ہو جائے، بے حد مشکل ہے۔ یہ مرتبۂ بلند انہیں جیالوں کے حصے میں آتا ہے جو شب و روز کشتِ غزل کی آبیاری کرتے ہیں اور اپنے فن کو زندگی اور شخصیت کا جزو لاینفک بنا لیتے ہیں۔ سرخ روئی کا یہ سلیقہ رضا ہمدانی نے ابتدا ہی سے رحمان بابا کی فکری صحبت میں رہ کر اپنی شخصیت کا جزو بنا لیا تھا۔

سرخ کپڑوں سے نہیں ہوتا ہے کوئی سرخرو سرخ روئی کے لئے خونِ جگر درکار ہے (رحمان مترجم رضا)

بعد ازاں جب رضا عملی طور پر زندگی کی دشوار گزار منازل اور تخلیقی طور پر فن کے کربناک مراحل سے گزرا تو اسے نہ صرف محبوبۂ زندگی اور محبوبۂ غزل کو بھی قدم قدم پر خونِ دل نذر کرنا پڑا لیکن اس ایثار و قربانی سے اس کی غزل اور زندگی کا رشتہ اتنا محکم اور پائیدار ہو گیا کہ اب وثوق کے ساتھ اس کی غزل سے اس کی زندگی کی داستان مرتب کی جا سکتی ہے۔ اس کی مسلسل غزلیں تو خاص طور پر اس کی داستانِ حیات کی نقاب کشائی کرتی ہیں جس میں ایک باشعور فرد ایک معاشرے اور ایک تاریخ کی داستان رقم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ؎

پھولے پھلے ہیں بے سر و سامانیوں میں ہم ایک پھول بن کے نکھرے ہیں ویرانیوں میں ہم
سارے جہاں میں کوئی خریدار ہی نہیں اتنے گراں بہا ہوئے ارزانیوں میں ہم

دورِ جنوں کی غزلیات میں ہم نے رضا ہمدانی کو الھڑپن اور معصومیت کے ساتھ اپنے خود ساختہ و پرداختہ جذباتی پیکر یا ارضیت کی زرخیزی اور شادابی سے منسلک دیکھا ہے۔ عہدِ شعور کی غزلیات میں وہ ایک ایسے جوشیلے جوان کی صورت میں ابھرتا ہے جسے ابھی ابھی زندگی کی بسیط حقیقتوں کا ادراک ہوا ہے اور جو بربنائے خلوص زندگی کی تمام غلط اقدار کا خاتمہ کر کے ایک مثالی اور صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لئے سرگرمِ عمل نظر آتا ہے لیکن آسمان کو چھونے کی دھن میں زندگی کی سنگین حقیقتوں سے ٹکرا کر جب اس کا آئینہ تمثال چور چور ہو جاتا ہے تو وہ پھر لاشعوری طور پر داخلی دنیا کی طرف مراجعت کرتا ہے اور ایک رومانی مثالی پیکر تراش کر اسے سینے سے لگا لیتا ہے۔ وہ اپنی غزل کے دریچوں سے بار بار جھانکتا ہے اور گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات میں اس کی آمد کا مسلسل انتظار کرتا ہے۔ آخری دور کی غزلوں میں، داخلی اور خارجی جذبوں کے امتیازات کو ختم کر کے، وہ جنون و خرد کے آمیزے کو روح کی آنچ دے کر اپنے تجربات و خیالات کے اظہار کے لئے ایک ایسی سطح کی تخلیق کر لیتا ہے جو ایک فنکار کا حقیقی منصب ہے اور جہاں سے وہ وسیع و عریض کائنات پر نظر ڈال کر اسے اپنے فن میں سمو سکتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر رضا ہمدانی ایک ایسے پختہ کار اور پہلودار درویش کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کی آنکھوں کی نمی اور ہونٹوں کی خفیف مسکراہٹ زندگی کی تہہ در تہہ حقیقتوں کو آن واحد میں اجاگر کر دیتی ہے اور مستقبل کے افق سے ابھرنے والے مسافروں کے لئے جس کی آنکھوں کی معنی خیز چمک میں اس کی ساری داستانِ حیات یوں سمٹ آتی ہے ؎

تمام عمر اسی کی تلاش میں گزری وہ ایک عکس کہ آئینۂ نظر میں نہ تھا

رضا ہمدانی

○

پھولے پھلے ہیں بے سروسامانیوں میں ہم
اک پھول بن کے مہکے ہیں ویرانیوں میں ہم

اس پیکرِ جمال کے اعجازِ حسن سے
ڈوبے ہیں بن کے آئینہ حیرانیوں میں ہم

شاید سکوں سے دل کو کوئی ربط بھی نہ تھا
کیا مطمئن رہے ہیں پریشانیوں میں ہم

ابھرے تو اپنے آپ میں آئے نہ عمر بھر
ڈوبے تھے حسنِ یار کی طغیانیوں میں ہم

اب تو کھٹک رہے ہیں جہاں کی نگاہ میں
مشہور کس قدر تھے گل افشانیوں میں ہم

چرچا ہماری سادہ دلی کا ہے شہر میں
بدنام کتنے ہو گئے نادانیوں میں ہم

افتادِ طبع کا وہی عالم ہے آج بھی
برباد اگرچہ ہو گئے من مانیوں میں ہم

سارے جہاں میں کوئی خریدار ہی نہیں
اتنے گراں بہا ہوئے ارزانیوں میں ہم

پاسِ وفا سے لب پہ شکایت نہیں رضا
کچھ کم نہیں کسی سے پشیمانیوں میں ہم

رضا ہمدانی

○

زخم کچھ ایسے مرے قلب و جگر نے پائے
عمر بھر جو کسی عنوان نہ بھرنے پائے

ہم نے اشکوں کے چراغوں سے سجالیں پلکیں
کہ تیرے درد کی بارات گزرنے پائے

موج طوفاں کی طرح بیت گئی فصلِ بہار
ہم ابھی دامنِ دل چاک نہ کرنے پائے

جن سے شاداب رہے ہیں تیری چاہت کے کنول
دل نے کچھ ایسے تیری یاد کے جھرنے پائے

اس لیے کم نظری کا بھی ستم سہنا پڑا
تجھ پہ محفل میں کوئی نام نہ دھرنے پائے

پاسِ آدابِ وفا تھا کہ شکستہ پائی
بے خودی میں بھی نہ ہم حد سے گزرنے پائے

اپنے جذبات کے بپھرے ہوئے دھارے میں رضاؔ
اس طرح ڈوبے کہ پھر ہم نہ اُبھرنے پائے

رضا ہمدانی

○

اشک یوں بہتے ہیں، ساون کی گھڑی ہو جیسے
یا کہیں پہلے پہل آنکھ لڑی ہو جیسے

کتنی یادوں نے ستایا ہے تیری یاد کے ساتھ
غمِ دوراں، غمِ جاناں کی کڑی ہو جیسے

بوٹے کاکل کی طرح پھیل گیا شب کا سکوت
تیری آمد بھی قیامت کی گھڑی ہو جیسے

یوں نظر آتے ہیں اخلاص میں ڈوبے ہوئے دوست
دشمنوں پر کوئی افتاد پڑی ہو جیسے

جلوۂ دار اِدھر، جنّتِ دیدار اُدھر
زندگی آج دوراہے پہ کھڑی ہو جیسے

یوں خیال آتے ہی ہر سانس میں محسوس ہوا
غمِ محبوب، تیری عمر بڑی ہو جیسے

رضا ہمدانی

○

حسن پابندِ حنا ہو جیسے
یہ وفاؤں کا صلہ ہو جیسے
یوں وہ کرتے ہیں کنارا مجھ سے
اس میں میرا ہی بھلا ہو جیسے
طعنہ دیتے ہیں مجھے جینے کا
زندگی میری خطا ہو جیسے
اس طرح آنکھ سے ٹپکا ہے لہو
شاخ سے پھول گرا ہو جیسے
حالِ دل پوچھتے ہیں یوں مجھ سے
تم مرے دل سے جدا ہو جیسے
دیکھ کر زخمِ دلِ افسردہ میں
چاک دامانِ وفا ہو جیسے
اب وفا کو بھی ترستے ہیں رضاؔ
یہی تاثیرِ دعا ہو جیسے

○

بھول جانا پہ یاد آنا سہی — دل دکھانے کا اک بہانہ سہی
چاک ہوں گے عقیدتوں کے جگر — فکر کی راہیں کافرانہ سہی
خواب آلود ہے افق کب سے — اک صدائے قلندرانہ سہی
کچھ تو ہوگا پسِ دریچۂ دل — عاشقی کھیل اک پرانا سہی
گر رہا ہے وہ آبشارِ سکوت — نوحۂ عشرتِ شبانہ سہی
چاک ہے زندگی کا پیراہن — یہ جہاں اک نگار خانہ سہی
کتنے ہی اور داغ ہیں دل پہ
بے رخی کا تیری گلہ نہ سہی

رضا ہمدانی

تجھ سا جہاں میں فتنۂ دوراں نہ تھا کبھی
اس درجہ کوئی دشمنِ ایماں نہ تھا کبھی

وہ عشرتِ جنوں کا زمانہ بھی یاد ہے
دامن نہ تھا کبھی تو گریباں نہ تھا کبھی

صحرا کو لے چلی ہے ہمیں وحشتِ خیال
جیسے ہمارے گھر میں بیاباں نہ تھا کبھی

اکثر وفا پہ اپنی ندامت ہوئی بہت
لیکن میں اس قدر بھی پشیماں نہ تھا کبھی

کچھ یوں سکوتِ مرگ ہے بحرِ حیات میں
جیسے یہ وقفِ موجۂ طوفاں نہ تھا کبھی

راہِ وفا میں لٹتا رہا ہے رضاؔ مدام
یہ شخص ورنہ حاتمِ دوراں نہ تھا کبھی

غمِ حیات کے شعلے نہ سرد ہوں گے کبھی
سکوں شناس نہ ہم اہلِ درد ہوں گے کبھی

نظر میں ہیں لب و عارض کی سرخیاں جب تک
وفا پرستوں کے چہرے نہ زرد ہوں گے کبھی

وہ گرمیاں ترے انفاس نے عطا کی ہیں
ہمارے دل کے الاؤ نہ سرد ہوں گے کبھی

وہ جن کے قدموں کی رہتی ہے منزلوں کو تلاش
جہاں میں ایسے بھی کچھ رہ نورد ہوں گے کبھی

یقیں نہ ہو تو ہم اہلِ شعور مر جائیں
یہ زرد زرد کنول لاجورد ہوں گے کبھی

ادارہ

ابنِ انشاء

ابنِ انشاء نے اپنی غزل کی زبان میرؔ سے مستعار لی ہے لیکن اس کی غزل میں میرؔ کی سی خود گدازی اور خود سپردگی نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک ایسا عاشق ہے جس نے اپنے شعور کی دھار کو کند نہیں ہونے دیا۔ اس کی غزلیں پڑھ کر قاری کے سامنے ایک ایسی شخصیت اُبھرتی ہے جس کے جنون میں بھی شعور ہے، جس کے لاابالی پن میں بھی شائستگی ہے اور جو آبدیدہ ہونے کے باوجود لبوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے ہے۔ ابنِ انشاء کی یقیناً ایک اپنی شعری شخصیت ہے مگر اس کی غزل کے رنگ اور آہنگ کو سمجھنے کے لئے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس میں میر تقی میرؔ اور سید انشاء اللہ خاں انشاءؔ کی شخصیتیں ایک دوسرے میں حلول کر گئی ہیں۔ بظاہر یہ اجتماعِ ضدین ہے۔ میرؔ کی مہذب اداسی اور انشاءؔ کے بے فکرے پن اور پلنگ پن کے درمیان کوئی رشتہ پیدا کرنا بظاہر مشکل ہے مگر کامیاب شعرا میں سے کسی ایک کی بھی مثال لے لیجئے، ان میں اضداد کا ایک ہجوم نظر آئے گا۔ میرؔ کا سا لئے دیئے رہنے والا شاعر بھی جب اپنے گھر کا نقشہ کھینچنے پر آتا ہے تو اردو شاعری میں طنز و مزاح کا ایک نیا در کھلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ سوداؔ کا سا دبنگ شاعر بھی غزل میں زار زار رو دیتا ہے۔ غالبؔ کی سی بلند شخصیت بھی محبوب کے ساتھ عام قسم کی چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آتی۔ اقبالؔ کا سا مقصدی شاعر بھی قرطبہ میں دخترِ دہقان کے گیتوں اور اُس کی آنکھوں میں عربی نقوش دیکھ کر جھوم اٹھتا ہے۔ سو اگر ابنِ انشاء میں میرؔ اور سید انشاءؔ یکجا ہو گئے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ابنِ انشاء نے ان اضداد کو کیسے یکجا کر لیا ہے۔ اس نے اداسی اور بے فکری کے درمیان کیسا عجیب رابطہ پیدا کیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ابنِ انشاء کی آواز اردو غزل میں ایک جوگی کی سی آواز ہے جس کے بولوں میں صدیوں کا دکھ ہے مگر جس کے دکھ اس کے دل و دماغ پر بوجھ بن کر نہیں ٹوٹے، پھول بن کر کھلے ہیں۔ پھر اس کے لہجے میں جو سادگی اور سلاست ہے وہ تن آسانی کی بجائے گہرے فنی ریاض کی غماز ہے۔ میرؔ کے بعد بہت ہی کم شاعروں نے اتنی سادہ زبان میں اتنی کامیاب غزلیں کہی ہیں۔ نظیرؔ اکبر آبادی جیسا شاعر بھی، جس کی نظموں کی زبان میں یہی سلاست ہے، جب غزل کہتا ہے تو غزل کے کلاسیکی طرزِ اظہار کا شکار ہو جاتا ہے۔ شاعری کے آشوب کے اس دور میں بھی اگر ابنِ انشاء اتنے سادہ اور غیر نمائشی انداز میں ایسی شاعری کر رہا ہے جس کا ایک ایک مصرع ذہنوں میں اترتا چلا جاتا ہے تو یہ ابنِ انشاء کا بھی کمال ہے اور اردو غزل کا بھی جس کے مقدر میں شاید قیامت تک جوان رہنا لکھا ہے۔

ابن انشا

○

اس کو نام جنوں کا دے لو، پیار کہو کہ دُلار کہو
ایسا اور کسی کا دیکھا؛ دل کا کاروبار کہو

بستی میں دیوانہ سمجھو، دشت میں ہم کو خوار کہو
ان سے ایک نہ ایک بہانے ہونا تھا دوچار کہو

تم کیا سود و زیاں کی جانو، تم جو اسے ایثار کہو
جان تو دیں پہ جاناں پائیں، ہم کو دنیا دار کہو

اور کسی کے در پہ جائیں، چھوڑ کے اُن کا دوار مگر
ایسی اچھی آنکھوں والے کتنے ہیں سرکار، کہو

تم نے حال ہمارا دیکھا! تم جو باغ و بہاراں میں
گُل کو چاک بداماں جانو، نرگس کو بیمار کہو

بیچ بھنور کے منزل کرتے، ہم تو یوں بھی پہنچیں گے
ایک مٹکے میں لے چلتے ہو، مانجھی دریا پار کہو

ہم بھی ترے، کونین بھی تیرے، دنیا کیا اور عقبیٰ کیا
بیچ میں کیوں اے دوست اُٹھا دی، ناحق کی دیوار، کہو

انشا جی یہ فیض ہے کس کا، کیا ہے اس کا نام مقام
ہم تو رنگ تمہارا جانیں، ایسے کب اشعار کہو

ابن انشا

○

اے دل والو گھر سے نکلو، دیتا دعوتِ عام ہے چاند
شہروں شہروں، قریوں قریوں، وحشت کا پیغام ہے چاند
تو بھی ہرے دریچے والی، آ جا، برسرِ بام ہے چاند
ہر کوئی جگ میں خود سا ڈھونڈے، تجھ بن بے آرام ہے چاند
سکھیوں سے کب سکھیاں اپنے جی کے بھید چھپاتی ہیں
ہم سے نہیں تو ان سے کہہ دے، کرتا کہاں کلام ہے چاند
جس جس سے اسے ربط رہا ہے، اور بھی لوگ ہزاروں ہیں
ایک تجھی کو بے مہری کا، دیتا کیوں الزام ہے چاند
وہ جو تیرا داغِ غلامی ماتھے پر لیے پھرتا ہے
اُس کا نام تو انشا ٹھہرا، ناحق کو بدنام ہے چاند

ہم سے بھی دو باتیں کر لے، کیسی بھیگی شام ہے چاند
سب کچھ سُن کر آپ نہ بولے، تیرا خوب نظام ہے چاند
آج جو اک گوری کو ہم نے چوما، چوم کے چھوڑ دیا
قابو میں اوسان نہیں ہیں، اُس گوری کا نام ہے چاند
ہم اس لمبے چوڑے گھر میں شب کو تنہا ہوتے ہیں
دیکھ کسی دن آ مل ہم سے، ہم کو تجھ سے کام ہے چاند
اپنے دل کے مشرق و مغرب، اُس کے رُخ سے منور ہیں
بے شک تیرا روپ بھی کامل، بیشک تو بھی تمام ہے چاند
تجھ کو تو ہر شام فلک پر گھٹتا بڑھتا دیکھتے ہیں
اُسی کو دیکھ کے عید کریں گے، اپنا دین اسلام ہے چاند

ابنِ انشا

○

گوری اب تو آپ سمجھ لے، ہم ساجن یا دشمن ہیں
گوری تو ہے جسم ہمارا، ہم تیرا پیراہن ہیں

نگری نگری گھوم رہے ہیں، سکھیو اچھا موقع ہے
روپ سروپ کی بھکشا دے دو، ہم تو پھیلا دامن ہیں

تیرے چاکر ہو کر پایا، درد بہت، رسوائی بہت
تجھ سے تھے بیس ٹکے کمائے، آج تجھی کو ارپن ہیں

لوگو میلے تن من دھن کی ہم کو سخت مناہی ہے
لوگو ہم اس چھوت سے بچ گئیں ہم تو کھرے برہمن ہیں

پوچھو کھیل بنانے والے، پوچھو کھیلنے والے سے
ہم کیا جانیں کس کی بازی؟ ہم جو پتے باون ہیں

صحرا سے جو پھول چنے تھے ان سے روح معطر ہے
اب جو خار سمیٹا چاہیں، ہستی بستی گلشن ہیں

وہ دو بوند کو اپنی کھیتی ترسی ہے اور ترسے گی
کہنے کو تو دوست ہمارے بھادوں ہیں اور ساون ہیں

ابنِ انشا

○

رات کے خواب سنائیں کس کو، رات کے خواب سہانے تھے
دھندلے دھندلے چہرے تھے پر سب جانے پہچانے تھے

ضدی، وحشی، الھڑ، چنچل، میٹھے لوگ، رسیلے لوگ
ہونٹ اُن کے غزلوں کے مصرعے، آنکھوں میں افسانے تھے

وحشت کا عنوان ہماری اُن میں سے جو نار بنی
دیکھیں گے تو لوگ کہیں گے، انشا جی دیوانے تھے

یہ لڑکی تو اِن گلیوں میں روز ہی گھوما کرتی تھی
اس سے ان کو ملنا تھا تو اس کے لاکھ بہانے تھے

ہم کو ساری رات جگایا، جلتے بجھتے تاروں نے
ہم کیوں اُن کے در پر اُترے، کتنے اور ٹھکانے تھے

○

جانے تُو کیا ڈھونڈ رہا ہے بستی میں ویرانے میں
لیلیٰ تو اے قیس ملے گی، دل کے دولت خانے میں

جنم جنم کے ساتوں دکھ ہیں اس کے ماتھے پر تحریر
دکھ ایک اور لگانا ہوگا، یہ تحریر مٹانے میں

اُس کے ہوتے بزم کے اندر کیفیت کہاں سے آتا ہے
پیمانے سے آنکھوں میں، یا آنکھوں سے پیمانے میں

کس کا کس کا حال سُنایا، تُو نے اے افسانہ گو
ہم نے ایک تجھی کو ڈھونڈا، اس سارے افسانے میں

اِس بستی میں اتنے گھر تھے، اتنے در تھے، اتنے لوگ
اور کسی کے در پہ پہنچا، ایسا ہوش دوانے میں!

ابنِ انشا

○

دیکھ ہماری دید کے کارن، وہ کیا قابلِ دید ہوا
ایک ستارہ بیٹھے بیٹھے تابش میں خورشید ہوا

آج ترجانی رستہ تکتے، شام کا چاند پدید ہوا
تُو نے تو انکار کیا تھا، دل کب نا اُمید ہوا

آن کے اس بیمار کو دیکھے، تجھ کو کب توفیق ہوئی
لب پر اس کے نام تھا تیرا جب بھی درد شدید ہوا

ہاں اس نے جھلکی دکھلائی، ایک ہی پل کو دریچے میں
جانو اک بجلی لہرائی، عالم ایک شہید ہوا

تو نے ہم سے کلام بھی چھوڑا، عرضِ وفا کے سنتے ہی
پہلے کون قریب تھا ہم سے، اب تو اور بعید ہوا

دنیا کے سب کارج چھوڑے، نام پہ تیرے انشا نے
اور اسے کیا تھوڑے غم تھے، تیرا عشق مزید ہوا

○

دیکھ ہمارے ماتھے پر یہ دشتِ طلب کی دھول میاں
ہم سے ہے ابھی یاد کا ناطہ، دیکھ ہمیں مت بھول میاں
اہلِ وفا سے بات نہ کرنا، ہوگا ترا اصول میاں
ہم کیوں چھوڑیں ان گلیوں کے پھیروں کا معمول میاں
یونہی تو نہیں دشت میں پہنچے، یونہی تو نہیں جوگ لیا
بستی بستی کانٹے دیکھے، جنگل جنگل پھول میاں
یہ تو کہو کبھی عشق کیا ہے؟ جگ میں ہوئے ہو رسوا بھی؟
اس کے سوا ہم کچھ بھی نہ پوچھیں، باقی بات فضول میاں
نصب کریں محرابِ تمنا، دیدہ و دل کو فرش کریں
سنتے ہیں وہ کوئے وفا میں آج کریں گے نزول میاں
سن تو لیا کسی نار کی خاطر، کاٹا کوہ، نکالی نہر
ایک ذرا سے قصے کو اب دیتے کیوں ہو طول میاں
کھیلنے دیں انھیں عشق کی بازی، کھیلیں گے تو سیکھیں گے
قیس کی یا فرہاد کی خاطر کھولیں کیا اسکول میاں
اب تو ہمیں منظور ہے یہ بھی، شہر سے نکلیں، رسوا ہوں
تجھ کو دیکھا، باتیں کرلیں، محنت ہوئی وصول میاں
ہم کو یہ کب تم پہ گماں تھا، شاعر ہو تم انشا جی
اب تک تو جب بھی ہمیں دیکھا، لگتے تھے معقول میاں

صلاح الدین محمد

مشرقی پاکستان کے اردو شاعروں میں صلاح الدین محمد کو کئی لحاظ سے ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ وہ نوجوان ہے مگر ابھی سے اس کا ایک خاص اسلوب ہے جو سراسر اُن کا اپنا ہے۔ اس اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی امیجری اور اس کی علامتیں ہیں۔ شاعری میں علامت کا استعمال نہایت مشکل اور نہایت نازک فن ہے۔ اس کے استعمال میں اگر سلیقہ نہ برتا جائے تو یہی علامت شاعری کو ناقابلِ فہم اور اس لئے بے نتیجہ اور بے ثمر بھی بنا ڈالتی ہے۔ آج کے دور میں علامت کے استعمال میں اس بے سلیقگی کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ یہاں سلیقے سے مراد ہے اردو کی کلاسیکی شاعری کی روایت سے استفادہ کرنا اور اپنے آپ کو اپنے معاشرے میں شامل سمجھنا اور فن کار کی یہ ذمہ داری نبھانا کہ اس کا فن، اس کی تفہیمِ حقیقت اور اس کی تخلیقِ جمال صرف اس کی ذات ہی کو آسودگی نہ بخشے بلکہ وہ اس آسودگی کو قاری تک بھی منتقل کر سکے ـــــــ

صلاح الدین محمد علامت کے استعمال کے معاملے میں بڑا باسلیقہ شاعر ہے۔ وہ دراصل علامتوں ہی کا شاعر ہے۔ لیکن علامت سے اس نے جو قیمتی کام لیا ہے، وہ کچھ اسی کا حصہ ہے۔ اس کا سبب محض یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے خول میں سمٹ سکڑ کر نہیں بیٹھ گیا ہے۔ وہ اس زندگی کا ایک حصہ ہے جو اس کے چاروں طرف رواں دواں ہے۔ وہ اس سماج کا ایک رکن ہے جس نے اسے وہ کچھ بنایا ہے جو وہ ہے، وہ تہذیبی، سیاسی اور مجلسی لحاظ سے ایک باشعور شاعر ہے اور جانتا ہے کہ داخلیتِ محض صرف ایسے شاعروں کو سجتی ہے جن تک ابھی مشین کی ایجاد کی اطلاع نہیں پہنچی اور جن کے اندر ابھی یہ احساس نہیں جاگا کہ آج پورے کرۂ ارض کے انسان مشترکہ مستقبل کی طرف گامزن ہیں۔

صلاح الدین محمد نے علامتیں اپنے اردگرد کی زندگی سے چنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی علامت ابلاغ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ قاری اس کی علامتوں سے نہ صرف اجنبیت محسوس نہیں کرتا بلکہ علامت کی مدد سے مفہوم اس کے ذہن میں چمک اٹھتا ہے۔ بعض علامتی شاعروں کے ہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ علامتیں تو اپنے آس پاس سے چنتے ہیں مگر عجزِ اظہار انہیں بے بس کر دیتا ہے اور یوں علامتیں ان کے گنجلک زبان و بیان کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ صلاح الدین محمد کو معلوم ہے کہ علامت کی کیفیت "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کی سی ہے اس لئے اس نے اردو کی کلاسیکی غزل کی زبان کو نئے امکانات سے آراستہ کر کے علامتی شاعری کی ہے۔ اسی لئے وہ جدید بھی ہے اور قابلِ فہم بھی۔ اس نے اظہار کا نیا انداز بھی اختیار کیا ہے مگر اس کی آواز جانی پہچانی بھی ہے۔ وہ حال کا شاعر بھی ہے اور مستقبل کا بھی۔

صلاح الدین محمد

شامِ تنہائی

ٹہنیاں ویران یادوں کی طرح اجڑی ہوئی
شامِ تنہائی سے لپٹی ہیں کسے اپنا کہیں
موسمِ گل کے چلے جانے سے پتے بھی گئے
کوئی طائر بھی نہیں آتا جسے اپنا کہیں

گھر کے بے مہر ہاتھوں میں ہوا بے مہر ہے
کوئی دیوانہ نہیں، کوئی خراباتی نہیں
ڈوبتا سورج بھی اب ناآشنا ہونے لگا
الوداع کہنے بھی اب کوئی کرن آتی نہیں

صلاح الدین محمد

پاگل ہاتھی

راجہ ناراض مہاوت سے
بستی بے چین بغاوت سے
بیڑی چھاگل نکلی
ہاتھی پاگل نکلا

ہاتھی پاگل پن میں
اپنی جان کا دشمن
کیا بستی کیا بن میں

دل دہلے، دل لرزے
پاگل ہاتھی ہر دیوار سے الجھے
دل دیوانہ، دلداری سے برہم، پیار سے الجھے
ہر پاگل انمول
ہاتھی پاگل نکلا

صلاح الدین محمد

لیلیٰ مجنوں

رانی رنگ رس کی
چاہت روپ بنی
چاہت جل تھل جھیل ہوئی
تنہائی جس کی پیاس
جھیل کنارے رنگ اس کی رانی روپ نکھارے
جھیل کنارے
ہر ساعت البیلی
رانی تنہائی سے کھیلی

تنہائی کا زہر کھلے تو جھیل بھی امنڈا دریا
تنہائی کا زہر کھلے تو ہر شے ڈسنے والی
تنہائی متوالی
موجیں سرکش، لہریں بے کل، پانی میں انگارے
دریا دلکش روپ نکھارے
لیکن رانی رنگ رس کی رنگ سبھاگی ماتی
کب لہروں کی ساتھی

منزل منزل چلتے چلتے ہلکا عکس بھی گہرا
پھیکا پیار بھی لیلیٰ مجنوں پھیکا رنگ سنہرا

دروغ گو راوی

دل دروغ راوی
فاصلے بلا کے ہیں

پیرہن کے پیرائے
جسم کی پرستش میں
جستجو محبت کی
خود فریب خواہش میں

دل دروغ گو راوی
فاصلے بلا کے ہیں

پیکر وفا کس نے
جسم سے تراشا ہے
زلف و عارض ولب میں
پیار کا تماشا ہے

داغ دل کا سرمایہ
کس نے کس کو اپنایا

صلاح الدین محمد

یادوں کے دیے

احساس الجھتے ہوئے لمحوں کی حکایت
ہے سروچراغاں تری یادوں کے دیے سے
تخئیل تمناؤں کی دریوزہ گری بھی
بے باک ہوئی جاتی ہے ہونٹوں کے سیے سے
یادوں کے دیے
زہر پیے
آگ لیے ہیں

لیل و نہار

سحر پرستوں کی داستاں بھی
طلوعِ خورشید کی حکایت
تمامتر روشنی کا محور
تمام امید کی حکایت

جہاں بھی امید جلوہ گر ہے
وہاں دلِ داغدار ہوگا
جہاں بھی سورج کی بات ہوگی
سوالِ لیل و نہار ہوگا

صلاح الدین محمد

پرستارِ اَنا

شوقِ وارفتہ ملا
جسم بے خواب لیے
تیرگی تشنہ لبی
تیرگی توبہ شکن
تیرگی تیشۂ مہتاب لیے

دست و بازو کی تمنا ہے بدن
روح بے رحم، پرستار انا
آگہی، آگ ہیں جیسے ایندھن
روح سرشارِ انا
شوق وارفتہ ملا
جنس نایاب لیے

قاتل سورج

چاند رفیقِ دشت نوردی ریت کی بے نوری پر رویا
ہم صحرا کے نئے مسافر سمجھے، رات سحر تک آئی
دل نے دن کو منزل جانا

جلتی ریت جہنم
ایندھن اس کے دشت نورد
سورج مرگ برہنہ، قاتل
دن رہزن
دن قاتل سورج کا پیراہن
مقتولوں کی لاش چھپائے
رات کے پیچھے بھاگے

شکیب جلالی

خلیل رامپوری

کیا کبھی آپ نے سورج کو مغربی افق سے پلٹتے اور دوبارہ نصف النہار کی طرف جاتے دیکھا ہے؟ اردو شاعری کی تاریخ میں یہ معجزہ غزل نے بار بار دہرایا ہے۔ کئی مرتبہ اس کے زوال کا نعرہ سننے میں آیا لیکن ہر بار تاریکی کی دہلیز کو چھونے سے پہلے ہی اسے نئی آب و تاب کے ساتھ دوبارہ بلند ہوتے دیکھا گیا۔ یہ غزل کے انتہائی جاندار صنفِ سخن ہونے کا بین ثبوت ہے۔ دراصل اس کے مزاج میں کچھ ایسی لچک ہے کہ یہ ہر زمانے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لیتی ہے۔ اگر اس میں یہ وصف نہ ہوتا تو اس سے قبولِ عام کی سند کب کی چھن گئی ہوتی۔

پچھلے برسوں میں اردو غزل کو ایک بار پھر عروج حاصل ہوا ہے اور اس میں زیادہ تر ہاتھ جدید نسل کے ان شعرا کا ہے جنھوں نے اپنے پیش رو سخنوروں کے قیمتی ورثے کو سینے سے لگایا اور اسے نئے تقاضوں کے مطابق نکھارا سنوار کر آگے بڑھایا۔ ایسے شعرا کی فہرست میں ناصر، احمد اور سیف، نقی جیسے متعدد نام آتے ہیں۔ خلیل رامپوری بھی شعرا کے اسی قبیلے کا ایک نمایاں فرد ہے۔ اس کے فن کی جڑیں تو روایت میں ہیں لیکن اس میں پھول نیا آتا ہے۔ وہ جدت برائے جدت کا قائل نہیں۔ اس کے ہاں تر و تازگی اور نیاپن تو ضرور ہے لیکن وہ ان جدید تر شعرا سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا جو ایک سے دس تک کے اعداد کو دو مصرعوں میں برابر تقسیم کر کے ان پر غزل کے شعر کا لیبل چسپاں کر دیتے ہیں۔

خلیل کا اپنا منفرد اسٹائل ہے جس میں ایک طرح کی معصومیت اور البیلاپن بہم ملتے ہیں۔ اس کی غزل گمبھیرتا، بوجھل پن اور الجھاؤ سے دامن کشاں ہے۔ اس کے لہجے میں دل موہ لینے والی ملائمت، شگفتگی اور سلاست ہے۔ وہ سامنے کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے نظر بچا کر نہیں گزر جاتا، انھیں اپنا موضوعِ سخن بناتا ہے۔ اسے ہلکے پھلکے احساسات، معمولی معمولی مشاہدات اور چھوٹے چھوٹے تجربات کو شعر کے قالب میں خوبصورتی سے ڈھالنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اس کے جذبات میں تندی اور شوریدگی کا سراغ نہیں ملتا۔ ایک ہلکا ہلکا تلاطم ہے جیسے کوئی خوشبودار جھونکا جھیل کی پرسکون سطح پر دائرے پھیلا جائے۔ اسی طرح اس کے سوچ بچار کا انداز بھی بہت گہرا اور بھاری بھرکم نہیں۔ جہاں کہیں فکر کی گہری لہر سرائت کرتی ہے وہ اسے اتنی سبک اور مدھم نے میں پیش کرتا ہے کہ اس کی گرانی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک لطیف اور دلکش سی شے بن جاتی ہے۔ شاید خلیل نے اس معاملے میں ندیم کے اس مصرع کو اپنا مسلک بنا لیا ہے کہ

یوں مُڑ جیسے پھول کی پتی، یوں چل جیسے سرگوشی

خلیل نے شاعری شروع کرنے کے بہت بعد حروفِ ابجد سے شناسائی حاصل کی۔ اس وقت اس کی عمر کا وہ حصہ گزر چکا تھا جب انسان کچھ سیکھنے اور جاننے کا نسبتاً زیادہ اہل ہوتا ہے لیکن لگاتار محنت اور گہری لگن سے اس نے تھوڑی ہی مدت میں اپنی صلاحیتوں کو چمکا لیا۔ یوں سمجھیے کہ وہ ایک ذہنی جست میں اپنے کتنے ہی ہم عصروں کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کے قابل ہو گیا۔ اس کی ترقی کی رفتار اگر یہی رہی تو کون جانے وہ ان میں سے کس کس کو کب پیچھے چھوڑ جائے۔

خلیل رامپوری

○

نقش وہ آنکھ میں اُترا تھا کہ جاتا ہی نہ تھا — میں نے اُس دھوپ کو ڈھلتے کبھی دیکھا ہی نہ تھا

روح کی پیاس بجھائے نہ بجھے گی کسی ڈھنگ — مجھ کو اس دشت کی پہنائی میں اگنا ہی نہ تھا

پہلے اس گھر کی ہر اک کھڑکی کھلی رہتی تھی — یوں ملا کرتے تھے جیسے کبھی پردہ ہی نہ تھا

اب جو انسان ہواؤں میں اڑا پھرتا ہے — یہ کبھی پیڑ کے سائے سے نکلتا ہی نہ تھا

دوڑ پڑتا تھا، جہاں ریت سے جلتے تھے قدم — ساتھ دریا تھا مگر ڈر سے اترتا ہی نہ تھا

ایسی سردی میں وہاں جا کے کہاں سستاتے — پار ندی کے کہیں دھوپ کا خیمہ ہی نہ تھا

رات کا پیڑ اُگا تھا کہ کوئی سایہ تھا — کیا کہوں، ہاتھ لگا کر اسے دیکھا ہی نہ تھا

کتنے آزاد تھے برسات کے خودرو نالے — اپنی دنیا تھی، کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا

حادثہ ایسا بھی پیش آئے گا، مر جاؤں گا — خواب ایسا تو کبھی عمر میں دیکھا ہی نہ تھا

شاعری نے مجھے انسان بنایا ہے خلیل
میں وہ شیشہ تھا کہ دنیا سے چمکتا ہی نہ تھا

خلیل رامپوری

○

روشنی لے کر اندھیری رات میں نکلا نہ کر
رات پردے کے لیے ہے خود کو بے پردہ نہ کر

دہر کا پھیلاؤ بھی نقطہ نظر آنے لگے
شعر کہتا ہے تو کہہ، اتنا مگر سوچا نہ کر

ایک دن تو بھی کسی تارے سے ٹکرا جائے گا
دوست میرے رات کی گلیوں میں یوں گھوما نہ کر

چاند بھی اُترا تھا پچھلی شب اسی تالاب میں
کیوں چمکتا ہے نہا دھو کر بدن، پوچھا نہ کر

آئینہ چمکائے رکھ، سب کچھ نظر آ جائے گا
جس کی چاہت ہو اُسے خود سے جدا سمجھا نہ کر

دوپہر کی دھوپ چہرے کو جھلس دے گی خلیل
گھر کی ٹھنڈک چھوڑ کر پیڑوں تلے بیٹھا نہ کر

خلیل رامپوری

○

دن ہے دھوپ کا چڑھتا دریا، اُترے گا تو پار لگو گے
گھر میں جا کر سو جاؤ گے دنیا سے بیزار لگو گے

ہر اک گُل کا سنہرا سایہ اس کے سندر رُوپ کا پرتو
جس سائے میں جا بیٹھو گے، اس کے نقش و نگار لگو گے

ساری ساری رات نہ سونا، غزلیں کہنا، ٹھیک نہیں ہے
دن کو کام میں جی نہ لگے گا، لوگوں کو بیمار لگو گے

پھول سی بستی میں، بہتر ہے، خوشبو بن کر وقت گزارو
ورنہ تم بھی، شاعر صاحب، پہلوئے گُل میں خار لگو گے

اونچے لوگوں کی محفل میں بیٹھو گے تو جچ نہ سکو گے
اپنے سے چھوٹے لوگوں میں بیٹھو گے، سردار لگو گے

کوئی اچھوتی بات انوکھے رنگ میں جب تم پیش کرو گے
بوڑھی محفل کے لوگوں کو البیلے فن کار لگو گے

خلیل رامپوری

○

نشہ سوار ہے اب تک سفر کا آنکھوں پر
دکھائی دیتی ہے خاکِ آسماں کی پیروں پر

میں جل رہا ہوں مناظر کی آگ میں کب سے
کوئی غلاف چڑھا دے مری نگاہوں پہ

نکالیے گا مکاں سے قدم مہک کی طرح
کہ آج چاندنی سوئی ہوئی ہے سڑکوں پر

ہوائیں شور مچاتی ہیں، مور ناچتے ہیں
بکھر گیا ہے صدا سے کے کوئی رستوں پہ

ٹپک رہا ہے تری انگلیوں سے خوں کیسا
کہ اس نے بید تو مارے ہیں میرے ہاتھوں پر

بہا دیا انھیں دریا میں میرے بعد خلیل
لکھا ہوا تھا مرا نام جن کتابوں پر

○

نقش کوئی اُبھاریئے، رنگ کوئی جمائیے
عرصہ ہوا سُنے ہوئے، آج تو کچھ سنائیے

پانی پیو تو آج بھی آتی ہے باس خون کی
لختِ جگر سے جو چراغ کیسے انھیں بجھائیے

کس کے لہو کی دھار سے دامنِ شام سرخ ہے
کس سے سوال کیجیے، کس سے یہ بھید پائیے

موجۂ سیلِ غم سے تم نکلے ہیں دوستو ابھی
خشک ہے پیرہن مگر کس کو یقیں دلائیے

دن کا شرار بجھ گیا، چڑیوں کا شور تھم گیا
شب کا علم بلند ہو، کوئی دیا جلائیے

ڈوبا ہوا ہے سارا شہر رات کی جھیل میں خلیل
کس کے مکاں پہ جائیے، کس کو غزل سنائیے

خلیل رامپوری

○

ملتی ہے جس جگہ پہ زمیں آسمان سے
دیتے ہیں کچھ دکھائی وہاں بھی مکان سے

برسا ہے ابر پارہ کوئی کوہسار پر
ہیں پتھروں پہ آبِ رواں کے نشان سے

چلتی ہے کس صدا پہ ہوا بے نشان سی
آتے ہیں جانے تیر یہ کس کی کمان سے

کل رات ایک پھول کو چوما تھا خواب میں
مہکے ہیں آج اس کے لبوں پر نشان سے

جسموں کے خول اوڑھ لیے ہیں تو کیا، کہ ہم
ہیں ایک دوسرے کے لیے داستان سے

شعلہ سا ایک دل سے اٹھا اور بجھ گیا
ٹکرا گیا تھا کیا کوئی دھارا چٹان سے

آیا نہ بولنے کا ہنر آج تک خلیل
پگھلا دیئے ہیں سنگ کسی نے زبان سے

○

وہ سو رہا تھا اور سرہانے کھڑا تھا میں
اس روز اپنے عشق پہ نادم ہوا تھا میں

ان انگلیوں کے لمس میں کھویا ہوا تھا میں
ظاہر میں سو رہا تھا مگر جاگتا تھا میں

اپنی صدا کو دور کہیں سن رہا تھا میں
جنگل میں آج خود سے جدا ہو گیا تھا میں

بتی جلی تو سارا مکاں گھورنے لگا
کیا ارتکابِ جرم کوئی کر رہا تھا میں

نکلا جو گھر سے دھوپ نے حلقے میں لے لیا
مدت میں آج اس کے یہاں جا رہا تھا میں

اک غم کی لو نے پھونک دیا تھا مرا بدن
سوکھے ہوئے شجر کی طرح ہو گیا تھا میں

اک آئینے میں آج نظر آئی اپنی شکل
ورنہ خلیل خود کو کہاں جانتا تھا میں

خلیل رامپوری

○

رستہ دریا میں نظر آیا جو لاٹھی ڈالی
کام آئی مرے پاکیزہ خیالی میری

اندھی آنکھوں کی طرح ہو گئے چشمے بے آب
اب کے تالاب کی طرح ہو گئی دل سی دھرتی

سونے دیتی نہیں مجھ کو یہ برہنہ راتیں
گویا دشمن ہیں مرے حق میں نگاہیں میری

کون کہتا ہے کہ تنہائی کا ساتھی ہے خیال
نظر آتی نہیں اس شیشے میں صورت کوئی

اس سے روشن تو ہیں گھر کے در و دیوار خلیل
کم سے کم آپ سے بہتر تو ہے گھر کی بتی

○

ایک مدت کے بعد ملے ہو، اچھے ہو
تم بھی اب کیا امریکہ میں رہتے ہو

شاعر ہو نا! آنکھیں کھولے سوتے ہو
دفتر کو بھی اپنی دنیا سمجھے ہو

پوچھو تو ۔ کہتے ہو، میرا سایہ ہے
دھوپ کو اک گٹھری میں باندھے پھرتے ہو

سر پر ٹوپی اور نہ جوتا پیروں میں
کس کی یہ بندوق اٹھائے پھرتے ہو؟

سورج تو پتھر کی آڑ سے آ نکلا
تم اب کس کا رستہ روکے بیٹھے ہو؟

بستی میں اک رامپوری شاعر بھی ہے
کوئی دن تم اس کے پاس بھی بیٹھے ہو؟

محمد خالد اختر

ٹائم — دی ویکلی نیوز میگزین

ہمہ گیر اندھیرا

پچھلے ہفتے کے آخر میں ایک رات کو صوبہ مغربی پاکستان میں اچانک بجلی فیل ہو گئی اور مسلسل کئی گھنٹے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مکمل اندھیرا چھایا رہا۔ اس واقعہ کے متعلق ایک مقامی اخبار نے خبر دیتے ہوئے کہا:

> ہوبہ آر (اے پ) کل مغربی پاکستان گرڈ میں کوئی ٹیکنیکل نقص ہو جانے کی وجہ سے لاہور، پنڈی، ملتان اور دوسرے اہم شہروں میں چھ سات گھنٹے تک مکمل اندھیرا رہا۔ بجلی کی غیر موجودگی میں کئی سینما اپنی فلمیں نہ دکھا سکے۔ اور دوکانیں، ہوٹل ریستوران جلد بند ہو گئے۔ شہری کاروبار کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ کیا جا رہا ہے۔ واپڈا کے انجینیر صورت حال پر قابو پانے اور بجلی کی بحالی میں کامیاب ہو جانے کے بعد اب تحقیقات کر رہے ہیں کہ اس برقی تعطل کا اصل سبب کیا تھا۔ اس نامہ نگار کو باوثوق ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ تعطل کی اصل وجہ یہ تھی کہ بیراں غائب پاور اسٹیشن کے سوئچ گیئر چینل میں ایک چھپکلی لیٹ کر گھس آئی۔ شارٹ سرکٹ ہونے سے گرڈ کا سارا نظام جو باہم منسلک ہے درہم برہم ہو گیا۔

لیکن اس واقعہ کے موضوع پر "ٹائم میگزین" کے اردو میں نکلنے والے ایشیائی ایڈیشن میں ایک پوری سرورقی کہانی شائع ہوئی جو قارئین کی دلچسپی کے لئے نیچے درج ہے:

واٹوں کی بغاوت (دیکھو سرورق)

لاہور سے پانچ ہزار فٹ اوپر کہری وصاف فضا میں کراچی سے آنے والا ۴ لاکھ روپے کا سبز پی آئی اے سپر کنسٹیلیشن جیٹ لاہور ایئرپورٹ پر اترنے کے لئے منڈلا رہا تھا۔ طیارے کا کپتان محمد خاں (۴۵ سال) ایئرپورٹ کے اٹھائیس فٹ اونچے دو منزلہ کنٹرول ٹاور سے اترنے کے سگنل کا انتظار کر رہا تھا اور پرواز کے ٹرپ کی خوشی میں سیٹی بجا رہا تھا۔ پھر اس نے حیرانی اور خوف میں آنکھیں جھپکیں "دوسرا قاہرہ گھٹیا گل گوتھا" محمد خاں بڑبڑایا۔ نیچے ایک لمحہ پہلے شہر گہری شام کے جھٹپٹے میں چمک رہا تھا۔ روشنیوں کے فوارے، بے شکل مضافات میں جواہرات کی آب و تاب کے ساتھ دمکتے ہوئے روشنیوں کے فیتے۔ رنگین روشنیوں کے پھٹتے ہوئے غبارے دعوت نظارہ دے رہے تھے اور دوسرے لمحے سب کچھ غائب ہو گیا۔ سپر کنسٹیلیشن کے اڑتالیس مسافروں کے دل دھک دھک کرنے لگے اور ایک بوڑھا آدمی غش کھا گیا۔ اس جہاز میں روالگا ڈانگا (رقبہ پچاسی مربع میل، آبادی چار ہزار) کا دورے پر آنے والا پریذیڈنٹ حاجی شفیلو (۶۲ سال) اور اس کی چار بیویاں بھی تھیں۔ وہ بے اشوڑوں پر ہاتھ مارنے لگیں۔ حوصلہ مند تجربہ کار کپتان محمد خاں نے حیرت سے دوبارہ سوچا "یہ دنیا کا خاتمہ ہے، دوسرا ہیروشیما"۔ صرف ایئر ہوسٹس خوبصورت بجلی قمر اسمٰعیل نے اپنے ہوش قائم رکھے۔

اس نے کہا "یہ روزمرہ کی بات ہے لاہور میں بجلی پھر فیل ہوگئی ہے"

مس قمر اسمٰعیل ٹھیک کہتی تھی مگر بجلی صرف لاہور کے شہر میں ہی فیل نہیں ہوئی تھی بلکہ اس برقی گہن کے دیئے نے شمال میں واڑسک سے لے کر جنوب میں رحیم یار خاں تک مغربی پاکستان کے بیشتر علاقے (اندازاً ۶۰ ہزار مربع میل) کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ڈیڑھ کروڑ لوگ تاریکی میں ڈوب گئے۔ تقریباً دو ارب روپے کے ویسٹ پاکستانی گرڈ نے کسی نامعلوم وجہ سے واٹوں کی ترسیل کرنے سے انکار کر دیا۔ غالباً یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مشین انسان سے زیادہ طاقتور ہے۔ گرڈ کے کئی بجلی گھروں میں مشینوں نے واٹ پیدا کرنے سے ہاتھ روک دیا اور کئی دوسرے جھنجھا کر غرائیں اور بند ہوگئیں۔

چھپکلیاں اور ٹڈے

اس برقی تعطل کا موجب کونسی چیز ہوئی تھی۔ اس اندھی طاقت کا کوئی بھی ماہر اصل وجہ پر انگلی نہیں دھر سکتا۔ واپڈا (پورا نام واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی) کے انجینیر یہ تو سب جانتے ہیں کہ کیا ہوا مگر یہ نہیں جانتے کہ کیوں اور کیسے ہوا۔ برقی قوت کا اتنا وسیع تعطل پہلے اس ملک میں کبھی نہیں ہوا۔ مشینی ٹربائنوں کے اس رویے نے اونچے واپڈا ناخداؤں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پہلا اشارہ کہ گرڈ کے تیور بدلے ہوئے ہیں، حبیب پیراں غائب کے ۴۲ کروڑ کے تھرمل پاور سٹیشن میں ہوا۔ بجلی کے کروڑوں واٹ گھڑی کی سوئی کی سمت گھومتے ہوئے اور برق وش سانپوں کی رفتار سے لہراتے ہوئے مغربی پاکستان کے شہریوں کو روشنی، حرارت، ریڈیو اور دوسری تفریحوں کی ضروریات مہیا کر رہے تھے کہ ملتان تھرمل پاور اسٹیشن کے طاقت کے بہاؤ کو ترسیل کرنے والے مشینی ہاتھ کپکپا اُٹھے۔ ٹربائن پہلے دہاڑے اور پھر چیخ کر ساکت ہوگئے اور باہر ۳۰ میگا واٹ کے چار لاکھ کی مالیت کے ٹرانسفارمروں سے شعلے کی زبانیں لپکیں۔ ایک منٹ میں بڑے چھبیس کروڑ روپے کا وارسک ہائیڈرو الیکٹرک سٹیشن بھی بدمست ہوگیا۔ سوئچ بھک بھک سے اڑنے لگے۔ چالیس ہزار واٹ کے ٹربائن کبھی سیدھے چلتے اور کبھی اُلٹے اور اس طاقت کے ساتھ کہ دریائے کابل کے بہاؤ کا رخ اُلٹ ہوگیا۔ میٹروں نے کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ واٹ کبھی اُٹھ کھڑے ہوتے۔ لاکھوں کی تعداد میں اچھل کود کرتے اور ۱۳۲ میگا واٹ چار کروڑ روپیہ کی لاگت کے شادی وال ہائیڈل بجلی گھر کی طرف بھاگتے۔ مگر پھر دوسرے لمحے ہانپتے ہوئے لوٹ آتے اور مایوسی میں لیٹ جاتے۔ برقی طاقت ڈیڑھ ہزار میگا واٹ سے اسی ہزار میگا واٹ ہوجاتی، پھر صفر ہوجاتی۔ کہا ایک واپڈا انجینیر نے "ایسی چیز پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ واٹوں کا یہ رویہ سب ٹیکسٹ بک اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ صریحاً برقی جن بڑی غیر ذمہ داری سے اور سب اخلاقی قانونوں کے خلاف یہ افسوسناک حرکت کر رہا ہے" شادی وال، مالاکنڈ، نندی پور میں ذیو ہیکل بجلی کی مشینیں یک ایک کے ہڑتال کرنے لگیں اور ہوائی اور تیل والے آہنی سرکٹ بریکروں کے شور سے پھٹتے ہوئے "آف" ہوگئے بات یہ تھی کہ انجینیروں نے برقی قوت کو ماپنے، سدھانے اور استعمال کرنے کے سب داؤ پیچ سیکھے تھے لیکن انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ایک متلون مزاج انسان کی طرح برقی قوت پر بھی کبھی دورے پڑ سکتے ہیں اور وہ بھی سب ضوابط اور بندھنوں کو توڑ کر اپنی من مانی کر سکتی ہے۔ کہا قابل، بیدار مغز، ڈائنمک واپڈا چیرمین غلام اسحٰق نے "ہم نے ایک سبق سیکھا ہے کہ مشینوں اور واٹوں پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور ہم آئندہ محتاط رہیں گے۔"

اندھے آدمی کا کھیل

لاہور میں اس رات کیا ہوا اور بہادر اور جانباز شہریوں نے اس بجلی کی بغاوت کو کس انداز میں لیا۔ کئی سو کہانیاں اب سننے میں آتی ہیں مشلاً افریقی سلطنت زامبار ملیبی (رقبہ آٹھ سو مربع میل۔ آبادی ڈھائی ہزار) کے جلا وطن سفیر مسٹر گومبو (۴۳ سال) نے جو لاہور میں پچھلے تین سال سے ہیں اور اپنے قومی لباس (ناک کے نتھنوں میں شتر مرغ کے پر، پاؤں میں جھانجھنیں وغیرہ) میں مال پر پھرنے کے باوجود خود کو لاہوری کہنے میں فخر محسوس

کرتے ہیں جو لوگوں کو بتایا "اس بلیک آؤٹ نے مجھ پر بڑا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو لاہور نے کیا۔ اس کے دوران سب سے دلچسپ اور سب سے زیادہ دقیق تجربہ ہے۔ ایسی مصیبت میں لوگوں کی بے تکلفی اور جرأت کی داد دینا پڑتی ہے۔ ہمارا جیسی میں ابھی تک ہم مشعلوں اور لالٹینوں سے روشنی کرتے ہیں اس لئے میرے لئے یہ بلیک آؤٹ بالکل نئی چیز ہے۔ اقبال بلکل ... تھیں مگر حقیقت اس سے بھی زیادہ بلکہ ... ڈیوٹی کرتے ہیں ... میں ایک مشتبہ آوارہ گرد نے اوپر نگاہ ڈالی اور ایک تیز رو لمحے میں اسے درختوں سے بھرے گنبد مکان قرون وسطیٰ کے زمانے کی فصیلیں لگے ... گویا ... اور سکندر لودھی کے زمانوں میں چلا گیا۔ گلبرگ میں بیگم شمسہ بدرالدجیٰ (سہیلیوں میں نام جیک) دل اپنے چودہ معزز مہمانوں کے لئے دعوت کے انتظام میں مصروف تھیں (راجہ احمد متقین (ایڈووکیٹ، سیاست دان) اس کی بیوی ۱۹۳۰ء کی بمبئی کی نیلی متقین اور دوسرے اہم لوگ مدعو تھے) ڈائننگ روم میں چاروں فلوروسنٹ روشنیاں گل ہوگئیں۔ اس نے روشنیوں کے آنے کا انتظار کیا جب بجلی نہ آئی تو وہ بوکھلا اٹھی۔ "چار ہزار روپے کا پارٹی ڈنر مکمل طور پر برباد ہوجائے گا" وہ غصے میں گڑگڑائی۔ اس کے خاوند مسٹر متقین دوسرے کمرے میں ٹیلی وژن دیکھنے میں گم تھے۔ انھوں نے وہاں سے آواز دے کر اپنی بیوی کو پکارا کہ ٹیلی وژن سیٹ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ فریج نے جس میں کسٹرڈ آئس کریم بن رہی تھی، کام کرنا چھوڑ دیا۔ ادھر مہمانوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس دن گھر میں موم بتیاں بھی نہ تھیں۔ آخر مسٹر متقین خود اپنی چالیس ہزار روپے کی ۱۹۶۴ ماڈل مرسیڈیز میں بھاگے اور آدھ گھنٹے تک موم بتیاں تلاش کرتے رہے۔ ایک روپیہ فی موم بتی کے حساب سے بیس موم بتیاں لے کر وہ واپس پہنچے تو ان کی بیوی نے ان سے لڑائی لڑی کہ انھوں نے اتنی دیر کہاں کر دی تھی، اور یہ کہ ان سے کسی کام کے لئے کہنا ہی غلطی ہے۔ موم بتیاں جلائی گئیں۔ مگر آدھے سے زیادہ مہمانوں نے ٹیلیفون پر معذرت کر دی اور پکا پکایا قیمتی کھانا تقریباً ضائع ہو گیا۔

مصری شاہ میں مغل پورہ ریلوے ورکشاپ کے مزدور کی بیوی سکینہ چولھے کے آگے بیٹھی اپنے خاوند اسحٰق اور پانچ بچوں کے لئے روٹیاں پکا رہی تھی اور گرم گرم ان کے سامنے رکھتی جاتی۔ اتنے میں اس کے صحن کی بجلی آہستہ آہستہ گل ہو گئی۔ اسحٰق نے ایک موٹی سی گالی بجلی والوں کو دی مگر وہ اور اس کے بچے آگ کی روشنی میں اپنا کھانا کھاتے رہے۔ کھانا کھا کر سکینہ بی بی نے اطمینان سے اپنا مٹی کا دیا روشن کیا اور اپنے کمرے کے طاق میں رکھ دیا۔ بجلی کے چلے جانے سے ان کے سکون پر بہت کم اثر پڑا۔

بعض لوگوں کو پہلے یہ خیال ہوا کہ تاریکی ان کے اندر سے آئی ہے اور ایک ادھیڑ عمر کے تاجر نے جو شب چشم کا مریض تھا، گل ہوتی ہوئی روشنیوں سے اس سوچ میں مبتلا ہو گیا کہ کہیں اس کی بینائی تو نہیں چلی گئی ہو۔ اردو بازار میں گلشن ہیر کٹنگ سیلون میں مو جھیل پانچ فٹ حجام قمرالدین اپنے استرے سے ایک گاہک کی مونچھیں تراش رہا تھا۔ ناگہانی اندھیرے میں اس نے مونچھوں کی بجائے گاہک کی ناک کا تھوڑا سا اونچا حصہ صاف کر دیا جس پر گاہک نے درد کی ایک بڑی چلاہٹ بلند کی اور کرسی سے چار فٹ اونچا اُٹھ آیا۔ بہت سے لوگ قتل کا گمان کرتے ہوئے دکان میں بھاگے آئے۔ لاہور والوں کے لئے سب سے تعجب خیز یہ بات تھی کہ اس تعطل میں ہڑتال اور لوٹ مار کے واقعات بہت کم ہوئے۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے صرف تین جانیں ضائع ہوئیں — دو بھینسیں اور ایک گدھا۔ ایک بھینس تیز ... چلتے ہوئے ایک ٹرک سے تصادم میں ہلاک ہوئی اور دوسری ... حرکت قلب کے فیل ہونے سے مری جیسا کہ دوسرے دن کارپوریشن کے ڈنگر ہسپتال (ڈنگر ڈاکٹر ہسپتال) ... کے پوسٹ مارٹم پر ثابت ہوا۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ گدھا کیسے مرا۔ وہ دوسری صبح چنگڑ محلہ کی ایک گلی کے نکڑ پر مرا ہوا پایا گیا۔ لاہور چڑیا گھر کے رکھوالوں نے اندھیرے میں ہڑبڑاہٹ میں غلط پنجرے کا دروازہ کھول دیا جس سے ... ام کا شیر ببر (۲۶) موتی نامی چیتے (البیلا نوجوان) کے پنجرے میں داخل ہو گیا اور دونوں کے درمیان رات بھر بڑی خوفناک لڑائی ہوتی رہی۔ مغربی پاکستان قانون ساز اسمبلی کے رات کے

سیشن میں ممبروں کی تنخواہ کے بارے میں ایک اہم قومی مسئلہ زیر بحث تھا۔ ڈونگہ بونگہ کے صوبائی ممبر نے ابھی لاؤڈ سپیکر کو اپنے قد (پانچ فٹ دو انچ) کے مطابق نیچے کر کے جناب سپیکر کے الفاظ ہی کہے تھے کہ روشنیاں چلی گئیں۔ پر جوشیلا ممبر بولتا جاری رکھا مگر لاؤڈ سپیکر کے فیل ہونے سے اس کی آواز ایک بکری کی ہیں ہیں ممناہٹ کی طرح تاریک ایوان میں سنائی دی۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دو تین ممبروں نے اسے سنا، اور انہیں وہ کافی ہیبت سی لگی۔ پہلے تو ممبر بیٹھے رہے کہ روشنی آ جائے گی۔ جب دس منٹ تک روشنی نہ ہوئی تو ممبر ایک ایک کر کے کھسکنے اور ٹٹول ٹٹول کر باہر جانے لگے۔ آخیر میں سپیکر، اسمبلی سارجنٹ اور ڈونگہ بونگہ کا ممبر پیچھے رہ گئے۔ ڈونگہ بونگہ کے ممبر نے سب موم بتیاں جو ایوان میں اس وقفے میں جلا دی گئی تھیں اکٹھی کیں اور وہ تینوں ٹھوکریں کھاتے کٹہروں کا سہارا لیتے باہر پہنچے۔ ساتھ کی الفلاح بلڈنگ میں چار مرد اور عورتیں کونسل آف نیشنل انٹگریشن کی ایک میٹنگ میں شامل ہونے کی خاطر نمبر دو لفٹ میں تیسری منزل پر جا رہے تھے۔ اچانک لفٹ کی لائٹ گل ہو گئی گڑگڑ کی آواز کے ساتھ لفٹ دوسری اور تیسری منزل کے درمیان ٹھہر گئی۔ اپنے باشندوں کو ایک آہنی کمرے میں تڑپ ، کرتی ہوئی ایک عورت نے چیخ ماری اور بیہوش ہو گئی۔ یہ لوگ پانچ گھنٹے اسی طرح لفٹ کے پنجرے میں معلق رہے۔ اسلامیہ کالج کے سکنڈ ایر کے طالب علم شاہزادہ مراد خاں (۱۹) نے، جو اس لفٹ میں تھے۔ بعد میں بتایا کہ یہ ایک بڑا خوفناک اعصاب کو ہلا دینے والا تجربہ تھا جب ایک بچاؤ کی پارٹی کسی طرح ان کو نکالنے کے لئے پہنچی اور بچاؤ والوں نے اندھیرے میں پوچھا "تم میں کوئی عورت بھی ہے" تو اندھیرے میں سب مردانہ آوازیں آئیں ہم سب خواتین ہیں، کونسل آف نیشنل انٹگریشن کے ہال میں مقرر بجلی کے گل ہونے کے بعد بھی بولتا گیا۔ اس وقت تک سامعین میں صرف ایک پستہ قد آدمی رہ گیا۔۔۔ جو مقرر کے تقریر ختم کرنے اور ڈائس سے نیچے اترنے کا منتظر تھا کیونکہ اس کا ارادہ مقرر سے کچھ روپیہ ادھار لینے کا تھا۔

سات سو پچاس رال ٹپکاتے ہوئے پتلیاں باہر نکالتے ہوئے تماشائی بھاٹی گیٹ کے ایک بوسیدہ سینما "عرش فرش" میں "باب بین" میں ایک نیم ملبوس ساؤنڈ ہیروئن کا ناچ دیکھ رہے تھے۔ روشنی جانے کے بعد ہال میں پندرہ منٹ "لائٹ اوے۔ وے تیری، وے تیری ..." وغیرہ کی گالیوں اور سیٹیوں کی آوازوں سے کافی اودھم مچا رہا۔ پھر مجمع نے خوش طبعی کی ایک لہر میں سینما کے سکرین پر ہلہ بول دیا اور ۵۰۰ روپے کا سلور سکرین اپنے ہاتھوں سے تار تار کر دیا۔ پولیس کے پہنچنے سے بیشتر مجمع کچھ فرنیچر توڑنے اور چند بریکٹ لائٹوں کو لے جانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کہا فرخ بیبر سینما کے ادھیڑ عمر کے منیجر نے "ہم تباہ ہو گئے ہیں۔ ہم نے یہ نیا سکرین پچھلے ہی ہفتے زر کثیر سے شائقین کی ضیافت طبع کے لئے تیار کرایا تھا۔ ہمیں اب پھر پرانا سکرین جس میں درجنوں سوراخ اور پیوند ہیں استعمال کرنا پڑے گا۔" مال روڈ پر پاش ریستوران فیروزان اونچے طبقے کے بے فکروں سے بھرا ہوا تھا۔ تاریکی کے اترنے ہی اور موم بتیوں کے آنے سے پہلے چار خوش پوش نوجوان اپنے اٹھارہ روپے کے بل کا انتظار کئے بغیر کھسک گئے۔ ریستوران کا بیرا احمد دین جب بل لے کر میز پر آیا، وہاں خالی کرسیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہا احمد دین بیرے نے "میں ان کو پہچانتا ہوں اور اگلی دفعہ وہ مجھے یہاں نظر پڑے تو ان کے کان مروڑوں، ہڑتالیوں کی خیر نہ ہو گی" بعض ستم ظریفوں نے مذاق مذاق میں پولیس کو ۴۴۴۴ اور ۳۳۳۳ ۔ ورکارپوریشن فائر بریگیڈ کو رنگ کیا اور فون پر خوفناک من گھڑت خبریں لوٹ مار اور آگ لگنے کی دیں۔ جب پولیس اور فائر بریگیڈ کا عملہ موقعۂ واردات پر پہنچتے تو وہاں کچھ نہ ہوتا۔ نتیجتہً جب فی الواقع مصری شاہ میں ایک چرم سازی کے کارخانے میں آگ لگی تو فائر بریگیڈ والوں نے اسے جھوٹ سمجھتے ہوئے پہنچنے سے انکار کر دیا۔

سارے لاہور میں اس رات گرمی اور حبس کے باوجود ایک بے فکری، احساس رفاقت اور جذبہ زندہ دلی کار فرما رہا۔ خصوصاً کئی زندہ دلوں نے کئی اجنبیوں سے شدید دوستی اور ہمدردی کا سلسلہ بڑھایا۔ اگرچہ بعد میں کئی اجنبیوں کی جیبی گھڑیاں، بٹوے غائب تھے۔

فاؤنٹین پین دو چھٹے سے کہیں غائب پائے گئے۔ جیسی داموں کا کام۔ اخبار گرم رہا۔ درانھوں نے منہ بولے دام بڑھا دیے تھے۔ شریفہ سکول ماسٹر کو ٹیکسی کرایہ سے ایجرٹن سے اپنے گھر جانے کے لئے پانچ روپے ادا کرنے پڑے۔

موم بتیاں

سب سے زیادہ موم بتیوں نے اس عظیم بین الاقوامی شہر کو بچایا۔ لوگ سٹوروں اور بازاروں سے جاتے جاتے موم بتیاں ختم کر دیتے گئے۔ پارک سنٹرل ہوٹل میں چار ہزار موم بتیاں ساری رات جلیں۔ انارکلی کے موڑ پر عجیب ذہن موم بتی بیچنے والے نے جواب دیا کہ اس نے ایک موم بتی کا ایک روپیہ وصول کیا ہو تو اس کا سٹاک آدھ گھنٹے میں ختم ہو گیا۔ کہا خوش دل ہمیں منچلوں والے عجیب ذہن نے ... باقی موم بتیوں کا سٹاک اکٹھا کر لیا ہے۔ اور اگلے بجلی کے تعطل کا انتظار کر رہا ہوں۔ لاہور کے ایک کالج کا اسسٹنٹ پروفیسر محمد منظل ایم اے ایم او ایل جو روشنی کے چلے جانے کے وقت اندرون شہر اپنے ایک دوست کے ہاں تھا، بھٹکتا، راستہ بھولتا، ایک بار پولیس اسٹیشن کی ہوا کھاتا کوئی چار بجے گھر پہنچی۔ دمیت کے مارے اس کی بیوی کی بری حالت تھی۔ اس نے سمجھا کہ پروفیسر یا تو اغوا ہو گیا ہے یا کسی کار کے نیچے آ کر مر گیا ہے۔ اس نے پروفیسر کے بہت سے دوستوں کو فون کیا اور وہ ساری رات شہر میں پروفیسر کا کھوج نکالنے کی خاطر پولیس سٹیشنوں، ہسپتال وارڈوں اور ایک دوسرے کے گھروں کی سیر کرتے پھرے۔

خواب

جو کچھ اس رات ہوا اب شہری تاریخ کا ایک باب بن چکا ہے ... جو اس قسمت میں جی کر رہے ... ابھی تک یقین ہو سکے ہیں۔ اس سارے واقعے کی حقیقت دھندلے سے خواب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس تباہی نے یہ ثابت کر دیا۔ اگر کسی ثبوت کی ضرورت تھی تو ... مشینوں کی بے سوچی سمجھی اطاعت پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے جہاں برقی قوت ایک بٹن دبانے کے تابع ہے ... اس وقت ایک موم بتی کا ... ہے۔ ہندوستانی حفاظتی انتظامات کے بغیر کسی شخص کی جیبی گھڑی یا بٹوہ زیادہ دیر تک اس کی جیب میں ... ایک بات ... یوں سنی ... وہ یہ کہ مکمل مشینوں کی دوستی اور ہمدردی کے سلسلہ میں چوکس رہنا چاہیئے کیونکہ ایسی ہمدردی اکثر بہت مہنگی پڑتی ہے۔ واپڈا انجینیروں نے یقین دلایا ہے کہ ایسے بلیک آؤٹ کا ہونا اب انتہائی ... اغلب ... وہ اس بات کی کہ آئندہ مستقبل میں بھی مشینیں ہمارا کام کرتی رہیں گے ... دینے کے لئے تیار نہیں۔ اندریں حالات مشینوں کے ساتھ دوستی سے پیش نظر ان پر بھروسہ کرنا غلطی ہوگی کیونکہ واپڈا والوں نے جو آج کیا ہے وہ کل بھی کر سکتے ہیں کتنے قیامت انگیز نتائج کے ساتھ ——— کوئی پیشگوئی نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ فلسفی اور کیمی ... جنھوں نے کہا یہ برقی تعطل کا تجربہ آخر بہت ... ایک اچھی چیز بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنے دشمن ملک سے ... جنگ چھڑ جانے کی صورت میں ہمارے کئی شہروں میں اور علاقوں پر بلیک آؤٹ ہوا کرے گا۔ ایک بلیک آؤٹ میں سے صحیح سلامت گذر آنے کے بعد ہم یہ جان سکیں گے کہ ان بلیک آؤٹوں میں ہمیں کیا کیا حفاظتی تدابیر وغیرہ اختیار کرنا ہوں گی۔ قسمت کے حادثے نے ہمیں مستقبل کے خطرات کے مقابلے کے لئے "ایجوکیٹ" کر دیا ہے اور جنگ کا بلیک آؤٹ ہمارے لئے غیر متوقع اور ہلاکت خیز نہیں ہو سکے گا۔

لوگ

(نام مشینوں کے بیڈ پروں سے دوبارہ معذرت کے ساتھ)

"میں تہت میں تاشی لامے کے بچا بچے کی دعوت پر جا رہا ہوں" سرخ سینیں کے پردوں اور اونچے آہنوسی دروازوں کے فلیٹی ہوٹل کے ڈبل سوٹ

کرے میں بے شمار فلمائے ہوئے کارناموں کے ہیرو اور آج کل کے لڑکوں کے ماڈل جیمز بانڈ فرام رشیا ود لو وغیرہ نے اعلان کیا۔ شکرے کے چہرے والا مرتی جسم بانڈ پچیس برس کو ہر مجیسٹی سیکرٹ سروس سے ریٹائر ہو چکا ہے۔ جون میں وہ پینشن پا رہا ہوگا اور سروس کی ریٹائرنگ کی عمر، لیکن اسے اس بات کا ذرا بھی غم نہیں کہ ایجنٹ ۰۰۷ کی حیثیت سے اس کا پرخطر عاشقانہ کیریر ختم ہو چکا ہے۔ بانڈ اپنی عمر سے ایک دن بڑا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے بال بدستور کہ وہ قدرے گنجا ہو چلا ہے اور اس نے ایک چھوٹی سی توند نکال لی ہے۔ وہ ابھی تک کوئی پھرتیلا اور چاق چوبند ہے۔ ہر کتے کا ایک دن ہوتا ہے۔ جیمز بانڈ نے پانچ مصنوعی دانت بھڑکاتے ہوئے کہا۔ ان دانتوں کے قائم مقام جو پچھلے سال اس نے برازیل میں خطرناک بین الاقوامی مجرم ڈاکٹر نو کے ساتھ کمہ بازی میں گنوائے۔ بانڈ جمالی تا اس بات میں ایمان رکھتا ہے کہ لوگ ایک عام آدمی کے لیے بڑی خطرناک چیزیں ہیں۔ بلکہ جنس کو تبدیل کرنے کے لئے جانے پہچانے حربے ۔۔۔ اگر استعمال کر رہا ہے۔ تاشی ڈاکا بھائی میرے ساتھ آکسفورڈ میں تھا۔ اور ہم پرانے دوست ہیں۔ اس نے اپنے سیکرٹ سروس دنوں کے نکل میٹل کے سگرٹ کیس سے مقدونیہ کا سیاہ لمبا سگرٹ نکالتے ہوئے صندلی آکسی ڈائمنڈ لائٹر سے سلگاتے ہوئے بتایا۔ پھر اس نے آہ بھری اور اپنی سیمائل روکی ریشمی پتلون کے بٹنوں پر نظر جما دی۔ بانڈ کے ساتھ تبت کے سفر پر اس کا فارم چیف ایم ہے۔ ایم اپنے چیف ۔۔۔ سے ایک ماہ پہلے ریٹائر ہوا۔ سویڈن کے ڈاکٹر اگلمنڈ کے پاس ہوائی جہاز میں پہنچا اور اپنی جنس کو تبدیل کرانے کا آپریشن کرایا۔ ایم اب ایک عورت ہے یا نقرپیا چھ فٹ لمبی نیلی چشم، کوے جیسے سیاہ گھونگھریالے بالوں والی میڈیم ایم جیمز بانڈ کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ بانڈ نے اقرار کیا کہ وہ میڈیم ایم سے خود کو کچھ دبا ہوا اور زن مرید قسم کا محسوس کرتا ہے۔ وہ لاہسا میں شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں یعنی گیتیوں نے دخل اندازی نہ کی تو۔ لیکن بانڈ کہتا ہے کہ وہ بھی اپنی جنس تبدیل کر رہا ہے اس لئے شادی میں الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

"اپنے وطن کی سرزمین میں واپس آنا اور لاہور کو اپنے قدموں کے نیچے صحیح سلامت پانا ایک حیران کن تجربہ ہے۔ میں خود کو سچا محب وطن محسوس کر رہا ہوں۔" ایبڈو زدہ سیاست دان جمعرات خواجہ نے لاہور کے ہوائی اڈے پر دو تین رپورٹروں کو بتایا جن کے کان میں اس کے آنے کی بھنک پڑ گئی تھی۔ کھچڑی بالوں والا، جامہ زیب چشمہ لگا جمعرات خواجہ ایبڈو ہونے کے بعد وینس چلا گیا تھا جہاں اس کا گنڈولوں کا کاروبار ہے اور جہاں اس کی لڑکیاں ڈوبڑی (چودہ سال ۔۔۔ ۳۴-۲۳-۳۴) اور پوشی (گیارہ سال) سکول میں پڑھتی ہیں۔ اس کے کتوں کے لئے بھی اس ملک کی آب و ہوا موافق نہیں۔ سات سالوں میں یہ جمعرات خواجہ کی لاہور میں پہلی واپسی تھی۔ اور وہ یہ دیکھ کر کہ لاہور ویسے کا ویسا بس رہا ہے بہت خوش ہوا۔ اپنی آمد کے دو دن بعد زین لاؤنج، جمعرات خواجہ نے آرٹ کونسل میں آٹھ صفحے کی آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی ایک تقریر مسئلہ کشمیر پر چنیدہ وکیلوں اور صحافیوں کے ایک منتخب مجمع کے سامنے پڑھی جسے بہت سراہا گیا۔ تقریر وینس میں ہی لکھی گئی تھی اور وہیں چھپی تھی۔ تقریر کے بعد جب اس سے پوچھا گیا کہ آیا وہ ایبڈو اٹھنے کے بعد سیاست میں دوبارہ آنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کا جواب معما انگیز تھا۔ کہا جمعرات خواجہ نے انگلی پر ۲۰۰۰ پونڈ کی ہیرے کی انگوٹھی کو بھڑکاتے ہوئے "ایک شیر اپنے پنجے اور داڑھی کو کھونے کے بعد بھی شیر ہی رہتا ہے۔" اس کی تقریر نے واقعی ثابت کر دیا کہ جھیل چھپیا تو ل خواجہ ابھی تک خود کو شیر سمجھتا ہے۔ وہ اپنے پنجے پھر نکال رہا ہے۔ داڑھی وہ کسی وقت بھی اگا سکتا ہے۔ اپنی بیوی اور دوسرے لوگوں اور دوستوں سے ملنے کے بعد وہ جلد پھر وینس جا رہا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ وینس اتنی جلدی پلٹنے کی کیا وجہ ہے جبکہ جنگ اب ختم ہو چکی ہے، جمعرات خواجہ منمنایا "میرے کتے وہاں اکیلے ہیں۔"

جب وہ کالج کی کلاس میں انگریزی ادب نہیں پڑھا رہا ہوتا، تو نوجوان چھریرا فراخ ماتھے والا پروفیسر ربانی خاں (۳۸) یا تو لمبی گھمبیر ناقابلِ فہم شعری تنقید یں لکھتا ہے یا مستقبل کے لئے شاعری کرنے کے کام میں مصروف رہتا ہے۔ پچھلے تین چار سال میں اس نے اس ضمن میں کافی وقیع کام کیا ہے مگر چونکہ عام لوگوں اور بیشتر ہمعصروں کے لئے یہ کام زیادہ ہی وقیع ہے۔ اس لئے اسے اپنی محنت اور تحقیق کی پوری داد نہیں ملی جب سے اسے دائرہ احبابِ شوق (جو ادبی ہم پیشہ لوگوں کی ایک ہفتہ وار میٹنگز منعقد کرنے والی سوسائٹی ہے) میں پچاس صفحات کے ایک طویل مقالے "جاپانی شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات" کے پڑھنے کے دوران میں ٹوک دیا گیا اور ممبروں نے جو عموماً نقیل سے ثقیل مضمون کو بھی صبر اور دلی حوصلے کے ساتھ برداشت کر لیتے ہیں، اسے سننے سے انکار کر دیا تو ربانی خاں نے اس بات کا برا مانا۔ اس نے مقالے کو پھاڑا تو نہیں مگر اپنے سامعین کو تنبیہہ کی کہ وہ اس دائرہ احبابِ شوق میں کبھی مقالہ نہیں پڑھے گا۔ اس نے اپنے چند شاگردوں کو جمع کیا ایک ادبی سوسائٹی حلقۂ اربابِ فکر کی طرح ڈالی اور باقی ماندہ مقالے کو اپنے آسودہ اور مطمئن لہجے میں اس سوسائٹی کے پہلے اور آخری اجلاس میں پڑھا۔ اجلاس کی صدارت خوش طبع اور رحیم شحیم ڈاکٹر اللہ دین (میرتقی کے مخفیہ خطا نے کی) اور اگر ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں یہ مقالہ نہیں آیا تو انھوں نے اس کے بارے میں خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ صدر کے علاوہ اس اجلاس میں شاعر اور کشیدہ کار نعیم زرتاج (۲۸) لمبا، متبسم، رنگے بالوں والا دلست جانِ جہاں، ریشم کا جیمبر(؟) اور پروفیسر شاعر نقاد ربانی خاں کے آدھ درجن شاگرد تھے۔ کہا نعیم زرتاج نے اجلاس کے بعد "ہم مستقبل کی شاعری اور تنقید کی تخلیق کر رہے ہیں اور اگر لوگ اس کو سمجھ نہیں سکتے تو نہ سمجھیں۔ ہم ان کے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔"

اپنے نئے ٹوتھ پیسٹ (ڈاکٹر باقی ٹوتھ پیسٹ دو روپے چالیس پیسے فی ٹیوب) کو لنڈی کوتل سے کیا ماڑی تک مشہور و مقبول بنانے کی مہم ختم کرنے کے بعد وہ دونوں پر مغز ذہین سیٹھ عبدالباقی (۵۲ فادر پرویرائٹر باقی بہادر سرکس، باقی کاٹن بازار وغیرہ بی۔ اے، علیگ) اور اس کا بھتیجا لمبا، خوش پوشاک ٹیڈی نما بختیار خلجی (۳۰) کراچی میں واپس آ گئے ہیں۔ وہ اپنی مہم کے نتائج سے بڑے مطمئن ہیں اور اب ستانے اور آرڈرز کے انتظار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کہا عبدالباقی نے "ہم اب ایک ہفتہ ہر ایک پکچر دیکھیں گے سفر کی تکان دور کرنے کے لئے۔" بختیار خلجی بڑبڑایا کہ اس کا اولڈ بوائے ابھی تک ٹس سے مس نہیں ہوا اور اپنے ہونہار بیٹے کی مالی مدد کرنے سے ہچکچا رہا ہے سب ڈاکٹر باقی ٹوتھ پیسٹ ٹیوب جو ہم ساتھ لے گئے تھے، نمونوں کے طور پر تقسیم ہو چکی ہیں اور اب ہمارے پاس صرف دو تین ٹیوبیں بچ گئی ہیں، جو ہمارے اپنے استعمال کے لئے ہیں۔ مزید سرمایہ کے بغیر مینوفیکچرنگ نہیں ہو سکتی۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم ان حالات میں کیسے ہر روز ایک پکچر دیکھ سکتے ہیں۔

اس کے باوجود گول مٹول آپ ٹو ڈیٹ جانسن اور اس کو بڑبڑاتا ہوا "بائی دی وے" ابھی تک خوشگوار تعلقات رکھتے ہیں اور واپسی کی پہلی شام ہاتھ میں ہاتھ ڈالے "فرام رشیا ود لو" کی اشتہاری تصویروں کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھے گئے۔ وہ اندر فلم دیکھنے گئے یا نہیں اس کی کوئی باوثوق اطلاع نہیں مل سکی۔

چیرنگ کراس پر نئی فولاد اور کنکریٹ کی الفلاح بلڈنگ کی تیسری منزل پر استحکام پاکستان کی کونسل کے گلابی رنگ اور کتابوں سے سجے ہال میں بہت سے منتخب طبقوں کے لوگ پاکستان پر ہندوستانی حملے سے پیدا شدہ حالات اور عوام کے فرائض پر بحث کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ ان میں احمد ندیم

قاسمی (۴۹) جیسے شاعر و افسانہ نگار، اعجاز حسین بٹالوی جیسے بلاک مین اور وکیل، پروفیسر سید عابد علی عابد (۶۰) اور حضرت کلیم احمد کلام (۵۰) جیسے ادیب اور ماہر تعلیم تھے۔ مدعوئین میں محمد خالد اختر (بیس سو گیارہ) اور سید محمد کاظم (ایڈیٹر برطرف) بھی تھے جنھیں سکریٹری کونسل نسیم انور (معذرت کے بغیر) نے بحیثیت اپنے دوستوں کے دعوت دی تھی۔ ایک پر جوش بلند پیشانی والے کلیم احمد کلام (تنقید و مدح تنقید) نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہی ہیں اور صاحبو! قوم کا کردار بدل گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ رات کو سوئے تو رشوت خوار، کام چور، سمگلر اور منافع اندوز تھے، صبح کو اٹھے تو ہم سب قربانی اور نیکی کے پتلے تھے۔ یہ تبدیلی، یہ انقلاب عظیم، جس کی دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی یکایک کیسے رونما ہو گیا؟ کلیم احمد کلام نے پوچھا۔ سامعین میں سے کسی نے جواب نہ دیا کیونکہ خواتین میں سے بیشتر جمائیاں لے رہی تھیں اور مرد سائز کے رنگین تصویروں والے رسالے اٹھا کر ان کے ورق الٹ رہے تھے۔ ذوالفقار غزنی معلوم ہے نے اپنی گونجیلی آواز میں اپنی وہ جنگجویانہ نظم پڑھی جو سامعین ان سے بیشتر اس سے آدھ درجن دفعہ ریڈیو سے سن چکے تھے لیکن مجبور ہونے کی وجہ سے ان کے لئے اس کا سننا لازم تھا۔ کہا قتیل شفائی (۸۰ مطربہ) نے یہ دعا پرشور ہے۔ شاعری یہ نہیں ہے" مگر بعد میں آغا بشیر ریڈ پارٹی (توبہ توبہ یا رب میری توبہ) نے ملکہ شاہ کی کافیاں لوگوں کو سنائیں۔ کہا جیتے ہوئے ظہور نظر (۴۰) نے کہ یہ شاعری ہے۔ ملکہ شاہ گریٹ تھا، جنگ زمانہ امن ملکہ شاہ جاودانی ہے۔

ایوب صابر

چند آٹوگراف

(غالب کی زمینوں میں)

ایک روتے ہوئے بچے کو

کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے رونے کا سبب دھل گیا کیوں پیرہن تجھ بیکسِ تصویر کا
اپنی اماں سے ذرا یہ پوچھ کر مجھ کو بتا نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

ایک لاوارث لاش کو

خوش ہو کہ اب خدا سے ہے تیرا معاملہ دنیا میں تجھ کو فکرِ زیاں تھا نہ سود تھا
پہنا دیا کمیٹی نے لٹھے کا اک کفن تو ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

ایک بیوہ کو

اب مر گیا ہے وہ تو اُسے گالیاں نہ دے شوہر تو تھا، مگر وہ ہزاروں میں فرد تھا
بچوں کا ایک لشکرِ جرار دے گیا حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ایک نیم حکیم کو

وقت سے پہلے سوئے قبرستاں گولیاں کھا کے میں روانہ ہوا
تجھ کو پہچان تو گئے ہیں لوگ میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

اپنی بیوی کو

گونگا ہوں نہ بہرہ ہوں مگر دیر سے چپ ہوں ڈرتا ہوں، نہ کھل جائے کہیں تیری زباں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے کمبخت! مگر تیرا ہے اندازِ بیاں اور

ایک گرے ہوئے مکان کے مالک کو

گر گیا ہے مکان جب تیرا رونے دھونے سے فائدہ کیا ہے
کم سے کم یہ تو ہو گیا معلوم ہائے کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

چودھری محمد صادق

عجیب زمانہ آ لگا ہے

مجھے کچھ یوں لگتا ہے کہ معمار پہلے کی نسبت اب مکان کی سیڑھیاں زیادہ عمودی بنانے لگے ہیں۔ زینے بھی اب کچھ اونچے بنائے جاتے ہیں اور ایسے زینے اب قریباً ہر مکان میں پائے جاتے ہیں، یا شاید چند ایک مکانوں میں ملتے ہوں۔ بہر حال ان میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ کیونکہ میرے لئے اب اکٹھے دو زینے پھلانگنا کچھ کٹھن سا ہو گیا ہے۔ اب تو مشکل سے ایک وقت میں ایک ہی زینہ چڑھ سکتا ہوں۔

ایک اور بات میرے مشاہدہ میں یہ آئی ہے کہ کاتب حضرات اب بہت مہین کتابت کرنے لگے ہیں مطبع والوں کے فن میں بھی اب وہ صفائی نہیں رہی چنانچہ جب کبھی اخبار کو ہاتھ میں لیتا ہوں، تو مجھے اسے دور پھیلا کر رکھنا پڑتا ہے (دور کا نظارہ بھلا ہوتا ہے نا!) اور دوسرے ہمسے پڑھنے کے لئے خاصی دیدہ ریزی کرنا پڑتی ہے۔

اگلے روز جب میں ایک جگہ ٹیلیفون کرنے کے لئے ٹیلیفون بوتھ میں گیا تو اس کی اندرونی فضا خاصی میلی نظر آئی۔ اور پھر اس میلی فضا میں کوشش کے باوجود میں ڈائل کے ہندسے نہ پڑھ سکا۔ اب تو ہندسوں کے نقوش میں بھی بڑی مدھم سی روشنائی استعمال ہونے لگی ہے۔

کل جب میں نے اپنے ایک نوجوان اور ہم عمر دوست سے ان خرابیوں کا تذکرہ کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ تمہیں بلا از جلد نظر کا چشمہ لگوا لینا چاہیے لاحول ولا قوۃ، میری عمر کے شخص کو چشمے کا مشورہ دینا کس قدر حماقت ہے۔ چنانچہ میں نے اس مشورہ پر کان دھرنا عبث سمجھا اور اس کی بجائے اخبار بینی کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ بجائے خود مطالعے کی کوشش کرنے کی بجائے کسی اور شخص سے یہ درخواست کروں کہ وہ مجھے اخبار اسے پڑھ کر سنا دیا کرے لیکن اس میں بھی ایک نئی دقت پیش آ گئی ہے۔ یہ لوگ کمبخت اتنی نیچی آواز میں گفتگو کرنے لگے ہیں کہ میں اسے صحیح طور پر سننے سے قاصر رہ جاتا ہوں۔

ہر چیز کے پرانے فاصلے میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور چیزیں اب دور ہی دور ہوتی جاتی ہیں مثلاً میرے گھر سے اسٹیشن تک کا فاصلہ اب پہلے کی نسبت دوگنا ہو گیا ہے اور ستم یہ ہے کہ بعض نابکاروں نے راستے میں ایک اچھی خاصی بلند پہاڑی بھی کھڑی کر دی ہے جو پہلے وہاں کبھی نظر نہ آتی تھی، گاڑیاں بھی اب جلد چھوٹ جاتی ہیں اور میں نے ان کے تعاقب کی کوشش کو ترک کر دیا ہے کیونکہ ان دنوں جب بھی میں نے چلتی گاڑی پر سوار ہونا چاہا، اس کی رفتار میں ایک دم تیزی آ گئی۔

کپڑوں کی ملوں والے بھی بد دیانت ہو گئے ہیں۔ اب وہ لباس کے اندر پہلے سا مال نہیں لگتے۔ میرے تمام سوٹ بہت جلد سکڑ جاتے ہیں خصوصاً کمر کے مقامات پر کپڑا جلد تنگ ہو جاتا ہے۔ بوٹوں کے تسمے بھی کچھ ایسے واہیات بننے لگے ہیں کہ آدمی ان تک مشکل ہی پہنچ پاتا ہے اور اکثر دوہرا ہو جاتا ہے۔

موسم تک میں عجیب انقلاب آ گیا ہے سردیاں اب پہلے کی نسبت زیادہ سرد ہو گئی ہیں اور گرمیاں پہلے کی نسبت زیادہ گرم۔ یہی نہیں دور جا چوں ٹیلیفون کمبخت دبی فاصلوں کا اضافہ آڑے آیا کمبخت برف بھی اب کچھ بوجھل ہو گئی ہے جب گرتی ہے تو ہٹائے نہیں ہٹتی۔ ہواؤں کے فراٹے اتنے تیز ہو گئے ہیں کہ ان کے اثر سے کمرے کے دروازے بھی جسم کانپ اٹھتا ہے۔ شاید وہ بچوں اور لڑکیوں کے زاویے صحیح نہیں رہے۔

لوگ مجھے اپنے زمانے کی نسبت کم عمر نظر آتے تھے۔ ماں یہی تھی کہ مجھے اپنے پرانے کالج کے سالانہ جلسے میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں سے میں نے ۱۹۳۵ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا تھا اور میں وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تمام طلبہ کے نام سے کس طرح یار لوگوں نے ہجوم طفلاں جمع کر رکھا ہے۔ اپنے چہرے بشرے کے لحاظ سے جو طلبا مجھے اپنے زمانے کی نسبت بہت کم نظر آتے تھے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ بی۔اے کے ایک طالب علم نے مجھے بابا جان کہہ کر خطاب کیا اور ایک نے اختتام جلسہ پر از راہ حماقت مجھے سہارا دے کر سڑک تک چھوڑ آنے کی پیش کش بھی کر دی۔

دوسری طرف جو لوگ میرے ہم عمر ہیں وہ مجھے اپنی نسبت زیادہ معمر نظر آتے ہیں۔ میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ میری نسل کے لوگ اب متوسط عمر (یعنی سرسری اندازے کے مطابق ۴۲ اور ۱۰۰ سال کی درمیانی مدت) کے دور میں داخل ہو رہے ہیں لیکن میں بہرحال اپنے ہم جماعتوں اور ہم سنوں کو قبل از وقت بڑھاپے کی منزل پر پڑا کراہتے دیکھ کر ان کی صحت کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرنے سے قاصر ہوں۔ چنانچہ کالج کے اسی جلسے میں جب ٹک شاپ پر میری مڈبھیڑ اتفاقاً اپنے ایک پرانے ہم جماعت سے ہوئی تو میں یہ دیکھ کر بے حد حیران ہوا کہ اس کے اندر بھی تعجب انگیز تبدیلی آ چکی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دیر تک پہچاننے سے بھی معذور رہے۔

"نصیر بھیا، تم نے تو خوب وزن بڑھا لیا ہے اپنا!" میں نے بات کی۔

"ارے! یہ سب آج کل کی غذاؤں کا کرشمہ ہے" نصیر نے جواب دیا "میرے خیال میں ہماری خوراک اب بہت چربی دار ہو گئی ہے۔"

"بھلا ہم کتنی دیر کے بعد ملے ہیں نصیر؟" میں نے پوچھا "میرے خیال میں کچھ زیادہ ہی مدت ہو گئی ہے۔"

"نہیں تو" نصیر بولا "ابھی کالج کے پچھلے انتخابات میں تو ہم اکٹھے کام کیا کرتے تھے۔"

"بھلا وہ کون سے سال کے انتخابات تھے؟" میں نے مزید پوچھا

نصیر نے یکمشت کچھ سوچا پھر بولا "۱۹۳۵ء کے انتخابات تھے شاید۔ زمانے کو بھی تو پر لگ گئے ہیں۔"

میں نے ٹک شاپ کے منیجر سے رس گلوں کی فرمائش کی اور جب ان کی پلیٹ ہمارے سامنے آئی تو نصیر نے ایک رس گلا اٹھا کر منہ میں ڈالا اور بولا "کچھ عجیب بے مزہ رس گلے ہیں، یاد ہے ہمارے وقت کی مٹھائیاں کیسی بے نظیر ہوا کرتی تھیں!"

"خوب یاد ہے اب نہ تو وہ مٹھائیاں نظر آتی ہیں نہ ان کے بنانے والے۔ حد یہ ہے کہ آج کل کا دودھ سفید تیل کی مانند ہے اور بالائی جیسے ربڑ ہو" میں نے کہا

"اور ذرا ان لونڈوں کی حالت ملاحظہ ہو کہ انہی چیزوں کو جنت کے میوے سمجھ کر لپک جھپک کھاتے ہیں۔ میرے خیال میں ہماری خوراک اب بہت چربی دار ہو گئی ہے۔"

"یہی بات تم ایک منٹ پہلے بھی کہہ چکے ہو"

"ارے کیا واقعی؟" نصیر نے بیتابانہ پوچھا۔

"ہاں تو کیا رس گلے اور منگواؤں؟ لیکن ہماری غذائیں واقعی ناقص ہو گئی ہیں، دودھ جیسے سفید تیل اور بالائی جیسے ربڑ ہو!"

"اخاہ!" نصیر نے تعجب سے کہا "تم نے یہ بات ابھی ایک ہی منٹ پہلے بھی کہی تھی"

"ادھر ابھی جانے دو" میں نے جھلا کر کہا اور پھر وہاں سے یک دم چل دیا۔

آج صبح جب میں شیو کر رہا تھا تو مجھے بار بار بے چارے نصیر کا خیال آیا۔ اس دوران میں اتفاقاً میری نگاہیں ایک لحظہ کے لیے آئینے میں اپنے عکس پر جم گئیں۔ اور مجھ پر یہ نیا انکشاف ہوا کہ کمبخت آئینہ ساز بھی اب آئینوں میں وہ پہلی سی شیشہ گری استعمال نہیں کرتے۔ عجیب زمانہ آ لگا ہے۔ (ماخوذ)

مسٹر دہلوی

بچّوں کا ایک کھیل ۔ شاعری

کراچی میں ساڑھے گیارہ ہزار شاعر ہیں ۔ یعنی ہر پانچ سو افراد میں سے دو شاعر ہیں ۔ دوسرے شہروں میں بھی اوسط تقریباً یہی ہے ۔ یہ لوگ (باستثنائے معدودے چند) کیا ہیں اور کیا تخلیق کر رہے ہیں اس کا ایک خاکہ ذیل کے اشعار میں پیش کیا گیا ہے :

علم آیا ہو نہ حصّے میں ترے اور نہ دھن
تجھ کو آتا نہ ہو دنیا کا اگر کوئی بھی فن
ملتفت تیری طرف ہوتی نظر آئے نہ زن
تجھ کو گمنامی کا دنیا نے اڑھایا ہو کفن
مشورہ مان مرا بن کیے از اہلِ سخن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچوں کے لیے

شاعری اور جہالت ہوئے لازم ملزوم
شعر میں اب ہو اثر، ہے یہ امیدِ موہوم
جانِ محفل ہے بس اب اک ترنم حلقوم
جب یہ عالم ہے تو پھر تو ہی رہے کیوں محروم
تو بھی گاتا ہوا اسٹیج پہ آ، تن تنہ تن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچوں کے لیے

اک قیامت ہے عروض اور ہے تقطیع وبال
گنگنا کر ہی تو الفاظ کو اشعار میں ڈھال
گرتے پڑتے ہوئے ارکان ترنم سے سنبھال
بحر لہجے سے بدلنے کی یہ مصرع ہے مثال
"تو اگر مے رہ نہیں بن تنہ بن اپ نہ تو بن"
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچوں کے لیے

کہنہ شاعر جو ہیں، دیوان تو سب ان کے کھنگال
لے زباں ان کی، بیان اُن کا، اُچک ان کا خیال
شرم کیا اس میں کہ سب کا ہے یہاں ایک ہی حال
کون دیکھے کہ ہے کس کس کا ترے منہ میں اُگال
محفلِ شعر میں آتے ہی نہیں اہلِ سخن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچوں کے لیے

آنکھ محبوب کی ساغر ہے، نظر ہے جادو
روزِ روشن ہے جو رخ، ظلمتِ شب ہے گیسو
گل ہیں عارض تو جبیں چاند ہے، خنجر ابرو
وہ سراپا ہے کہ جو دیکھے، پکار اٹھے : یا ہو
فارمولے یہ ہوں از بر تو ہے تو ماہرِ فن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچوں کے لیے

گفتگو میں بھی جو املا کی ہو تجھ سے غلطی
مبلغِ علم سبھی کا ہے کم و بیش یہی
تیرے اشعار میں معنی جو نہیں ہیں نہ سہی
بھاؤ بتلا کے پڑھ ان کو تو ہوں مقبول وہی
بھانڈ بننے سے نہ شرما کہ ہے اب عام یہ فن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچوں کے لیے

رائج الوقت یہاں ہیں جو مکاتیبِ خیال
اُن سے وابستہ جو ہیں بس ہیں وہی اہلِ کمال
اُن میں جا بیٹھ نبیٔے باہمی توصیف کا جال
خوب اُچھالیں گے تجھے تو جو ذرا اُن کو اچھال
اپنے کنکر کو یہاں کہتے ہیں سب لعلِ یمن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچّوں کے لیے

جس طرح آرٹ کی اک قسم ہے اب تجریدی
جس میں فن کار پہ ہوتی نہیں کچھ پابندی
ویسے ہی شعر کے ہاتھ آگئی بے راہ روی
قیدِ معنی سے چھٹا، نظم سے بھی جان بچی
فن کی تحصیل کا قائل نہیں اب صاحبِ فن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچّوں کے لیے

اینٹ ہاتھ آئی کہیں سے تو کہیں سے روڑا
کنبۂ شعر ہے یوں بھان متی نے جوڑا
دشمنی عقل سے لی، علم سے منہ کو موڑا
کشتِ اشعار کو تک بندی کے ہل سے گوڑا
بوئے معنی سے ہے محروم یہ شعروں کا چمن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچّوں کے لیے

پہلے کچھ روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گُل بھینس کے انڈے سے نکال[1]
معنی و لفظ کا پُر گُل بھینس کے انڈے سے نکال
شعر و مفہوم کا قُل بھینس کے انڈے سے نکال
مہمل اشعار گھڑے جاتے ہیں در چشم زدن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچّوں کے لیے

اس سہولت پہ بھی تو شعر اگر کہہ نہ سکے
اتنے دھاروں میں سے تو ایک میں بھی بہہ نہ سکے
اپنے حالات پہ قانع بھی اگر رہ نہ سکے
کس مپرسی کے مظالم بھی اگر سہہ نہ سکے
مانگ کر کام چلا، سیکھ توارد کا ہی فن
شاعری آج تو اک کھیل ہے بچّوں کے لیے

شاعروں میں جو حقیقی ہیں، تو بہتانی بھی
ان میں صحرائی بھی ملتے ہیں، گلستانی بھی
ان میں شکمی بھی ہیں، فکری بھی ہیں، رومانی بھی
یعنی شیطانی بھی، رحمانی بھی، ہذیانی بھی
ہے جو کم یاب تو مسٹر ہی کا اک رنگِ سخن
ورنہ اب شاعری اک کھیل ہے بچوں کے لیے

[1] تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) کا ایک ایک رکن ترنم سے دبایا تو بحر ہو گئی فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

[2] ملا عبدالقادر رامپوری

افضل پرویز

پکّے گانے کا کچّا پن

آپ نے وہ مشہور حکایت تو سُنی ہوگی کہ کوئی دیہاتی دوسرے "گرائیوں" کے کہنے پر پہلی بار بڑے چاؤ سے میلہ دیکھنے گیا۔ دن بھر میلے کے خوب مزے لوٹتا رہا مگر اسی دوران جب اُس نے کہیں جوتا اُتار کر رکھا تو کوئی اُچکا اُسے اُٹھا لے گیا۔ دیہاتی بے حد پریشان ہوا کیونکہ یہ جوتا اس نے اپنی جمع پونجی سے بنوایا تھا۔ اس کی انتہائی پریشانی نے اُس کو تمام لطف کرکرا کر دیا اور جب وہ ننگے پاؤں لوٹا اور گرائیوں نے میلے کی ریل پیل، رونقوں اور لطف اندوزی کے بارے میں اس سے دریافت کیا تو اس نے جل کر یا سادگی سے جواب دیا "کہاں کا میلہ اور کہاں کی رونق وہ تو میرا جوتا چرانے کے لئے یار لوگوں نے ڈھونگ رچایا تھا"۔

یہ حکایت تو ایک دیہاتی کی سادہ لوحی کی مثال ہے لیکن اسی کو ایک خاں صاحب نے اچھی خاصی جگت بنا دیا جب حالیہ پاک بھارت جنگ میں اپنی مسلح افواج کے بے مثال کارناموں اور جیداری اور قوم کی شاندار قربانیوں اور اتحاد کی باتیں ایک محفل میں ہو رہی تھیں تو ان خاں صاحب نے کہا "جی ہم تو سمجھتے ہیں یہ سارا کھیل پکے گانوں کو ختم کرنے کے لئے کھیلا گیا"۔ خاں صاحب کی جگت محض جگت برائے جگت ہی سہی لیکن یہ ان کے قدر دان اور کلاسیکی موسیقی کی بے قدری پر ایک تبصرہ بھی ہے۔

خاں صاحب کو یہ شکایت ہے کہ جنگ کے دوران ان سے خیال اور ٹھمریاں نہیں گوائی گئیں اور اب بھی پکے گانے کا دور دورہ نہیں چلا۔ سب کچھ دن کو جی اب نغمہ، گیت، اور وقت اور موسم کے تاثر کا نام دیا جاتا ہے اور بڑے بڑے خاندانی گویوں سے نغمے اور گیت ہی گوائے گئے اور گوائے جاتے ہیں مگر بات نہیں بنی کیونکہ جس طرح ہلکا پھلکا گانا گانے والے موسیقار کے لئے خیال گانا نہایت مشکل ہے، اسی طرح خیال اور پکا گانا گانے والے کے لئے ہلکا پھلکا گیت یا نغمہ گانا بہت محال ہے۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اب کھل کر سامنے آیا ہے جس کی تمام تر ذمہ داری نہ تو "قدر دانوں" پر ڈالی جا سکتی ہے اور نہ ہی موسیقاروں کو ہی سراسر موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ بہرحال دونوں فریق یہ الزام ایک دوسرے کے سر ہی تھوپتے ہیں۔

ہنگامی حالات کے دوران جہاں قوم نے اپنے آپ کو پہچانا اور اپنے تحفظ، یک جہتی، اور ایثار کے جذبوں کو ابھارا وہاں ہمارے نثر نگاروں اور شاعروں نے قوم اور مسلح افواج کو بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ جنگ کے اگلے مورچوں میں قوال اور ملی کے مجاہدوں ایسے بہتر دریافت ہوئے، اور جنگ کے پچھلے مورچوں میں بھی نئے فن کار اور شاعر بھی سامنے آئے اور پرانے فن کاروں کی کچھ چھپی خصوصیات بھی اُجاگر ہوئیں۔ شاعری کی طرح موسیقی میں بھی قومی جذبے رچ بس کر اب ہوئے۔ انہی دنوں یہ مسئلہ کھل کر ظاہر ہوا کہ ہمارے قومی جذبات کی ترجمانی کے لئے کیسی موسیقی درکار ہے۔

قدرتی طور پر اس وقت ایسی ہی شاعری اور موسیقی کی ضرورت محسوس کی گئی جو عوام اور مسلح افواج کے ذوق اور معیار کے مطابق ہو کیونکہ

فن کاروں اور شاعروں کو عوام اور مسلح افواج سے براہ راست مخاطب ہونا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں احساس ہوا کہ ایک تو عوام کے لئے ادب اور موسیقی تخلیق کرنا نہایت ضروری ہے۔ دوسرے ادب و فن کو عوام کی سطح تک اتارنے کے ساتھ ساتھ عوام کے ذوق کو بلند کرنے کا فرض بھی فن کاروں اور معاشرے پر عائد ہوتا ہے۔

جہاں تک فن کاروں کا عوامی سطح تک اُترنے کا تعلق ہے، یہ امر واضح ہے کہ ادیبوں شاعروں اور موسیقاروں نے ہنگامی حالات میں یہ فرض بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ عامیانہ سطح تک بھی بعض اوقات پہنچے ہیں۔ جہاں جنگ نے پوری قوم کو کچھ نہ کچھ دیا ہے وہاں فن کاروں اور عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بھی بڑا کام کیا ہے۔ مبہم اور مہمل گو شاعروں تک نے سیدھے سادے اور دو ٹوک لہجے میں نغمے لکھے۔ موسیقاروں نے ہلکے پھلکے رزمیہ زمزمے گائے۔ ادیبوں اور شاعروں نے عام فہم زبان استعمال کی، موسیقاروں نے عام فہم تانوں، مرکیوں اور بہلاووں سے کام لیا اور اس طرح فن کاروں اور عوام کے درمیان بڑا پیارا سا سمجھوتہ ہو گیا۔

جملۂ معترضہ کے طور پر ایک لطیفہ سن لیجئے۔ ریڈیو کے ایک اہل زبان افسر نے جو گانوں اور ترانوں کے ریکارڈ تیار کرنے والے ادارے کے نگران ہیں، جنگ کے دنوں میں اُردو کے ایک پنجابی ادیب سے (جنھوں نے ہنگامی دور میں ہی پنجابی میں لکھنے کی ضرورت محسوس کی) کہا: "حضور! بڑی حیرت کی بات ہے کہ اردو کے مقابلے میں پنجابی نغمے اور ان کی دھنیں بے حد مقبول ہو رہی ہیں۔" اس پر اُردو کے پنجابی ادیب نے جواب دیا: "جنگ جاری رہندی تے ہور گل رہندی تے قومی زبان وی پنجابی ہو جانی سی۔"

لطیفے سے ہٹ کر یہ بات ہے بڑے پتے کی۔ پاکستان کے دس کروڑ عوام میں سے تین کروڑ کی مادری زبان پنجابی ہے اور وہ قومی زبان اردو سے محبت کرنے اور اس کے لئے قربانیاں دینے کے باوجود اپنی مادری زبان سے جو انھیں ماں کے دودھ کے ساتھ ملی ہے بے حد پیار کرتے ہیں۔ اس میں صحیح معنوں میں متاثر بھی ہوتے ہیں اور ان کی اپنی عوامی دھنیں ہی ان کے لئے "من کھچویں" اپیل رکھتی ہیں۔ انہی دھنوں نے ان کے جذبات کو ابھارا، اُن کو روشنی دی اور اُن کے حوصلے بڑھائے۔ اسی طرح پنجابی اور دوسری علاقائی دھنوں نے بھی نہ صرف متعلقہ لوگوں کو بلکہ سارے عوام کو متاثر کیا اس لئے کہ عوام تو ایک ہی ہوتے ہیں اور ان کا سرمایۂ ثقافت آفاقی اور مشترک ہوتا ہے۔

عوام کے لئے گانے کا جو احساس شعوری اور لاشعوری طور پر ہمارے موسیقاروں اور نغمہ سازوں (کمپوزروں) میں ہنگامی حالات کے دوران بیدار ہوا ہے وہ اس سے پہلے اتنا اُجاگر نہ تھا۔ نزاکت علی خاں سلامت علی خاں، امانت علی خاں فتح علی خاں، اور ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم نے بھی ہلکے پھلکے نغمے گائے اور خیال کے انداز میں بھی جو چیزیں پیش کیں ان کو بھی نرم کر کے گایا کیونکہ ان کے سامنے یہ مقصد تھا کہ عوام کو متاثر کیا جائے۔

لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جنگ ختم ہو گئی ہے اور حالات معمول پہ آ رہے ہیں تو کیا ہم اس فصل کے حاصل سے ہاتھ اٹھا لیں یا اُن میں سے کچھ ایسے خوشے چن رکھیں جو ہماری موسیقی کی نئی اور زیادہ صحت مند فصل کی کاشت کے لئے "ترقی دادہ بیج" ثابت ہوں؟ میرے پاس اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس فصل کے حاصل سے منتخب خوشوں کو آئندہ تخم ریزی کے کام میں لانا چاہئے۔ عوامی دھنیں گانوں کے بولوں کی سادہ اور عام فہم زبان اور کلاسیکی موسیقی میں نرمی اس فصل کے منتخب خوشے ہیں۔ ان کے مقابلے میں گانے کا دقیانوسی انداز، مشکل زبان اور سکہ بند کلاسیکی موسیقی بیمار بیج ہیں جن سے صحت مند کونپل کے پھوٹنے کی کوئی امید نہیں۔

ان کے علاوہ ایک بہت ہی اہم اور قابل توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ کلاسیکی موسیقی کو ترک یا نظرانداز کرنے کا رجحان نہایت خطرناک ہے۔ اس موسیقی کو ترک کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے پاس آئندہ فصل کی تخم ریزی کے لئے زمین ہی نہ ہو گی۔ ہنگامی دور میں کلاسیکی موسیقی سے

بے توجہی کسی حد تک جائز تھی لیکن اس بے توجہی کو اس فصل کے منتخب حاصل میں شمار کرنا زیادتی ہے۔ اسے ترک کرنے کے لئے جو دلائل دئے جاتے ہیں ان میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عوام اسے سمجھتے نہیں۔ دوسرے دلائل یہ ہیں کہ خیالوں کے بول عام فہم نہیں ہوتے۔ گانے میں بے حد تانیں ٹھونسی جاتی ہیں۔ جن کی کوئی تک نہیں ہوتی اور ان میں کوئی مقصدیت نہیں ہوتی۔

یہ سب اعتراضات بجا ہیں۔ اس کے باوجود کلاسیکی موسیقی کو ترک کر دینا موسیقی کی جڑیں کھود ڈالنے کے مترادف ہے۔ لہذا جڑیں کھودنے کی بجائے اس کی نشو و نما کو بند ہونے سے بچانے کے لئے شاخ تراشی بہتر ہے۔ اور شاخ تراشی بہر صورت ضروری بھی ہے۔ آیئے ان شاخوں کو چھانٹ لیں جو بیمار ہیں اور جن کو چھانٹنے کے بغیر یہ فصل بے ثمر رہ جاتی ہے۔

پہلی شاخ تو یہ ہے کہ خیال عوام کی سمجھ سے بہت اونچے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک موٹی سی مثال عرض ہے۔ سب بچے جب ماں کا دودھ چھوڑنے کے بعد کچھ اور کھانا پینا سیکھتے ہیں تو وہ پہلے پہل تیز میٹھی چیز یا ترکاری کے طور پر ہلکی مرچوں والے آلو مٹر وغیرہ ہی پسند کرتے ہیں عمر کے ساتھ ساتھ جوں جوں ان کا ذوق ذائقہ بدلتا اور بلند ہوتا جاتا ہے وہ جوان ہونے تک نمکین اور مصالحے دار چیزوں اور حتیٰ کہ کریلوں جیسی کڑوی چیزوں کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ ان کا ذوق ذائقہ بلند کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح فنون لطیفہ کے ضمن میں بھی عوام کے بچہ ذوق کو بلند کرنے کی ضرورت ہے ورنہ وہ کلاسیکی موسیقی کو کڑوا گھونٹ سمجھتے رہیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ذوق کیونکر بلند ہو؟ بڑا مشکل سوال ہے کیونکہ یہ سوال حل کرنے کی ذمہ داری معاشرے پر، عوام پر، متعلقہ اداروں پر اور موسیقاروں پر تقسیم ہوتی ہے۔ اس ذمہ داری کا پہلا حصہ یہ ہے کہ موسیقی میں عوام کا ذوق بلند کرنے کے لئے ان کی تعلیم و تہذیب کا انتظام ہو ادا انھیں موسیقی کی کم از کم سدھ بدھ حاصل کرنے کی توفیق اور مواقع مہیا کئے جائیں۔ انھیں اعلیٰ موسیقی کی ابجد سے روشناس کرایا جائے اور ترقی یافتہ اعلیٰ موسیقی زیادہ سے زیادہ سنوائی جائے۔ کچھ اس موسیقی کو نیچے لایا جائے اور کچھ عوامی ذوق کو اوپر اٹھایا جائے۔

دوسری شاخ جو کاٹنے کے قابل ہے وہ ہیں خیالوں کے بول۔ ان سے بھی پیچھا چھڑانا زیادہ آسان نہیں کیونکہ انھیں ترک کرنے سے پہلے ان کی جگہ پر کرنے کا انتظام نہایت ... ہے۔ اب تک کلاسیکی موسیقی میں سینکڑوں سال پرانے بول رائج ہیں جو بیجو باورا، تان سین، سورداس، حاجی سوجان، ادارنگ سدارنگ اور تان رس خاں وغیرہ نے باندھے تھے مثلاً

بھیرویں، چارتال کا یہ دھرپد اب بھی گایا جاتا ہے:

استھائی:- توہی برہما توہی بشنو توہی گرو توہی چیلا رے

انترا:- توہی پون توہی پانی توہی رین۔ توہی دن
توہی بیلی توہی بیلا رے

ابھوگ:- توہی سونا توہی سناد توہی دیپک، توہی مندر توہی درپن توہی دکھارے
کہے بیجو باورا سب کا توہی پوشن توہی بھت توہی اکیلا رے

ایسے بولوں کے گانے والے بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتے اور ان کا محل تو کوئی ہے ہی لیکن مصیبت یہ ہے کہ پرانے اساتذہ اپنے لئے خود ہی مناسب بول گھڑ لیا کرتے تھے۔ یہاں یہ حال ہے کہ موسیقار تو موسیقار شعرا حضرات خیالوں کے لئے بول نہیں لکھ سکتے اور جو لکھ سکتے ہیں وہ لکھتے نہیں یا ان سے لکھوائے نہیں جاتے۔ ورنہ ہر زمانے میں نئے سے نئے بول لکھے جاتے رہے ہیں۔ ان میں زبان اور موضوع کی تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً

دھیما تیین تالہ میں شدھ ملہار کے پوربی زبان کے یہ بول ملاحظہ ہوں:

استھائی:- تم بن میکو کل نہ پرت ہے۔ مرلا کرائی شور، ہریالی جھم جھم برس
انترا:- (شعر میں) اے ابرِ نو بہار نہ دے دکھ برس برس
کیونکر کٹے گی رات پیا بن ترس ترس

تم بن میکو کل نہ پرت ہے۔۔۔۔۔

یہ ایک پرانا خیال ہے لیکن اس میں اردو کے ایک شعر کو انترے کے طور پر برتا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں موسیقاروں نے خیالوں کے بولوں اور انداز میں تبدیلیاں کی ہیں۔

دھیما تین تالہ میں راگنی مالسری کا ایک خیال سنیئے۔ یہ لہندی (پرانی پنجابی) زبان میں ہے:-

استھائی:- مینڈھی جند تہاڈے نال لگی۔ آویں وے آویں نہ رے میاں دیکھ نظر بھر
انترا:- ہوں بندی تُوں سانجا سائیاں۔ مینڈھا ادھارنگ توں سکھ بر کر۔ ساڈے نال پریت
مینڈھی جند۔۔۔۔۔۔

اب تین تالہ میں بسنت بہار راگنی کے یہ بول سنئے اور سر دھنیئے:

استھائی:- پھول رہی سرسوں سکل بن پھول رہی سرسوں
انترا:- آون آون کہہ گئے پیا موہے
بیت گئے برسوں۔ سکل بن پھول رہی سرسوں

ان بولوں کی زبان، انداز، وزن اور قافیہ بندی اپنے اندر سب کے لئے اپیل رکھتی ہے اور پھر اس کے معانی بھی راگنی کے نام، دُھن اور گانے کے موسم کے مطابق ہیں۔ یہ بھی پرانے بول ہیں لیکن سنئے لگتے ہیں۔ اس روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ کچھ نئے بول لکھے بھی گئے ہیں جن کا میں اپنے ایک سابقہ مضمون خیالوں کے بول میں ذکر کر چکا ہوں۔ بہرحال اس میدان میں ابھی بڑی گنجائش ہے۔ گر اس میدان میں وہی شاعر اُتر سکتے ہیں جو موسیقی کے فن سے تھوڑے بہت آشنا ہوں یا وہ موسیقار ہی طبع آزمائی کر سکتے ہیں جو شاعری بھی کر سکتے ہوں۔

تیسری قابل ترمیم شاخ خیالوں کی تانیں ہیں۔ تانوں کا معاملہ یہ ہے کہ سات سروں کے مختلف متبادل ترکیب اور بندش سے پانچ ہزار چالیس تانیں بنتی ہیں اور اگر پانچ اُترے سُر بھی شامل کرکے بارہ سروں کی تانیں شمار کی جائیں تو تین لاکھ دس ہزار نو سو تیس تانیں بن جاتی ہیں۔ ایک تان ایک سُر کی بھی ہوتی ہے دو بارہ سروں تک مختلف بندشوں سے بدلتی رہتی ہے۔ اس طرح ایک ہی راگ میں سروں سے کھیلنے والے گویّے اگر تین لاکھ دس ہزار نو تیس نہیں تو بیسیوں تانیں تو ضرور ہی لگاتے ہیں۔ ان تانوں کے مختلف انداز بھی ہیں۔ مثلاً گمک، بہلاوا، سپت، دھاکا پلٹا، سپاٹ، گٹکڑی، مینڈھ وغیرہ

بات دراصل یہ ہے کہ ایک اعلیٰ موسیقار بننے کے لئے موسیقی کی گرامر کے طور پر سُر گیان رکھنا، سرگم کی مشق کرنا اور تانوں کی گرام اور گردان جاننا ضروری ہوتا ہے لہٰذا ریاض مکمل کرنے کے لئے اعلیٰ موسیقار کو تانوں کے تمام اوگھٹ گھاٹوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سامعین کے سامنے آموختہ سنانے کی نہیں بلکہ راگ کے تاثر، بولوں کے معانی پیش کرنے اور سروں سے خیالوں کی تصویر کشی کی ضرورت ہے۔

اس تقابل بے دین شاخ کا سارا بوجھ موسیقاروں پر ہے۔ اس کو کاٹنے کی ساری ذمہ داری اُن پر ہے۔ انھیں ہر راگ کے لئے اُس کے وقت موسم اور سُروں کے تاثر کے لحاظ سے مناسب بولوں کے انتخاب کے ساتھ اس کے لئے موزوں اور ضروری تانوں کا چناؤ بھی کرنا چاہیئے باقی تانوں کو گرامر کی کتاب کی طرح تہ کر کے رکھ دینا چاہیئے۔ ہر راگ اور خیال کے لئے علیحدہ علیحدہ مناسب تانوں کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ساون کے راگوں، میگھ، ملہاروں اور ساونی کلیان وغیرہ کے لئے گمک اور دھا کا تانیں مناسب ہیں کہ ان میں بادل کی گھن گرج کا تاثر ہوتا ہے لیکن کسی حزنیہ راگ مثلاً پوریا، ماروا، سوہنی، بھیرون، بھیرویں وغیرہ کے لئے گمک اور دھا کا تانیں نہایت غیر موزوں اور ان کے تاثر کو ختم کرنے والی ہیں۔ ذٹاٹ اور بیاد کی راگنیوں مثلاً بیلو، بھیم پلاسی، کیدارا، تلک کاموہ، رام کلی، گن کلی، ٹوڈی، اساوری وغیرہ کے لئے ہلکی پھلکی نرم تانیں مثلاً پھلاوے، سُوت، مینڈھ موزوں ہیں۔ ان کی چال بھی بلمپت سے نہیں بڑھنی چاہیئے۔ دفار اور شکوہ کے راگوں مثلاً مالکوس، ہنڈول، درباری تنکرا، بہاگ وغیرہ میں گٹکری، سپاٹ اور نرم گمک کی تانیں مناسب ہیں، مگر راگ کے بولوں کے لحاظ سے تانوں، پلٹوں اور لے کی چال میں مناسب تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ ہنگامی دور میں کلاسیکی قسم کی موسیقی میں بھی بڑے موسیقاروں نے غیر ضروری تانوں سے محض اس لئے اجتناب کیا کہ انھیں احساس تھا کہ وہ عوام کے سامنے ہیں اور ان سے مخاطب ہیں اور ساتھ ہی انھیں اُن بولوں کا لحاظ بھی تھا جو وہ گاتے تھے، کیونکہ وہ خود بھی بولوں کے معانی سمجھتے تھے اور انھیں عوام تک پہنچانے کا شعور بھی رکھتے تھے۔ یہ احساس اور شعور نہ صرف زندہ رہنا چاہیئے بلکہ اس میں اضافہ ہونا چاہیئے۔

آخر میں ایک ضروری بات عرض کرتا ہوں۔ ہمارے ملک میں فی الحال موسیقی کی ترویج، ترسیل اور تعلیم کا سب سے بڑا ذریعہ ریڈیو اور فلم ہیں۔ فلم کے نغمہ سازوں نے بلاشبہ موسیقی میں اضافے کئے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی کو بڑی حد تک عام فہم اور نرم کر کے پیش کیا ہے۔ ان سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس میں اور تغیر اور ترقی کریں گے۔ بہر حال اس شعبے میں مزید محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ ریڈیو کے ارباب حل و عقد، ماتحت افسروں اور نغمہ سازوں نے جہاں ہلکی پھلکی موسیقی کو عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہاں ان سے کلاسیکی موسیقی کو نظر انداز کرنے اور اسے پنپنے کا موقع نہ دینے کی فرد گزاشت بھی سرزد ہوئی ہے۔ ریڈیو کا شعبہ "ٹرانسکریشن سروس" اگر ہلکی پھلکی موسیقی کی اچھی دھنیں تیار کرانے کے علاوہ خیالوں کے نئے بول لکھوانے اور ان کو نرم کر کے "بنانے" کا کام بھی اپنے ذمے لے لے تو یہ موسیقی، عوام اور موسیقاروں پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ خطرہ ہے کہ اعلیٰ موسیقی اور راگ ودیا کا سمندر سوکھ جائے گا اور اس کے نتیجے میں وہ تمام سوتے یعنی ہلکی پھلکی موسیقی، ٹھمریاں، دادرے، گیت، نغمے وغیرہ بھی خشک ہونا شروع ہو جائیں گے جو راگ ساگر سے ہی پھوٹتے ہیں۔

مظفر علی سیّد ——— محمّد خالد اختر ——— محمّد کاظم
آغا سہیل ——— جمیلہ شاہین ——— الیاس عشقی
——— خاطر غزنوی ———

تبصرے

مباحث: تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ

مصنف ڈاکٹر سید عبداللہ   ناشر: مجلس ترقی ادب۔ لاہور

"مباحث" ڈاکٹر سید عبداللہ کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا ایک جدید مجموعہ ہے۔ چھ ایک سو صفحوں کی اس کتاب میں کوئی تیس مضامین شامل ہیں جن کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ لسانی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے، دوسرے میں ادب و شعر کی ماہیت پر نظری بحثیں ہیں، تیسرا تنقید کے بارے میں ہے اور آخری حصے میں کچھ اصناف سخن موضوع گفتگو ہیں۔ نقاد اور محقق حضرات اپنے مطبوعہ مضامین کے جو مجموعے ترتیب دیتے ہیں، بالعموم اس کتاب سے بہت کم ضخامت اور تنوع کے حامل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر عبداللہ صاحب کا شمار اردو ادب کے معروف اور مصروف ترین اساتذہ اور علماء میں کیا جاتا ہے۔ وہ کوئی تیس چالیس برس سے تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھتے چلے آ رہے ہیں اور اگرچہ اس سے پہلے بھی ان کے مضامین اور خطبات کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ بھی اُن کے بہت سے متفرق مضامین رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے تھے اور ان کی شیرازہ بندی ہونی چاہیے تھی۔

ابھی اس مجموعے کو ضخامت کے علاوہ تنوع کا حامل بھی بتایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب عربی فارسی کے فارغ التحصیل، اردو زبان و ادب کے مشہور استاد اور اس کے علاوہ انگریزی تنقید کے شوقین واقع ہوئے ہیں۔ اس مجموعے میں یہ سب پہلو جس طرح نمودار ہوتے ہیں، ہمارے عام نقادوں کے مجموعوں میں نہیں ہوتے۔ اس کی ایک وجہ تو ڈاکٹر صاحب کی جامع الکمالات شخصیت ہے۔ پھر ہمارے زمانے میں علمائے ادب نے جو کسی ایک موضوع میں سپیشلائز کرنے کا رجحان چلا رکھا تھا، اس کے خلاف نوجوانوں میں بہت تیز قسم کا ردعمل ہوا ہے ـــ پہلے کی نسبت آج ایسے عالموں اور نقادوں کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے جو ایک ہی شاعر یا ایک ہی صنفِ کلام، ادب کا ایک ہی دور یا تنقید کی ایک ہی شاخ لے کے نہ بیٹھ جائیں، بلکہ ادب، زبان تعلیم اور معاشرت پر ایک جامع نظر کے حامل ہوں۔ ماہرینِ خصوصی کا ارشاد ہوگا کہ اس بسیط مطالعے سے کسی عمیق چیز کی توقع نہیں کی جا سکتی مگر دریا بڑا ہو تو اس میں پھیلاؤ بھی ہوتا ہے اور گہرائی بھی۔ گہرائی اگر کم ہو تب بھی تاریخ کے بعض ادوار میں جب انقباض بڑھ جاتا ہے تو بسط و کشاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ صاحب کا مجموعہ مضامین اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش معلوم ہوتی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اس کتاب کے متنوع موضوعات میں ایک دو انواع ایسی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ان پر زیادہ توجہ، وقت اور حوصلہ صرف کیا ہوا معلوم ہوتا ہے اور دو ایک انواع کو انہوں نے بس چھو کے دیکھا ہے۔ مگر یہ سب چونکہ باہم مربوط ہیں، اس لئے پورے میدان کا احاطہ کرنا بھی ضروری

تھا بعض موضوعات ہی ایسے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے عربی فارسی اردو اور کسی حد تک انگریزی زبان و ادب سے آشنائی ضروری تھی۔ مثلاً پہلے حصے میں جو مضمون تخلص کی رسم اور اس کی تاریخ پر لکھا ہے۔ کسی ایک مضمون کا ماہر خصوصی نہیں لکھ سکتا تھا آخری حصے میں ہماری شاعری کی ایک کلاسیکی صنف قصیدے کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے۔ وہ بھی ایک ہی کو لکھ سکے گر دگیسو نہ والوں کے لئے مشکل ہوتا۔ اس کے علاوہ نظری بحث کرتے ہوئے لغت اور دیگر علوم ادب کی بات کرتے ہوئے وہ کتنی آسانی سے ابن قتیبہ سے شمس قیس رازی اور شمس قیس رازی سے مولانا حالی اور مولانا حالی سے آئی اے رچرڈز تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ابن قتیبہ اور جاحظ، ابن رشیق قیروانی اور نظامی عروضی کی صحبت میں بیٹھے ہوئے وہ اجنبی نہیں لگتے۔ وہ اس محفل کے آداب سے واقف ہیں اور حفظِ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں۔ البتہ آئی اے رچرڈز اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی محفل اور اس کے آداب ان کے لئے کشش رکھنے کے باوجود کچھ نئے نئے سے لگتے ہیں اور وہ اس محفل میں شامل افراد کے مرتبے اور مقام کے بارے میں کسی نادانستہ غلطی کے شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود انھیں خصوصی ماہرین کے کنویں سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے پر داد دی جا سکتی ہے۔

ہمارے بزرگوں کی تنقید کا ایک خاص رجحان یہ ہے کہ کسی طرح مشرق اور مغرب کے مختلف نقطہ ہائے نظر میں مماثلت، اور مطابقت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ایک تربیت یافتہ مشرقی ذہن رکھنے کے باوجود اس رجحان کے حامل ہیں بلکہ شاید یہ بھی کہا جا سکے کہ اس رجحان کے علمبرداروں میں سے ہیں۔ ان کی مشرقیت کسی نعرے کی محتاج نہیں، وہ تو ان کی سطر سطر سے نمایاں ہوتی ہے۔ پھر بھی ان کا شمار ان روایت پسندوں میں نہیں کیا جا سکتا جو روایت کا مفہوم اردو ادب کی تاریخ تک محدود سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ عربی اور فارسی ادب سے ان کا رابطہ قوی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ادب محض سے گزر کر اس معاشرے کی اخلاقی و روحانی اقدار کو بھی جاننا بوجھنا چاہتے ہیں جس کے اندر وہ ادیبوں نے ادب تخلیق کیا، تاہم کسی وجہ سے ان کی شخصیت کے مشرقی عنصر نے خالص علمی اور تحقیقی مضامین میں اپنے آپ کو زیادہ نمایاں کیا ہے جب وہ شہر آشوب کی تاریخ لکھتے ہیں، یا فارسی کے زیر سایہ اردو زبان کی تدریجی ترقی کا سراغ لگاتے ہیں تو ان کے مشرقی ہونے کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ بہ نسبت ان مضامین کے جو انھوں نے تنقید اور نفسیات، خیال اور تخیل، صوت اور الفاظ قسم کے موضوعات پر لکھے ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ جس میں اصولی بحثوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش نظر آتی ہے، ہماری معاشرت کی اصل یعنی جڑ تک پہنچنے سے بہت پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ ایک آدھ مضمون جیسے شاعری اور علم کا رشتہ یا ادب کے قدیم تصور پر مضمون کا ایک جز، ایسی چیزوں سے یہ احساس تو ہوتا ہے کہ مشرقی تاریخ اور ادب کے بارے میں ان کی معلومات بہت اچھی ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے ان میں کہیں سے مدافعت بلکہ بعض جگہ معذرت کا انداز پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیں سرسید کے دور کی یاد دلاتا ہے۔ اس کے برعکس جب وہ مغربی یعنی زیادہ تر برطانوی نقادوں اور دانشوروں کا نام لیتے ہیں یا ان کے اقوال زریں سے اپنے مضامین کو زیب و زینت بخشتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ان کی نظر میں اب بحث مباحثے کی کوئی ضرورت باقی نہیں۔ دو چار دوایتی نام لے دیئے، ایک آدھ اقتباس انگریزی زبان میں درج کر دیا۔ اس سے زیادہ، مغرب کو جاننے کی ضرورت ہے نہ مشرق کو دینے کی مغرب کے بارے میں مشرق کا یہ رویہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے تحقیق ہو یا تنقید، تاریخ کا معاملہ ہو یا مذہب کا، سائنس سے سروکار ہو یا اخلاقیات سے، وکٹوریائی انداز نظر ان مضامین کے اندر سمویا ہوا ہے۔ مضمون کا عنوان تو ہوتا ہے "مسلمانوں کے ادب میں مزاح کے تنوعات" مگر جو کچھ اس میں کہا جاتا ہے اس کا انگلستان میں ایک صدی پہلے رواج تھا۔ اگرچہ قرآن و حدیث کا نام بھی لیا جاتا ہے مشرقی سرمایے کی طرف سے بے اعتنائی کی شکایت بھی کی جاتی ہے، اس کے ابتدائی دور کی تاریخ بھی آ جاتی ہے۔ مگر بعد میں وہ چیز جسے مصنف خود عربی ظرافت کا نام دیتے ہیں خود ان کی ناپسندیدگی کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ چیز جس کو انھوں نے مثل ایرانی ظرافت کہا ہے، اسلامی تہذیب

کی پردہ داری، بلاغت، رمزیت اور ایمائیت کا کرشمہ بن جاتی ہے۔ خیال رہے کہ عنوان تھا مسلمانوں کے ادب میں مزاح کے موضوعات اور حاصل کلام یہ ہے کہ جہاں جہاں سنبھلی ہوئی ظرافت ملتی ہے اپنے وقار اور سکون و اعتدال کے لئے اس ذائقہ حیات کے زیادہ قریب ہے جو اسلام کا پیش کردہ ہے مگر اس قسم کی سنبھلی ہوئی ظرافت مسلمانوں کے ادب میں کہاں ملتی ہے؟ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔ مغل ایرانی مزاج میں۔ یہ مزاج کا لفظ انھوں نے بڑی احتیاط سے لکھا ہے کیونکہ ادب کی دنیا میں اس کی مثالیں ان کو مغل ایرانی دور میں بھی کمتر ہی مل سکیں۔ ظرافت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے کچھ زیادہ ہی مہذب اور وکٹوریائی نقطۂ نظر سے ناقابل گرفت بننے کی جو کوشش کی ہے، اس کوشش نے انھیں مسلمانوں کے ادب میں مزاح کی زیادہ تر اقسام سے دور کر دیا ہے۔

مظفر علی سید

حرفِ بشاش (مجموعۂ کلام)

مصنف: نذیر احمد شیخ — ناشر: آئینہ ادب۔ لاہور

ضخامت ۲۲۴ صفحات — قیمت: پانچ روپے پچاس پیسے

نذیر احمد شیخ ادب و ظرافت کی دنیا میں نو وارد کی حیثیت تو نہیں رکھتے مگر اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ان کی شہرت زیادہ تر ایک مختصر حلقۂ احباب تک محدود رہی ہے اور اس کتاب سے پہلے ان کے بارے میں مزید تفاصیل جاننے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی تھی۔ شاعر کی اصل شخصیت اس کی شاعری ہی میں دیکھی جا سکتی ہے مگر پھر بھی کسی کو ظاہری معلومات کی خواہش ہو اس کے لئے۔ اس کتاب کے شروع میں جناب ممتاز حسن کا تعارف نثر میں، اور جناب ضمیر جعفری کا تعارف نظم میں موجود ہے۔

اردو ظرافت اکبر الٰہ آبادی کے بعد زیادہ تر نثر میں ہوتی رہی یوں اکبر کے بعد آنے والے مزاح نویس شعراء کی فہرست بنانا مقصود ہو تو خاصی بڑی کتاب بھی بن سکتی ہے مگر اچھے شاعرانہ قالب میں اچھی ظرافت اس پورے دور میں کمیاب ہی رہی ہے۔ سے دے کے ایک سید محمد جعفری کا نام ایسا ہے جو زبانوں پر بغیر کسی معذرت کے آ سکتا ہے۔ مگر ان کی ظرافت میں ادبیت کا رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ وہ بالکل خواص کی چیز بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس عوام پسند مزاح نویسوں کا ایک جم غفیر ہے جن کی ظرافت کتابی شکل میں زیادہ دیر تک مزہ نہیں دیتی۔ گویا اکبر کے بعد ظرافت کا لطف اور ظرافت کی گہرائی الگ الگ راستوں پر جا پڑے ہیں۔

اس پس منظر میں نذیر احمد شیخ کا مجموعۂ کلام "حرفِ بشاش" پڑھیں تو محسوس ہوگا کہ اب ظرافت سے یہ شکایت کرنا بے جا ہوگا۔ مثال کے لئے ایک چھوٹی سی نظم دیکھئے:۔

فرصت میں جنجو عہ سے جنجوعہ — پوچھا کہنے بچوں کا مجموعہ

اک دن سن کر آٹھ — حضرت بیگم ساٹھ

اس دن سے منکوحہ ہے ممنوعہ

یہ ظرافت پُر معنی بھی ہے اور پُر لطف بھی۔ پھر اس میں شاعری کا کمال بھی ہے۔ ظریف اگر فن کار نہ ہو تو ایسی بات اس طرح ادا نہیں کر سکتا۔ اب ایک ذرا بڑی نظم سنیئے۔ عنوان ہے "خیالی پلاؤ" جو عالمِ اسلام کی قومی غذا ہے:

پلاؤ دل آویز، دل کش، دل آرا — شہان راہ گدا را، بہار ما، شمارا

یہاں تک پلاؤ کی لذت نے مارا خیالی پلاؤ پر اب ہے گزارا
صد آفت رسیدہ، مگر یہ عقیدہ
کہ ایمان لاؤ تو کھاؤ پلاؤ

ملایا، مراکش، خراسان، یہ سب جہاں میں، جہاں ہیں مسلمان یہ سب
نشانِ تمدن، یہ خوان یہ سب مسلمان دنیا کی پہچان یہ سب
مہک بھینی بھینی، زہے دارچینی
پڑاؤ، پڑاؤ، ملے گا پلاؤ

جہاں گھر میں قسمت سے مہمان آیا تکلف یہ فوراً مسلمان آیا
بڑے دیگچے میں وہ طوفان آیا کہ چاول میں دنبہ پریشان آیا
نہ بستر نہ کرسی نہ احوال پرسی
مگر رکھ رکھاؤ سے حاضر پلاؤ

شاید آپ سمجھیں کہ یہ شوق محض آسودہ حالی کا کرشمہ ہے۔ بازار کا منظر بھی دیکھیے:۔

سڑک پر جو بیٹھے "پلا" بیچتے ہیں اسے بس بزورِ دعا بیچتے ہیں
ذلا بیچتے ہیں، بلا بیچتے ہیں ہمیں موت کو برملا بیچتے ہیں
نہ دیکھو نہ بھالو، چلو یار کھالو
دونی کا پاؤ لگا ہے پلاؤ

آخر میں بات کہاں سے کہاں پہنچتی ہے!

جہاں بھی پلاؤ بگھارا گیا ہے زمیں سے فلک تک پھیلا گیا ہے
اسی غم میں شیطان مارا گیا ہے کہ مومن پہ یہ کیا اتارا گیا ہے
چہ شاہی، چہ خرقہ، وہی ایک فرقہ
جسے ورغلاؤ، کہے گا پلاؤ

جہاں پیٹ میں تھال پر تھال بیٹھے مسلماں وہاں سالہا سال بیٹھے
شکم خوب ابھرے خوشحال بیٹھے یہاں تک کہ غازی سپر ڈال بیٹھے
نہ ہسپانیہ ہے نہ رومانیہ ہے
میاں اب پکاؤ خیالی پلاؤ

آپ نے ملاحظہ فرمایا، بات تسخیرِ ہندوستاں تک جا پہنچی۔ مگر شاعرانہ کمال اور مہارتِ فن نے کہیں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ زبان کا لطف۔ زورِ بیاں کا لطف۔ قافیے اور ردیف کی ندرتیں، نئی ترکیبیں اور ان سب کے باوجود۔ نشانہ ایسا کہ ضرب عین مخ کے سر پر لگتی ہے۔ یہی وہ ظرافت

ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ کوئی کھیل اس سے زیادہ پر لطف نہیں اور کوئی فلسفہ اس سے زیادہ پر معنی نہیں۔

کوئی دو سو صفحوں کے اس مجموعے میں ساری نظمیں اور غزلیں اس معیار کی نہیں مگر اکثر میں قریب قریب یہی معیار ہے۔ کم سے کم دس بارہ نظمیں ایسی ہیں جن کی ہم پلہ چیزوں کی تلاش میں کافی دور جانا پڑے گا۔ ایک جز پیروڈی نما نظموں پر مشتمل ہے۔ اور ایک جز ایسا بھی ہے جس میں صنعتی نظمیں شامل ہیں یعنی جن میں نئے صنعتی دور کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ از قسم ظرافت نہیں مگر انھیں پڑھ کے بھی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ آخر میں انگریزی ظرافت کی ایک صنف لمرک (Limerick) کو بھی آزمایا گیا ہے۔ یہ پانچ مصرعوں کی ایک مزاحیہ نظم ہوتی ہے جس کا تیسرا اور چوتھا مصرع باقیوں سے ذرا چھوٹا ہوتا ہے۔ ایک نمونہ اوپر آچکا ہے۔ ایک اور دیکھیے:

جاتے تھے کل مزار رکن الدین پیچھے بھینسوں کے کھڑکاتے ٹمین
پوچھا حضرت یہ کیا رنگ بولے اپنا اپنا ڈھنگ
ان کے آگے کون بجائے بین

اب آخر میں کچھ متفرق اشعار بھی دیکھیے:۔

کارناموں کی دھوم ہے ہر سو آدمی کم ہیں اشتہار بہت

یہ مانا بہت عورتیں ہیں عفیفہ مگر مرد بھی کچھ عفیفے ہوئے ہیں
وہی اک نہیں ہر صنم کی زباں پر یہ ملبے ازل سے بریلیے ہوئے ہیں

اس منزلِ ہستی میں ٹھہرنا ہے مناسب آگے تو خدا جانے سڑک ہے کہ نہیں ہے

کنفّ سے کب بات بنتی ہے حضور پیرجی کے گھر میں ٹیلیفون ہے

کیوں نہ مہماں کو ہم کہیں رحمت گھر میں امن و امان رکھتا ہے

المختصر یہ کہ ایسی زندہ اور ہری بھری کتابیں روز روز نہیں چھپتیں۔

مظفر علی سید

آتشِ رفتہ (نفسیاتی ناولٹ)

مصنف: جمیلہ ہاشمی ناشر: اردو اکاڈمی (سندھ) کراچی

صفحات: ۱۶۷ قیمت: ۴ روپے

جمیلہ ہاشمی کا یہ ناولٹ "آتشِ رفتہ" غالباً چھ سات سال ہوتے ہیں، اس چھوٹے ناگہشتے سے میگزین "داستانگو" میں چھپا تھا جسے اشفاق اور قدسیہ بڑے پیار اور سلیقے سے نکالا کرتے تھے۔ کتنا افسوس ہے کہ وہ پر مسرت میگزین اس ادبی خزاں میں زیادہ عرصہ نہ پنپ سکا اور

سسک سسک کر مر گیا، "آتشِ رفتہ" نے اپنی پہلی نمود پر ہم سب کو قدرے چونکا دیا۔ اس دور کی عمومی افسردگی میں یہ ناولٹ گویا بہار کا تازہ جھونکا تھا۔ اپنی تھیم اور لطافتِ بیان میں بالکل اچھوتا، نیا اور بلا کی پڑھنے والوں کے لئے ماجھے کے دیس کی یہ بھڑکتی محبت اور انتقام کی کہانی اتنی پر سحر ثابت ہوئی کہ انھوں نے اسے کئی بار پڑھا۔ یہ جیلہ ہاشمی کون تھی؟ ہر کوئی پوچھنے لگا۔ اسے ماجھے کے خطّے کے سکھ سرداروں کے رہن سہن۔ رسوم و رواج۔ ان کی توانا۔ جذبات بھری الھڑ زندگی کا اتنا گہرا اندر سے محسوس کیا ہوا علم کیسے تھا۔ وہ وہاں کی بلوان۔ تانبے کے سے دہکتے جسموں والی عورتوں اور کڑیل، زور آور مردوں کے جذبات کو اتنے قریب سے کیونکر لکھتی تھی ۔۔۔ اور پھر ماجھے کے کھلیانوں، کھلے میدانوں، میلوں ٹھیلوں کے سماں، برسات اور دھوپ اور اماوس کے راگ رنگ اس دم سادھ دینے والی خوبصورتی اور ہڑکے سے کھینچے ہوئے تھے کہ وہ بالکل حقیقی لگتے تھے۔ اور پڑھنے والے کو موہ لینے کی قدرت رکھتے تھے۔ وہ ان سکھ سرداروں کی زندگی۔ ان کے خطّے کو اندر باہر سے جانتی معلوم ہوتی تھی۔ نہ ہی صرف وہ اس تہذیب کو جانتی تھی بلکہ وہ اسے ایک نادر بانکپن اور سندرتا کی نثر میں ڈھال دینے کے گر سے بھی واقف تھی۔ اس کہانی نے ہم سب کو مسحور کر لیا کیونکہ یہ اتنی سادگی، اتنے حقیقی لگاؤ سے لکھی ہوئی تھی اور ہم شہری لوگوں کے متعلق سوشل انداز کے بے رنگ اور نفسیاتی، جنسیاتی، مریضانہ افسانے پڑھ پڑھ کر تھک چلے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ ہم اس لئے مسحور ہوئے کہ "آتشِ رفتہ" دل کو گرفت میں لے لینے والی غم انگیز اور تصویریت سے پُر کہانی تھی۔ میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو ایسی کہانیاں اور زیادہ لکھنی چاہئیں۔ میں ان کو ان سماجی، نفسیاتی، اینالیٹیکل کہانیوں سے کہیں زیادہ ترجیح دیتا ہوں، جو بے جان غیر دلچسپ لوگوں کے بارے میں ہوتی ہیں۔ اور جن میں شروع سے آخر تک کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے ایسی کتابیں پسند ہیں جن میں میں بالکل کھو جاؤں اور مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہے اور جب وہ ختم ہو تو میرا ذہن گوناگوں، رنگا رنگ تصویروں اور سپنوں سے دیر تک دمکتا رہے اور میں بڑی دیر تک نیند یا کسی اور چیز کا نہ سوچ سکوں۔ سب اچھی تخلیقی کتابوں میں یہ صفت ہوتی ہے۔ "آتشِ رفتہ" ایسی ہی کتاب ہے۔ ممکن ہے نقادوں کے نزدیک یہ اونچا فن نہ ہو مگر میں اسے ایک "مائنر اردو کلاسک" کہنے سے نہیں جھجکوں گا۔ میں اس پر نقادوں کو بل کھاتے ہوئے بھی دیکھ سکتا ہوں اور یہ بھی کہ وہ مجھ پر رحم کھا رہے ہیں۔ مگر میں ان کی کیوں پروا کروں؟

ایک چیز میں نہیں سمجھ سکا۔ عنوان کے نیچے اسے "نفسیاتی ناولٹ" بتایا گیا ہے (خدا جانے یہ ناشر کی اُپج ہے یا مصنفہ کی)۔ یہ نفسیاتی ناولٹ یا اس قبیل کی کوئی شے نہیں ہے اور ہم کو اس کے لئے "ستاروں" کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ یہ ماجھے کے خطّے کا ایک چمکتا دمکتا رومانس ہے۔ رومانس کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ اردو میں اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ وہ نعم البدل جو ہم نے تراشا ہے یعنی "رومان" اپنے معنی میں افسوس ناک حد تک محدود اور ناکافی ہے۔ اردو میں رومان فقط ایک محبت کی کہانی کے معنی میں مستعمل ہے۔ انگریزی رومانس، محبت کی کہانی بھی ہو سکتا ہے اور خالصتاً ایڈونچر کی داستان بھی۔ ناقابلِ تقلید رابرٹ لوئی اسٹیونسن نے کئی ایک رومانس لکھے۔ "ٹریژر آئی لینڈ" اور "کڈنیپڈ" کی طرح غیر فانی رومانس ہیں۔ لیکن ان میں عورت کا نام نہیں۔ وہ لڑکوں کے لئے یا میرے جیسے آدمیوں کے لئے جو کبھی بڑے نہیں ہوتے، ایڈونچر کی کہانیاں ہیں۔ اس کے برعکس "لارنا ڈون" یا "کارمن" بھی رومانس ہیں اور زیادہ تر خالص اور سادہ محبت کی داستانیں ہیں۔ اب اگر "آتشِ رفتہ" کو ایک رومان یا ایک رومانی ناولٹ کہا جائے تو اس کا تاثر بالکل غلط ہو گا۔ مگر اس میں ایک رومان کے سارے عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں اور نفسیاتی ناولٹ تو یہ ہرگز نہیں۔ ماجھے کے جیالے کڑیل مرد قطعاً نفسیاتی نہیں ہو سکتے۔ وہ دھرتی ماتا کے قدرتی بچے ہیں۔ جو اپنے جذبات سے نہیں ڈرتے۔ سگمنڈ فرائیڈ نے شہروں کے باہر ابھی سفر نہیں کیا۔

یہی وجہ ہے کہ ماجھے کے سردار اور سردارنیاں ہمارے تخیل پر چھا جاتے ہیں۔ ان میں کوئی نفسیاتی پیچ نہیں، اور ہم ان البیلے، مضبوط کلائی کے کسانوں کے تیز و تند وحشی جذبات، ان کی مسرتوں کی سادگی، قدرتی پن اور ایک حیوانی مکمل شادمانی، ان کی شدید دشمنیوں اور دوستیوں کو رشک اور تعریف سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کے مقابلہ میں ہماری اپنی زندگیاں (خواہ ہم گلبرگ کی کوٹھی اور مرسیڈیز کے مالک کیوں نہ ہوں) کتنی گھٹی

ہوئی اور فاقہ زدہ اور نزار ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں ایک کتاب "کامیاب زندگی کا تصور" پڑھی جسے لسانیات کے ایک ماہر پروفیسر نے بارہ سال کی محنت شاقہ سے ترتیب دیا۔ دراصل کامیابی کے بالکل مسخ شدہ تصور پر جو انسانیت کی ایک وسیع اکثریت کے دل و دماغ میں جڑ پا چکا ہے، تمہارا خیال کامیابی اس بات میں نہیں کہ تم اقتدار کے ایوانوں میں گھومتے پھرتے ہو اور تمہاری تقریریں دنیا کے اخباروں میں نقل کی جاتی ہیں یا کلفٹن پر تمہارا شیشے اور فولاد اور کنکریٹ کا محل ہو۔ ذرا یہ سوچو کہ تمہاری روح کتنی بھوکی ہوئی، ناتواں اور میلی ہے۔ تھورو نے کتنا صحیح کہا ہے کہ بیشتر آدمی ایک دبی ہوئی مایوسی کے کنارے پر جیتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کی برکات کے باوجود ہم سب اتنے غیر مطمئن اور ناخوش کیوں ہیں۔ ہم ان دیواروں کو کیوں نہیں توڑ سکتے جو ہماری روح کو قید کیے ہوئے ہیں جہاں خوشی اور سادگی اور مردانگی نہیں وہاں زندگی نہیں۔ خواہ ایک آدمی کے پاس بڑا بینک بیلنس ہو اور فرانسیسی جنوب میں ایک شاندار ولا، اور کروڑ پتی اونیسس کی طرح سجے ہوئے ذاتی بجروں کا بیڑا۔ وہ خوشی سے اتنا ہی دور رہے گا جتنا ایک تشنہ سوکھا صحرا پانی کے زندگی بخش لمس سے۔ ایسی بیابان روح میں کچھ نہیں اُگے گا اور اگر کچھ اُگے گا بھی تو زہریلی کھمبی۔ اوہ! ہم سب کتنے گھٹے گھٹے ہوئے کتنے خائف اور کتنے بے اطمینان اور بیمار ہیں۔ دیو ہیکل صنعتی مشینوں اور دس سالہ تعمیری منصوبوں اور ایٹم کی ایجادوں نے مہذب آدمی کی زندگی کو کچل دیا ہے اور جلد ہی وہ صحیح اور توانا زندگی کے تصور کو بھی بھول جائے گا۔ ہنری ملر کے الفاظ میں متمدن آدمی روح کے کوڑھ اور سرطان میں مبتلا ہیں۔ ہمارے چاروں طرف موت کی علامات استادہ ہیں۔ سپر سانک جیٹ موت ہیں مشین موت ہے۔ موٹر کار موت ہے۔ تمہارا محفوظ دفتری عہدہ، انشورنش پالیسی موت ہے، ٹیلی ویژن، کلب، اور اسٹاک ایکسچینج کے حصے سب موت ہیں، کالج اور کیریر کی دوڑ موت ہے اور اخبار خواتین کی پر مسرت ازدواجی زندگی بھی موت۔ ہم سب اس موت کے سانس کو محسوس کرتے ہیں لیکن ترقی اور کامیابی کے خیال سے اس کی طرف بڑھتے ہیں ہم ایک لفظ بھی نہیں کہتے۔ کیونکہ ہم کامیابی کے جھوٹے بہلاوے کے تعاقب میں لگے ہیں۔ کیا یہ [illegible] ادیم کی باتیں صحیح، سالم اور جیتے لوگوں کی باتیں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ پطرس کے دل میں کیا تھا جب اس نے اپنا وہ چھوٹا سا مضمون ایک آدمی کے مینار سے گرنے کے بارے میں لکھا جو داستانگو میں چھپا تھا۔ وہ گرنے والا آدمی خود پطرس تھا پطرس جو دنیاوی لحاظ سے اتنا کامیاب تھا اور اقوام متحدہ میں ہمارا مستقل لائق اور فصیح نمائندہ۔ اور میں اس چیز کو جانتا ہوں۔ اس رینگنے والے ڈر کو جس نے اس کامیاب ترین اور بے مثل لکھنے والے ارنسٹ ہمنگوے کو اپنی محبوب چاندی سے مڑھی ہوئی ہسپانوی بندوق کی گولی کو اپنے حلق میں چلا دینے پر آمادہ کیا۔ صرف زندگی، صرف ہستی کوئی شے نہیں۔ اگر ہم بھرپور جینے کی شادمانی سے محروم ہیں۔ ہمالیہ پر چڑھنے والا ایک کوہ پیما اس دس سیکنڈ میں جس میں ایک برفانی تودہ اسے عدم وجود کی طرف بہائے جاتا ہے۔ زیادہ جی لیتا ہے بہ نسبت مال روڈ کے ایک تاجر کے جس کی بے تہ ساری زندگی روپے کی کھنک، اور بینک نوٹ کی سرسراہٹ میں گزرتی ہے یا ایک یونیورسٹی پروفیسر کے جو اپنے کمرے میں بیڈ سلیپر اور سیاہی کی دوات کے ساتھ رہتا ہے اور قرون وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھنے میں سرگرداں ہے ——— ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لئے۔

جمیلہ ہاشمی کی "آتش رفتہ" کے لوگ جیالے، اور زندہ ہیں جن کی رگوں میں گرم، پرجوش خون گردش کرتا ہے، جو تندی اور شدید جذبے سے دشمنی اور محبت کرتے ہیں جن کا سکول اور دفتر گندم کی سنہری بالیں اگلنے والی زمین ہے۔ یہ ماجھے کے لوگ جسم اور دل کے مضبوط ہیں۔ قول کے سچے اور دلیر، دوستی اور دشمنی کے پکے۔ انہوں نے سگمنڈ فرائڈ اور جدید شاعری کو نہیں پڑھا۔ ان کی عقابی آنکھوں میں سے حسرتیں نہیں جھانکتیں وہ کبڈی کھیلتے ہیں گھوڑوں پر سواری کرتے ہیں۔ پاٹھ کرتے ہیں اور للکار کر کرپان چلاتے ہیں۔ وہ شاعر نہیں ہیں مگر ماہیا گاتے ہیں، اور زندگی کی ساری شاعری، سارا لطف ان کے رگ و ریشہ میں رچا ہوا ہے۔ ماجھے کی سرزمین سے وہ برگد کے درختوں کی طرح سیدھے اور تن آور اُگتے ہیں ——— اپنی داڑھیاں زمین میں گاڑتے ہوئے

اور جب وقت آنے پر وہ مرجھا کر گرتے ہیں تو ایسے ہی آدمیوں کی ایک نئی نسل ان کی جگہ لینے کے لئے توانائی سے اُگ آتی ہے۔ ان کی عورتیں چکی چلاتی ہیں۔ اوپلے تھاپتی ہیں اور چاٹی میں مکھن بلوتی ہیں اور رنگین چرخے کاتتی ہیں۔ وہ فریج، ٹیلی وژن، فلم اور میک اپ کے بغیر بھرپور صحت مند پرسکون زندگیاں گذارتی ہیں۔ ان کے بچے سینٹ انتھنی میں نہیں پڑھتے۔ وہ گاؤں کے دوسرے بچوں کے ساتھ کبڈی کھیلتے ہیں یا کھلی جگہوں میں اپنے بیلوں اور مویشیوں کو چراتے اور تالاب میں نہلاتے ہیں۔ خوش قسمت بچے! ایک بیٹے کے نئے ڈھور ڈنگروں کی گلہ بانی کتنی اچھی تعلیم ہے تعلیم (ان جو کچھ بھی کہیں، ایک بچے کے لئے اس سے بہتر تعلیم کوئی اور نہیں رہی تعلیم موسیٰؑ اور یسوعؑ اور ہمارے رسولؐ نے بچپن میں پائی تھی اور کتنے عظیم آدمی تھے وہ! قوموں اور دینوں کو بنانے والے اور دنیا کے لئے اچھائی اور نیکی کے پرچارک) ایسے کنزل لوگوں کے بارے میں جمیلہ ہاشمی کی یہ کہانی ہے اور یہ ایک آبدار، درخشاں اور پرکشش کہانی ہے۔ بڑی حساسیت اور خوبصورتی سے بُنی ہوئی۔ اس کے الفاظ رنگدار تصویروں کی طرح صفحے میں سے جھانکتے ہیں اور خیرہ کر دیتے ہیں اور نثر کہیں کہیں شاعری کو چھو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمیلہ ایک قدرتی کہانی کہنے والی ہے لیکن یہاں (میں سمجھتا ہوں) فنکار کی خوش بختی بھی اس کے ساتھ تھی جیسے وہ جان کیٹس کے ساتھ تھی جب اس نے اپنی چھوٹی دردمند نظم "لا بیلے ڈیم سانز مرسی" لکھی۔ سب فن کاروں کو اس خوش بختی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب ہی جادو پیدا ہوتا ہے اور ناممکن وقوع پذیر ہونے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب جمیلہ نے اپنا ناول "تلاشِ بہاراں" لکھا تو خوش بختی اس کے ساتھ نہ تھی۔ تحریر کی لطافت و رنگینی کے باوجود "تلاشِ بہاراں" میں آگ فروزاں نہ ہو سکی اور کہانی یا کردار کوئی جادو نہ جگا سکے۔ یہ ناول غیر حقیقی اور بے جان اور اکتا دینے والا ہے ـــــ سچے تجربے، محسوس احساس اور علم کے بغیر لکھا ہوا، صرف تحریر کے رنگ روپ سے ایک کتاب پڑھنے والے کو اپنے دام میں نہیں لے لیتی۔ ایسی ہی خوش بختی بیدی کے ساتھ تھی جب اس نے "میلی چادر" لکھی۔ بیدی نے اس سے بہتر کہانی کبھی نہیں لکھی اور بلونت سنگھ کے ہمراہ بھی "رات، چور اور چاند" کے پہلے باب لکھتے وقت یہی خوش بختی تھی جس کی بدولت اس کے منظروں میں وہ تیسرا بُعد (Third dimension) پیدا ہو گیا۔ اور لکھنے والا اور پڑھنے والا اپنی گرویدگی اور محویت میں یکجان ہو گئے اور الفاظ جیتی جاگتی شکلیں، رنگ اور بو میں بن گئے۔ "رات، چور اور چاند" میں یہ معجزہ رونما ہوتا ہے کہ ہم بعض دفعہ نہ صرف کرداروں کو اپنے سامنے چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے دیکھتے ہیں بلکہ ان کی بو بھی گویا سونگھنے لگتے ہیں۔

میں آتشِ رفتہ کا ان دو فنکاروں سے موازنہ نہیں کر رہا، درحقیقتاً اس کا ان سے موازنہ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ آتشِ رفتہ ایک رومانس (Romance) ہے۔ اب ایک رومانس میں واقعات اور فضا پہلے آتے ہیں۔ کردار نگاری اور فکر انگیزی بعد میں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک رومانس میں زندہ قابلِ یقین کردار نہیں ہو سکتے اور وہ محض پتلے ہوتے ہیں۔ رومانس میں کردار اتنی گہرائی اور باریکی سے پیش نہیں کئے جا سکتے جتنے ایک ناول میں۔ پھر بھی ان کا قابلِ یقین ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ساری چیز جھوٹی ہو جاتی ہے۔ وہ البتہ کہانی کی فضا اور واقعات کی مجیر العقولی کے تابع ہوتے ہیں اور اپنے رومانی نمونے اور سانچے کے مطابق وہ اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ انھیں حقیقی کرداروں کے سے رنگ ڈھنگ سے چلنا، پھرنا، گفتگو کرنا لازم ہے اور وہ قابلِ یقین ہونے چاہئیں لیکن ان کے شعور و فکر کا گہرا مطالعہ "رومانس" کے تاثر کو خراب کر دے گا۔ "برادر کرام زوف" کے طریقے "کنگ لیئر" جیسے رومانس میں برتے نہیں لائے جا سکتے۔ جو لڑکوں کے لئے ایک ایڈونچر کی کہانی ہے اور پھر بھی "چچا" اینڈرو۔ ہائی لینڈ ہلین اور ڈیوڈ جیسے زندہ کردار لئے ہوئے ہے۔ ان کرداروں کے متعلق ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہانی کے مقصد کے لئے ضروری ہے نہ کم نہ زیادہ نسیم حجازی اور بہت سے دوسرے بھی تاریخی رومانس لکھتے ہیں جن میں چال ڈھال یا گفتار میں ایک کردار سے دوسرے کردار میں کوئی تمیز نہیں ہو سکتی یوسف بن تاشفین یا محمد بن قاسم یا سعد بن غلام رسول یا عمر بن عبدالعزیز ایک ہی آدمی معلوم ہوتے ہیں اور بالکل ایک ہی قسم کی تقریریں کرتے ہیں نتیجہ مضحکہ خیز اور انتہائی ہوتا ہے اور رومانس ایک تبلیغی پمفلٹ بن کے رہ جاتا ہے۔

"آتش رفتہ" کے کردار شیر دل، بوڑھی کرتار کور، سردارنی کلدیپ کور، سفید گھوڑی والا مہر سنگھ، دھیو اور دلدار سنگھ اپنے طور طریق اور انداز و گفتگو میں صحیح اور قابل یقین ہیں۔ ان کی اپنی عادتیں، طبیعتیں، مزاج کی کیفیتیں ہیں اور ایک کردار گفتگو میں دوسرا نہیں بن جاتا۔ گو ہم ان کے متعلق کوئی گہرا علم حاصل نہیں کرتے (ایک رومانس میں یہ غیر ضروری ہے) جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے۔ یہ نفسیاتی ناولٹ نہیں، نہ ہی یہ کرداروں کا ناول ہے۔ لیکن ماجھے کی ایک جذباتی محبت اور انتقام کی رومانس کی حیثیت میں یہ اول درجے کا ہے اور میں اس میں کوئی نقص نہیں پاتا۔ یہ کہانی پڑھتے ہیں معنف کا ایک دن کو دیکھا ہوا سپنا لگتی ہے لیکن ایک حیرت ناک رنگا رنگ سپنا۔ اثری تصویروں کی خوبصورتی اپنی چمک دمک چھوڑ جاتی ہے اور کہانی کا ذہن سے وابستہ ہو جانے والا تاثر ہے دیہاتی زندگی کی مختلف کیفیتوں کی اتنی اچھوتی رنگین منظر کشی اردو کی چند ہی کتابوں میں مل سکے گی۔ معنف کا انداز بیان موضوع سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے اور ہندی اور پنجابی الفاظ جہاں بھی آتے ہیں، تحریر میں ایک نیا رچاؤ لے آتے ہیں۔ "بھنیڑ، مٹیار، ٹبی، دھوڑ، ڈھینگے، بنیرے، مون، پوت جیسے پنجابی الفاظ ماجھے کے ایک رومانس میں خوبی سے سجتے ہیں اور انھیں اردو زبان میں مدغم کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ماہر الفاظ ری جیسے بزرگ جو اردو کو لال قلعے میں بند رکھنا چاہتے ہیں اس پر بہت خفا ہوں گے، مگر زبان ایک نہ رکی ہوئی جا رہی شے نہیں۔ اس کے لئے بڑھنا، پھولنا اور تبدیل ہونا ناگزیر ہے۔

"آتش رفتہ" بے جان، بے سکت شہری لاشوں کی ایک گھسی پٹی فرسودہ سماجی کہانی نہیں (ایسی سماجی کہانیاں کوئی کیوں لکھے اور کیوں پڑھے) یہ ایک دلکش دلگداز رومانس ہے اور میری رائے میں ہمارے ادب کی ایک ماینر کلاسک

محمد خالد اختر

دیواریں (مختصر افسانے)

معنف: حمید کاشمیری | ناشر: مکتبہ ماحول۔ ۹ بہادر شاہ مارکیٹ۔ بندر روڈ کراچی

صفحات ۲۸۷ | قیمت: پانچ روپے پچاس پیسے

کتابوں کے گرد پوش ہمیشہ صاحب کتاب کو یونانی دیوتاؤں کی طرح اولمپیا کی دھندلی بلندیوں پر بٹھاتے ہیں اور اپنی خاص مروجہ ڈھنگ عبارت میں اس کے مکمل جینیئس ہونے کی نوید دیتے ہیں۔ گرد پوشوں کی نگاہ میں ہر کوئی بادن گزا ہوتا ہے۔ "دیواریں" کا گرد پوش بھی اپنا روایتی مقصد بخوبی پورا کرتا ہے۔ معنف کے فوٹو کے نیچے یہ ہمیں بتاتا ہے کہ حمید کاشمیری، افسانہ نگاری کے شاندار قلعے کی دیواریں توڑ کر فاتحانہ طریقے سے اندر داخل ہوا ہے۔ میں اس نوجوان لکھنے والے کے قلعے سر کرنے کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اس میں شک نہیں کہ اس نے بڑے اچھے مختصر افسانوں کی کتاب لکھی ہے۔ اس کی صلاحیت اور ہونہاری میں کلام نہیں اور یہی بات یہ ہے کہ سیدھے سادے پرخلوص اسلوب اور ستھری تکنیک سے لکھے ہوئے یہ افسانے ان بیشتر افسانوں سے خوشگوار طور پر مختلف ہیں جو آج کل اردو میں لکھے جا رہے ہیں۔ حمید کاشمیری کی کہانیوں میں ایک تازگی ہے نئے ڈھلے ہوئے سکے کی کھنک اور چمک اور اپن۔ اس کتاب میں انیس کہانیاں ہیں۔ ان میں سے وہ کہانیاں جو کراچی کی سیٹنگ رکھتی ہیں نمبرے جاتی ہیں اور وہ مجھے بڑی اچھی لگتی ہیں۔ یہ کہانیاں اس ہو شربا، کلبلاتے ہوئے لاتخص، میٹرو پولس کی نچلی زندگی کے نہایت تیکھے، ترشے ترشائے چھوٹے مرقعے ہیں۔ حمید کاشمیری اس لینڈ کا ایک حقیقی انیکلہ ہے ۔۔۔ غالباً سب سے ذہین اور پرفن جو اسے پچھلے دس پندرہ سالوں میں میسر ہوا ہے۔ وہ افتشار کا شکار نہیں اور وہ کم سے کم الفاظ میں تاثر پیدا کرتا ہے۔ وہ چھوٹی مختصر تصویر جو وہ دکھانا چاہتا ہے، اس کے تخیل اور احساس کی روشنی اسی کو روشن کرتی ہے اور نادار گرد کی تصویریں اور نقوش تاریکی میں دبتے ہیں میری رائے میں یہ فن ہے اور بڑا قابل تعریف فن۔ ایرانی کیفوں، چھوٹی کتابوں کی دوکانوں، روشن ٹیکسیوں، اونچی پتھریلی عمارتوں کی رومانس ان کراچی کے مرقعوں میں زندہ ہو جاتی ہے۔ تنہا، غریب، روندے ہوئے آدمی اس پتھر کے وسیع جنگل میں اپنی روزی

اور زندگی کے ساتھ نبرد آزما ہیں)۔

ان کہانیوں میں ایک کہانی جو مجھے اچھی لگی "شاہزادی" ہے۔ میں نے سب سے پہلے پہل پڑھا تو وہ مجھے کچھ کچھ جذباتی اور رومینٹک محسوس ہوئی۔ پر جب میں نے پروفیسر ممتاز حسین کا پیش لفظ پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ حمید کاشمیری ایک چھوٹا بک سیلر ہے اور ہیومنٹ ہے۔ ایک ولایتی میگزینوں اور پیپر بیکس کے کیاسک میں بیٹھتا ہے۔ یہ سوانح عمری معلوم کرنے کے بعد میں نے "شاہزادی" کو دوبارہ پڑھا اور اب اس کے معنی ہی کچھ اور تھے۔ یہ ایک خوبصورت کہانی ہے اور دل کو چھو جاتی ہے۔ "بند گلی" کراچی کے غنڈوں، پٹھان چوکیداروں اور ایک ایرانی کیفے کے متعلق ہے اور میری رائے میں یہ ہیمنگوے کی لاجواب The Killers کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ کہانی اپنے کرداروں کے حقیقی رنگ روپ، اپنی ڈرامائی کیفیت، اپنی ادبی ساخت میں تقریباً مکمل ہے — اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کے متعلق احساس ہو کہ وہ وہاں نہ ہونا چاہیے۔ "خودکشی"، "زیر تعمیر"، "آپ کی کہانی" جانا جب سب کراچی کی زندگی کے مرقعے ہیں۔ وہ کافی جاندار۔ حمید کاشمیری نے اس شہر میں مفلسی اور تنہائی کاٹی ہے، روزی کے لیے جدوجہد کی ہے اپنے جیسے بندوں کا ہمدردی اور محبت سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ خوش قسمت ہے کہ الفنسٹن اسٹریٹ میں اس کی چھوٹی سی بک شاپ ہے اور وہ اس لیے بھی خوش قسمت ہے کہ وہ اتنے حساس، غیر مرئی انداز میں سوچ اور لکھ سکتا ہے۔

ممتاز حسین نے اپنے پیش لفظ میں کہا ہے کہ مصنف کو ابھی اپنی زبان پر پوری قدرت حاصل نہیں۔ میں ان سے اس حد تک متفق ہوں کہ حمید کاشمیری کی زبان اتنی زیادہ صاف اور منجھی ہوئی نہیں اور ان کہانیوں میں بعض جگہ خام طرز بیان کے ٹکڑے آجاتے ہیں مگر پھر کیسا احساس ہے کہ ان کا لکھنے والا وہ ہے! اور کتنی محبت کے قابل شخصیت اس کی کہانیوں میں ابھرتی ہے! میری رائے میں وہ ایک سچا لکھنے والا ہے — ایک ایسا نہیں جو ہمارے ادب میں اتنے سارے ہیں جو اصل احساس اور انسانی محبت سے نہیں لکھتے اور صرف عبارت آرائی کرتے ہیں)۔

اب جب میں کراچی گیا تو اس اچھے اور حساس انسان کے ولایتی رسالوں کے کیاسک پر ضرور جاؤں گا۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ اسے ابھی زبان پر عبور حاصل نہیں ہوا، وہ لکھ سکتا ہے اور یہ ایک بڑی چیز ہے — بلکہ سب کچھ ہے۔

محمد خالد اختر

قاسم کی مہندی (افسانوں کا مجموعہ)

تصنیف: سید قاسم محمود — اشاعت: نفیس محل، ۱۵ سرکلر روڈ، لاہور

سرورق و تصاویر: تفضل ضیا — ضخامت: ۳۲۰ صفحات — قیمت: پانچ روپے

اردو ادب کے ایک ثقہ نقاد ڈاکٹر محمد حسن نے ہم پڑھنے والوں کو یہ اچھی خبر سنائی ہے کہ اردو ادب کے افق پر حال ہی میں ایک (اور) ستارہ ابھرا ہے جس کا نام ہے: سید قاسم محمود۔ ... اس کی رواں دواں نثر، شگفتہ احساسات، اور فکر سے معمور انداز بیان اسے ہم عصروں میں ایک منفرد مقام دیتا ہے۔ چنانچہ اردو افسانے کو بجا طور پر قاسم محمود سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لینی چاہئیں — ہمیں امید ہے کہ اردو افسانہ نقاد کے اس مشورے پر عمل کرے گا اس لئے کہ ہمارے ثقہ نقاد معاصر ادب کے بارے میں شاذ و نادر ہی کوئی بات کہتے ہیں۔ وہ جب کمال شفقت سے کام لیتے ہوئے زمانہ حال کے ادب کے بارے میں کوئی بات کہہ دیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہو چکا ہے۔

"قاسم کی مہندی" سید قاسم محمود کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا عنوان اسی نام کی ایک کہانی سے لیا گیا ہے۔ کہانی میں مہندی کا تعلق سید قاسم محمود سے نہیں ہے، نہ اس کا تعلق کہانی کے مرکزی کردار قاسم سے ہے جو سولہ برس کا ایک مذہبی جوش رکھنے والا لڑکا ہے۔ بلکہ یہ وہ مہندی ہے جو ہماری بعض مذہبی روایات کی اہم رسومات میں سے ہے:

ان میں بیوہ حسن کی یوں پکاری میرے قاسم کی آتی ہے مہندی

اس کی علامت کتاب کے گردپوش پر بھی بنی ہوئی ہے، لیکن اس کی طرف پڑھنے والے کا خیال بعد میں جاتا ہے۔

مختصر افسانے کو مشرق و مغرب کے اہل فن نے ادب کی مشکل ترین اور نازک ترین صنف قرار دیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ مختصر افسانے میں ایک بہت ہی چھوٹے سے فریم کے اندر ترتیب واقعات، کردار نگاری اور کہانی کہنے کی تکنیک — ان تینوں چیزوں سے کام لے کر زندگی کا ایک ایسا عکس پیش کیا جاتا ہے جس میں انسانی کردار اپنے تمام خدوخال اور اپنی انفرادیت کے ساتھ اپنے گردوپیش میں سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اور افسانہ اصل زندگی سے کٹا ہوا ایک زندہ اور تھرکتا ہوا ٹکڑا لگتا ہے۔ ان کی رائے میں کچھ چیزیں مختصر افسانے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، اور وہ ہیں: مشاہدے کی گہرائی، انسانی نفسیات کا علم اور بیان میں اکانومی! وہ کہتے ہیں کہ مختصر افسانے میں ایک افسانہ نگار ایک فقرہ، بلکہ ایک لفظ بھی زائد از ضرورت نہیں لکھ سکتا، ورنہ اس کی کہانی میں وحدتِ تاثر کا مجروح ہونا یقینی ہے۔ اس کی کہانی کا مجموعی تاثر کہانی کے پہلے جملے سے ہی شروع ہو جاتا ہے، اور اسی کو سامنے رکھتے ہوئے کہانی آگے بڑھتی ہے۔

لیکن سید قاسم محمود کے یہ افسانے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مختصر افسانہ کوئی خاص مشکل فن نہیں ہے۔ نہ یہ ادب کی کوئی ایسی صنف ہے جس کے لیے فنی پختگی، محنت، کاوش اور احتیاط جیسے تکلفات (اہل فن کے خود اپنے اوپر عائد کردہ تکلفات) لازماً برتے جائیں۔ وہ افسانے کی اس نام نہاد کٹھن اور پرپیچ وادی میں یوں بے فکری سے داخل ہوئے ہیں جیسے ٹہلتے ٹہلتے کسی گلستاں میں آ نکلے ہوں۔ انہوں نے مغرب و مشرق کے اہل نظر کی اُن تمام تھیوریوں کا مذاق اُڑاتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ افسانہ نگاری کے لیے فقط دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک خود اعتمادی اور نڈرپن، دوسرے زبان و بیان کا رواں دواں انداز! — ایک عجیب لاابالی پن اور خود اطمینانی کی کیفیت اُن کے اِن تمام افسانوں میں جھلکتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں، اور لکھتے ہوئے ٹھہر کر کچھ سوچنے اور تصور کو زحمت دینے کی انہیں کبھی ضرورت ہی لاحق نہیں ہوتی۔ اظہار و بیان کا ایک سیلاب امڈا چلا آتا ہے، جس کے آگے فکر اور سوچ کا کوئی بند باندھنا ناممکنات میں سے ہے!

ان کا افسانہ "عشقِ حقیقی" حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے ایک مردِ خدا کا قصہ ہے، جس کے پاس حضرت موسیٰؑ یہ دعا منگوانے کے لیے جاتے ہیں کہ سرزمینِ مصر سے قحط کا عذاب ٹل جائے۔ وہ بزرگ دعا کرتے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں ان کی یہ دعا قبول ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا وصال ہو جاتا ہے۔ کہانی کے آغاز میں مصر کے اس قحط کا جو حال بیان ہوتا ہے وہ ذرا کلیجہ تھام کر سننے کی چیز ہے:۔

"…. بارش کی ایک بوند تک آسمان سے نہ برسائی گئی اور سختی کی یوں ہوا کہ زمین کے اندر تک سے پانی کی ایک ایک بوند نچوڑ لی گئی۔ دریاؤں اور جھیلوں اور تالابوں کا پانی خشک ہو گیا۔ مینڈک اور کچھوے اور مچھلیاں غائب ہو گئیں۔ گیہوں اور جَو اور باجرہ ناپید ہو گیا۔ انگور اور سنگترے اور زیتون اور انجیر کے باغات اجڑ بیابان ہو گئے۔ مٹی تپ کر تانبہ ہو گئی اور بھربھری ریت میں زندگی کا رس ہی نہ رہا۔ جڑی بوٹیاں اور پودینہ اور سونف اور زیرہ اور زعفران ترس ترس کر مر گئیں۔ اور گھاس کی پتیاں لرز لرز کر جدا جدا ہو گئیں۔ گلاب اور چنبیلی اور موسری اور موتیا کے پھول مرجھا مرجھا کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ہاتھی اور گینڈے

اور چیتے اور شیر چاروں طرف گھبرائے گھبرائے پھرے اور آہستہ آہستہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ سانپ اور بچھو اور کنکھجورے اور کیڑے کوڑے اور چیونٹیاں رینگتے رینگتے لیامیٹ ہو گئیں۔ بطخیں اور مرغابیاں اور مینائیں اور کبوتر غول در غول اڑے اور سوکھ سوکھ کر گرتے گئے۔ چڑیاں ٹڈیاں اور شہد کی مکھیاں آپ ہی آپ چرمر ہو کر رہ گئیں۔ گائیں اور بھینسیں اور بھیڑیں اور بکریاں منمنائیں، چیخیں اور چلائیں اور چلاتی ہی رہ گئیں۔ مرد اور عورتیں۔ بچے اور بوڑھے، امیر اور غریب، تندرست اور بیمار، سب کے سب بلبلانے لگے، بستیاں اور دیہات، قصبے اور گلیاں اور کوچے ویران ہو گئے .....

اس سے آگے نہ مجھ میں نقل کرنے کی تاب ہے، نہ غالباً آپ میں سننے کی تاب ہوگی۔ کیسا بھیانک اور دردناک نقشہ ہے ملک فراعنہ کے قحط کا! سید قاسم محمود کو قدرت کی طرف سے ذخیرۂ الفاظ کی جو فراوانی عطا ہوئی ہے وہ قابل رشک ہے لیکن ہم ان کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ خدارا قارئین کے جذبات کا بھی کچھ خیال رکھا کریں۔ اُن پر صبر و ضبط کا اتنا ہی بوجھ ڈالا کریں جتنا وہ سہار سکیں۔ میری تو آنکھوں میں آنسو ڈھلک آئے جب میں نے یہ تصور کیا کہ کس طرح بیچارے ہاتھی اور گینڈے اور چیتے اور شیر چاروں طرف گھبرائے گھبرائے پھرتے ہوں گے۔ اور پھر بطخوں اور مرغابیوں اور میناؤں کے سوکھ سوکھ کر گرنے کا منظر! اللہ اکبر! ـــ ہمارا خیال ہے افسانے کی طرح قوت بیانیہ کو بھی سید قاسم محمود سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لینی چاہئیں۔

لیکن پڑھنے والے کو اس سارے المیہ میں سے گذرنے کا انعام بھی کہانی کے آخر میں ملتا ہے۔ وہ یوں کہ جب اس بابا کی دعا قبول ہوتی ہے اور آسمان سے پانی برسنے لگتا ہے، تو اتنی ہی تفصیل اور جزئیہ نگاری کے ساتھ زندگی کے لوٹنے کا منظر اسے دکھایا جاتا ہے۔ جس میں ہاتھی، گینڈے، چیتے، شیر، لگڑ بگڑ، سانپ، بچھو اور کنکھجورے، کیڑے، مکوڑے اور چیونٹیاں ـــ بطخیں، مرغیاں، مینائیں، الّو اور گدھ ـــ غرض اوپر کے پیراگراف والے تمام چرند پرند حیوانات، نباتات اور حشرات الارض پھر سے جی اٹھتے ہیں" اور زمین کی چھاتی پر روندنا نے لگتے ہیں" اور "گاؤں در گاؤں، قریہ در قریہ، کوچہ بہ کوچہ، مشرق تا مغرب، زمین تا آسمان، زندگی ہی زندگی، نور ہی نور، خدا ہی خدا چھایا ہوا، ہوتا ہے ـــ یہاں پہنچ کر پڑھنے والے کا مرجھایا ہوا دل بھی ساتھ ہی کھل اٹھتا ہے اور اس کے چہرے پر ایک ملکوتی تبسم نمودار ہوتا ہے!

زبان و بیان کی روانی بھی اپنی جگہ ایک اعجاز ہے جو ایک افسانے کی اثرانگیزی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے لیکن یہ چیز ہر کہ و مہ کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ یہاں مثلاً تصور کیجیے کہ مشہور امریکی افسانہ نگار ارنسٹ ہیمنگوے ہوتا اور اسے مصر کے اس قحط کا نقشہ کھینچنا ہوتا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کا مفلس ذخیرۂ الفاظ اور اس کی اختصار نویسی اس منزل میں دو قدم بھی چل سکتی؟ جہاں تک اس نمونے کی منظر کشی کا تعلق ہے ہم تو انگریزی کے سمرسٹ مام کو بھی سید قاسم محمود کے سامنے کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ چاہے اس پر کوئی خفا ہی کیوں نہ ہو! ہم نے مام کے کسی افسانے میں اس طرح کی منظر نگاری نہیں دیکھی۔

کردار نگاری کے باب میں سید قاسم محمود کا نقطۂ نظر بالکل غیر روایتی اور اوریجنل ہے۔ ان کے نزدیک انسانی شخصیت اور اس کا کردار کوئی اٹل اور محکم چیز نہیں ہے کہ اس میں ہمیشہ ایک استقامت اور یکساں روی نظر آئے بلکہ وہ بوقلموں ہوتا ہے اور مختلف حالات میں مختلف رنگ اختیار کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ مثلاً ایک بیوی اگر ایک شام کو اپنے مایوس اور پژمردہ شوہر کے حق میں امید اور روشنی کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہے اور اسے خدا پر توکل کرنے کا راستہ دکھاتی ہے، تو دوسری ہی شام کو وہ اُس کا منہ بھی نوچ سکتی ہے اور ایک ماہ بعد اُسے گھر سے نکل جانے کا حکم بھی سنا سکتی ہے ـــ جیسے حالات، ویسا رویہ! یہ کیفیت ان کے افسانے "شہر آشوب" میں بوضاحت دیکھی جا سکتی ہے۔ "شہر آشوب" شاہ عالمی کے باہر چھتیس برس تک ایک گول گپے بیچنے والے کی داستان الم ہے۔ جسے کمیٹی کا عملہ اپنی جگہ سے اٹھا دیتا ہے۔ چنانچہ وہ بہت مایوس اور دل شکستہ گھر آتا ہے اور اہل و عیال کو اپنی بپتا سناتا ہے۔ اس کی بیوی یہ سن کر کمیٹی والوں کو کوسنے

لگتی ہے۔ لیکن اس کی بیوی؟ سبحان اللہ!

بیوی نے بیٹی کو ڈانٹ پلائی۔ شوہر کو حوصلہ دیا کہ کوئی آدمی فاقوں کبھی نہیں مرا۔ اللہ میاں ایک در بند کرتا ہے تو ہزار کھول دیتا ہے اور ساتھ ہی اتنی روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے جو اس نے بچا بچا کر جوڑ جوڑ کر جوڑ رکھے تھے،

وہ ان پیسوں سے گول گپوں کا ایک نیا چھینکو تیار کرتا ہے اور دوسرے ہی دن داتا دربار کے نئے ماحول میں بیچنے کے لئے لے جاتا ہے لیکن یہاں اس کی بکری معمول سے بہت کم ہوتی ہے۔ وہ مایوس ہو کر وقت سے بہت پہلے ہی گھر چلا آتا ہے اور میاں بیوی کے درمیان یوں گفتگو ہوتی ہے۔

"بیوی نے حیرانی سے کہا: ابھی سے کیوں چلا آیا؟ ابھی تو پورا چھینکو بھرا ہوا ہے۔ اس نے کہا: مجھ سے نہیں بکتے بکتے یہ: بیوی ہنس پڑی: واہ یہ بھی خوب رہی، تو نہیں بیچے گا تو اور کون بیچے گا۔ کیا میں نے کوئی اور دھکا ٹھیکہ کر رکھا ہے۔ وہ جھنجھلا کر تڑ دنا اور چھینکو اٹھا کر پھر گھر سے نکل گیا۔"

گول گپوں کو چھوڑ کر وہ بے چارا دوسری چیزوں میں قسمت آزمائی کرتا ہے۔ مالٹے، موسمیاں، مونگ پھلی، انگریزی مٹھائی کی گولیاں، پیسٹری، بسکٹ وغیرہ، لیکن کسی سودے میں اس کی بکری نہیں ہوتی (جب کسی کے بُرے دن آتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے) پورا ایک سال اسی طرح گزر جاتا ہے۔ آخر ایک دن دوپہر منہ لٹکائے گھر پہنچتا ہے۔ اب کے اس کی بیوی اور بھی اونچے سروں میں بولتی ہے:

"بیوی نے پوچھا: پیسے لایا؟ اس نے جھلا کر کہا: اندھی ہوئی ہے، کہاں سے لے آتا پیسے۔ مجھے کیا معلوم کہیں سے بھی لا۔ چوری کر، ڈاکہ ڈال بھیک مانگ، مگر پیسے لا کر دے، فاقہ تو برداشت ہو سکتا ہے، قرضہ برداشت نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا: تو بھاگوان! تیرا مطلب یہ ہے کہ میں گھر سے نکل جاؤں؟ بیوی نے کہا: ہاں میرا مطلب یہی ہے، ایسے غیرت والا ہے تو ابھی نکل جا گھر سے، اور اس کو ہے تو پانچ روپے لائے بنا یہاں نہ گھسیو۔" (بیوی اہلِ زبان ہے)

آگے چل کر افسانہ نگار ہمیں بتلاتے ہیں کہ یہ اس کی "محبت کرنے والی" بیوی ہے۔ وہ یوں کہ وہ بیچارا ان حالات سے "تنگ آکر خودکشی کا فیصلہ کر لیتا ہے، اور ریل کی پٹڑی کے درمیان چلنے لگتا ہے لیکن یکلخت اپنا ارادہ تبدیل کر لیتا ہے اور گاڑی صرف دو گز پر ہوتی ہے جب وہ چھلانگ لگا کر پٹڑی سے باہر جا کر گرتا ہے۔ اس وقت اُسے اپنے شہر کی جن جگہوں اور انسانوں کی یاد آتی ہے ان میں اس کی یہ محبت کرنے والی بیوی بھی ہے،

"..... اور یاں، راوی، شاہی مسجد، جہانگیر کا مقبرہ، اور شالامار باغ اور اس کی پیاری اکلوتی بیٹی، اور محبت کرنے والی بیوی، مدحسیکم اقبال حسین ..... اس کے قدم اور بھی تیز ہو گئے تھے۔"

"تانگے والے کی بیٹی" کے کردار کے بھرپور بیان کے لئے باقاعدہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں

اس کا نامۂ اعمال —

اس کی معاشیات — الف۔ روٹی۔ ب۔ لباس۔ ج مکان

اور اس کی زبان —

اس کی ثقافت — "جوڑی وار پاجامے کا تذکرہ اصل میں ثقافت کے تحت ہونا چاہئے تھا، لیکن خیر، اگر اس کا بیان تین بنیادی معاشی احتیاجات کے تحت ہو چکا ہے تو ایسا خاص ہرج بھی واقع نہیں ہوا، معاشیات اور ثقافت میں دیکھا جائے تو کوئی فرق بھی نہیں ہے لیکن اس کی ایک ثقافتی ضرورت ایسی بھی تھی جس کا معاشیات سے کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ اس کا معیار شعبۂ یقیناً اتنا بلند تھا کہ اس کی یہ ضرورت بآسانی پوری ہو سکتی تھی ..... وغیرہ وغیرہ"

۵ے دھکّے، المعنی یار آشنا

اس کا مذہب ــــ

اس کا جسم ــــ .... "رنگ گندم گندم، نقشہ نازک نازک، آنکھیں ہرنی کی سی بڑی بڑی برقی دار، بھویں باریک باریک اور نوک دار، ماتھا کشادہ کشادہ مسکراتا ہوا، دانت اُجلے اُجلے پاس پاس رکھے ہوئے سفید موتی کے سے۔ ناک ستواں ستواں، ہونٹ پتلے پتلے گلابی گلابی سے، اوپر والے ہونٹ کے پاس ہی کالا کالا موٹا سا مسّا، بدن دُبلا پتلا، اور لچکیلا، چھاتیاں گول گول ابھری ابھری جن کی گوری گوری سرمئی سرمئی دودھ بھری بھٹنیاں وہ بڑی بے تکلفی سے فقیروں تک کے سامنے بھی بچے کے منہ میں دے رکھتی ....."

اور اس کا مستقبل ــــ

اس طرح چوالیس صفحوں پر پھیلا ہوا یہ افسانہ مولانا مودودی کی تقریر کی طرح مرتب اور سائنٹیفک انداز میں باقاعدہ عنوانوں کے تحت چلتا ہے اور قاری کو ہر طرح سے محظوظ کرتا ہے.. فسانے کا افسانہ اور تقریر کی تقریر، جس میں معاشیات، ثقافت اور زبان وغیرہ کے مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ اسی افسانے میں بعض جگہ سید قاسم محمود ادیب سے زیادہ ایک مفکر لگتے ہیں اور ہمارے ثقہ نقاد ڈاکٹر محمد حسن کی یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ "قاسم کے افسانوں میں فکر و احساس کی تازگی اور توانائی ملتی ہے .... سید قاسم محمود در اصل افسانے میں تکنیک کے نئے نئے تجربے کرنے کے قائل ہیں۔ اسی طرح کا ایک انوکھا تجربہ انھوں نے اپنی کہانی "سات لڑکیاں" میں بھی کیا ہے جس میں ایک اُستانی کے ہاں پڑھنے والی سات لڑکیوں کا حال بیان کرتے کرتے افسانہ نگار ایک نجومی کی طرح اچانک ان کا مستقبل، بیان کرنے لگتے ہیں:

"عابدہ، اپنا سیپارہ نزہت کے حوالے کر کے اٹھی اور سیدھی باورچی خانے میں چلی آئی۔ سامنے کی چیزیں الماری میں ہیں۔ اور الماری کے آگے چرخا رکھا ہوا ہے۔ اس نے چرخا اٹھا کر چولہے کے پاس رکھ دیا۔ کل اسی وقت جب یہ چرخا اٹھائے گی تو اتفاق سے چرخا ہاتھوں سے چھوٹ جائے گا اور تکلا اس کے دائیں رخسار میں چبھ جائے گا۔ خون کا فوارہ پھوٹ بہے گا ...... پندرہ برس کے بعد ایک صحت مند گورا چٹا مزدور ان کے گھر میں قلعی کرنے آئے گا، اندر سیڑھیوں پر چڑھا ہوا، کمرے میں گذرتی ہوئی عابدہ سے جھاڑو مانگے گا۔ عابدہ اُسے جھاڑو تھمائے گی تو اوپر سے قلعی کی ایک چھینٹ عین زخم کے نشان پر آ پڑے گی۔ یہ انگلیوں سے چھینٹ صاف کرتے ہوئے مزدور کی طرف دیکھے گی اور اسے مسکراتا ہوا دیکھ کر خود بھی مسکرا دے گی۔ یہ مشترکہ مسکراہٹ مشترکہ زندگی گذارنے کے عہد و پیمان کی بنیاد بن جائے گی ......"

کہاں ایک سیپارہ پڑھنے والی عابدہ، اور کہاں ایک صحت مند گورے چٹے مزدور کے ساتھ، اس کی مشترکہ مسکراہٹ اور پھر ایک مشترکہ زندگی گذارنے کا عہد و پیمان! تقدیر بھی کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ سات لڑکیوں کے بارے میں افسانہ نگار کی ان سات پیشین گوئیوں کا "اخلاقی سبق" یہ نکلتا ہے کہ تقدیر کے کام واقعی نرالے ہوتے ہیں ــــ اس طرح سید قاسم محمود نے اپنے ان افسانوں میں تکنیک کے اتنے رنگا رنگ تجربے کئے ہیں کہ ہمارے خیال میں ممتاز شیریں کے لئے تکنیک کے تنوع پر ایک دوسرا مضمون لکھنا ضروری ہو گیا ہے۔

"قاسم کی مہندی" میں جو ٹائیٹل سٹوری ہے، افسانہ نگار نے ایک اور ہی تکنیک استعمال کرتے ہوئے کہانی کو آخر میں جا کر ایک ایسا ٹوسٹ دیا ہے کہ پڑھنے والا بھونچکا رہ جاتا ہے جیسے اس کی جیب کسی نے کاٹ لی ہو۔ کسی گاؤں میں باہمنوں کی ایک گلی ہے جس میں قدیم زمانے سے تعزیہ گذرا کرتا تھا لیکن جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد ہوا، ہندوؤں نے کہہ دیا کہ اب کے تعزیہ باہمنوں کی گلی سے نہیں گذرے گا۔ اس پر قاسم کے والد کاظم علی کو جوش آیا تو وہ اکیلا باہمنوں کی گلی میں گھس گیا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد اس کی لاش ہی وہاں سے واپس آئی۔ اس واقعے کے تین

ماہ بعد سولہ سالہ قاسم اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مہندی لے کر باہمنوں کی گلی میں چلا جاتا ہے۔ یہ خبر جب محلے میں مہندی گاتی ہوئی عورتوں تک پہنچتی ہے تو ہر طرف ایک کہرام برپا ہو جاتا ہے۔ پولیس والے اس کے پیچھے چلتے ہیں لیکن افسوس!

"چار پانچ سپاہی قاسم کو اٹھائے لا رہے تھے۔ ایک سپاہی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر، دھڑ تھاما ہوا تھا۔ دو سپاہیوں نے اس کی دونوں ٹانگیں، اور باقیوں نے جسم کے مختلف حصوں کو سہارا دے رکھا تھا۔ ... پیشانی سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ کپڑوں پر جگہ جگہ تازہ خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ناک بالکل پس گئی تھی۔ بازوؤں اور گردن پر گہرے زخم تھے...... ایک تجربہ کار اور مرتی ہوئی زندگی کے نبض شناس بڈھے شخص نے نبض ٹٹولی، اور مجمع کی طرف مایوس نظریں اٹھا کر بولا: اللہ کو پیارا ہوگیا۔"

اس شہید کی تجہیز و تکفین کے لئے اس کی چارپائی پہلے کربلا کے میدان میں لے جائی جاتی ہے۔ قبر کھودی جاتی ہے۔ قاسم کا دوست عابد فرطِ جذبات سے اچھل کر قبر میں جا لیٹتا ہے اور کہتا ہے "پہلے مجھے دفنا دو، میں اب کیسے جیوں؟" لیکن پھر فیصلہ ہوتا ہے کہ قاسم کا جنازہ اس کے گھر ہی سے نکلنا چاہیئے۔ چارپائی گھر لے آئی جاتی ہے۔ غمزدہ ماں آگے بڑھتی ہے: "اس نے چادر کا پلّو اٹھایا۔ خون میں لتھڑے ہوئے چہرے پر جلدی جلدی انگلیاں پھیریں۔ پھر گال پر ایک بوسہ دیا۔ میرا قاسم! قاسم! نہایت دھیمی آواز میں بولا: جی!

"یہ تو نے کیا کر لیا چاند؟ یہ کہہ کر اس نے قاسم کا سینہ ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ میں ٹھیک ہوں امی! قاسم نے اپنی نحیف آواز میں ماں کی ڈھارس بندھائی۔"

چارپائی پر لایا ہوا قاسم، جس کے متعلق افسانے کے سادہ لوح قاری کو ہر طرح یقین ہو چلا تھا کہ وہ شہید ہو چکا ہے، یکلخت زندہ ہو کر اپنی ماں کی ڈھارس بندھانے لگتا ہے ــــــ اسے کہتے ہیں تکنیک کا کمال! کہانی کے آخر میں سسپنس کی کیفیت پیدا کرنے کی یہ تکنیک سید قاسم محمود سے پہلے روس کے چیخوف نے استعمال کی تھی۔ ہمارے ایک نقاد کے بقول وہ بھی اپنے اکثر افسانوں میں ہمیں حیران چھوڑ کر ہم سے رخصت ہوتا ہے لیکن اس کے افسانے میں پھر کوئی معنی خیز اشارہ، کوئی گہری حقیقت چھپی ہوئی مل جاتی ہے جس سے افسانے کا انجام خود بخود ہمارے ذہن میں تشکیل پا جاتا ہے ــــــ سید قاسم محمود کے یہاں یہ حیران چھوڑنے والی کیفیت زیادہ بے رحم اور جرأت مندانہ ہے۔ اُن کے افسانے میں اُسی طرح کا کوئی معنی خیز اشارہ، کوئی گہری حقیقت تلاش کرنا آسان نہیں!

کتاب کی پشت پر ناشر نے ہم پڑھنے والوں کو آگاہ کیا ہے کہ "پریم چند سے آج تک مختصر افسانے کے جتنے بھی مجموعے چھپے ہیں، اور ان میں بھی وہ جو سب سے اچھے، ورا اونچے ہیں، ایسے ہی گنتی کے چند مجموعوں میں قاسم کی مہندی شامل ہے" سید قاسم محمود کا مقام اردو افسانے کی روایت میں تو متعین ہو گیا، جس کے لئے ہمیں محترم ناشر کا شکر گذار ہونا چاہیئے لیکن یہ زمانہ عالمی ادب کے تقابلی مطالعے کا ہے۔ کاش وہ ہمیں یہ بھی بتا دیتے کہ مغربی افسانے کی روایت میں سید قاسم محمود کے ان افسانوں کا مقام کہاں متعین ہوتا ہے، اور چیخوف، ٹالستائی، موپساں، سمرسٹ ماہم اور کافکا وغیرہ کے زمرے میں سید قاسم محمود کن کن پہلوؤں سے نمایاں اور منفرد نظر آتے ہیں، افسانوں کا یہ مجموعہ تو اب شائع ہو چکا، امید ہے ان کے اگلے مجموعے کی اشاعت کے وقت وہ ضرور اس معاملے پر روشنی ڈالیں گے۔

سید قاسم محمود لاہور کے ادبی حلقوں کی ایک مشہور و معروف شخصیت ہیں وہ ترجمہ اور صحافت کی منزلوں سے گذر کر ادب کی محفل میں آئے ہیں۔ وہ پہلے سیارہ ڈائجسٹ جیسے مقبول عوام رسالے کے مدیر تھے۔ پھر انھوں نے ماہنامہ "ادبِ لطیف" کی ادارت سنبھالی۔ اور وہ جو ایک کوشش شروع سے چلی آئی ہے کہ پڑھے لکھے عوام کے مذاق کو بلند کر کے، انھیں ادب سے بہرہ مند ہونے کے قابل بنایا جائے۔ تو اس کے برعکس انھوں نے ایک نئی تحریک یہ چلائی کہ خود ادب کو عوام کی سطح پر لا کر اسے ایک عام رواج کی چیز بنا دیا جائے ــــ اس تحریک میں انھیں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، ابھی ہم اس کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ "ادبِ لطیف"

کی پیشانی پر سے بھی ان کا نام غائب ہو گیا۔ غالباً وہ اپنا عصا اُٹھا کر کسی دوسری منزل کو چل دیئے! چلا چل جانب منزل ۔ ۔ ۔ ۔

حلقہ ارباب ذوق میں وہ کسی عہدے (غالباً جائنٹ سکریٹری) پر بھی فائز رہے اور ہم نے ایک مرتبہ ان کی زبانی حلقے کی روداد بھی سنی۔ پھر ہم نے انھیں اکثر حلقہ کے جلسوں میں مشہور و مسلّم ادبا کے پہلو میں بیٹھے اور ان سے سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھا جس سے ہمیں ان کے ادبی مرتبے کا کسی حد تک اندازہ ہوا ـــــــ اور اب ان کا یہ مجموعہ "قاسم کی مہندی" پڑھ کر تو ہم دم بخود ہی رہ گئے!

آخر میں ہم اپنے ثقہ نقاد ڈاکٹر محمد حسن کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے بروقت ہمیں ایک ستارے کے طلوع ہونے کی خبر سنائی۔ سیّد قاسم محمود کے بعد اب ایک نئے ستارے کے طلوع ہونے کی خبر وہ ہمیں کب دے رہے ہیں؟!

محمد کاظم

براہوی کی لوک کہانیاں

تالیف: انور رومان — اشاعت: قلات پبلشرز مستونگ (قلات)

صفحات: ۹۷ — قیمت: تین رُوپے پچھتر پیسے

ایک براہوی لڑکی اپنے بوڑھے باپ کے ہمراہ جاتے ہوئے بازار میں ایک کار کے پاس رکی، اور کار میں بیٹھی ہوئی ایک خوش وضع اور نازک اندام خاتون کو گھورنے لگی جس نے بیش قیمت لباس اور سونے کے جگمگ کرتے ہوئے زیورات پہن رکھے تھے۔ بوڑھے باپ نے یہ سمجھا کہ شاید اس کی بیٹی قیمتی کپڑوں اور زیوروں کی چمک دمک سے مسحور ہو گئی ہے۔ اس نے کہا، "زہبوا آگے چلو، اپنی چاندی دوسروں کے سونے سے بہتر ہے۔" اس لڑکی نے خاتون پر آخری نظر ڈالتے ہوئے معصومیت سے جواب دیا "بابا! میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس عورت کو خیمے میں رہنا پڑے، دودھ دوہنا اور بلونا پڑے، ریوڑ چرانا پڑے، پہاڑوں اور گھاٹیوں میں چڑھنا اترنا پڑے تو یہ بیچاری کیا کرے گی؟" ـــــــ ایک جنگلی اور دیہاتی لڑکی کا ایک دیوانہ سا سوال! اس کے بابا نے اس کا کیا جواب دیا ہوگا؟ وہ یہ خیال کرکے آگے بڑھ گیا ہوگا کہ اس کی زہبو کتنی بھولی ہے، کہ اس انداز میں سوچتی ہے!

تو خیمے میں رہنے والی، اور پہاڑوں اور گھاٹیوں میں اُچھلنے کودنے والی اس دوشیزہ کے نام براہوی لوک کہانیوں کی یہ کتاب معنون کی گئی ہے۔ یہ ایک خوبصورت اور برمحل انتساب ہے، جو ان کہانیوں کی دنیا میں داخل ہونے والے قاری کو متاثر کرتا ہے، اور وہ اپنے خیال میں ایک رومانی دنیا بسائے ان کہانیوں کی ولایت میں قدم رکھتا ہے۔

یہ براہوی لوک کہانیاں ہیں۔ براہوی کون لوگ تھے؟ کہاں سے آئے؟ اور ان کی تاریخ کیا ہے؟ اس بارے میں دس صفحات پر پھیلے ہوئے ایک دیباچے میں کچھ مختلف اور متضاد قسم کی آرا جمع کی گئی ہیں جن میں سے بیچ کی راہ یوں نکلتی ہے کہ براہوی پاکستان کے قدیم ترین قبائل میں سے ہیں، بلوچوں کا طائفہ اول بعد ان کی عام ہجرت سے بہت پہلے ایرانی حکومتوں کی لوٹ مار سے تنگ آکر اس سرزمین میں وارد ہوئے۔ چونکہ یہ کوہ البرز سے چلے تھے اس لئے مقامی لوگ انھیں برزکوہی پکارنے لگے، اور پھر یہ رفتہ رفتہ براہوی بن گئے۔ براہویوں نے پہلی مرتبہ میر عمر میروانڑی کے تحت سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں قلات میں ایک آزاد سلطنت قائم کی لیکن ان کی سلطنت کو چلانے میں بلوچی قبائل ہی دست و بازو بنے۔ اس لئے براہوی حکومت نے ان کے مفاد کو ہمیشہ عزیز رکھا اور ان کے زبان و ادب کی سرپرستی فرمائی۔

لوک کہانیوں کے متعلق کسی کو غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیئے۔ یہ کہانیاں ہمارے لکھے ہوئے افسانوں اور ناولوں سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ یہ پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ ایک داستان گو کی زبانی سننے کے لئے ہوتی ہیں۔ ان کے مصنف کوئی زید یا بکر نہیں۔ بلکہ وہ سب افراد ہوتے ہیں جن کی زبانوں پر سے ہوتی ہوئی یہ

ارتقاء کی جانب اپنا سفر جاری رکھتی ہیں اور اس حالتِ انتقال میں برابر منجھتی اور سنورتی چلی جاتی ہیں۔ ان کہانیوں میں ابدی سچائی اور عملی زندگی کی کہانی ملتی ہے۔ انسانوں کی نفسیات کا بیباک اظہار دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ کہانیاں بعض اوقات واقعیت سے بہت دور جا پڑتی ہیں لیکن ان کا تعلق ان لوگوں کی جذباتی زندگی سے بہت قریبی ہوتا ہے جو ان کی تخلیق کرتے اور ان میں اپنے تخیل کا رنگ بھرتے ہیں۔ تخیل کی یہ رنگ آمیزی اس طرح سے کی جاتی ہے کہ کہانی باوجود ایک فینٹسی ہونے کے پُر اثر اور یقین دلانے والی ہوتی ہے جس میں انسانی کمزوریاں اور انسانی مزاج کی خصوصیات صاف جھلک اٹھتی ہیں۔

اس مجموعے میں سب سے پہلی کہانی جگ بیتی چار مزدوروں (نجار، صراف، خیاط اور درویش) کی کہانی ہے جو تلاشِ روزگار کے لئے گھر سے نکلتے ہیں اور راستے میں ایک سنسان صحرا میں پہنچتے ہیں۔ صحرائی ڈاکوؤں کے ڈر سے وہ باری باری پہرہ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے نجار کی باری آتی ہے۔ جب تنہائی کے لمحات اس پر بوجھل ہونے لگتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے ایک حسین دوشیزہ کی تصویر گھڑتا ہے اور اس کی پوری مورت بنا ڈالتا ہے۔ اس کے بعد صراف کی باری آتی ہے۔ وہ اس تراشی ہوئی چوبی دوشیزہ کو زیورات سے آراستہ کرتا ہے۔ پھر خیاط اٹھتا ہے اور اس مورت کو لباس پہنا کر اس کی ظاہری شخصیت کی تکمیل کر دیتا ہے اور جب آخر میں درویش کی باری آتی ہے تو وہ اپنے پیشرؤوں کا یہ کارنامہ دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے اور خالقِ اعظم کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر دعا کرتا ہے کہ اس بے جان مورت میں اپنے حکم سے روح ڈال دے۔ اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔ اور وہ بے روح دوشیزہ سب کے سامنے سانس لینے اور چلنے پھرنے لگتی ہے ــــ اس پر ان چاروں میں تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر ایک یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ عورت میری ہے کہ اس کی تخلیق میں میرا حصہ سب سے بڑھ کر ہے جب یہ جھگڑا طول پکڑتا ہے تو چاروں ایک کوتوال کے پاس جاتے ہیں۔ عورت کی شکل دیکھ کر کوتوال کی رال ٹپک پڑتی ہے۔ اور وہ چلا اٹھتا ہے: ابے او لفنگو! یہ تو میرے مرحوم بھائی کی بیوی ہے، جس کا اب اس دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں۔ یقیناً میرے بھائی کو بھی تمہی نے قتل کیا ہوگا، وہ ان سب کو بادشاہ سلامت کے پاس لے چلتا ہے تاکہ انھیں اپنے کئے کی سزا دلوائے۔ بادشاہ سلامت جب اس دوشیزہ کو دیکھتے ہیں تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں، اور وہ بمسرت یہ اعلان فرماتے ہیں کہ یہ تو ہماری خادمہ ہے جو ہمارے جواہرات چرا کر بھاگ گئی تھی۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ سب مال تم نے اس سے چھین رکھا ہے۔ میں ابھی تم سب کو کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہوں۔ لے جاؤ ان سب بدمعاشوں کو! ان کے پیٹ چاک کر دو، ان کو زمین میں گاڑ دو، ان کو......

یہ ایک فینٹسی ہے لیکن کتنی حقیقت آمیز! اور عورت کے معاملے میں ایک مرد کی فطری کمزوری پر کتنی کٹیلی طنز! مرد کی یہ کمزوری ازل سے اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اور آج بھی جبکہ ہر طرف تہذیب و ثقافت اور شرافت و اخلاق کی دھوم ہے، وہ اپنی اس کمزوری پر غالب نہیں آ سکا۔ اس فینٹسی کو حقیقت کے روپ میں آپ نے اپنے گرد و پیش میں ضرور کہیں دیکھا ہوگا۔ کیا آپ کے مشاہدے میں کوئی ایسی نوخیز دوشیزہ نہیں آئی جس کے متعلق ایک سے زیادہ افراد میں سے ہر ایک کو یہ خیال ہو کہ وہی اس کے زیادہ قریب، اور اس کی شخصیت کو ابھارنے اور نکھارنے والا ہے ــــ اس لڑکی کے گھر میں آنے جانے والا ایک منہ بولا ہمسایہ، کالج میں اس کا مہربان ٹیوٹر، اس کے دور کے رشتے کا ایک عم زاد، اور اگر وہ کسی ادارے میں کام کرتی ہے تو اس ادارے کا باس، اور پھر سرِ راہے ملنے والا ایک لائق اور معزز ملاقاتی! ــــ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتا ہے کہ اس گلعذار کی شخصیت کی تکمیل میں اسی کا حصہ سب سے اہم اور اس لئے اس کی توجہات پر اسی کا حق سب سے فائق ہے۔ [illegible] بالکمال اس کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ پردۂ غیب سے ایک چھٹا آدمی، جو اپنے ذرائع اور اثر و نفوذ میں ان سب سے برتر ہوتا ہے (کہانی کا بادشاہ سلامت) اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتا ہے، اور یہ بے چارے پسماندگان اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں اور اپنے تئیں یوں محسوس کرتے ہیں،

جیسے وہ اس لوک کہانی کے مجرم اور سزا یافتہ افراد ہوں!

نمائندہ کردار کے تحت اس طرح کی ساتھ سچائیاں ان لوک کہانیوں میں اور دنیا کی کسی بھی زبان کی لوک کہانیوں میں ہمیشہ پائی جائیں گی۔ ان کہانیوں میں اگر کوئی فرق ہوا کرتا ہے تو یہ کہ ان کے انداز و بیان میں وہ گہرائی، وہ نزاکت اور صفائی نہیں ہوتی جو ایک کتابی ادب یا ادبِ عالیہ میں ہوا کرتی ہے۔ ان کا انداز بیان بالکل ڈائرکٹ اور عامیانہ، اور بعض اوقات سوقیانہ ہوتا ہے۔ ان میں زبان کی نفاستیں اور تصور و خیال کی جولانیاں نہیں ہوتیں۔ ہاں کبھی کبھی ایسا اتفاق بھی ہو جاتا ہے کہ ان کہانیوں کو بھی معیاری لب و لہجہ اور شستہ زبان میسر آ جاتی ہے جیسے عربی زبان کی الف لیلہ کی بعض کہانیوں میں ہم دیکھتے ہیں۔ جب ایسا ہو جائے تو پھر ان کہانیوں کا جادو بے مثل ہوتا ہے۔ پھر ان کا مقابلہ ہمارے افسانوی ادب کا بڑے سے بڑا شاہکار بھی نہیں کر سکتا!

بروہی کی ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ایک چیز البتہ کھٹکتی ہے جس کا اظہار ہم خلوص و ہمدردی کے جذبے سے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ ان کہانیوں کو اردو کا جامہ پہناتے وقت کچھ زیادہ ہی تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ یہ کہانیاں اردو میں آ کر اپنی اس سادگی اور جنگلی پن سے عاری ہو جاتی ہیں جو ایسی کہانیوں کا خاصہ ہوا کرتا ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ ان کہانیوں کو اردو میں منتقل کرتے وقت ان کے داستانی طرزِ بیان، ان کے انوکھے پن، اور سادہ اور قدرتی اسلوب کو جوں کا توں رہنے دیا جاتا! جنگل کی ایک خانہ بدوش دوشیزہ شہر کے پُرتکلف لباس میں آپ کو کبھی بھی مطمئن نہیں کر سکتی۔ اس لباس میں اس کی ساری شخصیت دب جاتی ہے۔ وہ نہ شہر کی مخلوق رہتی ہے نہ جنگل کی۔ یہ صورت حال ان کہانیوں میں جگہ جگہ پیش آتی ہے۔

مثلاً اسی کہانی میں جب چوتھا آدمی ـــ درویش ـــ بیدار ہو کر اپنی ڈیوٹی پر آتا ہے تو وہ خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے:

سبحان اللہ! الحمد للہ! اللہ اکبر! دکھائی دیتا ہے، اندھیرے کی دنیا ختم ہو رہی ہے۔ یہ دن کی چکا چوند کا پیش خیمہ ہے۔ صحرائی پرندے فضا میں نغمے بکھر رہے ہیں، اور صحرا کی وسیع آغوش میں وقت کے پھول کھل رہے ہیں۔ خوشبوئیں تیر رہی ہیں۔ ایسے وقت آ، او کاہل انسان! اٹھ جا، اور خدائے قدوس کے سامنے سجدہ ریز ہو جا جو اس عجیب کائنات کا خالق ہے . . .

اب اس طرح کی فاضلانہ خود کلامی ایک لوک کہانی میں بہت عجیب لگتی ہے۔ لوک کہانیوں کے کردار اول تو خود کلامی نہیں کرتے۔ اور اگر کبھی ان کے منہ سے کوئی جملہ تنہائی کے لمحات میں نکل بھی جاتا ہوگا تو بہت سادہ اور بے تکلف انداز میں! ـــ تاہم لوک کہانیوں کی وہ جو اپنی شخصیت ہوتی ہے وہ اس پُرتکلف لباس میں بھی اپنی جھلکیاں دکھاتی رہتی ہے اور ایک ذہین قاری ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے جب اپنے تصور میں ان کا یہ لباس اتار دیتا ہے، تو ان کا عریاں حسن اسے مسرور کئے بغیر نہیں رہتا!

بروہی کی ان لوک کہانیوں کے مؤلف انور رومانی صاحب ہیں جو پہلے گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ اب گورنمنٹ کالج جنڈی گھیپ میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا یہ کہانیاں روزنامہ "امروز" میں چھپی تھیں اور پسند کی گئی تھیں۔ اب قلات پبلشرز نے انہیں کتابی صورت میں جمع کر کے شائع کیا ہے۔ بلوچوں اور بروہیوں کے عوامی ادب کی ترقی اور نمو کے لئے یہ کوشش یقیناً مبارک ہے اور امید ہے قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

محمد کاظم

بلوچی لوک گیت

ترتیب و ترجمہ: عطا شاد، مین سلام
صفحات: ۱۴۲

اشاعت: قلات پبلشرز، مستونگ
قیمت: ۵۰ء۲ روپے

مغربی پاکستان کی علاقائی زبانوں میں ہم نے ابھی تک پشتو، سندھی، پنجابی اور سرائیکی زبانوں کا چرچا سنا تھا۔ لوک گیتوں کی اس کتاب سے ہمیں

معلوم ہوا کہ خشک پہاڑوں، وسیع چٹیل میدانوں کی سرزمین — بلوچستان — میں بولی جانے والی ایک زبان بلوچی بھی ہے کہ جس کا اپنا ادب اور اپنے لوک گیت ہیں — شادی بیاہ کی مسرتوں میں گائے جانے والے گیت، نعت اور حمد کے گیت، جو بچے کی پیدائش پر عورتیں مل کر گاتی ہیں۔ لوری کے نغمے جن کے ذریعے بلوچ مائیں اپنی نئی نسل میں مردانگی کے جذبات پیدا کرتی ہیں، ہجر و فراق کے، دکھڑے، چرواہوں کے گیت، ورسوگ اور ماتم منانے کے گیت — غرض، اس زندگی کے سارے رنگوں، اور جذبات کی سب حالتوں سے متعلق گیت جن میں بلوچی کردار اور تہذیب کی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ان میں ایک گیت "سوت" کہلاتا ہے جو شادیوں میں گایا جاتا ہے اور جس میں مرد اور عورتیں ناچتے اور تالیاں بجاتے ہوئے کہتے ہیں:

او ستارہ سری:

سر کنے ، قبر کنے

داب مجب تہر کنے او ستارہ سری!

یعنی اے سلمہ ستارہ والے مزین دوپٹے والی!

تیرا جوبن سنگار اور میرے لیے؛

اک قبا ہے تیری کمر پڑی

اے ستارہ سری!

تیرے ہاتھوں کی مہندی دلفریب رنگ

اور زلفیں گھٹاؤں کی جادوگری

اے ستارہ سری!

یہ گیت دولہن کے بارے میں دولہا کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ بلوچوں میں قبائلی تہذیب کی خصوصیات ابھی تک باقی ہیں جن میں مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہوتی ہے اور عائلی زندگی میں عورت ہمیشہ مرد کے زیرنگیں رہتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ شادی کے دن ممنونیت اور تحسین کے اس گیت کا گانے والا دولہا کو اپنی آنے والی گھریلو زندگی میں کبھی پچھتانا نہیں پڑے گا اور ستارہ سری اپنے دوسرے روپ میں ظاہر ہو کر اس کا جینا ناس نہیں کرتی ہوگی۔

سوت، لاڑوگ، ہالو، سپت، لولی، .... یہ بلوچی گیتوں کی کچھ اقسام ہیں، جن کے ذیل میں زیادہ مقبول عام گیت اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں۔ لولی اردو کی لوری ہے جس میں ایک بلوچی ماں اپنی اس آرزو کا اظہار کرتی ہے کہ میرا لال بڑا ہو کر ہاتھ میں تلوار سنبھالے گا اور اپنے حریفوں سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے گا۔ جب ایک بلوچی ننھا لال کو ماں کی لوری میں ہی یہ فریضہ سپرد ہوتا ہوگا تو آپ ... کہ اس کی شخصیت کی نشوونما کس ڈھب پر ہوتی ہوگی اور وہ کس قسم کے ارادوں اور حوصلوں کے ساتھ اس زندگی میں قدم رکھتا ہوگا۔ ہمارے اور آپ کے نزدیک بلوچی کردار کا یہ رخ شاید زیادہ محبوب اور دل بھانے والا نہ ہو، لیکن قبائلی تہذیب میں افراد کی تربیت اور اٹھان ہمیشہ اسی نہج پر ہوا کرتی ہے۔ اس لوری میں ایک بلوچی ماں کا حوصلہ اور جذبہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

میرے لال!

بیٹے!

اگر جنگ میں تو بھی کام آ گیا

تب دلہن کی طرح سج کر تیرے نام پر گاؤں گی (ہالو: شادی بیاہ کا گیت)

ایک تجھ سا جیالا سپوت اور دوں گی جنم
مجھ کو موتک سے کیا واسطہ،   (موتک: سوگ کا گیت، مرثیہ)
اے میرے لاڈلے!
میرے دل کے سہارے!

یہ انسان کی اولین تہذیب کی کوئی لوری لگتی ہے۔ اُس زمانے کا گیت جب انسان پر موت کا خوف اس قدر غالب نہیں آیا تھا۔ تہذیب و تمدن نے جہاں اور بہت سی چیزیں دی ہیں، وہاں زندگی سے پیار اور موت کی دہشت بھی عطا فرمائی ہے۔ ایک متمدن اور شہری ماں کے لئے اپنے جوان بیٹے کی موت کا تصور بھی ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ وہ کبھی اس کا ذکر زبان پر نہیں لا سکتی لیکن بلوچی ماں کہتی ہے اگر ایسا ہو بھی گیا، اور اے میرے لال! تو اگر قبیلے کی کسی جھڑپ میں کام آ بھی گیا (ظاہر ہے کہ اس لوری میں اس جنگ کا تصور نہیں ہے جو ملک کی سرحدوں پر لڑی جاتی ہے) تو میں پھر سے دلہن بن کر شادیانے کے گیت گاؤں گی اور تجھ جیسا ایک اور جیالا سپوت جن کر اپنی قوم کے حوالے کروں گی۔

اس لوری کے بعض جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلوچی عورتوں اور مردوں کی جنسی صحت بہت دیر تک برقرار رہتی ہوگی۔ جنسی صحت کا دار و مدار انسان کی عام صحت اور توانائی پر ہوتا ہے اور قبائل میں جس طرح کی آزاد اور فطری زندگی بسر کی جاتی ہے۔ اس میں یہ کوئی بڑی چیز نہیں ہوگی کہ ایک سن رسیدہ ماں اپنے جوان اور جنگجو بیٹے کی موت پر پھر سے تخلیق اور تربیت کی وہ ساری مشقتیں جھیلنے پر تیار ہو جائے اور مرنے سے پہلے اپنے قبیلے کو ایک دوسرا جوان اور سورما بیٹا دے کر جائے۔

بلوچی لوک گیتوں کی سب سے مقبول صنف "سوت" بھی ہے جو شادی بیاہ اور دوسری پر مسرت تقریبوں میں گایا جاتا ہے۔ اس کے ایک گیت میں ایک لڑکے اور لڑکی کے درمیان ایک دلچسپ نزاع منظوم مکالمے کی صورت میں دیکھنے میں آتا ہے۔ لڑکی ایک اونچائی پر ہے لڑکے سے کہتی ہے کہ مجھے اس بلندی سے اتار دو۔ لڑکا جواب میں کہتا ہے، میں اتار تو دوں گا لیکن مجھے اس کا بدلہ کیا ملے گا، لڑکی کہتی ہے میں تجھے اپنا یہ ہار یا اپنے ہاتھوں کا یہ کنگن دے دوں گی۔ لڑکا کہتا ہے:

مجھے ہار یا تیرے ہاتھوں کے کنگنے سے کیا واسطہ!
میں تو شیدا ہوں نازک کٹار ایسی ناک اور جھنکار تے گیسوؤں کا

لڑکی — کٹار ایسی ناک اور لہراتی زلفوں کو پانا
اس قدر کیوں ہے آسان جانا؟
میں ترے ہاتھ کب آؤں گی، میں تو چھپ جاؤں گی
اونچی ٹہنی کے پتوں میں بن کر ترنج

لڑکا — چاٹ جاؤں گا بن کر پہاڑی مج
سبز پتوں کا جھنڈ!

لڑکی — اور اگر میں بسنے لگوں دامن کوہ میں بن کے ہلکی پھوار؟

لڑکا — اگر پہاڑی ہرن بن کے پی جاؤں گا آبِ شیریں تیرا!

لڑکی — اور اگر جوار کا دانہ بن جاؤں میں

جو پڑا ہے کسی خشک میدان میں!

لڑکا — بن کے صحرا کا پنچھی اُچک لوں گا میں

اسی طرح چلتے چلتے آخر لڑکی کہتی ہے :

اور اگر بن کے میں ایک پڑیا سرِ نوشتہ پر بندھ گئی!

تو بتاؤ کہ پھر کیا کرو گے؟

لڑکا — تو میں ایک گاہک بنوں گا، تجھے دام دے کے عوض مانگ لوں گا!

ایک گاہک بن کر محبوبہ کو دام دے کر پانے کا یہ خیال کتنا اچھوتا اور دلکش ہے! اگر فی الواقعی اصل بلوچی گیت کے بول بھی یہی ہیں جس کا متن ساتھ دیا ہوا ہے، تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بلوچی ایک ذہین اور نازک خیال قوم ہیں۔ خیال کی ایسی لطافتیں عام طور پر لوک گیتوں میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

بلوچی لوک گیتوں کا یہ مجموعہ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس کے ایک صفحہ پر بلوچی متن ہے، اور دوسرے صفحے پر اردو میں اس کا منظوم ترجمہ۔ شعر کا شعر میں ترجمہ بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں اصل کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنا ایک بے حد دشوار اور بعض اوقات ناممکن چیز ہوتی ہے لیکن اس کا ایک فائدہ ایسا ہے کہ اس کی خاطر یہ ساری جوکھم مول لی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ترجمہ میں اصل کا سا [illegible] اور آہنگ کسی درجے میں بھی پیدا کر دیا جائے، تو اس سے ایک اجنبی قاری پر بھی وہ جذباتی کیفیت طاری ہو سکتی ہے جو اصل گیت میں موجود ہے۔ لوک گیتوں میں بنیادی چیز تال اور دھن ہوتی ہے جو گانے والوں کے جذبات کا اظہار ہوتی ہے۔ گیتوں کے الفاظ ثانوی درجہ رکھتے ہیں اور ان میں فکر و معنی کا عنصر برائے نام ہوتا ہے۔ اس لئے ان گیتوں کا سیدھا سادا نثری ترجمہ کرنے میں اس بات کا احتمال ہو سکتا ہے کہ ترجمہ شدہ گیت ایک بالکل ہی سپاٹ اور بے کیف چیز بن کے رہ جائے۔ بلوچی گیتوں کا زیرِ نظر ترجمہ بحیثیت مجموعی اچھا اور شعری خوبیوں کا حامل ہے۔ البتہ کہیں کہیں اس میں تکلف اور کوشش کی نشاندہی ضرور ملتی ہے۔ مثلاً سوت کے ایک گیت میں عاشق اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:

بیائے شپ ءُ نیم ءَ	ڈھونڈتے ہیں میری راتوں کی تنہائیاں تجھے
نندے منی دیم ءَ	اے چاند آ بھی جا کہ یہ دل کی لگی بجھے
گرہ سرائے تو	کرہ و دمن بھی کرتے ہیں تیرا ہی انتظار
گرہ تہائے تو	تو کھو گئی کہاں میری روٹھی ہوئی بہار
بلبل نالاں گوں شاں دل ءِ حال	ہیں بلبلیں بھی نالہ کناں لے گلِ وفا
من تئی گناہ چہ کتہ؟	کیا ہے میری خطا؟

ہمیں بلوچی زبان سے واقفیت نہیں ہے تاہم اوپر اصل اور ترجمہ کا موازنہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ترجمے میں "اثر" پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ "میری راتوں کی تنہائیاں"، "میری روٹھی ہوئی بہار"، "لے گلِ وفا" جیسی ترکیبیں ایسی ہیں کہ اصل میں غالباً ان کا استعمال نہیں کیا گیا، اور نہ ایسی ترکیبیں لوک گیتوں کی زبان اور فضا سے زیادہ مناسبت رکھتی ہیں۔ لوک گیت تو عوام کے بالکل صاف اور سیدھے جذبات کی ترجمانی کے لئے ہوتے ہیں جس طرح مونتک کے اس گیت میں ایک دکھیا ماں کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے:

میرے جلتے ہوئے درد کا
شعلہ بھڑکتا رہتا ہے
دل ہے کہ بے سبب سدا
یوں ہی دھڑکتا رہتا ہے
ہائے یہ مادرِ شفیق
لختِ جگر کے ہجر میں
کتنی زبون و زار ہے
دن میں دھواں دھواں سی وہ
راتوں کو اشکبار رہے!

ہمارے علاقائی زبانوں میں لوک گیتوں کی جمع و تدوین پر کچھ عرصے سے جو کام ہو رہا ہے، وہ ہر اعتبار سے تحسین اور ہمت افزائی کے لائق ہے اور اسے ایک مستقل صورت میں جاری رہنا چاہیے۔ اس لئے کہ لوک گیتوں کا ذخیرہ، چاہے کسی زبان میں ہو، ایک وسیع اور لامحدود چیز ہوتی ہے کاش ہمارے یہاں موسیقی کو علائم و رموز میں قلمبند کرنے کا رواج ہوتا، تو ان لوک گیتوں کے مجموعوں میں گیتوں کی سُریں اور دھنیں بھی شامل کی جا سکتیں۔ انگریزی یا امریکی لوک گیتوں کا آپ کوئی بھی مجموعہ دیکھیں، اس میں ایک صفحے پر گیت اور دوسرے صفحے پر اس کی پوری دھن بنی ہوئی ملے گی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان گیتوں کے مجموعوں کی افادیت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے!

محمد کاظم

طرحدار لونڈی

مصنف: منشی سجاد حسین — مرتبہ: ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری

ناشر: مجلس ترقی ادب۔ لاہور — صفحات: ۳۰۰ + ۴۲ = ۳۴۲ — قیمت: چھ روپے

یادش بخیر منشی سجاد حسین کی "طرحدار لونڈی" پر زمانۂ طالب علمی میں میری بھی نظر پڑی تھی اور جن وجوہ کی بنا پر اسے دیکھ کر طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک وجہ نسیم بکڈپو لکھنؤ کی بدسلیقگی اور بدچھپائی تھی۔ اب جبکہ مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے نئے سرے سے یہ طبع ہوئی ہے اور ڈاکٹر میمونہ بیگم نے بڑی شائستگی سے طرحدار لونڈی کو سنوارا تو ایک بار پھر اس کے حسن گلو سوز پر نظریں پڑنے لگیں۔ اس ناول کا دوبارہ مطالعہ کر کے مجلس ترقی ادب کے حق میں کہ اس نے ڈاکٹر میمونہ بیگم جیسی ذمے دار خاتون کو یہ کام سپرد کیا، سچے دل سے دعا نکلی۔

ڈاکٹر موصوفہ کا نام ادبی حلقوں میں متعارف ہے اور ان کے خدماتِ ادب مشہور و معروف ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے ایک مہذب و باسلیقہ خاتون کی طرح اپنے ہنر خوب پیش کئے ہیں۔ مذکورہ ناول کی فہرست بنائی مقدمہ لکھا اور آخر میں ایک مفید فرہنگ بھی شامل کی۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ ان تمام مقامات سے وہ بخیر و خوبی گزریں اور ہر موقع پر انھوں نے نبھایا، لیکن ایک آدھ آنچ کی کسر رہ گئی۔ اگر یہ کمی بھی دور ہو گئی ہوتی تو یقیناً مشمولہ مقدمہ بھی وقیع ہو جاتا اور اس مقدمہ کی وجہ سے مذکورہ نسخے کی افادیت کچھ اور بڑھ جاتی۔ اس کے باوجود مجھے یہ اعتراف ہے کہ "طرحدار لونڈی" کے تمام نسخوں میں یہی نسخہ زیادہ مستند ہے اور نہ صرف مستقبل میں بلکہ غالباً بعید مستقبل میں بھی اس کی یہ حیثیت بحال رہے گی۔

مقدمے پر نہایت عاجزی سے چند معروضات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اور امید وار ہوں کہ میری نیت پر شبہ نہیں کیا جائے گا۔ میں بالکل ابتدا میں عرض کر دوں کہ خواتین کے احساسات و جذبات کا میں سب سے زیادہ احترام کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ حتی الامکان انھیں ٹھیس نہ پہنچے۔ یہی جذبہ اس موقع پر بھی موجود ہے۔

مذکورہ مقدمہ چار حصوں میں بانٹا گیا ہے اور اڑتالیس صفحات پر پھیلایا گیا ہے اور ان چاروں حصوں کی ترتیب کو منطقی بنا کر کچھ یوں ڈھانچہ بنایا ہے (۱) سجاد حسین کے حالات زندگی (۲) مزاح نگار کی حیثیت سے (۳) صحافی اور (۴) ناول نگار کی حیثیت سے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ شروع میں چند کلمات "اودھ پنچ" کی فائلوں کی تحقیق کے ضمن میں ارشاد فرمائے ہیں جن میں سے بعض محل نظر ہیں، بعض نام بھرتی کے لئے لئے گئے ہیں اور بعض محض چند در چند مصالح کی بنا پر۔[1] البتہ اس مقام پر ڈاکٹر صاحبہ کا یہ انکشاف تحقیقی نقطۂ نظر سے اہم ہے کہ "حیات شیخ چلی" سجاد حسین سے غلط منسوب ہے بلکہ یہ کتاب سجاد حسین انجم کسمنڈوی کی لکھی ہوئی ہے۔ بڑا اچھا ہوتا کہ سجاد حسین کسمنڈوی کے باب میں ڈاکٹر صاحبہ تھوڑی سی اور تحقیق فرما کر اسی مقام پر ہمیشہ کے لئے اس شبہے کو دفن کر دیتیں۔

حالات زندگی کے ضمن میں مجھے تقریباً کوئی بات عرض نہیں کرنا ہے۔ سوا اس کے کہ اگر اس حصے میں عبارت ذرا اور درست کر لی جاتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ مثلاً "منشی سجاد حسین کی ابتدائی زندگی بڑے چاؤ اور چونچلوں سے بسر ہوئی" وہ مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ جو ڈاکٹر موصوفہ کا اصل مافی الضمیر ہے۔ ایک تو جملہ لمبا ہے، دوسرے "بسر ہوئی" کا فقرہ اپنے سیاق سباق کے اعتبار سے غیر مربوط ہے۔ اس کو شاید یوں بھی ادا کیا جا سکتا تھا کہ ان کے ایام طفلی میں بڑے چاؤ چونچلے ہوئے۔ یہی حشر آگے بڑھ کر اس فقرے کا ہوا ہے کہ "سجاد حسین کو پورا ماحول لکھنؤ کا ملا" مبہم و تشنہ ہے کیونکہ اس پورے ماحول کے لئے (پہلے یا بعد میں) ایک اشارہ تک نہیں ہے علی ہذا القیاس اسی صفحہ پر یہ جملہ ملاحظہ ہو "ٹھیک اسی جذباتی کشمکش اور فکری تصادم میں منشی سجاد حسین نے شعور کی آنکھیں کھولیں" کم از کم ایسے فقروں کی موجودگی میں کوئی ایک رائے قائم کرنے میں دشواری بھی ہوتی ہے اور تکلف بھی۔ ذرا سی توجہ اور کی جاتی تو یہ سقم بھی دور ہو جاتا اور ژولیدہ بیانی سے بھی چھٹکارا مل جاتا لیکن معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحبہ نے یہ سطور نہایت عجلت میں تحریر فرمائیں اور بہ عبارت پر نظر ثانی بھی نہیں فرمائی۔

حواشی کے ذیل میں بعض بہت مفید ہیں خصوصاً تحقیقی اشارے اچھے ہیں۔

مقدمے کا دوسرا حصہ مزاح سے منسوب ہوا ہے اور مزاح کی مختصر تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ یہاں پر تجزیے اور تحلیل کے مفروضات قائم کئے گئے ہیں، اردو مزاح نگاری کی ابتدائی تاریخ کا ایجاز بھی اگر صحیح جائزہ لیا جاتا تو وہ عوامل و محرکات جنھیں تاریخی اور عمرانی اہمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے، معرض بحث میں آتے اور اس طرح مزاح کی روایت کا تعین ہو جاتا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مزاح کی صحیح تعریف میں ڈاکٹر صاحبہ نے کچھ بخل سے کام لیا ہے یا کچھ کفایت شعاری دکھائی ہے جس کا اثر سجاد حسین پر بھی ہوا ہے جو کسی ناتجربہ کار وکیل کے ہاتھوں اس کے موکل پر ہوتا ہے اور مقدمہ کمزور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو مزاح کی مختصر تاریخ تو ایک مضبوط پس منظر کا کام دیتی، ڈاکٹر صاحبہ

---

[1] اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "اودھ پنچ" کی مکمل فائلیں راجا صاحب محمود آباد کے [illegible] مسعود حسن ادیب کی لائبریری میں بھی ہوں گی لیکن منشی سجاد حسین کے بعد ممتاز حسین عثمانی نے [illegible] "اودھ پنچ" کا اجرا کیا تو رسالہ ان کے پاس موجود تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ظہیر مرحوم نے بھی اس کو محفوظ رکھا۔ ان کے انتقال کے بعد ممتاز حسین عثمانی مرحوم کے چونکہ کوئی اور اولاد نرینہ نہیں تھی بلکہ چار بیٹیاں تھیں، یہ سرمایہ [illegible] کو منتقل ہوتا رہا۔ ایک بیٹی حیات ہیں اور ۲۰۱ وکٹوریہ اسٹریٹ، نخاس لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ جو وہیں اور جہاں اور مرزا مرحوم سے منسوب تھیں۔ اب بھی ان کے پاس یہ سرمایہ محفوظ ہے بلکہ راقم الحروف نے ان کے علاوہ بھی چند دوسری نایاب اور قیمتی کتب کا ذخیرہ وہاں دیکھا ہے۔ آغا سہیل

نے اس تمدنیت کو نظر انداز کیا ہے۔ دوسرے رعایت لفظی اور ضلع جگت کے باب میں جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے اور دریافت فرمایا گیا ہے۔ اس کے کچھ اور بھی اسباب تھے۔ اگر یہ الزام آنکھ بند کر کے لکھنؤ کے سر تھوپ دیا گیا تو زیادتی ہو گی بلکہ ۱۷۷۵ء[۱] سے قبل یہ ورثہ تو دہلی سے اودھ کو منتقل ہوا تھا۔ برہان الملک کی سلطنت کی اس میں کیا خطا ہے! نیز یہ کہ برہان الملک کے ایرانی ہونے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ "جاگیردارانہ عہد کی نفسیاتی زندگی میں مزاح کا رویہ انفرادی اور شخصی انداز کا پیدا ہونا نظر آتا ہے" اگر ڈاکٹر صاحبہ صفحہ بارہ[۱۲] پر اس کے علاوہ کچھ اور بیان کرنا چاہتی ہیں تو مندرجہ بالا باتوں کو میرے سوءِ ظن پر محمول نہ کریں بلکہ اسے میری ناسمجھی قرار دے کر سمجھانے کی سعی کریں کہ سمجھدار لوگوں کا یہی قاعدہ ہے۔

ان سطور سے یہ استنباط کرنا غلط ہوگا کہ میں کسی جاگیردارانہ نظام کے خلاف کچھ سن نہیں سکتا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحبہ نے حکومت اودھ اور سلاطین اودھ کے باب میں جو رائے عموماً ظاہر کی ہے وہ ان کے اصل مقصد کو ظاہر نہیں کر سکی۔ وہ یہ بتانا چاہتی تھیں کہ اودھ کے علاقے میں ایک خاص قسم کی تہذیب پیدا ہوئی جو دہلی سے مختلف تھی۔ اور اسی بنا پر مزاح کا رجحان شخصی رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مزاح کی اس روایت کو ذرا تفصیل سے ڈاکٹر صاحبہ بتاتیں اور دہلی اور لکھنؤ کے فرق کو واضح کرتیں اور پھر لکھنؤ کی اجتماعی تہذیب کے عناصر واضح کر کے مزاح کی مروجہ اور مستعمل روایات کا تجزیہ کر کے اس روایت کا پتہ لگاتیں جو منشی سجاد حسین تک پہنچی، تو ہم جیسے کم مایہ اور بے بضاعت طلبہ کچھ استفادہ کر لیتے۔ محض اس قدر بتانا کہ

"جاگیردارانہ عہد کی نفسیاتی زندگی میں مزاح کا رویہ انفرادی اور شخصی انداز کا پیدا ہوتا نظر آتا ہے اور اس مزاح کی ماہیت محض کھیلنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ اس لئے اس مزاح کا رنگ عارضی، فوری اور سطحی نوعیت کا ہوگیا۔"

کافی نہیں تھا اور اس کے بعد یہ کہنا کہ:

"منشی سجاد حسین کو مزاح کا یہی ورثہ ملا تھا۔"

اور پھر یہ ارشاد کہ:

"منشی سجاد حسین کا اردو مزاح پر بڑا احسان ہے۔"

کچھ عجیب مضحکہ خیز ہے اور مجموعی طور پر خود ڈاکٹر صاحبہ موصوفہ کے بیان میں عدم تسلسل اور انتشار کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تو ڈاکٹر صاحبہ کو بھی معلوم ہے کہ انتزاعِ اودھ ۱۸۵۶ء میں ہوا اور یہی سجاد حسین کا سنہ پیدائش ہے۔ لکھنؤ جس وقت وہ پہنچے تو عنفوان شباب تھا۔ ظاہر ہے کہ اس دوران برطانیہ کی عملداری مستحکم ہو چکی تھی۔ وہ آخری کانٹا جو بہادر شاہ ظفر کی صورت میں کھٹک رہا تھا، ۱۸۵۷ء میں نکل چکا تھا۔ اخبارات نکل رہے تھے۔ کتابیں چھپ رہی تھیں ذرائع نقل و حمل کی وجہ سے اجتماعی زندگی میں حرکت تیز ہو گئی تھی۔ ملک کی تبدیلیاں ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا اور بارہ سال تک جس نہج پر کام کرتا رہا اس نے بھی ملک گیر تبدیلی زندگی کے ان گنت شعبوں میں پیدا کر دی تھی۔ ۱۸۲۲ء میں دہلی کالج قائم ہوا اور چند اہم خدمات انجام دے کر ۱۸۵۷ء میں ختم ہوگیا۔ سرسید اور ان کے رفقاء ۱۸۵۷ء کے بعد ہی اپنا معرکۃ الآرا کام شروع کرتے ہیں۔ یہ ہیں دراصل وہ اہم حالات اور واقعات جو سجاد حسین کے ذہن کے لئے اُفق کا کام دیتے ہیں۔ مزاح میں وہ روایات جو برہان الملک سے لے کر واجد علی شاہ تک کے زمانے میں پھیلی ہوئی ہیں، یکساں نہیں ہیں اور نہ شخصی حکومتوں میں خارجی اثرات، تاریخی واقعات اور عمرانی حالات کے دھاروں کو روکا جا سکتا ہے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے ہی سے لکھنؤ کا ایرانی رنگ انگریزیت کی طرف مائل ہونے لگا تھا لہٰذا جن روایات کا ڈاکٹر صاحبہ ذکر فرما رہی ہیں کہ سجاد حسین کو ورثہ میں ملیں، میرے نزدیک مضمحل اور پژمردہ ہو چکی تھیں، یا یوں کہئے کہ ان روایات کے مزاج میں انقلاب آ چکا تھا۔ جس بات کو ڈاکٹر صاحبہ یہ کہہ کر کہ منشی سجاد حسین نے:

".....مزاح کا رخ شخصیت سے اجتماعیت کی طرف پھیر دیا"

---

[۱] ۱۷۷۵ء تک فیض آباد دارالحکومت اودھ کا دارالحکومت رہا پھر لکھنؤ کو منتقل ہوا۔ [۲] یہ جملہ میرا نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا ہے۔

ایک معمولی واقعہ بتا رہی ہیں لیکن یہ غیر معمولی انقلاب ہے جس کی تہہ میں ایک تاریخ ہے اور ایک قوم کے مزاج کی داستان ہے۔

مقدمہ کا دوسرا پہلو جو مزاح سے متعلق ہے، بڑا مایوس کن اور غیر تسلی بخش ہے

تیسرا حصہ ظرافت سے متعلق ہے۔ اس بارے میں تو میں خاموشی اختیار کرتا ہوں، البتہ چوتھا اور آخری حصہ جو ناول نگاری کے فن سے زیادہ خود سجاد حسین کے فن ناول نگاری کے بارے میں ہے، میرے علاوہ ناظرین کے لئے بھی فکر انگیز اور محل غور ہے۔

اس حصے کو میں بھی دو حصوں میں تقسیم کروں گا۔

(ا)

یہاں میں ڈاکٹر صاحبہ سے بالکل متفق ہوں کہ منشی سجاد حسین کا مرتبہ بحیثیت ناول نگار سرشار، شرر، اور رسوا کے مقابلے میں کم ہے بلکہ مجھے اجازت دیجئے تو میں یہاں تک عرض کروں گا کہ نذیر احمد جو سرشار، شرر، اور رسوا کے مقابلے میں ایک ادنیٰ درجے کے ناول نگار ٹھہرتے ہیں، سجاد حسین تو اُن سے بھی گئے گزرے ہیں۔ نذیر احمد پلاٹ، کردار اور واقعات میں منطقی تسلسل پیدا کرنے میں کامیاب ہیں۔ سجاد حسین کو اپنے اس پیشرو سے یہ سلیقہ بھی نہیں ملا۔ نذیر احمد دلی کی زبان، محاورے اور چٹخارے دار زبان لکھنے پر قادر ہیں۔ سجاد حسین لکھنؤ کی زبان تو خوب لکھتے ہیں لیکن سرشار اور شرر کے مقابلے میں ہیچ۔ مجھے ڈاکٹر صاحبہ کی یہ رائے بھی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ سجاد حسین کے زمانے میں ناول لکھنے کا جو عام چلن تھا سجاد حسین بھی اسی رو میں بہہ گئے لیکن کوئی منفرد مزاج نہ پیدا کر سکے۔ اسی لئے کہ ناول کے لئے جس مشاہدے، اور مطالعہ کی ضرورت ہے وہ سجاد حسین کے حصے میں نہیں آیا تھا۔

"طرحدار لونڈی" میں اگرچہ پلاٹ بھی ہے اور حادثات اور واقعات بھی ہیں اور کردار بھی نفسیاتی اعتبار سے قصے سے مربوط ہیں، زبان بھی اچھی ہے اور مکالمے بھی خوب ہیں، اس کے باوجود مجموعی طور پر اس ناول میں اول درجے کے ناول کی سی جذب و کشش مفقود ہے، اس لئے کہ پلاٹ میں گہرائی نہیں ہے، کرداروں میں زندگی تو ہے مگر بھرپور زندگی اور زندہ رہنے کی طاقت نہیں ہے نیز یہ کہ کسی کردار میں کوئی ندرت یا تنوع نہیں ہے۔

منشی سجاد حسین کے سامنے لکھنؤ کی ہفت رنگ زندگی بکھری ہوئی تھی لیکن ناول نگار کی حیثیت سے انھوں نے مذکورہ ناول کے لئے صرف چند معمولی رنگ منتخب کئے جو بالکل روکھے پھیکے ہیں اور اصل لکھنؤ تو اس میں ظاہر ہی نہیں ہوتا۔ اگر وہ ذرا نظر تعمق سے دیکھتے اور اس کے پلاٹ میں ذرا اور وسعت پیدا کرتے تو لکھنؤ اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا اور ان کرداروں میں کچھ اور جان پیدا ہو جاتی لیکن چونکہ ڈاکٹر صاحبہ اس بات سے متفق ہیں کہ سجاد حسین کا اصل مقام ناول نہیں تھا لہٰذا میں اس بحث کو طول دینا ضروری نہیں سمجھتا البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ "طرحدار لونڈی" بھی مکمل ناول نہیں ہے۔

جس پر ڈاکٹر صاحبہ کو اصرار ہے وہ فرماتی ہیں:

"۔۔۔ہاں طرحدار لونڈی منشی سجاد حسین کی واحد ناول ہے جو پلاٹ، تکنیک، کردار اور مکالمے کے اعتبار سے مکمل ہے"

اگر یوں کہا جائے کہ طرحدار لونڈی وہ واحد ناول ہے منشی سجاد حسین کا، جس میں کوئی پلاٹ، کردار اور مکالمے بھی موجود ہیں تو درست ہے ورنہ ظاہر ہے کہ میں ڈاکٹر صاحبہ سے کسی قیمت پر بھی متفق نہیں ہو سکتا۔

اس ناول کا مرکزی کردار طرحدار لونڈی ہے جس کے ساتھ کچھ ناانصافی تو سجاد حسین نے کی، رہی سہی کسر ڈاکٹر صاحبہ نے پوری کر دی۔ جاگیردارانہ نظام کی چکی میں پسماندہ طبقہ جس بری طرح پسا ہے وہ ناقابل بیان اور ناگفتہ بہ حقیقت ہے۔ برطانوی عہد میں بھی یہ طبقہ ناآسودہ رہا اور مغلوں کے عہد میں بھی۔ شاید اس طبقہ کی پسماندگی اس زمانے میں رو بہ انحطاط ہے لیکن منشی سجاد حسین کے زمانے میں تو اپنے شباب پر تھی۔ چنبیلیا اسی طبقہ کی نمائندہ ہے۔ اس میں ہزار ہا کمزوریاں ہیں، وہ کمزوریاں بھی جن کا ذکر سجاد حسین نے کیا اور وہ بھی جو اُن کی نظر سے مخفی ہو گئیں لیکن ان کمزوریوں

کو ذرا سا کریدیئے تو ان کی تہہ میں بعض سماجی اور عمرانی محرکات ہیں، بعض نفسیاتی [illegible]رات جو [illegible] اور صرف "محرومیوں" اور "نا آسودگیوں" کا نتیجہ ہیں، لہذا نجبیا یا نجم النسا یعنی طرحدار لونڈی مصنف اور مرتبہ کی جس ہمدردی کی مستحق تھی وہ اسے نہیں ملی۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحبہ نے اتنی اہم اور غیر معمولی بات کو کیسے نظر انداز کر دیا، بلکہ نظر انداز کرنا تو ایک طرف رہا، بیچاری نجبیا کے باب میں جو انھوں نے طرز فکر اختیار کی، وہ بے ساختہ ان کے قلم سے ٹپک پڑی، ملاحظہ ہو، فرماتی ہیں:

"......اس میں اپنے طبقے کی رذالت اور کمینگی بھی ہے، نواب صاحب کے گھر سے نکلتے ہی اس کا کمینہ پن اور رذیل انداز ظاہر ہونے لگتے ہیں، اس کی زبان کا ٹانکا ٹوٹ جاتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ جس مسروقہ مال پر وہ اللّے تللّے کرتی ہے وہ اس کی ذاتی محرومی اور اس کے طبقے کی نا آسودگی کا بدیہی نتیجہ ہے۔ ایک جگہ ڈاکٹر صاحبہ یوں رقم طراز ہیں:

"کم ظرفی دیکھیئے ذرا سی بات پر یہ اپنی اصلیت پر آجاتی ہے۔"

یہ بھلا کیا لکھنے کا انداز ہے اور کیسا محاکمہ ہے، سبحان اللہ، سبحان اللہ!!

ایک جگہ اسی کردار کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحبہ نے مصنف پر یہ بجا اعتراض وارد کیا ہے کہ نجبیا کے کردار میں اس کے مکالموں کی زبان یکساں نہیں ہے بلکہ کبھی کچی ہے اور کبھی پکی۔ بعض دوسرے کرداروں کے باب میں بھی ڈاکٹر صاحبہ کے ارشادات اور فرمودات کا معیار کچھ یہی ہے جس کا نمونہ آپ اوپر ملاحظہ فرما چکے ہیں لہذا اب آگے بڑھیئے:

(۲)

اس حصے میں مجھے ڈاکٹر صاحبہ سے کچھ ذاتی شکایتیں ہیں یعنی جو زبان انھوں نے اس وقیع مقدمے میں استعمال کی ہے اکثر غلط اور ناقص ہے جس کی کم از کم ان سے ہرگز توقع نہیں تھی۔ زبان میں جو اغلاط ہیں وہ محض املے کی نہیں، انشا اور املے سے بھی متعلق ہیں اور قواعد سے بھی حتیٰ کہ واحد اور جمع تک میں امتیاز نہیں کیا گیا۔ ملاحظہ کیجیے صفحہ ۱۹، سطر نمبر ۲:

"وہ جس کنبے میں رہتے تھے وہاں ہر قسم کے لوگ تھے، بیگمات۔ انا۔ لونڈی۔ ماما۔ آتو۔ مغلانیاں، متانیاں سب ہی تھیں۔ نواب۔ غلام قدم اور صاحب یہ سب ان کے ماحول کے افراد ہیں۔"

محض چند ناموں کے رٹ لینے سے کام نہیں چلتا۔ جب تک واحد اور جمع کے اصولوں کو برتا نہ جائے ذمہ داری پوری نہیں ہوتی، یہ جو واحد اور جمع کا مرکب بلکہ معجون مرکب تیار ہوا ہے اس سے کوئی بتدی کیا سبق لیگا، طلبہ کیا سیکھیں گے؟ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

"لکھنؤ کے نواب بھی عجیب شے تھے۔"

حالانکہ محترمہ کی مراد نواب سے نہیں "نوابین" سے ہے۔ اسی جگہ پر ایک بامزہ محاورہ بھی سنتے چلیے:

"......سب کچھ دیکھتے ہوئے آنکھیں بند رکھتے اور سب کچھ سنتے ہوئے کانوں میں کڑوا تیل ڈالے رہتے ......"

میں تو صرف یہی عرض کروں گا کہ ڈاکٹر صاحبہ نے کڑوے تیل کو بہت یاد رکھا جو اس قدر شیفتگی سے اسے ایک محاورے سے چسپاں کر دیا ورنہ ظاہر ہے کہ محاورہ تو صرف کانوں میں تیل ڈالنا ہے، کڑوے میٹھے کی قید نہیں۔

صفحہ ۳۸، سطر ۶ ملاحظہ ہو:

"... کوشش کی گئی ہے کہ قدیم املا کو جدید شکل میں تبدیل کیا جائے"

املائے کی غلطی ہے یہاں "قدیم املے" ہونا چاہیے۔ آگے بڑھ کر اسی غلطی کا پھر اعادہ ہوا ہے: صفحہ ۳۸ سطر ۱۳

"..... ہم اردو املا میں ضروری تبدیلیاں کریں"

یہاں بھی "املے" ہونا چاہیے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ صفحہ ۳۹، سطر نمبر ۱۱ میں ارشاد ہوا ہے

"... مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے املا، اور انتشار کو سنوارا ..."

اسی صفحے کی چودھویں سطر ملاحظہ ہو،

"غرض نسخے کو بہتر بنانے کی خاطر جو جتن کیا جا سکتا تھا ...."

یہاں بھی جو جتن کیے جا سکتے تھے کی جگہ، جو جتن لکھا گیا ہے

ان معروضات کے ساتھ مجھے دبی زبان سے ایک بات ملک کے نوجوان ادبا سے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ زبان کی ترویج و اشاعت میں صحیح زبان کی اہمیت ان کی سہل انگاری سے کسی طرح کم نہیں ہوگی، نیز ناشرین کی خدمت میں بھی یہی عاجزانہ درخواست ہے کہ ادیبوں کو اس طرف مزید توجہ دلائیں۔ مجھے ڈاکٹر میمونہ بیگم صاحبہ کے مرتب کردہ نسخے سے جو استفادہ کرنے کا موقع ملا، میں اُن کا تہہ دل سے ممنون ہوں اور اُن کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ تمام نسخوں میں یہی نسخہ زیادہ مستند ہے

آغا سہیل

گلافتاب (مجموعۂ کلام)

شاعر: ظفر اقبال　　　ناشر: نیا ادارہ، لاہور　　　قیمت: چھ روپے

ادب کے ایک عام قاری کی حیثیت سے میں اکثر سوچتی ہوں کہ آج کے شاعر کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آج کا قاری بے حد روشن خیال ہے۔ وہ تجربات سے ڈرتا نہیں، چاہے وہ ان تجربات کو بالکل ہی رد کر دے مگر وہ تجربات پر غیر ضروری طور سے چونکنے اور خواہ مخواہ کا واویلا مچانے کا قائل نہیں۔ ہم سب کو یاد ہے کہ جب ہمارے نئے اور ترقی پسند شعرا نے اردو شاعری میں موضوع اور ہیئت کے تجربے شروع کیے تو مخالفت اور تردید کا کتنا بڑا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کتنے ہی نیاز فتحپوری اور عبدالماجد دریا بادیوں کی طرف سے معاشرت تہذیب اور ادب کے خطرے میں مبتلا ہونے کے نعرے بلند ہوئے تھے۔ مخالفت کی یہ لہر جتنی اونچی ہوتی جاتی تھی، ہمارے شاعر کا باغیانہ جوش و خروش اتنا ہی زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ ان تجربات نے ہماری شاعری کو فائدہ پہنچایا اور شاعر کو نقصان۔ وہ اس طرح کہ شاعر نے باغی کا کردار اپنا لیا اور ہونے یہ لگا کہ جب تک شاعر کے تجربات کی مخالفت زور نہ پکڑتی، شاعر کو چین نہ آتا لیکن گذشتہ بیس پچیس برس کی ادبی تربیت نے قاری کو بے حد وسیع النظر بنا دیا ہے۔ اب اس نے ہیئت اور موضوع کے تجربات پر چونکنا، ان کی مخالفت و تردید کرنا ترک کر دیا ہے۔ قاری کے اس رویے سے آج کا شاعر اس غلط فکری کا شکار ہوا کہ پڑھنے والا اس کے نام اور کام سے لاتعلق ہے۔ پڑھنے والے کو اپنے نام اور کام سے متعلق کرنے کی خاطر نیا شاعر بے تحاشا تجربات کر رہا ہے۔ ان تجربات کی افادیت کا فیصلہ وقت کے ہاتھ ہے مگر اتنا ابھی سے کہا جا سکتا ہے کہ اکثر بغاوتیں برائے بغاوت ہیں اور اُن کے پیچھے کسی قابل قدر ادبی مسلک کی موجودگی کا احساس نہیں۔

"آب رواں" شاہد ہے کہ ظفر اقبال صاحب بہت اچھے غزل گو ہیں۔ "گلافتاب" گواہ ہے کہ وہ غزل میں تجربے کر رہے ہیں۔ یہ تجربے اس لحاظ سے ضرور منفرد ہیں کہ دوسرے شاعروں کے برعکس ظفر اقبال صاحب نے اپنے نئے مجموعۂ کلام میں اپنے آپ کو ایک نئے رنگ سے دُہرایا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے

تھے، بڑے سلیقے سے آب رواں میں کہہ چکے ہیں۔ اب ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ آج کل کے بیشتر شاعروں کی طرح اپنی کہی ہوئی باتوں کو آئندہ شائع ہونے والے مجموعوں میں مسلسل دہراتے چلے جائیں یا، اپنے آپ کو دہرانے کا ایک نیا تجربہ کریں اور اس کو پنجابی، انگریزی، بنگلہ وغیرہ اور اردو کا درمیانی فاصلہ کم کرنے کی ابتدائی کوشش قرار دیں —— ہاں مجھے یاد آیا کہ گلافتاب کے ساتھ ہی عابد علی عابد صاحب کا تازہ مجموعۂ کلام "بریشم عود" بھی بازار میں آیا ہے۔ کچھ شاعر اپنی ادبی زندگی میں صرف چند اچھے شعر کہتے ہیں، کچھ شاعر وہ چند اچھے شعر کہہ لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ ہی اپنے آپ کو دہرانے کا کاروبار شروع کر دیتے ہیں لیکن قاری کے احتراماً پڑھنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ "بریشم عود" کے مقابلے میں "گلافتاب" واقعی ایک زندہ تجربہ نظر آتی ہے ——
ظفر اقبال صاحب ایک ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں تجربات واماندگیٔ شوق کی پناہ گاہ نہیں ہیں لیکن گذشتہ دنوں ان کی شاعری پر ایک سانحہ گذر چکا ہے وہ یہ کہ انھیں ایک دیباچہ نگار مل گئے۔ افتخار جالب صاحب نے "صاحب عہد" بننے کی ذمن میں صاحب عہد شاعروں کی اہمیت سے انکار اور نئے شاعروں کو ہر جز و غلط بنانے پر اصرار کا جو انداز اپنا رکھا ہے، اس سے ہمارے ادب میں تخریبی رجحانات راہ پا رہے ہیں۔ ظفر اقبال صاحب کو اپنے عہد کا صاحب عہد بنانے کے لئے انھوں نے یہی مشورہ دیا کہ چونکہ "زمان و مکاں گرامر اور مفروضے من مانی کارروائی کی راہیں مسدود کئے رہتے ہیں اس لئے تم ان رکاوٹوں کو دور کر دو کہ صاحب عہد کی یہی شناخت ہے۔" ایک ہونہار شاگرد کی طرح ظفر اقبال صاحب "کلی ستیز کا یہ پہاڑ" کاٹنے میں مصروف ہو گئے "لفظوں کو نئے جوڑ توڑ سے روشناس کیا اور کسی حد تک ٹھوٹ بھی روا رکھی کہ من مانی کارروائی اسی کو کہتے ہیں،" ورنہ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، یہ غریب سیدھی سادی کارروائی تو کرنے دیتی ہے مگر من مانی کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی۔ اس لئے چند لوگوں کو ہمیشہ شکایت رہی ہے کہ "مروج اردو کے ساتھ اپنی کچھ بن نہیں آتی۔"

"گلافتاب" کی بیشتر لسانی تشکیلات مجھے "تحصیل حاصل" نظر آتی ہیں۔ الفاظ کی بندش کے اصول کی جن تبدیلیوں کی طرف افتخار جالب صاحب نے دیباچے میں اشارہ کیا ہے وہ اردو زبان میں ولی، میر، جیسے شاہ اور سلطان باہو نے اپنائی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ جان کر افسوس ناک حیرت کا احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب کی جو غزلیات افتخار جالب صاحب کے حصۂ اثر میں شامل ہونے سے پہلے "فنون" جیسے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں، ان پر بھی ظفر اقبال صاحب نے لسانی تجربہ کرنا ضروری سمجھا:

سورج دریا میں گر رہا تھا میں دور سے چھپ کے دیکھتا تھا

اس کے باوجود میں سمجھتی ہوں کہ ظفر اقبال صاحب ایک سچے شاعر ہیں جو شاعر یہ اشعار کہہ سکتا ہے:

جاگ کر بھاگ پڑے تھے یونہی بے سمت ظفر اب کھڑے سوچتے آوازہ کدھر سے آیا

ہماری موجِ نگہ نے مٹا دیئے ورنہ ہزار نقش بنے خاک پر ہمارے لئے

گر کر ٹھنڈا ہو گیا جلتا ہاتھ فقیر کا جیبوں ہی میں رہ گئیں سب کی نیک کمائیاں

تماب ہو یا سراب ہو میرے لئے نیا نہیں اے نم چشم شیشہ رنگ یہ تو فنا ہی اور ہے

اس کے لئے نیا نہیں گرم دنوں کا بچپنا اور وہ کچھ بھی ہو مگر مادرِ مہرباں تو ہے

روشن تھا ظفر وسط میں مہتاب ملاقات میں چاروں طرف ہالۂ ہجراں کی طرح تھا

اس کی طرف سے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً ظفر اقبال صاحب کا تجرباتی دور عبوری دور ثابت ہوگا اور وہ بہت جلد یہ سوچتے نظر آئیں گے کہ احمد ندیم قاسمی سے افتخار جالب تک کا سفر کس سمت میں ہے۔ ترقی کی طرف یا تنزل کی طرف اور اپنے اس نظریے کے بارے میں بھی سوچیں گے :

شاعر وہی شاعروں میں اچھا کہا جائے جو شاعری کو کچا

ہم نہ سہی ظفر اقبال صاحب تو "یقیناً عقدِ ثریا کو پہچان سکتے ہیں" اور انھیں بھی چاہیے کہ "وہ فلک منظر کو استثنا قرار دینے سے پہلے اپنی آنکھ پر شبے کی نظر ڈالیں "۔ اور جب وہ یہ کرلیں گے تب ہی ان کے تجربات نئی اردو شاعری میں جگہ پاسکیں گے۔ جمیلہ شاہین

داغِ فراق (مجموعۂ کلام)

مصنف : شاد امرتسری
ناشر :
صفحات :
قیمت :

روحِ عصر پریشان اور پراگندہ ہوتی ہے مگر یہ پریشانی اور پراگندگی ایک تعمیری قوت کی حامل بھی ہوتی ہے جس دور میں ہم زندگی گذار رہے ہیں اس کی پریشانی و پراگندگی، شکست و ریخت اور تعمیر و تشکیل کے ہزار رخ رکھتی ہے۔ جہاں ہر لحظہ بڑھتی ہوئی رفتار نے فاصلوں کو سمیٹ لیا ہے وہاں نئے فاصلے اور نئی وسعتیں دریافت کی گئی ہیں۔ اور اب یہ فاصلے سوچنے والے دماغوں کے سامنے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں خارج کے علاوہ داخلی دنیا کا پھیلاؤ بھی ہر لحظہ بڑھ رہا ہے اور سوچنے والے ذہن داخلی وسعتوں کے لامحدود فاصلوں کی پیمائش میں بھی اسی انہماک سے مصروف ہیں۔ فلسفی، سائنس داں اور ادیب و شاعر اپنی اپنی قسم کے مفکر ہوتے ہیں لیکن ان مفکرین میں غالباً شاعر سب سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس کے ذہن پر جذبے اور احساس کی گرفت زیادہ شدید ہوتی ہے اور اس کی فکر کا رشتہ انسانیت سے زیادہ قریب کا ہے۔ وہ جذبے اور احساس کے ذریعے ذات اور کائنات کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ فلسفی اور سائنس داں کائنات کے مسائل کو سلجھا کر ذات کے مسائل کو حل کرتے ہیں تو شاعر اپنی ذات میں ڈوب کر کائنات کی طلسم کشائی کرتا ہے لیکن آج کے شاعر کی ذات کائنات سے اس قدر ملتبس ہو چکی ہے کہ دونوں کو علیحدہ کرکے دیکھنا ممکن نہیں رہا ہے۔ پھر بھی "دروں بینی" کی خصوصیت نے بعض شعرا کو اپنی ذات میں گم کردیا ہے اور وہ اس سے باہر نہیں نکل پاتے۔ انھیں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی گمشدگی میں ایک پہلو شعور کا بھی نکلتا ہے۔

شاد امرتسری کا شعور ایک شدید داخلیت کا انداز لئے ہوئے ہے لیکن اس کی داخلیت مریضانہ داخلیت نہیں ہے۔ اس نے اپنی ذات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا شعورِ ذات بالکل انفرادی ہوتے ہوئے بھی زندگی سے بالکل غیر متعلق نہیں ہے کیونکہ اسے زندگی کے حسن کا احساس ہے اور وہ اس احساس کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ اگر اپنے وجود کو فراموش کردینا بھی چاہتا ہے تو وجود کا شعور حاصل کرنے کے لئے۔ شاید گوئٹے کی طرح اس نے بھی اپنے طور پر یہ دریافت کرلیا ہے کہ "زندہ رہنے کا سارا فن وجود کے عرفان کے لئے وجود کو ترک کردینے میں ہے" اور شاید یہی وجودیت کے نئے فلسفے کا نچوڑ ہے۔ یہ احساس شاد کی شاعری میں انفرادی ہونے کے باوجود

بھی انفرادی نہیں ہے کیونکہ یہ اس صنعت اور ٹیکنالوجی کے عہد کی دین ہے۔ اور آج کے تقریباً ہر لکھنے والے کی تقدیر بن چکا ہے۔ یہ نظریہ ویسے انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی کے لئے مفید نہیں ہے لیکن اس دور کے نظامِ فکر میں کوئی تصور "خالص" نہیں ہے۔ شاد کے ذاتی دکھ نے اسے ایک ایسی بصیرت بھی دی ہے جس نے ذہنی طور پر اسے بچا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کافکا کے الفاظ میں "بحیثیت شاعر اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ اس کی شاعری کو سراہا جائے بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے تجربات پر اعتبار کیا جائے"۔ اسے سمجھا جائے۔ اس کے ذاتی مسائل پر غور کیا جائے کیونکہ اس کے ذاتی مسائل بھی غالباً بالکل ذاتی مسائل نہیں۔ وہ معاشرے کا ایک فرد ہے۔ اس کی شخصیت کی تعمیر میں ماحول کو دخل ہے۔ ماحول کو بدلنے کی دبی دبی تمنا اس کی "اندروں بینی" کے اندازِ فکر کا تقاضا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی فکر میں قنوطیت کا غلبہ ہونا یقینی تھا۔ لیکن وہ اپنے دکھوں کو پا کر انہیں بھول جانا چاہتا ہے۔ اسے مسرت کی تلاش ہے۔ وہ دکھ میں بھی خوشی کا ایک پہلو اور امید کی ایک کرن دیکھ لیتا ہے۔ شاد کی شاعری کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس کی اس فطرت کو جان لینا ضروری ہے۔

شاد کا پہلا مجموعۂ کلام "داغِ فراق" اس کی شخصیت اور اندازِ فکر کا اظہار ہے۔ وہ ایک غیر مطمئن اور مضطرب دنیا کا باسی ہے۔ ایک معمولی انسان نہ کسی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے نہ کسی مکتبۂ فکر کا مخالف۔ اس کی فکر بھی کسی غیر معمولی انسان کی فکر نہیں ہے لیکن اس نے ایک شاعر کی طبیعت پائی ہے۔ یہی طبیعت اس کی شاعری کا جوہر ہے۔ یہ جوہر پیرایۂ اظہار میں ڈھل کر اس کی فطرت کے اضطراب کی وجہ سے متحرک ہو جاتا ہے تو اس کا تصور تاثرات کی صورت گری کرنے لگتا ہے اور وہ محسوسات چلتی پھرتی، ہنستی بولتی تصویروں کے روپ میں دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ اس کا تخیل کیمرے کے لینس کی طرح کام کرتا ہے، اور نظم اس کے ذہن میں بقول خود اس کے ایک تصویر کی طرح آتی ہے۔ وہ چاندنی رات کو ایک عیار حسینہ کی صورت میں دیکھتا ہے۔ بادلوں میں سے اجداد کی روحیں نظر آتی ہیں۔ محبت اسے ایک تند خو دریا کی موجوں کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ آرزوؤں کو وہ ناامیدی کے سمندر میں گرتے ہوئے خشک اور بے جان پتوں کی شکل میں مشاہدہ کرتا ہے —— تلازمۂ خیالات کا انداز اس کی شاعری کا ایک فکری عنصر بن جاتا ہے۔ وہ ان دریچوں سے بھی اپنی ذات کے اندر جھانکتا ہے۔ لیکن یہی نہیں کہ ہمیشہ اس کی آنکھیں اندر ہی کھلتی ہیں کبھی کبھی وہ ان روزنوں سے باہر بھی دیکھ لیتا ہے اور ایسے ہی لمحات میں وہ سوچنے لگتا ہے:

سوچتا ہوں بھلا تخلیق کا مقصد کیا ہے
کس لئے حضرتِ یزداں کو یہ سوجھی آخر
کہ فقط آدم و حوا کو بسانے کے لئے
عرش سے دور کوئی اور جہاں پیدا کرے

بحر و بر کوہ و بیابان جنگل جو ایک تغیر کے مرہونِ منت ہیں۔ طوفان، ہنگامے، نت نئی شکلیں بدلتے معصوم و دل آویز ہیولے، کبھی واہموں کے شکار، کبھی ہوش و خرد سے سرشار، عرش و فرش کے اسرارِ نہاں کے محرم، انسان، فرشتے بظاہر جبر کی زنجیروں میں اسیر، لیکن فکر میں آزاد۔ لیکن ہر فکر تخلیق کا مقصد معلوم کرنے سے عاری۔ اس طرح اس کی نظم "لایخل" ایک دعوتِ فکر بھی ہے اور فکر کی نارسائی کا اعتراف بھی۔ اس نظم میں شاد کا لہجہ راشد سے متاثر نظر آتا ہے لیکن اس کی آواز بازگشت نہیں ہے یہی لہجہ "بے بسی" میں ذرا زیادہ واضح ہو جاتا ہے:

چاندنی شب کسی عیار حسینہ کی طرح
میری بیتی ہوئی راتوں کا اڑاتی ہے مذاق

میری بیتی ہوئی راتیں کہ جنہیں
اب مرے پاس کبھی کوئی نہیں لائے گا

اس کا عشق "ماورا" والے راشد کے عشق سے نوعیت میں مختلف سہی لیکن اس کے اظہار کا لب ولہجہ مختلف نہیں:

مان لے میرا کہا اب مان لے
دیکھ دن کی لاش پر
رات ماتم کے لئے آنے کو ہے

....

اور پھر خاموش بستا شہر بھی
جاگ اُٹھے گا خواب سے

....

چل کہ وہ گلیاں وہ کوچے وہ منقش بام و در
وہ پری خانے ہماری آرزوؤں کے محل
آج تک ہیں تیرے میرے منتظر

راشد کی طرح شادؔ نے میراجی کا تاثر بھی قبول کیا ہے لیکن یہ تاثر بھی لب ولہجے اور انداز بیان تک محدود ہے۔ اس کا عشق میراجی کی طرح "خود اذیتی" کی منزل تک نہیں پہنچنے پاتا:

تیری آنکھوں پر چھائی ہے چاہت کی گھنگھور گھٹا
میرے من کو گیان ہوا ہے تیرا من بھی ہے دُکھیا
میں دُکھیا باتوں کا رسیا کوئی میٹھی بات سنا
آ پہلے کچھ کہہ لیں سن لیں سونے کو ہے وقت پڑا

....

من بالک ہے گھور اندھیرا رستہ کون سنبھالے گا
دھن اور روپ کا جال بچھا ہے اس سے کون بچائے گا
میں تو ہار چکا ہوں تجھ کو تسکین کون دلائے گا
کون سورما ایسا ہے جو دونوں کے کام آئے گا

لیکن وہ میراجی کی طرح جنس زدہ نہیں ہے۔ اس کے ہاں عورت جنس کے علاوہ رفاقت کا احساس بھی دلاتی ہے۔

لمبی چوٹی والی لڑکی جس کی زلفیں کالی ہیں
اس کے گورے گال اور بھوری آنکھیں دیکھنے والی ہیں

خود کالج میں پڑھتی ہے اور بچوں کی استانی ہے
سُر سنگیت کی رسیا ہے اور شعروں کی دیوانی ہے
نغموں اور گیتوں کی دھنیں وہ اکثر خود ہی بناتی ہے
مجھ سے ملنے آتی ہے تو اپنی دھنیں سناتی ہے
گا نا گا کر پھر وہ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے
اور پھر مجھ سے بائرن شیلے کیٹس کی باتیں کرتی ہے
چپکے بیٹھا اس کے علم کی باتیں سنتا رہتا ہوں
کتنے ستم سہے ہیں میں نے پھر بھی کچھ نہیں کہتا ہوں

کبھی کبھی مترنم بحروں میں سیدھی سادہ زبان اور الفاظ کی موسیقیت میں بھی میراجی کا رنگ جھلک آتا ہے لیکن موضوع اور تاثر اس کا اپنا ہوتا ہے۔ میراجی کی طرح جنسی ناآسودگی اسے اندھے کنوئیں میں جھنکواتی بلکہ کبھی کبھی حسن کے ساتھ اس کا خیال ایک پاکیزہ فضا میں پہنچ جاتا ہے اور وہ یہاں تک کہہ دیتا ہے ؎

تیرا روپ یہی ہے داتا اور یہی تیرا بہروپ
تو ہی روپ کلا ہے تو ہی سندرتا کا روپ انوپ

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ جسم کے جنسی احساس سے اس کی شاعری خالی ہو گئی ہو۔ جہاں جہاں اس کے کلام میں حسن کا احساس ملتا ہے وہاں اس کی آوازیں راشد اور میراجی دونوں کی آوازیں مل گئی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کی شاعری محض میراجی اور راشد کے تاثر تک ہی محدود ہو۔ اس کا اپنا رنگ اور اپنا انداز ہے۔ اس نے اس تاثر کے ذریعے اپنی آواز کو پانے کی کوشش کی ہے اور یہ آواز اس کے پہلے مجموعے میں واضح ہوتی ہوئی نظر بھی آتی ہے۔ اس کی طبیعت کا اصلی رنگ اس کی ہلکی پھلکی نظموں میں نکھرتا ہے کیونکہ اس کے مزاج میں رچا ہوا ذکھر بہت لطیف پردوں سے چھن کر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اس انداز کی نظمیں "باتوں کے جال" "مت چھیڑ اسے" "آدرش" اور "نظم" ہیں۔

شاعری کا یہ ہلکا پھلکا انداز عظمت اللہ خاں کی بعض نظموں سے ملتا ہے اور اسی کی طرح شاد کی شاعری کا رنگ بھی اسی قسم کی شاعری میں نکھرتا ہے زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں شاد کا نقطۂ نظر رومانی ہے اور ایسا ہونا لازمی بھی تھا کیونکہ جس دور میں شاد نے شاعری شروع کی تھی وہ رومانی اور ترقی پسند شاعری کا دور تھا۔ اپنی طبیعت کے لاابالی انداز اور اپنی فطری رومان پسندی کی وجہ سے انسانی اقدار کے احترام کے باوجود شاد ترقی پسند تحریک سے زیادہ متاثر نہیں ہوا۔ اس کے باوجود اس کی شاعری اپنے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے کیوں کہ اس کی ذات ماحول سے غیر متعلق نہیں ہے، مگر وہی بات جو ترقی پسند شاعروں کے ہاں گمبھیر بن کر سامنے آتی ہے، شاد کے ہاں ایک ہلکا پھلکا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ اس کی نظم "تہذیب" میں ایک گمبھیر موضوع کا ہلکا پھلکا برتاؤ پڑھنے والے کی توجہ کو روکتا ہے اور اس کے لیے ایک لمحۂ فکریہ مہیا کرتا ہے:

اک بڑھا برگد کے نیچے — بیٹھا بھٹے بھون رہا ہے
آس پاس کچھ گندے بچے — پھٹے پرانے کپڑے پہنے
لال دہکتے انگاروں کو — آنکھیں مل مل دیکھ رہے ہیں

بھٹوں کے بھُننے کی سوندھی ۔۔۔ سوندھی خوشبو سونگھتے ہیں
بڈھا اِن سے بے سدھ ہو کر ۔۔۔ اپنا کام کئے جاتا ہے
پنکھا جھلتے جھلتے گاہے ۔۔۔ اک آواز دیئے جاتا ہے
ایک آنے کے دو بھٹے بھی ۔۔۔ لے لو ایک آنے کے دو
بھٹے ایک آنے کے دو

آخری دو مصرعے ہرچند کہ نظم کی موسیقیت اور آہنگ سے بے نیاز ہیں لیکن سڑک کے کنارے برگد کے نیچے بھٹے بھوننے والے اور کچھ گندے بچوں کی کیفیت کا حقیقت پسندانہ مگر غیر شاعرانہ بیان پڑھنے والے کو اس نظم کے انجام کے متعلق سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور آخری تین مصرعے اسے چونکا دیتے ہیں:

آ نہیں سکتے نہیں بچوں میں
ہاتھ بڑھا کر بھٹے چھینیں
اور اک پل میں یہ جا وہ جا

یہ نظم شاد کی اس خصوصیت کی مظہر ہے کہ وہ ہر نظم کو تصویر کی صورت میں دیکھتا ہے ورنہ درحقیقت نہ بچے بچے ہیں، نہ بھٹے والا، بھٹے والا اور حقیقت میں ایسا بھی نہیں ہے، جو چیز بچوں کو بھٹے چھین کر بھاگ جانے سے روکتی ہے وہ تہذیب ہے۔ یہ نظم بھی شاد کی دوسری نظموں کی طرح ایک خواب ہے، جو وہ اپنے شعور کی روشنی میں کھلی آنکھوں دیکھتا ہے۔

شاد ایک شفاف اور سلجھے ہوئے ذہن کا مالک ہے لیکن الجھن اور ابہام آج کی زندگی اور ادب کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے آج کا سوچنے والا انسان دامن نہیں بچا سکتا۔ اس دور کی حقیقت نگاری بھی ماورائے اصلیت کے فنی اور اصطلاحی انداز میں اظہار پاتی ہے تو اشاریت کا روپ دھار لیتی ہے۔ شاد کی تصویریت کے تقاضے سے یہ اشاریت غیر مربوط تصویروں (Broken Images) کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اپنی اس کیفیت میں شاد کی شاعری پر مصوری کے جدید مکتبہ ہائے فکر کا پرتو پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نظمیں "وقت کا راگ" "تاریخ" اور "فرشتوں کی بارگاہ" وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

ویسے یہ اٹل ہے جو تصویر جو نرسری رائمس کی سی سادگی اور معصومیت لئے ہوئے ہیں، بلا مقصد نہیں ہیں۔ شاد اپنے عہد کے ذہنی اور فکری تقاضوں کو اپنے تصوراتی انداز میں اپنے رومانی نقطۂ نظر سے قبول کرتا ہے اور یہی اس کے پیرایۂ اظہار میں ایک مخصوص شاعرانہ رنگ بن کر جھلکتے ہیں۔ اس کی شاعری میں ہلکے گہرے رنگوں کا ایک ایسا امتزاج ہے جو اس کے جذبات و احساسات کی فراوانی و شدت کو ابھار کر اس کی فکر پر مسلط کر دیتا ہے۔

شاد اپنے عہد کی عکاسی داخلی رومانوی انداز میں کرتا ہے، لیکن اس کے ہاں اس دور کے خارجی مظاہر اور خاص کر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور اس کے ذہنی اور نفسیاتی اثرات سے بلا واسطہ کوئی جذباتی علاقہ نہیں پایا جاتا ہے۔ ان معنی میں اسے ایک طرح سے اس عہد کا نمائندہ شاعر نہیں کہا جا سکتا اور اس کا کیا ذکر ہے، بہت کم شاعر اس کا شعور و ادراک رکھتے ہیں۔ پھر بھی اس قسم کا شعور ہمارے عہد کے بہت سے شعرا کے کلام میں نظر آتا ہے لیکن ابھی اس شعور کی ابتدا ہے۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ شاد جیسے "اندرون بیں" شعرا کے کلام میں یہ شعور کس طرح ظاہر ہوگا۔ بظاہر تو یہ اس کے رومانی اندازِ فکر کے دائرے سے باہر کی چیز معلوم ہوتی ہے۔

شاذ ایک اچھا غزل گو بھی ہے اور اس کی غزل میں بھی اس کی انفرادیت کا بھرپور اظہار ہے۔ اور اس کی غزل کی شاعری پر بھی اسی قسم کی گفتگو ہو سکتی ہے، لیکن ایسا کرنے میں انھیں باتوں کا اعادہ کرنا پڑے گا۔ اس لئے یہاں اس کی غزل کے کچھ نمائندہ اشعار کا انتخاب کافی ہوگا:

مرگِ خورشید دیکھنے والو　　　جلوۂ ماہتاب باقی ہے

خامشی سازگار ہو نہ سکی　　　اور اگر سازگار ہو بھی تو کیا

ہنگامہ ہائے دہر میں ہم اس طرح رہے　　　جس طرح شمع جلتی ہو سنسان راہ میں

دل میں کیا کیا تصویریں ابھریں ڈوبیں　　　محفل میں جب تیری چپ کی بات چلی

آوارگی زمانے بھر کی شہ دے گئی　　　کوئی پکارتا ہی رہا عمر بھر مجھے

سفر دراز ہے تنہائیوں کے صحرا کا　　　ڈرا رہی ہیں ابھی سے عجب صدائیں مجھے

الیاس عشقی

ٹیڈی بوائے

مصنف: عزیز اثری　　　ناشر: عوامی کتاب گھر۔ لاہور　　　قیمت: ۲/۵۰ روپے

روزنامہ "امروز" لاہور کے ہفتہ وار کالم "تہذیب و فن" میں احمد ندیم قاسمی نے ایک بار پھر وقت کے اہم ترین ادبی و قومی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے اور انتہائی درد کے ساتھ ایک بار پھر یہ سوال دُہرایا ہے کہ "بچوں کا ادب کون تخلیق کرے گا؟"

کبھی مال روڈ کی کسی بھی بڑی دکان پر جانے کا اتفاق ہو اور بچوں کے لئے کوئی موزوں کتاب تلاش کرنے کی زحمت کی جائے تو عجیب عجیب مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ انگریزی زبان میں چھپے ہوئے "کامکس" میں ایک مرد ولڑکا جینز پہنے، پستول تانے، دشمن پر گولی چلاتا ہوا نظر آئے گا، اور اردو میں چھپی ہوئی کتابیں کہ ترجمہ ہوتی ہیں انگریزی کتابوں کا "انتخاب" میں تو اور بھی عجیب تضادات دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک سؤر سکرٹ پہنے، ہیٹ لگائے، ہاتھ میں چھتری لئے دروازے پر کھڑا دستک دیتا ہوا دکھائی دے گا، اور پاکستانی بچہ جو سؤر کے لفظ کو گالی کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ سؤر سے ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کی بے سود کوشش میں کتاب جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوا نظر آئے گا۔

ہمارے ناشر کافی سیانے ہیں۔ بچوں کی کتابوں کو نفع بخش کاروبار جانتے ہوئے سکولوں کی لائبریریوں کے لئے بتیس بتیس صفحوں کے کتابچے قیمت جن کی "ایک روپیہ یا دو آنے" رکھی ہوتی ہے چھپوا رکھی ہیں اور محکمہ تعلیم نے انھیں کمال فراخ دلی منظور کر رکھا ہے نتیجۃً سکول یہ کتابیں انہی قیمتوں پر خرید کر اپنی لائبریریوں میں سجانے پر مجبور ہیں جبکہ اسی ضخامت کی کتابیں مذکورہ کتابوں سے بہتر گٹ اپ کے ساتھ ۲۵ پیسے میں عام مل جاتی ہیں۔ اگر ان کتابوں کو، جو عظیم مسلمان شخصیتوں کے بارے میں ہیں، اٹھائیں تو کچھ اس طرح کی عبارت نظر سے گذرے گی۔

"جب خلیفۂ اوّل کو اس امر کا علم ہوا تو حضرت نے بقدرِ استطاعت و توفیق سائل کی مدد فرمائی۔"

ذرا خیال کیجئے یہ عبارت بچوں کے لئے ہے۔ اب آپ ہی بتائیں ہمارے بچے کیا پڑھیں؟ کاکس یا السید نا عبد الصمد الصارم الازہری کی تالیف کردہ علامہ تصنیفات کو سمجھنا تو در کنار جامعۂ ازہر کے تعلیم یافتہ مصنف کا نام پڑھنا بھی بچوں کے بس میں نہیں۔

عزیز اثری نے وقت کی اہم ضرورت کو سمجھ لیا ہے۔ وہ احمد ندیم قاسمی کے اٹھائے سوال کا مجسم جواب بن گیا ہے اور اس نے خاص طور پر "تخلیق" کے لفظ کا خیال رکھا ہے۔ عزیز اثری انگریزی سے اردو میں ترجمے نہیں کرتا، اس کے پلاٹ غیر ملکی کتابوں سے ماخوذ نہیں ہوتے۔ وہ بچوں کے لئے ادب تخلیق کرتا ہے اور وہ بھی اپنی دھرتی سے۔

"عالی پر کیا گذری" اور "حامد پر کیا گذری" کے بعد "ٹیڈی بولے" عزیز اثری کا تیسرا ناول ہے۔ اس ناول میں پہلے دو ناولوں کی نسبت واقعات تیزی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ کہانی کی رفتار نسبتاً تیز ہے اور جہاں دو واقعات کے درمیان ذرا وقفہ ہے، وہاں مصنف نے ماحول کو اجاگر کرنے کے لئے ضمنی کرداروں سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کام لیا ہے اور یوں دو موڑوں کے درمیان فاصلے کا احساس نہیں ہونے دیا ہے۔

عزیز اثری کا نام ہی اس کتاب کی مقبولیت کے لئے کافی ہے کیونکہ وہ بچوں کا محبوب مصنف ہے۔ یہ کتاب بچوں میں اثری کی مقبولیت میں اضافے کا باعث ہوگی۔ میں یہاں پر عوامی کتاب گھر لاہور کو اپنی پہلی کتاب اتنے سلیقے اور اہتمام سے شائع کرنے پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بچوں میں قومیت، وطنیت، اچھائی سے محبت، بدی سے نفرت کے بیج کی تلاش کی لگن پیدا کرنا ادیب کا کام ہے یہ کام نہ سکول ٹیچر کر سکتے ہیں نہ والدین، یہ ادیب ہی کر سکتا ہے اور اس وقت اثری یہ کر رہا ہے اور عوامی کتاب گھر اس عظیم مشن میں اثری کا معاون ہونے کی حیثیت سے مبارکباد کا مستحق ہے۔

زبیر

اردو میں حوالے کی کتابیں

مرتب: قومی کتاب گھر — ناشر: قومی کتاب مرکز پاکستان، کراچی — ضخامت: ۲۷ صفحات

قومی کتاب مرکز پاکستان (نیشنل بک سنٹر آف پاکستان) حکومت پاکستان کا قائم کردہ ایک ادارہ ہے جو لوگوں کی عادات، مطالعہ اور ضروریات کتب کا جائزہ لے کر مصنفین، ناشرین، کتب فروش اور لائبریرین حضرات کے تعاون سے وہ تمام ذرائع بروئے کار لانے کی سعی کرتا ہے جن سے لوگوں کو اچھی کتابیں وافر تعداد میں اور سستے داموں ملنے کی صورت پیدا ہو سکے۔ اس کے فرائض میں مطالعے کی عادات کو فروغ دینا، کتابوں کی نمائشیں ترتیب دینا، مضمون وار فہرستیں شائع کرنا اور کتابوں کے متعلق معلومات مہیا اور مشتہر کرنا شامل ہے۔ کتابوں کو خوبصورت اور دیدہ زیب بنانے کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ ادارہ ناشرین اور مصوروں کو ہر سال متعدد انعامات بھی تقسیم کرتا ہے (جنہیں اب ہنگامی حالات کے پیشِ نظر روک لیا گیا ہے)۔

اس ادارے کے انتظامی بورڈ میں مصنفین، ناشرین اور لائبریرین حضرات کی قومی انجمنوں کے علاوہ اپوا، یونیورسٹی بورڈ، مرکزی اور صوبائی محکمہ ہائے تعلیمات، یونیسکو اور مختلف علمی اداروں کے نمائندے شریک ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں انسائیکلوپیڈیا، لغت اور دیگر کتبِ حوالہ نرلیستہ عنوانات کے تحت جمع کر دی گئی ہیں اور یوں مطالعہ کرنے والوں اور تحقیق کے طالب علموں کے لئے بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن بعض عنوانات کے تحت بعض کتب درج ہونے سے رہ بھی گئی ہیں، اس سے صرف یہ مترشح ہوتا ہے کہ بعض نمائندے ادارے سے پوری طرح تعاون نہیں کر رہے اور انھیں ضروری معلومات بہم نہیں پہنچاتے لیکن اس معمولی سی فروگذاشت کے باوجود یہ کتاب اپنی افادیت کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔

خاطر غزنوی

آئینۂ ادب لاہور کی چند کتابیں

مذہب

لغات القرآن (دو حصے)	مولوی عبدالرحمان	۱۲/۰۰
شرعۃ المتین	اسدالرحمٰن قدسی	۳/۵۰
آئینہ قرآن وحدیث	قاضی محمد عالم	۲/۰۰
شعاعِ قرآن	صوفی عبدالحمید	۲/۵۰
عورت اسلام کی نظر میں	مفتی سید احمد علی	۴/۰۰
مضامین البلاغ	ابوالکلام آزاد	۴/۰۰
قرآن کا نظریۂ سلطنت	ہارون خاں شیروانی	۲/۰۰
منصبِ امامت	شاہ اسمٰعیل شہیدؒ	۴/۵۰
منصبِ امامت (فارسی)	〃	۳/۰۰
سائنس، صحت، روحانیت	مہر علی قریشی	۳/۵۰
ہادیٔ ہریانہ	منظورالحق صدیقی	۲/۰۰
قصۂ آدم وابلیس	کوثر نیازی	۳/۵۰
دربارِ رسولؐ کے فیصلے	عبداللہ قرطبی	۶/۰۰

شخصیات وسیاسیات

پنجابی دے صوفی شاعر	ڈاکٹر لاجونتی	۵/۵۰
جبران	بشیر ہندی	۴/۵۰
ادیب	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	۴/۰۰
جمال الدین افغانی	میرزا ادیب	۱/۵۰
اشتراکی چین	ارشاد احمد حقانی	۵/۰۰
تغیرِ عظیم (ترجمہ)	خالد لطیف	۶/۰۰
جان کینیڈی (〃)	〃	۱/۵۰
جیکولین کینیڈی (〃)	بانو قدسیہ	۳/۵۰
لنڈن جانسن (〃)	یٰسین احسن کلیم	۴/۰۰
آندھی میں چراغ	خواجہ غلام السیدین	۹/۰۰
جرات کے پیکر	جان کینیڈی	۶/۰۰
استقلال کے پیکر (ترجمہ)	حبیب اشعر	۶/۷۵
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	۶/۰۰
ہم نفسانِ رفتہ	〃	۶/۰۰
روحِ اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین	۱۰/۰۰

داغ	تمکین کاظمی	۷/۵۰
ہادیٔ ہریانہ	منظورالحق صدیقی	۲/۰۰
غالب	رضیہ سجاد ظہیر	۲/۰۰
ایک صدر کی میراث (ترجمہ)	حبیب اشعر	۵/۵۰
پاکستان کا مستقبل	سعید ملک	۳/۰۰
چند مشاہیر	عشرت رحمانی	۷/۵۰
حکیم الامت	عبدالماجد دریابادی	۱۵/۰۰
نامۂ اعمال (دو حصے)	سر محمد یامین	۳۰/۰۰
حیاتِ جاوید	الطاف حسین حالی	۱۰/۵۰
حیاتِ جاوید (اعلیٰ ایڈیشن)	〃	۱۷/۵۰

تعلیم تنقید

بچے کی تعلیم (ترجمہ)	فضل محمد خاں	۹/۰۰
تعلیم کے مقاصد (〃)	سید عبداللہ	۶/۵۰
تعلیمی مقالات (〃)	وقار عظیم	۷/۰۰
تعلیم اور تہذیبِ نفس (〃)	〃	۲/۵۰
روحِ اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۰/۰۰
اردو غزل	〃	۱۶/۰۰
حسرت کی شاعری	〃	۲/۰۰
امریکی ناول اور اس کی روایات	وقار عظیم	۵/۰۰
ایمرسن کے مضامین	〃	۵/۰۰
مولانا حالی کا سیاسی شعور	معین احسن جذبی	۵/۵۰
مضامین ملک پیما	میاں عبدالعزیز	۹/۰۰
جینے کے طریقے	تمکین کاظمی	۴/۰۰
آئینۂ فرنگ (تاریخ)	شاکر شمسی	۴/۰۰
یادگارِ حالی	صالحہ عابد حسین	۶/۰۰
ادبی جھلکیاں	〃	۵/۵۰
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	۶/۰۰
ہم نفسانِ رفتہ	〃	۶/۰۰
اختر شیرانی اور اس کی شاعری	اختر جعفری	۵/۵۰
اقبال کے صنائع بدائع	پرنسپل نذیر احمد	۶/۰۰
باقیاتِ اقبال	اقبال	۱۰/۵۰

مفصل فہرست طلب کریں

آئینۂ ادب • چوک مینار انارکلی • لاہور

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر، پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر "فنون" ۴م - انارکلی لاہور سے شائع کیا